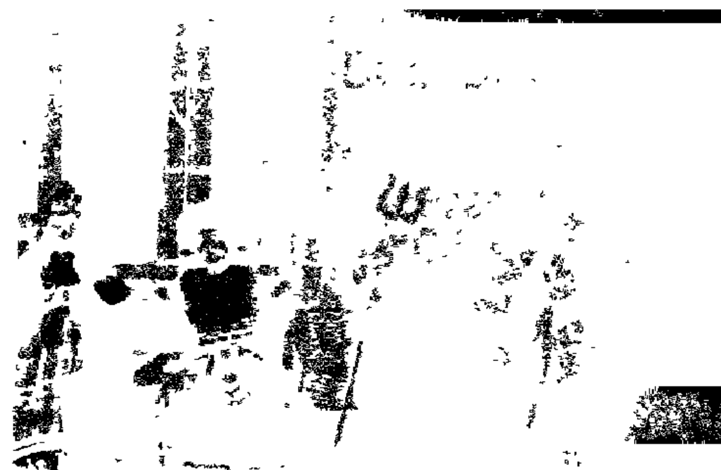
مغربی بنگال











پندرہ روزہ

مغربی بنگال

کلکتہ

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھیندرا ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

جلد نمبر ۳۳ ★ یکم جنوری سنہ ۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۱

شرح خریداری

قیمت : بارہ ۱۲ پیسے فی پرچہ
سالانہ : تین روپئے

ترسیل زر کا پتہ

بزنس منیجر
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۲۳ - آر، این، مکھرجی روڈ - کلکتہ ۷۰۰۰۰۱

سرورق پر : شانتی نکیتن میں منعقدہ ثقافتی تقریب کی جھلکیاں



یووا بھارتی کیرنگن، سالٹ لیک، کلکتہ میں منعقدہ مجاہدین آزادی نمائش

قومی یکجہتی

از ——— ڈاکٹر وائی۔ رادھا کرشن مورتھی جنرل سکریٹری آندھرا پردیش شہری آزادی ایسوسی ایشن

ہملوگوں سے کہا گیا کہ ہم لوگ "قومی یکجہتی ہفتہ" منائیں۔ گزشتہ پانچ برسوں میں قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے ہمارے ملک کے مختلف علاقوں میں کئی سیمینار منعقد کئے گئے، گفت و شنید کی نشستیں بھی ہوئیں۔

اس سوال پر کہ ہندوستان جیسے ملک کو برطانیہ جیسے چھوٹے سے ملک نے کیوں کر فتح کر لی، کارل مارکس نے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل، غور و خوض کرتے ہوئے تین اہم وجوہ بتائیں، جو یہ ہیں۔ پہلی ہندوستانی جاگیری نظام کا سماجی جمود، دوسری قومی تنوع اور تیسری ذات پات کا نظام جو جدت کاری کے کام میں سدِ راہ بنا ہوا ہے۔

ٹیگور کے الفاظ میں " ہندوستان عالم صغیر ہے " اور یہاں جس قوم کی تشکیل ہوئی ہے وہ مختلف فرقوں، مختلف زبانوں اور ثقافتوں، مختلف مذاہب اور ذات اور قبیلوں کی مرہونِ منت ہے۔ ہندوستان کی قبل از نوآبادیاتی تاریخ شاہد ہے کہ کبھی بھی اس پورے ملک پر ایک واحد حکمراں کی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ یہ تو انگریز ہی تھے جو ایک ایک کر کے تمام علاقوں کو ایک مرکزی حکومت کے تحت لے آئے۔ نیز یہاں بہت ساری چھوٹی چھوٹی ریاستیں عالم وجود میں تھیں جن پر انفرادی طور پر راجاؤں کی حکومتیں تھیں، گرچہ یہ ریاستیں اپنے طور پر خود مختار تھیں تاہم ان سبھوں کو برطانیہ کے زیر حکومت آنا پڑا۔ یہ تو جدوجہد آزادی تھی جس نے مختلف مذاہب، ذات پات، زبان وغیرہ کے لوگوں کے درمیان جذباتی وحدت کو فروغ دیا۔

آزادی کے بعد، تقسیم کردہ ہندوستان جس میں ہندوستان کی شاہی ریاستیں ضم ہو گئیں ایک واحد دستور اور حکومت کے تحت آیا۔ ہندوستان کی وحدت، جسے کثرت میں وحدت کہتے ہیں، قائم رہی۔ مشترکہ دشمن کے چلے جانے کے بعد پھوٹ، بے اطمینانی، فرقہ وارانہ تناؤ اور افتراق پسند رجحانات بڑی تیزی سے وسیع پیمانے پر نمودار ہونے لگے۔

لسانیت : گرچہ ہندوستان ایک قوم۔ ریاست کی طرح نمودار ہوا، درحقیقت یہ تو مختلف قوموں کا اتصال یا یونین ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحتی قومیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ عام الفاظ میں تحتی قومیت کو لسانی قومیت کہا جا سکتا ہے۔

افتراق پسندی : آج قومی یکجہتی جس اہم مسئلہ سے دوچار ہے وہ ہے افتراق کا رجحان۔ اس مہلک رجحان کے لئے زمین کو زرخیز بنانے والے بہت سارے اسباب ہیں۔ یہ اسباب خاص طور پر داخلی ہیں اور براہ راست یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکمراں طبقوں کی مرتب کردہ غلط پالیسیوں کی وجہ سے یہ رونما ہوئے ہیں۔ اس خامیوں کو چالاکی اور اپنے مقصد کی برآوری کے لئے روبہ کار لانے کے سلسلے میں سامراجی طاقتیں تو تیار کھڑی ہیں۔ یہ طاقتیں ہماری مادرِ وطن کو منتشر کرنے، اسے ٹکڑوں ٹکڑوں میں منقسم کرنے، اسے غیر مستحکم بنانے، اور اگر ممکن ہو سکے تو اسے نگل جانے کے لئے موقع کا پر کھولے انتظار کر رہی ہیں۔

اس دوران مرکزی حکومت کیا کر رہی ہے۔ بلاشبہ یہ مفادات یہی خبر پرچار کر رہی ہے کہ غیر ملکی ہاتھ ہمارے دشمنوں کو دستک دے رہے ہیں۔ اگر ہم وقتاً فوقتاً مناسب بروقت اور موثر اقدامات کرتے تو کیا صورت حال اس حد تک ابتر ہو جاتی کہ ہماری وزیراعظم کو خود ان کے گھر کے احاطہ میں قتل کر دیا گیا۔ اس بات کی اہمیت تو سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک طرف تو لوگوں کے درمیان قومی یکجہتی کا پرچار کیا جاتا ہے تو دوسری طرف برسر اقتدار افراد لوگوں کو دبائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔

کشمیر میں مہاراجہ کے اور کالونیائی نظام کے خلاف جدوجہد، اس کے ساتھ ہی مقامی قومیت، کشمیری تہذیب کی مشترکہ روایت اور اس کی لسانی انفرادیت، روایات اور ثقافت، ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مذہب میں فرق کے باوجود ہندوستان سے ملحق ہو گیا۔ جن خصوصی شرائط پر یہ الحاق ہوا، اس کے پیش نظر ہمارے دستور میں کشمیر کو ایک خصوصی حیثیت دی گئی۔ لیکن شروع سے ہی ہندو لابی نے یہ مطالبہ کیا کہ ہندو اکثریت کے نظریے اور اس سے اتفاق کرنے کو اگر ضرورت ہو تو زبردستی سے، اقلیت کے لئے لازمی قرار دیا جائے۔

جارحانہ ہندو ہندوستانی قومیت نے لامحالہ ایک چھوٹے سے دستوری نقطہ کو ایک عظیم سیاسی بحران میں بدل دیا۔ ایسا شدید بحران جو کشمیر میں ہندوستانی قومیت کی بنیاد کو ہلا سکتا ہے۔

پنجاب میں بے چینی کے بیج تو اسی وقت بھی تھے جب مشرقی پنجاب کو پنجاب اور ہریانہ میں تقسیم کر دیا گیا۔ دارالسلطنت (چنڈی گڑھ) کا سوال۔ ابوہر اور فضلکا کا مسئلہ، اور دریا کے پانی کی تقسیم کا مسئلہ۔ ان تمام مسائل کو حل کئے بغیر یوں ہی لٹکا رکھ دیا گیا ہے۔ سکھ۔ ہندو اتحاد کو شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا اور قومی یکجہتی ٹوٹنے کے قریب آ گئی۔

فرقہ واریت : انگریزوں کے دور حکومت میں بہت سارے ہندو۔ مسلمان تنازعات رونما ہوئے۔ لیکن برٹش کی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی کے باوجود، آزادی کی جدوجہد کے مختلف ادوار میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھائی چارگی اور تعاون کو فروغ حاصل ہوا۔

قومی بورژوائی پارٹیاں چھوٹے موٹے سیاسی اور انتخابی فائدے کے لئے مذہبی جماعتوں کو بہلانے پھسلانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ اس ملک میں تمام صحیح معنوں میں سیکولرزم کے شیدائیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ سب قومی اتحاد کے مفادات کے لئے ایسی سیاسی موقع پرستی کے خلاف آواز بلند کریں اور اسکی مذمت کریں۔

ذات پات : ذات پات ہمارے ملک میں اپنی نوعیت کا بہت ہی قدیم سماجی نظام ہے۔ سرمایہ داری کی ترقی کے ساتھ ساتھ چیزوں کی ترقی کی وجہ سے ذات پات کے فرق کو مٹ جانا تھا۔ لیکن آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ موجود ہے۔ سرمایہ داری کی نشو و نما کے دور میں ابھرتے ہوئے بورژوا لوگوں میں "اونچی" اور "نیچی" ذاتوں کے درمیان مسابقت شروع ہو گئی، اونچی ذات کے بورژواؤں کو نیچی ذات کے بورژواؤں پر قدرتی طور پر کچھ فوقیت حاصل تھی۔ حکمران پارٹی کے زیادہ تر سربراہ اپنی اپنی ذات کے لوگوں کو منظم کر کے اور انکی رہنمائی کر کے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اقتدار اور اپنے فائدہ کیلئے بات چیت کر سکے۔

قبائلی فرقے : برسوں تک برٹش نے قبائلیوں کو باقی ہندوستان سے الگ الگ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ آزادی کے بعد بھی ہماری حکومت ان کے خصوصی مسائل اور قومی شناخت کو برقرار رکھنے کے لئے ان کی کوشش کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ ان کی سماجی اور معاشی ترقی کی طرف دھیان نہیں دیا گیا اور غفلت برتی گئی۔ ان باتوں نے مسلح بغاوت اور الگ ہونے کے مطالبات کو ہوا دی۔ غیر مساوی سلوک کو جو ان کے ساتھ کیا جاتا ہے، ختم کرنا چاہئے اور ان میں اعتماد پیدا کرنا چاہئے کہ وہ سب ہندوستان کے سماجی اور معاشی نظام کے جزو لاینفک ہیں۔

مرکز۔ ریاست تعلقات : جیسا کہ قبل ذکر کیا گیا ہے ہندوستانی قوم۔ ریاست، جغرافیائی۔ لسانی قوموں کا یونین ہے ہمارے دستور کا مقصد یہ تھا کہ اس کی نوعیت وفاقی ہو۔ لیکن بڑے سرمایہ داروں کو اپنے مفادات اور ترقی کی خاطر ہندوستان کی

یک متحدہ واحد یکساں بازار کی شکل میں ضرورت ہوئی، چنانچہ ناگوؤں نے دستور کی دفعات کا غلط طریقے سے تشریح کرنی شروع کردی اور ایسی تشریحات کی روشنی میں اقدامات کرنے شروع کر دئے۔ آہستہ آہستہ مرکز نے ریاستی حکومتوں کے اختیارات میں کاٹ چھانٹ کا کام شروع کر دیا اور اس طرح مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان تنازعات رونما ہونے لگے۔

تمام سیاسی اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھوں دھیرے دھیرے مرکوز ہونے لگے۔ حکمران پارٹی کی یونٹیں اپنی اپنی ریاست میں اپنے تنگ نظر مفادات کے لئے شعلوں کو بھڑکانے لگیں۔

ذمہ داریاں: ان تمام باتوں کو اس طرح اجاگر کیا جاتا ہے کہ جیسے ان سے ہی قومی وحدت اور یکجہتی کو خدشہ لاحق ہو گیا ہے اور مرکز میں حکمران پارٹی شور و غوغا کرنا شروع کر دیتی ہے کہ قوم خطرہ میں ہے۔ لیکن پوری صورتحال کا غائر تجزیہ صحیح مجرم کو ظاہر کر دے گا، اور یہ مجرم وہ پارٹی ہے جو ان تمام برسوں سے ملک پر حکومت کرتی آرہی ہے اور جس نے اس ملک کی ترقی کے لئے سرمایہ دارانہ راستہ کو اپنایا ہے۔ حکمران پارٹی یہ چاہتی ہے کہ ہم اس بات پر یقین کریں کہ جمہوریت انتخابات کے وسیع نظام کے ساتھ تفریق پسند طاقتوں کو پیدا کرنے کی وجہ بن جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شاید وہ غیر جمہوری بادل کی بابت سوچ رہی ہے۔ یہاں ہم اسی بات کو عیاں کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ مرکزی حکومت کی غیر جمہوری طبقاتی پالیسیاں ہیں جو ان تمام ناموافق صورت حال کی ذمہ دار ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جغرافیائی۔ لسانی قوموں کی جمہوری تمناؤں کو فرقہ واریت اور ذات پات میں یکجا کر دی جاتی ہے۔ اور یہ بات ۱۹۲۸ء میں نیشنل کانگریس میں جس اصول کو صحیح طریقہ سے اپنایا گیا تھا اس کے خلاف ہے۔

اس کا مقصد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ اختیارات اور باعزت برتاؤ کے لئے لسانی ریاستوں کے مطالبہ کو رد کر دیا جائے اور خود اپنے ان کے تمام اختیارات کو ہڑپ کر لیا جائے اور ایک مطلق العنان حکومت بنانے کے لئے آگے بڑھا جائے۔

یہ اس ملک کے تمام لوگوں کا، بلا لحاظ زبان، مذہب، ذات پات فرض ہے کہ ان دونوں انتہائی صفوں کو پرے رکھیں تاکہ ایک طرف مطلق العنان اور ڈکٹیٹرشپ کے نمودار ہونے کی اور دوسری طرف قومی انتشار کی روک تھام کی جا سکے۔

مارکس نے ۱۸۴۷ء میں کہا تھا۔ "اگر لوگ صحیح معنوں میں متحد ہونا چاہتے ہیں کہ ان کے مشترک مفادات ہونے چاہئیں اور اس مقصد کے پیش نظر کہ ان کے مفادات مشترک بن جائیں، موجودہ جائیداد نظام اور تعلقات کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا ضروری ہے، کیوں کہ ایسے جائیداد تعلقات میں چند قوموں کا دوسری قوموں سے استحصال شامل ہے ۔۔۔

بقیہ: امداد

کو ۱۰۰۰۰ روپئے امداد ایک عورت کے، جو پولس فائرنگ میں ماری گئی تھی، خاندان کو ۱۰۰۰۰ روپے دیئے۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں بھی انتظامات کئے گئے کہ متاثر افراد آسان قسطوں پر بنک کے قرض حاصل کر سکے۔

بین الاقوامی ریڈ کراس کی مغربی بنگال شاخ کے لئے ریاستی حکومت نے بردھان نگر میں ۵۳۲۴۰۰۰ روپئے کی مالیت کے ۱۱ ایکڑ پر مشتمل قطعات آراضی الاٹ کئے۔ یہاں ایک علاقائی امداد فنڈ اور تربیتی مرکز قائم کیا جائے گا۔

سیلاب اور طوفان سے متاثر لوگوں کو عارضی پناہ گاہ فراہم کرنے کے پیش نظر شعبۂ امداد یورپی معاشی کمیٹی کے تعاون سے اس ریاست کے ان دس ضلعوں میں، جو سیلاب اور آندھی طوفان سے متاثر ہوتے رہتے ہیں ۸۵ مستقل امداد کیمپ قائم کرے گا۔ ایسے اسی امدادی کیمپ کے سلسلے میں کام کاج مکمل کر لئے گئے ہیں۔

آسام سے آنے والے پناہ گزینوں کے لئے عارضی رہائشی سہولتیں اور امداد کے اقدامات کے لئے شعبۂ امداد نے ۴ کروڑ سے زیادہ روپئے صرف کئے اور ایسے پناہ گزینوں کی اپنی ریاست میں آباد کاری کے لئے ریاستی حکومت نے بہت کچھ کیا۔۔

بائیں محاذ حکومت کو دیگر ریاستوں کی تائید حاصل ہے

شدید مالی دشواریوں کے باوجود بائیں محاذ حکومت نے گوناگوں ترقی کی

نرمل بوس

مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت کے آٹھ سال مکمل ہونے پر حیدرآباد میں ۴ر تا ۶ر دسمبر ۸۵ء کو تین روزہ واسطہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں شری نرمل بوس، وزیر صنعت و حرفت حکومت مغربی بنگال نے شرکت کی۔ یہاں وزیر موصوف نے تقریر کرتے ہوئے بائیں محاذ حکومت کے تحت مغربی بنگال کی گوناگوں ترقی کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ بائیں محاذ حکومت آج بھی برسر اقتدار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے مغربی بنگال کے عوام کی تائید حاصل ہے۔ ساتھ ہی اسے دیگر ریاستوں کی بھی مسلسل تائید حاصل ہے اور اس حکومت کو گرانے کی مفاد پرستوں کی کوششوں کو ناکام بنانے میں ان ریاستوں نے ہمیشہ بائیں محاذ حکومت کا ساتھ دیا۔ وزیر موصوف کی تقریر کا متن اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے:

مغربی بنگال کی بائیں محاذ حکومت نے گزشتہ سال کے جون مہینہ میں اپنی حکومت کے آٹھ سال مکمل کر لئے اور اب اس نے اپنے نویں سال میں قدم رکھا ہے۔ ملک کے موجودہ دستوری نظام میں بائیں محاذ کا اتنے دنوں سے مسلسل برسر اقتدار رہنا ایک انوکھی سی بات ہے، لیکن ایسا ہوا، اور اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ بائیں محاذ حکومت کو مغربی بنگال کے لوگوں کی تائید حاصل ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ اسے ملک کی دیگر ریاستوں کے دوست اور جمہوری طور پر بیدار لوگوں نے، جنہوں نے مفاد پرست پارٹیوں کی بائیں محاذ حکومت کو گرانے کے لئے تمام کوششوں کے خلاف، ہمیشہ بائیں محاذ حکومت کا ساتھ دیا، کی تائید حاصل ہے۔ جب آندھرا پردیش کے عوام نے ان کی منتخب حکومت کو گرا دینے کے خلاف جدوجہد کی، تو اس وقت انہوں نے صرف اپنی ہی ریاست میں جمہوریت کو مستحکم بنانے کے لئے جدوجہد نہیں کی بلکہ اس کاز کے لئے ان کی دلیرانہ جدوجہد دیگر ریاستوں میں منتخبہ غیر کانگریسی حکومت کو بھی برسر اقتدار رکھنے میں معاون ثابت ہوئی۔

بائیں محاذ حکومت کو اس بات کا بجا طور پر فخر حاصل ہے کہ جب بدقسمتی سے ملک کے چند علاقوں میں افتراقیت، اہوائیت اور فرقہ وارانہ طاقتیں اب بھی بہت مستحکم ہیں وہاں مغربی بنگال میں تمام طبقوں کے لوگوں میں بلا لحاظ مذہب، زبان، ذات، پات اور ثقافت میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ بائیں محاذ حکومت تمام سطحوں پر قومی اتحاد کو برقرار رکھنے کو اعلیٰ ترین ترجیح دیتی ہے۔

شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے لوگوں سے کسی بھی قسم کا امتیاز برتا نہیں جاتا۔ سماج کے دیگر طبقوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی حکومت کی فراہم کردہ سہولتوں سے مکمل طور پر مستفید ہو رہے ہیں۔ بائیں محاذ حکومت ان کی معاشی اور ثقافتی زندگی میں بہتری لانے کے لئے موثر اقدامات کر رہی ہے۔

مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے، جن میں دارجلنگ کے پہاڑی علاقوں میں آباد نیپالی بھی شامل ہیں، حقوق کا مکمل طور پر

حفاظت کی جاتی ہے۔

مغربی بنگال میں امن و امان کی صورت حال کافی اچھی ہے۔
مغربی بنگال نے مرکز کے ان قوانین کو، جن میں مقدمہ چلائے بغیر لوگوں کو احتیاطی طور پر زیر حراست رکھنے کی گنجائش رکھی گئی ہے، نہیں اپنایا اور اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ احتیاطی حراست کے بغیر بھی امن و امان کی صورتحال کو مکمل طور پر بہتر حالت میں برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

اس ریاست میں اپنی حکومت کے آٹھ برسوں کے بعد بائیں محاذ حکومت کو اس بات کا اور بھی زیادہ یقین ہو چکا ہے کہ ایک ریاست میں منتخب حکومت اس وقت تک مناسب طور پر اپنے فرائض کو انجام نہیں دے سکتی، اپنے دستوری فرائض کو پورا نہیں کر سکتی اور اپنے انتخابی وعدوں کو پورا نہیں کر سکتی جب تک کہ اسے زیادہ اختیارات نہ دئے جائیں اور دستوری ڈھانچہ کے تحت اس کے لئے زیادہ مالی وسائل کی گنجائش نہ رکھی جائے اور اسی لئے اس ملک میں دیگر ریاستوں کے ساتھ ساتھ بائیں محاذ حکومت بھی مرکز۔ریاست تعلقات میں تبدیلی لانے کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہی ہے۔

ملک کے موجودہ انتظامی ڈھانچے میں غیر کانگریسی حکومتوں اور بائیں محاذ حکومت کے اختیارات بہت ہی محدود ہیں، لیکن اس کے باوجود مغربی بنگال کی بائیں محاذ حکومت کو اپنی سرگرمیوں کے مختلف میدان میں نمایاں کامرانیاں حاصل ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند کامرانیوں کا ذکر اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے۔

اصلاحات اراضی: گرچہ قبل کی کانگریسی حکومت کے دوران اصلاحات آراضی کے چند ایکٹ پاس کئے گئے تھے، لیکن انہیں روبہ عمل لانے کے لئے بہت ہی کم اقدامات کئے گئے لیکن بائیں محاذ حکومت نے اس ریاست میں اصلاحات آراضی کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے مرکوز طور پر کوششیں کی ہیں۔ اس نے انتہائی حد سے زیادہ قطعات آراضی کا کھوج لگایا اور ایسے فاضل قطعات کو پنچایتوں اور کسانوں کی تنظیموں کے ذریعہ بے زمین کسانوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ "برگہ آپریشن" کے ذریعہ برگداروں کو ان کے حقوق کو قانونی حیثیت دے دی گئی اور اسی کی وجہ سے ریاست کی دیہی معیشت میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

پنچایتیں اور میونسپلٹیاں: اس ریاست میں کانگریس کے عہد حکومت میں لمبے عرصے تک نہ پنچایتوں اور نہ میونسپلٹیوں کے لئے انتخابات ہوتے۔ لیکن اب پنچایتوں اور میونسپلٹیوں کے لئے باضابطہ مدت کے بعد انتخابات کئے جائیں گے۔ ان خود اختیار شہری اور مضافاتی اداروں کو متعلقہ قوانین میں مناسب ترمیمات لا کر زیادہ اختیارات دئے گئے ہیں تاکہ سب سے نچلی سطح تک یہ جمہوریت کے صحیح مراکز بن سکیں اور مقامی ترقی کی ذمہ داریوں کو مکمل طور پر سنبھالیں۔

ضلع پریشد سطح تک ضلع منصوبے کی تیاری کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔

تعلیم عامہ: اس ریاست میں ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک تعلیم کے میدان میں مکمل طور پر افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ سماج دشمن عناصر نے تعلیمی اداروں کو اپنے زیر اختیار کر لیا تھا اور امتحانات میں نقل کرنا عام بن چکا تھا۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باضابطہ کلاس بھی نہیں ہوتے تھے۔ امتحانات کے نتائج بھی وقت پر شائع نہیں کئے جاتے۔ بائیں محاذ حکومت نے اس صورتحال کو بالکل بدل دیا اور تعلیم کے میدان کو افراتفری سے پاک کر کے حسب معمول صورت حال کو بحال کیا۔ اب تعلیمی اداروں میں باضابطہ کلاس منعقد ہو رہے ہیں۔ امتحانات کے نتائج وقت پر شائع کئے جاتے ہیں۔ امتحانات میں نقل کرنے کی روک تھام مکمل طور پر کی گئی ہے۔

نئے قوانین کے ذریعہ یونیورسٹی تعلیم کے انتظامیہ کو جمہوری بنا دیا گیا ہے اور یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں میں انتخابات ہوئے ہیں۔

مدناپور میں ایک نئی یونیورسٹی بنام "ودیا ساگر" قائم کی گئی۔

اس کے ساتھ ہی غیر روایتی تعلیم پر بھی زور دیا گیا۔ اس سلسلہ میں کھلی یونیورسٹی کے لئے ایک بل ریاستی قانون ساز اسمبلی کی کل پارٹی سلیکٹ کمیٹی کے زیر غور ہے۔

ساری ریاست میں کلاس XII تک تعلیم مفت کر دی گئی ہے۔

اب ابتدائی تعلیم اور تمام سطحوں پر ناخواندگی کو دور کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس کے لئے غیر رسمی تعلیم کو بھی خصوصی اہمیت دی جا رہی ہے۔

۸۵-۸۶ء میں تعلیم کی مد پر بجٹ میں ۵۹۰ کروڑ روپئے کی

گنجائش رکھی گئی ہے، جو پورے بجٹ کا تقریباً ۲۳ فی صد ہے۔

صنعت: آزادی کے وقت مغربی بنگال ملک کی صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ریاستوں میں سرِ فہرست تھا۔ بعد کے عرصہ میں یہ صورتحال برقرار نہ رہی اور اس ریاست کے خلاف مرکز کی امتیازی پالیسی اس بات کی ذمہ دار ہے۔ لیکن حالیہ برسوں میں ریاست میں صنعتی فضا سازگار بن گئی اور اب اس ریاست میں سرمایہ کاری کے لئے بہت سارے صنعت کار آگے بڑھ رہے ہیں۔

گوکہ ریاستی حکومت اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ جہاں کہیں بھی ممکن ہو سکے، پبلک سیکٹر میں صنعتی یونٹیں قائم کی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی ریاستی حکومت پرائیوٹ سیکٹر کی بھی ہمت افزائی کر رہی ہے اور اس سیکٹر کے لئے بہت ساری سہولتیں فراہم کر رہی ہے۔ نیز حکومت پرائیوٹ سیکٹر کے ساتھ مشترکہ سیکٹر کی بھی کوشش کر رہی ہے۔ ریاستی حکومت نے ہلدیہ میں ایک پیٹرو کیمیکلس صنعت جس کی سرمایہ کاری کیلئے تقریباً ایک ہزار کروڑ روپیہ کی ضرورت ہوگی، کے قیام کیلئے گوئنکا کیساتھ اور بانکوڑہ میں جہاں ایک بھی صنعت نہیں ہے، ٹائیٹانیم ڈائیوکسائیڈ کے لئے، جس کی سرمایہ کاری کے لئے تقریباً ۱۰۰ کروڑ روپئے کی ضرورت ہوگی برلاؤں کے ساتھ معاہدے پر دستخط کیا۔ یہ دونوں بہت ہی بڑے اور اہم صنعتی پروجیکٹ ہیں اور ان کی وجہ سے اب یہ بات عیاں ہو چلی ہے کہ بہت ہی سازگار صنعتی ماحول قائم ہو چکا ہے۔ کلکتہ کے سالٹ لیک کے علاقہ میں الیکٹرونکس صنعت کے لئے ۸۴ ایکڑ قطعات آراضی مختص کئے گئے اور یہاں فلپس اور دیگر صنعتی اداروں نے اپنی یونٹیں قائم کیں۔ نیز اس علاقہ میں مزید ۹۵ ایکڑ قطعات آراضی الیکٹرونکس صنعت کے لئے مختص کئے گئے تاکہ دیگر صنعت کار بھی یہاں اپنی اپنی صنعتی یونٹیں قائم کر سکیں۔ کلکتہ سے تھوڑی دوری پر واقع فالتا میں برآمدات پروسیسنگ علاقہ کی ترقی کا کام تیزی سے جاری ہے۔ گرچہ ابھی صنعت کاری کے لئے جدید صنعتوں کو کافی اہمیت دی گئی ہے تاہم بائیں محاذ حکومت کے تحت اس ریاست کی روایتی صنعتوں جیسے پٹ سن، سوتی کپڑے، کیمیاوی اشیاء، انجینئرنگ اور چائے صنعتوں کی رفتار ترقی کو تیز تر کرنے کے لئے تمام ممکنہ اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ نیز بیمار یونٹوں کی احیاء کے لئے بھی اقدامات کئے گئے ہیں۔

اس ریاست میں دیہی اور چھوٹی صنعتیں خاص طور پر ہتھکرگھے نے کافی ترقی کی ہے۔ سارے ملک میں رجسٹرڈ چھوٹی صنعتوں کی تعداد مغربی بنگال میں سب سے زیادہ ہے۔

مزدور: مغربی بنگال میں مالک۔ مزدور کا رشتہ بہت ہی تشفی بخش ہے۔ بائیں محاذ حکومت نے ہمیشہ محنت کشوں کی، ان کے کاز کے لئے جدوجہد میں، تائید کی اور ان کا ساتھ دیا۔ ریاستی حکومت کی مداخلت کی وجہ سے بہت سارے صنعتی تنازعات کا باہمی بات چیت کے ذریعہ تصفیہ ہو گیا۔

بجلی: دیگر ریاستوں کی طرح مغربی بنگال بھی بجلی کی کمی سے دوچار ہے اور اس کی وجہ ماضی کی ناقص منصوبہ بندی ہے۔ لیکن بائیں محاذ حکومت نے کولہ گھاٹ، درگاپور اور دیگر علاقوں میں بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے مسلسل کوششیں کیں اور بجلی پیدا کرنے والی یونٹوں کو اچھی حالت میں برقرار رکھنے کے لئے مثبتی اقدامات کئے۔ اس کی وجہ سے بجلی کی صورت حال میں کافی بہتری ہوئی اور یہ صورت حال عنقریب مستقبل میں اور بھی بہتر ہو جائے گی۔

ثقافت: بائیں محاذ حکومت نے لوگوں کی، خاص طور پر مضافاتی علاقوں میں، ثقافتی سرگرمیوں کی نشوونما کے لئے خصوصی اقدامات کئے۔ کھیل کود اور نوجوانوں کی رفاہ کے معاملہ میں بھی حکومت نے مستحسن اقدامات کئے۔ اس سلسلہ میں سالٹ لیک کلکتہ میں یوبا بھارتی اسٹیڈیم تعمیر کیا گیا جو سارے ایشیا میں اپنی نوعیت کا سب بڑا اسٹیڈیم ہے۔

پسماندہ علاقے: بائیں محاذ حکومت سندربن، جھاڑ گرام جیسے پسماندہ علاقوں اور دارجلنگ کے پہاڑی علاقوں کی بہتری اور ترقی کے لئے خصوصی اقدامات کو تیزی سے روبہ عمل لا رہی ہے۔

زراعت، مویشیوں کی پرورش و علاج، ماہی گیری و ماہی پروری، آب پاشی، جنگلات، سیاحت، نقل و حمل، سڑکوں کی تعمیر، لازمی اشیاء کی سپلائی وغیرہ جیسے میدانوں میں بھی بائیں محاذ حکومت کی کارگزاریاں کافی تشفی بخش ہیں۔

"انعام یافتہ فلم کونی"

فلم "کونی" کو تہران میں ہونے والے چوتھے فارجر بین الاقوامی فلم تہوار میں پیش کیا جائے گا۔ اس فلم کو ۱۹۸۵ء میں بہترین فلم کا قومی انعام "سورن کمل" ملا۔ اس فلم کے ڈائرکٹر مسری سرج دے ہیں اور اسے حکومتِ مغربی بنگال نے پروڈیوس کیا ہے۔

امن اور انقلاب

بھبوتوش رائے

سطحی طور پر امن اور انقلاب کے تصورات ظاہراً ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کیوں کہ انقلاب، جو تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے، موجودہ صورتحال میں مداخلت کئے بغیر نہیں لایا جا سکتا اور موجودہ صورتحال میں گڑبڑی ہی کو لوگ امن میں خلل کہتے ہیں۔ چنانچہ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انقلاب اور امن ایک دوسرے کے پاس پاس رہ نہیں سکتے۔

ہماری یہ دنیا اب تک امیروں کے ذریعے غریبوں کے استحصال سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہوئی ہے، چنانچہ یہ خیالات اور تصورات مختلف جماعتوں یا طبقوں کے لوگوں کے لئے مختلف معنی رکھتے ہیں، اور ان کا انحصار استحصال کے طریقہ کار میں یا سلسلہ میں ایک خاص جماعت یا طبقہ کو جو مقام حاصل ہوتا ہے، اسی پر ہے۔ استحصال کرنے والے طبقہ کے لئے ان باتوں کے ایک معنی ہوتے ہیں تو استحصال کے شکار طبقہ کے لوگوں کے لئے ان باتوں کے معنی مختلف یا بالکل متضاد ہوتے ہیں۔

امن اس طرح کا ایک تصور ہے۔ ان طبقوں کے لئے جو دیگر طبقوں کے استحصال پر عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں، امن کے معنی یہ ہیں کہ ان نظاموں، انتظامات، طریقہ کار، رسومات اور دیگر متعلقہ اقدامات کو برقرار رکھا جائے اور انہیں جاری و ساری رکھا جائے جو استحصال کے سماجی طریقہ کار کو تقویت پہونچاتے ہیں اور اسے مستحکم بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان باتوں سے ذرہ برابر بھی انحراف کا مطلب امن کو توڑنا ہے۔

لیکن جو استحصال کے شکار ہیں ان کے لئے امن کی یہ تعریف کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ جہاں تک ان کے مفادات کا تعلق ہے، جتنا اس امن میں خلل ڈالا جائے گا اتنا ہی ان کیلئے بہتر ہوگا، کیوں کہ موجودہ نظام کو قائم رکھنے کے لئے عدم مداخلت کی حالت کو برقرار رکھنا ان کے لئے امن نہیں لاتا ہے۔ موجودہ نظام سماج، جہاں ان کا مسلسل استحصال کیا جا رہا ہے ان لوگوں کے لئے مصائب اور دشواریاں پیدا کرتا ہے اور ان کی زندگی سے امن اور شانتی کو چھین لیتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے امن سے مراد یہ ہے کہ طبقے میں بٹے سماج میں موجودہ نظام میں تبدیلی لائی جائے۔

کارخانہ کے مالک کی، جو مزدوروں کی پیدا کردہ قدر فاضل سے حاصل کردہ نفع پر زندگی بسر کرتا ہے اور جو مزدوروں کے زیادہ سے زیادہ استحصال سے ہمیشہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی فکر میں لگا رہتا ہے، کبھی بھی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ اس کے کارخانہ میں کسی قسم کی دشواری رونما ہو۔ اس لئے وہ ہمیشہ مزدوروں کی ہڑتال کی مخالفت کرتا ہے۔ جب مزدوروں کی اجتماعی قوت ہڑتال کی اعلان کرتی ہے، تب کارخانہ کا مالک یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کے کارخانہ میں امن میں خلل پیدا کر دیا گیا ہے۔ امن و امان کے سرپرست یعنی طبقات میں بٹے سماج میں ریاستی طاقت فوراً آگے بڑھتا ہے اور امن و امان اور شانتی کی بحالی کے نام نہاد کام کے لئے مزدوروں کے خلاف

قوت استعمال کرتی ہے اور انہیں اپنے ظلم کا نشانہ بناتی ہے۔
دوسری طرف مزدوروں کے لئے ہڑتال تو ایک آلۂ کار ہے
ان کی اپنی زندگی میں امن کی بحالی کے لئے، جس سے وہ محروم ہیں،
پیداوار کے نظام میں بھی یہی باتیں زمین کے مالکوں اور بے زمین
مزدوروں اور اسی طرح کے دیگر طبقے کے لوگوں میں نظر آتی ہیں۔
دراصل سماج کی تاریخ بذاتِ خود اپنے اپنے تصورات کے
مطابق امن قائم کرنے کے لئے مخالف طبقوں کے مابین جدوجہد کی
ایک تاریخ ہے۔

انقلاب تو مکمل تبدیلی کی دلالت کرتا ہے۔ ایک
سیاسی تصور کی حیثیت سے انقلاب کا مقصد یہ ہے کہ سماج
کے ایک دور سے دوسرے دور تک تبدیلی لائی جائے۔ تاریخ نے
بہت سارے انقلابات دیکھے ہیں لیکن تمام انقلابات کامیاب
نہیں ہوئے اور تمام کامیاب انقلابات کے ایک جیسے نتائج رونما
نہیں ہوتے۔ انقلابات کی تاریخ میں روس میں ۱۹۱۷ء کے نومبر
انقلاب کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ساری دنیا میں یہ پہلا انقلاب
تھا جس نے ایک ایسے سماج کو جنم دیا جہاں آدمی آدمی کا استحصال
نہیں کر سکتا اور سماج استحصال کے پہیوں پر مبنی نہیں ہے۔ جیسا کہ
اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے کہ طبقوں میں بٹے سماج میں استحصال
کی مشین کو جاری و ساری رکھنے کے لئے لوگوں کے امن میں خلل
ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن جب نومبر انقلاب کے بعد نئے سماج نے
استحصال کو الوداع کہا، تو اب یہ بات واضح بن چکی ہے کہ لوگوں کے
لئے امن میں کسی طرح سے خلل ڈالا جائے۔ اشتراکیتی انقلاب کے
اور اس کے نتائج میں عالم وجود میں آنے والے اشتراکیتی سماج کی
نوعیت سماج میں محنت کشوں کے لئے امن کی صورت حال پیدا کر
دیتی ہے۔

آج بنی نوع انسان مکمل تباہی کے خدشے سے دوچار
ہے۔ نیوکلیائی جنگ، خلائی جنگ، حیاتیاتی جنگ وغیرہ کیلئے
سامراجی جماعت، جس کا سربراہ ممالک متحدہ امریکہ کا ریگن انتظامیہ
ہے، کی بدنیتی سے یہ خدشہ لاحق ہو گیا ہے۔ بلاشبہ یہ سچ ہے کہ
اشتراکیتی ممالک بھی خود کو نیوکلیائی اور دیگر ہتھیاروں سے لیس کر رہے

ہیں۔ ان باتوں سے بہت سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور
اس پروپیگنڈے کو صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ سر پر
منڈلاتی ہوئی تیسری عالمی جنگ کی موجودہ خطرناک صورتحال کے لئے
سامراجی اور اشتراکیتی دونوں ہی کیمپ ذمہ دار ہیں لیکن حقیقت
اس سے مختلف ہے۔ موجودہ جنگی صورتحال تو سامراجیوں کی اور
خاص طور پر ممالک متحدہ امریکہ کی پیدا کردہ ہے۔ اشتراکیتی کیمپ
تو امریکہ کے جواب میں خود کو مسلح کر رہا ہے تاکہ امریکہ تیسری عالمی
جنگ نہ چھیڑ سکے اس لئے ہر جگہ محنت کش لوگوں کو سامراجی
کیمپ اور اشتراکیتی کیمپ کے درمیان، تباہ کن تیسری عالمی جنگ
یا امن کے لئے ان کے انفرادی کردار کی روشنی میں "فرق" کو سمجھنا
چاہئے۔ جہاں سامراجی کیمپ جنگ کے لئے خود کو مسلح کر رہا ہے،
وہاں اشتراکیتی ممالک امن کے لئے خود کو مسلح کر رہے ہیں۔ اگر جدید
ہتھیاروں کے سلسلے میں اشتراکیتی کیمپ مساوی طور پر طاقتور
نہ ہوتا تو اب تک تیسری عالم گیر جنگ چھڑ چکی ہوتی۔ لیکن کیوں؟

سرمایہ دارانہ نظام ایک جنگی معیشت کے بغیر زیادہ
دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ سرمایہ داری کا نظام مسائل پیدا کرتا ہے
جنہیں وہ خود حل نہیں کر سکتا۔ اس لئے دورٍ دور کے بعد بحران
نمودار ہوتا ہے۔ بورژوا حکومتیں عارضی طور پر اس بحران کو دور کرنے
کے لئے بہت سارے طریقہ کار اور اقدامات کو بروئے کار لاتی ہیں،
اور جنگی معیشت کو پیدا کرنا اور اسے فروغ دینا ایک طریقہ کار ہے۔

آج کی دنیا میں سرمایہ دارانہ کیمپ کے اس بحران سے
باہر نکل آنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس سرزمین سے اشتراکیتی
نظام کو مٹا دیا جائے۔ جب ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑی، تو دنیا
کو ایک ایسا نظام دیکھنا تھا جہاں استحصال کے بغیر زندگی گذارنا
ممکن تھا۔ جب ۱۹۳۹ء میں ہٹلر کے تحت فاشسٹ جرمنی نے
دوسری عالم گیر جنگ چھیڑ دی تو اس وقت سویت روس کی اشتراکیتی
ریاست نہ صرف عالم وجود میں آ چکی تھی بلکہ اس کے قبل کے بیس
سال سے زائد عرصہ سے وہ اپنی بقا کے لئے سرگرم عمل تھی کیوں
کہ اس عرصے میں اندرون ملک رجعت پسند عناصر اور بیرونی ملک کے
سامراجیوں نے اسے مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن ان سبھوں کو

ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔
فاشسٹ جرمنی نے ایسی پالیسی کو روبہ عمل لایا تھا
جس کی وجہ سے دوسری عالمی جنگ میں سرمایہ دارانہ ریاستوں
کو جرمنی کے خلاف متحد ہو جانا پڑا تھا اور ان کا یہ اتحاد اس وقت
بھی برقرار رہا جب ہٹلر نے سوویت روس پر دھاوا بول دیا تھا
تاکہ دنیا کی پہلی اشتراکیتی ریاست کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔
لیکن دوسری عالمی جنگ میں روس کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور
ساری دنیا میں محنت کش طبقوں میں اشتراکیتی نظام سے اور بھی
گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ دوسری عالمی جنگ میں روس کے تقریباً ۲۰ء۲
کروڑ افراد نے اپنی جان عزیز کی قربانیاں دیں۔ سوویت روس
نے اپنی معیشت کی نو تعمیر میں اشتراکیت کی حیرت انگیز طاقت
کا مظاہرہ کیا۔ اس سے اشتراکیتی نظام کی سرمایہ دارانہ نظام
پر برتری کا کافی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام علاقوں میں
زیادہ سے زیادہ مظلوم اور محنت کش لوگ اشتراکیتی نظام سے
منسلک ہوتے گئے، اور اس طرح زیادہ سے زیادہ اشتراکیتی
ریاستیں عالم وجود میں آئیں۔ چین، ویت نام اور اس کے آس
پاس کے ملکوں نے اشتراکیت کو اپنایا اور اس طرح ایک عظیم
اشتراکیتی کیمپ عالم وجود میں آیا جس سے سرمایہ داری کے
استحصال کرنے کے نظام کے وجود کو کافی خدشہ لاحق ہو گیا۔

اب سامراجیت کو اشتراکیت کا قلع قمع کرنے
کے لئے طریقہ کار کی بابت سوچنا پڑا۔ چنانچہ جنگ اب پھر سامراجیت
کے دھاگے سے بندھے تمام ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کے لئے
ایک ضروری نعرہ بن گئی۔ ممالک متحدہ امریکہ نے جو سرمایہ دار ملکوں
کا سب سے زیادہ طاقت ور ملک ہے، اس سلسلہ میں سربراہی کی،
جیسا کہ جرمنی نے ہٹلر کے تحت سائنسی علم و ایجادات کو صرف جنگ
کے لئے مرکوز و مخصوص کر دیا تھا۔ اسی طرح آج ہم سب پھر
ممالک متحدہ امریکہ اور دیگر سامراجی ملکوں میں وہی مناظر دیکھتے
ہیں۔ آج سائنس کی نئی نئی تکنیکیں دریافت اور ایجاد کی جا رہی
ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کو تباہ و برباد اور ختم کر دیا
جائے۔ صرف نیوکلیائی جنگ کافی نہیں ہے بلکہ بہت ہی شدید قسم
کی کیمیائی جنگ اور خلا میں جنگ کا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے اور
خلائی جنگ کے لئے سائنس کی دریافتوں کے رخوں کو موڑا جا
رہا ہے۔

اشتراکیتی کیمپ، خاص طور پر سوویت روس جنگ
سے پرہیز کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ کیوں کہ وہ یہ جانتا
ہے کہ اب جنگ کے معنی انسانی تہذیب کی اور ان تمام چیزوں کی
جنہیں ہزاروں ہزار برس کی محنت، جدوجہد اور ایثار کے ذریعہ
لوگوں نے تیار کیا تھا، مکمل تباہی ہیں۔ ساری دنیا کے لاکھوں
لاکھ لوگ جن میں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک یعنی وہ ممالک جو
جنگ کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں، کے لوگ بھی شامل ہیں، جنگ
کے خلاف اور امن کے لئے اس جدوجہد میں شریک ہو چکے ہیں۔

لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ امن
کے لئے موجودہ جدوجہد درحقیقت ایک نیوکلیائی جنگ سے ایک
ایسی جنگ جس سے انسانی تہذیب کی بقا کو خدشہ لاحق ہو گیا
ہے، گریز کرنے کی جدوجہد ہے۔ جب تک سرمایہ دارانہ نظام
یعنی طبقات میں بٹے سماج کا نظام، جہاں ایک چھوٹا سا طبقہ
اکثریتی طبقہ کا استحصال کرتا ہے قائم رہے گا، جنگ کا خدشہ
ہمیشہ لاحق رہے گا۔ محنت کش طبقوں کیلئے صحیح معنوں میں امن اسی
وقت قائم ہو سکتا ہے جب ساری دنیا میں طبقوں میں بٹے
سماج کی جگہ اشتراکیتی سماج لے لے۔ اشتراکیتی سماج سے
مراد یہ ہے کہ ایسا سماج جہاں لوگوں کو زندگی اور روزگار کا تحفظ
حاصل ہو، جہاں بھوک اور جہالت کو ہمیشہ کے لئے دور کر دیا گیا ہو
اور کام کرنے کے حق کو بنیادی ضمانت دی گئی ہو۔ ایسا کرنا انقلاب
کا کام ہے۔ انقلاب کے بغیر نفع پر پرائیویٹ جائیداد ملکیت پر
مبنی سرمایہ دارانہ سماج کو پرائیویٹ جائیداد ملکیت کو ختم کر دینے
تمام ذرائع پیداوار کو عوامی ملکیت میں شامل کرنے اور پیداواری
مشینوں کو ذاتی فائدہ کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کے مفاد کیلئے
چلانے پر مبنی اشتراکیتی نظام میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔
جنگ کا خطرہ اس وقت ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا جب ساری
دنیا میں استحصال پر گزر بسر کرنے والا کوئی ملک نہ ہوگا۔ اسے
(باقی صفحہ ۱۴ پر)

امداد

مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے تقریباً ہر سال ریاستی حکومت کے شعبہ امداد اور رفاہ کو شدید ترین سیلاب، خشک سالی اور آندھی طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔

جون ۱۹۷۸ء میں مسلسل بارش کی وجہ سے مغربی بنگال کے ۱۱ اضلاع کے بیشتر علاقے زیر آب ہو گئے۔ قبل اس کے کہ ان علاقوں میں امداد کے کام کو مکمل کیا جاتے ۱۹۷۸ء کے تباہ کن سیلاب نے اس ریاست کی شہری اور دیہی زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ ۱۹۷۹ء میں چند اضلاع کو خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا اور ۱۹۸۰ء میں بہت سارے علاقوں کو سیلاب اور مٹی کے کٹاؤ سے دوچار ہونا پڑا۔ اضلاع ۲۴ پرگنہ اور مدناپور کے بہت سارے علاقے آندھی اور طوفان کی زد میں آ گئے اور اس کی وجہ سے ان علاقوں میں کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ ریاست ان نقصانات سے ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اسے ۱۹۸۴ء میں بہت ہی زبردست سیلاب سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سیلاب سے ریاست کے مضافاتی علاقوں اور وہاں کے لاکھوں لوگوں کو کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس کا اثر دھان کی فصل پر پڑا اور اس سال دھان کی پیداوار میں بہت زیادہ کمی ہوئی اور گزشتہ ۲۷ برسوں میں اتنی کم پیداوار کبھی نہیں ہوئی۔

۸۳-۸۴ء میں لوگوں کو آندھی، طوفان، مٹی کے کٹائی اور سیلاب کی وجہ سے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۸۴-۸۵ء کے جون مہینہ میں مسلسل بارش ہوئی۔ اتنی بارش گزشتہ صدی میں کبھی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ستمبر میں پھر سیلاب آیا، جس نے لاکھوں لاکھ لوگوں کو بے گھر کر دیا اور نان نفقہ کا محتاج بنا دیا۔

ان آفات ناگہانی کے بار بار رونما ہونے سے دیہی عوام کو ناقابل برداشت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ریاستی حکومت داد و تحسین کی مستحق ہے کہ اس نے بہت ساری دشواریوں کے باوجود بہت ہی جلد اور موثر امدادی اقدامات کر کے متاثر لوگوں کی تکالیف اور دشواریوں کو بہت حد تک دور کر دیا۔ ان تمام برسوں میں ریاستی حکومت نے امداد کے اقدامات پر کل ۱۷۶۴۹۱۴۰۰۰ روپئے یعنی سالانہ ۲۲ کروڑ سے زیادہ روپئے خرچ کئے۔

اس موسم میں جب کاشتکاری کا کام نہیں ہوتا مضافات کے لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے ریاستی حکومت ۷۷-۷۸ء سے ۸۰-۸۱ء تک "کام کے لئے خوراک پروگرام" اور ۸۱-۸۲ء سے ۸۴-۸۵ء تک "مضافاتی روزگار اسکیم" کے تحت پروگرام کو بحسن و خوبی پایہ تکمیل تک پہونچایا۔ ریاستی حکومت نے ان پروگراموں کے تحت ۵۱.۷۲۰۰۰۰ روپئے خرچ کئے اور ۳ لاکھ میٹرک ٹن چاول گیہوں تقسیم کئے۔ ان اقدامات نے غریب مضافاتی عوام کو مصائب سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ ان مضافاتی علاقوں میں بہت سارے مستقل اثاثے بھی پیدا کئے۔

ان پروگراموں کے ذریعہ ۷۷-۷۸ء سے ۸۴-۸۵ء کے دوران ۷۷۵۶۲ پرانی سڑکوں کی مرمت کی گئی۔ ۵۴۲۰ نئی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ ۴۸۲۰ نہریں اور تالاب کھودے گئے یا ان کی از سر نو کھدائی کی گئی۔ چھوٹی آبپاشی کی ۱۳۷۲۲۱ اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا گیا، ۷۵۲۴ بند کی از سر نو تعمیر کی گئی اور سیلاب میں منہدم ہونے والے ۱۲۴۵۰۰۰ مکانات کی مرمت کی گئی یا نو تعمیر کی گئی اور تقریباً ۲۰ ہزار دیگر اسکیموں کو بھی پایۂ تکمیل تک پہونچایا گیا۔

اکتوبر ۱۹۸۴ء میں آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے قتل کے بعد رونما ہونے والے فسادات میں دس سکھ مارے گئے۔ شعبۂ امداد نے ہر مقتول سکھ کے خاندان

(باقی صفحہ ۵ پر)

حج ۱۹۸۶ء کی بابت اعلانیہ

ریاستی حج کمیٹی، مغربی بنگال نے ۱۹۸۶ء میں عازمین حج کے لئے مندرجہ ذیل پروگرام کا اعلان کیا ہے:

روانگی:

جہاز کا نام	بمبئی سے روانہ ہونے کی تاریخ۔	جدہ میں پہونچنے کی تاریخ
۱۔ ایم۔وی۔اکبر	۱۵ر جون ۸۶ء	۲۵ر جون ۸۶ء
۲۔ ایم۔وی۔اکبر	۶ر جولائی ۸۶ء	۱۶ر جولائی ۸۶ء
۳۔ ایم۔وی۔اکبر	۲۷ر جولائی ۸۶ء	۶ر اگست ۸۶ء

واپسی۔

جہاز کا نام	جدہ سے روانہ ہونے کی تاریخ	بمبئی میں پہونچنے کی تاریخ
۱۔ ایم۔وی۔اکبر	۲۳ر اگست ۸۶ء	یکم ستمبر ۸۶ء
۲۔ ایم۔وی۔اکبر	۱۳ر ستمبر ۸۶ء	۲۲ر ستمبر ۸۶ء
۳۔ ایم۔وی۔اکبر	۴ر اکتوبر ۸۶ء	۱۳ر اکتوبر ۸۶ء

جہاز کی روانگی کی مندرجہ بالا تاریخوں میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

کرایہ اور دیگر اخراجات: جہاز کا کرایہ مقرر کرنے کی بات حکومت ہند کے زیر غور ہے۔ اس لئے عازمین حج کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بنک کلاس کے لئے ۲۷۵۰ روپئے کا معہ بی پی ٹی اور حج کمیٹی فیس کے لئے ۱۳۲ر روپئے یعنی کل ۲۸۸۲ روپئے کا اور فرسٹ کلاس کے لئے ۶۵۲۵ روپئے معہ بی پی ٹی اور حج کمیٹی فیس اور ایف ٹی ٹی ۳۴۶ روپئے یعنی کل ۶۸۷۱ روپئے کا بنک ڈرافٹ بطور پیشگی رقم ریاستی حج کمیٹی مغربی بنگال کے نام بھیج دیں۔ یہ بنک ڈرافٹ اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی کسی بھی شاخ سے یا سینٹرل بنک آف انڈیا کی کسی بھی شاخ سے بھیجے جا سکتے ہیں۔

بنک کلاس میں سفر کرنے کے خواہاں ہر درخواست کنندہ سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ وہ کلکتہ میں "حج گھر" کی تعمیر کے سلسلے میں ریزرو فنڈ کے لئے پوسٹل آرڈر کی شکل میں ایک سو روپئے بطور عطیہ دے۔ اسی طرح فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے خواہاں ہر درخواست کنندہ سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس مقصد کے لئے ۲۰۰ روپیہ بطور عطیہ دے۔ پوسٹل آرڈر میں کلکتہ حج ہاؤس فنڈ درج کریں۔ کراس پوسٹل آرڈر قبول نہیں کئے جائیں گے۔ عطیے کے اعلانیہ کا مقصد یہ ہے کہ عازمین حج کو رہائش کی مناسب سہولتیں فراہم کرنے کے لئے کلکتہ "حج گھر" کی تعمیر کے کام کو جلد از جلد مکمل کر لیا جائے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ۱۶ سال سے کم عمر کے بچہ کو کسی بھی حالت میں حج کو جانے والوں کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں ہے۔

غیر ملکی زرمبادلہ: فی الحال حج کو جانے والے لوگوں کو فی کس ۴۱۰۰ سعودی ریال زرمبادلہ کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ اتنے ریال کتنے ہندستانی روپئے کے برابر ہیں۔ اس کا بعد میں اعلان کیا جائے گا۔

درخواست داخل کرنے کا طریقہ: (۱) عازمین حج ۱۹۸۶ء کے لئے مقررہ فارم میں درخواستیں داخل کریں۔ درخواست کی دو کاپیاں مکمل کر کے بحری سفر کے لئے بنک ڈرافٹ کے ساتھ جس کا اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے: رجسٹرڈ پوسٹ سے سکریٹری، ریاستی حج کمیٹی، مغربی بنگال، ۱۰ اسٹرس بلڈنگ، بلاک نمبر ۱، کلکتہ ۱۰۰۰۱ کے نام بھیجیں۔ سائیکلو اسٹائیل میں چھپا ہوا ایک الگ فارم بھی حج دفتر سے سپلائی کیا جائے گا اور درخواست کنندہ اس فارم کو پُر کر کے درخواست کے ساتھ داخل کریں۔

(۲) درخواست کنندگان سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ہر درخواست پر اپنی پاسپورٹ سائز تصویر چسپاں کر دیں اور درخواست کے ساتھ اپنی تصویر کی پانچ کاپیاں بھیجیں اور ہر تصویر کے پیچھے کی طرف اپنا پورا نام اور پتہ درج کریں۔ اس طرح کی ایک تصویر سائیکلو اسٹائل سے چھپے فارم کے ساتھ بھی منسلک کر دیں۔

(۳) عورتوں کو بھی اپنی درخواستوں کے ساتھ اپنی اپنی

تصویر چسپاں کرنی ہوگی ۔ حج کو جانے والی کسی بھی عورت کو محرم کے بغیر حج کے لئے روانہ ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی ۔

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ :

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ر جنوری ۱۹۸۶ء ہے ۔ تمام درخواستیں رجسٹرڈ ڈاک سے سکریٹری ، ریاستی حج کمیٹی ، مغربی بنگال ، رائٹرس بلڈنگس ، کلکتہ ۷۰۰۰۰۱ کے نام ۱۵ر جنوری ۱۹۸۶ء کو یا اس سے قبل پہونچ جانی چاہئیں ۔ اس کے بعد موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا ۔

مقررہ درخواست فارم اور جہاز کے ذریعہ ۱۹۸۶ء میں حج کی بابت مفصل معلومات ، اضلاع کوچ بہار ، مغربی دیناج پور ، مالدہ ، مرشدآباد ، ندیا ، بردوان ، بیربھوم اور مدناپور کے ضلع ہیڈکوارٹرس میں اور ضلع ہگلی کے آرام باغ کے سب ڈویژنل ہیڈکوارٹرس میں "حاجی احباب" سے حاصل کریں ۔ ایک سال میں ایک خاندان کے زیادہ سے زیادہ پانچ ممبران درخواستیں داخل کر سکتے ہیں ۔

حج دفتر ، رائٹرس بلڈنگس ، کلکتہ ۱ سے ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۵ء سے درخواست کے مقررہ فارم سپلائی کئے جارہے ہیں ۔ صرف ریاستی حج کمیٹی مغربی بنگال کے دفتر سے جاری کردہ درخواست فارم کو قبول کیا جائے گا ٭٭٭

بقیہ : امن اور انقلاب

لئے یہ صرف انقلاب ہے جو مستقل امن لا سکتا ہے ۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھیں تو انقلاب امن کا مخالف نہیں ہے ۔ اسی لئے نیوکلیائی جنگ سے پرہیز کرنے کے لئے موجودہ جدوجہد کے ساتھ انقلاب کیلئے بھی جدوجہد ہونی چاہئے ۔ یا یوں کہئے کہ ساری دنیا میں ایک اشتراکیتی سماج کے قیام کے لئے جدوجہد ہونی چاہئے ۔ اس طرح انقلاب اور امن ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں ۔

یہاں اس بات کو زیر غور رکھنا چاہئے کہ ساری دنیا میں اشتراکیتی سماج کے لئے جدوجہد ، تیسری عالمی جنگ کے خلاف امن کے لئے موجودہ دور میں جدوجہد سے پرہیز نہیں کر سکتی اور نہ اس سے کترا سکتی ہے ٭٭٭

کلکتہ پولیس کا نیا ٹیلی فون نمبر

خدمت میں اور بھی بہتری لانے کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ لال بازار پی بی ایکس کے آئی رسی جنکشن لائنوں کو ۲۲-۱۰ ایکسچینج سے ۲۵-۱۰ ایکسچینج میں منتقل کر دیا جائے اور لال بازار پی ۔ بی ۔ ایکس کا نیا ٹیلی فون نمبر ۲۵-۵۹۰۰ (۱۵ لائن) ہے اور کنٹرول روم پی ۔ بی ۔ ایکس نمبر ۱۱۳۳-۲۲ کی جگہ نیا نمبر ۲۵-۳۳۴۰ (۵ لائن) ہے ۔ کلکتہ ٹیلی فونس نے یکم دسمبر ۱۹۸۵ء سے یہ تبدیلی کی ۔

دیگھا میں سیاحوں کی رہائش گاہوں کا کرایہ

ریاستی حکومت نے یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے دیگھا میں سیاحوں کی مختلف رہائش گاہوں کا کرایہ از سر نو مقرر کیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ۔

(۱) اپرجیت کوٹجس (پرانے کوٹجس)
- (الف) دو کمروں کا کوٹج — ۴۰ روپئے
- (ب) ایک کمرہ کا کوٹج — ۲۵ روپئے

(۲) نیا گیسٹ کاٹجس (نئے کوٹجس)
- (الف) دو کمروں کا کاٹج — ۴۰ روپئے
- (ب) ایک کمرہ کا کاٹج — ۲۵ روپئے

(۳) نرالا :-
- (الف) یک منزلہ فلیٹ — ۲۵ روپئے
- (ب) دوسری منزل کے فلیٹ ۔ ۳۵ روپئے
- (ج) تیسری منزل کے فلیٹ ۔ ۳۰ روپئے

(۴) مانیجو (۱۴ یونٹ) ۔۔ ہر یونٹ ۴۰ روپئے

(۵) جیاینٹ اور سنجوجنہ عمارت (آنندم) فی سیٹ ۔
- (الف) یک منزلہ — ۳ روپئے (فاضل فی کس ۔ ۲ روپئے)
- (ب) دوسری منزلہ ۔ ۵ روپئے (فاضل فی کس ۔ ۲ روپئے)

(۶) چینکا (صبح ۶ بجے سے شام کے ۶ بجے تک) ۔ ۱۲۵۰ روپئے فی کرایہ میں بجلی اور دیگر سہولتوں کے تمام چارجات شامل ہیں ۔



انڈین لیدر ٹکنالوجسٹس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام لیکسپو - IX کی افتتاحی تقریب میں وزیر بلدیات و شہری ترقیات شری پرسنتا سور تقریر کرتے ہوئے۔ دیہی اور چھوٹی صنعت کے وزیر ریاست۔ انچارج شری پرولائی تالکدار، انڈین لیدر ٹکنالوجسٹس ایسوسی ایشن کے صدر شری سنجے سین اور وزیر صنعت و تجارت شری نرمل بوس بھی بیٹھے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں ——————— نیچے، وزرائے موصوف شری پرسنتا سور اور پرولائی تالکدار لیکسپو تھیم پویلین کا معائنہ کرتے ہوئے۔



Postal Regd. No. WB/ CC-52
Vol—33 No.—1
PRICE—12 Paise

MAGHREBI BANGAL
1st January 1986



مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت کے آٹھ سال مکمل ہونے کے سلسلے میں بنگلور میں منعقدہ تقریب میں ریاستی وزیر اطلاعات و ثقافتی امور شری پربھاش پھودیکار تقریر کرتے ہوئے۔ (نیچے): اس موقعہ پر منعقدہ ایک نمائش کا وزیر موصوف معائنہ کرتے ہوئے



Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azam
Published by the Information & Cultural Affairs Department. Govt. of West Bengal and Printed by M/s. G. R. T. Printers. 54/1C. Shyampukur Street, Calcutta-700 004.

مغربی بنگال

۱۵ر جنوری سنہ ۱۹۸۶ء

پندرہ روزہ

مغربی بنگال

کلکتہ

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

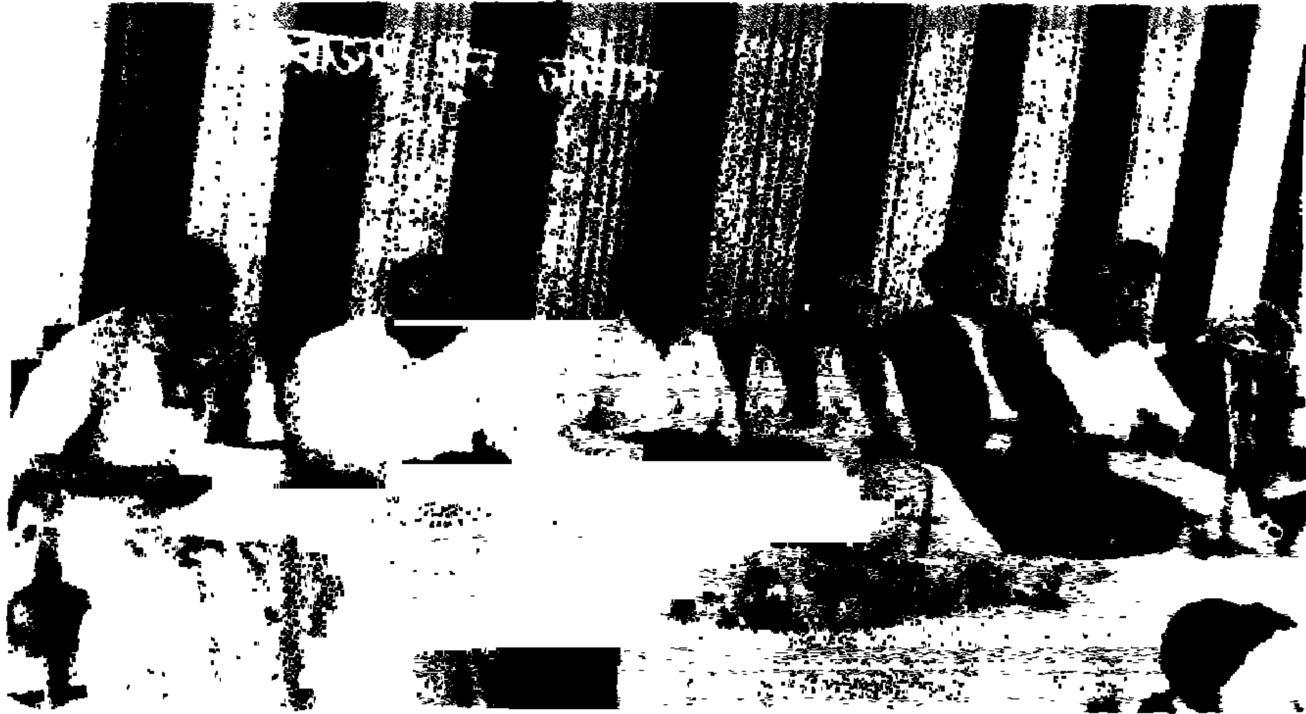
جلد نمبر ۳۳ ★ ۱۵ جنوری ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۲

شرحِ خریداری

قیمت : بارہ ۱۲ پیسے فی پرچہ
سالانہ : تین روپئے

ترسیلِ زر کا پتہ

بزنس منیجر!
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومتِ مغربی بنگال
۲۳- آر این مکھرجی روڈ - کلکتہ - ۷۰۰۰۰۱



کلکتہ سالٹ لیک اسٹیڈیم میں " راجیہ جوبو اُتسو " کی افتتاحی تقریب ـــــــ اس تقریب کا افتتاح شری جیوتی باسو نے کیا۔
تصویر میں (بائیں سے) شری سبھاش چکرورتی، وزیر شعبۂ نوجوان اور کھیل کود۔ شری اوچنت رائے وزیر شعبۂ جنگلات۔
شری پرسنتا سور، وزیر بلدیات و شہری ترقیات۔ وزیر اعلیٰ جیوتی باسو اور شری کمل باسو میئر کلکتہ کارپوریشن۔

بین الاقوامی نوجوان سال : ایک جائزہ

از :—— انجن بھیرا

نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کے لئے پروگرام کی تکمیل کے کام کو حال ہی میں مکمل کیا گیا ہے۔ تہوار اور تقریبات کے بارہ مہینے گزر چکے اور یہ تاریخی اہمیت کے ایک بامعنی نشان چھوڑ گئے۔ اقوام متحدہ کا یہ فیصلہ کہ گزشتہ سال کو نوجوانوں کے سال کی طرح منایا جائے، سیاسی اور سماجی زندگی میں نوجوانوں کے بڑھتے ہوئے کردار اور بنی نوع انسان کی سماجی ترقی میں کامرانی حاصل کرنے کی عکاسی کرتا ہے۔ گزشتہ سال ہم نے فاشزم پر فتح کی چالیسویں سالگرہ شاندار طریقے سے منائیں، کیونکہ فاشزم دنیا کی سیاسی تاریخ کا بہت ہی مہیب رُخ ہے۔ گزشتہ سال اقوام متحدہ کے عالم وجود میں آنے کا چالیسواں سال تھا۔ نیز گزشتہ سال ناوابستہ تحریک نے بھی اپنے ۲۰ ویں سال مکمل کر لئے۔

اس طرح یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ ان تمام اہم واقعات نے بلاشبہ نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کیا۔

نوجوان اور اقوام متحدہ:

جب سنہ ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ تنظیم قائم کی گئی تو اس وقت ساری دنیا میں نوجوان نسل کے مسائل پر شدید غور کیا گیا، لیکن گزشتہ دہائی میں اس سلسلہ میں ایک بھی قابلِ ذکر پروجیکٹ یا اسکیم کو روبہ عمل لایا نہیں گیا۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں اقوام متحدہ نے "نوجوانوں" کی یوں تعریف کی "بارہ تا پچیس سال کی عمر کے لوگوں کو نوجوان کہتے ہیں"۔ اس دور میں بچپن کا آخری دور، بلوغ اور نوجوان بالغ شامل ہیں۔ نیز اس عمر کے لوگوں کو، جو اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں، ساتھ ہی ان نوجوانوں کو بھی جنہوں نے شادی کر لی اور جن کے بچے بھی ہیں، نوجوانوں میں شامل کیا جائے گا۔

"نوجوان" کے تصور کی ثقافتی نقطۂ نظر سے تشریح کی جا سکتی ہے، لیکن ساری دنیا میں مختلف ملکوں نے اس کی مختلف تشریحیں کیں۔ اس عرصہ میں یو۔این۔او نے مختلف ملکوں کی اس سلسلے میں ہمت افزائی کی کہ وہ ایک ٹھوس قومی نوجوان پالیسی کو اپنائیں۔ یونیسکو کے تحت خاص طور پر اس مقصد کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کیا گیا۔ یونیسکو نے نوجوانوں کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ دی۔ یونیسکو جنرل کانفرنس کے ۲۱ ویں اجلاس میں نوجوانوں کے مسائل کے لئے ایک لمبے عرصہ یعنی سنہ ۷۷ء سے سنہ ۸۲ء تک کے منصوبہ کو اپنایا گیا۔ ۷ ار دسمبر سنہ ۱۹۷۹ء کو یو۔این۔او نے بین الاقوامی نوجوان سال منانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلہ میں چند خصوصی پروگراموں (یو این دستاویز ۳۶/۲۱۵ اے) کو تین دور میں پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی منظوری دی۔ وہ پروگرام یہ ہیں: قومی اور علاقائی سطحوں پر نوجوانوں کی شرکت میں اضافہ، روزگار کے امکانات میں اضافہ، تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت وغیرہ کے امکانات کا تعین، دماغی صحت عامہ، تعلیم، تغذیہ، خاندانی منصوبہ بندی کے لئے بین جماعتی سرگرمیوں اور خود احتسابی وغیرہ کی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے رفاہی خدمات کا فروغ۔

یو۔این۔او کا بین الاقوامی نوجوان سال کیلئے نعرہ "شرکت، ترقی اور امن" مذکورہ پروگراموں کا لب و لباب ہے اور یہ تمام ملکوں خاص طور پر ترقی کی راہ پر گامزن ملکوں کی نوجوان نسل کی فوری ضرورتوں کی عکاسی کرتا ہے۔

آج کی دنیا کے نوجوان :

ساری دنیا میں نوجوانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ دنیا کے ہر پانچ افراد میں ایک فرد ۱۵ تا ۲۴ سال کا ہوتا ہے۔ یو۔ این۔ او کے ماہرین کے مطابق آج ساری دنیا میں ۱۵ تا ۲۴ سال کی عمر کے نوجوانوں کی تعداد ۹۲،۲۲ کروڑ ہے۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں انکی تعداد ۶۷،۱ کروڑ تھی۔ ایک قیاس کے مطابق اس صدی کے آخر میں نوجوانوں کی تعداد ۱۰۰ کروڑ سے زیادہ ہو جائے گی۔

نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کے سلسلے میں سنہ ۱۹۸۰ء میں نوجوانوں کی بابت تیار کردہ ایک رپورٹ میں یو۔ این کے سکریٹری جنرل نے یہ باتیں بتائیں۔ اس رپورٹ میں یہ بتایا گیا کہ ایشیا میں سب سے زیادہ نوجوان یعنی ۶۰ فیصد نوجوان رہتے ہیں۔ اس کے بعد افریقہ میں ۱۱ فیصد، لاطینی امریکہ میں ۹ فیصد، یورپ میں ۸ فیصد اور شمالی امریکہ میں ۵ فیصد نوجوان ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام اور نوجوان :

ہم یہ جانتے ہیں کہ سماج میں ابھرتی ہوئی نسل کے مقام کا انحصار ریاست کی نوجوان نسل کے سلسلہ میں پالیسی پر ہے۔ آج ریاست۔ اجارہ دار سرمایہ دارانہ نظام میں پرولتاریتی طبقہ کی جدوجہد کے مسائل اور نوجوانوں کے سماجی سیاسی جدوجہد کے مسائل ایک دوسرے سے گھل مل گئے ہیں۔ حالیہ برسوں میں مغربی ممالک میں کتابوں کی دکانیں آج کے نوجوانوں کے مسائل پر لکھی کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ معاشی زندگی اور سرگرمیوں میں آج کے نوجوان جو کردار ادا کر رہے ہیں، ان کے پیش نظر ہم خود ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ ملکوں کے نوجوانوں کو کن کن سماجی اور معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یو۔ این کی رپورٹ کے مطابق نوجوانوں کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو سرمایہ دارانہ ملکوں میں سماجی۔ معاشی بحران سے زیادہ سے زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ان ملکوں میں بے روزگاری کی شرح بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ سنہ ۱۹۸۱ء میں چند یورپی ممالک میں بے روزگاری ۴۰ تا ۵۰ فیصد تھی۔ جزوی روزگار، اپنے کام سے غیر تشفی، کام کرنے کے لئے ناکافی سہولتیں، کام کی تعداد کی بابت شک وغیرہ جیسے مسائل کو آج کافی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں معاشی افزائش کی شرحوں میں کمی کی وجہ سے نوجوانوں کے لئے روزگار کے نئے مواقع میں کافی کمی ہوگئی ہے۔ مغربی یورپ اور ممالک متحدہ امریکہ میں ۱۵ تا ۲۴ سال کی عمر کے ۲۰ کروڑ سے زیادہ نوجوان آباد ہیں، لیکن ان میں سے صرف ۴۰ فیصد برسرروزگار ہیں۔ فرانس اور ممالک متحدہ امریکہ میں برسرروزگار لوگوں میں ۲۰ فیصد افراد نوجوان ہیں اور جاپان میں برسرروزگار نوجوانوں کی تعداد ۴۰ تا ۴۵ فیصد ہے۔ اگر کناڈا کے بے روزگار لوگ ایک صف میں کھڑے ہو جائیں تو وہ صف ۹۰۰۱ میٹر لمبی ہوگی۔ برطانیہ میں ۱۵ تا ۲۴ سال کی عمر کے بے روزگار نوجوانوں کی تعداد اسی جماعت کے باہر کے گروپ کے بے روزگاروں کی تعداد کی دگنی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس ملک میں ۱۸ سال کی عمر کے جتنے نوجوان ہیں ان میں سے نصف بے روزگار ہیں۔ اسکولوں کی پڑھائی چھوڑنے والے ۴۰۰۰۰۰ نوجوانوں کے لئے سالانہ ۱۰۰ کروڑ پونڈ مختص کئے جاتے ہیں۔ اب تک اس ملک میں بے روزگار نوجوانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہی ایک اہم کوشش ہے لیکن اس نئے پروگرام نے بھی مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ تربیت پانے والے پانچ افراد میں صرف دو کو روزگار ملنے کی امید ہے۔ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کے استحصال پر مبنی سرمایہ دارانہ طبقاتی تعلقات سے رونما ہونے والی سرمایہ دارانہ تردید ہی بے روزگاری کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی بہت ساری سماجی وجوہ بھی ہیں۔

سائنسی اور تکنکی ترقی کے ساتھ ساتھ تعلیم معاشی افزائش کا بہت ہی اہم جزو بن گئی ہے اور یہ معاشی تبدیلی تیزی سے اثرانداز ہو رہی ہے لیکن آج بھی سرمایہ دارانہ ملکوں میں ناخواندگی بہت ہی شدید مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق اس دنیا میں ۸۰ کروڑ لوگ ایسے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ ان میں سرمایہ دارانہ ملکوں میں ۶ تا ۱۱ سال کی عمر کے ۱۰ کروڑ بچے شامل ہیں جن میں اسکولوں میں جانا نصیب

نہیں ہوا۔ یو۔این۔او کے تخمینہ کے مطابق ممالک متحدہ امریکہ کا شمار تعلیمی سطح پر ۴۹ویں نمبر پر آتا ہے۔ اس مسئلہ سے قومی اقلیتیں بہت ہی شدید طور پر دوچار ہیں۔ سرمایہ دارانہ تعلیمی نظام محنت کش عوام کے لئے تعلیم کے سلسلے میں حسب ضروری سہولتیں فراہم نہ کر سکا۔ درحقیقت اس نظام کا مقصد ہی یہ ہے کہ مختلف معاشی، سماجی طبقوں کے نوجوانوں کو مختلف سطحوں کی تعلیم فراہم کی جائے۔ یہ تو ایک سماجی ٹھپا ہے، جو بورژوا کی کے لئے فراہم کردہ سہولتیں کی عکاسی کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ ملکوں میں حکمران بورژوازی کا ایک اہم ہتھیار یہ تھا کہ وہ اپنے زر خرید ماہرین کے ذریعہ نوجوانوں کے دل و دماغ میں تصوراتی زہر آہستہ آہستہ گھولتے تاکہ نوجوانوں کو دوسری طرف موڑ دیا جائے۔ امریکہ کے اسٹورٹ کلیرک ایک ایسے ہی ماہر تھے جنہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ "سرمایہ" اور "بے روزگاری" جیسے الفاظ بے معنی ہیں اور اگر ہماری فرہنگ میں 'استحصال' جیسے خراب الفاظ نہ ہوں تو کہیں استحصال نہ ہو گا۔

اب یہ بات حقیقت بن چکی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام بذات خود نوجوان نسل کے لئے کسی قسم کے سماجی، معاشی اور روحانی تحفظ فراہم نہیں کر سکتا ان باتوں کو سمجھتے ہوئے بہت سارے نوجوان ان باتوں کا اظہار کر رہے ہیں کہ سماجی، سائنسی اور تکنیکی ترقی کے لئے اہم ضرورت یہ ہے کہ پورے سیاسی ڈھانچہ کو از سر نو منظم کیا جائے اور نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کے لئے یو۔این کا نعرہ "شرکت، ترقی اور امن" ان فوری مسائل کو حل کئے بغیر سرمایہ دارانہ نظام میں بااثر نہیں ہو سکتا۔

اشتراکیت کے تحت نوجوان:

لیکن اشتراکیتی یعنی سوشلسٹ ملکوں میں منظر بالکل اس کے برعکس ہے۔ سوشلسٹ ملکوں کی نوجوان نسل سماج کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ سوشلزم کی فتح نے نوجوانوں کی سرگرمیوں کے لئے اور انکی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کی جامع ترقی کے لئے نئی باتیں پیدا کیں۔ سوشلسٹ ملکوں میں نوجوانوں کو وسیع حقوق فراہم کئے گئے ہیں۔ یہ حقوق قانون کے تحت فراہم کئے گئے ہیں اور ساتھ ہی سیاسی، قانونی اور مادی ضمانت بھی دی گئی ہے۔ سوشلسٹ ملکوں کے نوجوانوں کی سرگرمیوں کو پرولتاریت کی انقلابی جدوجہد سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سوشلسٹ ملکوں کی نوجوان۔ تنظیموں کی پیداواری سرگرمیاں کام سے وابستہ تعلیم کے سوال سے اور نوجوان مردوں اور عورتوں کو پیداواری کام سے منسلک کرنے سے وابستہ ہیں۔ یہ سب سوشلسٹ نظام کے لئے مادی اور تکنیکی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح سماجی اور معاشی ترقی کے کام میں نوجوانوں کو شامل کیا جاتا ہے۔

سوشلسٹ ملکوں کے دستوروں میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ تمام شہریوں کو تعلیم کا حق حاصل ہے اور مفت تعلیم فراہم کرنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ سوشلسٹ ملکوں میں نوجوانوں کو دیگر سماجی حقوق کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل حقوق بھی حاصل ہیں:

آرام کرنے اور فرصت کے لمحات گزارنے کا حق، صحت کی حفاظت کا حق، ثقافتی سہولتوں سے مستفید ہونے کا حق، تنظیموں میں شامل ہونے کا حق، تقریر کی آزادی وغیرہ، اور ریاست کی انتظامیہ میں براہ راست شرکت سے نوجوانوں کو یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ سماجی لحاظ سے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں اور سماجی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ان میں طبقاتی نظریہ رونما ہوتا ہے۔

اس طرح نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کے مقاصد کی حصولیابی تو نوجوانوں کے لئے سوشلسٹ ریاستوں کی پالیسی کی ایک منطقی کڑی ہے۔ سوشلزم نوجوانوں کو استحصال اور نابرابری سے نجات دلاتی ہے اور ان کے سماجی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔ نوجوانوں کے بین الاقوامی سال میں سوشلسٹ ملکوں نے بہت سارے اقدامات اپنائے جن کے تحت ملک کی سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں اور ان کے مزید فروغ میں نوجوانوں کی شرکت کے لئے بہت وسیع سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔

ہندستان کے نوجوانوں کی کوفت:

ہندستان میں نوجوانوں کی ناگفتہ بہ حالت کا معاشی سماجی ڈھانچہ کو پرے رکھ کر تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے جب سے جدوجہد شروع ہوئی تھی اس وقت سے ہندوستان کا حکمراں طبقہ اپنے منصوبوں اور پروگراموں کی تائید میں سوشلزم کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ لیکن حقائق نے ان نعروں کا پول کھول دیا کیوں کہ سائنسی نقطۂ نظر سے سوشلزم ہندستان بورژوازی کے طبقاتی مفادات کے بالکل برعکس ہے۔

ہمارے ملک میں ہماری نوجوان نسل کے مسائل سماج کے دیگر طبقوں کے مسائل کی طرح سال بہ سال بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں ۱۵ تا ۲۴ سال کی عمر کے نوجوانوں کی تعداد کل آبادی کی کم و بیش ۲۰ فیصد ہے لیکن ان کی اکثریت بے روزگار ہے۔ اس کے ساتھ ہی مرکزی حکومت کی نئی معاشی اور صنعتی پالیسیوں نے ہندوستانی نوجوانوں کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ قومی ترقی کی راہ کو تکتے ہوئے جدید صنعتوں کے تیئیں دروازوں کے باہر روزگار کے متلاشیوں کی لمبی قطار میں کھڑے مصائب سے دوچار ہندوستان کے نوجوانوں کو صنعتی پالیسی کی کامیابی کی، جیسا کہ مرکزی حکومت نے اعلان کیا ہے، کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔

ہندستان کے مضافاتی علاقوں کے نوجوانوں کی حالت تو اور بھی ابتر ہو گئی ہے۔ ان کے لئے ثقافت، کھیل کود، طبّی دیکھ بھال، روزگار وغیرہ کی کم سے کم سہولتیں فراہم ہیں۔ تبادلۂ روزگار کے دفاتر کی تعداد میں کمی کی وجہ سے بہت سارے بے روزگار دیہی نوجوان تو اپنے نام ان دفاتر میں رجسٹرڈ نہ کرا سکے۔

اب حکومتِ ہند کی پیش کردہ تنازعاتی تعلیمی پالیسی کو لیجئے۔ یہ پالیسی ایک اجارہ دار طبقہ پیدا کرے گی جو ہندوستانی اور کثیر الاقوام صنعت کاروں کے مفادات کو فروغ دے گا۔ مزید برآں ڈگری کو روزگار سے الگ کر دینے سے تعلیم یافتہ ہندوستانی نوجوانوں کے لئے شدید غیر یقینی کی صورتحال اجاگر ہو گی۔ کیوں کہ ان پر اب یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انہوں نے روزگار کے لئے جو تعلیم حاصل کی تھی وہ اب بے معنی سی بات ہو گئی ہے۔ حکمراں طبقہ کی پالیسی کا مقصد یہی ہے کہ ان لوگوں کو حکمراں طبقہ کے نوجوانوں کے ساتھ ۲۱ ویں صدی کے جلوس میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ ہمارے ملک کی مختلف بائیں اور جمہوری نوجوان تنظیمیں ان غیر جمہوری اور ظالمانہ اقدامات کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں۔

آج کے نوجوانوں کی تحریک:

نوجوانوں کی تحریک کا موجودہ دور مندرجہ ذیل باتیں کم و بیش اثر انداز ہوئی ہیں: سرمایہ داری کے عام بحران میں اضافہ اور شدت، آمر ملکوں کے حملے اور لوگوں کی اس کے خلاف جدوجہد، اسلحہ جات کی دوڑ کے مسائل اور تمام براعظموں میں انقلابی طریقۂ کار کے بڑھتے ہوئے اثرات۔

ان باتوں سے نوجوانوں کی آج کی تحریک کی کئی خصوصیات عیاں ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ نوجوان اب زیادہ سے زیادہ ٹھوس سماجی اقدامات کر رہے ہیں اور سیاسی جدوجہد میں پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔ نوجوانوں کی اس نسل میں سیاسی پختگی آگئی ہے۔ اب وہ سب سماجی زندگی کے حقائق سے اچھی طرح سے واقف ہیں۔ ترقی کی راہ پر گامزن ملکوں کے ترقی پذیر نوجوان سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلی کے لئے فاشزم کے خلاف، مطلق العنانی کے خلاف، رجعت پسندی کے خلاف اور ایک نئے بین الاقوامی نظام کے لئے، سامراجیت پر انحصار کو مکمل طور پر ختم کر دینے کے لئے اور کالونیائی یا نوکالونیائی کی میراث کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دینے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ساری دنیا میں نوجوان لوگ محنت کش طبقہ کی منظم جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

آج مغربی اور سرمایہ دارانہ ملکوں میں صورتحال بہت کچھ بدل چکی ہے۔ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ملکوں میں نئی نسل اپنی پہلی نسل کے تجربات کا اور سماج میں زندگی کے ذاتی تجربات کا جائزہ لیتی ہے۔ چھٹی دہائی کے آخری دور اور ساتویں دہائی کے شروع میں مغربی ملکوں میں نوجوانوں کی سرگرمیاں بڑی پیچیدہ بن گئیں اور ان میں تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو یہ سرگرمیاں سرمایہ دارانہ اداروں کے بورژوائی طرزِ زندگی کے خلاف جمہوریت پسند نوجوانوں کے احتجاج کی عکاسی کرتی

ہیں تو دوسری طرف نوجوانوں کے بہت سارے اقدامات کے تصورات اور سیاسی پلیٹ فارم پر بائیں رجحانات کے زیر اثر بورژوائی صنعتی بغاوت کی، جو افراتفری کی سیاست کو جنم دیتی ہے اور جو نوجوانوں کو محنت کش طبقہ کی منظم تحریک سے الگ کر دیتا ہے اعانت کرتی ہے۔

لیکن صورتحال امید افزا طور پر بدل چکے ہیں، گزشتہ دس پندرہ برسوں میں مغربی ملکوں کے نوجوانوں کے سماجی حقائق کے شعور میں کافی تبدیلی آگئی، نیز ان میں بیداری پیدا ہوگئی اور وہ سب اب بورژوائی طرز زندگی کو برداشت نہیں کرتے۔ سرمایہ دارانہ ملکوں میں نوجوان نسل روایتی بورژوائی قدروں سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ گزشتہ دہائی اور موجودہ دہائی کے اوائل میں نوجوانوں کی جو رائے لی گئی تھی اس سے صرف یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ مغرب میں نوجوانوں کی صرف اقلیت ہی زندگی میں مادی تحفظ کو ہی اہم سمجھتی ہے۔ اس طرح چھ یورپی ممالک میں ایسے خیالات رکھنے والے ۱۵ سے ۲۴ سال کی عمر کے نوجوانوں کی تعداد سنہ ۷۰ء میں ۲۰ فیصد، سنہ ۷۳ء میں ۲۱ فیصد، سنہ ۷۶ء میں ۲۵ فیصد اور سنہ ۷۹ء میں ۲۴ فیصد تھی۔ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ زندگی کے سلسلے میں نوجوانوں کے خیالات میں کتنی نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ اب نوجوان سیاسی لحاظ سے بیدار بھی ہو چکے ہیں اور عمرانیاتی جائزہ سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ حالیہ برسوں میں وہ نوجوان، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اور ثقافتی میدان میں جنہیں ایک مقام حاصل ہے اور سماجی مسائل کا تجزیہ کر سکتے ہیں، بائیں شاخ کی تنظیموں کا زیادہ تعداد میں ممبر بن رہے ہیں اور جمہوری تحریکوں میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں اور وہ محنت کش طبقوں اور دنیا کی تمام جمہوری طاقتوں کو تقویت بخشتے ہیں۔

نوجوانوں میں جو انقلابی بیداری رونما ہوئی ہے اس کی مثال کے طور پر لاطینی امریکہ اور افریقہ میں نوجوانوں کی تحریک کے پہلے دور کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ افریقی، ایشیائی اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کی قومی آزادی اور سماجی تبدیلی کے لئے جدوجہد سے وابستہ مسائل کی طرف آج ساری دنیا کے نوجوان خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ لاطینی امریکہ میں انقلابی رجحانات کی توسیع ہو رہی ہے اور اس کا اظہار وہاں کی بڑھتی ہوئی عوامی تحریک سے ہوتا ہے۔

لاطینی امریکہ کے ملکوں کی انقلابی تحریکوں میں طلبا روایتی طور پر ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انقلابی سرگرمیوں میں طلبا کی سرگرم شرکت نے تمام یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کو لاطینی امریکہ کی سیاسی زندگی کا لازمی جزو بنا دیا ہے۔ غیر سامراجیت اور جمہوریت کے جھنڈے لہرانے والے طلبا کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ صرف محنت کش طبقہ کی سربراہی کے تحت ہی وہ سب اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر چیلی میں پوپولر یونیٹی گورنمنٹ کی فتح اس بات کی شاہد ہے کہ وہاں محنت کش طبقہ اور طلبا کے درمیان مستحکم رشتہ قائم تھا اور لاطینی امریکہ میں امریکی سامراجیت کے بڑھتے ہوئے خدشات کے پیش نظر آج ایسے مستحکم رشتہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ لاطینی امریکہ بر اعظم طلبا تنظیم (او سی ایل اے ای) نے اس بات پر کافی زور دیا کہ اس بر اعظم میں سامراجیت کے خلاف طلبا اور نوجوانوں کی تحریک کو مستحکم بنایا جائے اور تمام انقلابی طاقتوں اور فاشزم اور رجعت پسند مطلق العنانی کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کے درمیان یکجہتی اور استحکام کو ٹھوس بنا دیا جائے۔ یہ تنظیم نوجوانوں اور طلبا کی عالمی جمہوری تحریک میں سرگرم عمل ہے اور آئی یو ایس سے تعاون کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم اس کے منظم کردار کا ذکر کر سکتے ہیں جو انقلاب کے دوران چیلی کے نوجوانوں نے ادا کئے تھے۔ اب "نکاراگوا" میں "۱۹ جولائی سینڈینسٹا یوتھ" نوجوانوں کی بہت ہی با اثر تنظیم ہے۔ فی الحال اس کے ۵۰۰۰ ممبر ہیں اور تقریباً ۲۰۰۰۰ افراد ممبر ہونے والے ہیں۔ انقلاب کے بعد کے عرصہ کی جدوجہد میں نوجوانوں کی یہ تنظیم سب سے آگے ہے۔ وہ سب پر امن تعمیراتی کام میں حصہ لیتے ہیں۔ ملک کے رہنماؤں کی پکار پر "۱۹ جولائی سینڈینسٹا یوتھ" کی سربراہی کے تحت ۶۰۰۰۰ نوجوان ناخواندگی کو دور کرنے کے کام میں سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔

بین افریقی نوجوان تحریک، ایشیا اور افریقہ کی اہم نوجوانوں کی علاقائی تنظیم ہے (یہاں ایشیائی یوتھ کاؤنسل، عرب یوتھ فیڈریشن، کل افریقہ اسٹوڈنٹس یونین وغیرہ جیسی تنظیمیں بھی ہیں) حالیہ برسوں میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ ان ملکوں نے دنیا کے دیگر ترقی پذیر نوجوانوں کی بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے مثبتی رویہ اختیار کیا ہے۔ جنوبی افریقہ کے ترقی پذیر نوجوانوں کی طاقتیں نسل پرست سفید اقلیت کے ظلم کے خلاف

وہاں کے عوام کی جدوجہد آزادی میں پورے طور سے شرکت کرنے کے لئے اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہی ہیں۔

نسلی امتیاز کے علاقہ کے خلاف جنوبی افریقہ کے نوجوانوں کی مزاحمتی تحریک کی اہم طاقت افریقن نیشنل کانگریس یوتھ لیگ ہے۔ جنوبی افریقی طلباء اور امنضابی طلباء تنظیموں سے غیر سفید طلباء کی بہت ساری تنظیمیں وابستہ ہیں۔ یہ تمام تنظیمیں اس ملک میں نوجوانوں کی تحریک میں اور اپنے ممبروں کے سیاسی تصورات کو اجاگر کرنے میں سرگرمی کے ساتھ شرکت کرتی ہیں۔ نسلی امتیاز کے خلاف ترقی پذیر سفید طلباء کی بہت ساری تنظیمیں بھی آگے بڑھ رہی ہیں۔ ریاستی ایمرجنسی کا اعلان کرنے کے بعد حکومت کے خلاف نوجوانوں کی سرگرمیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔

ساری دنیا میں امن، تحفظ اور تخفیف افواج و اسلحہ جات کے لئے مختلف سیاسی، فلسفیانی اور یہاں تک کہ مذہبی پلیٹ فارم سے نوجوانوں کی تنظیموں نے وسیع پیمانہ پر جو اقدامات کئے ہیں وہ موجودہ دور کی جدوجہد کی اہم خصوصیت ہے۔ اسی طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بنیادی انسانی حقوق اور مفاد آزادی کے لئے جدوجہد میں ترقی پذیر تنظیمیں جیسی جمہوری نوجوانوں کی عالمی فیڈریشن اور طلباء کی بین الاقوامی یونین کی سرگرمیاں کافی وسیع ہو گئی ہیں۔

حالیہ برسوں میں یورپ کے نوجوانوں کی مختلف تنظیموں کے مابین تعاون بڑھ گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نعرہ برائے مستقل امن اور تحفظ کے ساتھ یورپین یوتھ اور اسٹوڈنٹس میٹنگ کے مابین تعاون (وارسا۔ جون ۱۹۷۶ء) اور تخفیف افواج و اسلحہ جات پر (بڈاپسٹ ۱۹۷۸ء میں) سوشل پروگریس اور یورپین یوتھ اسٹوڈنٹس کی کانفرنس بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ مئی ۱۹۸۰ء میں جنگ کے خلاف نوجوانوں کی جدوجہد نے ایک نیا موڑ لیا، جبکہ تخفیف افواج و اسلحہ جات کے لئے یورپین اور اسٹوڈنٹس تنظیموں نے ایک دن مشترکہ اقدام کئے۔ اس تخفیف کے سلسلہ میں نوجوانوں کی تنظیموں کے نوجوان وفد نے یو۔این جنرل اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں شرکت کی جو ۱۹۸۲ء میں اسکا میں منعقدہ امن، عالمی باہمی کشیدگی کو دور کرنے، تخفیف افواج و اسلحہ جات کے لئے نوجوانوں اور طلباء کی عالمی کانفرنس میں طلباء کی بین الاقوامی، علاقائی اور قومی تنظیموں کے ۷۵۰ نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جنگ کے خطرے کے خلاف متحدہ طور پر جدوجہد کرنے کے لئے دنیا کے نوجوانوں کو علمبردار ہونے کو کہا گیا۔

ڈبلیو۔ایف۔ڈی۔وائی اور آئی۔ایس۔یو اور دیگر ترقی پذیر بین الاقوامی اور قومی تنظیموں کے مشترکہ اقدامات یہ بات بیان کرتے ہیں۔ آج ساری دنیا میں مستقل امن اور بین الاقوامی تحفظ نوجوانوں کے مفادات کے لئے ضروری ہیں۔

عالمی امن کاؤنسل اور ٹریڈ یونینوں کی عالمی فیڈریشن نے بھی نوجوانوں کی بین الاقوامی تحریک کی حمایت کی۔ ان دونوں تنظیموں میں نوجوانوں کی کمیٹیاں بھی ہیں۔

دنیا کے نوجوانوں میں تعاون کو فروغ دینے کے لئے نوجوانوں اور طلباء کی عالمی تہواروں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ جولائی ۱۹۸۵ء میں ماسکو میں، نوجوانوں اور طلباء کا ۱۲واں عالمی تہوار منایا گیا۔ اس تہوار میں ۱۵۷ ملکوں کے دو ہزار سے زیادہ نوجوان تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس تہوار میں سامراجیت کے خلاف متحدہ جدوجہد کی ضرورت کو اجاگر کرنے اور سامراجیوں کے پیدا کردہ بین الاقوامی تنازعات کو کم کرنے، اسلحہ جات کی دوڑ کو ختم کرنے کے لئے تعاون اور تحفظ، عام لوگوں کی تباہی کے لئے نئے ہتھیار کی تیاری کے خلاف، خلائی جنگ کے خلاف، جدوجہد کرنے کے لئے نوجوانوں سے پرزور اپیل کی گئی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نوجوان اور طلباء کے ۱۲ویں عالمی تہوار میں "امن" کو ہمیشہ زیر غور رکھا گیا۔ نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کے لئے اقوام متحدہ کے نعرہ میں بھی عالمی امن کے لئے نوجوانوں کی خواہشات اور کوششوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس طرح اب یہ بات حقیقت بن چکی ہے کہ نوجوانوں کی بین الاقوامی تحریک اور بین الاقوامی امن تحریک ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئی ہے۔

فاشزم کی شکست کے بعد اقوام متحدہ کی تنظیم قائم کی گئی۔ اس ادارہ نے ۱۹۸۵ء کو نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کی طرح منانے کا اعلان کیا اور یہ تقریبات ساری دنیا میں منائی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی گزشتہ سال فاشزم پر فتح کی ۴۰ویں سالگرہ منائی گئی۔ یہ دونوں باتیں کافی اہمیت کی حامل ہیں اور اب دنیا کے جمہوریت پسند اور ترقی پذیر نوجوان پر امن تحریک کو جاری کر کے تہذیب کے دفاع کے سلسلے میں عملی اقدامات کر رہے ہیں کیوں کہ نوجوانوں کے لئے امن ضروری ہے اور ہر قیمت

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

امداد باہمی تحریک کی رفتار ترقی

امداد باہمی تو عوام سے وابستہ تحریک اور اس کی کامیابی کا انحصار بہت حد تک لوگوں کی سرگرم شرکت پر رہے۔ اگرچہ معیشت کی نوعیت کے پیش نظر امداد باہمی عوام کے بنیادی معاشی مسائل کو حل نہیں کر سکتی تاہم غریبوں کی مدد کرنے کے لئے تاکہ وہ سب سماجی مراعات سے مستفید ہوں، یہ لوگوں کو کم از کم منظم کر سکتی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر گزشتہ آٹھ برسوں سے بائیں محاذ حکومت زراعت، ماہی پروری و ماہی گیری ڈیری کی ترقیات، دیہی اور چھوٹی صنعت، مکانات، لازمی چیزوں کی عوامی تقسیم کو امداد باہمی کی تحریک تلے لانے کی سرگرم کوشش کر رہی ہے۔

اہم اسکیموں میں غریب کسانوں کو لمبے اور مختصر عرصہ کے لئے قرض کی فراہمی شامل ہے۔ زرعی کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کرنے کے لئے کسانوں کی بہت افزائی کی جاتی ہے۔ سنہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں کسانوں کو طوفان اور سیلاب کے نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لئے ریاستی حکومت نے غلہ بیمہ اسکیم رائج کیا۔ فی الحال اس اسکیم کو بوروا اور ربیع فصلوں پر بھی لاگو کر دیا گیا ہے۔ نیز موجودہ خریف موسم میں ۱۶۲ تعلقوں کے علاقوں میں غلہ بیمہ اسکیم کے دائرہ عمل میں لایا گیا۔

کوآپریٹیو بنکنگ میں بھی پیش قدمی کی گئی ہے۔ سنہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ابتدائی زرعی قرض سوسائٹیوں میں ۱۹٫۳ لاکھ ممبر تھے، جن کی تعداد بڑھ کر سنہ ۸۴ء میں ۳۱ لاکھ ہو گئی۔ سنہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں مرکزی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی تعداد ۱۴۳ تھی جو بڑھ کر ۱۹۸۴ء میں ۲۰۵ ہو گئی۔ ان بنکوں میں سنہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں کل ۳۳٫۷ کروڑ روپئے جمع تھے جو بڑھ کر سنہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۱۷٫۳۴ کروڑ روپئے ہو گئے۔

سنہ ۱۹۸۴ء کے آخر میں سات لاکھ حاشیائی کسانوں، بر گداروں، پٹہ داروں اور زرعی مزدوروں کو کوآپریٹیو (یعنی امداد باہمی) تحریک کے دائرہ عمل میں لایا گیا۔ نئے کوآپریٹیو قوانین کے بعد لوگوں کے لئے اب یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اپنی زمینوں کو رہن رکھے بغیر زرعی ترقیات بنکوں سے قرض حاصل کرے۔

زرعی بازار کے میدان میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔ سنہ ۸۴ء تک بی ای این ایف ای ڈی اور اس کی تسلیم کردہ ابتدائی زرعی سوسائٹیاں نے ۸۳٫۱ لاکھ کا منشور پاٹ حاصل کئے اور شعبہ امداد باہمی نے کسانوں کے درمیان ایک لاکھ میٹرک ٹن کھاد تقسیم کئے۔ اناج کو اچھی حالت میں رکھنے کے لئے سنہ ۸۴ء میں ۱۱۳۱ سفانی گودام اور ۳۰۶ بڑے گودام اور ۲۵ سرد خانے جہاں ۸۰۴۰۰ میٹرک ٹن اناج حفاظت سے رکھے جا سکتے ہیں، تعمیر کئے گئے۔

غیر زرعی سیکٹر میں امداد باہمی تحریک نے کافی ترقی کی۔ سرکاری دفتروں، کارخانوں، کاروباری دفتروں، اسکولوں اور کالجوں میں ملازمین کی قائم کردہ غیر زرعی قرض سوسائٹیوں نے بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے اور مشرقی ہندوستان میں ایسی سوسائٹیوں میں مغربی بنگال کا نام سر فہرست ہے۔ سنہ ۱۹۸۴ء کے آخر میں مغربی بنگال میں کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی کل تعداد ۲۵۱۰ تھی اور جس کے ۲۰ لاکھ افراد ممبر تھے۔ ان سوسائٹیوں کا کل ادا کردہ سرمایہ ۳۰ کروڑ روپیہ تھا اور سرمایہ ۲۱۸٫۵۰ کروڑ روپیہ۔ اس عرصہ میں انکا بجٹ کی رقوم میں کافی اضافہ ہوا اور یہ رقم ۱۳۹ روپئے کی ہو گی۔

اس ریاست میں زیادہ سے زیادہ صارفین کی کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ فی الحال ۲۸ صارفین تھوک فروش کوآپریٹیو اسٹورس اور ۲۰۲۳ ابتدائی کوآپریٹیو اسٹورس ہیں۔ ماہی گیری کوآپریٹیو کو خود کفیل بنانے کے پیش نظر ابتدائی ماہی گیری کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کی جا رہی ہیں۔ اب تک ۵۵۰۰۰ ماہی گیروں کو ایسی ۵۲۰ سوسائٹیوں کا ممبر بنا لیا گیا ہے۔ دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے میدان میں بند اور بیمار صنعتوں کے ورکروں کو ساتھ لے کر ۳۷۹ ورکرس کوآپریٹیو، ۵۳۲ انجینئرنگ کوآپریٹیو اور ۷۰ صنعتی کوآپریٹیو قائم کئے گئے ہیں۔ جون سنہ ۱۹۸۴ء تک رجسٹرڈ ابتدائی مکانات کوآپریٹیو کی تعداد ۱۴۵۰ تھی۔

اس بات کے سلسلے میں انتظامات کئے جا رہے ہیں کہ ساتویں منصوبہ کے دوران کوآپریٹیو کے ممبروں کی تربیت دی جائے ووو

مغربی بنگال میں ہتھ کرگھے کی صنعت ایک شاندار مستقبل

از: میورپندر رائے،
سکریٹری،
شعبہ دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعت

حالیہ برسوں میں مغربی بنگال کے ہتھ کرگھے کے تیار کردہ کپڑے مقبول عام بن چکے ہیں اور اس کے لئے اس ریاست کے غریب لیکن محنتی اور ماہر بنکر خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ ہتھ کرگھا مغربی بنگال کی سب سے بڑی دیہی صنعت ہے اور یہاں اس دیہی صنعت کی بابت چند باتیں درج ذیل ہیں۔

ہندوستان میں جتنے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں اس کی تقریباً ایک تہائی کپڑے ہتھ کرگھے کے ذریعہ تیار کئے جاتے ہیں۔ مغربی بنگال میں بھی یہی تناسب ہے۔ ہندوستان میں کرگھوں کی کل تعداد تقریباً ۳۰ لاکھ ہے اور ہماری ریاست میں ان کی تعداد ۲٫۵۶ لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ اب یہ کرد کھانا ممکن ہو سکا کہ اب ایک کرگھے پر سالانہ تقریباً ۵۰۰۰ روپئے کی سرمایہ کاری کر کے تقریباً ۷۵۰۰ روپئے کی مالیت کے کپڑے تیار کئے جاسکتے ہیں اور براہ راست کام کرنے کے ۷۵۰ دن پیدا کئے جاسکتے ہیں۔

اس دیہی صنعت کا مستقبل تو بہت شاندار ہے لیکن ابھی تک یہ صنعت اپنا مناسب کردار ادا نہیں کر سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دیہاتوں میں غیر منظم طور پر بنکر بکھرے پڑے ہیں اور اس صورت حال کا مہاجن ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ منصوبہ بندی کے اوائل دور میں ہتھ کرگھے سیکٹر میں امداد باہمی تحریک کی توسیع کے سلسلے میں ایک پروگرام کو اپنایا گیا تھا جس میں اس امید کا اظہار کیا گیا تھا کہ استحصال سے پاک ایک ادارہ کے تحت بنکروں کے لئے بہت سارے پروجیکٹوں کو روبہ عمل لا کر اس صنعت کی مجموعی ترقی کے سلسلے میں کچھ کرنا ممکن ہو سکے گا۔ لیکن اس پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے راستہ میں بہت ساری دشواریاں آکھڑی ہوئیں۔

۱۹۷۶-۷۷ء میں کچھ مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں جب مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی طرف سے مشترکہ طور پر ہتھ کرگھے صنعت کیلئے کافی سرمایہ کاری کی گئی۔ اب نابارڈ (NABARD) کی طرف سے بھی سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے۔

اب مغربی بنگال میں ہتھ کرگھے کے سلسلے میں جتنے پروجیکٹوں کو روبہ عمل لایا جارہا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اس صنعت کی مجموعی ترقی ہو۔ لیکن یہ تمام امداد باہمی پروجیکٹس ہیں کیوں کہ امداد باہمی ہی بنکروں کو مہاجن کے جنگل سے آزاد کرا سکتی ہے اور ان کے ساتھ ان پراجیکٹوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچا سکتی ہے۔ نیز بنکروں کے لئے پروویڈنٹ فنڈ جیسی رفاہی اسکیمیں بھی رائج کی گئی ہیں۔ بنکروں کے لئے رہائشی مکانات کی تعمیر کا پروجیکٹ بھی ریاستی حکومت کے زیر غور ہے۔

چند کوآپریٹو (یعنی امداد باہمی) سوسائٹیاں اپنے ممبروں کو طبی بھتہ بھی دیتی ہیں۔ ہماری ریاست میں چند بنکر کوآپریٹوس خیراتی شفاخانے بھی چلاتے ہیں۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مغربی بنگال کے بنکروں پر کوآپریٹو کے فوائد آہستہ آہستہ عیاں ہوتے جارہے ہیں۔ فی الحال کوآپریٹو کے تحت ۹۰ ہزار بنکر کام کر رہے ہیں۔ پانچ سال قبل ایسے بنکروں کی تعداد صرف ۴۹ ہزار تھی۔

لیکن آج بھی یہ صنعت سرمایہ، خام اشیاء، مصنوعات کی فروخت جیسے کئی ایک مسائل سے دوچار ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے سرکاری سطح پر کوششیں کی جارہی ہیں۔ قومی، زرعی اور مضافاتی ترقیات بنکس اور کوآپریٹو بنکس ابھی تک مالی وسائل فراہم کر رہے ہیں۔ اس بات کی مرکوز کوششیں کی جارہی ہیں کہ یہ بنک بنکروں کی کوآپریٹو سوسائٹیاں

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

جیل

۱۹۷۷ء سے مئی ۱۹۸۵ء کے دوران مغربی بنگال کے جیلوں میں بہتری لانے اور انہیں جدید رجحانات سے روشناس کرانے کے سلسلہ میں متعدد اصلاحات و اقدامات اپنائے گئے ہیں۔

ریاست میں پانچ مرکزی جیل، گیارہ ضلع جیل، چار خصوصی جیل اور ۳۰ تحتی جیل ہیں۔ یہاں اصلاحی خدمات کا ایک ادارہ ہے اور رواڑوں کو تربیت دینے کا ایک ادارہ ہے۔ جولائی ۸۳ء سے علی پور خصوصی جیل کو غیر مجرم مرد پاگل کے لئے ایک دماغی علاج کے انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

جیل میں بھیڑ کو کم کرنے کی کوشش :

مغربی بنگال جہاں ۲۰۰۰۰ قیدیوں کو رکھنے کی گنجائش ہے وہاں اب ۱۰۰۰۰ قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ ان جیلوں میں جتنے قیدیوں کی رہائش کی سہولتیں تھیں ہنگامی دور میں یہاں قیدیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو گئی۔ اس دوران جیل کی فاضل آبادی سے نپٹنے کے لئے بہت سارے شیڈ تیار کئے گئے تھے جن میں ضرورت سے زیادہ لوگ رکھے گئے۔ لیکن جیل میں صفائی اور پانی کی سپلائی کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں کا ماحول بھی غیر صحت بخش بن گیا ضرورت سے زیادہ بڑھتی ہوئی قیدیوں کی تعداد کی وجہ سے ان کے لئے کھانا تیار کرنے اور ان میں کھانوں کی بڑھتی ہوئی تقسیم کا مسئلہ شدید بن گیا تھا۔

بائیں محاذ حکومت جب اقتدار میں آئی تو اس نے ملزموں کی ایک بڑی تعداد کو رہا کر دیا۔ رہائی کے سلسلے میں سیاسی قیدیوں کو ترجیح دی گئی۔ نکسل قیدیوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی رہا کیا گیا جن میں عمر قید کی سزا پانے والے قیدیوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ غرض عملی طور پر تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا۔ فی الحال چند نکسل قیدی زیر حراست ہیں جن کے سلسلے میں مقدمہ جاری ہے۔ اور انہیں چھوڑ کر تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ ۱۴ اور ۲۰ سال سے کم عمر والے ملزموں کی رہائی کے سلسلے میں حکومت کی جو پالیسی ہے اس کے تحت ان مجرموں کی جنہیں عمر قید کی سزا دی گئی ہے، تعداد گھٹ کر نصف ہو گئی ہے۔ یہ پالیسی سپریم کورٹ کے آرڈر کے عین مطابق ہے۔ اس کی وجہ سے تمام جیلوں میں آبادی میں کمی ہونے کی وجہ سے صفائی اور پانی کی سپلائی کے انتظام میں بہتری ہوئی اور ایک صحت بخش فضا بھی قائم ہوئی۔

زیر سماعت مقدموں کی تکمیل میں سرعت

ماضی میں ان قیدیوں کی تعداد جن کے مقدمے زیر سماعت تھے بہت زیادہ تھی۔ انہیں بنا کسی الزام یا فیصلے کے مہینوں اور سالوں تک جیلوں میں سڑنے دیا جاتا تھا۔ ان میں سے

اکثر زیر سماعت قیدیوں کو جیل میں جتنی مدت کے لئے رکھا جاتا ہے اگر ان کو سزا ملتی تو سزا کی مدت اس مدت سے کم ہوتی۔ بائیں محاذ حکومت جب برسر اقتدار آئی تو اس نے ان زیر سماعت قیدیوں کے مقدموں کی جانچ کرنے کے لئے اور انہیں باضابطہ عدالت میں پیش کرنے کے لئے انہیں لمبے عرصے تک زیر حراست رکھنے کی وجہ سے روشناس کرانے کے سلسلے میں احکامات جاری کئے گئے۔ ضمانتوں کی منظوری میں نرمی اور جیلوں اور عدالتوں کے مابین متواتر رابطے کی وجہ سے زیر سماعت قیدیوں کی ایک بڑی تعداد کو رہا کیا جا سکا۔ سپریم کورٹ کی ہدایت جس کے تحت جیل کے تمام مقدموں میں چارج شیٹ کو چھ ماہ کے اندر داخل کر دینا چاہئے اکو روبہ عمل لایا گیا۔ نتیجہ کے طور پر مقدموں کے فیصلے اور ان کی پیشی جلد از جلد ہونے لگی۔ ضلع سطح کے افسران اکثر و بیشتر جیلوں کا دورہ کرتے اور زیر سماعت قیدیوں کے مقدموں پر خصوصی توجہ رکھتے جو کافی لمبی مدت جیل میں گزار چکے تھے۔ درحقیقت مغربی بنگال کی جیلوں میں اب کوئی بھی ایسا زیر سماعت قیدی نہیں ہے جس نے سزا کی مدت کے نصف سے زیادہ عرصہ جیل میں گزارا ہے۔ فی الحال زیر سماعت قیدیوں کی تعداد گھٹ کر پہلے سے آدھی ہو گئی ہے۔ یہ اقدامات جیلوں میں صحت مند فضا بحال کرنے میں اور جیلوں کو صاف ستھرا رکھنے میں معاون ثابت ہوئے۔

قیدیوں کو الگ تھلگ رکھنا

یہ ممکن ہو سکا ہے کہ قیدیوں کی تعداد میں کمی ہونے کی وجہ سے مختلف وارڈ اور یارڈ میں مختلف قیدیوں کو الگ الگ رکھا جائے۔ ان ملزموں کو زیر سماعت قیدیوں سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے۔ نوعمر مجرموں کو مختلف وارڈوں میں بالغ مجرموں اور زیر سماعت مجرموں سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے۔ بہت ساری جیلوں میں عام مجرموں کو بھی عادی اور خطرناک مجرموں سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اس علیحدگی کا مقصد یہ ہے کہ ان قیدیوں کی اکثریت کو جو کسی حادثہ یا لمحاتی غلطی کی وجہ سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے آ گئے ہیں اصلاح کر کے انہیں صحیح راستے پر گامزن کر دیں۔

عورتوں کیلئے علیحدہ جیل

کلکتہ کے پریسیڈنسی جیل اور دیگر مرکزی جیلوں اور ضلع جیلوں (سوائے علی پور سنٹرل جیل اور دمدم سنٹرل جیل کے) میں قیدی عورتیں بھی ہیں۔ بہت سارے تحتی جیلوں میں عورتوں کا وارڈ موجود ہے۔ اگرچہ عورتوں کے وارڈ اور مردوں کے وارڈ سے علیحدہ ہیں تاہم باورچی خانے کی راہداری اور ملاقات کے کاؤنٹر دونوں ہی کے لئے مشترک ہیں۔ جیلوں میں تحفظ کے سوال کو مد نظر رکھتے ہوئے قیدی عورتوں کو پیشہ ورانہ تربیت و تعلیم، اصلاحی سرگرمیاں اور سماج میں ان کی بحالی کے لئے عورت قیدیوں کی طرف خصوصی توجہ دینا ممکن نہ ہو سکا۔ ۱۹۷۹ء میں بائیں محاذ حکومت نے جیل آئین میں ترمیم کمیٹی کی تشکیل کی۔ شری تارا پد لاہری اس کے چیئرمین مقرر کئے گئے۔ اس کمیٹی نے عورتوں کے لئے ایک الگ جیل کھولنے کی پرزور سفارش کی۔ اس علیحدہ جیل کی تعمیر کے سلسلے میں ہم لوگوں نے ۲۰ ایکڑ قطعات آراضی مشرقی میٹرو پولیٹن بائی پاس کے مقام پر منتخب کئے۔ بہر کیف اس کی تعمیر میں کچھ وقت لگے گا۔ مسئلہ کی اہمیت اور ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے بردوان کی نئی جیل کمپلکس میں عورتوں کے لئے ایک علیحدہ جیل کا انتظام کیا گیا ہے جہاں ان کے لئے علیحدہ وارڈ، غسل خانے، باورچی خانے، اسپتال اور کھانا کھانے کے کمرے ہیں۔ اس نئی عورتوں کی جیل کے گرد ایک چہار دیواری کھڑی کر دی گئی ہے۔ فی الحال یہاں ۱۵۰ قیدی عورتیں ہیں جن میں اکثر بے گھر عورتیں، گمشدہ عورتیں اور مظلوم لڑکیاں ہیں۔ یہاں ریاست کی مختلف جیلوں سے لائی گئی زیر سماعت اور سزا یافتہ عورت قیدیوں کو رکھا گیا ہے۔ یہاں ان قیدی عورتوں کو لحاف بنانا، سلائی اور باغبانی کی پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے۔ وارڈر عورتوں کے ساتھ ساتھ وہاں ایک لیڈی ویلفیئر افسر اور لیڈی ڈپٹی جیلر ان لوگوں کی دیکھ ریکھ کے لئے موجود ہیں۔

آوارہ بچوں کی بحالی: اصلاحی خدمات کا ادارہ، باراسات

باراسات میں اصلاحی خدمات کا ایک ادارہ واقع ہے جہاں ایم۔ آئی۔ ایس۔ اے کے تحت حراست میں لئے گئے افراد کو نظر بند رکھا جاتا ہے۔ گزشتہ سال تمام ایسے افراد کی رہائی کے بعد یہ ادارہ خالی ہوگیا۔ تب سے اس ادارہ کو جیل میں ڈالے گئے آوارہ بچوں کی رہائش کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ اس کا مقصد صرف انہیں جیل کی فضا سے دور ہی رکھنا نہیں ہے بلکہ سماج میں ان کی بحالی کے لئے وہاں انہیں ادارہ جاتی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ فی الحال اس ادارہ میں ایسے ۱۱۳ لڑکے ہیں۔ وہاں انہیں پرائمری سے لیکر درجہ ششم تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ (خصوصی طور پر منتخب) وارڈس روزانہ چار گھنٹے لڑکوں کو درس دیا جاتا ہے۔ صبح کو ورزش اور ڈرل کا کلاس ہوتا ہے سہ پہر میں بچوں کے کھیلنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ موتبر کے ماتحت بچے اپنے اپنے وارڈوں میں ساڑھے آٹھ بجے شب تک مطالعہ کرتے ہیں اور دعا پڑھتے ہیں۔ وارڈس معاون نصابی سرگرمیوں جیسے مٹی کے کھلونے، آرٹ، دستکاری، خیاطی، براٹا جاری، باغبانی، پھولوں کی پرورش و پرداخت کے کلاس منعقد کرتے ہیں۔

علی پور سنٹرل جیل کے معمر سائیکلوجسٹ کو ہر لڑکے کی انفرادی کیس ہسٹری تیار کرنے کا کام سونپا گیا ہے جو ان کی شخصیات اور ذہنی رو کی نشاندہی کرے گا۔ مخصوص لڑکوں کے لئے مخصوص پیشوں کا انتخاب کی بابت یہ تشخیص نہایت ہی اہم ہے۔ پری توش نام کے ایک آوارہ لڑکے نے مدھیامک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے چار موضوعات میں اسٹار مارکس پائے ہیں۔ یہی نہیں اس نے ہائر سکنڈری کا امتحان بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے اور اب وہ ریجنل انجینیرنگ کالج، درگاپور میں زیر تعلیم ہے۔

جیلوں کے سپرنٹنڈنٹ کو پہلے ہی سے یہ ہدایت دی ہوئی ہے کہ وہ آوارہ بچوں کے مناسب کیسوں کو ضلع مجسٹریٹ کے پاس روانہ کریں تاکہ وہ اس سلسلے میں سرکاری وکیل اور افسروں کو اس بات کی ہدایت دیں کہ وہ حضرات عدالتی کارروائیوں کے ذریعہ ایسے بچوں کے لئے مغربی بنگال ایکٹ ۱۹۵۹ء کی دفعات ۲۶ اور ۳۱ کے تحت ایسے بچوں کو اصلاح گھر صنعتی اسکولوں میں منتقل کرنے کے لئے عدالتوں سے رجوع کریں۔ اصولاً اس بات کی ہدایت دی گئی ہے کہ انہیں سماجی رفاہ کے اصلاحی ادارے کے حوالے کر دیا جائے تاکہ یہ نوعمر غیر مجرم بچوں کو ریاستی جیلوں سے ان اداروں میں منتقل کیا جا سکے کیوں کہ ایسے بچوں کا جیلوں میں مجرموں کے ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔

ذہنی امراض کے علاج کا ادارہ - علی پور

مغربی بنگال کی جیلوں میں غیر مجرم پاگلوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے، زیادہ تر غیر پاگل مرد اور عورتوں کو دمدم سنٹرل جیل اور پریسیڈنسی جیل میں رکھا جاتا ہے۔ جیل غیر مجرم پاگلوں کے لئے مناسب جگہ نہیں ہے۔ جیلوں میں ایسے افراد رکھے جاتے ہیں جن پر ضابطۂ فوجداری ایکٹ کے تحت مختلف جرم عائد کئے گئے ہیں۔ ایسی جگہوں میں غیر مجرم پاگلوں کے لئے، جو دماغی امراض کے شکار ہوتے ہیں نفسیاتی دیکھ بھال علاج اور طبی دیکھ بھال اور شفا کے بعد احتیاط کے انتظامات کئے گئے ہیں۔ لہٰذا بائیں محاذ حکومت نے علی پور اسپیشل جیل کو ذہنی صحت ادارے میں تبدیل کر دیا ہے اور یہاں دمدم سنٹرل جیل سے ۲۰۰ غیر مجرم پاگلوں کو منتقل کر دیا ہے۔ اب یہاں نہ کوئی قیدی ہے اور نہ ہی کوئی ان لوگوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کے برعکس اب یہاں ایک میٹرن، نرسیں، اور جی ڈی اے ان لوگوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ کلکتہ جیلوں اور علی پور اسپشل جیل کے میڈیکل افسران پورے طور پر ان کے علاج اور دیکھ بھال کے ذمہ دار ہیں۔ بھوانی پور کے منٹل ابزرویشن وارڈ کے سپرنٹنڈنٹ یہاں کے ماہر نفسیات و دماغی امراض ہیں جو علی پور سنٹرل جیل کو ضروری ہدایت اور مشورہ دیتے ہیں۔ اب تک ۲۱ غیر مجرم پاگل افراد اس ادارے سے صحتیاب ہو کر عدالت

کے محکمے کے تحت اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔

یہاں کے تمام مرکزی ضلع اور خصوصی جیلوں میں مریضوں کے علاج و معالجہ کے لئے متعدد ہسپتال موجود ہیں۔ ہر ہسپتال سے میڈیکل افسران اور دواسازوں کی جماعتیں ملحق ہیں۔ مرکزی جیلوں میں ۳ سے زائد میڈیکل افسران موجود ہیں اور دواساز جماعتیں ان ہسپتالوں سے ملحق ہیں۔ علاوہ ازیں کلکتہ جیلوں میں ہسپتالوں کے نظام کی نگرانی کے لئے ایک چیف میڈیکل آفسر ہوتا ہے۔ ان تمام ہسپتالوں میں آؤٹ ڈور اور انڈور علاج و معالجے کے انتظامات موجود ہیں۔ بوقت ضرورت مریض قیدیوں کے علاج و معالجے کے لئے مخصوص ماہرین معالج طلب کئے جاتے ہیں اور ان کے مشوروں پر مریضوں کو باہر کے ہسپتالوں میں داخل بھی کیا جاتا ہے۔ علی پور سنٹرل جیل ہسپتال آپریشن تھیٹر، ڈینٹل چیمبر، تجربہ گاہ، ایکسرے یونٹ وغیرہ ساری چیزوں سے لیس ہے۔ قیدی مریضوں کو علاج کی غرض سے باہر کی جیلوں سے علی پور سنٹرل جیل میں داخل کیا جاتا ہے۔ بائیں محاذ حکومت نے تمام مرکزی جیلوں میں ڈینٹل چیمبر کا اور تجربہ گاہ کی سہولتوں کی فراہمی کا انتظام کیا ہے۔ کلکتہ کی تین جیلوں کو ایمبولنس گاڑیاں فراہم کی گئی ہیں۔ جلپائی گوڑی جیل کے لئے موجودہ حکومت نے ۵۰ بستر والے ایک ہسپتال (تین منزلہ) کی تعمیر کی ہے۔

تفریحات کی سہولتیں:

قریب قریب تمام جیلوں میں اب خبر، نغمے اور دیگر پروگرام سننے کے لئے ریڈیو فراہم کئے گئے ہیں۔ تمام مرکزی جیلوں اور ریاست کے اصلاحی خدمات کے اداروں اور تمام جیلوں میں کیرم بورڈ، شطرنج، تاش وغیرہ کھیلنے کی سہولتیں فراہم ہیں۔ اس کے علاوہ فٹ بال، والی بال، کبڈی وغیرہ کا انتظام اکثر کیا جاتا ہے۔ تمام مرکزی جیلوں میں سال میں ایک بار لیگ اور ناک آؤٹ کی بنیاد پر فٹ بال ٹورنامنٹ کروائے جاتے ہیں۔ ہر سال اسپورٹس کا انعقاد مناسب ایونٹس (EVENTS) کے ساتھ کیا جاتا ہے جس میں نہ صرف مجرم ہی بلکہ زیر سماعت مقدموں کے قیدی بھی حصہ لیتے ہیں۔ ڈرامہ، جاترا اور درگا پوجا، عید الفطر، سرسوتی پوجا، کالی پوجا، نانک کا جنم دن، کرسمس جیسے تہوار وغیرہ منائے جاتے ہیں جس سے قیدیوں کے تمام فرقوں کو دلی تشفی ملتی ہے۔

بقیہ: نوجوانوں کا بین الاقوامی سال: ایک جائزہ

پر اسے برقرار رکھنا لازمی ہے۔

مشہور سائنسی ادیب لیونارڈ لیوتو نے ایک بار کہا تھا کہ امن تو ایک انجن ہے جسے نوجوان زندہ رکھتے ہیں۔ بنی نوع انسان کو اپنی نوجوان نسل پر پورا بھروسہ ہے اور یہ تو نوجوان ہی ہیں جو یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اس دنیا میں زندگی قائم رہے گی یا نہیں؟ ٭٭٭

بقیہ: مغربی بنگال میں ہتھ کرگھے

کے ساتھ مل کر کام کریں اور ان کوششوں کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اس ریاست میں خام اشیاء اور دھاگے کی کافی کمی ہے۔ ۸۰ فیصد دھاگے مغربی یا جنوبی ریاستوں سے منگائے جاتے ہیں۔ موجودہ کوآپریٹو سوت کاتنے کی ملوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ تاکہ جہاں تک ممکن ہو سکے دیگر ریاستوں پر انحصار کو کم کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ کوآپریٹو سیکٹر میں سوت کاتنے کی دو ملیں اور ریاستی حکومت کے زیر انتظام ایک ہی مل بہت ہی جلد چالو ہو جائے گی۔ "تانتوجا" "تانتو شری" "منجوشا" "بنگو شری" جیسی سرکاری اور نیم سرکاری ایجنسیاں ہتھ کرگھے کی تیار کردہ کپڑے کی فروخت کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ انہیں صارفین کا اعتماد حاصل ہو چکا ہے۔ ہم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ بازار میں ایسے کپڑوں کی فروخت کے نظام کو اور بھی بہتر طرز پر ڈھال جائے۔

مغربی بنگال میں ہتھ کرگھے صنعت کی موجودہ صورت حال ایک مایوس کن تصویر پیش نہیں کرتی بلکہ یہ تو ایک شاندار مستقبل کی پیشن گوئی کرتی ہے۔ ٭٭٭



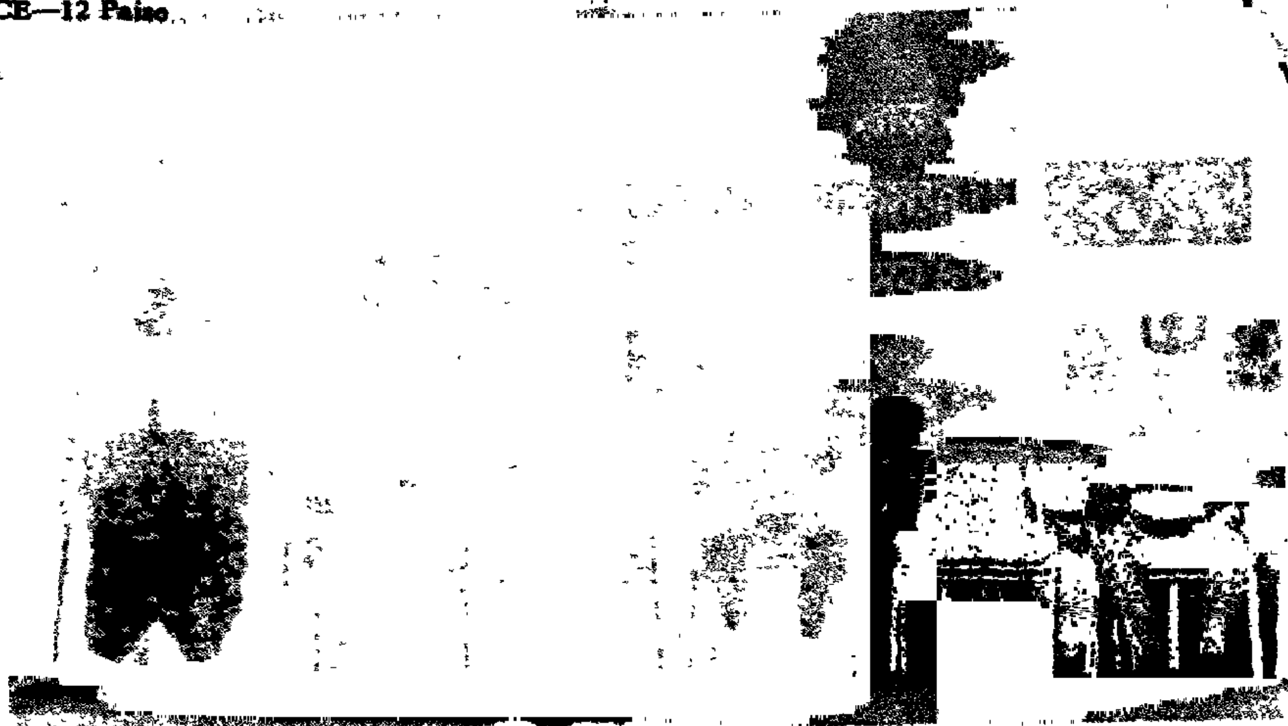
شری پرولائے تالکدار، وزیر ریاست برائے دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعت، حکومت مغربی بنگال ۸ اردسمبر ۸۵ء کو برلا ٹکنیکل میوزیم میں علاقائی جانچ مرکز کے زیر اہتمام سیمینار کے موقع پر منعقدہ ایک نمائش میں صنعتی مصنوعات کا معائنہ کرتے ہوئے



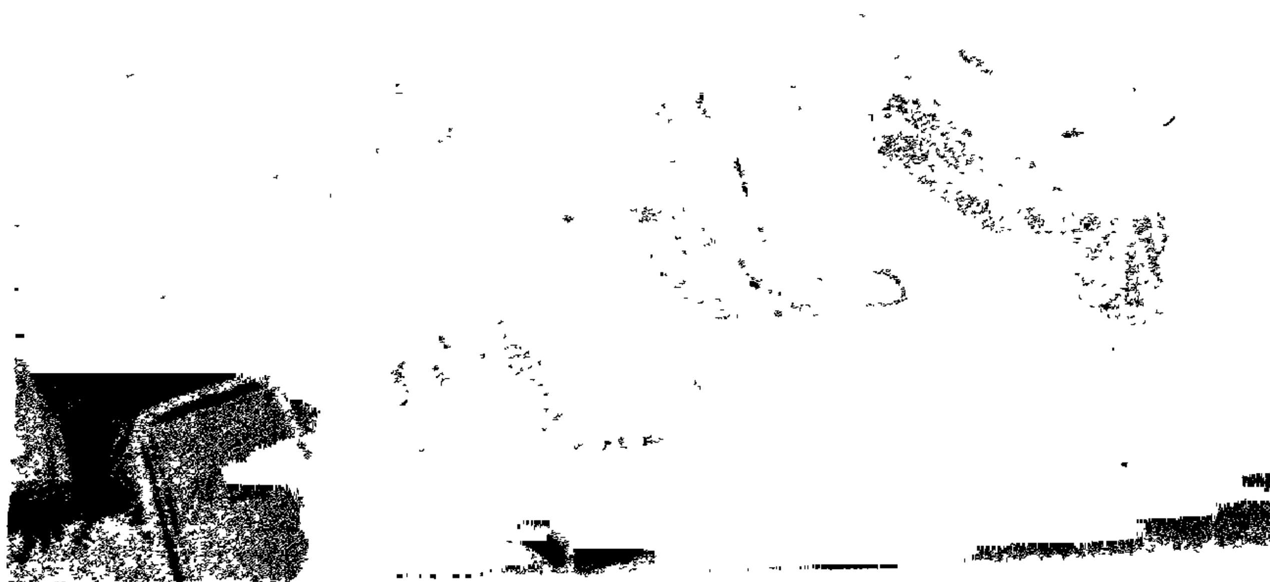
۴؍جنوری کو کلکتہ کے رابندر سدن کے احاطے میں ریاستی لوک ثقافت ' ۸۶ء کے سلسلے میں منعقدہ سمینار کا ایک منظر۔

Postal Regd. No. WB/ CC-52
Vol—33 No.—1
PRICE—12 Paise

MAGHREBI BANGAL
15th January 1986

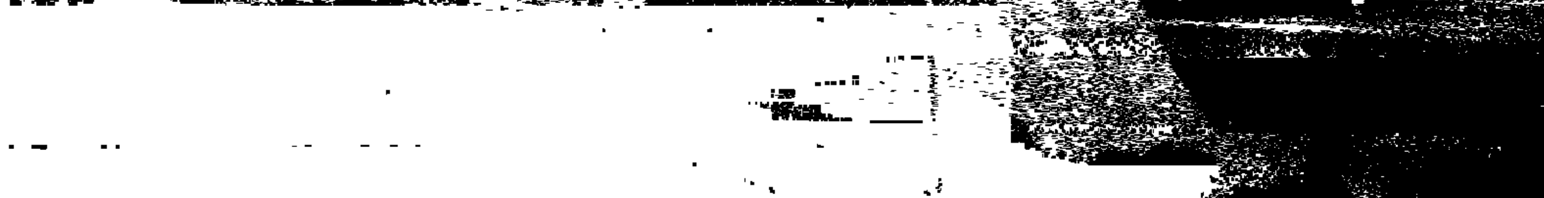


وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو ۴ر جنوری کو کلکتہ کے رابندر سدن کے احاطے میں ریاستی لوک ثقافت '۸۶ کا
افتتاح کرتے ہوئے —————— نیچے: سامعین۔



Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azam, Published by the Information & Cultural Affairs Department, Govt. of West Bengal and Printed by M/s. G. R. T. Printers, 54/1C, Shyampukur Street, Calcutta-700 004.


مغربی بنگال
یکم فروری سنہ ۸۶ء

















پندرہ روزہ
مغربی بنگال
کلکتہ

یومِ جمہوریہ نمبر

مدیر اعلیٰ : پرسن بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

جلد نمبر ۳۴ ★ یکم فروری ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۳

شرحِ خریداری

سالانہ : تین روپئے
اس خصوصی شمارے کی قیمت : ۳۵ پیسے

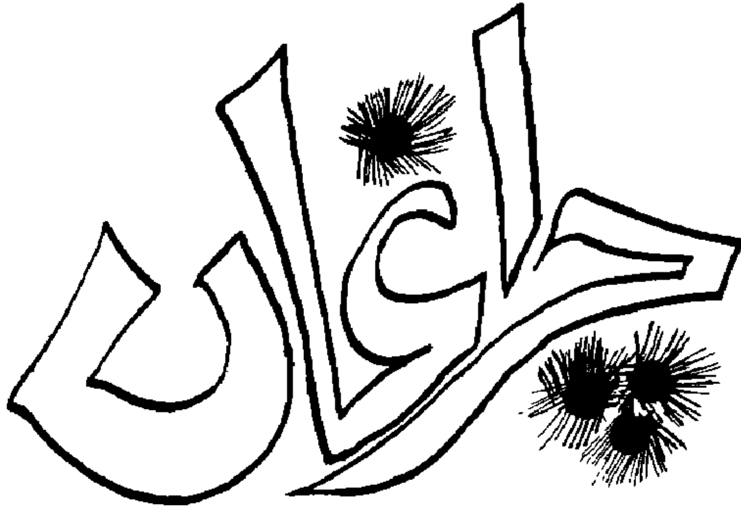
ترسیل زر کا پتہ :

بزنس منیجر
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۲۳۔آر، این، مکھرجی روڈ ۔ کلکتہ ۔ ۱۰۰۰۱



۲۶ جنوری ۱۹۸۶ء کو ریڈ روڈ کلکتہ میں یوم جمہوریہ کے موقع پر مغربی بنگال کے گورنر شری اوما شنکر دکشت پیریڈ کی سلامی لیتے ہوئے ۔ تصویر میں مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو کو بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔

سرورق اور آخری صفحہ پر : یوم جمہوریہ ۸۶ء کے موقع پر ریڈ روڈ کلکتہ میں پیریڈ اور ترقیاتی جھانکیوں کے مناظر



کیفی اعظمی



ایک[۱] دو[۲] بھی نہیں چھتیس[۳۶] دیئے
ایک اک کر کے جلائے میں نے
اک دیا نام کا آزادی کے
چاہے جس ملک سے گیہوں مانگو
ہاتھ پھیلانے کی آزادی ہے

اک دیا نام کا خوشحالی کے
اس کے جلتے ہی یہ معلوم ہوا
کتنی بدحالی ہے
پیٹ خالی ہے مرا جیب مری خالی ہے

اک دیا نام کا یکجہتی کے
روشنی اس کی جہاں تک پہونچی
قوم کو لڑتے جھگڑتے دیکھا
ماں کے آنچل میں ہیں جتنے پیوند
سب کو اک ساتھ ادھڑتے دیکھا

دور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیئے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکہ نہ منڈیر
طاق سپنوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصے کا اک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیئے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے!

"ہماری ریاست کو ہندوستانی ثقافت کا گہوارہ کہتے ہیں"

اوما شنکر دکشت : گورنر مغربی بنگال

سال گزشتہ ہندوستان کے لئے مجموعی طور پر ملاپ اور نو تعمیر کا سال رہا ہے۔ اس ریاست کو ہندوستانی ثقافت کا گہوارہ کہتے ہیں اور اس بات کو سراہتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ شانتی نکیتن میں مشرقی علاقہ کے لئے ثقافتی مرکز قائم کیا جائے۔ شری اوما شنکر دکشت، گورنر مغربی بنگال نے، ۲۶ جنوری ۱۹۸۶ء کی شام کو آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں تقریر کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ گورنر کی اس تقریر کا متن درج ذیل ہے:

ہندوستان کے یوم جمہوریہ کی ۳۶ ویں سالگرہ کے مبارک موقع پر میں مغربی بنگال کے عوام کو اپنا دلی مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

سال گزشتہ ہندوستان کے لئے مجموعی طور پر ملاپ اور نو تعمیر کا سال رہا ہے۔ ملک کے چند علاقوں میں کچھ دنوں تک تخریب پسندی کے مناظر رونما ہوئے، لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کی اچھی سوجھ بوجھ سے صورتحال آخر میں معمول پر آگئی۔ بدقسمتی سے دنیا کے بہت سارے علاقوں میں تخریب پسندی کے حربہ کو روبہ استعمال لایا جارہا ہے۔ ہم اس بات کی امید کر سکتے ہیں کہ بہت ہی جلد یا کچھ عرصہ میں سبھوں پر یہ حقیقت عیاں ہوجائے گی کہ سیاسی اغراض کی حصولیابی کے لئے ایسے ہتھیار بے ثمر ثابت ہوں گے۔

علاقہ پرستی اور فرقہ واریت نے بھی ملک کے چند علاقوں میں اپنے سر اٹھائے ہیں۔ یہ بات نہایت تشفی بخش ہے کہ ان تمام رجحانات کا مغربی بنگال کے عوام پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہاں کے عوام کا ملک کی وحدت پر اور جمہوریت اور آزادی کے لئے اس کے اعلیٰ تصورات پر یقین کامل ہے۔ ہندوستان کے انوکھے دستور کے تحت باہمی مفادات کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد مرکز اور ریاست کے درمیان ہم آہنگ تعلقات کی بنیاد پر ریاستوں کی مکمل ترقی کے لئے امکانات روشن ہیں۔ مجھے اس بات کی قوی امید ہے کہ ریاست کے شہری، آبادی کے تمام طبقوں کے درمیان ہم آہنگ تعلقات کو فروغ دیتے رہیں گے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہماری ریاست میں جہاں تک ممکن ہوسکا باضابطہ انتخابات منعقد کرا کے اور پنچایت راج نظام کی تکمیل کے ذریعہ سماج کی تمام سطحوں پر جمہوریت کے طریقہ کار کو روبہ عمل لانے اور اقلیتوں اور دیگر شہریوں کے حقوق کے تحفظ کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا ممکن ہوسکا۔

میں اس بات سے واقف ہوں کہ اس ریاست کے بہت سارے مسائل ہیں اور یہ ریاست بہت ساری دشواریوں سے دوچار ہے لیکن مجھے اس بات پر پورا بھروسہ ہے کہ میری حکومت اپنی انتھک محنت اور عوام کے سرگرم تعاون کے ذریعہ آہستہ آہستہ اور مستحکم طور پر ان دشواریوں پر قابو پالے گی اور اسی طرح اس ریاست کے لئے ایک روشن مستقبل کی راہیں ہموار ہو جائیں گی۔ میری ریاست میں زرعی پیداوار میں کافی بہتری ہوئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مضافاتی علاقوں میں اس ریاست نے عوام، برگداروں، پٹہ داروں، حاشیائی اور چھوٹے کسانوں کی زندگی کے معیار میں بہتری لانے کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مضافاتی اور شہری علاقوں میں واقع چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو بھی حکومت کی طرف سے کافی امداد فراہم کی

جا رہی ہے۔ سالٹ لیک میں الیکٹرونکس کمپلکس کے قیام اور مشترکہ سیکٹر میں شامل ہونے کے فیصلے نے بڑے پیمانہ کے صنعتی سیکٹر میں بھی ایک روشن مستقبل کو عیاں کر دیا ہے۔ مشترکہ سیکٹر میں ہلدیہ میں پیٹرو۔ کیمیکل صنعتوں کے قیام کے سلسلے میں ٹھوس اقدامات کئے گئے ہیں۔ بڑے پیمانہ کے سیکٹر میں روایتی صنعتوں کی سست رفتاری کی روک تھام کرنے اور انہیں ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے یہ تمام کوششیں کافی حد تک ثمر آور ثابت ہوں گی اور اس ریاست کی معیشت کو مستحکم بنانے میں کافی مدد دے گی۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج اس ریاست میں صنعتی ماحول کافی بہتر ہے 'خود روزگار اسکیم' جسے حال ہی میں رائج کیا گیا ہے اور بڑے پیمانہ کے پروجیکٹس جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، یہ دونوں اس ریاست میں بے روزگاری کے شدید مسئلہ کو حل کرنے میں کافی معاون ثابت ہوں گے۔

میری حکومت نے اس بات پر مسلسل زور دیا ہے کہ مفت لازمی تعلیم کو عام بنا دیا جائے۔ مغربی بنگال میں کلاس XII تک تعلیم مفت کر دی گئی ہے۔ ریاست کی چند یونیورسٹیوں کی صورت حال سے ریاستی حکومت کو تشویش لاحق ہو گئی تھی لیکن یہ بات باعث مسرت ہے کہ اعلان کردہ حالیہ پالیسیاں یقیناً حالات کو سنوار دیں گی اور ان اداروں کیلئے معاون ثابت ہوں گی کہ وہ سب تیزی سے اپنے کام کاج کو جاری رکھ سکیں اور تشفی بخش تعلیمی نتائج برآمد کر لیں۔

چند ہفتے قبل شانتی نکیتن میں مشرقی علاقائی ثقافتی مرکز کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم نے اس ریاست کے اعلیٰ ثقافتی روایت کا ذکر کیا تھا۔ اس ریاست کو ہندوستانی ثقافت کا گہوارہ کہتے ہیں اور اس بات کو سراہتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ شانتی نکیتن میں مشرقی علاقہ کے لئے ثقافتی مرکز قائم کیا جائے۔

ہمارا ملک بہت وسیع ہے۔ یہاں مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے لوگ آباد ہیں۔ مختلف ثقافتیں پاس پاس موجود ہیں اور ہمارے قومی ڈھانچہ کو مزین کرتی ہیں۔ ہمارے ملک کی یہ اتحاد بلاشبہ کثرت میں وحدت ہے۔

اس یادگار موقع پر میں مغربی بنگال کے عوام سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ سب جمہوریت اور قومی یکجہتی کے عظیم تر مطمعِ نظر کے لئے خود کو از سر نو وقف کر دیں اور ہمارے عظیم ملک کی شان و شوکت کو برقرار رکھنے کے لئے از سر نو عہد کریں۔ میں ایک بار پھر اس ریاست کے لوگوں کو اپنی پر خلوص خواہشات پیش کرتا ہوں۔

بقیہ: دستورِ ہند اور عوامی توقعات

"شہریوں" کا ایک بڑا حلقہ اس انصاف سے محروم رہتا ہے جس کا وعدہ دستور العمل میں موجود ہے۔

ہمارے دستور العمل اور اس کے تحت جاری شدہ قوانین میں یہ احکام موجود ہیں کہ (۱) جب تک کسی قانونی عدالت سے کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے وہ بے گناہ تصور کیا جائے (۲) مذہب و ذات، رنگ و نسل، عقیدہ و عمل کی بنیاد پر شہریوں کے درمیان ان کے جائز حقوق کے لئے کوئی امتیاز نہ کیا جائے (۳) فکر و اظہارِ خیال کی آزادی کا احترام کیا جائے وغیرہ۔ لیکن گزشتہ اڑتیس برسوں کے دوران میں یہی دیکھا گیا ہے کہ حوالاتیوں میں ملزموں کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں۔ انہیں لنجا یا اپاہج بنا دیا گیا، انہیں مار ڈالا گیا۔ ذات و مذہب، رنگ و نسل اور عقائد کے فرق کو بنیاد بنا کر بات بات پر پورے ملک میں تقریباً ہر ماہ اقلیت کش فسادات ہوتے رہے۔ اگر عمالِ حکومت دستور العمل کی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے قوانین کو ماننے اور منوانے پر کما حقہ کاربند ہوں تو وہ عوامی جمہوریت صحیح معنوں میں سامنے آ جائے جس کا اعلان ۲۶ نومبر سنہ ۱۹۴۹ء میں کیا گیا اور جس کا نفاذ ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو عمل میں آیا۔

مجموعی طور پر اگر غور کیا جائے تو ہمارا دستور العمل ایشیا کے تمام نو آزاد ملکوں کے مقابلے میں زیادہ جامع، جمہوریت انگیز اور مساواتِ انسانی کا علمبردار نظر آئے گا جس پر ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ آج نہیں تو کل وہ دن ضرور آئے گا جب اسی دستور العمل کے تحت ہندوستان کے عوام کی وہ توقعات ضرور پوری ہوں گی جن کے وہ منتظر ہیں۔

منزل کا ترانہ

(یومِ جمہوریہ کے موقع پر جمہوریت پسند قوتوں کے نام)

آندھیوں میں بھی چراغِ زندگی جلتا رہے
عزم و استقلال کے سانچے میں دل ڈھلتا رہے
شوقِ منزل آرزوؤں کی طرح پلتا رہے
راستے میں آئے جو طوفان وہ ٹلتا رہے
قافلہ چلتا رہے، چلتا رہے چلتا رہے

ہے گھنا جنگل بھیانک بیکراں صحرا بھی ہے
راہ میں آتش فشاں بھی آگ کا دریا بھی ہے
ہر قدم ہر آن لٹ جانے کا اک کھٹکا بھی ہے
جھاڑیاں پُر خار ہیں لیکن ہمیں جانا بھی ہے
ہے وہی باحوصلہ طوفاں کو جو چھلتا رہے

اونچی نیچی گھاٹیاں، کہسار، ٹیلے ندیاں!
دور تک پھیلی ببولوں کی منظّم ڈالیاں
زہر سے بد مست کالی ناگنوں کی جھاڑیاں
منزلوں سے دشمنی کرتی ہوئی پگڈنڈیاں
مشکلوں کی چھاتیوں پر مونگ یوں دلتا رہے

سازشوں کے دام میں پھیلے ہوئے چاروں طرف
ہر گلی کے موڑ پر بیٹھے ہیں رہزن صف بہ صف
پیکرِ غیظ و غضب، شعلہ دہن، خنجر بکف
رہروانِ راہِ منزل بن نہیں سکتے ہدف
آستیں میں سانپ جو پلتا ہے وہ پلتا رہے

دور سے آتی ہے یہ آوازِ منزل دور ہے
رات کے پردے میں پنہاں صبحِ نو کا نور ہے
درحقیقت ہر مسافر ہی تھکن سے چور ہے
پھر بھی تھک کر بیٹھنا راہوں میں کب منظور ہے
خاک چہرے پر وفورِ شوق سے ملتا رہے

قافلے کو روک لے ایسی کوئی مشکل نہیں
راستے میں کوہِ غم حائل سہی حائل نہیں
راہزن سے خوف جس دل میں ہو وہ دل دل نہیں
پاؤں تھک جائیں جہاں وہ آخری منزل نہیں
وہ ہے بزدل جو کفِ افسوس ہی ملتا رہے

ان گنت اشجار اپنے ہمسفر ہیں راہ میں
ہم قدم ہیں ہم زباں ہیں ہم نظر ہیں راہ میں
کیسے کیسے اہلِ دانش راہبر ہیں راہ میں
یہ حقیقت ہے مناظر پُر خطر ہیں راہ میں
ہے وہی منزل طلب، رہزن کو جو کھلتا رہے

رات کی تاریکیوں کا ہم بھی دیکھیں گے دماغ
پاؤں کے چھالے ہوں مشعل، دیپ ہوں سینے کے داغ
نور کی صہبا سے خالی ہیں ستاروں کے ایاغ
جگنوؤں سے مل نہیں سکتا ہے منزل کا سراغ
شمع کی صورت ہمارا نقشِ پا جلتا رہے

رات پگھلے گی سحر ہوگی تو دن بھی آئے گا
اپنے دامن میں زمانے بھر کی خوشیاں لائے گا
غم کا بادل آسماں کی سطح سے چھٹ جائے گا
ہر مسافر اپنی منزل کا ترانہ گائے گا
غم نہیں کوئی حسد کی آگ میں جلتا رہے
قافلہ چلتا رہے چلتا رہے چلتا رہے

حامی گورکھپوری



مزدور تحریک اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد

محمد امین

مغل حکومت کے آخری دور میں ہندوستان کی جاگیردارانہ معیشت جس انجماد اور بحران کا شکار ہوگئی تھی اس سے نکلنے کے لئے سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب کی ضرورت تھی لیکن صنعت اور ٹکنولوجی یورپ کی سرحدوں سے نکل نہیں پائی تھی۔ اس طرح ایک معاشی سیاسی خلا پیدا ہوگیا تھا۔ انگریز تاجر اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے شروع میں خوشامد پھر توڑ جوڑ سازش اور آخر میں بے ایمانی اور طاقت کے بل بوتے پر اس ملک پر قبضہ کرلیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب برطانیہ دنیا کا مضبوط ترین بحری طاقت بن چکا تھا۔ آتشیں ہتھیاروں میں بھی اسے فوقیت حاصل تھی اور برطانیہ میں کل کارخانہ کا نظام قائم ہوچکا تھا۔

ہندوستان کے عوام جاگیردارانہ نظام کی حدبندیوں کی وجہ سے بے یار و مددگار اور لوٹ کے شکار تھے لیکن مغل حکومت کے خاتمے پر اور انگریزی حکومت کے برسراقتدار آنے پر رنجیدہ ضرور تھے۔ اسی لئے بکسر کی جنگ کے بعد بھی جو ہندوستان کے انگریز مخالف سارے حکمرانوں کے قائم کردہ متحدہ محاذ کی جنگ تھی جس میں انگریزوں کو فتح ہوگئی اور برطانوی اقتدار مکمل ہوگیا، ہندوستان کے محب وطن عوام کبھی بھی چین سے نہیں بیٹھے۔ برطانوی جبر و استبداد اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف ہندوؤں، مسلمانوں، سنیاسیوں، قبائلیوں، کسانوں کی ہزار بغاوتیں ہوئیں جو کچل دی گئیں۔ ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی ان ہی بغاوتوں کا نقطہ عروج تھی جو بعض تاریخی اسباب کی بنا پر اگرچہ ناکام رہی لیکن جنگ آزادی کے پورے دور پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئی جس کا ذکر تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ سنہرے حروف میں کیا جاتا رہے گا۔

اس واقعہ نے انگریز حکمرانوں کا انداز فکر بھی بدل دیا اور انہوں نے اس ملک کو سامراجی لوٹ کھسوٹ کے لئے ایک حد تک صنعت بند کرنے کا فیصلہ کیا۔

ریلوے لائن بچھانے کا کام شروع ہوگیا۔ ہندوستانی عوام تو ریلوے لائن کے دور رس اثرات کا اندازہ نہیں لگا سکے لیکن لندن میں بیٹھ کر کارل مارکس نے اس واقعہ پر ایک تاریخی تبصرہ کیا۔ اس عقاب چشم عالم نے نیویارک ہیرالڈ ٹریبیون میں یکے بعد دیگرے تین مضامین لکھے جن میں لکھا کہ برطانوی سامراجیوں نے ہندوستان میں ریلوے لائن بچھانے کا جو کام شروع کیا ہے یہ اگرچہ انہوں نے فوری طور پر اپنے سامراجی مقاصد پورے کرنے کے لئے کیا ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ اس کے ذریعہ انہوں نے اپنی قبر کھود دی ہے جس میں ایک دن انہیں دفن کردیا جائے گا۔

کارل مارکس نے اپنے مضامین میں وضاحت کی کہ ریلوے لائن بچھانے کا مطلب یہ ہوا کہ اب ریل گاڑی چلے گی اور کوئلہ، لوہا، پٹ سن، کپاس، خام مال ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچانے کا انتظام ہوگا۔ بجلی گھر بنیں گے اور کل کارخانے قائم ہوں گے یعنی ہندوستانی سماج میں دو نئے طبقوں کا جنم ہوگا۔ کارخانہ دار سرمایہ دار اور مزدور طبقہ، اس کے بعد ان دونوں طبقوں کا مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے گا۔ مزدور طبقہ زندگی کی جدوجہد کے اندر سے دیکھے گا کہ کارخانہ دار کی سب سے بڑی مددگار برطانوی حکومت ہے اس لئے اس حکومت کے خلاف ہی جدوجہد کرنا ہوگی اس طرح یہ نیا طاقتور انقلابی طبقہ برطانوی سامراجی حکومت

کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ تب ہی اسے سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ سے بھی نجات ملے گی۔

مزدور طبقہ کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہی سوتا کل، جیٹ کل، انجینئرنگ، چائے باغات، کاغذ کل، ریلوے، ربر کے باغات اور چھوٹی بڑی دیگر تمام صنعتوں کے مزدور روزی روٹی کے مطالبے اور کام کے بہتر حالات کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کے مطالبہ پر بھی جدوجہد کرنے لگے۔

۱۹۲۰ء میں جب آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو اس کے نصب العین میں برطانوی حکومت کا خاتمہ اور سوشلزم شامل کیا گیا۔ کانگریسی، سوشلسٹ، کمیونسٹ سب نے اس مزدور تنظیم میں کام کیا۔

۱۹۰۸ء میں بمبئی میں بال گنگادھر تلک کی گرفتاری کے خلاف جو عام ہڑتال ہوئی تھی اس میں بمبئی کے مزدور طبقہ نے قائدانہ رول ادا کیا تھا جس کی سراہنا کرتے ہوئے لینن نے لکھا تھا کہ ہندوستان کا مزدور طبقہ بیدار ہو رہا ہے۔

اس کے بعد ہڑتالوں اور تحریکوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالے باغ کے قتلِ عام کے خلاف ملک گیر احتجاجی تحریکوں کی جو لہر چل پڑی تھی اس میں بھی مزدور طبقہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ برطانوی دورِ حکومت میں دو مرتبہ جیٹ کل صنعت میں بڑی ہڑتالیں ہوئیں۔ پہلی ہڑتال ۱۹۲۹ء اور دوسری ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی۔

پورے برطانوی دورِ حکومت میں ان گنت مزدور رہنماؤں کو لاٹھی، گولی اور جیل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان گنت لوگوں کو کام سے نکالا گیا، اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں لیکن مزدور تحریک بڑھتی گئی۔ کانپور سازش کیس اور میرٹھ سازش کیس میں تمام چوٹی کے مزدور لیڈروں کو گرفتار کر کے مقدمے چلائے گئے، سزائیں دی گئیں لیکن نتیجہ الٹا نکلا۔ عدالت میں یہ مزدور رہنما اپنی صفائی میں جو کچھ کہتے وہ دوسرے دن اخبارات میں چھپتا اور اسی طرح یہ مقدمے مزدور تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کا زبردست وسیلہ بن گئے۔ کامریڈ مظفر احمد ان دونوں مقدموں میں ملزم بنائے گئے تھے۔

۱۹۴۶ء میں بمبئی میں جہازیوں کی بغاوت ہوئی جس کی حمایت میں پورا بمبئی شہر سڑکوں پر آ گیا تھا اور تمام کارخانے بند ہو گئے تھے۔ اسی طرح آزاد ہند فوج کے کپتان رشید علی کی رہائی کے مطالبہ پر کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی نے مشترکہ طور پر رشید علی ڈے منانے کا اعلان کیا اور کلکتہ سمیت بنگال کے تمام کل کارخانے بند ہو گئے۔ اس کے بعد مزدور طبقہ کی آخری منظم جدوجہد جولائی مہینے میں ہوئی جب ڈاک اور تار کے ملازمین کی ہڑتال کی حمایت میں بنگال صوبائی ٹریڈ یونین کانگریس کی پکار پر کلکتہ سمیت تمام صنعتوں میں ۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو عام ہڑتال منائی گئی اور کلکتہ میدان میں یادگار اجتماع ہوا جس سے بنکم مکھرجی، عبدالمومن، محمد اسمٰعیل اور دیگر لیڈروں نے خطاب کیا۔

اس عام ہڑتال نے برطانوی حکمرانوں کے دلوں پر دہشت بٹھا دی اور انہوں نے کارل مارکس کی پیشن گوئی کے مطابق مزدور طبقہ کے ہاتھوں دفن ہونے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس ملک کے عوام کو ان ہی کے خون میں نہلا دینے کی سازش میں مصروف ہو گئے۔

جو کلکتہ شہر ۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا وہی کلکتہ شہر ۱۷ دنوں کے بعد ۱۶ر اگست ۴۶ء کو فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں جلنے لگا۔ یہ فساد مسلم لیگ کے ڈائریکٹ ایکشن کے ذریعہ شروع ہوا جب مسلم لیگ کے حامی جلوس بنا کر کلکتہ آنے لگے اور اسی میدان میں جہاں ۲۹ر جولائی ۴۶ء کا مزدور اجتماع ہوا تھا، بنگال کے مسلم لیگی وزیر اعظم حسن شہید سہروردی نے ایک اشتعال انگیز تقریر کر کے شہر کو شعلوں کے حوالے کرنے کا اہتمام کر دیا۔

کلکتہ کے بعد نواکھالی اور پھر بہار اور اس کے بعد پورا پنجاب جلنے لگا اور ان ہی حالات کے تحت ملک کو بٹوارہ کرنے کا انگریزوں کا منصوبہ ہندوستان کے عوام پر مسلط کر دیا گیا۔ اس طرح ہندوستان کی آزادی کے متعلق مزدور طبقہ کے کردار کے بارے میں کارل مارکس نے جو پیشن گوئی کی تھی اس کا آخری حصہ تشنۂ تکمیل رہ گیا اور ملک کے بٹوارے نے ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر)



حیدر صفت

اور اس روز
جب ہم بہت خوش ہوئے تھے
ہمارے گھروں کی چھتوں پہ نئے دن کا سورج اگا تھا
ہواؤں میں اک تازگی تھی
سیہ بخت راتوں کو ماضی کا قصہ بتایا گیا تھا
اور اس کا یقیں بھی دلایا گیا تھا
کہ اب ندیاں گنگنائیں گی
فصلیں ہنسیں گی
کہ اب دودھ کی نہر کے پاس خوابوں کے خیمے لگیں گے
کہ اب قریہ قریہ ابھرتی ہوئی لَے
کہ اب جنگلوں اور پہاڑوں کی ہر شے
ہماری ہے اور بس ہمارے لئے ہے

آج کی صبح
اسی روز کی طرح خوش کن سی اک صبح امید ہے
آج کیوں ہم بہت خوش نہیں ہیں!

دستورِ ہند

اور

عوام کی توقعات



کوئی قوم ہو یا جماعت، جرگہ ہو یا قبیلہ، بغیر کسی جغرافیائی حد بندی کے قائم نہیں رہتا۔ وہ جغرافیائی حد بندی دنیا کے تہذیبی مراکز سے چاہے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو، کسی نہ کسی نظام یا دستور کے تحت اس میں بسنے والے اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ وہ نظام یا دستور خود ان لوگوں کا اپنے آپ پر نافذ کیا ہوا ہوتا ہے اور اس جغرافیائی حد بندی کا نام "ریاست" کہلاتا ہے۔

ریاست چھوٹے سے گاؤں سے لے کر بڑے بڑے ملکوں تک کی ہوسکتی ہے۔ ریاست یعنی جغرافیائی حد بندی کا رقبہ کتنا ہی مختصر یا وسیع کیوں نہ ہو ہمیں ہر ریاست کو ایک اکائی مان لینا چاہئے۔ سیاست کی زبان میں ہر ریاست کے باشندے کو "شہری" کہا جاتا ہے۔ اسی لئے ہر باشندے کے شہری حقوق ہوا کرتے ہیں۔ آزاد دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی ریاست کا شہری ہے۔ وہ چاہے بھی تو "شہریت" سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی شخص آزاد دنیا کی کسی ایک ریاست کی شہریت چھوڑتا ہے تو خود بخود اور لازماً کسی دوسری ریاست کا شہری بن جاتا ہے۔ یہ تبدیلی وقتی بھی ہوسکتی ہے اور دائمی بھی۔ ممکن ہے کہ ایک شہری کو اپنی ریاست کے معاملات سے کوئی عملی دلچسپی نہ ہو تاہم اس کی شہریت پر حرف نہیں آتا اور وہ ان تمام مراعات سے نادانستہ طور پر مستفید ہوتا رہتا ہے جو اس ریاست کے دستور نے اپنے ہر شہری کے لئے مقرر کی ہیں۔

ریاست کا دستور العمل اس قطعی اور اساسی قانون کا نام ہے جو کسی ریاست کے باشندے خود اپنے آپ کو عطا کرتے ہیں اور جس کی رہنمائی میں اس ریاست کے دیگر قوانین حسب ضرورت بنتے رہتے ہیں۔

ہم ہندوستانی جب ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو انگریز کی غلامی سے آزاد ہوئے تو پارلیمنٹ کو ایک دستور ساز اسمبلی میں تبدیل کر دیا گیا اور اس اسمبلی نے ۲۶ رنومبر ۱۹۴۹ء کو مملکت ہندوستان کیلئے وہ بنیادی اور اساسی قانون منظور کر لیا جسے آج ہم اپنے ملک کا دستور العمل کہتے ہیں۔ اس دستور کی دفعہ ۳۹۴ کے تحت یہ اعلان کیا گیا کہ ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء سے یہ دستور پورے ہندوستان پر نافذ سمجھا جائے گا۔

اس دستور العمل نے ہندوستان کے عوام کو جن بنیادی اصول موضوعہ کی گارنٹی دی وہ دستور العمل کی تمہید (Preamble) میں یوں موجود ہیں:۔

"تمہید!"

"ہم ہندوستان کے عوام سنجیدگی کے ساتھ عہد کرتے ہوئے کہ ہندوستان کو ایک خود مختار عوامی جمہوریت بنانا ہے تمام شہریوں کے لئے مندرجہ ذیل حقوق حاصل کرتے ہیں:۔

عدل: سماجی، اقتصادی اور سیاسی

آزادی: فکر و اظہار کی۔ عقیدہ، ایمان اور عبادت کی۔

مساوات: درجات و مواقع کی۔

اخوت: شخصی وقار اور اتحاد قومی کی یقین دہی

اپنی دستور ساز اسمبلی میں آج ۲۶ر نومبر ۱۹۴۹ء کو ہم اس دستور العمل کو اپناتے ہیں، نافذ کرتے ہیں اور خود کے حوالے کرتے ہیں۔"

مندرجہ بالا تمہیدی اصولوں پر ہی ہمارے ملک کا پورا دستور العمل قائم ہے۔ ان اصولوں کو قبول کر لینے کے بعد عوام کا خوشگوار ردعمل فطری اور قدرتی تھا اور ہندوستان کے عوام نے اس دستور العمل کی روشنی میں مستقبل کے لئے بہت سی بہتر توقعات وابستہ کر لی تھیں۔

ان اصولوں میں انہیں انصاف کا وہ ترازو نظر آئی جو سبھوں کے لیے برابر تولے! انصاف صرف امیروں اور جاگیرداروں کی خواہشوں اور مرضی کے لئے مختص نہ ہو جائے۔ کہیں اور کوئی بھی زمانہ ہو، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں ناداروں کے لئے انصاف کے دروازے کھلے رہنے کے باوجود بند پائے گئے ہیں۔ قانون جو سب کے لئے یکساں ہو، سماج میں رنگ و نسل و مذہب یا جائے پیدائش کو لے کر امتیاز نہ ہو، اقتصادی طور پر کسی شہری کا استحصال نہ کیا جائے اور سیاست میں کسی ایک فرد یا نسل یا مذہب کا اقتدار نہ ہو۔ ہر شہری کو اپنے مذہب، عقیدے اور ایمان پر قائم رہنے، اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے، آزادانہ طور پر سوچنے، سمجھنے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی آزادی ہو۔ معاشی اور نظام حکومت کے ذریعہ ارتقائے زندگی کے لئے جو مواقع فراہم ہوں وہ کسی خاص فرقے کے لئے مخصوص نہ ہو جائیں۔ وغیرہ۔ یہی وہ توقعات تھیں جو ہندوستان کے عوام یعنی عام شہریوں نے دستور العمل سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

ہمارا دستور العمل ۲۲ حصوں پر مشتمل ہے۔ دستور کے تیسرے حصے میں ہندوستانیوں کو وہ تمام بنیادی حقوق دیے گئے ہیں جو مذکورہ اصول موضوعہ کے تحت آتے ہیں۔

۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو دستور کے نافذ ہوتے ہی تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے۔ سیاسی جماعتوں پر عائد شدہ پابندیاں ہٹالی گئیں۔ ملک بھر کی سڑکوں، گلی کوچوں میں بھائی چارگی کا ایک ایسا منظر اور میل نظر آیا جیسے اس ملک میں کبھی کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوا ہی نہ ہو۔ مختلف فرقوں اور طبقوں کے لوگ، بلا لحاظ مذہب و ملت، ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ پرجوش نوجوان سڑکوں پر نکل آئے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنے لگے۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب ہم خود مختار ہیں، انگریز کی غلامی سے آزاد ہیں، اپنی قسمت کے آپ مالک ہیں۔ اب وطن میں کوئی فساد نہ ہوگا، اب شہروں شہروں، گاؤں گاؤں انسانی خون کی ندیاں نہ بہیں گی۔ اب ۱۹۴۶/۴۷ء کا ہولناک دور کبھی نہ آئے گا۔

لیکن یہ تمام توقعات خواب ثابت ہوئیں، دستور کتنا ہی بلند اور پاکیزہ کیوں نہ ہو، قوانین کتنے ہی خلوص نیت اور مساوات انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے کیوں نہ بنائے جائیں، اگر دستور کی کماحقہ تعمیل نہ ہو، قوانین کو بلا خوف و تعصب کاربند نہ کیا جائے تو ہر دستور کے اصول موضوعہ کی بنیادیں ہل جایا کرتی ہیں اور عوام کی توقعات کا محل اس طرح ڈھئے جاتا ہے جیسے اس محل کی بنیاد ریت پر ہو!

یہی حال فرانس میں ہوا۔ کم و بیش یہی حال ہمارے دستور کا بھی ہوا۔ ہمارے دستور کے اصول موضوعہ انقلاب فرانس (۱۷۹۳ء) کے اس نعرے سے ماخوذ ہیں جو فرانس کے انقلابیوں نے اپنے ملک کی شہنشاہیت کے خلاف بلند کیا تھا یعنی "آزادی، مساوات، اخوت یا موت!" (موت سے مراد یہ تھی کہ اگر نعرے کے اولین تین حقوق عوام کو نہیں ملے تو شہنشاہیت کے لئے سوائے موت کے چارہ نہیں ہے)۔ ہمارا قومی ترنگا پرچم بھی فرانس کے ترنگے پرچم کی تقلید ہے۔ فرانس میں انقلاب آیا۔ صرف وقتی طور پر شہنشاہیت ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ شہنشاہ فرانس (لوئی شانزدہم) اور ملکۂ فرانس کو "گلوٹین" کی نذر کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ شاہی خاندان کا ہر فرد، ہر جاگیردار، ہر گورنر، ہر حاکم اور ان سبھوں کے طرفداروں کو "گلوٹین" کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ہزاروں ہزار افراد قتل کر دیے گئے۔ لیکن انجام کار یہ انقلاب ناکام ہو گیا اور چند برسوں ہی میں دوبارہ شہنشاہیت قائم ہو گئی۔ (اگرچہ اس کی مدت بھی زیادہ عرصے تک نہیں رہی)۔ وجہ یہ تھی کہ انقلابیوں کے پاس نہ کوئی

بنیادی فلسفہ تھا، نہ مستقبل کے لئے کوئی لائحہ عمل اور نہ کوئی رہنما اصول۔ جن نعروں کو لیکر فرانس کے انقلابی آگے بڑھے تھے اقتدار حاصل کرنے کے بعد خود ان پر قائم نہ رہ سکے اور ذاتی مفاد کے شکار ہو گئے۔ آزادی کا سایہ تو باقی رہا لیکن مساوات و اخوت کے خواب ٹوٹ گئے۔

مساوات کے خواب، باوجود دستورالعمل کے تمام عہد و پیمان و اعلان کے، ہمارے یہاں بھی ٹوٹ گئے۔ ایک صحیح عوامی جمہوریت کی اولین پہچان یہ ہے کہ اس میں اقلیتیں اپنے حقوق کی جانب سے مطمئن ہوں، ان کی زندگی کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ ہو جسے وہ اپنے اوپر اکثریت کا ظلم یا استحصال سمجھیں۔ ہندوستان میں مذہبی، عقیدیاتی، نسلی اور لسانی بے شمار اقلیتیں آباد ہیں۔ ہر ایک کے اپنے تہذیبی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل ہیں، ان مسائل کا حل اپنے دستورالعمل کے تحت کچھ بہت مشکل بھی نہیں۔ اس کے باوجود مذہبوں، قبائلیوں اور لسانی اقلیتوں کی مشکلات بلکہ مصیبتیں اپنی جگہ قائم ہیں۔ کوئی سال، کوئی مہینہ، کوئی ہفتہ بلکہ کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرتا جبکہ کسی نہ کسی اقلیت پر اکثریت کا ظلم اخباروں کی خبر نہ بنتا ہو۔ عوامی جمہوریت کی روح کا یہ قتل روزانہ آخر کیوں اور کیسے ہوتا رہتا ہے؟ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اگرچہ دستورالعمل نے ہم ہندوستانیوں کو ہر طرح کے مساوی حقوق عطا کئے ہیں لیکن حکومت کے وہ عمال جن کا تعلق ایک خاص اکثریت سے ہے، اور جو خود بھی اونچی ملازمتوں میں اکثریت رکھتے ہیں، مذہبی یا نسلی اور لسانی عصبیت کا شکار ہیں۔

اس چھوٹے سے مضمون میں یہ تو ممکن نہیں کہ ان تمام مساوات کش اقدام و عمل کا ذکر کیا جا سکے جو متعصب اکثریت کی جانب سے اقلیتوں کے حقوق کے خلاف کئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن لسانی عصبیت کی ایک مثال ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے ہندوستان کی سب سے بڑی اہمیتی زبان اردو کے ساتھ جارحانہ سلوک۔

دستورالعمل کے آٹھویں شیڈول میں ہندوستان کی جن زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں اردو بھی شامل ہے۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں، ایک مکمل تہذیب ہے۔ مشہور عالم فلسفی برٹرینڈ رسل نے ۱۹۱۸ء میں اپنی مشہور تصنیف "آزادی کی راہیں" (Roads To Freedom) میں کہا:

"اس شخص یا قوم کو کیونکر آزاد کہا جا
سکتا ہے جس کی مادری زبان پر پابندی
لگا دی گئی ہو۔ کوئی قوم کبھی ہتھیاروں سے
فنا نہیں ہوتی۔ اس کی زبان مٹا دو، وہ
مٹ جائے گی ــــــــ"

دستورالعمل کی تاریخ کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں خود اہل اردو نے اردو کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جب دستور ساز اسمبلی میں آرٹیکل ۳۴۳ پر بحث شروع ہوئی تو مسئلہ یہ تھا کہ ہندی دفتری زبان ہوگی یا اردو یا دونوں۔ جب بحث ختم ہوئی تو ایوان سے مسلم لیگ کے ارکان واک آؤٹ کر گئے۔ رائے لی گئی۔ پورے جنوبی ہند اور چند اہل اردو اراکین دستور ساز اسمبلی نے اردو کے حق میں اور بقیہ اراکین نے ہندی کے حق میں رائے دی۔ گنتی گنی گئی تو دونوں زبانوں کے طرفداروں کے ووٹ برابر نکلے۔ اب فیصلہ صدر اسمبلی کی رائے سے ہونا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر اسمبلی تھے۔ انہوں نے اپنا "کاسٹنگ ووٹ" ہندی کو دے دیا اور اردو اپنی حیثیت کھو بیٹھی۔ مسلم لیگی اراکین اسمبلی کا واک آؤٹ زبان اردو کی تاریخ کا ایک المیہ بن گیا۔

دستورالعمل اور اس کی بنیاد پر بننے والے قوانین کتنے ہی بے لاگ، مثبت اور محیط کل کیوں نہ ہوں، اگر عمال حکومت ان قوانین کا احترام نہیں کرتے تو عوام کو انصاف و مساوات سے محروم ہونا پڑتا ہے اور دستورالعمل کی روح مجروح ہو جاتی ہے۔ اردو زبان کا معاملہ ہو یا اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت اور انسان کی بنیادی آزادی کا مسئلہ ہو دیکھا گیا ہے کہ خود وہ عمال قانون شکن نظر آتے ہیں جن کے ذمے قوانین کی پیروی و حفاظت ہے۔ مثلاً دستور میں اجازت مساوی کے باوجود جو قوانین برائے تعلیم بنائے جاتے ہیں ان کی تاویلیں چند صوبوں میں عمال حکومت کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ طلباء کے لئے اردو کی ابتدائی یا ثانوی تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا اور اس طرح عوام یعنی

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

ہماری تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ

ڈاکٹر جاوید نہال

کلکتہ اردو نثر کا پہلا اہم مرکز تسلیم کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی داستانیں اردو نثر کی بنیاد تصور کی جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح کلکتہ کو اردو صحافت کی جنم بھومی مانا جاتا ہے۔ اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا جس کی اشاعت کا مقصد سماجی و معاشی برائیوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا تھا جو غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑے رہنے کی وجہ سے اپنے معاشرے میں بھی اصلاح لانے پر دھیان نہیں دے رہے تھے۔ "جام جہاں نما" کے ایڈیٹر ہری ہردت تھے جو بنگالی تھے اور ان کے اندر غلامی کے خلاف بغاوت کی ہلکی چنگاری موجود تھی مگر نامساعد حالات اور حاکم وقت کی چیرہ دستیوں اور ستم رانیوں کے ڈر سے آزادی کی خواہش کا گلا گھونٹتے رہے۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں اردو صحافت کی بنیاد پڑی۔ "جام جہاں نما" کے بعد دارالسلطنت، جبرئیل گوہر آصفی اور شمس الاخبار جیسے اخبارات شائع ہوتے جو چند برسوں تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گئے۔ چونکہ انیسویں صدی میں اردو صحافت حکومت برطانیہ کے خلاف کھل کر بغاوت نہیں کر سکتے تھے اور تقریر و تحریر پر سخت پابندی عائد تھی لہذا اس صدی میں اخبارات نے آزادی کی تحریک اور اس کی کامیابی کے لئے جد و جہد مسلسل میں نمایاں کردار ادا نہیں کیا۔ عوام کا شعور ناپختہ تھا۔ آزادی کا احساس پیدا نہیں ہوا تھا لہذا اس زمانے کے اخبارات ہندوستانی سماج و معاشرے میں اصلاحات لا کر اسے بدلنے کی کوشش میں مدد دے رہے تھے۔

انیسویں صدی کے اخبارات نے جد و جہد آزادی میں براہ راست کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا۔ بیسویں صدی میں اردو صحافت نے نئی شکل اختیار کی۔ اخبارات کے اسلوب میں تبدیلی آئی، اس کی ترتیب بھی نئے ڈھنگ سے ہونے لگی، اخبارات زیادہ باوقار نظر آرہے تھے اور عوام پر اخبارات کی تحریروں کا عمدہ اثر مرتب ہونے لگا۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ ۱۹ویں صدی کے اردو اخبارات میں زیادہ تر اصلاحی پہلو اجاگر کئے جاتے تھے۔ "تحریک آزادی" کا تصور واضح طور پر نہیں ابھرا تھا۔

بیسویں صدی میں مولانا ظفر علی خاں نے روزنامہ "زمیندار" نکالا جس کا بنیادی مقصد بے حس قوم کو غیرت دلانا اور اس کے اندر احساس بیداری پیدا کرنا تھا۔ "زمیندار" دیکھتے ہی دیکھتے عوام کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ آزادی کی ہلکی تڑپ قوم محسوس کرنے لگی۔ "زمیندار" میں مولانا کی سیاسی نظمیں شائع ہونے لگیں جن کی وجہ سے عوام کا انداز فکر بدلا۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم ان مضبوط زنجیروں کو توڑنے کے لئے انگڑائیاں لینے لگیں۔ اردو کا یہ اخبار اسی زمانہ میں ۳۰ ہزار چھپتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں بے مثل نثار اور شاعر تھے اور شعلہ بیان تھے۔ ان کی شعلہ بیانیاں "زمیندار" کے صفحات کی زینت بننے لگیں۔ خوابیدہ عوام کو جھرجھری محسوس ہوئی آزادی کی تڑپ جاگی، زمیندار کی جوشیلی تحریریں، مولانا ظفر علی خاں کی شعلہ بار تخلیقات نثری اور منظوم عوام کے دلوں میں آزادی کی

لہریں جگانے میں محرک ثابت ہوئیں۔ حکومتِ برطانیہ کے خلاف آوازیں سنی جانے لگیں۔ بغاوت کا لاوا اندر اندر پکنے لگا۔ ایوانِ برطانیہ میں زلزلہ سا آ گیا۔ اس کی اینٹیں کھسکنے لگی تھیں۔ زمیندار نے ہلچل سی مچا دی تھی۔ حکومتِ برطانیہ خوف سے کانپنے لگی۔ زمیندار سے تین بار ضمانتیں طلب کی گئیں کیوں کہ پریس ایکٹ کے خلاف اس نے سب سے پہلے صدائے احتجاج بلند کی۔ زمیندار نے اردو صحافت کو وقار بخشا اور اردو صحافت میں نئی تعلیم کے زیور سے آراستہ افراد داخل ہوئے۔ اس فن کو متانت اور سنجیدگی عطا کی گئی۔

مولانا ظفر علی خاں کی شعلہ بیانی کے سبھی قائل تھے۔ وہ بزم کو رزم میں بدلنا اور ڈھالنا جانتے تھے اور ملک میں اصلاحی یا آزادی کی تحریک میں شدت پیدا کرنے میں اسے دستگاہِ کامل حاصل تھی۔ بغاوت کے شعلے بھڑکانے میں ان کی تحریک اپنی مثال آپ تھی۔ یہ اخبار لوگوں کو آزادی کی جدوجہد میں دھکیلنے میں کامیاب ہوا۔ مولانا موصوف کی شعلہ بیانی ۱۹۲۷ء تک جاری رہی پھر یہ شعلے بجھ گئے۔ زمیندار بند ہو گیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں شیخ عبدالقادر نے اپنا مشہور رسالہ "مخزن" نکالا جس میں علامہ اقبال کی جوشیلی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ قومیت کے تصور کی عکاسی ہوتی تھی اور لوگوں کو خوابِ گراں سے اٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ "مخزن" نے انگریزوں، ان کی عریاں تہذیب اور حاکمانہ ذہنیت کی شدید مخالفت کی۔ "سوراجیہ" ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ گرچہ یہ ہفتہ وار تھا لیکن آزادی کی جدوجہد میں اس نے نمایاں حصہ لیا۔ اس میں جوشیلے اور باغیانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ بغاوت کے جرم میں اس کے مدیر کو دس سال کی سزا بھی کاٹنی پڑی تھی۔ بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں کئی معیاری اخبارات شائع ہوئے۔ ان اخبارات کی خدمات آزادی کو ہندوستانی قوم کبھی نہیں بھول پائے گی۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے روزنامے "الہلال" اور مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "ہمدرد" (انگریزی میں کامریڈ) کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کیوں کہ ان اخبارات کے ہر صفحہ میں ہندوستانی قوم

کی دھڑکن چھپی ہوتی تھی۔ مولانا آزاد کے "الہلال" نے اردو صحافت کی کایا پلٹ دی۔ اسے نیا رنگ و روغن دیا اور معنوی و صوری اعتبار سے "الہلال" اپنے زمانہ کا اہم ترین اخبار مانا گیا ہے۔ ان کا اپنا صحافتی نظریہ تھا جس کے متعلق انہوں نے خود الہلال میں تحریر کیا تھا کہ:

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں
بلکہ تلاشِ زیاں و نقصان میں آئے ہیں۔ داد و تحسین
کے لئے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں۔
دنیا کے سیم و زر کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ
خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہی خلوص، ان کی ایمانداری، قوم کی بے لوث خدمت کی تڑپ انہیں ہر زمانے کا عظیم ترین صحافی بناتی ہے۔ "الہلال" نے جو نقوش قائم کئے آج بھی زمانہ انہیں مٹا نہ سکا۔ الہلال نے نہ صرف صحافت کا نیا آہنگ اور لب و لہجہ عطا کیا بلکہ بے حس ہندوستانی قوم میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ اس میں نئی روح پیدا کی اور غلامی کے آہنی سلاسل کو کاٹنے اور توڑنے کے لئے اخبار مسلسل ضربیں لگانے لگا۔ عوام نے الہلال کی باغیانہ گرج سنی جو کوہِ ندا کے دیو کی طلسماتی آوازیں تھیں اور لوگ بے اختیار اس کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ عوام میدانِ جنگ میں اس طرح بے خطر کود پڑے جس طرح آتشِ نمرود میں عشق بے خطر کود پڑا تھا۔ بغاوت کی تند موجیں اٹھنے لگیں۔ ایوانِ برطانیہ میں تزلزل پیدا ہونے لگا، حکومت بدحواس ہو گئی۔ بھاری ضمانت طلب کی گئی۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۱۳ء کو الہلال بند ہو گیا کیوں کہ مولانا دو ہزار کی ضمانت داخل نہ کر سکے تھے اور انہیں شہر بدر کر کے رانچی قید خانے میں بھی ڈال دیا گیا۔ اسی دوران پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ آزادی کے متوالوں کی باغیانہ آوازیں دبا دی گئیں۔ ۱۹۲۷ء میں کلکتہ واپس آ کر مولانا نے الہلال دوبارہ نکالا مگر چند ماہ کے اندر ہی بند ہو گیا۔ مولانا نے دوسرا رسالہ "البلاغ" شائع کیا جو زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔

۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی جوہر نے دلی سے ہمدرد جاری

کیا - ہمدرد نے آزادی کی جدوجہد میں نمایاں رول ادا کیا تھا - حکومتِ وقت کی ستم رانیوں اور غلط کاریوں پر سخت نکتہ چینی کرتا تھا، لوگوں کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کی تلقین کرتا تھا - حکومت نے حق گو اخبار کا گلا گھونٹ دینے کے لئے اس پر سنسر شپ عائد کردی تھی - چنانچہ ۱۹۲۶ء میں ہمدرد بھی ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا - مولانا حسن نظامی کے اخبار "توحید" میرٹھ کو بھی آزادی کی تحریک کو مواد دینے کی سزا ملی اور حکومت برطانیہ نے چند ماہ کے بعد اسے بند کرنے کا حکم نافذ کردیا - مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام کو لوگوں کے دلوں میں بغاوت کے شعلے بھڑکانے کے جرم میں قید و بند کی سختیاں بھی جھیلنی پڑیں -

پرتاپ اردو کا پرانا اخبار ہے - مارچ ۱۹۱۹ء کو لاہور سے شائع ہوا - مہاشہ کرشن اس کے مالک و مدیر تھے - اس نے بھی آزادی کی تحریک کو تقویت پہنچانے میں اپنا کردار ادا کیا تھا مہاشہ کرشن پر کئی مقدمے چلے، ضمانت طلب کی گئی اور بالآخر اس "باغی اخبار" کو بند کردیا گیا -

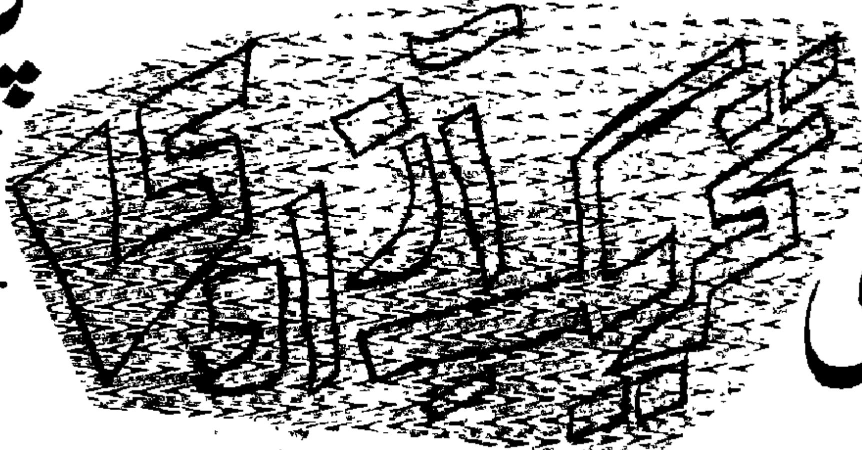
۱۹۱۷ء میں لاہور سے سید حبیب نے "سیاست" نکالا جو اپنی بے باکی، شعلہ بیانی اور حکومتِ برطانیہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے جرم میں بند ہو گیا -

دیوان سنگھ مفتوں بے باک اور نڈر صحافی تھے ان کا اخبار "ریاست" ان کی ذات کی تفسیر تھا - دیوان سنگھ مفتوں کے قلم کی دھار تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز تھی - انہوں نے راجوں مہاراجوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے جبر و استبداد کے کے خلاف آواز بلند کی - ان کی عیش کوشیوں کو بے نقاب کیا - ان پر مقدمات چلائے گئے - انہیں دھمکیاں دی گئیں مگر مفتوں اپنے مسلک و موقف پر قطب کی لاٹ کی طرح اٹل رہے اور آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے - حیدرآباد سے "شعیب" اور "زمانہ" شائع ہوا - محبِ وطن اور قوم پرور (شعیب) مدیر کو مسلم لیگیوں نے متحدہ ہندوستان کی تحریک چلانے کے الزام میں قتل کردیا - ۱۹۲۵ء میں الجمعیتہ شائع ہوا جو قوم پرور اخبار تھا اور آزادی کی جدوجہد کا ساتھ دیتا رہا - ۱۹۲۷ء میں

عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر نے لاہور سے "انقلاب" شائع کیا جو حقیقی معنوں میں انقلاب آفریں ثابت ہوا - اس کی صحافت پر انقلاب کی چھاپ گہری ہوتی چلی گئی اور ۱۹۴۹ء تک جاری رہا - اپنا مشن پورا کر کے بند ہو گیا - اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں ہندوستان بھر میں بہت سارے اخبارات شائع ہوئے جن کا بنیادی مقصد حصولِ آزادی تھا - یہ اخبارات آزادی کی جنگ جیتنے میں پیش پیش رہے - ان کے قلم کاروں پر مظالم ڈھائے گئے مگر ان کی زبان گنگ نہ ہوئی - بغاوت کے شعلے لپکتے چلے جا رہے تھے - آزادی کی تحریک میں شدت پیدا ہو چکی تھی اور ان ہی اخبارات نے آزادی جیتنے کے لئے ہندوستانی قوم کو سر سے کفن باندھ کر میدانِ کارزار میں اترنا سکھایا تھا - ان میں کلکتہ کا اخبار روزانہ ہند بھی تھا جس کے مدیر مولانا رزاق ملیح آبادی تھے جو مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عہد ساز صحافی سے تربیت پائی تھی - آزادی کی جنگ میں روزانہ ہند نے خاصہ کردار ادا کیا - قوم پرور مدیر پر علاحدگی پسند قوتیں وار کرتی رہیں مگر وہ اپنے اصول سے ٹس سے مس نہیں ہوئے - تلوار کے سایے میں بھی اس اخبار نے ہمیشہ سچی مگر کڑوی باتیں لکھیں - آزادی کی جدوجہد میں بنگال نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا - روزانہ ہند بھی بنگال کی سرزمین سے نکلا تھا - "انقلاب" اس کی سرشت میں تھا مگر کلکتہ اور ہندوستان کے مختلف شہروں کی بے باک اردو صحافت نے غلامی کی آہنی زنجیروں کو کاٹ دیا اور اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے افق پر آزادی کا آفتاب طلوع ہوا اور آج ہندوستانی قوم آزادی میں پھل پھول رہی ہے، ترقی کی جانب گامزن ہے - روزانہ ہند کی جگہ مولانا ملیح آبادی نے "آزاد ہند" نکالا جو آج بھی مولانا کی ترتیب شدہ پالیسیوں پر عمل پیرا ہے * * *

سنو اے ساکنانِ بزمِ ہستی
صدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

— جوش ملیح آبادی

ہماری  پر بین الاقوامی حالات کے اثرات

انیس رفیع

برطانوی سامراج کا چراغ انیسویں صدی کے آخری برسوں میں اپنی تابناکی کے عروج پر تھا۔ اس کا خطۂ اقتدار ایک کروڑ تیس لاکھ مربع میل (Square Miles) میں پھیلا تھا۔ ۳۰ کروڑ کی ہندوستانی آبادی بھی اسی وسیع خطے پر آباد تھی۔ فرانس، جرمنی، روس، بلجیم، ہالینڈ، پرتگال اور امریکہ کے زیر اقتدار خطے بھی اس کے سامنے بے حد مختصر تھے اور اس کی معیشت اس قدر مضبوط تھی کہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔

عام طور پر اہل قلم حضرات برطانوی سامراج کی مثال سورج سے دیتے ہیں جو اس کے زیر اقتدار خطے میں کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔ لیکن میں نے قصداً لفظ چراغ کا استعمال کیا ہے کیوں کہ چراغ کا تعلق تیل سے اور بتی سے بھی ہوتا ہے۔ اگر چراغ میں تیل یا بتی نہ ہو تو گل ہو جاتا ہے۔ جبکہ سورج توانائی کا مستقل ذریعہ ہے اور اس کے خاتمے کے آثار لاکھوں برس تک شاید نمایاں نہ ہوں گے۔ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ سامراجیت کی بنیاد ہی معاشی دخل پر رکھی گئی ہے۔ اگر یہ دخل کمزور پڑ جائے تو سامراجیت کی بنیادیں ہل جائیں۔ یعنی چراغ کا تیل کم ہو جائے یا بتی جلتے جلتے مختصر ہو جائے تو پھر روشنی معدوم ہونے لگتی ہے۔ ہماری آزادی کا تعلق بھی ان باتوں سے گہرا ہے۔ اگرچہ یہ باتیں بین الاقوامی معلوم ہوتی ہیں مگر ان کے اثرات ہماری تحریک آزادی پر بھی پڑا ہے۔

دراصل ہماری تحریک آزادی یا آزادی دونوں کو ایک اور بھی زاویہ نظر ہے جس سے کچھ دانشور انہیں دیکھتے ہیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ اگر برطانوی سامراج کے چراغ میں تیل ہوتا یا اس میں جلتے رہنے کی صلاحیت باقی رہتی تو شاید وہ اپنی مقبوضہ کالونی (نوآبادی) سے اپنے خونی پنجے نہیں اکھاڑتا۔ مگر عالمی معاشی ڈھانچے نئے نئے سانچوں میں ڈھلنے لگے اور سامراجی تھوتھنوں میں کانٹے پیوست ہونے لگے۔ اور بیل اس ناند میں تھوتھنے کیوں رکھے جس میں کانٹے گڑے ہوں۔

تو سب سے پہلے ان حالات کا جائزہ لیا جائے جو برطانوی سامراج کی کمزوری اور پھر اس کے خاتمے کا باعث ہوئے۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ تکنیکی ترقی کی وجہ سے سرمایہ کاری کی نوعیت بدلنے لگی لہٰذا وہ سرمایہ دار ممالک جو تکنیکی ترقی میں اس عالم گیر سامراجی قوت سے آگے نکل گئے انہوں نے اپنے پر پرزے نکالنے شروع کیے اور عالمی بازار میں سوداگری کی ہوڑ شروع ہو گئی۔ اور یہ ہوڑ شروع کیوں نہ ہو جبکہ متحدہ امریکہ اور جرمنی نے پہلی جنگ عظیم کے قبل کی دو دہائیوں میں آبادی میں اضافے کے علاوہ لوہے، خام اسپات اور تیار مال کی برآمدات میں اس قدر اضافے کیے کہ برطانیہ کی پیداوار کی شرح مات

کھانے لگی۔ اس کے اثرات چہار دیواری کے اندر اور باہر دونوں جگہ ہوئے۔ داخلی حالات کے ساتھ ساتھ بیرونی حالات بھی بگڑنے لگے۔ گرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کی شروعات میں برطانیہ کو دنیا کے دیگر ممالک کی نظر میں ایک زبردست معاشی و سیاسی مقام حاصل تھا مگر اس کی مثال اس تربوزے کی سی تھی جو اوپر سے تو بہت بڑا اور پرشکوہ لگتا ہے مگر اندر سے کھوکھلا اور پھسپھسا ہوتا ہے۔

برطانیہ کے معاشی حریف آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ داخلی حالات چاہے سماجی ہوں یا سیاسی ابتر ہوتے جا رہے تھے۔ سرمایہ اور محنت کی کشاکشی، حزب مخالف اور حکومت کا ٹکراؤ، عورتوں کے حقوق کا مسئلہ، 'Irish Home Rule' مزدوروں کی مزدوری اور دوسرے مسائل کا شکار برطانیہ اپنے گھر میں ہی افراتفری اور متشدد واقعات سے دوچار تھا۔ ایسے میں جب گھر پھوٹ رہا ہو تو باہر کا دیکھنا کتنا کٹھن ہو جاتا ہے۔ یہ بات برطانوی سامراج بخوبی سمجھتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے دنیا کے اقتصادی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ زر مبادلہ کی حالت خستہ ہو گئی۔ برطانیہ کی بچت اور کمائی میں زبردست کمی آ گئی کیوں کہ بین الاقوامی Surplus میں کمی آ چکی تھی۔ ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ کے ممالک میں آزادی کی لہر تیز ہونے لگی تھی۔ نتیجے میں کئی آزاد اور خود مختار ممالک وجود میں آئے اور برطانیہ کا تجارتی حلقہ سکڑنے لگا۔ متحدہ امریکہ اور جاپان جنگ عظیم کے جھٹکے سے غیر متاثر رہنے کی وجہ سے صنعت کاری کی ریس میں اپنے گھوڑے بڑی تیزی سے دوڑانے لگے۔ یہ دونوں ممالک انگریزی سامراج کے زبردست حریف ہو گئے۔ اس کے علاوہ برطانوی ڈومینس (Dominous) نے بھی انگلینڈ کا دم چھلا بنا رہنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنی خود مختاری کا مطالبہ کیا اور League of Nations کی رکنیت کی بھی مانگ کی۔ ان کے مطالبات پورے ہوئے اور بہت حد تک انہیں خود مختاری حاصل ہو گئی اور جب انگلینڈ میں خود ہی آزادی کی مانگ شروع ہو گئی تھی تو دوسرے ملک میں آزادی کی آواز کیوں نہ بلند ہوتی۔

ہندوستان میں بھی ہنگامہ اٹھا۔ لہذا اسے فرو کرنے کے لئے Govt of India Act 1919 کا انعقاد کرنا پڑا۔

بین الاقوامی رشتے بھی ٹوٹتے پھوٹتے نظر آ رہے تھے۔ League of Nations اپنا وقار کھوتی جا رہی تھی۔ برطانیہ کی پوزیشن دوسرے ممالک کے درمیان خراب ہو رہی تھی۔ توازن بگڑتا جا رہا تھا۔ عالمی طاقت پر اس کی فوقیت ختم ہو رہی تھی جس کا ثبوت واشنگٹن معاہدہ ہے جس کے تحت برطانیہ کو سمندری علاقوں پر فوقیت حاصل نہ رہی۔

جاپان کا چین پر، اٹلی کا ایتھوپیا پر اور جرمنی کا اپنے پڑوسی ملک پر جارحانہ حملہ اس بات کی علامت تھا کہ دنیا پھر ایک جنگ عظیم سے دوچار ہونے والی ہے۔ ایسی صورت میں لاغر ہوتے ہوئے سامراج کے دانت بھی کند ہونے لگے۔ فاشسٹی قوتوں کے عروج سے چشم پوشی اور اس کی مخالفت میں ہونے والے تصادم سے بے پرواہی اس کا خاصہ بن چکا تھا۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ حتی کی جنگ میں بھی شامل نہ ہو۔ مثلاً چیمبرلین نے آسٹریا اور چیکوسلاواکیہ کے تحفظ کی ذمہ داری سے صاف انکار کر دیا۔ چیمبرلین اندرون ملک کی پالیسی میں بھی بری طرح ناکام رہا تھا۔ یعنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں (Dominion) کے دولت مشترکہ کا قیام عملی طور پر نہ ہو سکا جس کے نتیجے میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے داخلی اور بین الاقوامی پالیسی خود مرتب کرنی شروع کر دی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو ۱۹۱۷ء میں ماننٹاگو کے اعلان کے بعد یہاں کے مسائل کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی لہذا ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک ہندوستان میں گاندھی جی کی قیادت میں ایک زبردست بیداری آئی اور آزادی کی تحریک کو ایک نئی توانائی حاصل ہوئی۔ دراصل بیسویں صدی کے آغاز سے ہندوستان جن نامساعد حالات سے دوچار تھا برطانیہ راج ان مسائل کا حل نکالنے میں ناکام رہا تھا۔ بقول ایچ۔ جی ویلس (H.G. Wells) - "برطانیہ راج کی مثال اس آدمی کی سی تھی جو سیڑھی سے لڑھک کر ہاتھی کی گردن پر آ گرا ہو اور یہ سمجھ نہیں پا رہا ہو کہ نیچے کس طرح اترے"۔

جب حال یہ ہو تو سلطنت برطانیہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے کیسے بچ سکتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم نے تو اس

کی کمر ہی توڑ دی ۔ حالت یہ ہوئی کہ خود برطانیہ کو امریکہ کی محتاجی
لاحق ہوگئی سیاسی اور اقتصادی دونوں ہی معاملات میں ۔

اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان میں
یہ احساس شدید ہو رہا تھا کہ ہندوستان کو خواہ مخواہ اس جنگ میں
الجھایا گیا ہے لہٰذا ہر طرف ایک طرح کا احتجاجی ماحول پیدا ہوگیا تھا ۔
نتیجے میں ۱۹۴۲ء میں یہاں بغاوت پھوٹ پڑی ۔ بقول پنڈت جواہر
لال نہرو " ہندوستان ڈوبتے ہوئے سامراج کو بچانے سے انکار
کرتا ہے " سر اسٹیفورڈ کرپس کی سرکردگی میں ایک مشن بھیج
کر یہ وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو اپنی حکومت قائم کرنے
کا موقع دیا جائے گا ۔ پھر بھی ہندوستانیوں کے دلوں میں شکوک
بدستور موجود رہے ۔ اور ہندوستان چھوڑو کا نعرہ بلند ہو ہی گیا ۔
آخرش برطانیہ کو یہ باور کرنا ہی پڑا کہ ہندوستان پر اقتدار جمائے
رکھنا اس کے لئے منافع بخش نہیں ہے ۔ اقتدار قائم رکھنا اس لئے
بھی ناممکن تھا کہ برطانیہ کی بحری برتری بھی امریکہ نے چھین لی تھی ۔

نامساعد حالات اور تمام غلام ملکوں میں قومی شعور کی
بیداری نے برطانیہ کی جڑیں ہلادیں اور برطانیہ زیر اقتدار ممالک
کو آزاد کرنے پر مجبور ہوگیا ۔

تحریک آزادی کی تحریک محض واقعات اور حادثات کا
بیان نہیں ہے بلکہ ایک ایسا موضوع ہے جو فکری سطح پر ہمیں
سماجی ارتقاء کے طریقے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے ۔ نئی فکر اور تازہ
نظریوں کو وجود میں لانا اور پھر انہیں مشتہر کرنا یا فریقین کے مفادات
کے تصادم کا تجزیہ کرنا دراصل تاریخ کے اہم مبادیات ہیں ۔ چنانچہ
تحریک آزادی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت سیاسی جدوجہد کے
بیان کے ساتھ ان فلسفوں اور نظریوں کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے جس
سے مجاہدین آزادی کی فکری تربیت ہوئی ہے ۔ مثلاً ۱۷۸۹ء
کا فرانسیسی انقلاب جس کے محرک والٹیر، روسو، دی دے رو
(Diderot) اور Encyclopaedists تھے، ایشیا
افریقہ کے غلام ممالک کی ذہنی جاگیری کا موجب تھا ۔ ہندوستانی
ذہن نے اس انقلاب کا گہرا اثر لیا ۔ مثال کے طور پر اربندو گھوش اور
سی آر داس یہ دونوں ایسے رہنما تھے جن کا ذہن فرانسیسی انقلاب

سے بے حد متاثر ہوا تھا ۔ ۱۹۱۷ء کا بولشویک انقلاب جو مارکس،
اینگلس اور لینن کی فکر کا نتیجہ تھا ایک ایسا انقلاب تھا جس نے
آزادی کی تحریک پر زبردست اثر ڈالا ۔ صرف یہی نہیں بلکہ باعمل
لیڈران کو جرمن اور اٹالی فلاسفر کانٹ، ہیگل، نیٹشے اور میزینی کے
نظریے نے بھی ایک نئی جہت سے آشنا کرایا ۔ ترکی کے خلاف
تحریک ہندوستان میں بھی شروع ہوئی ۔ ہندوستان کی جدوجہد
آزادی میں شریک نمایاں لیڈران بلاواسطہ یا بالواسطہ ان
بین الاقوامی حالات اور نظریات سے یقیناً متاثر ہوتے تھے ۔ بال
گنگا دھر تلک، رابندر ناتھ ٹیگور، سبھاش چندر بوس، مہاتما گاندھی،
اربندو گھوش، محمود الحسن، ابوالکلام آزاد، محمد اقبال، محمد علی جوہر،
جواہر لال نہرو، سردار پٹیل ۔ سب کے سب کسی نہ کسی بین الاقوامی
نظریے اور تحریک سے ضرور متاثر تھے ۔ ہندوستان کی آزادی کے تصور
کی تشکیل بھی انہی بنیادوں پر کر رہے تھے ۔ جمہوریت، انسانی حقوق،
مساوات یہ تمام قدریں ہماری آزادی کے مجاہدین کے لئے مشعل فکر
تھیں ۔ سماجی برابری کے حصول کو مدنظر رکھتے ہوئے پنڈت جواہر لال
نہرو Socialism کی حمایت کی اور اسی خط پر وہ عملی اور
نظریاتی تجربے کرتے رہے ۔ اور جدید بھارت کی تشکیل میں اہم رول
ادا کیا ۔

ہندوستان کا جدید سیاسی ڈھانچہ دراصل بین الاقوامی
نظریات اور تحریکات کا عکاس ہے ۔ اس کے سیاسی مناظر اب
بین یورپ سے تعلق رکھنے والی دو بڑی تحریکوں مارکسی اور
جمہوری سے عبارت ہیں ۔

بین الاقوامی تحریک نے ہندوستانی عوام کو انقلابی شعور
عطا کیا ۔ اس شعور کی آبیاری ہر سطح پر ہوئی ۔ تہذیبی سطح پر، سیاسی
و سماجی سطح پر اور ادبی سطح پر ۔ ثقافت جو ہماری زندگی کا جزو
لاینفک ہے مارکسی نظریے کو مقبول عام بنانے کا اہم Medium
(ذریعہ) ثابت ہوا ۔ یہ Medium میرا خیال ہے، اس انسانی
اور سائنسی نظریے کو شعور کی کھڑکیوں تک پہونچانے میں کسی
سیاسی پلیٹ فارم سے زیادہ موثر تھا ۔ مظفر احمد، ایم این رائے،
اور دیگر سیاسی رہنماؤں نے عوامی پلیٹ فارم سے اور مارکسی تحریک میں

عملی متحرک شعوریت سے نہ صرف دانشورانہ سطح پر بلکہ عوامی سطح پر آزادی کے تصور کی نئی تشریح پیش کر کے سامراجی قوتوں کے خلاف ایک زبردست رائے عامہ تیار کیا۔ مگر عوام کے دلوں تک اس نظریے کو پہنچانے کا کام Cultural Front (ثقافتی محاذ) نے بڑے ہی پُر تاثیر انداز میں کیا۔ اردو ادب کی ہی مثال لے لیجئے۔ جو چراغ علی سجاد ظہیر نے روشن کیا تھا وہ ۱۹۳۶ء کی پہلی ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے بعد ادب کرنے والوں کی اکثریت اس تحریک کے ساتھ ہوگئی۔ پورے اردو ادب کو رومانیت کے مخملی یا پولشن سے اتار کر حقیقت کی چٹانوں پر کھڑا کر دیا یعنی ادب کی ایک سائنسی اور انقلابی تصویر پیش کی۔ جس نے انسانی حقوق کی بحالی اور طبقاتی جبر کے خاتمے سے قلم کی قوت کو جوڑ دیا۔ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب میں مثلاً بنگلہ، ہندی، انگریزی ادب میں بھی یہ تحریک زوروں پر تھی۔ دانش وروں اور ادیبوں کی خاصی تعداد ہندوستان میں اس نظریے کی حامل تھی۔ اگر ایک ادیب ایک لاکھ آدمی کو اپنی تحریر سے متاثر کرتا ہے تو ہزاروں ادیب و شاعر کروڑوں لوگوں کو متاثر کریں گے۔ پھر ایک بار اردو کی مثال دی جائے تو اقبالؔ، منشی پریم چند، حسرتؔ موہانی، جوشؔ نے اپنی انقلابی تحریروں سے برٹش سامراج کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ ادب کے علاوہ Performing Art کے مادھیم نے ملی آزادی کی لہر تیز کرنے میں زبردست رول ادا کیا۔ مثلاً IPTA کے تھیٹر گروپ اپنے تھیٹر لے کر شہر سے گاؤں تک پہنچ گئے اور براہِ راست عوام میں آزاد ہو جانے کی للک جگائی۔

تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ محض Political Action تبدیلی کی بنیاد نہیں ہوتا بلکہ کسی انقلاب کے لانے میں ہم پلہ کردار نبھاتا ہے۔ تو ہماری آزادی کی تحریک جہاں سیاسی رہنماؤں / سماجی کارکنوں کی مرہونِ منت رہی ہے وہیں ہمارے ادبی و ثقافتی رہنماؤں نے اس تحریک کو اخلاقی مسرت انگیز بنیاد عطا کی ٭٭٭

سرکاری خبریں

دواسازی اور نباتاتی کیمیادی ترقیات کارپوریشن کے ڈائریکٹروں کے بورڈ کی ازسرِ نو تشکیل

حکومت مغربی بنگال نے مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل دواسازی اور نباتاتی کیمیادی ترقیات کارپوریشن کے ڈائریکٹروں کے بورڈ کی ازسرِ نو تشکیل کی ہے:

(۱) پروفیسر ڈاکٹر اے کے شرما، پدما بھوشن — چیئرمین — شعبہ نباتات، کلکتہ یونیورسٹی

(۲) ڈاکٹر ایس. آر. کے چرجی، ڈائرکٹر آف سینکونا اینڈ میڈیکل پلانٹ — منیجنگ ڈائرکٹر۔

(مندرجہ ذیل حضرات اس بورڈ کے ڈائرکٹر ہیں):

(۳) ڈاکٹر ڈی چکرورتی (۴) ڈاکٹر کلیان دت (۵) شری ایم۔این۔پال (۶) ڈاکٹر ایس سی پکراشی (۷) شعبۂ ماحولیات کا نمائندہ (۸) شری مرگلیش سنیال (۹) ڈاکٹر جے داس (۱۰) ایم سی سین گپتا (۱۱) شری آر این بنرجی (۱۱) ڈاکٹر ایس کے چندا ٭٭٭

طوفان سے متاثر ہونے والوں کیلئے مکانات کی تعمیر کیلئے عطیات

ریاستی حکومت کے شعبۂ امداد نے مزید ۵ء۲ لاکھ روپئے بطور عطیہ دینے کی منظوری دی ہے۔ یہ رقم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، مدناپور کے حوالے کر دی جائے گی۔ اس ضلع میں حالیہ طوفان سے جن لوگوں کے مکانات کو نقصان پہنچا ہے یا جن کے مکانات منہدم ہو گئے ہیں ان کے درمیان مکانات کی تعمیر کے لئے مذکورہ رقم بطور تعمیر مکانات عطیہ تقسیم کی جائے گی ٭٭٭





یومِ جمہوریہ کے موقع پر

کہا گیا تھا کہ تیرے ہیں پھول پھل سارے
تمام شہد کے دریا یہ دودھ کی نہریں
کہا یہ میں نے کہ میں کیا کروں یہ نظارے
مزہ تو جب ہے کوئی خوش بدن ہو پہلو میں

تو یوں ہوا کہ بدن کی رفاقتیں بھی ملیں
بدن کے نشے کے آگے کوئی نشہ نہ ٹکا
تمام ذائقے چھوٹے پڑے سبک ٹھیرے

پھر اس کے بعد بہانہ تھا میوۂ ممنوع
عطائے خاص کی صورت مجھے ملا کیا کیا
کہا سنبھال کے یہ کائنات ہے تیری
یہ جزر و مد یہ سمندر یہ شاخِ تر یہ ببول
یہ من و سلویٰ کی بارش یہ مائدہ کا نزول

تمام ذائقے چھوٹے پڑے سبک ٹھیرے
تو پھر یہ پیاز یہ لہسن یہ رت جگے یہ تھکن

کہا یہ میں نے ادب سے کہ اے مرے مالک
یہ کائنات کہاں میں سنبھال کر رکھوں

نظر وسیع مگر جذبۂ قناعت دے
وہ یارِ خوش بدن و گوشۂ فراغت دے

کہا یہ اس نے کہ تیری دعا قبول مگر
وہ اک جنوں کہ جسے کائنات چھوٹی پڑے
ملال یہ ہے کہ دیوار و در میں قید ہوا ؟

تو یوں ہوا کہ زمین و زماں سنبھال لیا
مکاں سنبھال لیا، لامکاں سنبھال لیا

رؤف خیر

اردو ادب میں جمہوری رجحانات

مصطفیٰ اکبر

اردو زبان و ادب کو شروع سے ہی شاہی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اردو ادب جب مغل جاگیرداروں کے مراکز سے نکلا تو مختلف چھوٹے بڑے مرکزوں مثلاً لکھنؤ اور عظیم آباد تک گزر کر رام پور اور نظام حیدرآباد کے دربار میں جا پہونچا۔ شاہی محلوں سے نوابی درباروں تک کے سفر میں اردو کے ادبا و شعرا کو اپنی تعیش پسندی اور سرکار کی قصیدہ خوانی سے اتنی بھی فرصت نہیں تھی کہ وہ رعایا یا عوام کی طرف مڑ کر بھی دیکھیں۔ بدقسمتی کی بات یہ کہ نوابی دربار بھی چھن جانے کے بعد رعایا / عوام کی زندگی انکی توجہ خاص کا مرکز نہ بن سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے ادبا و شعرا جب دربار سے نکلے تو کنج تنہائی میں جا بیٹھے جہاں ماضی کی خوشنما یادیں تھیں، حال کا رونا تھا خوبصورت شہروں کے اجڑ جانے کا غم یا انگریزوں کی مکاری یا سفاکی کے خلاف نفرت کا بیان تھا۔ اُس وقت کی شاعری (غزل، مرثیہ، شہر آشوب، ہجو اور مثنوی) میں انہیں جذبات کے خاکے نظر آتے ہیں۔ ہمیں میرؔ اور غالبؔ جیسے شاعروں کے یہاں بھی ایسے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ یہی تصویر حالیؔ اور ان کے معاصرین کے یہاں بھی صاف دکھائی دیتی ہے ؎

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستانِ گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز (حالیؔ)

مگر حالیؔ اور ان کے ہم عصروں نے محض اسے نہ دھونے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بدحال قوم کی خوشحالی اور ترقی کے لئے سرسید کی سرپرستی میں اصلاحی تحریک چلائی۔ اس تحریک کے زیر اثر ایک نیا ادب پنپنے لگا جس کا موضوع شاہی محلوں سے نکل کر گلی کوچوں میں آ گیا۔ اب روزمرہ کی زندگی اور اس کے مسائل ادب کا موضوع بن گئے مگر باوجودیکہ یہ ادب عوام کا براہ راست نمائندگی نہ کر سکا کیوں کہ یہ تحریک متوسط طبقے کے مفادات تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ عوام کی اکثریت کو اس تحریک سے خاطر خواہ فائدہ نہیں پہونچا اور اس کی وجہ اس تحریک کی سرکاری سرپرستی تھی۔

اس طرح دیکھا جائے تو اردو ادب کے سرکاری نگارخانے میں سامراج، جاگیردار اور متوسط طبقوں کی تصویریں اور خاکے بھرے پڑے ملیں گے اور ان کو اس طرح سجایا گیا ہے کہ ہر دیکھنے والے کی نگاہ بار بار انہی پر پڑتی ہے۔ لیکن ذرا ان تصویروں کو ادھر ادھر ہٹا کر دیکھیں اور بعض تصویروں کے رنگ و روغن کو کھرچ کر نگاہ ڈالیں تو ہمیں عوامی زندگی کے خاکے اور انسان پسندی کی تصویریں بھی صاف نظر آئیں گی۔ اگرچہ یہ خاکے بہت دھندلے ہیں۔ اردو ادب کی طویل تاریخ میں نظیر اکبرآبادی کی مثال دی جا سکتی ہے۔ رنگ و روغن میں لپٹی تصویروں کی بھیڑ میں ایک تصویر ایسی بھی نظر آتی ہے جس میں عوامی زندگی کے خاکے صاف صاف دکھائی دیتے ہیں۔

نظیر اکبرآبادی کو ان کی عوامی نظموں کی ہی بنیاد پر عومیت اور جمہوریت کے آئینہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ سبب یہ کہ ان کی نظموں کے موضوع عوامی ہیں اور ان کا بیان اس طرح کیا

گیا ہے کہ شاعر بھی ان ہی میں سے ایک فرد معلوم ہوتا ہے مگر
نظیر کے یہاں کوئی نظریاتی تصور نہیں ملتا۔

جمہوریت کا اصل تصور اس وقت ابھرا جب لارڈ میکالے
نے ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مفادات کے تحت ایک نیا نظام
تعلیم مسلط کیا۔ نئی انگریزی تعلیم نے جمہوری خیالات کے لئے راستہ
کھول دیا۔ مغربی تعلیم پانے سے بہت سے وکیل، ڈاکٹر، استاد
اور دیگر انتظامی کام کرنے والے پیدا ہوئے اور ۱۹ویں صدی
کے اواخر میں جمہوریت اور شہری حقوق کے جو تصورات رائج
تھے، وہ ان کا مطالبہ کرنے لگے۔ اقبال بھی ان میں سے ایک
مغربی تعلیم یافتہ صاحبِ فکر و نظر تھے جنہوں نے اپنے بیرونی
ممالک کے دورے سے بہت سارے تصورات لائے جن میں
اشتراکیت اور جمہوریت کا تصور بھی تھا۔ جمہوریت کا موجودہ
تصور اردو ادب میں سب سے پہلے اقبال نے
دیا ہے

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

جدوجہد آزادی اور قومی تحریکوں نے اس تصور کو
اور بھی جلا بخشی۔ جس وقت غلامی اور انگریزوں کے خلاف جنگِ
آزادی لڑی جا رہی تھی۔ ایک نئے ہندوستان کا تصور بھی ابھر رہا
تھا۔ یہ تصور اشتراکیتی اور جمہوری ملک کا تھا۔ اردو ادب میں
چونکہ اس تصور کا خمیر پہلے سے موجود تھا لہٰذا اردو شعراء و ادباء
جدوجہد آزادی میں اس تصور کے ساتھ براہِ راست شامل ہو گئے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب جمہوری طاقتوں
نے سوویت یونین کی قیادت میں فاسزم کے خلاف جنگ میں
فتح حاصل کر لی تو امن، اشتراکیت اور جمہوریت کی تحریکوں نے
بہت زور پکڑ لیا۔ اس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑے۔ اس
وقت ہندوستان میں سرمایہ دار طبقہ اور اس کی حکومت عوام
پر مظالم ڈھا رہے تھے۔ عوام کی شہری آزادی اور ان کے
جمہوری حقوق کو سلب کیا جا رہا تھا۔ اس جابر حکومت نے جمہوری
اخباروں اور رسالوں کو بند کر دیا لیکن بدیسی ایجنسیوں اور ہندوستانی
اجارہ داروں کو پوری آزادی تھی کہ وہ سب کو اپنے جال میں پھنسائے
رکھیں اور غیر جمہوری پروپیگنڈہ کرتے رہیں۔ آرٹ اور ادب
بھی اس پروپیگنڈے کی زد میں آیا۔

ایسے ناسازگار حالات میں اردو شعراء و ادباء کا یہ فرض
تھا کہ وہ اظہارِ خیال کے لئے جدوجہد کریں، جمہوری رسالوں اور
اخباروں کو جاری رکھنے کی پوری کوشش کریں اور عوام کے ساتھ مل
کر معیارِ زندگی بڑھانے اور تعلیم و تہذیب اور تمدن کو آزادی کے
ساتھ حاصل کرنے کی جدوجہد میں پورا پورا حصہ لیں۔

جنگِ آزادی کے اس نئے دور میں آرٹ اور ادب کے
اندر ایک نمایاں رجحان ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اردو کے ادباء
و شعراء، لڑائی اور سرمایہ دارانہ تشدد اور عوام کے استحصال کی
مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو امن اور جمہوریت کے لئے
جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ ہیں اور جو پرانے ادب کی جمہوری
روایات کو آگے بڑھانے میں مددگار بھی۔

ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر کی قیادت
میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کی گئی۔ پھر ادباء و شعراء
کو ایک خطِ مستقیم پر چلنے کے لئے منشور مرتب کیا گیا جس میں
دوسرے مقاصد کے ساتھ اس مقصد پر بھی زور دیا گیا کہ ادب اور
دوسرے فنون کو قدامت پسندوں کی اجارہ داری سے نکال کر عام
لوگوں کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنایا جائے، انہیں حقائق
کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم مستقبل روشن کر سکیں۔ ایک
طرف یہ تحریک آزادی کی جدوجہد میں اتحاد قائم کرنے اور ہر مکتبۂ فکر
سے تعلق رکھنے والے عوام کو یکجا کرنے میں مصروف تھی تو دوسری
طرف اس نظریے کو بھی عام کرنے میں کوشاں تھی کہ انسانی سماج میں
مزدور، کسان اور غریب کو بھی وہی حیثیت حاصل ہو جو دوسروں کو
حاصل ہے۔ ادباء و شعراء کی ایک بڑی تعداد اسی نظریے کی اشاعت
کے لئے کاربند عمل ہو گئی نتیجتاً محنت کش عوام اور غریب طبقہ کے حق
میں اردو ادب کا ایک بڑا سرمایہ جمع ہو گیا۔ شاعروں میں فراق،
مجاز، مخدوم، فیض، جذبی، سردار، کیفی، ساحر، پرویز شاہدی
اور علی جواد زیدی اس نئے ادب کی ترجمانی اور جمہوریت کی علمبرداری

کر رہے تھے ۔ سجاد ظہیر، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، ابراہیم جلیس، عزیز احمد کے ناولوں اور افسانوں میں جمہوری قدروں کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی تحریروں کے ذریعہ عوامی زندگی کے پیچیدہ مسائل نت نئے روپ اور رنگ میں ہمارے سامنے آئے ۔ پریم چند نے ملک کی اکثریت کا جو گاؤں میں رہتی ہے اپنے ناول اور افسانوں کے لئے منتخب کیا۔ "گئو دان" ہی کو لیجئے اس ناول میں گاؤں کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئی ہیں جن سے ہم تقریباً ناآشنا تھے۔ انہوں نے اپنی ہر تحریر میں جمہوریت یا عمومیت کی علمبرداری کی ۔

اردو تنقید نے بھی اس تحریک کے زیر اثر زور قلم دکھایا ۔ مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، سردار جعفری وغیرہ کی تنقید نے اس نئے ادب کے جمہوری رجحانات کی پذیرائی کی اور اس نئے ادب کو فروغ دینے کے لئے راستہ ہموار کیا۔

اس تحریک کے زیر قیادت اردو ڈرامے کو نئی جہت عطا کی گئی۔ جمہوریت اور اشتراکیت کو فروغ دینے کے لئے اردو ڈرامے لکھے گئے ۔ انہیں اسٹیج کیا گیا ۔ چوں کہ ڈرامہ کا تعلق براہ راست عوام سے ہے اس لئے اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ۔ اس سلسلے میں IPTA تھیٹر گروپ کی مثال دی جا سکتی ہے جو عوامی و قومی تحریک کو تقویت بخشنے کے لئے شہر سے گاؤں تک پہونچ گیا تھا۔

سیاسی اور ادبی تحریک کے نتیجے میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہو گیا — مگر یہ خواب کہ آزادی کے بعد ملک میں جمہوری نظام قائم ہوگا، سرمایہ داری کا خاتمہ اور مزدوروں کا راج ہوگا، یکسر ٹوٹ گیا ۔ ہمیں ایک بار پھر سوچنا پڑا کہ ہم نے کیا کھو کر کیا پایا ہے ؎

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابن آدم نے
خرد گنوا کے جنوں آزما کے کیا پایا
وہی شکست تمنا وہی غم ایام
نگار زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا — (ساحر)

یہاں سے ترقی پسند ادب میں متانت اور سنجیدگی کی جگہ جھلاہٹ اور بے راہ روی گھر کرنے لگی ۔ ادب میں خونیں انقلاب کی لہر اور اشتعال انگیزی جگہ پانے لگی جو ملک اور ادب دونوں کے لئے نقصان دہ تھی ۔

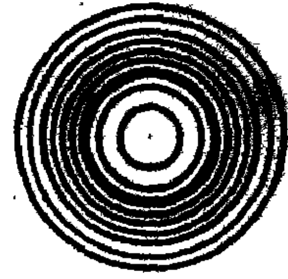
پھر ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان کے عوامی جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا ۔ آزادی کے دن سے ۲۵ جنوری تک اس ملک نے برٹش بادشاہت سے رشتہ قائم کر رکھا تھا ۔ مگر ۲۶ جنوری کے یادگار دن میں سارے ملک میں ہندوستان کے نئے دستور کو رائج کر دیا گیا ۔ ملک بھر میں خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ اردو شعرا بھی اس خوشی میں صدق دل سے شامل ہو گئے ؎

یہی دن قوت جمہور کے آغاز کا دن ہے
دلوں سے تا بہ لب آتی ہوئی آواز کا دن ہے

اس کے بعد اردو ادبا و شعرا کو ملک کی جمہوریت کی بقا کے لئے سوچنا پڑا ۔ ۱۹۵۳ء میں ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی جس میں وضاحت کی گئی کہ "ہندوستانی ادب کا مستقبل مزدور طبقے کی رہنمائی میں لڑتی ہوئی جنتا کے مستقبل سے الگ نہیں ہے جو آج ایک آزاد زندگی، مکمل آزاد، خود مختار جمہوریت اور سوشلزم کیلئے جدوجہد کر رہی ہے" ۔ نیا منشور مرتب ہوا جس میں زور دیا گیا کہ ہمارے ادب کو فنی و فکری اعتبار سے خوبصورت ہونا چاہئے ۔ قومی اور عام پسند ہونا چاہئے ۔ منشور کے ذریعہ تمام ادبا و شعرا سے اپیل کی گئی کہ وہ عوام کی خدمات کے لئے متحد ہو جائیں اور ان کی خوشحال اور پر بہار زندگی کی تعمیر میں اپنی فنی کاوشوں کے ذریعہ ان کی مدد کریں ۔

اردو ادب آج بھی صدق دل سے جمہوریت کی پاسداری اور اس کی نمائندگی کر رہا ہے اور اس کی بقا کے لئے جدوجہد بھی ۔ ۔ ۔

سبز پتوں پہ نام لکھنے سے
پا چکے تم نجات مت کہنا
—— ظفر اوگانوی



جشنِ جمہوریت



انجم عظیم آبادی

یہاں جمہوریت ہے
جشن اس کا ہم مناتے ہیں
سجا کر بام و در اپنے
ترانہ ہائے جمہوری بھی گاتے ہیں
وقار اس کا بڑھاتے ہیں

مگر جب دل ہو رنجیدہ خوشی اچھی نہیں لگتی
غریبی مفلسی میں زندگی اچھی نہیں لگتی

ہماری خواہشیں ہیں
دیش میں ہو امن ہر جانب
نہ ہو فرقہ پرستی کا کہیں چرچا
نہ کھیلی جائے ہرگز خون کی ہولی
سدا ہم پاس رکھیں ایک دوجے کا
نشان اپنے وطن کا قومی یک جہتی ہی کہلائے

یہی خواہش ہماری ہے کہ
اپنے دیش کے پچھڑے ہوئے لوگوں کو
عطا ہو زندگانی کی رمق
اور پھر
جو ہیں غربت کی سطحوں سے بھی نیچے
انہیں خوشحال ہم دیکھیں

ہیں یہ اپنی تمنائیں
نہ ظلم و جبر سے لے کام کوئی
نہ استحصال ہو محنت کشوں کا
تبسم رقص فرما ہو کسانوں
کے بھی ہونٹوں پر
تو پھر جمہوریت کا جشن بھی
کھل کر منائیں ہم!



غزل

نسیم سلطانپوری

تشریح میں اک دل ہوں کس طرح تماشائی
خود اس کی تجلی بھی سو رنگ میں لہرائی

یہ زخم تو کیا دیں گے اب کے جو خراش آئی
کانٹوں سے نپٹ لیں گے پھولوں کے تمنائی

سیرِ رخِ زیبا کے آداب مقرر تھے
جب حد سے بڑھیں نظریں ہم نے بھی سزا پائی

کل اہلِ ہوس بھی کچھ زیبائیاں لے بھاگے
اب اہلِ وفا لوٹیں اس یار کی رعنائی

فرقت میں گزرتی ہے اب عمرِ رواں کیوں کر
ہم سے تو نہ کٹتی تھی اک رات کی تنہائی

وحشی کے گریباں کا ہر تار سلامت ہے
ہم کیسے یقیں کر لیں گلشن میں بہار آئی

ہے سر پہ نسیم اپنے جمہور کا دل بادل!
وہ دور گیا جس میں موزوں بھی تھی دارائی



جدوجہد آزادی انقلاب اور اشتراکیت

از ——— ایم۔ بی نشاط

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

انقلابی شاعر رام پرشاد بسمل یہ شعر کہتے کہتے دار و رسن پر چڑھ گئے اور ان کے ساتھ بہت سارے انقلابیوں نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ ان کی قربانیاں ثمرآور ثابت ہوئیں اور انگریزوں کو یہاں سے تقریباً دو سو سال تک حکومت کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے جانا پڑا۔

آزادی کی جدوجہد تو ۱۸۵۷ء سے ہی شروع ہو چکی تھی، لیکن میں اختصار کے ساتھ موجودہ صدی کی دوسری دہائی کے عرصہ میں رونما ہونے والے انقلابی واقعات کا ذکر کروں گا:

ہندوستان میں اس صدی کی دوسری دہائی کے عرصہ میں انقلابی تخریب پسند نوجوانوں کا ایک طبقہ نمودار ہوا۔ اس طبقہ کا نظریہ تھا کہ ملک کو آزاد کرانے کے لئے تقریر اور تحریر کی نہیں بلکہ تلوار کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ سر سے کفن باندھے میدان عمل میں کود پڑے اور سارے ملک میں انگریزوں کی حکومت سے نبرد آزما ہوئے اور مادر وطن کی آزادی کیلئے اپنی اپنی جان عزیز کی قربانیاں دیں۔ ان انقلابیوں کو تخریب پسند کہا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں وہ ایسے نہ تھے۔ ملک کو آزاد کرانے کے لئے جو کچھ ان سے ہو سکا انہوں نے کیا کیوں کہ وہ اس امر سے اچھی طرح واقف تھے کہ انگریز سامراج انہیں آزادی کو سونے کے طشت میں رکھ کر پیش نہیں کریں گے، بلکہ اس کے لئے انہیں تن، من اور دھن کی قربانی دینی ہوگی اور ہمارے انقلابیوں نے اسے کر دکھایا۔ اس لئے انہیں صرف انقلابی کہا جا سکتا ہے۔

آج ہم لوگ آزادی کے لئے ان نوجوانوں کی عملی کوششوں اور قربانیوں کو سراہتے ہیں لیکن اس زمانہ میں انہیں سارے ملک میں پوشیدہ طور پر اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنا پڑا اس لئے عوام ان کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف نہ ہو سکے، ورنہ ہندوستان ۱۹۴۷ء سے قبل ہی آزاد ہو جاتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس دور کے بہت سارے سیاسی رہنما عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے اور تحریر اور تقریر کے ذریعہ ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ چوں کہ عام لوگوں تک ان کی رسائی تھی اس لئے وہ عام لوگوں کو بھی اپنے خیالات سے متاثر کر سکے۔ اس طرح ہمارے انقلابی تخریب پسند نوجوانوں کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔

اس صدی کی دوسری دہائی کے عرصے میں انقلابی تخریب پسندی تحریک شروع ہوئی۔ اس کی بہت ساری وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ اس سے قبل کی انقلابی تحریکوں جیسی پہلی عالمی جنگ کے دوران راش بہاری بوس اور سچندر ناتھ سانیال کی انقلابی تحریک، ہارڈنگ بم کیس، غدر تحریک، مینپوری سازش اور پہلی لاہور سازش کیس نے بنگال، مہاراشٹر، پنجاب اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں انقلابی تحریک کو جلا بخشی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک چلائی تھی۔ اس ستیہ گرہ میں ہندوستان کے لوگوں نے شرکت کی۔ لیکن چوری چورا میں اس تحریک کے

دوران تشدد کے واقعات رونما ہوئے جس کی وجہ سے گاندھی جی نے
اس تحریک کو اٹھا لیا۔ سارے ہندوستان میں مایوسی اور جھنجھلاہٹ
کی ایک فضا قائم ہو گئی۔ محرک نوجوانوں میں ایک بے چینی پھیل گئی۔
انہوں نے گاندھیائی سیاست کو خیرباد کہا اور اس کا بادل راستہ
تلاش کرنے لگے۔ آخر میں وہ منزل انہیں مل گئی۔ ایک طرف
وہ اشتراکیت سے تو وہ دوسری طرف تخریب پسندی سے روشناس
ہو گئے۔ نوجوانوں نے ان دونوں کو اپنایا جس طرح نصف صدی
قبل روس کے انقلابی نوجوانوں نے کیا تھا۔

تیسری بات جس نے محرک نوجوانوں کو متاثر کیا وہ تھی
پہلی جنگ عظیم کے بعد محنت کش طبقہ کی بیداری۔ انقلابی تحریک
کے رہنماؤں نے اس نئی سماجی طاقت کا غائر مطالعہ کیا۔ اس نئے
طبقہ میں انہیں انقلابی امکانات کی جھلکیاں نظر آئیں۔ محنت کش
طبقہ کی اہمیت اور اثر کا ۱۹۲۸ء میں بہت شدت سے احساس
ہوا جب سارے ملک میں محنت کشوں کی ہڑتال پھیل گئی۔

نوجوان انقلابیوں پر روسی انقلاب کا اور اس نئے
سوشلسٹ ریاست کا، اندرون ملک بہت ساری دشواریوں
کے باوجود اور طاقتور بیرونی دشمنوں کے خلاف خود کو مستحکم بنانے
میں کامیابی کا اچھا خاصہ اثر ہوا۔ اسی کی وجہ سے نوجوان انقلابیوں
نے مارکسی ادب اور اشتراکیت پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرنا
شروع کیا۔ یوں تو ۱۹۲۴ء سے یہاں کے انقلابیوں نے سوویت
انقلاب اور کمیونزم پر گفت و شنید کرنی شروع کردی تھی۔ لالہ
لجپت رائے نے دوارکا داس لائبریری قائم کی تھی جہاں سوویت
روس سے متعلق کتابیں رکھی گئی تھیں۔ اس وقت ہندوستان
میں برطانوی حکومت نے انتہائی بہت کوشش کی کہ سوویت
روس کی خبریں یہاں نہ آنے پائے لیکن اسے ناکامی ہوئی اور بہت سارے
ذرائع سے سوویت انقلاب کی خبریں یہاں آنے لگیں اور یہاں
کے عوام دوست رہبروں اور نوجوانوں کے دلوں میں انقلاب کی
ایک نئی جوت جگا دی۔ اگست ۱۹۲۸ء میں نوجوان بھارت سبھا کی
طرف سے "احباب روس ہفتہ" منایا۔ ۲۴ جنوری ۱۹۳۰ء
کو لاہور سازش کیس کے قیدیوں نے عدالت میں "یوم لینن" منایا

اور نومبر ۱۹۳۰ء کو انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر سوویت یونین
کو پیغامات تہنیت بھیجے گئے۔ نیز بہت سارے انقلابی رہنماؤں
نے روس جانے کا بھی فیصلہ کیا۔ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان ریپبلکن
ایسوسی ایشن (ایچ۔ آر۔ اے) کے اشفاق اللہ نے جب روس
جانے کا منصوبہ بنایا تھا کہ کاکوری سازش کیس کے سلسلے میں انہیں
گرفتار کر لیا گیا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن
(آرمی) ایسوسی ایشن (ایس۔ ایس۔ آر۔ اے) نے اپنے ممبر بیجوئے
کمار سنہا کو سوویت یونین بھیجا۔ روسی انقلاب ہندوستان کے
انقلابیوں میں اشتراکیتی تصورات کی تبلیغ میں معاون ثابت ہوا،
ساتھ ہی بہت سارے انقلابیوں نے تخریب پسندی سے قطع تعلق
کر لیا۔

نوجوان تخریب پسند انقلابیوں نے سارے ملک میں
چھوٹی چھوٹی کمیونسٹ جماعتوں سے رابطہ قائم رکھا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء
کے عرصہ میں ان انقلابیوں اور کمیونسٹوں نے نوجوان بھارت سبھا میں
ایک ساتھ مل کر کام کیا۔ ۱۹۲۴ء میں انقلابی جماعتوں اور انفرادی
طور پر انقلابی لوگوں نے اپنے پرانے رہنما سچندر ناتھ سانیال،
جوگیش چندر چٹرجی اور رام پرشاد بسمل کی سربراہی میں
ہندوستان ریپبلکن فوج کی تشکیل کی۔ نوجوان بھگت سنگھ،
شیو ورما، آزاد اور دیگر انقلابی نوجوان اس کے ممبر بن گئے۔

نوجوان انقلابیوں کی نئی نسل نے عملی زندگی پر زیادہ
زور دیا تھا اور ان کی انقلابی سرگرمیوں سے ان کے تصورات اور
نصب العین عیاں ہو جاتے تھے۔ لیکن ان میں سے چند نوجوان جیسے
بھگت سنگھ، بھگوتی چرن جوہرا ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے انقلابی
تصورات کو تحریری شکل میں پیش کیا۔ نیز انقلابی بھگوتی نے اپنے
ساتھی چندر شیکھر کی ایما پر ایک کتاب "بم کا فلسفہ" کا مسودہ
تیار کیا۔ اس کتاب میں انقلاب کی تشریح کی گئی۔ انقلاب
سے مراد مکمل جدوجہد ہے۔ مصالحت کے بغیر جدوجہد، ایسی
جدوجہد جس کی آخری منزل فتح ہے۔ اس کتاب کے اختتام
میں یہ کہا گیا "ہم کسی کے رحم کے طلب گار نہیں ہیں۔ ہماری
جنگ تو آخر تک جاری رہے گی۔ ہم یا تو فتح سے ہمکنار ہوں گے یا

جام شہادت نوش کریں گے۔"

نوجوان انقلابیوں نے تصوریاتی سطح پر ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی۔ غیر ملکیوں کے خلاف ان کی جدوجہد کے مقاصد کیا ہیں۔ وہ سب سیاسی نظام اور سماج میں کیسی کیا تبدیلیاں لانے کی خواہاں ہیں، کون سے سماجی نظام اور ریاستی ڈھانچہ موجودہ نظام اور ڈھانچہ کی جگہ لیں گے؟ پھر ایک نئے سماجی نظام سے طبقاتی تفریق اور تسلط کی مستردی پر مبنی اشتراکیتی نظام کی بنیاد پر سماج کی نو تعمیر کے لئے روشن خیال انقلابی طبقہ نے سماج کے مظلوم اور استحصال کے شکار لوگوں کے درمیان عوامی تحریک کو منظم کرنے کا کام شروع کر دیا۔

انقلابی سب سے پہلے غیر ملکی حکومت سے ہندوستانی کو آزاد کرانے اور ایک انقلاب کے ذریعہ ہندوستانی سماج کو بدلنے کے لئے میدان عمل میں کود پڑے۔ اسی وقت سے "انقلاب زندہ باد" کے نعرے بلند کئے جانے لگے۔ ہمارے ان دلیر نوجوان انقلابیوں کی نگاہ میں انقلاب صرف ایک تاریخی حادثہ یا جشن کا نام نہیں تھا۔ یہ نہ صرف ہندوستان میں ایک خاص تاریخی صورتحال کا مطالبہ تھا۔ ان کی نظر میں یہ بنی نوع انسان کا غیر منفک حق تھا۔ یہ تو بنی نوع انسان کی ترقی کا ابدی اصول تھا۔ اگر انسانی سماج کو جمود سے باہر نکالنا ہے اور اسے تنزلی کے شکنجے سے آزاد کرانا ہے تو اس کے لئے انقلاب کی ضرورت ہے۔ ایچ ایس آر اے نے ۱۹۲۹ء میں اپنے دستور میں یہ باتیں درج کیں۔

اقتدار کے مالکوں کے لئے تو شورش ہمیشہ باعث خدشہ ثابت ہوئی ہے، لیکن انقلاب تو ایک مظہر فطرت ہے جو حیات کی پرورش کرتا ہے اور جس کے بغیر فطرت میں یا انسانی امور میں کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں ہو سکتی۔ انقلاب تو مایوسی کا فلسفہ نہیں۔ یہ تو جیتی جاگتی طاقت ہے۔ انقلاب قانون ہے، انقلاب نظام ہے اور انقلاب حقیقت ہے۔

نیز پہلے ایچ آر اے کے سربراہوں نے، ان کے بعد نوجوان ممبر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے انقلاب کی تعریف میں اضافہ کیا۔ انہوں نے بار بار اس دعوے کو مسترد کر دیا کہ انقلاب کی تشدد کے ساتھ بم اور پستول کے مسلک کے ساتھ شناخت کی جا سکتی ہے۔ یہ تو انقلاب لانے کے اتفاقاً ذرائع ہیں جنہیں بعض موقعوں پر حسب ضرورت استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ انقلاب کو صرف ایک سیاسی طریقہ کار نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے بغاوت کو انقلاب نہیں کہتے اگرچہ یہ انقلاب کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ انقلاب کے بہت ہی وسیع معنی ہیں۔ اب اس کا یہ مقصد ہے کہ سماج کی اس طرح احیائے نو کی جائے کہ وہ نا انصافی پر مبنی سماجی نظام کو بدل دے۔ انقلاب تو بہتری کے لئے تبدیلی کا ایک جذبہ ہے۔ یہ تو سیاسی اور معاشی حالات میں تبدیلی لانے کے لئے لوگوں کی خواہش کا ترجمان ہے۔ بھگوتی چرن نے انقلاب کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ انقلاب تو آزادی ہے — سماجی، سیاسی اور معاشی۔

انقلابی طریقہ کار کے پیش نظر انقلابی رہنماؤں نے اب صرف مکمل قومی آزادی حاصل کرنے کو ہی اپنا مقصد نہیں بنایا۔ ان کے خیال میں اب قومی آزادی کو ایک نئے سماجی نظام کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے ۱۹۲۵ء میں ایچ آر اے نے اپنے اعلانیہ میں یہ کہا تھا کہ وہ ان تمام نظاموں کو نیست و نابود کر دینے کی تائید کرتا ہے جو انسان کو انسان کے ذریعہ استحصال کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں لاہور میں پولس سپرنٹنڈنٹ مسٹر سانڈرس کے قتل کے بعد یہ پوسٹر جا بجا چسپاں کئے گئے جن میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ انقلابی ایسے انقلاب کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں جو آدمی کا آدمی کے ذریعہ استحصال کو ختم کر دے۔ پھر اپریل ۱۹۲۹ء میں سنٹرل اسمبلی میں دو ورقی پرچے پھینکے گئے جن میں یہی باتیں درج تھیں۔ نیز "بم کا فلسفہ" کتاب میں پڑھنے والوں کو مدعو کیا گیا تھا کہ وہ سماج کا ایک ایسا نظام قائم کرنے میں مدد کریں جہاں سیاسی اور معاشی استحصال ناممکن ہو جائے۔ اس کے بعد اشتراکیتی سماج کے قیام کا مطالبہ شروع کر دیا گیا۔ اشتراکیت تو انقلابیوں کا مقصد حیات بن چکی تھی، اسی لئے جب ۹ اور ۱۰ ستمبر ۱۹۲۸ء کو ایچ آر اے کی ایک نشست میں بھگت سنگھ نے اس پارٹی کے

نام کو بدل کر ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن رکھنے کی تجویز پیش کی تو ان کی اس تجویز کو قبول کر لیا گیا۔ پارٹی کے نام میں تبدیلی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انقلابی جو جدوجہد شروع کرنے والے تھے ان کی سماجی، معاشی اور سیاسی نوعیت میں بہت کچھ تبدیلی آ گئی تھی، اسی لئے اس صورت حال کے مطابق پارٹی کا نام بدل دیا گیا۔

انقلابیوں نے اشتراکیت کو انقلابی تحریک کی منزل قرار دیا تھا لیکن انقلابیوں میں یہ بات اچانک پیدا نہ ہوئی۔ انقلابیوں کی تنظیم کی طرف سے اس سلسلے میں چند اقدامات کئے گئے تھے لیکن ۳۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو کانپور میں منعقدہ ایچ آر اے کی کونسل کی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سماجی انقلابیوں اور کمیونسٹوں کے اصولوں کا پرچار کیا جائے۔ ایچ آر اے کی تصنیف "انقلابی" میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ریل اور نقل و حمل کے دیگر ذرائع کو اور اسپات اور جہاز سازی جیسی بڑی صنعتوں کو قومیا لیا جائے۔ نیز پرائیویٹ سیکٹر کی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو کوآپریٹو تنظیم کے تحت لایا جائے۔

آہستہ آہستہ بہت سارے انقلابی نوجوان ایچ آر اے میں شامل ہونے لگے۔ ۱۹۲۴ء میں جوگیش چندر چٹرجی اشتراکیت کے محرک بن گئے۔ پنجاب، اترپردیش، بہار، بنگال اور دیگر علاقوں کے بہت سارے نوجوان انقلابیوں نے اشتراکیت میں دلچسپی لینی شروع کی۔ ان میں کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے نوجوان بھی تھے۔

اشتراکیت کی منزل کی بنیاد مبہم تصورات یا نوجوانوں کے جوش و خروش پر قائم نہیں کی گئی تھی بلکہ اس کے لئے انقلابیوں میں کافی بحث و مباحثے ہوئے تھے۔ لاہور میں بھگت سنگھ نے دوارکا داس لائبریری کو روس، آئرلینڈ اور اٹلی اور دیگر جگہوں میں رونما ہونے والے انقلابات پر لکھی کتابوں اور جریدوں سے پُر کر دیا۔ بھگت سنگھ نے بذات خود ۱۹۲۴-۲۷ء کے دوران انقلاب پر لکھی کتابوں اور مضامین کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں لاہور سازش کیس میں ان کے ایک ساتھی قیدی جے۔ این۔ سانیال نے بھگت سنگھ کے سلسلے میں یوں لکھا،

"بھگت سنگھ نے اشتراکیت پر لکھی کتابوں کا کافی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ گرچہ اشتراکیت ان کا خاص موضوع تھا تاہم انہوں نے روسی انقلاب کی تاریخ کا، ۱۹ویں صدی کے ستر دہے سے ۱۹۱۷ء کے اکتوبر انقلاب تک کافی گہرا مطالعہ کیا۔ نیز بالشویک دور حکومت میں روس میں کئے گئے معاشی تجربات کی بابت انہوں نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔"

بھگت سنگھ جب لاہور سازش کیس کے سلسلے میں جیل میں تھے تو اس وقت انہوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں جن میں چند یہ ہیں۔ سوانح حیات، موت تک جانے کا دروازہ، اشتراکیت کا مطمع النظر اور ہندوستان کی انقلابی تحریک۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے پارٹی ممبروں کو اشتراکیت کی تھیوری کی بابت تعلیم دینے کا انتظام کیا تھا کیونکہ وہ سب اس امر سے واقف تھے کہ سائنسی مطمع النظر انقلاب میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ لاہور ہائی کورٹ میں جج کے سامنے بھگت سنگھ نے یہ اعلان کیا تھا کہ "انقلاب کی تلوار کو سلی میں سان دیا گیا ہے۔"

اشتراکیت کی تشریح کرتے ہوئے بھگت سنگھ نے اپنے ایک ساتھی سکھ دیو سنگھ کو ایک خط لکھا۔ "اگر ہم میدان عمل میں داخل نہیں ہوتے تو کیا اس کے معنی یہ ہوئے کہ انقلابی اقدامات کئے ہی نہیں جاتے۔ اگر آپ ایسا خیال کرتے تو آپ غلطی کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم لوگوں نے سیاسی آب و ہوا بہت حد تک تبدیل کرنے میں مدد کی۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم سب ہمارے وقت کی ضرورت کی پیداوار ہیں۔ آپ نے یا میں نے اس ملک میں اشتراکیتی یا کمیونسٹ خیالات کا آغاز نہیں کیا۔ یہ تو ہمارے وقت اور حالات کا ہم لوگوں پر جو اثر ہوا اس کے نتائج ہیں۔ بلاشبہ ہم لوگوں نے اپنے طور پر ان تصورات کے فروغ کے لئے کچھ کوششیں کیں۔"

ایچ ایس آر اے کے سربراہوں پر یہ حقیقت عیاں ہو چکی تھی کہ اشتراکیت تو تاریخی طریق کار کی پیداوار ہے اور اس لئے یہ نظام سرمایہ داری کی ضد ہے اور سرمایہ داری کو ختم کرتا

[illegible] ہوگا۔ بھگت سنگھ اور دت نے ۶ جون ۱۹۲۹ء کو دہلی کی کورٹ میں اپنے ان باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے "بم کا فلسفہ" کتاب میں تو یہ اعلان کیا گیا تھا "انقلاب سرمایہ داری کی موت کی گھنٹی بجائے گا۔"

اس امر کو تسلیم کر لیا گیا تھا کہ اشتراکیت تو سماج میں طبقاتی طاقتوں کے مابین ایک نئے رشتہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اشتراکیت کا شعور تو سماج کے طبقاتی تجزیہ پر مبنی ہے۔ اشتراکیت تو استحصال کے شکار لوگوں، غریب مزدوروں اور کسانوں کی نجات پر اور ملک کی معیشت، سیاست اور سماج میں ان کے مفادات کے تسلط پر مبنی ہے۔ ان باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے بھگت سنگھ اور دت نے اپنے ۲۹ جون ۱۹۲۹ء کے بیان میں کہا تھا۔

"پروڈیوسرس یا مزدوروں کے جو سماج کے بہت ہی لازمی جزو ہیں استحصال کرنے والے ان کی محنت کے پھلوں کو چھین لیتے ہیں اور انہیں ان کے ابتدائی حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔ ایک طرف تو کسان ہے جو دوسروں کے لئے اناج پیدا کرتا ہے لیکن خود اپنے خاندان کے ساتھ بھوکا رہتا ہے۔ بنکر جو عالمی بازار میں اپنے بنے کپڑے سپلائی کرتے ہیں، کے پاس اپنے اور اپنے بچوں کے تن ڈھانکنے کا کافی کپڑا نہیں ہوتا۔ معمار، کمہار اور بڑھئی جو عالیشان محلات تعمیر کرتے ہیں، خود بستیوں میں رہتے ہیں اور وہیں اس دار فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ دوسری طرف استحصال کرنے والے سرمایہ دار سماج کے جونک ہوتے ہیں۔ وہ سب اپنے عیش و عشرت پر لاکھوں روپئے صرف کرتے ہیں...... اس لئے بنیادی تبدیلی لانی ضروری ہے، اور ان باتوں کا احساس کرنے والے تمام لوگوں کا یہ فرض ہے کہ اشتراکیتی بنیاد پر سماج کی از سر نو تنظیم کریں۔"

ایچ ایس آر اے کے سربراہوں کے خیال میں اشتراکیت تو ایک نیا سماجی ڈھانچہ پیش کرتی ہے، جہاں اختیارات مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت اس وقت تک قائم نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اشتراکیتی انقلابی طاقت استحصال کرنے والے طبقوں کے ہاتھوں سے ریاست کی انتظامیہ کو چھین لیں۔ بھگت سنگھ نے اکتوبر ۱۹۳۰ء میں اپنے قید خانہ سے جاری کردہ پیغام میں یہ کہا:۔

"ہمارے نقطہ نظر سے انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ سماجی نظام کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس لئے ریاستی اقتدار پر قابض ہونا ضروری ہے۔ ریاست کا انتظامیہ اب امیر لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ عوام کے مفادات کی حفاظت، ہمارے خیالات کی حقیقت میں منتقلی یعنی کارل مارکس کے اصولوں کے مطابق سماج کی بنیاد کی تعمیر کا مطالبہ یہ ہے کہ اس انتظامیہ پر قبضہ کر لیا جائے۔"

اشتراکیت کے تحت ریاست کی کیا حالت ہوگی، اس سوال کا جواب کتاب "بم کا فلسفہ" میں دیا گیا ہے کہ انقلابی یہاں پرولتاری ڈکٹیٹرشپ قائم کریں گے اور سماجی جونکوں کو سیاسی اقتدار سے ہمیشہ کے لئے دور کر دیں گے۔

بڑھتی ہوئی اشتراکیتی بیداری نے انقلابیوں میں کافی دور اندیشی پیدا کر دی ہے۔ اب وہ سرمایہ داری اور جدید سامراجیت کے درمیان اور سرمایہ دارانہ معاشی استحصال اور قوم کی غلامی کے درمیان قریبی رشتہ کو دیکھنے لگے۔ انقلابیوں کے خیال میں ہندوستان میں غیر ملکی حکومت تو ایک قسم کی طبقاتی حکومت یا غیر ملکی سرمایہ داروں کی حکومت تھی، اس لئے اس طبقاتی حکومت کو اور معاشی استحصال کو ختم کرنے اور صحیح معنوں میں آزادی لانے کے لئے اشتراکیت ہی واحد علاج ہے۔ انقلابیوں کی جاری کردہ تمام دستاویزات میں یہی باتیں درج تھیں۔ ایچ ایس آر اے کے دستور میں یہ باتیں درج ہیں:

"پرولتاریت کی توجہ اب اشتراکیت کی طرف مرکوز ہے کیوں کہ صرف اشتراکیت ہی مکمل آزادی قائم کر سکتی ہے اور تمام سماجی تفریق کو مٹا سکتی ہے۔"

بھگت سنگھ نے قید خانہ سے ۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو اپنے ایک پیغام میں کہا تھا کہ "کسانوں کو نہ صرف غیر ملکیوں کی بلکہ زمین داروں اور سرمایہ داروں کے چنگلوں سے خود کو آزاد کرنا

ہے۔ ہندوستان میں عام لوگوں کی جد و جہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مٹھی بھر لوگ اپنے فائدے کے لئے عام لوگوں کی محنت کا استحصال کرتے رہیں گے، خواہ استحصال کرنے والے انگریز سرمایہ دار ہوں، انگریز اور ہندوستانی ملے جلے ہوں یا صرف ہندوستانی ہوں۔

اس انقلابی تحریک کی سماجی بنیاد کیا ہوگی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ایچ ایس آر اے کے سربراہوں نے کہا یہ تحریک عام لوگوں، مزدوروں، کسانوں اور نوجوانوں اور پڑھے لکھے انتہا پسندوں پر مبنی ہوگی۔ نوجوان بھارت سبھا (۱۹۲۸ء) کے منشور میں یہ باتیں درج تھیں "انقلاب عوام کے ذریعہ اور عوام کے لئے"۔ اس سبھا نے ملک کے مختلف علاقوں میں اور خاص طور پر دیہاتوں میں اپنی شاخ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ ایچ ایس آر اے کی مرکزی کاؤنسل نے جنوری ۱۹۳۰ء کو اپنی ایک نشست میں، جس میں چندر شیکھر آزاد، بھگوتی چرن دوہرا، یشپال، کیلاش پتی اور دیگر انقلابیوں نے شرکت کی تھی، یہ فیصلہ کیا گیا کہ طلبا، کسانوں اور مزدوروں کے درمیان اس کام کو مرکوز طور پر کیا جائے۔ ایچ ایس آر اے کے سربراہوں کو اس بات کا یقین کامل تھا کہ سرمایہ داروں اور اونچے فرقوں کے لوگوں میں یہ رجحانات پائے جاتے ہیں کہ وہ غیر ملکی طاقت کے ساتھ ہاتھ ملالیں گے اور ایسا ہو سکتا ہے کہ آزادی کی جد و جہد میں وہ سب آدھے راستے سے واپس لوٹ جائیں اس لئے صرف عام لوگوں پر ہی بھروسہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ان میں اجتماعی طاقت ہے اور وہ آزادی کی جد و جہد کو آگے بڑھا سکیں گے۔ بھگت سنگھ کے مطابق "قوم صرف مزدوروں، کسانوں اور عام لوگوں کی منظم طاقتوں کے بل بوتے پر کامیاب جد و جہد کو جاری رکھ سکتی ہے۔

لیکن افسوس تو اس بات کا ہے یہ سب باتیں پروگرام کی سطح تک رہیں۔ عام لوگوں کو منظم کرنے کے لئے کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ نوجوان بھارت سبھا نے چند گاؤں میں اپنی شاخیں قائم کیں تھیں۔ اور ۱۹۲۸ء میں کسانوں کے احتجاجی جلوس کا بھی انتظام کیا تھا۔ دوسری طرف اس سبھا کی سرگرمیاں زیادہ شہروں کی طرف اور وہاں آباد متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کے درمیان مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اجئے گھوش اور ان کے دیگر چند ساتھیوں نے کمیونسٹ ورکروں کے ساتھ مل کر کانپور میں مزدوروں کے درمیان کام کیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود ایچ ایس آر اے عام لوگوں کے درمیان کچھ سیاسی کام کاج کر نہ سکے اور طبقاتی جد و جہد کیلئے وہ عام لوگوں کو منظم نہ کر سکے۔ ایچ ایس آر اے نے جدت پسند نوجوانوں پر بھروسہ کیا، ان کے دلوں میں انقلاب کی جوت جلائی۔ ان نوجوانوں کو دو ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں مزدوروں اور کسانوں تک انقلابی اشتراکیتی پیغامات پہونچانا تھا اور دوسری طرف انقلاب کے لئے انہیں عملی میدان میں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایچ ایس آر اے کے دستور میں نوجوانوں سے یہ اپیل کی گئی تھی۔

"ہندوستان کا مستقبل نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی ہمت اور ان کی قربانیاں یہ ثابت کرتی ہیں کہ ہندوستان کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں مکمل طور پر محفوظ ہے۔ نوجوان! ہندوستانی ری پبلک کے سپاہی، آگے بڑھو تمہارے ذمے بہت ہی عظیم واتعی دیئے گئے ہیں۔ جاؤ! ملک کے کونے کونے میں جا کر مستقبل کے انقلاب کے لئے، جو ضرور رونما ہوگا، میدان تیار کرو۔ اپنے نوجوان ساتھیوں کے زرخیز دل و دماغ میں انگریزوں کی سامراجیت کے خلاف حقارت کے بیج بو دو۔ ان بیجوں سے بہت سے پودے نکل آئیں گے جو بہت جلد تناور درخت بن جائیں گے کیوں کہ تم لوگوں نے ان بیجوں کی اپنے خون سے آبیاری کی ہے۔"

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارے انقلابی رہنما سیاسی میدان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلا شبہ ان لوگوں نے مادر وطن کی آزادی کے لئے اپنی جانِ عزیز کی قربانی دی۔ لیکن وہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف عوامی انقلاب کے لئے اقدامات نہ کر سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں پوشیدہ طور پر اپنے اقدامات کو روبہ عمل لانا پڑا۔ اس لئے عوام سے رابطہ قائم نہ رکھ سکے۔ البتہ انہیں عوام میں سامراجیت کے خلاف بیداری

اجاگر کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ ان باتوں کی وجہ سے انگریزوں کی حکومت نے انہیں آسانی سے تحلیل کر دیا اور آخر کار انقلابی سربراہ چندر شیکھر آزاد کی، فروری ۱۹۳۰ء میں، موت کے بعد سارے ہندوستان میں انقلابیوں کی سرگرمیاں بہت سست ہو گئیں۔ اور شمالی ہندوستان میں تو تقریباً ختم ہو گئیں۔

بنیادی طور پر انقلابیوں کی ناکامیوں کا تجزیہ ان کے تصورات اور ان کے عمل کے دوران بہت ساری ضدوں کی شکل میں کیا جا سکتا ہے۔ نظریہ میں تو انہوں نے اشتراکیت کو اپنایا تھا لیکن عملی میدان میں وہ قومیت کے دائرہ سے باہر نہ نکل سکے۔ نظریہ میں انہوں نے عوامی اقدامات اور عوامی جدوجہد شروع کرنے کا اعلان کیا لیکن عملی طور پر حکومت کے خلاف انفرادی اقدامات یا تخویف پسندی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ نظریہ میں وہ اپنی تحریک کو عوام۔ کسان اور مزدور پر مبنی کرنا چاہتے تھے لیکن عملی طور پر وہ صرف شہر کے نچلی متوسط طبقہ کے یا برژوائی نوجوانوں سے اپیل کر سکے۔ نظریہ میں وہ عوامی تحریک پیدا کرنے اور اس کی سربراہی کرنا چاہتے تھے، لیکن عملی میدان میں وہ بہادر نوجوانوں کی ایک چھوٹی سی تنظیم بن کر رہ گئے۔ نظریہ میں ان لوگوں نے یہ منصوبہ مرتب کیا تھا کہ ایک چھوٹی سی تنظیم قائم کی جائے جسے مرکز کی حیثیت حاصل ہو اور اس کے گرد ملک کی انقلابی طاقتیں آکر اکٹھا ہوتی رہیں، لیکن عملی میدان میں ان کے لئے ایسا کرنا مشکل ہو گیا اور آخر میں ان کے لئے اپنی تنظیم کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔

اس طرح یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی انقلابی کبھی بھی اپنی ایک کل ہند تنظیم قائم نہ کر سکے اور ان لوگوں نے یہاں وہاں اکا دکا سرگرمیوں کو جاری رکھا اور ان باتوں کی وجہ سے برٹش حکومت کو کوئی خاص خدشہ لاحق نہیں ہوا۔ لیکن انقلابیوں نے اپنی سرگرمیوں اور قربانیوں سے سارے ہندوستان میں بیداری کا جو جذبہ اجاگر کیا اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ برٹش ۱۹۱۴-۱۸ء کی پہلی عالمی جنگ میں جمہوریت کی دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن بعد میں ہندوستان میں یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ جمہوریت کے دشمن ہیں۔ ساری مہذب دنیا کے لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ ہندوستان کے عوام انگریزی حکومت کے خلاف اسی طرح نبرد آزما ہیں جس طرح دیگر مظلوم ملکوں کے لوگ حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت میں مشغول عمل ہیں۔ ان تمام ملکوں میں جہاں انقلابیوں نے اپنی سرگرمیوں کے مراکز قائم کئے تھے، لوگوں کو ہندوستان کی قدیم تہذیب، اس کی ثقافت اور ادب سے روشناس کرایا گیا۔ اس سے قبل کبھی بھی در حقیقت غیر ملکوں میں ایسی باتوں کی تشہیر نہیں کی گئی کہ برطانیہ ہندوستان میں لوگوں پر طاقت کے ذریعہ قابض ہے۔ اس سے قبل کبھی بھی دنیا کے لوگوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ برٹش حکومت سے ہندوستانیوں کی نام نہاد فرمانبرداری ایک جھوٹا دعویٰ ہے۔ اس سے قبل کبھی بھی برٹش اس بات پر یقین نہیں کر سکتے تھے کہ اتنے سارے ہندوستانی ان کی حکومت کے خلاف مسلح طور پر نبرد آزما ہو جائیں گے۔ ان تمام باتوں نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ان باتوں نے اس جذبہ کو اجاگر کیا کہ اگر برٹش برسر اقتدار رہنے کی کوشش کرے، تو یہ جذبہ شدت اختیار کرتا جائے گا۔ اگر برٹش اقتدار کی منتقلی کا فیصلہ جلد نہ کریں تو ان کے لئے ہندوستان میں چین کی نیند حرام ہو جائے گی اور اس کے افسروں پر قاتلانہ حملے ہوتے رہیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برٹش نے انقلابیوں کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا لیکن ان منصوبوں کے اور انقلابیوں کی قربانیوں کے جو اثرات نمودار ہوئے انہوں نے حکمران طبقہ کو حقائق کے روبرو لا کھڑا کر دیا۔ اور اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "انقلاب زندہ باد" کے نعرہ نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا ٭٭٭

کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر بھی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

(فیض)

تبصرہ نگار سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مبصر: مصطفیٰ اکبر

تبصرہ

کتاب : "صلیب" (ڈرامہ)
مصنف : ظہیر انور
قیمت : ۲۰ روپئے
ناشر : مصنف
۱۱- ہری پوکھر فرسٹ لین۔ کلکتہ ۱۹

ڈرامے کی دنیا میں ظہیر انور کا نام محتاج تعارف نہیں۔ "انگاروں کا شہر" کی مقبولیت کے بعد ڈرامہ نگار اپنی دوسری پیش کش "صلیب" کے ساتھ ارباب ذوق ونظر کی عدالت میں حاضر ہوا ہے۔ مجموعہ میں ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ایک جائزہ ـــ بعنوان "جدید ہندوستانی تھیٹر" اور دو ڈرامے "قیدی" اور "صلیب" ہیں۔ مجموعہ کا سرورق جاذب وخوبصورت، ترتیب وطباعت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔ مجموعہ میں تمہید کے طور پر لکھا گیا جائزہ "جدید ہندوستانی تھیٹر" ڈرامہ/ تھیٹر کی تاریخ اور اس کی ارتقائی منزلوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ "قیدی" ۲۵ صفحات پر مشتمل ایک احتجاجی ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامہ میں اسی نام نہاد آزادی کا وہ شرمناک ماحول پیش کیا گیا ہے جس میں سامراج وادیوں اور سرمایہ داروں کی ملی بھگت سے عوام کا پیہم استحصال ہوتا ہے ـــ کبھی رائے دہندگی کے بے جان اصول اور جمہوریت دشمن عمل کی صورت میں تو کبھی پُر فریب جال اور خونی سازش کے روپ میں۔ غریبوں کے خون پسینے کی کمائی چھین لی جاتی ہے۔ انہیں ظلم واستبداد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ذرا سی چوں چرا پر انہیں گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے جیسے یہ انسان نہیں جنگلی جانور ہیں، جن کے بے شمار فرائض تو ہیں مگر حقوق نہیں، زبان تو ہے مگر قوت گویائی نہیں جیسے یہ مجرم ہیں، آج تلک اپنے آقاؤں کے غلام ـــ مگر ایک سوال کہ کب تک؟ انہیں سچی آزادی کب ملے گی؟

"صلیب" ۶۶ صفحات پر مشتمل ایک طویل تلخ تجرباتی ڈرامہ ہے جس میں ہمارے سماج کے ان بھیانک چہروں کو بے نقاب کیا گیا ہے جنہیں ہم غازہ یا غلاف میں دیکھتے ہیں۔ ان کی شناخت نہیں کر سکتے۔ اس ڈرامہ میں اس حساس طبع اور اصول پسند ڈرامہ نگار مرزا ادیب کی زندگی کا المیہ پیش کیا گیا ہے جس نے ہمیشہ دن کو دن اور رات کو رات کہنے کو فن اور شخصیت کی عظمت کا ضامن سمجھا اور اپنی زندگی کا اصول بھی ـــ مگر سماج کی عدالت میں ان کے اصولوں کو سماج دشمن قرار دیا گیا۔ حق کو جھٹلایا گیا۔ حق گوئی کے جرم میں مرزا ادیب کو تا عمر قید تنہائی کی سزا ملی۔ بظاہر حق کی ہار ہوئی مگر قیدی کو معلوم کہ سچ کی گواہی اور جیت کی نشاندہی کے لئے دیوار پر ٹنگی مسیح کی تصویر کافی ہے ـــ "صلیب" دراصل حیات جاوداں کا وسیلہ ہے۔

ظہیر انور کے ڈرامے دراصل سماجی استحصال و توہمات و ظلم واستبداد کے خلاف صدائے احتجاج ہیں جو نعرۂ انقلاب و پروپیگنڈے کی صورت میں نہیں بلکہ فنی پارے کے روپ میں صفحۂ قرطاس پر آئے ہیں۔ ان کے یہاں عصری حسیت اس قدر شدید، فنی بصیرت اس قدر تیز، سماجی شعور اس قدر پختہ اور خلوص اظہار اس قدر موثر ہے کہ ڈرامہ کا ہر منظر اپنے چست مکالمے کے ساتھ ہمارے دل میں سچائی کی طرح اترتا اور نقش چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ ڈراموں میں مکالمہ کی برجستگی و چستی اور مختصر بیانی کردار کو اور بھی زیادہ متوازن اور متحرک بناتی ہے۔ ان کا ہر کردار صحت مند ردعمل کی نمائندگی کرتا ہے۔

ظہیر انور کے ڈراموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے ڈرامے ادب اور اسٹیج دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ اردو ادب میں ڈراموں کی بڑی کمی ہے۔ اردو میں اب تک جتنے ڈرامے لکھے گئے ہیں ان میں بیشتر یا تو محض تحریر بن کر رہ گئے ہیں یا پھر محض کھیل تماشے بن کر اداکاروں کے سینوں میں مدفون ہو گئے۔ ظہیر انور کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسٹیج اور تحریر دونوں میں فن اور ادب کی پاسداری کی ہے۔ سنجیدگی اور متانت ان کے ڈراموں کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ طنز یا تمسخر یا گیت غزل سے ڈرامہ کو رنگین اور دلچسپ بنانا پسند نہیں کرتے۔ وہ زندگی کی سچائیوں کو پُر خلوص اور دردمند

اظہار کے ذریعہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ڈرامہ کو تفریح و تماشہ کا وسیلہ نہیں بلکہ سماج کی ناانصافی، ظلم و استحصال کے خلاف ایک ہتھیار سمجھتے ہیں۔ ان کی یہی دیانت داری اور پاکیزگیٔ خیال انہیں معاصرین میں ممتاز اور ڈرامہ کی دنیا میں مقبول کرتی ہے۔ ابھی جب اردو ڈرامہ اپنی کم مائیگی کے ساتھ ارتقائی منازل سے گزر رہا ہے، ظہیر انور کی بے لاگ اور پرخلوص کوشش یقیناً قابلِ صد تحسین ہیں۔ "صلیب" کی فنی اور تکنیکی محاسن کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ظہیر انور کا یہ تنہا مجموعہ ڈرامہ کی حیثیت منوانے کے لئے کافی ہے۔ "صلیب" کا مطالعہ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے ٭٭٭

(مصطفیٰ اکبر)

بقیہ: مزدور تحریک اور......

میں مزدور تحریک کو کافی پیچھے ڈھکیل دیا۔

اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ برطانوی نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کے نظام سے نکلنے اور سامراجی جوئے سے آزاد ہونے میں ہندوستان کے عوام نے جو قربانیاں دیں اور جو جانفشانی کی اس میں مزدور تحریک کے عطیات امٹ ہیں۔

آج دنیا کا نقشہ بدل گیا ہے۔ برطانیہ اب ایک روبہ زوال نحیف اور امریکہ کا محتاج سامراجی طاقت بن کر رہ گیا ہے۔ اس وقت ساری دنیا کے محنت کش عوام امریکی سامراجیوں کی تیسری عالمی جنگ چھیڑنے کی تیاریوں کے خلاف سینہ سپر ہو رہے ہیں۔ اس معرکہ آرائی میں دنیا بھر کے امن پسند، آزادی اور جمہوریت پسند لوگوں کی فتح اور جنگ بازوں کی شکست ہو جائے تو ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مزدور طبقہ کا جو کارنامہ ادھورا رہ گیا ہے وہ پورا ہو جائے گا۔

دریں اثنا ہندوستان کی آزادی، اتحاد اور سالمیت کے لئے اندرونِ ملک جو خطرے ابھر رہے ہیں مزدور طبقہ کو اس کے خلاف ہمہ وقت چوکنا رہنا ہوگا اور پھوٹ پرست، علیحدگی پسند فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف مزدور اتحاد کا پرچم بلند رکھنا ہوگا ٭٭

کلکتہ اور مضافات میں یومِ جمہوریہ کی تقریبات

مغربی بنگال کے گورنر نے پریڈ کی سلامی لی

کلکتہ اور مضافات میں ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۸۷ء کو یومِ جمہوریہ کی تقریبات شان و شوکت کے ساتھ منائی گئیں۔ اس دن صبح کے وقت ریڈ روڈ، کلکتہ میدان میں مغربی بنگال کے گورنر شری اوما شنکر دکشت نے ایک دلکش مارچ پاسٹ کی سلامی لی۔ اس موقع پر وزیرِ اعلیٰ شری جیوتی باسو، ان کی کابینہ کے وزراء، ممتاز شہری نیز فوج کے افسران موجود تھے۔

کلکتہ میدان میں مغربی بنگال کے گورنر نے قومی جھنڈا لہرا کر اس تقریب کا افتتاح کیا۔ مارچ پاسٹ میں ۴۲ دستوں نے حصہ لیا جن میں بری افواج کی پیادہ فوج، انجینئرنگ اور سگنل دستے، بحری اور ہوائی افواج کے دستے، پولس کے دستے، این سی سی، سینک اسکول اور اسکاؤٹ کے دستے اور گھڑ سوار پولس کے دستے شامل تھے۔ نیز اس مارچ پاسٹ میں کلکتہ اور اس کے آس پاس کے بیشتر اسکولوں کے طلباء اور طالبات نے بھی حصہ لیا۔ مارچ پاسٹ کے بعد حکومتِ مغربی بنگال کے مختلف شعبوں، صحتِ عامہ اور خاندانی رفاہ، چھوٹی بچت، کھیل کود اور خدماتِ نوجوانان، اطلاعات و ثقافتی امور، کھادی اور دیہی صنعت نیز سی ایم ڈی اے، گارڈن ریچ شپ بلڈرس اور انجینئرس لمیٹیڈ، ہندوستان کیبل لمیٹیڈ، اور کلکتہ میونسپل کارپوریشن کے کئے گئے ترقیاتی اقدامات کی جھانکیاں پیش کی گئیں۔ ان جھانکیوں کو پریڈ دیکھنے والے ہزاروں مرد، عورت اور بچوں نے کافی سراہا۔

مغربی بنگال کے ہر ضلع میں یومِ جمہوریہ کی تقریبات منائی گئیں اور اسی دن یعنی ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۸۷ء کو تمام سرکاری اور نیم سرکاری دفتروں میں قومی پرچم لہرائے گئے ٭٭٭

قومی اتحاد کو مستحکم بنائیے

آج کے ہندوستان میں کثرت میں وحدت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ وقت کی اہم ضرورت مختلف نسلی، ثقافتی اور لسانی جماعتوں کے درمیان رشتوں کو مستحکم بنانا ہے۔ ہم لوگوں کو وفاقیت کے بنیادی اصولوں کو برقرار رکھنے اور انہیں فروغ دینے کے لئے پُرخلوص کوشش کرنی چاہئے۔

ہم لوگوں کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہم کسی بھی شکل کی حد سے زیادہ مرکزیت کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ آئیے ہم سب ملک کی وحدت اور یک جہتی کو مستحکم بنانے کے لئے سرگرم عمل ہوجائیں۔

۲۶ جنوری ۱۹۸۶ء

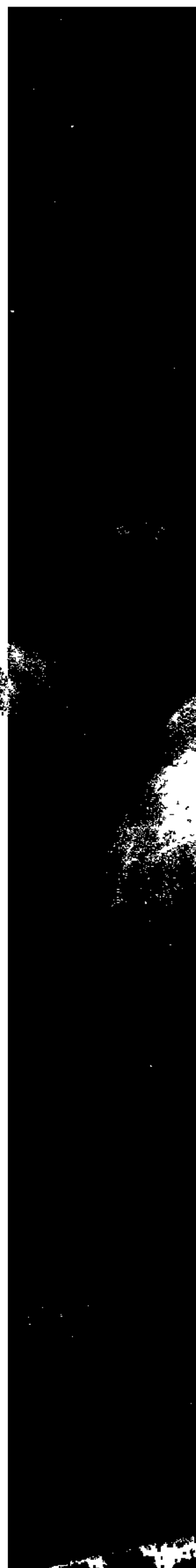
حکومت مغربی بنگال

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azam,
Published by the Information & Cultural Affairs Department Govt. of West Bengal and Printed by M/s.

Postal Regd. No. WB/ CC-52
Vol—33 No —3
PRICE—12 Paise

MAGHREBI BANGAL
1st February 1986




پندرہ روزہ

مغربی بنگال
کلکتہ

مدیر اعلیٰ : پرستین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندر ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

جلد نمبر ۳۳ ★ ۱۵ر فروری سنہ ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۲

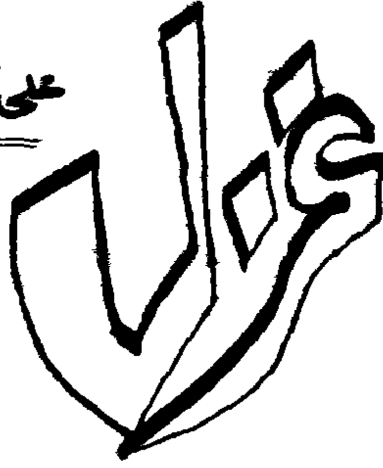
شرح خریداری

سالانہ: تین روپے ★ اس شمارے کی قیمت: بارہ پیسے

ترسیل زر کا پتہ،

بزنس منیجر!
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۲۳- آر، این، مکھرجی روڈ - کلکتہ - ۷۰۰۰۰۱

حال ہی میں کلکتہ میں منعقدہ "پھولوں کی نمائش" میں شری کمل باسو، میئر کلکتہ کارپوریشن، شری اچنتو رائے، وزیر ریاست برائے جنگلات وسیاحت اور جناب ہاشم عبدالحلیم، اسپیکر مغربی بنگال اسمبلی —————



علی سردار جعفری

جلا کے لحن کی قندیلیں نوربار چلو
لٹاتے دولتِ گل صورتِ بہار چلو

وصال و ہجر کی راہوں میں روشنی ہوگی
دلوں میں لے کے چراغِ جمالِ یار چلو

یہیں سے پھول کھلیں گے لہولہان ہیں پاؤں
ابھی تو دشتِ طلب میں بہت ہیں خار چلو

کہاں ہو میرے رفیقانِ حرف و صوت و صدا
سکوتِ شب ہے سیہ رنگ شعلہ بار چلو

عدو کے تیغِ ستم سے مقابلہ ہے ابھی
جلا کے علمِ رفیقانِ کم عیار چلو

سوادِ منزلِ جاناں قریب ہے شاید
مثالِ بادِ صبا ہو کے بے قرار چلو

❖❖

اقلیتوں کی تعلیم
ایک جائزہ

از: محبوب زاہدی

ہندوستان میں تقریباً ۱۵۰ سال قبل جدید تعلیم کا دور شروع ہوا تھا اور اس سمت میں مجموعی طور پر ہندوستانی قوم کی ترقی حسب خواہ نہیں ہوئی ہے کیوں کہ ابھی بھی ۵۰ فیصد سے بھی کم آبادی کو پڑھا لکھا کہا جا سکتا ہے۔ خواندہ اور کچھ حد تک تعلیم یافتہ یہ دونوں مختلف تصورات ہیں اور اگر بعد الذکر کو جدید تعلیم کی ترقی کی پیمائش کا آلہ تسلیم کریں تو پھر اس ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کل آبادی کی ۲۵ فیصد ہو جائے گی۔ بے شک یہ بات ان لوگوں کے لئے جن کا اس ملک میں تعلیم کی اشاعت سے تعلق ہے کافی خوشگوار ہے۔

اب کم و بیش سب ہندوستانی جن میں اسلام کو ماننے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شامل ہے، ایک مخصوص عمر کے بعد سے موجودہ تعلیم کے خلاف ہیں۔ یہ بات اس حقیقت سے عیاں ہو جاتی ہے کہ پرائمری اسکولوں میں تو طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور پھر اس کے مقابلہ کالج اور یونیورسٹی سطحوں میں طلبا کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے۔ پرائمری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی اکثریت پرائمری تعلیم ختم کرنے کے بعد سے تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رکھ پاتی۔ اس طرح جو بچے ثانوی درجوں میں داخلہ لیتے ہیں ان میں نصف بھی دسویں جماعت تک تعلیم کو جاری نہیں رکھ سکتے نیز ثانوی تعلیم کے مکمل کرنے کے بعد طلبا کی اکثریت کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایسی چند باتیں دیگر ملکوں مثلاً یورپی ملکوں میں بھی دیکھی جاتی ہیں۔ لیکن وجوہ بہت مختلف ہیں۔ یورپی ملکوں میں وہ طلبا جو ثانوی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے کرتے اسکول چھوڑ دیتے ہیں ان میں بیشتر تکنیکی، پیشہ ورانہ یا دیگر تربیت حاصل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں اسکول چھوڑنے والے ایسے طلبا، نوجوان بے روزگار بن جاتے ہیں اور سماجی ڈھانچہ میں ایک مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جس ماحول سے ہندوستانی طلبہ ابھرتے ہیں وہاں کے سماجی پس منظر اور معاشی سماجی امکانات کی تصویر ان کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔

یہ عام فہم بات ہے کہ تعلیم کے لئے وقت اور زر کی صورت میں سرمایہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں ۹ سال کی عمر سے زیادہ عمر کے بچوں کو (غربت کی سطح سے ذرا اوپر اور ذرا نیچے زندگی گزارنے والے لوگوں کے لئے یہ عمر کمانے کی عمر ہے) تعلیم کے لئے اسکول میں بھیجنے کے معنی خاندان کے لئے مالی نقصان ہے، کیوں کہ اس خاندان کو اس بچے کی کمائی سے محروم ہو جانا پڑتا ہے، نیز اس خاندان کو، اس بچے کی گھریلو خدمات سے بھی محروم ہو جانا پڑتا ہے۔ اس بات کو ہم مذکورہ خاندان کی بے حسی یا مردہ دلی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول میں بھیجنے میں پس و پیش کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ یہی بات بچوں کی اکثریت کو اسکول میں جانے کی راہ میں سدِ راہ ثابت ہوتی ہے۔ نیز ایسے طلبا کو اپنے خاندان کی معاشی بدحالی کے دباؤ کے تحت پڑھنا لکھنا چھوڑ کر دیگر سرگرمیوں میں شامل ہو جانا پڑتا ہے۔ ایسا اس لئے بھی ہوتا ہے کہ اس خاندان کے افراد اس بات کو نامناسب سمجھتے ہیں کہ بچوں کو اسکولوں میں نہ بھیج کر جو مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں ان سے خاندان کو محروم رکھا جائے۔

غربت تعلیمی پسماندگی کی وجہ ہے: اس صورت حال کو موجودہ

فضا نے اور بھی ابتر بنا دیا کیوں کہ یہ فضا تعلیم کے لئے نفسیاتی ترقی اور ایسے خاندان میں تعلیم کے فروغ کے لئے خوشگوار نہ تھی۔ یہ تمام باتیں خاندانوں کی معاشی حالت سے منسلک ہیں، خواہ وہ مسلمان خاندان ہو یا غیر مسلم خاندان۔ دونوں خاندانوں کا ردِ عمل اس سلسلے میں ایک جیسا ہے۔ جائزے کے ذریعہ حاصل کردہ اعداد و شمار کے مطابق یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں تک بچوں کو اسکولوں میں بھیجنے کا سوال ہے ایک غریب مسلمان خاندان اور ایک غریب غیر مسلمان خاندان، دونوں کے خیالات ایک جیسے ہیں اور تعلیم کی ترقی اور تعلیم کی اشاعت کے سلسلہ میں ان کا ردِ عمل بھی ایک جیسا ہے۔ غریب مسلمان خاندان یا غریب غیر مسلمان خاندان کی معاشی حالت میں کوئی فرق نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک عام بات یہ کہی جاتی ہے کہ غیر مسلمانوں سے زیادہ مسلمان طلباء ہی پڑھتے پڑھتے اسکول چھوڑ دیتے ہیں لیکن جب ہم اسکول چھوڑنے والے طلباء کی سماجی۔ معاشی حالت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں تو یہ بات صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت یا بڑی تعداد غربت کی سطح سے بھی نیچی سطح پر زندگی گزارتی ہے، اور کافی خاندان درمیانی آمدنی پر زندگی گزارتے ہیں۔

اصلاحی اقدامات:

موجودہ پس منظر کے پیشِ نظر ہمیں ان باتوں پر غور کرنا چاہئے کہ ہمیں کون کون سے اقدامات کرنے ہوں گے جن کے ذریعہ مسلمانوں میں یہ جوش و خروش پیدا کیا جا سکے کہ وہ موجودہ تعلیمی مواقع سے انتہائی حد تک مستفید ہوں اور جدید تعلیم کے قومی دھارے میں شامل ہو جائیں، جیسا کہ ان کے دیگر ہم وطن کرتے ہیں۔ ہم نے تو اس خامی کی علامتیں عیاں کر دیں لیکن اب تک اصلاحی اقدامات کی تشخیص نہیں کی اس کے لئے ہمیں صاف صاف طور پر یہ کہنا پڑے گا کہ اصلاحی اقدامات کا انحصار مسلمانوں کے ساتھ ہی پوری ہندوستانی قوم کی معاشی۔ سماجی تبدیلیوں پر ہے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر سب سے پہلے تو بچوں کے والدین اور سرپرستوں سے بات چیت کرنی ہوگی، انہیں آج کی دنیا میں تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانا چاہئے تاکہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے اسکول میں بھیجیں اور پھر ان کے بچے جدید تعلیم کے قومی دھارے کا جزو بن جائیں لیکن اس کام کے لئے انقلابی تصور کی ضرورت ہے جس کے تحت ریاست کو یہ ذمہ داری سنبھالنی ہوگی کہ وہ ایسے غربت کی سطح سے بھی نیچی سطح پر زندگی بسر کرنے والوں کو، جو اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے اسکولوں میں بھیجتے ہیں معاوضہ دینے کے ایک پروگرام کو رو بہ عمل لانے کی ضمانت دے۔ معاوضہ زرِ نقد کی شکل میں دیا جائے تاکہ والدین کافی سمجھیں اور وہ اس پروگرام میں شرکت کریں اور اسے کامیاب بنائیں۔ اس پروگرام کے لئے کافی رقوم کی ضرورت ہوگی اس لئے چند برسوں کے لئے تعلیم کی مد کے تحت کچھ رقم اس مقصد کے تحت مختص کرنی چاہئے۔ شروع میں تجرباتی بنیاد پر ہم یہ تجویز پیش کریں گے کہ منتخب علاقوں کو (جہاں مسلمانوں، شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب طبقوں کی کثیر آبادی ہے) اس پروگرام کے تحت لایا جائے تاکہ بچوں کے سرپرستوں کا ردِ عمل کا جائزہ لیا جا سکے کیوں کہ اس پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ پسماندہ طبقوں، غریب اور معاشی لحاظ سے کمزور لوگوں میں اس بات کو اجاگر کیا جائے کہ وہ جدید تعلیم کو قبول کر لیں۔ اس مقصد کی بر آوری کے لئے ہمارے خیال میں یہی ایک واحد طریقۂ کار ہے۔ اس بات کو یہاں پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ یہ پروگرام معاشی اور مالی لحاظ سے کمزور لوگوں، بلا لحاظ مذہب کیلئے ہے۔

اس لئے ہماری تجویز یہ ہے:۔ (۱) ہر ریاست میں اور مرکزی حکومت کے علاقوں میں ۱۰ نمائندہ بلاکوں کو منتخب کیا جائے اور اس بات کا اعلان کیا جائے کہ انہیں معاوضہ تعلیم پروگرام کے تحت لایا گیا ہے (۲) آمدنی کی سطح مقرر کر دی جائے جس کے پیشِ نظر والدین اس پروگرام میں شرکت کرنے کے مستحق ہوں گے (۳) اس پروگرام میں حصہ لینے کے مستحق خاندانوں کے بچوں کو منتخب کیا جائیگا اور اس کے بعد اس مقصد کے لئے مخصوص اسکولوں میں انہیں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا جائے گا (۴) ہر خاندان سے کم از کم ایک بچہ اور زیادہ سے زیادہ دو بچوں کو اس پروگرام میں شرکت کرنے کی اجازت ہوگی (۵) ۸ سال سے زیادہ عمر کے ہر بچہ کے لئے معاوضہ زرِ نقد میں اس کے والدین کو دیا جائے گا۔ مختلف عمروں کی جماعتوں کے لئے معاوضہ

کی رقوم بھی مختلف ہونگی اور اس سلسلہ میں فیصلہ کرنے کے
بعد ہی معاوضہ ادا کیا جائے گا (۷) اس پروگرام کے تحت زیر تعلیم
طلبہ کو کتابیں، دیگر سازوسامان اور سہولتیں فراہم کرنی ہونگی۔
(۷) یہ پروگرام پہلے پرائمری دور میں ہر بچہ کے لئے ۴ برسوں تک اور
ثانوی دور میں ہر بچہ کے لئے ۶ برسوں تک جاری رہے گا۔ (۸) اس
پروگرام کی رفتار ترقی کا ریاستی سطح پر جائزہ لیا جائے گا اور اس کی
رپورٹ کو مرکزی سطح ایجنسی کو بھیجنی ہوگی تاکہ ان رپورٹوں کی روشنی
میں مرکز تعلیمی پالیسی اور تعلیمی پروگرام کی توسیع کے لئے منصوبہ
مرتب کر سکے (۹) اس پروگرام میں شرکت کرنے والوں کو اس بات
کی ضمانت دینی ہوگی کہ تعلیم کی مدت ختم ہونے کے بعد طلبہ کو مناسب
پیشے سے وابستہ کر دیا جائے گا۔

خصوصی اقدامات : چونکہ ہمیں کہیں نہ کہیں سے
اس دوڑ کو شروع کرنا ہے، لہذا اگر ہم اس ملک کے موجودہ تعلیمی
مواقع کو انتہائی حد تک روبہ عمل لانے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی
آبادی کے تعلیمی لحاظ سے پسماندہ طبقوں میں اس کے ساتھ ہی
مسلمانوں میں جوش و خروش پیدا کر دیں۔ اسکولی تعلیم کی ابتدائی اور
ثانوی سطحوں میں عورتوں کی تعلیم، بالغوں کی اور غیر رسمی تعلیم کے
حلقوں میں مسلمانوں کو مساوی مواقع فراہم کرنے کے لئے تکمیلی
تعلیمی سہولتوں اور بڑھاوا دینے کے دیگر پروگراموں اور انہیں
روبہ عمل لانے سے کچھ تو اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ مسلمان
طبقہ کو اپنے نظریہ کے لحاظ سے دیگر طبقوں کے مساوی قرار نہیں دیا
جا سکتا، لہذا مساوات کے لئے اقدامات تجویز کرنا بھی مشکل ہی
ہے، تاہم ان باتوں کے باوجود تعلیم کے حلقہ میں مسلمانوں کے مفادات
کو فروغ دینے کے لئے چند مناسب اقدامات کی گنجائش ہے۔
اس مقصد کے لئے مذکورہ بالا عبارت میں ذکر کردہ اقدامات کے
ساتھ ساتھ چند خصوصی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ترقیاتی
اقدامات کی رفتار میں تیزی پیدا ہو جائے۔ ایک مثال یہ دی جا سکتی
ہے، اگر ایک اسکول کسی ایسے علاقے میں واقع ہو جہاں مسلمانوں کی
اکثریت ہے، مثلاً زیادہ سے زیادہ بچے اس اسکول میں بھیجے گئے
[illegible] اگر ایسے اسکول کا اسٹاف مسلمان ہوں

پر مشتمل ہو تو اس بات کے امکانات کافی روشن ہیں کہ یہ ممبران لوگوں
سے براہ راست ملاقات کریں گے اور اپنے بچوں کو اسکولوں میں بھیجنے
کے لئے لوگوں پر زیادہ دباؤ ڈالیں گے۔ لیکن اگر اسٹاف غیر مسلمانوں
کے زیر اختیار ہو تو وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ ذاتی تعلقات قائم رکھیں
گے اگر ایسی کوششیں پر خلوص طریقے سے کی جائیں۔ اس لئے ہم یہ
تجویز پیش نہیں کرتے کہ اسکولوں میں اسٹاف مسلمانوں پر مشتمل ہو اور
مسلمانوں کی آبادی سے دور علاقوں میں ایسے اسکول قائم کئے جائیں۔
یہ تو عام فہم بات ہے کہ والدین کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے اپنے
گھروں کے نزدیک ترین اسکولوں میں زیر تعلیم رہیں اور اس سلسلہ میں
مسلمان والدین کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جہاں تک عورتوں کی تعلیم کا تعلق ہے تو اب ہندوستان
میں جو تحریک چل رہی ہے لیکن ابھی بھی تعلیم نسواں اعلیٰ آمدنی والے
لوگوں تک ہی محدود ہے۔ کم آمدنی والی سطح تک بلحاظ مذہب، انہیں
پسند نہیں۔ جہاں زندگی کی کم سے کم ضروریات کو پورا کرنے کے لئے محنت و
مشقت لازمی شرط ہے وہاں تعلیم تو عشرت کا سامان بن جاتی ہے اور
یہ ایسے لوگوں کی پہونچ سے باہر ہوتی ہے۔ بلالحاظ مسلمان اور غیر
مسلمان سماجی نظریہ اور عورتوں پر عائد سماجی پابندی بلاشبہ
کم آمدنی والے لوگوں کے خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم کی ترقی کے سلسلے
میں سدِ راہ ثابت ہوتی ہے۔

تعلیم بالغان : تعلیم بالغان ایک خوبصورت تصور ہے
اور جسے بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ حقیقی جامہ پہنانا چاہئے ورنہ ایک
طرح بہت ہی مختصر مدت میں ہندوستان کے خواندہ اور ناخواندہ افراد
کے درمیان حائل خلیج تنگ ہو جائے گی۔

تعلیم بالغان یا خواندگی تحریک کو بنیادی سطح سے جاری
رکھنی چاہئے اور اس سلسلے میں اس بات کو لازمی قرار دینا چاہئے کہ
ثانوی درجہ کے ہر طالب علم کو، ثانوی تعلیم پاس سرٹیفکیٹ حاصل
کرنے کے خود کو اہل بنانے کے لئے انہیں اس بات کا ثبوت فراہم کرنا
ہوگا کہ انہوں نے کم از کم چار ان پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا اور
اب وہ حسب اچھی طرح کی زبان میں کچھ لکھ سکتے ہیں اور کچھ پڑھ سکتے
ہیں [illegible] اس سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر [illegible]

تصدیق کرے گا۔ پھر آخری سال کے امتحان کے بعد متعلقہ امیدوار کو سرٹیفکیٹ عطا کر دینے سے قبل ثانوی تعلیم بورڈ مذکورہ باتوں کو پیش نظر رکھے گا۔

اس خواندگی پروگرام میں شامل طالب علم کو وظیفہ کے طور پر ۔۔ روپے کی رقم دی جانی چاہئے اور ثانوی سطح پر تعلیمی عرصہ کے دوران ہر ان پڑھ طالب علم کو مناسب مشاہرہ کے طور پر ۔۔ روپے بطور بڑھاوا دینے چاہئیں۔ نظامت تعلیم بالغان کے بالغوں کی تعلیم کے پروگراموں کے تحت ناخواندہ طلباء کو کتابیں، کاپیاں، پنسل اور دیگر ضروری چیزیں فراہم کی جانی چاہئیں۔ اس اسکیم کی سرگرمیوں اور رفتار ترقی کے سلسلے میں اس نظامت کو چوکس رہنا چاہئے۔ اس پروگرام کی اشاعت، اسے مقبول عام بنانے اور اس کی ترقی کے لئے مقامی پنچایتوں کا تعاون حاصل کرنا چاہئے۔ پنچایت کی شرکت سے اس پروگرام میں جمہوریت کو فروغ حاصل ہوگا۔ ہمارے خیال میں ان انتظامات سے خواندگی کی رفتار میں تیزی پیدا ہوگی اور آٹھ برسوں میں اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں خواندہ لوگوں کی تعداد پوری آبادی کا ۔۔ فیصد ہو جائے گی۔ اس پروگرام کی مالیاتی ذمہ داریاں مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہیں کیوں کہ دستور ہند کے رہنما اصول میں یہ بات کہی گئی ہے۔ نیز تعلیم تو مشترکہ فہرست میں شامل ہے۔ خواندگی کو دور کرنے کے اس پروگرام سے مسلمانوں کی بڑی تعداد مستفید ہوگی اور اس طرح مسلمانوں کی فیصد خواندگی کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگا۔

اس سلسلے میں یہاں اس بات کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ روایتی طور پر تعلیم ترجیحی طبقہ کے اور خاص طور پر متوسط طبقہ کے لوگوں کی میراث بن چکی تھی اور کہ ہونا کی طاقت، جو اس ملک پر حکمران تھی اس کی سرپرستی بھی کرتی تھی، تاکہ مقامی استحصال اور اس کے کارندوں کے مفادات کو فروغ حاصل ہو۔ عوامی اسکول قائم کرنے کا ایک دور شروع ہو چکا تھا لیکن ایک صدی سے زیادہ عرصہ کے بعد یہ تحریک غریب اور معاشی لحاظ سے کمزور لوگوں تک نہ پہنچ سکی۔ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ اس عوامی اسکول کے فوائد کہاں سے آتے ہیں۔ اس مقالہ میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہر ضلع میں ایک ماڈل اسکول قائم کیا جائے لیکن میرے خیال میں ایسے اسکولوں سے عام لوگوں کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، کیونکہ ایسے اسکول تو امیر لوگوں کے بچوں کے لئے ہوتے ہیں۔ اور آج حالت یہ ہے کہ ان لوگوں کے بچوں کو بھی ایسے اسکولوں میں جگہیں نہیں مل رہی ہیں کیوں کہ ایسے اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس طرح ماڈل اسکول کی اسکیم سے اعلیٰ متوسط درجہ کا ایک چھوٹا طبقہ ہی مستفید ہو سکتا ہے۔ اس سے غریبوں، غربت کی سطح سے نیچی سطح پر زندگی گزارنے والے لوگ مستفید ہو سکیں گے۔ حالانکہ ہمارے موجودہ جمہوری نظام میں ہم اس سلسلے میں چیخ پکار کرتے ہیں کہ اکثریت کے لئے خواندگی کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی میں ماڈل اسکول کی مجوزہ اسکیم کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ہم اس اسکیم کی مخالفت کرتے ہیں اور ہم نے جس اسکیم کا اس سے قبل ذکر کیا ہے اس کی تائید کرتے ہیں۔

اس بات کے پیش نظر موجودہ تعلیمی نظام میں بہتری لائی جائے تاکہ ملک میں روزگار کے بڑھتے ہوئے بازار سے اسے وابستہ کر دیا جائے اور اس طرح مسلمانوں کی معاشی حالت میں بہتری لائی جائے۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس فرقہ کے ممبروں کی یہ خواہش ہے کہ ان کی انفرادی زندگی میں بہتری لائی جائے۔ اور دیگر طبقوں کے لوگوں کے ساتھ مساوی طور پر وہ آگے بڑھ سکیں، اس لئے ہم کو قومی دھارے میں گھل مل جانا ہوگا۔ تکنیکی اور پیشہ ورانہ تربیت پر مبنی جو تعلیمی نظام رائج کیا جائے گا، اس کا ہمارے موجودہ نظام جیسے مدرسہ اور مکتبی تعلیم سے کہیں بھی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ اس طرح اس نئے تعلیمی نظام سے ہمارے لاکھوں نوجوان تعلیم و تربیت سے مستفید ہوں گے اور اپنے تکنیکی اور پیشہ ورانہ جگہوں پر فائز ہو جائیں گے۔ ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بلا لحاظ مذہب ہر ایک فرقے کی بھلائی اور ترقی کے لئے نوجوانوں کو حسب خواہ تربیت دی جانی چاہئے۔ ہم اس بات کو دہراتے ہیں کہ ہندوستانی سماج میں دیگر طبقوں کے بچوں کی تعلیم کے لئے جو نظام رائج ہے اس کے تحت مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو بھی تعلیم دی جانی چاہئے۔ اس طرح قومی یکجہتی کا فروغ ہوگا اور ایک متحدہ تعلیمی نظام قائم ہوگا جس کا مقصد لوگوں کو ایسی تعلیم دینا ہوگا جو ہندوستان کے تمام طبقوں مع مسلمانوں کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ ضابطہ وضع کے ساتھ تعلیم

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

ے

شیرِ میسور۔ ٹیپو

ڈاکٹر جے منگاما

سلطنت میسور کے دو افراد پر مشتمل خاندان کے آخری سلطان کا نام ٹیپو رکھا گیا کیوں کہ جب ان کے والد حیدر ایک پارسا بزرگ کے دیدار کیلئے گئے ہوئے تھے تو انہیں ایک لڑکے اور اپنے ولی عہد کی ولادت کی خبر ملی۔ ہندوستان میں حیدر کا مطلب ہے شیر اور ٹیپو نے خود بھی شیر بننے کے لئے اپنے سرکاری نشان کے لئے شیر کے سر کا انتخاب کیا اور اپنے محل اور قلعے کے اندر اور باہر ہر جگہ اس نشان کی نمائش کی۔

حیدر خود ان پڑھ تھے لہٰذا وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا لڑکا بھی اس محرومی کا شکار ہو۔ اسی لئے انہوں نے بہترین سے بہترین اتالیق ان کی تعلیم کے لئے مقرر کئے۔ حیدر نے اپنے بیٹے کے کانوں میں بچپن ہی سے یہ آواز ڈال دی کہ وہ ایک بادشاہ ہے اور انگریزوں کا اس ملک سے خاتمہ کر دے۔ چنانچہ ٹیپو کی پرورش انگریزوں سے نفرت کے ماحول میں ہوئی۔ سرنگا پٹم کی گلیوں میں یہ تصویر عام دکھائی دیتی تھی کہ ایک شیر نے ایک خوفزدہ انگریز کو دبوچ رکھا ہے۔ ٹیپو کے راگ محل میں ایک علامتی موضوع پر ایک شیر باجہ بھی بنا کر رکھا گیا تھا۔ جب اس کی چابی گھمائی جاتی تو شیر غراتا اور انگریز کو پکڑ لیتا، انگریز جس کے چہرے پر خوف کے مارے ہوائیاں اڑ رہی ہوتیں، درد سے کراہتا۔ کہیں کسی دیوار پر کچھ یورپی باشندے قطار میں کھڑے دکھائی دیتے جن کے ہاتھ کمر پر باندھے ہوتے اور کسی دیوار پر شیر کچھ یورپی باشندوں کو چیرتے پھاڑتے دکھائی دیتے۔

حیدر کی وفات: انگریزوں نے ۱۷۷۲ء میں میسور کے شاہی خاندان کی حکومت بحال کرنے کا منصوبہ بنایا۔

ٹیپو نے جو اس وقت بمشکل ۱۸ برس کے تھے اپنے باپ کا غضبناک حالت میں عمل اور ردعمل دیکھا اور ایک گھوڑ سوار دستے کے ساتھ انہوں نے مدراس کا قلعہ قریب قریب فتح کر لیا۔ ارکاٹ کے پاس پہنچ کر حیدر نے ٹیپو کو مغربی ساحل پر ایک اور محاذ پر لڑانے کے لئے بھیج دیا لیکن خود وہ ایک ماہ بعد سرطان کے مرض میں چل بسے۔ والد کی موت کی خبر پا کر ٹیپو نے مالابار کے محاذ کو خیرباد کہا اور تیزی سے کولار پہنچے جہاں ان کے والد کی میت رکھی ہوئی تھی۔ ٹیپو اتنی تیزی اور خاموشی سے کولار آئے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ کولار میں انہوں نے پندرہ دن تک اپنے والد کی تمام آخری رسوم انجام دیں اور دل کھول کر فقیروں کو خیرات دی۔ حیدر کی وفات پر ریاست میں کوئی سوگ نہیں منایا گیا اور اسی طرح ٹیپو کی تاج پوشی ریاست کی خاموش ترین تقریب تھی۔ بلکہ کہنا ہوگا کہ باپ بیٹے دونوں کی کبھی رسم تاج پوشی ہوئی ہی نہیں۔ حیدر کی آخری رسوم انجام دینے کے بعد ٹیپو خود مسند پر بیٹھ گئے اور اپنے والد کی وفات کا اعلان کیا۔

رہنماؤں اور سرکردہ درباریوں نے اپنے نذرانے ٹیپو کو پیش کئے۔ ٹیپو کو ۸۸ ہزار افراد کی فوج اور تین کروڑ روپئے نقد اور بڑی مقدار میں زیورات و جواہرات پر مشتمل خزانہ وراثت میں ملا۔

اسّی ہزار مربع میل علاقے اور ۶۰ لاکھ آبادی پر حکمراں ہونے کے باوجود ٹیپو اپنے والد سے کسی طور پر کم اولوالعزم اور توسیع پسند نہیں تھے۔ ایک مضبوط بحری طاقت بننے کی خواہش سے منگلور کی بندرگاہ پر ان کی مہم بہت اہمیت رکھتی ہے۔ بدنور پر قبضہ اور برطانوی افسروں سے کیا گیا سلوک انگریزوں کے خلاف ان کی نفرت کی درخشاں مثالیں ہیں۔

جنوب کا بلیک ہول: ٹیپو مالابار میں زیادہ سرگرم تھے۔ وہ انگریزوں کا رسوخ ختم کرنے اور اپنے علاقے کی حفاظت کے لئے جنگ کی آگ علاقے کے اندر تک لے گئے۔ اس مہم میں فرانسیسی ان کی مددگار رہے تھے جنہیں خوفناک کشت و خون کے بعد فتح حاصل ہوئی تھی۔ تمام برطانوی افسر سوائے ایک کے زخمی ہوئے اور قید کر لئے گئے۔ انہیں سرنگا پٹم میں اذیت ناک قید سخت کی سزا بھگتنی پڑی۔ جو قیدی اس مشکل سے نکل رہے انہوں

نے اسے جنوب کا جنگ بہول قرار دیا۔

فرانسیسیوں نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ ٹیپو نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا کہ ان سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ جنگ بند ہو گئی لیکن سلطان اور انگریزوں کی دشمنی میں نہیں۔ ۱۷۸۹ء میں جب ٹیپو نے ولندیزی بستی کرنگانور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو فرانسیسیوں نے اسے انگریزوں کے ہاتھ ترادنکور کو فروخت کر دیا۔ اس بات پر غضبناک ہو کر کہ ان سے مشورہ نہیں کیا گیا ٹیپو نے ترادنکور پر چڑھائی کر دی۔ مرہٹے اور نظام انگریزوں سے مل گئے۔ جب انگریزوں نے کرناٹک کی طرف سے خطرہ پیدا کر دیا تو ٹیپو جلدی سے اپنی راجدھانی لوٹ آئے۔ انگریز ٹیپو کو گھیرنے کی غرض سے ساری سرحد کے ساتھ ساتھ اپنی فوجی طاقت بڑھانے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ لیکن ٹیپو نے اس کے جواب میں دشمنوں کو حیران کر دینے کے لئے اپنی پوزیشن کو اتنی تیزی اور چستی سے بدلا کہ عقبی جانب سے ان کا تعاقب کیا اور وہاں سے بھگا دیا۔ انگریزوں نے مغربی ساحل سے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ٹیپو نے ان سے سمجھوتہ کر لیا کیوں کہ ان کی کامیابی سے ٹیپو حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

برطانوی فوج مہم کے لئے اپنی تیاری مکمل کرنے اور پہاڑیوں میں آسانی داخلے کے دروں کے محل و قوع کا جائزہ لینے کے بعد ایک بار پھر میسور میں داخل ہو گئی۔ کولار اور ہوسکوٹا کے قلعے آسانی سے سر ہو گئے اور انگریز بنگلور کے نزدیک آ پہنچے۔ ٹیپو اپنے والد کی تنبیہ کے باوجود جنگ کو میسور کی سرزمین پر لے آئے تھے۔ ٹیپو کی گھوڑ سوار فوج نے انگریزوں کو دو سو افراد اور تین سو گھوڑوں کا نقصان اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ان کی فوج کا قلبی حصہ انگریزوں کی فوج سے جا ملا اور بنگلور پر ان کے قبضے سے ٹیپو کو سخت جھنجھلاہٹ ہوئی۔ ۱۷۹۱ء میں ٹیپو نے دشمنی ختم کرنے کے لئے بات چیت کی تجویز پیش کی۔ کارنوالس نے مرہٹوں اور نظام پر بھروسہ کرتے ہوئے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ حالانکہ ہوا کا رخ ٹیپو کے مخالف تھا پھر بھی انہوں نے دھمکی کے طور پر تین انگریز قیدیوں کو قتل کرا دیا۔ کارنوالس نے سرنگاپٹم پر چڑھائی کر دی۔ نظام کی گھوڑ سوار فوج اس کے ساتھ تھی۔ وہ بہت مشکل سے سرنگاپٹم سے نو میل دور ارا کیری کے مقام پر پہنچ پایا۔ ٹیپو نے یہ محسوس کر کے کہ وہ چاروں اطراف سے گھر گئے ہیں، انہیں نکل جانے کا راستہ دے دیا اور خود قلعہ بند ہو گئے۔ قلعہ کے باہر پڑاؤ بھی انگریزوں کی حمایت پر آ گئے۔ ٹیپو نے پھر بات چیت کی کوشش کی جو کامیاب نہیں ہوئی۔ چونکہ مانسون شروع ہو گیا تھا اس لئے انگریز اور ان کے ساتھی اپنے صدر مقامات تبدیل کر کے بنگلور کے قریب لے گئے اور نندی قلعہ فتح کر لیا۔

پہلی شکست : کارنوالس سرنگاپٹم کی تباہی پر تُلا ہوا تھا۔ اتحادی فوجیں پھر راجدھانی کی جانب بڑھیں۔ ٹیپو نے اپنے قلعہ کی حفاظت کا فیصلہ کیا جو کہ وسیع سلطنت میں سے واحد جگہ اس کے پاس بچ رہی تھی۔ جو فرانسیسی ان کی فوج میں ملازم تھے وہ ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ صلح و صفائی کی ایک کوشش کے طور پر انہوں نے تمام انگریزی قیدی رہا کر دئے اور صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی وہ ۱۷۹۲ء کی ذلت آمیز شکست سے نہ بچ سکے۔ معاہدے کی شرائط کے مطابق انہیں اپنا نصف علاقہ اتحادیوں کے حوالے کرنا پڑا۔ ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ روپئے کی ادائیگی کرنی پڑی۔ حیدر علی کے وقت سے گرفتار تمام قیدی واپس کرنے پڑے اور اپنے دو لڑکے بطور یرغمال رکھنے پڑے۔

ٹیپو اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے انتظار کر رہے تھے کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ خفیہ خط و کتابت میں ٹیپو نے بیان کیا ہے کہ کس طرح ان کے مخالف متحد ہو کر آئے اور کس طرح انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا جا سکتا ہے۔ ٹیپو نے تجویز کے مطابق فرانسیسیوں کو پیدل، گھوڑ سوار اور توپ خانے پر مشتمل ۱۵ ہزار فوج دینی تھی اور ساحلوں پر لڑائی کے لئے ایک بحری فوج بھی سپرد کرنی تھی جبکہ ٹیپو کو فرانسیسی فوج کو فوجی سامان اور یوروپین شرابوں کے سوا کھانے پینے کا سامان مہیا کرنا تھا۔ ٹیپو یہ بھی چاہتے تھے کہ فتح کے بعد کوئی معاہدہ کرتے وقت ٹیپو کو فرانس کا اتحادی سمجھا جائے۔ بہت سے فرانسیسی ماہرین اور کاریگر جو توپیں ڈھالنے، کاغذ اور شیشہ تیار کرنے کے ماہر تھے اور کچھ انجینئر و معماروں کو سلطان کی ملازمت میں شامل ہونا تھا۔ فرانسیسیوں نے ٹیپو کو انگریزوں کے ناپاک ارادوں سے خبردار کیا جو اپنی سازشوں سے ہندوستان میں ہر طاقت کو تباہ کر سکتے تھے۔ ایک فرانسیسی جنگی جہ

سلطان کے سفیروں اور فرانسیسی فوجیوں کو لے کر ۱۷۹۸ء میں منگلور
بندرگاہ پر پہنچا۔ انگریزوں نے اسے امن کے معاہدے کی کھلی
خلاف ورزی قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ ٹیپو نے براہِ راست دشمنی
اور ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف جارحیت کی کارروائی کی ہے۔
اسے کھلم کھلا اور برملا اعلانِ جنگ قرار دیا گیا۔

میسور کی جنگ

جب ٹیپو فرانس کو ایک سفارت
بھیجنے میں مصروف تھے تو ویلزلی کی
کمانڈ میں برطانوی فوج آگے بڑھی۔ جو بالآخر سرنگا پٹم جا پہنچی
اور حکم دے کر میسور میں داخل ہو گئی۔ اب تک ٹیپو کو یقین تھا کہ سرنگا
پٹم ناقابلِ تسخیر ہے۔ اس نے فرانس کی مدد سے کارومنڈل کے
ساحل کا مالک بننے کی ٹھان لی تھی۔ ۱۷۹۲ء کے بعد اس نے اپنے
مقبوضہ علاقوں کے لئے "خداداد سرکار" کے الفاظ منسوب کرائے
جس کا مطلب ہے وہ سرکار جو خدا کا عطیہ ہو۔

سرنگا پٹم پر ۴ مئی ۱۷۹۹ء کی دوپہر کو یلغار کی گئی۔
انگریز اب تک ناقابلِ تسخیر قلعے اور محل میں داخل ہو گئے۔ ٹیپو اپنے
بہت سے افسروں اور فوجیوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں ہلاک ہو گئے۔
جب انہیں ڈیوڑھی سے باہر لایا گیا تو ان کی بڑی بڑی آنکھیں ابھی تک
کھلی تھیں اور جسم اتنا گرم تھا کہ ویلزلی کو بھی ایک لمحہ تو شک گزرا کہ
کہیں وہ زندہ تو نہیں۔ ٹیپو کو چار زخم لگے تھے۔ ان میں سے تین
زخم جسم پر اور ایک کنپٹی پر تھا۔ وہ دشمن کا مقابلہ کرتے میدانِ جنگ
میں مارے گئے۔ انہیں ایک جلوس کی صورت میں لے جا کر سرکاری
اعزازات کے ساتھ ان کے والد حیدر علی کی قبر کے پہلو میں دفنایا گیا۔

انگریزوں کو قلعوں میں بارود کے گیارہ بڑے ذخیرے،
گیارہ اسلحہ خانے، توپیں ڈھالنے کے دو کارخانے اور گولی سکے کے
چار بڑے ذخیرے ملے۔ اب میسور کی پوری سلطنت اپنے تمام وسائل
کے ساتھ انگریزوں کے قدموں پر تھی۔ اصطبلوں کے گھوڑے، ہاتھی اور
اونٹ اور بیل ان کے حوالے کر دیے گئے۔ فتح کی رو سے انہیں یہ سارا
علاقہ اپنے پاس رکھنے کا اختیار تھا۔ محل سے جو کاغذات ملے ان
سے پتہ چلتا ہے کہ ٹیپو کس طرح انگریزوں کو ہندوستان سے خارج کرنا
چاہتے تھے۔ فرانسیسی اور فارسی میں لکھے کاغذات تھے جو ٹیپو سلطان
کی دربار کابل اور ترکی دربار سے خط و کتابت سے متعلق تھے جن
میں انہیں صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے مدد مانگی گئی تھی۔ ملک کے
اندر انہوں نے تمام بڑی بڑی طاقتوں سے خط و کتابت کی تھی جس
میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ برطانوی عزائم کو ناکام بنانے کے لئے متحد
ہو جائیں۔ پونا میں دولت راؤ سندھیا، حیدرآباد میں نظام کو، دلی
کالی کٹ اور مالابار کے ساحل پر کمپنی کے مقبوضات میں اپنے خفیہ
ایجنٹوں کو خطوط لکھے گئے تھے۔

ٹیپو ایک باخبر سلطان تھے اور کبھی کوئی کتاب پڑھے
بغیر نہیں سوتے تھے۔ ان کی لائبریری راجاؤں کی لائبریری میں سب
سے بڑی اور بیش قیمت تھی۔ کوئی ایسا موضوع نہیں تھا جس پر
ان کے پاس کتاب نہ ہو۔ لائبریری میں اسلامی ادب پر عربی، فارسی
اور ہندوستانی زبانوں میں تقریباً دو ہزار کتابیں تھیں۔ ان میں سے
اکثر کتابوں کی تحریر نہایت خوبصورت اور آرائشی تھی۔ یہ
کتابیں سندور، اکڑا پا اور کرناٹک کی لوٹ کا ایک حصہ تھیں۔

انگریزوں نے ٹیپو کی موت کے بعد ان کی زیادہ عزت
افزائی کی۔ جب تک وہ زندہ تھے وہ ان سے زیادہ ڈرتے رہے۔
سرنگا پٹم سرنگوں ہونے کے بعد ونڈھیا چل کے جنوب میں واحد
بڑی طاقت کا وجود ختم ہو گیا اور برطانیہ کے لئے ۱۹ ویں صدی کے
آغاز میں سارے پریزیڈنسی میں مالیہ کی تشکیل اور تصفیہ کا راستہ
صاف ہو گیا۔

ٹیپو نے مرتے وقت اس قول کو جسے وہ اکثر دہرایا کرتے
تھے، صحیح ثابت کر دکھایا کہ صدیوں تک بھیڑ کی طرح زندہ رہنے سے
دو دن کی شیر کی زندگی بہتر ہے۔ ***

بقیہ: تامل ناڈو کے جنگلی باشندے

ہے اور میدانوں کے ماہرینِ طب اکثر وہاں آتے رہتے ہیں۔
وہ لوگ جو شدید بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں انہیں اٹھا کر
اب بھی آٹھ دس کلومیٹر دور کے ہسپتالوں میں لے جاتے ہیں۔

تامل ناڈو کے

ملیالی باشندے

اختراع الفاظ کا علم بھی کیا گل کھلاتا ہے۔ تمل ناڈو کی سنتھیری پہاڑیوں میں رہنے والے ملیالی لوگ ایسی ہی صورتحال میں رہتے ہیں۔

تمل زبان میں "ملائی" کا لفظ پہاڑی کے معنی رکھتا ہے۔ "الی" لفظ کا مطلب ہے باشندہ یا حکمراں۔ ان دو الفاظ کو ملا کر بنائے گئے لفظ ملیالی سے مراد ہے پہاڑوں کا باشندہ یا حکمراں۔ ایسی ہی صورت میں تمل لوگ جو سنتھیری کی پہاڑیوں میں رہتے ہیں۔ تمل زبان میں ملیالی کہلانے لگے۔ یہ ملیالم بولنے والے ملیالی نہیں ہیں۔ یہ تمل زبان بولتے ہیں۔ لسانیات میں تراکیب کی ادلا بدلی کی یہ ایک بہت ہی عمدہ مثال ہے۔

سنتھیری کی پہاڑیاں تمل ناڈو کی دھرما پوری کا ضلع میں واقع ہیں۔ اس علاقے میں ۳۴ گاؤں ہیں۔ تمل ناڈو کے ملیالیوں نے مدتوں سے اونچے علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی تمام دلکش جسمانی خدوخال حاصل کر لئے ہیں۔ سفید وقامت ہیں وہ ہلکے پھلکے [illegible] رنگ کے ہوتے ہیں۔

وہ اپنے آپ کو ان پانچ قبائلی سرداروں کی اولاد سمجھتے ہیں جو اس علاقے میں کانچی پورم سے آئے تھے۔ نگریشو کانچی کے نام سے یہ شہر سولہویں صدی کا ہے [illegible] کا مشہور راجدھانی تھا۔ ابتداء میں وہ کھرآمن کے کوہستان کا [illegible] آباد ہو گئے [illegible] سنتھیری کا ایک بڑا حصہ ہے [illegible] تمل زبان بولتے ہیں [illegible]

کرلیا ہے لیکن تحریر میں تمل حسب معمول رہی ہے۔ لباس اور ایسے ہی دوسرے معاملات میں بھی ایک ملیالی اور تمل باشندے میں کوئی فرق نہیں۔ امتیازی روایات اور مکمل دیانت داری جو دنیا بھر کے پہاڑی باشندوں کی مشترکہ خصوصیات ہیں ان ملیالیوں کو غریبی سے محفوظ نہ کر سکیں۔ ان کی رہائش گاہیں محض جھونپڑیاں ہوتی ہیں جو مٹی کی دیواروں پر بانس اور کدجن کے پتوں کی کھپریلوں سے بنی ہوتی ہیں۔ جنگلوں سے گال نٹ جمع کر کے انہیں چھتوں پر سکھاتے ہیں اور دھرم پوری کے شہر میں بیچتے ہیں۔ یہی شہر ان کے لئے تہذیب و تمدن کا نزدیک ترین مقام ہے۔

ان کی اہم خوراک جوار باجرہ ہے اگرچہ وہ دھان بھی اگاتے ہیں لیکن چاول ان کے لئے خصوصی نعمت ہے جسے اہم موقعوں کے لئے رکھ لیا جاتا ہے۔

ملیالی لوگ اپنی شناخت منفرد رکھتے ہیں چاہے وہ بہت ہی غریب ہوتے ہیں۔ ہر گاؤں کی پنچایت ہوتی ہے جس کا مکھیا اور گاؤنڈر کہلاتا ہے۔ مختلف وقفوں کے بعد تمام گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ سنتھیاں ارکاٹ کی ایک دور دراز پہاڑی میں سکونت پذیر ان کا سردار ان کے دورانی تالی اس اجتماع کی صدارت کرتا ہے۔ اس کی سماجی زندگی میں بیرونی اثرات جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی اگرچہ طلاق اور بیوہ کی شادی عام ہوتی ہے۔ طلاق کی صورت میں بچے باپ کے پاس ہی رہتے ہیں۔

سنتھیری کے ملیالی لوگ پہاڑی چیزیں اکٹھی کر کے یا کھیتی سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ چاول اور جوار باجرہ اگاتے ہیں۔ گال نٹ، بانس اور صندل کی لکڑی ہی وہ اہم چیزیں ہیں جو ان ہی پہاڑوں سے دستیاب ہوتی ہیں۔

دھیرے دھیرے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ پسماندگی سے [illegible] باہر نکل رہے ہیں۔ اب تعلیم صحت کی دیکھ بھال، [illegible] اور دیگر سہولیات انہیں دستیاب ہو رہی ہیں [illegible] ایک ہسپتال قائم ہو چکا

[باقی صفحہ ...]

سرکاری خبریں

وقف ترمیمی ایکٹ

بنگال وقف ایکٹ میں ترمیم لائی گئی ہے اور اس ترمیمی ایکٹ یعنی وقف ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۵ء کو ہندوستان کے صدر کی منظوری حاصل ہوگئی۔ اس ترمیمی ایکٹ میں رکھی گئی گنجائش کے تحت اس ایکٹ کو مغربی بنگال میں نافذ کیا جارہا ہے۔ اس ترمیمی ایکٹ میں وقف کمشنر کی منظوری حاصل کئے بغیر وقف جائیداد منتقل کرنے والوں کے اور جن کے نام پر منتقل کئے جائیں گے ان کے خلاف تعزیرات ہند کے تحت قانونی کارروائی کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس ترمیم سے قبل اگرچہ ایسی اجازت حاصل کرنی لازمی تھی تاہم وقف کمشنر کی منظوری یا اجازت کے بغیر وقف جائیداد منتقل کرنے والوں یا جن کے نام پر جائیداد منتقل کئے گئے ان کے خلاف تعزیرات ہند کے تحت قانونی کارروائی کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وقف جائیداد کی منتقلی کی بابت مرتب کردہ قانون دیوانی میں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف اقدامات یا وقف جائیداد کی تعمیر، ازسر نو تعمیر یا تبدیلی کے کام کی روک تھام کرنا امر محال بن چکا ہے یہاں تک کہ وقف سے وابستہ دیگر شعبے اور مقامی باڈیز جیسے شعبہ محاصل آراضی، کارپوریشن بھی منتقلی کی دستاویزات کے مطابق جائیداد کی منتقلی سے انکار کرنے میں دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔ اسی لئے وقف ایکٹ کی دفعہ ۵۳ کے باوجود جس میں پہلے اجازت لینے کی گنجائش رکھی گئی ہے درحقیقت جائیداد کی منتقلی کی روک تھام نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس ترمیم کردہ قانون کی تعزیراتی دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ ایسی جائیداد منتقل کرنے کا کام کرنے والے لوگ بلا اجازت وقف جائیداد منتقل نہ کرسکیں۔ اس ترمیمی ایکٹ میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وقف کمشنر کی اجازت حاصل کئے بغیر وقف جائیداد منتقل کرنے والے لوگوں کو اب قابل تعزیر سمجھا جائے گا اور انہیں چھ ماہ قید کی سزا دی جائے گی۔

ریاستی سطح پر بچوں کی رفاہ کے بورڈ کی ازسر نو تشکیل

۱۹۷۴ء میں سارے ملک میں بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک قومی پالیسی کو اپنایا گیا۔ اس پالیسی میں مرکزی سطح پر بچوں کے قومی بورڈ کے اور ریاستی سطح پر بچوں کے ریاستی بورڈ کی تشکیل کی گنجائش رکھی گئی ہے نیز ان مرکزی اور ریاستی بورڈوں کو یہ ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں کہ وہ بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مرتب کردہ منصوبوں کا جائزہ لیں اور اس کام میں مصروف عمل اداروں کی خدمات میں تال میل پیدا کریں۔

اس پالیسی کے پیش نظر ۱۹۷۵ء میں بچوں کے رفاہی بورڈ کی تشکیل کی گئی۔ اب اسی بورڈ کی ازسر نو تشکیل کی جاتی ہے۔ یہ بورڈ مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل ہوگا۔

صدر: وزیر اعلیٰ مغربی بنگال

عملی چیرمین: وزیر انچارج شعبۂ امداد و رفاہ

ممبران: (۱) آفیسر انچارج شعبۂ مالیات (۲) وزیر انچارج، شعبۂ صحت (۳) وزیر انچارج، صحت عامہ اور پروگرام، شعبۂ صحت عامہ اور خاندانی رفاہ (۴) وزیر انچارج ابتدائی و ثانوی تعلیم (۵) ریاستی منصوبہ بندی بورڈ کا نامزد کردہ اسی بورڈ کا ایک ممبر (۶) بچوں کی رفاہ کے کام میں مصروف عمل رضاکار اداروں کے پانچ ممبران (۷) عزت مآب اسپیکر کے نامزد کردہ ریاستی اسمبلی کے تین ممبران (۸) بچوں کے ریاستی بورڈ کا ایک نمائندہ (۹) چیرمین، مغربی بنگال سماجی رفاہ مشاورتی بورڈ، ۱۰ اے مرزا غالب اسٹریٹ کلکتہ (۱۰) بچوں کی رفاہ سے وابستہ مشہور تربیتی ادارہ کا ایک نمائندہ۔

ممبر سکریٹری: شعبۂ امداد و رفاہ (رفاہی شاخ)

اس بورڈ کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ بچوں کی رفاہ کی سرگرمیوں سے وابستہ پروگرام مرتب کرے اور پروگرام کی تکمیل کے کام کی نگرانی کرے نیز بچوں کی رفاہ کے لئے پروگرام کی تکمیل میں مختلف سرکاری اور پرائیویٹ ایجنسیوں کے درمیان تال میل قائم رکھ سکے۔

فالتا برآمدات پروسیسنگ علاقہ کی رفتار ترقی

ریاستی حکومت کے وزیر صنعت و تجارت شری نرمل بوس نے ۶؍فروری ۱۹۸۶ء کو فالتا برآمدات پروسیسنگ علاقہ کا دورہ کیا اور وہاں کئے جانے والے تعمیراتی کام کی رفتار ترقی کے سلسلے میں اپنی تشفی کا اظہار کیا۔

اب تک اس علاقہ میں ۱۴ صنعت کاروں کو اپنے اپنے کارخانے قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ان کارخانوں کے لئے ۳۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی ضرورت ہوگی۔ اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ پانچ برسوں میں یہاں سے ۴۰۰ کروڑ روپے زر مبادلہ کی صورت میں کمائے جائیں گے۔ مرکزی حکومت نے اس علاقہ کی ترقی کے سلسلہ میں تعمیراتی کام کاج کے لئے ۵ء۱۵ کروڑ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔ اس رقم میں سے آٹھ کروڑ روپئے مارچ ۱۹۸۶ء تک تعمیری اخراجات کے لئے اس پروسیسنگ علاقہ کے حکام کو دے گئے ہیں۔ ریاستی حکومت نے انڈسٹریل انفرااسٹرکچر ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے ذریعہ اس علاقہ میں سڑکوں کی تعمیر، بجلی کی فراہمی، پانی کے نکاس اور دیگر ضروری اقدامات پر ۶۴ء۹ کروڑ روپے خرچ کئے۔ اس علاقہ کو قائم کرنے کے لئے ۱۲۸۰ ایکڑ قطعات آراضی کو حکومت نے اپنے اختیار میں لے لیا ہے۔ یہاں ایک گاؤں تھا جہاں ۳۰۰ خاندان آباد تھے۔ گاؤں کی پوری آبادی کو پاس کے ایک گاؤں گوپال پور میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ گاؤں ۴۰ ایکڑ رقبہ آراضی پر پھیلا ہوا ہے اور اسے ایک نمونے کے گاؤں میں تبدیل کرنے کے لئے یہاں ترقیاتی کام کاج شروع کر دئے گئے ہیں۔

شری بوس نے یہاں رفتار ترقی کے سلسلے میں اپنی تشفی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ مالی دشواریوں کے باوجود ریاستی حکومت اس علاقہ کی ترقی کی خاطر ہر قسم کی مدد فراہم کرے گی۔ ایک پرائیویٹ یونٹ نے جو کمپیوٹر کے لئے ڈوٹ میٹرکس پرنٹر تیار کرتا ہے گزشتہ ڈیڑھ مہینے میں ۱۰ لاکھ روپئے کی مالیت کی مصنوعات برآمد کی ÷÷÷

سیلی گوڑی میں ریاستی سطح کے مرکز اطلاعات کا افتتاح

حکومت مغربی بنگال کے شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور کے زیر قیادت ۱۳؍فروری ۸۶ء کو سیلی گوڑی میں ریاستی سطح پر ایک اطلاعاتی مرکز کی افتتاح کی تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقع پر پہاڑی امور کے وزیر ریاست شری تمنگ داوا لاما نے کہا کہ یہ مرکز سیلی گوڑی اور شمالی بنگال کے عوام کی دیرینہ خواہش کو پورا کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس بات کی امید کرتے ہیں کہ یہ مرکز صحیح اطلاعات کی اشاعت کی بنیادی ذمہ داری نبھائے گا اور ثقافتی سرگرمیوں کا انتظام کرے گا۔ اس جشن کے سلسلے میں منعقدہ ایک جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور کے وزیر ریاست شری پربھاش چندر پھودیکار نے اپنی تقریر میں کہا کہ تقریباً ۱۳ء۱ کروڑ روپئے خرچ کر کے یہاں ایک عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اس زیر تعمیر عمارت کے کچھ حصے کھول لئے گئے ہیں۔ پوری عمارت ایک سال کے اندر مکمل طور پر تیار ہو جائے گی۔

انہوں نے مزید کہا کہ یہ عمارت ۹۰۰ نشستوں کی ایک بڑی ایئر کنڈیشن آڈیٹوریم، ایک لائبریری، ایک نمائش ہال وغیرہ پر مشتمل ہوگی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ یہ مرکز صحت مند ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوگا اور عوام کو صحیح اطلاعات فراہم کرے گا۔ انہوں نے مقامی لوگوں اور پریس پر زور دیا کہ وہ اس مرکز کی سرگرمیوں میں اپنا تعاون پیش کریں۔

اس جلسہ میں جلپائی گوڑی ڈویژن کے کمشنر شری بھاسکر گھوش، سیلی گوڑی میونسپلٹی کے چیئرمین شری سوبن سرکار، سیلی گوڑی کے ایم ایل اے شری بیرن بوس نے بھی تقریریں کیں ÷÷÷

ذمہ داری سنبھالنے کی چھ بیمار یونٹوں کی مدت میں توسیع

مندرجہ ذیل بیمار یونٹوں کی ذمہ داری سنبھالنے کی مدت ۱۳؍مارچ کو پوری ہونے جا رہی ہے۔

یونٹوں کے نام	ذمہ داری سنبھالنے کی تاریخ	مزدوروں کی تعداد
انڈین بیلٹنگ اینڈ کاٹن ملس لمیٹیڈ۔	۶-۹-۷۴	۱۱۹
گلوکرنٹ لمیٹیڈ	۲۲-۷-۷۵	۵۳۴
آلوکو ڈیلکس ووسپیتی اینڈ چلوئی ووڈ لمیٹیڈ	۲۹-۳-۷۸	۵۴۲
ٹی ٹی بسکٹ کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹیڈ اینڈ ٹی ٹی ملس (پرائیویٹ) لمیٹیڈ	۲۷-۷-۷۹	۴۵۲
انڈین ہیلتھ انسٹی ٹیوٹ اینڈ لیبوریٹری لمیٹیڈ	۴-۹-۷۹	۳۸۶
اپولو زپر کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹیڈ۔	۲۶-۵-۷۹	۳۱۲

حکومت مغربی بنگال کے وزیر برائے تجارت و صنعت شری نرمل بوس نے مرکزی وزیر برائے صنعت سے ایک خط میں گزارش کی ہے کہ ذمہ داری سنبھالنے کی مدت کو مزید ایک سال کے لئے بڑھا دیا جائے۔ اس مدت کے اندر ایسے تمام یونٹوں کے قومیانے کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

شری بوس نے مزید بتایا کہ تمام پٹرولیم مصنوعات جن میں پٹرول، ڈیزل، پکانے کی گیس اور کراسن تیل شامل ہیں، کی قیمت میں اضافے کے سلسلے میں مرکزی حکومت کا اعلان سے نہ صرف تمام لوگ بری طرح متاثر ہوں گے اور اس سے افراط زر میں اضافہ ہوگا، بلکہ اس سے ریاست کی صنعتی ترقی بھی بری طرح متاثر ہوگی۔ صنعتوں کا دارومدار زیادہ تر پٹرولیم مصنوعات پر ہوتا ہے مگر پیداوار کی بہت ساری خام اشیاء کی قیمتوں میں باضابطہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ اضافہ صنعتوں کے لئے مزید مسائل پیدا کرے گا۔

ہسپتال کھولنے کیلئے عطیہ

بولپور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے لئے مزید طبی سہولتیں فراہم کرنے اور زیادہ سے زیادہ مریضوں کے ہسپتالوں میں علاج کے سلسلے میں ریاستی حکومت نے بولپور میں ایک ریاستی عام ہسپتال کھولنے کے لئے ۲۵۰۰۰ روپئے بطور غیر مکرر عطیہ دینے کی منظوری دی ہے۔ اس ہسپتال میں مریضوں کے لئے ۱۲۵ بستر ہوں گے اور آؤٹ ڈور میں بھی مریضوں کا علاج کیا جائے گا۔ مذکورہ ۱۲۵ بستروں میں سے ۱۰۰ بستر مفت ہوں گے اور ۲۵ بستروں کے لئے فیس لی جائے گی۔

بقیہ: اقلیتوں کی تعلیم

کے حصول کو جس کا میں نے ذکر کیا ہے، اور اس سے متعلق سہولتوں کے دیگر پہلوؤں کو [illegible] ہندوستان کے عام لوگوں کی بنیادی معاشی [illegible] ہو سکے اور اس طرح اس سے مسلمانوں کے بھی مفادات کو فروغ حاصل ہوگا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلمان شہریوں کے ساتھ مختلف طریقہ سے سلوک کیا جائے، جبکہ ہماری منزلِ مقصود متحدہ ہندوستان ہے۔ لیکن ہم اس بات کی امید کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے لئے سماجی تحفظ کے انتظامات کئے جائیں گے، جو غربت کی سطح سے بھی نیچی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور اس میں مسلمان اور غیر مسلمان دونوں شامل ہیں۔

رفیقِ راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد
چھٹا یہ ساتھ تو رہ کی تلاش بھی نہ رہی
ملول تھا دلِ آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا اک خراش بھی نہ رہی

فیض احمد فیض

قطعہ



سندربن علاقے کی مزید ترقی کے سلسلے میں ۳۰ ؍ اور ۳۱ ؍ جنوری ۱۹۸۶ء کو مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو "سندربن علاقے" کا اسٹیمر سے دورہ کرتے ہوئے۔

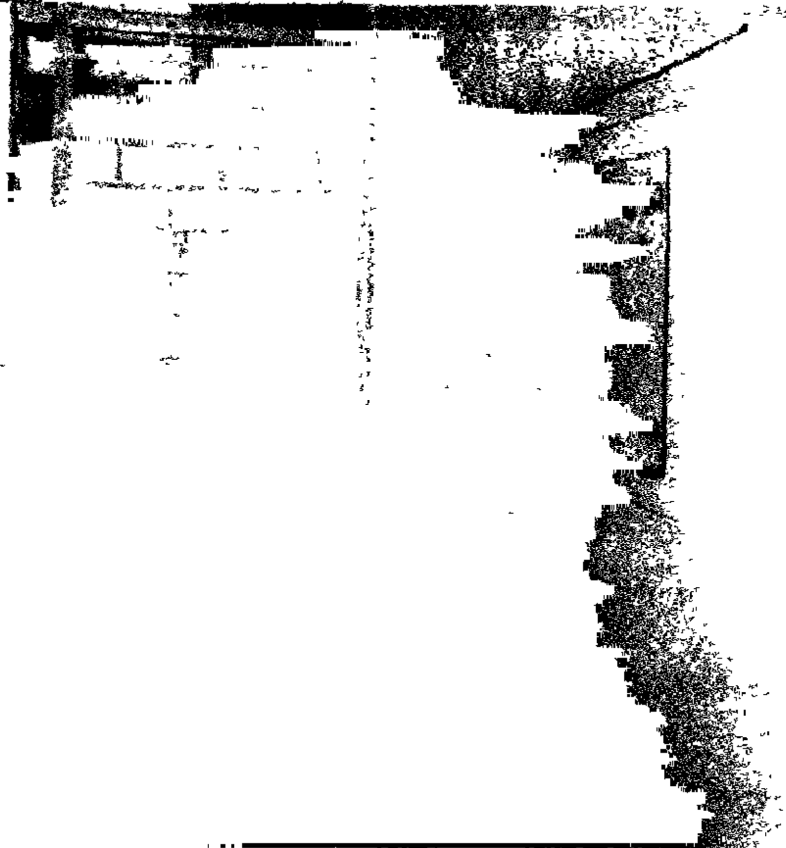


سندربن علاقے میں نیا نمونہ کھالی جیٹی" جس کا مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے ۳۰ ؍ جنوری ۱۹۸۶ء کو افتتاح کیا۔

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azam, Published by the Information & Cultural Affairs Department, Govt. of West Bengal and Printed by M/s. G. R. T. Printers, 54/1C, Shyampukur Street, Calcutta-700 004.

Postal Regd. No. WB/ CC-52
Vol—33 No.—4
PRICE—12 Paise

MAGHREBI BANGAL
15th Febuary 1986



مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو مدنا پور میں ودیا ساگر یونیورسٹی کی نئی عمارت کا ۱۵ ر جنوری ۱۹۸۶ء کو افتتاح کرتے ہوئے۔



مغربی بنگال



پندرہ روزہ
مغربی بنگال
کلکتہ

مدیر اعلیٰ : پروستین بھٹاچاریہ

مدیر : دھریندرا ناتھ دت

مدیر معاون : محمد اعظم

جلد نمبر ۱۳ ★ یکم مارچ ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۵

شرح خریداری

سالانہ: تین روپے ★ اس شمارے کی قیمت: بارہ پیسے

ترسیل زر کا پتہ:

بزنس منیجر
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۱۳۔ آر، این، مکھرجی روڈ۔ کلکتہ ۷۰۰۰۰۱



صدر جمہوریہ ہند شری ذیل سنگھ ۱۰ فروری ۱۹۸۶ء کو سندن ہال، کلکتہ میں پریس کلب کے زیر اہتمام قومی یکجہتی پر منعقدہ ایک سیمینار میں۔ مغربی بنگال اسمبلی کے اسپیکر جناب ہاشم عبدالحلیم کو بھی تصویر میں دیکھا جا سکتا ہے (تصویر از اجیت داس)

فلم اُتسو ۸۶

حیدرآباد میں رنگارنگ فلم تقریب کا افتتاح



روشنی کی چمک دمک، گیتوں کے لہراتے سروں اور رنگین رقص کے درمیان حیدرآباد میں "فلم اُتسو ۸۶" کا افتتاح ہوا۔ اس اتسو کا مشہور فلم آرٹسٹ شری اشوک کمار نے افتتاح کیا اور جنوب کی ایک مشہور فلم اسٹار سری دیوی نے روایتی چراغ جلا کر اس تقریب کا آغاز کیا۔

اس تقریب کے میزبان آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ شری این۔ ٹی۔ راما راؤ اس افتتاحی تقریب میں دیگر مہمانوں کے ساتھ موجود تھے۔ یہ تقریب مرتبہ "للیتا کلا تھورانم" کے ڈائس پر منعقد ہوئی۔ اس تھورانم کی تقریب کے لئے ۹۰ دنوں میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس موقع پر کنڑا کی ایک تفریحی فلم "۰۰ ۹ دن" کھلی ہوا کے آڈیٹوریم کے بڑے پردے پر پیش کی گئی۔

اس شاندار تقریب کے افتتاح کے بعد شاندار رقص پروگرام پیش کیا گیا۔ اس رقص کی ہدایت کار مشہور اداکارہ لکشمی تھیں۔ اس رقص میں عثمانیہ یونیورسٹی کی چالیس طالبات نے پانچ فلم ایکٹریس رادھا، بھانو پریہ، اعالیہ، منگلا گوری اور راما پریہ کرشنا کی سربراہی میں، حصہ لیا۔ ان ایکٹریسوں نے اپنے رقص کے ذریعہ ہندوستان کی ثقافتی اور جذباتی یک جہتی کو نمایاں کیا اور اس کے ساتھ ساتھ مہمانوں کو جنوب کے اس تاریخی شہر میں خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد اس اسٹیج میں لمباڈا ناچ پیش کیا گیا۔

راجستھان کے لمباڈی قبیلہ کے نام پر اس ناچ کا نام لمباڈا رکھا گیا ہے اس کے بعد ایک اور ناچ پیش کیا گیا، اس ناچ میں مردوں کے بجائے ڈھول کی آواز اور عورتوں کی چوڑیوں کی جھنکار نے پورے آڈیٹوریم کو بہت ہی لطف انگیز سرور سے بھر دیا۔ آخر میں پانچ سو سال کا قدیم ناچ "پیرینی شیو تھنڈاوم" پیش کیا گیا۔ یہ ناچ شیو دیوتا کو بطور خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ناچ کتھک ناچ کی طرح ہے۔ اس ناچ کی موسیقی کا وصف اور سُر ایک جذباتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

اس سے قبل شری این۔ ٹی۔ راما راؤ نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اپنی تقریر میں بتایا کہ کھلی ہوا کے اس شاندار آڈیٹوریم کا نام "تیلگو للیتا کلا تھورانم" رکھا گیا ہے اور اسے عوام کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ تہوار ساری دنیا سے یہاں آنے والے آرٹسٹوں، فن کاروں اور فلم سازوں کے نئے فلم سازی کے طرز اور نئے رجحانات سے مستفیض ہونے میں معاون ثابت ہوگا۔

شری اشوک کمار نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ فلم کی دنیا میں ان کے آنے کے ۵۰ برس ہو چکے ہیں اور اس سال ان کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے۔ اس عزت افزائی کے لئے وہ سبھوں کے مشکور ہیں۔

مرکزی وزیر ریاست برائے ثقافت اور شریمتی سوشیلا

حیدرآباد
کا
چارمینار
گیٹ۔

فلمی
وفدوں
کی
آمد



روہتگی نے، جو اس تقریب کی صدر تھیں، فلم سازوں سے اپیل کی کہ
وہ سب ایک متحد اور یک جہت قوم کی حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ
کو سینما کے پردے پر پیش کریں۔

مہمانِ خصوصی آندھرا پردیش کے گورنر شری کمد بن جوشی
نے اپنی تقریر میں ان مشہور ڈائرکٹروں کا ذکر کیا جنہوں نے پردۂ سیمیں
پر ہندوستان کی سنہری تصویر کی عکاسی کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں
نوجوان فلم ڈائرکٹروں اور اداکاروں سے اپیل کی کہ وہ ان ڈائرکٹروں
کے نقشِ قدم پر چلیں۔

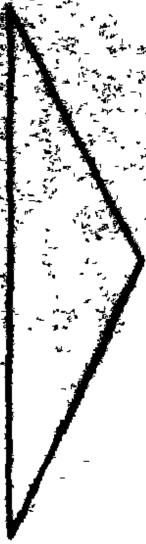
فلم اتسو ۸۶ء کے ڈائرکٹر شری ویرین ولھر نے اپنی
تقریر میں نمائندوں کو خوش آمدید کہا اور اس فلمی تہوار کی منتظمات کی
کوششوں کا ذکر کیا جن کی وجہ سے یہ تہوار کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

مہمانوں اور نمائندوں کی طرف سے شری دلیپ کمار نے
میزبانوں اور فلمی تہوار کی منتظمات کا مل شکریہ ادا کیا کہ ان لوگوں
نے بہت ہی خلوص اور گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے
اپنی تقریر میں شری این۔ ٹی۔ راما راؤ سے درخواست کی کہ وہ فلم صنعت کی
ان مسائل کو جن سے یہ دوچار ہے دور کرنے میں رہنمائی کریں۔

ہندوستان کے فلم فیڈریشن کے صدر شری جی پی سپی
نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے حکومت سے
درخواست کی کہ وہ اس صنعت پر ٹیکس کا جو بوجھ ہے، اسے ہلکا کرے۔

آندھرا پردیش فلم ترقیات کارپوریشن اور دیگر متعلقہ
اداروں کی میزبانی کو نمائندوں نے کافی سراہا۔

اس تقریب کی افتتاحی فلم "۹ دن" ہنسی مذاق کی
ایک تفریحی فلم ہے۔ اسے کناڈا کے قومی فلم بورڈ نے پروڈیوس کیا
اور جائیلس والکر نے اسے ڈائرکٹ کیا۔ یہ فلم موجودہ دور کے
دو نوجوانوں کی دلی خوشی کی تلاش کی کہانی ہے۔ یہ نوجوان ایلیکس
اور تیو ہیں جنہیں ازدواجی زندگی کے لئے اچھی بیوی کی ضرورت ہے۔
تیو ایک اچھی بیوی کی تلاش میں ڈاک فہرست کو چھان مارتا ہے،
دوسری طرف ایلیکس کو، جسے اس کی بیوی گھر سے نکال دیتی ہے، ایک
لڑکی کا سہارا مل جاتا ہے جو اس کے پاس یہ تجویز پیش کرتی
ہے کہ وہ اس کے ایک موکل کے لئے ایک بچے کا باپ بن جائے۔ تیو
اپنے دوست کی طرح باہمت نہیں ہے۔ اس نے محض ڈاک سے
ایک عورت کو چُن لیا ہے اور اس سے شادی کر کے اسے اپنی زندگی



حیدرآباد میں فلم فیسٹول ۸۶ء فلموں کی نمائش کے لئے تعمیر کردہ کھلی ہوا اسکرین۔

کا ساتھی بنا لینا چاہتا ہے لیکن اس کی ہونے والی بیوی غیر ملکی ہوتی ہے اس لئے اسے صرف ۹۰ دنوں کی مہلت دی گئی کہ جس میں وہ اپنی ہونے والی بیوی کی بابت حسب ضروری معلومات حاصل کر لے ورنہ ۹۰ دن کے بعد اس عورت کی ویزا کی تاریخ ختم ہو جائے گی۔

تسنیم گراناڈا اور اسٹیفان وروڈویلوسکی نے ان دوستوں کا کردار بہت ہی شاندار طریقہ سے ادا کیا اور ایک پر اسرار کھیل کرنے ٹو آمنین سے کیسینے میں کرسٹائین چارک اور فرشندا ٹوڈاریس نے ان دوستوں کا ساتھ دیا۔ فلم "۹۰ دن" میں ڈائرکٹر نے اس بات کو عیاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ جسے صرف روپئے کمانے کی فکر ہوتی ہے، وہ انسانی تعلقات کی رتی بھر پرواہ نہیں کرتا اور آج اسی وجہ سے مغربی دنیا میں انسانی تعلقات نیستی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔

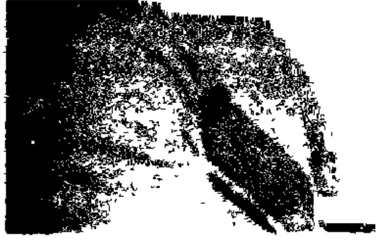
حیدرآباد میں پہلی بار بین الاقوامی فلم تہوار منعقد ہوا۔ اس رنگین تہوار کے موقع پر پاسنگ تہوار کے معیار کی اپنی چند فلموں کی نمائش بھی کی۔ بڑے اور اہم سیکشن میں جو فلمیں دکھائی گئیں، ان کے سلسلے میں بہت سارے ونفداد اور پریس نے مایوسی کا اظہار کیا اور اسی سال اس فلمی تہوار میں فلموں کے جمالیاتی ذوق کی ابتری پر شدید تنقید کی۔

مغربی ممالک نے بہت ساری فلمیں اور برازیل نے چند فلمیں اس تہوار میں پیش کیں لیکن ان میں سے زیادہ تر فلموں میں ذہنی کی جنسیاتی موضوع کو اجاگر کیا گیا ہے اور تکنیکی لحاظ سے ان میں کوئی بات پائی جاتی ہے۔ ان میں اعلیٰ معیار کے اخلاقی اقدار اور جمالیاتی ذوق کا فقدان ہے۔ بین الاقوامی تہوار میں ایسی فلموں کی نمائش کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان باتوں کے اور غیر ملکی فلموں کی اوٹ پٹانگ انتخاب کے پیش نظر ایک شخص صحیح معنوں میں یہ پوچھ سکتا ہے کہ کیا تہوار کے حکام کا صحیح معنوں میں یہ ارادہ ہے کہ ہندوستانی فلم صنعت کی ترقی ہو اور ملک میں فلم کو اکادمی اور فلم میکنگ کے آرٹ میں بہتری ہو۔ یہ بات باعث تشکیک ہے کہ فلم دیکھنے والے جمالیاتی قدروں کو پسند کرتے ہیں اور خاص طور پر حیدرآباد کی طالبات نے جنس، جرم اور تشدد کی فلمیں منتخب کرنے کے لئے تہوار کے حکام کے خلاف مظاہرہ کیا۔

بہرحال سوویت اور چند مشرقی یورپ کے ممالک اور تیسری دنیا کے ملکوں کی پیش کردہ فلمیں گرچہ مغرب کے مقابلے تعداد میں کم تھیں



حیدرآباد فلم اُتسو ۱۹۸۷ء میں پیش کردہ بچوں کی فلم "چروما" کا ایک منظر دو ستارے ارناسین اور گوکل شرما



تاہم یہ رویہ زوال آرٹ اور ثقافت کے ریگستان میں نخلستان ثابت ہوئیں۔ مثال کے طور پر یہاں "کتونی کیچ" جیسی فلم کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس فلم کے ڈائریکٹر زجران پاویل چیکرے ہے جس نے اس فلم کے ذریعہ اس حقیقت کو عیاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ نوجوان غلط راستہ پر گامزن ہوسکتے ہیں اگر اخلاق اور ایمانداری کے راستہ پر گامزن کرنے کے لئے مناسب اقدامات نہ کئے جائیں۔ اس فلم میں اس بات کو عیاں کرنے کی کوشش کی گئی کہ سماجی رفاہ کی مقبول عام فلمیں بنائی جاسکتی ہیں جن میں زندگی کی قدروں کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

ہنگری کی فلم "وِش دَ ٹائم، مسٹر کلوک" (کیا وقت ہوا مسٹر کلوک) میں انسان کی زندگی کی ایک اہم تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ فلم واقعی قابل تعریف ہے۔ فلم کے ڈائریکٹر پیٹر بوسکو نے ایک گھڑی ساز کی اس کہانی میں اس بات کو عیاں کیا ہے کہ بدنصیبی اور حملہ آور نازیوں کے وحشیانہ ظلم پر قابو پانے کے عزم ہی سے مجاہدین کو آخر میں آزادی نصیب ہوتی ہے۔

نمائش میں بہت سی اچھی فلمیں بھی پیش کی گئیں۔ ان فلموں میں جدوجہد کرنے والے مردوں اور عورتوں کی زندگی کے حقائق پیش کئے گئے ہیں اور نئی امنگ اور روشنی اور نئی امیدوں کی پیشنگوئیاں کی گئیں ہیں۔ چند فلموں میں سماجی مسائل کو اجاگر کیا گیا۔

ان فلموں میں سے چند یہ ہیں: "پرولونگڈ ٹائم" (چیکوسلواکیہ) "میرر" (ایف آر جی)، "ماسک" (یو ایس اے)، "دابلے ژنگ سن" (جمہوریہ کوریا)، "اسٹیکو" (اسپین)، "بلوماؤنٹین" (روس)۔

پہلی فلم بڑھاپے، موت اور محبت کی بابت ایک المیہ۔ مزاحیہ فلم ہے۔ اس فلم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح پیار محبت اور عزمات لاعلاج سرطان کے مرض پر قابو پانے کے لئے مریض کے دل میں امید اور امنگ کی روشنی پیدا کر دیتی ہے۔ دوسری فلم میں ایک غریب اور ایماندار کھیت مزدور اور اس کی بیوی جو زمیندار کی ہوس کا شکار بن جاتی ہے کے درمیان نفسیاتی تنازعہ کی عکاسی کی گئی ہے۔

شوہر اپنی عزت اور اپنی بیوی کی آبرو بچانے کے لئے اس زمیندار کو جو اس کے گھر میں گھس آتا ہے، جان سے مار ڈالتا ہے اور اس کی لاش کو اپنے بیل کے گوال گھر میں لے جاکر دفن کر دیتا ہے۔ بیوی بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے اور شوہر کی حرکت سے ناخوشی کا اظہار کرنے کے لئے بالکل خاموش ہو جاتی ہے اور اس



فلم اتسو ۸۶ء میں "تیسری دنیا کی عورتوں کی فلم" "لسیلا اور بھیڑیے" کا ایک منظر

بات چیت بھی نہیں کرتی۔ ان لوگوں کا بیل بھی بیوی کا ساتھ دیتا ہے اور بے چینی کا اظہار کرتا ہے گویا وہ اس قتل کی مذمت کرتا ہے۔ وہ شخص شور مچانے والے اس جانور کو مار کر اپنی بیوی کے خاموش غصہ کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈائریکٹر ایرڈن کیرل ان باتوں کو بہت ہی بہترین طریقہ سے فلم کی شکل میں پردہ پر پیش کرتا ہے اور بیوی کی شکل میں نور سرور نے بہت ہی اچھی اداکاری کی ہے۔ ہم یہاں یہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح خاموشی چیخ سکتی ہے۔ اس فلم میں اس نقطہ کو بہت ہی بہترین طریقے سے پیش کیا گیا ہے اور آرٹسٹوں نے بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا۔ فلم "کوچے ہسنوبے" (ملیشیا) "ٹین فروم بجوررا" (سویڈن) "گوایندٹ سی" (روس) "دین خاور ودازاحلے اون برنس ز یوگوسلاویہ) اور جیسمائن" (ملیشیا) ٹکنک اور مقصد کے لحاظ سے بہت ہی عمدہ فلمیں ہیں اور انہیں بہت بہترین طریقہ سے پردہ پر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے ہفتہ میں ملکی اور دیگر لحاظ سے مغرب کی چند اچھی فلمیں بھی دکھائی گئیں، اس طرح نس، جرم، تشدد کی فلموں سے اکتا جانے والوں کو کچھ راحت ملی۔

ہندوستانی فلمیں: ہندوستان کے فلم سازوں نے اس تہوار میں ۱۲ فیچر فلمیں پیش کیں۔ یہ فلمیں گزشتہ سال تیار کی گئی تھیں اور انہیں نمائش کے لیے سرٹیفکیٹ بھی دے دیے گئے تھے۔ پہلی فلم "مایوری" تھی جو تلگو فلم ہے اور جس کے ڈائریکٹر شری ایس سری نواس راؤ ہیں۔ اس کے بعد پیش کردہ فلمیں جیسی "اگنیسنی" (آسامی، ڈائریکٹر جی۔ سیکیہ)، "آدمی اور عورت" (ہندی ڈائریکٹر تپن سنہا) بہت ہی عمدہ کرالیٹی کی فلمیں ہیں۔ بنگلہ فلم "چوپر" جس کے ڈائریکٹر اپنی چربجا ہیں، میں لوگوں کی ایک جماعت میں پیش کیا گیا ہے جو ایک تاریک گلی میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں اور انہیں اپنے مسائل کا کوئی منطقی حل نہیں ملتا۔ اس فلم کا گرچہ موضوع تو بہت اچھا ہے لیکن فلم میں اس موضوع کو اچھی طرح اجاگر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح "اگھات" (گووند نہلانی) پرلما (اپرنا سین) "کلنتا اپار رہتا" (اڑیہ ڈائریکٹر بن موہن مہاپاترا) "سنسرط" (ڈائریکٹر کیتن آنند) فلمیں بھی خصوصی ذکر کی مستحق ہیں۔

اس تہوار میں سب سے زیادہ ہندی فلمیں پیش کی گئیں۔ ان کے بعد جنوبی ہند کی فلمیں آتی ہیں۔ گرچہ بہت ہی کم بنگلہ فلمیں پیش کی گئیں تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ نامور فلمسازوں کی وجہ سے آج بھی بنگلہ فلمیں ہندوستان کے دیگر علاقوں کے لئے مشعل راہ بنی ہوئی ہیں۔

ے

تیسری دنیا عورت سنیما

تیسری دنیا عورت سنیما ایک نیا باب ہے، جس کا فلم اتسو ۸۶ء میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کی ابتدا ایک رنگین فلم "انڈیا کیبرے" (ہندستان کا ناچ) سے کی گئی۔ اس فلم کو میرا نائر نے ڈائرکٹ کیا۔ اس فلم کی عورتیں ایک نائٹ کلب میں کام کرتی ہیں اور وہ سب ناچتے ناچتے اپنے جسموں سے لباس کو اتارتی رہتی ہیں، اس طرح مردوں کی تفریح کی جاتی ہے۔ اس فلم میں ان ناچنے والی عورتوں کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ فلم اس بات کی جانچ کرتی ہے کہ ان ناچنے والی عورتوں کے خود اپنی بابت کیا خیالات ہیں، کیوں کہ وہ جو کام کرتی ہیں وہ سماج کی بدنامی سے وابستہ ہے۔ اس فلم میں ہندستانی سماجی زندگی کی چند اہم مسائل کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس فلم میں ان لوگوں کے تضاد اور امیدوں کو ظاہر کیا گیا ہے جو سماج کے بندھے اخلاقی اصول کے ذریعہ قائم کردہ حدود کے باہر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اس تہوار کے ساتھ سات ملکوں میں اور بھی بہت سی فلمیں پیش کی گئیں جن میں "سٹیلرز" اور "۳۶- چورنگی لین" (ہندستان)، "ہوٹ لائنس" (برازیل)، "بروٹل" (فیلیپائنس) "دا اور میری" (چلی) اور "گرل ان دَ ریڈ" (چین) شامل ہیں۔ "بروٹل" فلم کی نمائش کے سلسلے میں حیدرآباد کی عورتوں نے احتجاج کیا، کیوں کہ اس فلم میں صرف جنسی باتیں دکھائی گئی تھیں، اور حکام نے احتجاج کے پیش نظر اس فلم کی نمائش روک دی۔

پہلی بار اس فلم اتسو ۸۶ء نے ہندستان کی فلم سوسائٹیوں کے فیڈریشن کے تعاون کے ساتھ دستاویزی فلموں کی نمائش کے لئے ایک الگ سیکشن کا انتظام کیا۔ اس سیکشن کا افتتاح کرتے ہوئے شری ادور گوپال کرشنن نے اپنی تقریر میں اتسو سے الگ ایک دستاویزی فلموں کے تہوار کی ضرورت کی اہمیت پر زور دیا۔ مسٹر رابرٹ آرونن، پیرس کے بین الاقوامی ویڈیو اور فلم سازوں کی ایسوسی ایشن کے ڈائرکٹر نے اس فیڈریشن کو دستاویزی فلموں کے تہوار کے لئے مبارکباد دی۔

اس سے قبل اس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری شری اجے کدے نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ مختصر تصویریں سماج کی صحیح تصویریں پیش کرتی ہیں، اس لئے ایسی فلموں کے ذریعہ سماجی مسائل کے سلسلے میں عوامی بیداری پیدا کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہندستان میں خود مختار دستاویزی فلموں کی نمائش کے لئے تہوار کا انتظام کرنے کے لئے کوششیں کی جانی چاہئیں۔

فلم اتسو ۸۶ء کے ڈائرکٹر مسٹر ڈیرن کیتھر نے فلم سازوں سے یہ درخواست کی کہ وہ مختصر فلموں کی تحریک کو زندہ رکھیں۔

آسٹریلیا، چیکوسلواکیہ، ڈنمارک، ایف آر جی، ہندستان، اسپین اور ممالک متحدہ امریکہ کی منتخبہ ۵۶ دستاویزی فلمیں اس نمائش میں پیش کی گئیں۔ آنند پٹوردھن، لوسین لال وانی، کاگی کول، پرادیپ، دکشت، اور پریم ویدیہ نے ہندستانی دستاویزی فلمیں پیش کیں۔

پرانی فلمیں

فلم اتسو ۸۶ء کی پرانی فلموں کے سیکشن نے ۱۹ امریکی اور ۷ استوزابو کی فلمیں پیش کیں۔ زابو کی فلموں میں فلم بینوں کی کافی بھیڑ بھاڑ ہوئی اور اس کی تقریبی "میفسٹو" فلم بہت مقبول ہوئی۔

ہندستان کی پرانی فلموں میں "نیو تھیٹرز" اشوک کمار اور ایم آئی آر کی فلموں نے خاص طور پر نیو تھیٹرز کی فلمیں کافی مقبول ہوئیں۔

اس تہوار میں ایک فلم بازار کا بھی انتظام کیا گیا تھا جس میں مختلف ملکوں کی تقریباً ۲۰۰ فلمیں رکھی گئی تھیں۔ +++

از: دھریندرا ناتھ دت



کماری ترودت

از ــــــــ مرنال کانتی گھوش

انیسویں صدی کے دوران بنگال نے بہت سی غیر معمولی ذہین اور قابل ہستیوں کو جنم دیا۔ "ہندوستان کی قدیم رزمیہ نظمیں اور داستانیں" کی مصنفہ کماری ترودت ایک ایسی ہی ہستی تھیں جن کی انگریزی کی یہ تصنیف ۱۸۸۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ان کی کتاب "کشت فرانس کے چند خوشے" ۱۸۷۶ میں منظر عام پر آچکی تھی۔ فرانسیسی زبان کی دو سو سے زیادہ نظموں کے تراجم پر مشتمل اس کتاب سے انہیں ایک شاعرہ کی حیثیت سے پہلی بار شہرت حاصل ہوئی۔ درحقیقت شاعری کا ترجمہ بہت ہی مشکل کام تھا۔ لہٰذا فرانسیسی اور انگریزی زبان کے نقادوں نے انہیں مبارکباد دی کیوں کہ انہوں نے دو بلے، دوبارتس اسپیرون، بیٹری کارنیلے، ڈی کا پارتی، فلوریکین، وگنی، مسّے، بیرنگا، بریسیو، ڈیاٹ لیپرورے، بیرگرانی کونشے ڈی لا کیل، بودیئر، جینٹرو نیو جیسے شاعروں کی نظموں کا ترجمہ کیا تھا۔ بشلر نے "کشت فرانس کے چند گوشے" کا پیش لفظ لکھا تھا جس کا منظوم ترجمہ حسب ذیل ہے:

تمہارے دریچوں پہ بندش یہ کیوں ہے؟
بڑی دور مشرق کے پھول
سحر کی ہوائیں شگفتہ اور تازہ، یہاں چل رہی ہیں
یہ وقفہ جو سوتے گلابوں کو بیدار کرتا ہے اکثر
تمہیں بھی جگا دے تو کیا بات ہوگی؟
سبھی ڈھونڈتے ہیں محبت، ضیاء اور نغمہ
ضیاء آسمان میں ــــ بڑی سرخ اوپر
گلوکار کوئل کے معنبر ٹہنیوں میں نغمہ
محبت مرے دل میں .... سچی محبت

ایڈمنڈ گاس نے لکھا تھا:

جب ہمارے ملک کے ادب کی تاریخ لکھی جائے گی تو یقیناً اس کا ایک صفحہ اس عجیب و غریب نازک گل نغمہ کی نذر کیا جائے گا۔ ترو دیکھتے ہی دیکھتے مشہور ہو گئیں۔

ترو کی تصنیف "ہندوستان کی قدیم رزمیہ نظمیں اور داستانیں" میں ساوتری، لکشمن، جگا دھیا ایا "راج رشی اور ہرنی" دھرو کی داستان، بتو سندھو، پرہلاد اور سیتا کی نظمیں شامل ہیں۔

ترو کا پہلا مضمون "لیکونٹ دی لزلے" "بنگال میگزین" میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک فرانسیسی شاعر کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا تھا۔ بعد میں انہوں نے کچھ فرانسیسی کی سانیٹوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ تراجم ان کی کچھ طبع زاد انگریزی کی کہانیوں کے ساتھ شائع ہوئے۔

ترودت محض ایک شاعرہ یا کہانی کار ہی نہیں تھیں بلکہ وہ ناول نگار بھی تھیں۔ ان کا ناول "بیانکا" ۱۸۷۸ء میں بنگال میگزین میں شائع ہوا۔ ان کا ایک اور ناول "لا جرنل دی میڈا مائیل ڈی ارور" میڈم کلیری سے بابلسنے پیرس میں ان کی وفات کے بعد شائع کیا۔ دونوں ناول ان کی اپنی سوانح حیات پر مبنی ہیں اور ان میں زہرا کی موت، نجات، نیکی اور قدرت ایزدی پر پختہ اعتقاد کے ماحول میں دکھائی گئی ہے۔

کماری ترودت کا جنم کلکتہ میں ماتو رام بگان کے دت خاندان میں ۴ مارچ ۱۸۵۶ء کو ہوا۔ ان کے والد گووند چندر دت جو کچھ عرصے کے لئے انگریزی کے یہاں اعلیٰ افسر اور بعد میں کلکتہ کے جسٹس آف پیس رہے۔ خود بھی شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو فرانس میں نائس شہر کے ایک بورڈنگ اسکول اور بعد میں کیمبرج میں تعلیم دلوائی۔ کیمبرج میں ترو اپنی بہن آرو کے ساتھ خواتین کے لئے بلند معیار لیکچر سنا کرتی تھیں اور سینٹ لیونارڈ میں فرانسیسی زبان پڑھتی تھیں جو عیسائی ہو جانے کے بعد سمندر پار گئیں۔ گووند چندر دت بھی ان کے ہمراہ تھے۔

تروؔ چودہ برس کی تھیں اور اس سے پہلے سے ہی شعر کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے انگریزی ہی میں فرانسیسی شعرا کی تخلیقات کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ فرانس کو ابھی ابھی شکست ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا:

یہ ٹوٹی ہوئی ایک شمشیر ہے
فقط یہ نہ سمجھو کہ چلنے لگی ہے
نگاہوں میں اس کی ہیں آتش کے شعلے
خبردار رہنا! خبردار رہنا!
اپنا کے فتح مناتے، سبکسر قبیلو!
فقط ایک گھنٹے کے بے جا سے وقفے میں، اف
یہ دلیری تمہاری!

فرانس! اور تمہاری اسی کانشانہ!
یہ ٹوٹی ہوئی ایک شمشیر ہے
وہ دیکھو وہ پھر اٹھ رہی ہے
بڑے حوصلے اور ہمت کے بل پر، لڑائی کی خاطر
چمکنے لگا! اس کی روشن جبیں کا ستارا
زمانے کو پُرنور کرنے کی خاطر
جھکو اس کے آگے، زمانے کی قومو!
تمہاری یہ پھر سربراہی کرے گا

❖ ❖

اس کے علاوہ نظم "ساوتری" کے یہ سطور ملاحظہ ہوں!

حسیں ہے یہ جنگل سویرے سویرے
حسیں ہے یہ جنگل، بھری دوپہر کو
مگر شام کو یہ تو سب سے حسیں ہے
کہ جب ڈوب جاتا ہے سورج
شفق اور نئے چاند کی روشنی
بدل ڈالتے ہیں سبھی کھردری صورتیں
اور رنگوں کے چہرے
یہاں چاندنی سے بچے نیلے پردے کی تہہ میں اتر جاتے ہیں
ادھر دیکھئے اس پہاڑی کے نزدیک

اور وادی کے اندر جہاں
اوس میں بھیگتے، مسکراتے شگوفے
سبک خوشبوئیں چھوڑتے ہیں
وہاں ایک شوہر، وفادار بیوی
لئے ہاتھ میں ہاتھ، دیکھو
گھنے جنگلوں کی طرف
بڑھے جا رہے ہیں۔

❖ ❖

وہ نازک نہ تھی، وہ نہ کمزور تھی
قوی تھا ہر اک انگ، گویا، چھلکتے ہوئے حسن کا
بھرا، ابھرا سینہ
ادائیں بڑی روح افزا
پہاڑی پہ "لتماس" کی
تعاقب کی دیوی، سبک گام خرگوش جیسی
ارے۔ اس کا چہرہ، گھرا لہلہاتی سی کی زلف کے بادلوں میں
کسی دست فنکار کو اتنی فرصت کہاں؟
کہ اس حسن و شوکت کی تصویر کھینچے
اسے راہ جاتے تعجب بھری نگہ عزت سے دیکھیں
وہ آنکھیں بڑی نرم، لیکن
چمکتی ہوئی اک کرن جو کبھی ان میں لہرا سی جائے
شہنشاہ بھی کوئی ان کی اطاعت سے منکر نہ ہو
("جگن ماما" سے)

❖ ❖ ❖

کئی سال گزرے، گزرتے گئے......
مگر موت........ جس سے مفر ہی نہیں ہے
ادھر آن پہنچی، رشی راج کو لے کے جانے کی خاطر
وہ بیٹی وہاں، ان کے پہلو میں تھی
لئے سوگ میں ڈبڈبائی سی آنکھیں
کہ بچہ ہو جیسے کوئی اپنے ابا کے لمحات آخر پہ نظریں جمائے
بھری آنکھوں کی دھندلی سی تہوں سے

رشی راج بھی تو تھے دیکھنے میں ایسے
مادرا! اپنے انجام کی آہٹوں سے
بڑے ناز سے پالی پوسی تھی سے آخر
بچھڑنے کے لمحات کا دکھ بہت تھا انہیں
اس کی طرف سب خیال ان کا مرکوز تھا
بے خبر اپنے حال اور قضا کی پرچھائیوں سے
(راج رشی اور ہرنی)

٭٭

دھرو!
رہو نرم بن کر عقیدت کے پتلے
کہ مقصود ہے بس بھلائی کی کوشش
بشر اور خدا ہی کی ذی حس خدائی کی خاطر
رہو منکسر!
یہاں انکسار بشر پر اترتے ہیں خوشحالیوں کے ہیولے
کہ جیسے ڈھلانوں کی جانب ہی بہتا ہے پانی۔
(نظم "دھرو کی داستان سے")

٭٭

نہ آتش سے خائف نہ شمشیر سے
میں خطروں میں بھی کود جاؤں گا، اے میرے والد!
ادھر ایک چیتا
ادھر میں اکیلا سہی
نمٹ لوں گا پھر بھی کہ میرا خدا ہر جگہ ہے
("پرہلاد" سے)

٭٭٭

ایڈمنڈ گاس نے ان کی تخلیقات میں تازگی اور دیہی ماحول کی منظر کشی کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور ان کی بارے میں مضمون بھی لکھا جس کے اختتام پر انگریزی کے ایک شاعر کے یہ الفاظ تھے:

"تمہارے یہ پھول، کھلے دل کی نعمت
جوانی کی رو میں فراہم ہیں پھر بھی
ہمیں ان میں مسرت نظر آ رہی ہے
گزرتے ہوئے حالتِ پختگی سے
مگر ہم جو تکتے رہے ہیں
ڈبو کر قلم،
کئی قافیوں کی گرانبار شیرینیوں میں
انہیں تو یہ مدغم کئے جا رہے ہیں
تمہارے یہ پھول، کھلے دل کی نعمت!"

ترو اور ارو معذلت تپ دق کے عارضہ سے وفات پا گئیں۔ ارو [illegible] تھی۔ ارو کی موت پر ترو نے میری کو لکھا،

"مالک نے پیاری ارو کو ہم سے چھین لیا ہے۔ ہمارے لئے یہ دردناک آزمائش ہے لیکن اس کی رضا پوری ہو گئی۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ سب کچھ ہماری بھلائی کے لئے کرتا ہے۔"

جب ترو بیمار پڑ گئیں تو ان کے والد نے لکھا:

وہ دبلی پتلی سی، کمزور لڑکی
وہ بکھرے ہوئے بالوں والی
وہ شرمیلی، اپنی ہی مرضی کی مالک
پکارو جو میں تو توجہ نہ دے
پرندے سے اچھی ہے وہ
بڑی نرم و نازک سی باتوں کے در پے
مگر وہ بہت ہی سمجھدار تھی!

٭٭

جب کھانسی اور تپ بخار کا دورہ نہ ہوتا تو ترو جی سنسکرت، لائز بیلس ڈکشنریز آف مانشیر لٹرا وغیرہ کا مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ اکیس برس کی عمر میں انہوں نے وفات پائی۔ پدمنی سین گپتا نے ٹھیک ہی کہا ہے:

"ہماری ترودت کی بے وقت رحلت سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں شاعری کے لگاتار پروان چڑھتے معیاروں تک پہنچنے کے سدا بہار امکانات سے محروم کر دیا گیا۔ وہ انگریزی، فرانسیسی اور سنسکرت میں کافی عبور رکھتی تھیں اور ان میں سچے شاعر کی روح تھی۔"

٭٭٭



سرکاری خبریں

[illegible] انجینئرنگ کالج کی سلور جوبلی

[illegible] ویں سالگرہ کے موقع پر درگاپور انجینئرنگ کالج اور مارچ [illegible] تک اپنی سلور جوبلی تقریبات منائے گا۔ پہلے مرحلے میں تقریبات کا افتتاح [illegible] ہوگی۔ اسی ہفتہ جو ثقافتی نمائش، سیمینار اور آل انڈیا [illegible] کمیٹی کو وغیرہ کا انعقاد کا انتظام کیا جائے گا۔ بالغرض اس سلسلے کی تقریبات کئی مرحلوں پر مشتمل سنہ ۱۹۸۶ء میں پورے سال بھر ہوتی رہیں گی۔۔۔

شیڈیولڈ کاسٹ طلبہ کے لئے وظیفہ

حکومت مغربی بنگال نے شیڈیولڈ کاسٹ اور ٹرائب بہبود شعبہ کے تحت سنہ ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران مغربی بنگال کے بعد از ثانوی سطح کے شیڈیولڈ کاسٹ طلبا کو کچھ ہی دنوں پہلے کچھ رقم بطور وظیفہ دینے کی منظوری دے دی تھی۔ اس کے باوجود آج پھر حکومت مغربی بنگال نے مندرجہ بالا شعبہ کے تحت مذکورہ بالا سال کے لئے مذکورہ بالا سطح کے شیڈیولڈ کاسٹ طلبا کو مزید ۱۹۹۷۵۰۰ روپئے بطور وظیفہ دینے کی منظوری دے ڈالی ہے۔۔۔

ریاستی طبی فیکلٹی کو عطیہ

ریاستی حکومت نے ۸۶-۱۹۸۵ء کے لئے ریاستی میڈیکل فیکلٹی کی اسکیم کے اخراجات کی تکمیل کے لئے ۵۰۰۰ روپئے بطور غیر مکرر عطیہ دینے کی منظوری دے دی ہے۔ لہذا امروزہ مالی سال کے دوران مذکورہ مقصد کی حصولی کے لئے عطیہ کی کل رقم ۲۷۰۰۰ روپئے تک پہنچتا ہے۔۔۔

"ٹال مانب" سووینیر کو عطیہ

ریاستی حکومت نے ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران "ٹال مانب" سووینیر جسے کلکتہ کے پاولووا انسٹی ٹیوٹ اور ہسپتال نے قائم کیا ہے اس کی سلور جوبلی کی تقریب کو منانے کے لئے ۴۰۰۰ روپئے بطور غیر مکرر عطیہ دینے کی منظوری دے دی ہے۔۔۔

مرکزی اخبارات ایکٹ (سنہ ۱۹۵۶ء) کی دفعہ ۸ کے تحت تفاصیل درج ذیل ہیں:

۱: رسالہ کا نام — "مغربی بنگال"
۲: زبان — اردو
۳: اشاعت کا عرصہ — پندرہ روزہ
۴: جائے اشاعت — شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال، رائٹرس بلڈنگس، کلکتہ ۷۰۰۰۰۱
۵: ناشر — دھریندرا ناتھ دت، ہندستانی، شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال، رائٹرس بلڈنگس، کلکتہ ۷۰۰۰۰۱
۶: مدیر — دھریندرا ناتھ دت، ہندستانی، شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال، رائٹرس بلڈنگس، کلکتہ ۷۰۰۰۰۱
۷: طابع — تپن شنکر، جی۔ آر۔ ٹی پرنٹرس، سی ۱/۲۵ شیام پوکھر اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۰۴

میں دھریندرا ناتھ دت اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا بیان میرے علم و یقین کے لحاظ سے صحیح ہے۔

یکم مارچ سنہ ۱۹۸۶ء

دھریندرا ناتھ دت
مدیر، "مغربی بنگال"

مغربی بنگال کے اضلاع میں منصوبہ بندی

از: ڈاکٹر اشیم داس گپتا ؛ ریڈر شعبۂ معیشت، کلکتہ یونیورسٹی ــ اور ممبر ریاستی منصوبہ بندی بورڈ

مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت کی منصوبہ بندی کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے پورے طریقہ کار میں۔ منصوبہ مرتب کرنے سے لیکر منصوبہ کے پروجیکٹوں کی تکمیل تک ــ منظم طریقہ سے عام لوگوں کو شریک کیا جائے۔ کیونکہ منصوبہ بندی کا مقصد یہی ہے کہ عام لوگوں کو فائدہ پہونچایا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر مضافاتی علاقوں میں پنچایتوں کو لامرکز اور نمائندہ تنظیم تصور کیا گیا ہے، ان تنظیموں کے ذریعہ ہی عام لوگوں کو منصوبہ بندی کے کام میں شریک کیا جا سکے گا۔ اس طرح ان پنچایتوں کو منصوبہ مرتب کرنے اور اصلاحاتِ آراضی کے اقدامات، قومی مضافاتی روزگار پروگرام، مضافاتی بے زمین روزگار ضمانت پروگرام، جامع مضافاتی ترقیاتی پروگرام وغیرہ جیسے پروگراموں کے ذریعہ سماجی اور پیداواری اثاثے کی تعمیر کے چند اہم پروگراموں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی جامع ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ ان پروگراموں کے سلسلے میں پنچایتیں گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ پنچایتوں نے عام لوگوں میں ایک جوش و خروش پیدا کر دیا ہے اور وہ سب ان پروگراموں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے کام میں مصروف عمل ہو گئے ہیں۔ اس طرح منصوبہ کی اسکیموں کو بہت ہی کم خرچ پر پایۂ تکمیل تک پہونچایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں بہت ساری مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ــ سڑکوں کی تعمیر اور چھوٹی آبپاشی پروجیکٹوں کو لیجئے۔ متعلقہ شعبوں کے تحت ان پروجیکٹوں پر جتنا خرچ ہوتا تھا، پنچایتوں نے اس کے نصف خرچ پر ان پروجیکٹوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا۔ اس "سماجی" بچت کی ایک اور اہم وجہ یہ ہے کہ ٹھیکہ داروں کی جگہ پنچایتوں کی رضاکارانہ نگرانی ہے۔

بہر حال اب ایک نئی بات کی شروعات ہو چکی ہے۔ ایک طرف ان خصوصی پروگراموں کو مرتب کرنے اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے کام میں پنچایتوں کے ذریعہ عام لوگوں کو شامل کیا گیا تو دوسری طرف بہت سارے اہم شعبوں کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی ذمہ داریاں متعلقہ شعبوں کو سونپی گئیں اور پنچایتوں کو الگ رکھا گیا۔ اس طرح بہت سارے مشترکہ پروگراموں جیسے چھوٹی آبپاشی، سڑکوں کی تعمیر و مرمت وغیرہ کی تکمیل کے کام میں، شعبوں کے درمیان کی تال میل میں کمی پائی جاتی ہے۔ نیز مختلف شعبوں کے پروگراموں کی تکمیل کے کام میں شعبوں کے درمیان بھی تال میل کا فقدان نظر آتا ہے نیز ایک وجہ یہ بھی ہے کہ منصوبہ بندی کے طریقہ کار میں ناکافی تعداد میں عام لوگوں کو شریک کیا جاتا ہے۔

بائیں محاذ حکومت کے منصوبہ کے ایک بنیادی مقصد کو پورا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ (۱) پنچایتوں کے زیر انتظام پروجیکٹوں اور شعبوں کے پروجیکٹوں کے اور مختلف شعبوں کے پروجیکٹوں کے درمیان بہتر تال میل پیدا کیا جائے اور (۲) تال میل کے اس کام میں مضافات میں پنچایتوں اور شہری علاقوں میں میونسپلٹی کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں عام لوگوں کو شریک کیا جائے۔

حکومت اپنے فرائض کی انجام دہی میں مختلف سطحوں پر تال میل قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ریاستی سطح پر مختلف شعبوں اور ریاستی منصوبہ بندی بورڈ کے درمیان تعامل کی شکل میں وزیر اعلیٰ کی سربراہی کے تحت ایسی کوششیں کی جاتی ہیں۔ نیز ضلع سطح اور بلاک سطح پر منصوبہ مرتب کرنے کے کام میں عام لوگوں کو شریک کیا جاتا ہے۔

تنظیم: ہر ضلع میں منصوبہ بندی کے مقصد کے لئے ایک عام ادارہ بنام ضلع منصوبہ بندی اور تال میل کاؤنسل، قائم کیا گیا، اس کے ذمہ یہ کام دیا گیا کہ وہ ریاستی سطح پر فراہم کردہ رہنمائی کی روشنی میں ضلع میں منصوبہ مرتب کرنے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں

م ترجیحات کو نمایاں کرتی ہے۔ ضلع کاؤنسل اس کے قبل کی ضلع سطح
یال میل کمیٹی کی جگہ قائم کیا گیا ہے۔ اس ضلع کاؤنسل کے ریاستی
حکومت کے اس ضلع کے وزیر چیئرمین ہوں گے (اگر ایک ضلع کے کئی
وزراء ہوں تو وہ یکے بعد دیگرے چیئرمین ہوں گے) اس ضلع کے
ضلع پریشد کے سبھا دھیپتی، اس کاؤنسل کے وائس چیئرمین ہیں۔ اس
ضلع کے ممبران پارلیمنٹ اور ممبران اسمبلی ضلع پریشد کے کرما دھیاکش،
تمام پنچایت کمیٹیوں کے سبھا پتی، اس ضلع کے میونسپلٹی کے چیئرمین،
تمام شعبوں کے ضلع سطح کے افسران، اس ضلع میں قانونی اداروں کے ایک ایک
ممبر نمائندے اس کاؤنسل کے ممبر ہیں۔ ڈویژنل کمشنر کو اس کمیٹی میں مدعو
کیا جائے گا، ضلع مجسٹریٹ اس کاؤنسل کے ممبر سکریٹری ہیں۔

ضلع منصوبہ اور تال میل کاؤنسل (ڈی پی سی سی) ضلع
منصوبہ بندی میں ایک عام ادارہ کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتے ہیں
اور اس کی ایک عملی شاخ ضلع منصوبہ بندی کمیٹی (ڈی پی سی) ہے۔
اس ڈی پی سی کے چیئرمین ضلع پریشد کے سبھا دھیپتی ہیں اور اس
ضلع کے تمام پنچایتوں کے سبھا دھیپتی، ضلع کے میونسپلٹیوں کے چیئرمین،
تمام شعبوں کے ضلع سطح کے افسران اور ضلع میں قانونی حکام کے ایک ایک
نمائندے اس کے ممبر ہیں۔ سب ڈویژنل افسر کو اس کمیٹی میں مدعو کیا
جائے گا۔ ضلع مجسٹریٹ اس کمیٹی کے ممبر چیئرمین ہیں۔ ڈی پی سی کو
ماہرین اور تکنیکی افراد کی خدمات فراہم کی جائے گی۔ ان افراد میں ایک
ماہر معاشیات، جو قرض کے لئے بھی منصوبہ تیار کریں گے، ایک ماہر دیہی
معاشیات ایک ماہر ارضیات / علاقہ کا منصوبہ تیار کرنے اور ایک
انجینئر ہوں گے۔

ایک ضلع میں ہر بلاک کی سطح پر ایک بلاک منصوبہ بندی
کمیٹی (بی پی سی) قائم کی گئی ہے۔ اس کمیٹی کے پنچایت سمیتی کے سبھا پتی
چیئرمین اور پنچایت سمیتی کی مختلف عملی کمیٹیوں کے کرما دھیکش، اس
بلاک میں واقع تمام گرام پنچایتوں کے پردھان اور تمام شعبوں بلاک
سطح کے افسران ممبر ہیں — بلاک ترقیاتی افسر اس کمیٹی کے ممبر سکریٹری
ہیں۔ اس کمیٹی کو بھی ماہرین معاشیات، انجینئر اور ماہرین دیہی معاشیات
کی خدمات فراہم کی جائیں گی۔

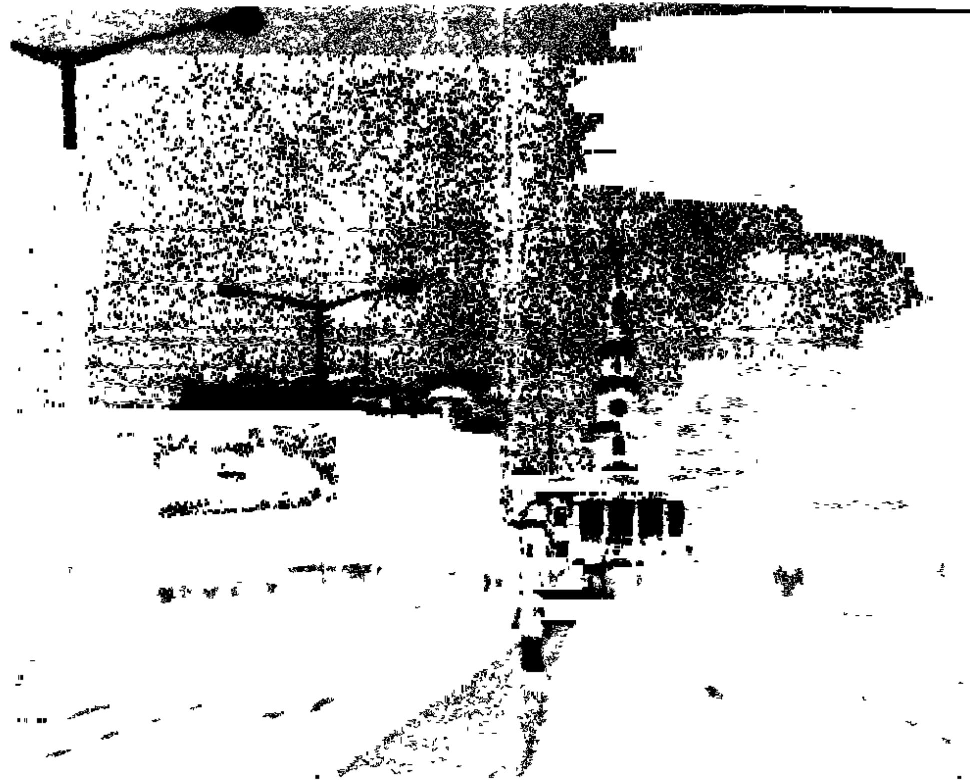
یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب ضلع اور بلاک سطحوں پر

منصوبہ تیار کرنے کے کام میں عوام کے نمائندوں کی اکثریت شامل ہوگی تو
اس کے معنی یہ ہوئے کہ مقامی لوگوں کو بھی منصوبہ بندی کے کام میں حصہ
لینے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔

منصوبے: ریاستی سطح سے، وزیر اعلیٰ کی سربراہی کے تحت
اور مختلف شعبوں اور ریاستی منصوبہ بندی بورڈ کے مابین تفاعلی
کے ذریعہ، ضلع کے شہری اور مضافاتی علاقوں میں منصوبہ مرتب کرتے
وقت جن ترجیحات کو اہمیت دی گئی، انہیں مقرر کر لیا گیا ہے۔ ان
ترجیحات میں دیگر باتوں کے علاوہ اصلاحات آراضی، آبپاشی، خصوصاً
چھوٹی آبپاشی، زراعت میں ٹکنالوجی کی اہمیت، زراعت سے وابستہ
سیکٹروں کے لئے پروگرام، مقامی صنعت، مصنوعات کی بازار میں فروخت،
سڑکیں، شہری ترقی میں لامرکزیت، تعلیم کی مختلف سطحوں کی اہمیت،
طبی علاج کا دیکھ بھال کا پہلو وغیرہ شامل ہیں۔ ان وسیع ترجیحات اور
ریاستی حکومت کے وسائل کی فراہمی کے سلسلے میں دشواریوں کے پیش نظر
ریاستی اور ضلع سطح کے اراکین کے درمیان گفت و شنید ضروری تھی تاکہ ہر ضلع
کے ہر سیکٹر میں، جیسے سڑکیں، آبپاشی وغیرہ کے لئے مالیاتی رقوم مختص
کی جا سکیں۔ نیز شعبہ جاتی بجٹوں میں ان باتوں کی گنجائش رکھی جائے
گی اور ہر بلاک کے لئے قومی مضافاتی روزگار پروگرام، جامع مضافاتی
ترقیاتی پروگرام وغیرہ کے تحت خصوصی پروگرام فنڈ فراہم کئے جائیں۔
وقت کی کمی کی وجہ سے اس سال ضلع سطح پر کافی گفت و شنید کئے
بغیر اضلاع کے لئے مالی رقوم مختص کی جائیں گی۔ آئندہ سال سے گفت
و شنید کے طریقہ کار کو روبہ عمل لایا جائے گا۔

ضلع میں ہر سیکٹر کے لئے عام ترجیحات کو روبہ عمل لانے کے
لئے حسب ضرورت فنڈ فراہم کئے جائیں گے۔ نیز ہر ضلع میں ضلع منصوبہ
بندی کمیٹی (ڈی پی سی) بھی ہے جو ہر سیکٹر میں اسکیموں کے انتخاب کی
بابت ضلع، بلاک اور میونسپلٹیوں کے درمیان تال میل برقرار رکھتی ہے۔
ایسی اسکیمیں تین اقسام کی ہو سکتی ہیں:
(۱) ایسی اسکیمیں جو متعدد دیہی بلاکوں اور شہری علاقوں کو
اپنے احاطے میں لے لیتی ہیں (۲) ایسی اسکیمیں جو صرف دیہی بلاکوں تک
محدود رہتی ہیں اور (۳) ایسی اسکیمیں جو صرف شہری علاقوں کے لئے
ہوتی ہیں۔ انہیں علی الترتیب ضلع اسکیم، بلاک اسکیم اور شہری اسکیم کہا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)



پٹرولیم اور دیگر ضروری چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ کے لئے مرکزی حکومت کے فیصلہ کے خلاف ۱۱ فروری ۸۵ء کو بطور احتجاج سارے مغربی بنگال میں ۲۴ گھنٹے کا بند منایا گیا ۔ اس بند کے دن کلکتہ کے بی بی ڈی باغ (اوپر) اور چورنگی (نیچے) کے علاقوں کے مناظر (تصویر از اجیت داس) ۔



Postal Regd. No. WB/ CC-52
Vol—33 No.— 5
PRICE—12 .

MAGHREBI BANGAL
1 • 3 • 1986



وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو، حال ہی میں کلکتہ کے دھکوریہ کے سی آئی ٹی کمپلکس میں مدھیہ پردیش کے مرگ نینی ایمپوریم میں جس کا انھوں نے افتتاح کیا۔ وزیر اعلیٰ کی بائیں جانب میں مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ شری موتی لال ووہرا بھی دیکھے جاسکتے ہیں ——— (تصویر: اجیت داس)

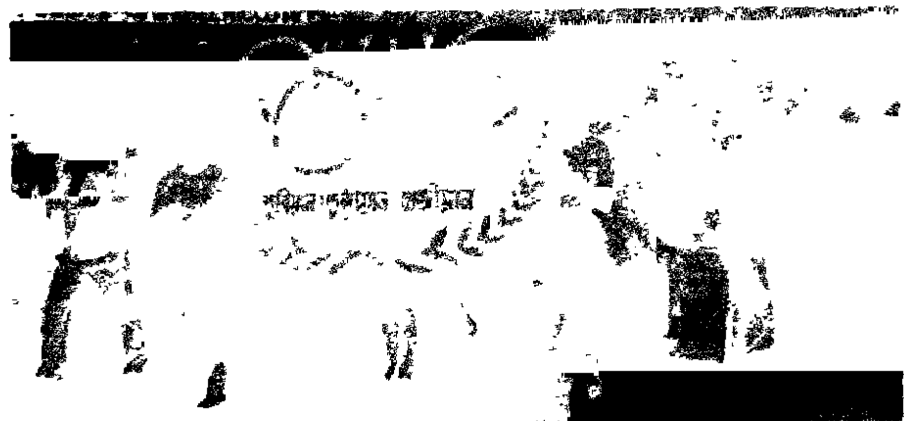
یووا بھارتی اسٹیڈیم، سالٹ لیک، کلکتہ میں "کھیل کود میں عوام کی شرکت اور اسکی مقبولیت" کے موضوع پر حال ہی میں منعقدہ ایک سیمینار میں ریاستی حکومت کے وزیر شعبہ کھیل کود اور امور نوجوانان شری سبھاش چکرورتی تقریر کرتے ہوئے

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azam,
Published by the Information & Cultural Affairs Department. Govt. of West Bengal and Printed by M/s.

مغربی بنگال

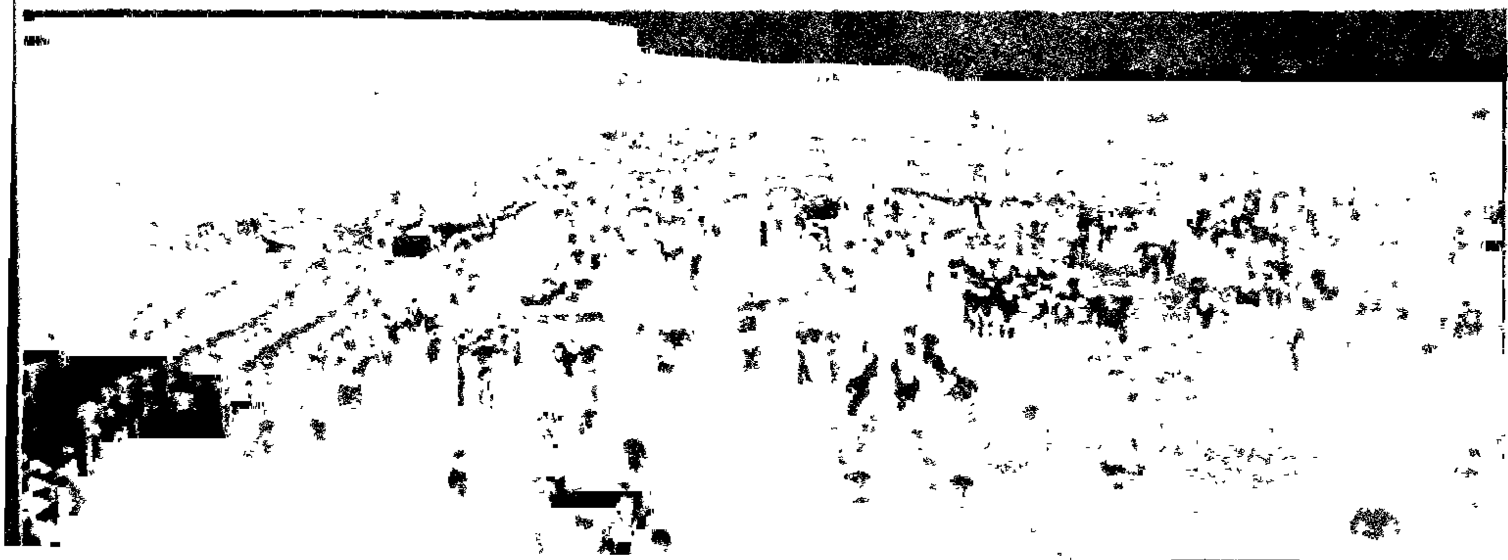


۱۸ جولائی ۱۹۸۶ء









مغربی بنگال

مدیر اعلیٰ : پرتین بہ ٹاچاریہ
مدیر : دھرینداراناتھ دت
مدیر معاون : م۔ محمد اعظم

جلد نمبر ۳۳ * ۱۵؍ مارچ ۱۹۸۶ء * شمارہ نمبر ۶

شرح خریداری

سالانہ : تین روپئے * اس شمارے کی قیمت : ۱۲ پیسے

ترسیل زر کا پتہ

بزنس منیجر!
شعبہ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۲۳- آر، این، مکھرجی روڈ - کلکتہ ۷۰۰۰۰۱



وزیر ریاست برائے اطلاعات و ثقافتی امور شری پربھاش پھودیکار، کلکتہ انفارمیشن سنٹر میں حال ہی میں منعقدہ "چارو کلا ارجیت" (فنون لطیفہ) کی نمائش میں۔

غزل

جاں نثار اختر

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے

دبا کے آئی ہے سینے میں کون سی آہیں
کچھ آج رنگ ترا سانولا لگے ہے مجھے

میں سوچتا ہوں کہ لوٹوں گا اجنبی کی طرح
یہ میرا گاؤں تو پہچانتا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھئے
ابھی تلک تو وہی فاصلہ لگے ہے مجھے

حکایتِ غمِ دل کچھ کشش تو رکھتی ہے
زمانہ غور سے سنتا ہوا لگے ہے مجھے



اس ریاست میں صنعتی سرمایہ کاری کی فضا کافی سازگار ہے

مرکز کی طرف سے پٹرولیم کی مصنوعات کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کی تائید نہیں کی جا سکتی

گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی رفتار تشفی بخش ہے۔

اوماشنکر دکشت ، گورنر مغربی بنگال

مغربی بنگال کے گورنر شری اوماشنکر دکشت نے ۳ر مارچ ۱۹۸۶ء کو ریاستی قانون ساز اسمبلی کے بجٹ سیشن کا افتتاح کیا۔ اپنے افتتاحی خطبہ میں گورنر نے کہا کہ مسلسل نگرانی کے سبب اس سال ریاست میں امن وامان کی صورتحال بالکل اطمینان بخش رہی۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ریاست میں صنعتی سرمایہ کاری کی فضا کافی اچھی ہے اور یہاں نئی صنعتیں قائم کرنے کے لئے کاروباریوں میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ انہوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ریاست میں صنعتی فضا بہتر ہونے کے باوجود مرکز کی عوامی سیکٹر میں سرمایہ کاری معمولی ہوئی ہے۔ گورنر موصوف کا افتتاحی خطبہ کا متن اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے:

نئے سال کے پہلے اجلاس میں آپ لوگوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے مجھے کافی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ میں آپ لوگوں کو اور مغربی بنگال کے عوام کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

میں یہاں سالِ رواں میں اپنی حکومت کی اہم سرگرمیوں اور کارناموں کا اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں ساتھ ہی آئندہ سال کے لئے چند بڑی اسکیموں اور پروجیکٹوں کا، جنہیں پایۂ تکمیل تک پہونچایا جائے گا، اختصار کے ساتھ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اسی سیشن میں ۸۷-۱۹۸۶ء کے لئے بجٹ کا تخمینہ بھی آپ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

میں اس ریاست کے سابق وزرا، سابق ممبرانِ پارلیمنٹ، سابق ممبرانِ اسمبلی اور سابق ممبرانِ ریاستی کونسل اور موجودہ ریاستی اسمبلی کے ممبر کو اور مشہور شاعروں کو، جو گزشتہ سال اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئے، اپنا دلی خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

سالِ رواں میں مسلسل چوکسی کی وجہ سے اس ریاست میں امن وامان کی صورتحال مجموعی طور پر تشفی بخش رہی۔ پارٹی جھڑپوں، سیاسی قتل اور زرعی تصادم کے واقعات گزشتہ سال کے مقابلے میں بہت ہی کم رونما ہوئے۔ اس سال وسیع پیمانے کے فرقہ وارانہ فساد کا اور انتہا پسندوں کے ظلم کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس ریاست میں شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب اور سماج کے دیگر کمزور طبقے کے لوگوں پر ظلم ڈھانے کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

۱۹۸۵ء میں امن دھان کے پودوں کی روپائی میں تاخیر ہوئی کیوں کہ اگست مہینہ کے شروع میں ناکافی بارش ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں اضلاع ۲۴ پرگنہ اور مدناپور کے ساحلی علاقے طوفان اور آندھی سے بری طرح متاثر ہوئے اور سمندر میں طوفان کی وجہ سے یہ علاقے زیر آب بھی ہو گئے۔ اس حادثے میں ۱۴ افراد

ہلاک ہوئے۔ ۷ اضلاع کے ۶۱ بلاکس متاثر ہوئے۔ ۱۵۸۰۰۰
افراد کو محفوظ جگہوں پر منتقل کر دیا گیا اور انہیں امداد فراہم کی گئی۔
۹۱۱۳ رہائشی مکانات بالکل برباد ہو گئے۔ اس طوفان کی
وجہ سے ساحلی پشتے جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے اور انکی مرمت کر دی
گئی۔ میں یہاں تین اور حادثات کا ذکر کروں گا جو حالیہ مہینوں میں
رونما ہوئے۔ یعنی دسمبر ۸۵ میں ہوڑہ مارکیٹ اور کلکتہ کے نیو مارکیٹ
میں آگ لگنے کے واقعات۔ اس سال جنوری میں گنگا ساگر میلہ
کے دوران حادثہ۔ آندھی طوفان کی وجہ سے ۹۲۰۰۰ ہیکٹرس
کی امن دھان فصل کو کافی نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ تقریباً
۴ لاکھ ہیکٹرس کی امن دھان فصل جاوؤں کے کیڑوں کے حملہ سے
بری طرح متاثر ہوئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود ۴۰ لاکھ ہیکٹرس
کھیتوں میں امن دھان کی کاشت کی گئی۔ حالانکہ نشانہ اس سلسلے
میں ۴۱ لاکھ ہیکٹرس کا تھا۔ اس بات کی امید کی جا سکتی
ہے کہ اس سال امن دھان کی پیداوار گزشتہ سال کی پیداوار
یعنی ۶۱٫۶ لاکھ ٹن سے کم نہ ہوگی۔ ۸۶-۸۷ء کیلئے کل غذائی
اجناس کی پیداوار کا نشانہ ۷۹ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا ہے۔ گزشتہ
سال پاٹ کی قیمت کچھ زیادہ تھی۔ اس سال کسانوں میں اوس
دھان کے کھیتوں میں پاٹ کی کاشت کی اور اس طرح پاٹ کے زیر
کاشت علاقوں میں ۳۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔ بدقسمتی سے پاٹ
اگانے والوں کو اس سال بہت کم قیمتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس
سال بھی تیل کے بیج کی پیداوار میں اضافہ کی رفتار کو برقرار رکھا جائے
گا۔ آلو اور سبزی کی پیداوار کافی تشفی بخش ہے۔ شمالی بنگال
میں ترائی کے پسماندہ علاقے میں زرعی ترقی کے لئے خرچ کی امداد سے
ایک نئے پروگرام کو روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ غلہ بیمہ کے تحت اس
سال ان تمام کسانوں کو لایا جا رہا ہے جنہیں غلہ قرض فراہم کئے گئے
ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اچھی فصل نہ ہونے پر بھی انہیں
قرض حاصل کرنے میں دشواری حاصل نہیں ہوگی۔

آبپاشی کے سیکٹر میں متوراکشی ریزروائر پروجیکٹ
کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا ہے اور کنگسابتی ریزروائر اور دامودر
ویلی کارپوریشن (بیراج اور آبپاشی) پروجیکٹ کی تعمیر کا کام
قریب الاختتام ہے۔ اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ آئندہ سال
تیستا بیراج سے محدود پیمانہ پر آبپاشی کے لئے پانی فراہم کیا جا سکے
گا۔ اس پروجیکٹ کی تعمیر پر ۳٫۵ کروڑ روپئے خرچ ہوئے اور
مرکز سے اس کام کے لئے خصوصی امداد نہیں ملی، صرف ۱۹۸۴ء میں
۵ کروڑ روپئے مرکز نے اس مقصد کے لئے فراہم کئے تھے۔ ہم لوگ بار
بار مرکزی امداد کے لئے درخواست کر رہے ہیں کیونکہ اس کے بغیر
موجودہ منصوبہ کے عرصہ میں اس پروجیکٹ کو مکمل کرنا ممکن نہیں۔
اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ مرکزی حکومت شمالی بنگال میں
اس اہم پروجیکٹ کو امداد فراہم کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کرے
گی۔ آبپاشی کے بڑے پروجیکٹوں کے ساتھ ساتھ درمیانی درجے
کی آبپاشی کے ۱۸ پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ اس
بات کی امید کی جاتی ہے کہ ۸۶-۸۷ء میں مزید ۲۲۰۰۰ ہیکٹرس
قطعات اراضی کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی جا سکیں گی۔ سیلاب
کے کنٹرول سیکٹر میں تقریباً ۷۵۰۰۰ ہیکٹرس قطعات اراضی
کو سیلاب کی زد سے محفوظ رکھا جا سکے گا۔ آبپاشی کے بڑے
اور متوسط پروجیکٹوں کے ساتھ ساتھ سال رواں میں چھوٹی آبپاشی
کے وسیع پروگراموں کو روبہ عمل لایا گیا اور اسکی وجہ سے عالمی بنک
کی امداد کی وجہ سے تقریباً ۱٫۳۸ لاکھ ہیکٹرس قطعات اراضی
کے لئے چھوٹی آبپاشی کی تنصیبات سے پانی فراہم کیا جا سکے گا۔
کنگسابتی، دامودر ویلی اور متوراکشی کے کمانڈ علاقے یعنی وہ
علاقے، جہاں ان پروجیکٹوں سے آبپاشی کے لئے پانی فراہم کیا جاتا
ہے، کے ساتھ ساتھ تیستا آبپاشی کمانڈ علاقہ میں بھی ایسی
سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

اصلاحات اراضی مضافاتی ترقی کے جزو لاینفک ہیں۔
۸٫۱ لاکھ ایکڑ قطعات اراضی ۱۹۸۵ء تک ۱۶٫۲۷ لاکھ غریب
اور مستحق کسانوں کے درمیان تقسیم کئے گئے۔ مستحق ہونے والوں
میں شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے لوگوں کی تعداد نصف سے کچھ
زیادہ تھی۔ گزشتہ سال کے ستمبر کے آخر تک ۱۳٫۳۳ لاکھ
برگداروں کے نام ریکارڈس میں درج کئے گئے۔ زرعی مزدوروں یعنی
کاریگروں اور ماہی گیروں کی رہائش کے لئے قطعات اراضی کی حصولیابی

سے مغربی بنگال ایکٹ ۱۹۷۵ء کے تحت ۲٫۰۲ لاکھ افراد کے نام ریکارڈس میں درج کئے گئے تاکہ انہیں رہائش کیلئے قطعات اراضی فراہم کئے جاسکیں ۔

سہ رخی پنچایتی راج کے لئے دوسری بار انتخابات ہوئے اور یہ ادارے دیہی ترقی کے لئے مستحکم اور ٹھوس ایجنسیوں کی طرح مزید پانچ برسوں تک خدمات انجام دیتے رہیں گے ۔ قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین روزگار ضمانت پروگرام جیسی اہم اسکیموں کو پنچایتیں پایۂ تکمیل تک پہونچاتی رہیں اور اس کام میں مقامی لوگوں نے سرگرم شرکت کی ۔ دیہی بے زمین روزگار ضمانت پروگرام کے تحت نومبر ۱۹۸۵ء تک کام کرنے کے ۶۳۲٫۰۷ لاکھ دن پیدا کئے جاسکے ۔ دیہی مکانات اسکیم کے تحت ۱۳۶۶۹۴۹ لوگوں کو مستحق قرار دیا گیا اور ان میں ۲۷۳۶۲۶ افراد کو قطعات آراضی دئے گئے اور ۱۱۸۳۲۳ افراد کو مکانات تعمیر کرنے کیلئے امداد فراہم کی گئی ۔

ساتویں منصوبہ کے درمیان مصارف کے لئے ۱۲۵۴ کروڑ روپئے کی اور ۸۶-۱۹۸۵ء کے سالانہ منصوبہ کے لئے ۲۷۷ کروڑ روپئے کے مصارف کو تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ منصوبہ کا سائز متعین کرنے کے لئے کاشتکاری، آبپاشی اور سیلاب کنٹرول، بجلی، تعلیم اور معاشی ترقی کو پہلے کی طرح ترجیح دی گئی ہے ۔ اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ سماج کے غریب لوگوں جن میں بے زمین کھیت مزدور، برگدار، چھوٹے کسان اور کاریگر شامل ہیں، اس منصوبہ کے تحت کئے گئے اقدامات سے مستفید ہوں ۔ لامرکز منصوبہ بندی کے مقصد کی کامیابی کے لئے ضلع اور بلاک سطحوں پر منصوبے مرتب کرنے کے نظام کو رائج کیا گیا ۔ ضلع اور بلاک دونوں سطحوں پر منصوبہ تیار کرنے والی مشنری کو مستحکم بنا دیا گیا ہے ۔ قومی دیہی روزگار پروگرام کے تحت کل اخراجات کی ۱۰ فیصد رقم ایسے اسکیموں کے لئے مختص کر دی گئی ہے جن سے شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے لوگ مستفید ہوں گے اور ۲۰ فیصد رقم سماجی جنگلات اور جلاون کی لکڑی کے لئے جنگل کاری کے واسطے مختص کی گئی ہے ۔ جامع دیہی ترقیاتی پروگرام میں حالیہ برسوں میں تیزی لائی گئی ہے ۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں اس پروگرام کے تحت ۲۷۵۴۰۶ خاندانوں کو سہولتیں فراہم کی گئیں اور یہ سال کے لئے مقررہ نشانہ سے کہیں زیادہ ہے ۔

شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کی رفاہ کے لئے مرکوز کوششیں جاری رکھی گئی ہیں ۔ ان کی تعلیم اور تربیت کے پروگراموں، جن میں ہاسٹلوں کی تعمیر، کتابیں خریدنے کے لئے عطیات اور اسکالرشپ وغیرہ شامل ہیں، کے علاوہ موجودہ مالی سال میں خصوصی معاون منصوبہ اور قبائلی تحتی منصوبہ کے تحت خاندان کیلئے آمدنی پیدا کرنے کی اسکیموں کے ذریعہ ۱۸۱۲۹۳ شیڈولڈ کاسٹ اور ۴۶۵۷ شیڈولڈ ٹرائب ممبروں کو معاشی امداد فراہم کی گئی ۔ مغربی بنگال شیڈولڈ کاسٹ اور ٹرائب ترقیاتی اور مالیاتی کارپوریشن نے موجودہ سال میں ۵۹۵۴۰ شیڈولڈ کاسٹ اور ۹۷۷۰ شیڈولڈ ٹرائب درخواست کنندگان کو ضمانتی رقوم فراہم کیں تاکہ وہ بنکوں سے قرض حاصل کرسکیں ۔ گزشتہ مالی سال میں کام کرنے کے ۷۵۰۰۰ دن پیدا کئے گئے ۔ ۲۵۵۷۶ شیڈولڈ ٹرائب خاندانوں کو چھوٹی چھوٹی جنگلاتی پیداوار کے سلسلہ میں مراعات دی گئیں اور ان کے درمیان ۳۰۰ لاکھ روپئے کی مالیت کے سامان تقسیم کئے گئے ۔ زرعی آبادی کی ترقی میں امداد باہمی ادارے بہت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ کل قرض کے تصور کو روبہ عمل لاتے ہوئے اس سلسلہ میں ایک اسکیم مرتب کی گئی ہے کہ ساتویں منصوبہ کے دوران ۲۰۰۰ پرائمری زرعی قرض سوسائیٹیوں کو از سر نو منظم کیا جائے تاکہ یہ اپنے مختلف النوع فرائض انجام دے سکیں ۔ ۲۲۱۷۱۰ میٹرک ٹن غلوں کو اچھی طرح رکھنے کے لئے گودام ہیں، نیز ۲۸۰۰۰ میٹرک ٹن غلوں کو رکھنے کے لئے گودام تیار کئے جائیں گے ۔

پناہ گزینوں کے لئے معاشی ۔ سماجی اور راہ راست بحالی پروگرام کے جزو کے طور پر ہومس، کیمپ اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے رہنے والے بے گھر پناہ گزینوں کے ۴۲۱ خاندانوں کو سال رواں میں بحال کر دیا گیا ۔ جبر دخل کالونیوں میں ۱۲۶۴۶ یونٹوں کو دیہی اور شہری علاقوں میں حکومت کے زیر اہتمام کالونیوں میں حقوق کے ۲۶۷۹۸ یونٹوں کو رجسٹرڈ کر دیا گیا ۔

ماحول کو اچھی حالت میں برقرار رکھنے اور جنگلی جانوروں کو محفوظ رکھنے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ سماجی جنگلات پروجیکٹ کے تحت گزشتہ چار برسوں میں یعنی ۸۲-۱۹۸۱ء سے ۸۵-۱۹۸۴ء تک ۶۰۰۰ ۴ ہیکٹرس کی جگہ ۲۰۰۰ ۶ ہیکٹرس قطعات اراضی پر مشتمل جنگلات سے معاشی فوائد حاصل کئے گئے۔ شیروں کے تحفظ کے لئے بکسا اور جور پوکھری سلامنڈر میں دو پناہ گاہیں قائم کی گئیں اور اس طرح کل جنگلاتی علاقوں کے ۲۰ فیصد علاقے جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لئے پناہ گاہ بن چکے ہیں۔ فضا کو پراگندہ کرنے کی روک تھام کرنے والے ریاستی بورڈ نے ان بڑی صنعتوں کی شناخت کی ہے جو فضا کو دھواں اور دیگر گیسوں سے اور ندی کے پانی کو گندہ کر دیتے ہیں۔ یہ بورڈ ایسی آلودگی کو دور کرنے کے لئے اقدامات کر رہا ہے۔ گنگا عمل منصوبہ اب زیر تکمیل ہے جس کے ذریعہ ندی کے پانی کو اور ساحلوں کو گندگی سے صاف کر کے پانی کی کوالیٹی میں بہتری لائی جائے گی۔

اس بات پر خصوصی زور دیا گیا ہے کہ ہر گاؤں میں پینے کا پانی فراہم ہو۔ اس سال ایسے ۲۰۰ دیہاتوں میں پانی کی سپلائی کا انتظام کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ سال رواں میں پائپ کے ذریعہ پانی سپلائی کرنے کی ۱۷۵ اسکیموں کو چالو کر دیا گیا ہے۔ پانی کی سپلائی کی بڑی بڑی اسکیمیں جن میں ہلدیہ، الوبیڑیا اور کلمپونگ کے لئے پانی کی سپلائی کی اسکیمیں شامل ہیں، زیر تکمیل ہیں۔

صنعت کاری کے لئے فضا میں شاندار بہتری رونما ہوئی ہے اور اس ریاست میں صنعتیں قائم کرنے کے لئے کاروباریوں میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ حالیہ برسوں میں چائے جیسی روایتی صنعتوں نے کافی بہتری کا اظہار کیا ہے۔ گزشتہ سال مشترکہ سیکٹر کے اہم معاہدے ہوئے۔ ہلدیہ پیٹرو کیمیکل پروجیکٹ کے لئے مشترکہ سیکٹر کی ایک نئی کمپنی نے کام کرنا شروع کر دیا ہے اور اس سلسلہ میں غیر ملکی ہم کاروں اور مشیروں کے ساتھ تکنیکی تعاون اور لائسنس کے لئے معاہدے ہوئے ہیں۔ مختلف النوع مصنوعات تیار کرنے کے لئے ایک رپورٹ بھی تیار کی گئی ہے۔ مغربی بنگال صنعتی ترقیات کارپوریشن مشترکہ سیکٹر کے کئی ایک پروجیکٹوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچا رہا ہے۔ اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ موجودہ سال کے دوران ان میں سے تین پروجیکٹس کاروباری پیمانہ پر کام کرنا شروع کر دیں گے۔ بدھان نگر کلکتہ کے الیکٹرونکس کمپلیکس کے پہلے دور کے علاقہ میں کئی ایک یونٹوں نے پیداواری کام شروع کر دیا ہے۔ اس علاقہ میں دوسرے دور میں ۹۳ ایکڑ قطعات اراضی کی ترقی کا کام جاری ہے۔ فالتا میں برآمدات پروسیسنگ علاقہ نے کافی ترقی کی ہے اور یہاں ۱۸ یونٹوں کے قیام کی منظوری دی جا چکی ہے۔ ان یونٹوں کے پروجیکٹوں کے لئے تقریباً ۳۰ کروڑ روپئے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن مرکزی عوامی سیکٹر کے لئے مغربی بنگال میں بہت ہی کم سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ درگاپور اسٹیل، الیسکو اور ہلدیہ آئل ریفائنری کی جدت کاری اور توسیع جیسے اہم پروجیکٹوں کے لئے اب تک کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ اس ریاست میں الیکٹرونکس کمپلکس، ریل کے ڈبے بنانے کا کارخانہ اور جہازوں کی مرمت کا یارڈ جیسے نئے پروجیکٹس قائم کرنے کے لئے ریاست کے لمبے عرصے کے مطالبہ کو ابھی بھی مرکزی حکومت کی رضامندی کا انتظار ہے۔ عزت مآب ممبران اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اس طرح کوئلہ، لوہا اور اسپات کی مصنوعات کے لئے مساوی کرایہ کی غیر مساوی پالیسی سے اس ریاست کے مفادات کتنی بری طرح سے متاثر ہوئے۔ ہم عرصہ دراز سے اس بات کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ یا تو اس پالیسی کو ختم کر دیا جائے یا کپاس، پٹرولیم مصنوعات، کیمیاوی مصنوعات وغیرہ قومی اہمیت کی دیگر خام اشیاء کو بھی اس پالیسی کے تحت لایا جائے، لیکن ابھی تک ہمارے اس مطالبہ کی بابت صاف صاف طور پر کچھ کیا نہیں گیا۔

صنعت (ترقیات اور ضابطگی) ایکٹ ۱۹۵۱ء کے تحت ۱۳ بند اور بیمار صنعتی یونٹوں کے انتظامیہ اور ملکیت پر کنٹرول حاصل کر لیا گیا ہے۔ ان یونٹوں میں برسر روزگار لوگوں کی تعداد تقریباً ۱۲۸۵۰ ہے۔ ان میں دو یونٹیں یعنی ایسٹرن ڈسٹلریس اور انڈین لیوڈوگ زناسپتی پلائی ووڈ کمپنی لمیٹڈ نے ۱۹۸۵ء میں نفع کمائے۔ ان تیرہ میں سے چار یونٹوں کو اب تک قومیا لیا گیا ہے ـــــ ہم باقی

۹ یونٹوں کو بھی توسیع دیا جانا چاہئے تھا لیکن توسیع دینے کے سلسلے میں توسیع دینے
کے قبل بنکوں اور مالی اداروں کے دیئے گئے قرض کے تحفظ کے لئے
حکومت ہند حالیہ فیصلے کے پیش نظر ہم ایسا نہ کر سکے۔ اس
سلسلے میں حکومت ہند سے بات چیت کی جا رہی ہے۔ میری حکومت نے
۴۷ یونٹوں کی جن میں ۳۶۰۰ سے زیادہ افراد برسر روزگار ہیں
اور جنہیں ۱۰ امداد ادارہ ۹ قرار دیا گیا ہے نو تعمیر کے کام میں
شرکت بھی کی ہے۔

گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی
رفتار ترقی کافی تشفی بخش ہے۔ سنہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں بڑھاوا کے
طور پر ۵۳ر۲۱۷ لاکھ روپئے تقسیم کئے گئے اور سنہ ۸۶-۸۵ء
میں اس مد کے تحت ۲۴۰ لاکھ روپئے خرچ کئے جائیں گے۔ سنہ ۸۶-۸۵ء
میں چھوٹے پیمانے کی صنعت کی ۳۴۰۰ یونٹیں تھیں اور سنہ ۸۶-۸۵ء
کے لئے نشانہ ۳۷۰۰ یونٹ ہے۔ ان میں ۱۷۴۰۰ افراد کے لئے
روزگار فراہم کئے جائیں گے۔ کھادی اور دیہی صنعت بورڈ کے پروگرام
سے مضافاتی علاقوں میں ۵۵۰۰ لوگوں کے لئے روزگار فراہم کئے
جانے کی امید ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے روزگار پروگرام کے
تحت سنہ ۸۶-۸۵ء میں ۲۴۰۰ بے روزگار نوجوانوں کے لئے روزگار
فراہم کئے جا سکیں گے۔ سنہ ۸۵-۸۴ء میں اسی پروگرام کے تحت
۲۴۰۰ بے روزگار نوجوانوں کو بارروزگار بنا دیا گیا۔ ریشم سازی کے
سیکٹر میں شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے لوگوں کے مفاد کیلئے
سنہ ۸۶-۸۵ء میں تین مظاہرتی فارم قائم کئے جائیں گے۔ اسی طرح
ٹسر اور ایری کی کاشت سے شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے تقریباً
۶۰۰ افراد مستفید ہوں گے۔

بجلی سیکٹر کی طرف حکومت خصوصی توجہ دیتی ہے۔
سنہ ۸۶-۸۵ء میں ریاستی بجلی بورڈ کے کولاگھاٹ تھرمل پاور اسٹیشن
میں ۲۱۰ میگاواٹ یونٹ کو مستحکم بنا لیا گیا ہے۔ کولاگھاٹ میں
۲۱۰ میگاواٹ کی ایک اور یونٹ کی دسمبر سنہ ۸۵ء میں تعمیر کا کام مکمل
ہو گیا۔ کلکتہ الیکٹرک سپلائی کارپوریشن نے ٹیٹا گڑھ میں ۶۰
میگاواٹ کی اپنی چوتھی یونٹ کو چالو کر دیا ہے۔ سنہ ۸۵-۸۴ء میں
ڈبلیو بی ایس ای بی اور سی ای ایس سی نے مجموعی طور پر ۵ر۴۰ کروڑ
یونٹ بجلی پیدا کی اور امید کی جاتی ہے کہ سنہ ۸۶-۸۵ء میں ان کی مجموعی
پیداوار ۶۹۰ کروڑ یونٹ بجلی ہوگی۔ اس طرح بجلی کی پیداوار میں
پندرہ فیصد کا اضافہ ہوا۔ درگاپور پروجیکٹس پاور اسٹیشن کی ۱۱۰
میگاواٹ کی چھٹی بجلی یونٹ مارچ سنہ ۸۶ء سے چالو ہو جائے گی۔
یہ بات باعث مسرت ہے کہ آئی ڈی بی آئی نے اخراجات کا تخمینہ کرنے
کے بعد کولاگھاٹ تھرمل پروجیکٹ کے لئے ۳۲ کروڑ روپئے بطور قرض
دینے کی منظوری دی ہے۔ نیز مزید بجلی پیدا کرنے کے سلسلے میں کئی
ایک تجویز یا ابھی بھی حسب ضروری منظوری کے لئے مرکزی حکومت کے
زیر غور ہے۔ ان میں ساگر دیگھی میں ۲۰۰۰ میگاواٹ پروجیکٹ،
بکریشور میں ایک ۶۳۰ میگاواٹ پروجیکٹ اور ڈی پی ایل کی ۲۱۰ میگا
واٹ کی ساتویں یونٹ شامل ہیں۔ اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ
مرکزی حکومت ان بڑے پروجیکٹوں کے لئے جلد از جلد اپنی منظوری
دے دے گی۔ ڈبلیو بی ایس ای بی سنہ ۸۷-۸۶ء میں ۱۸۰۰۰ پمپ
سیٹوں کے لئے اور ۴۰۰ موضعات میں بجلی سپلائی کرنے کے پروگرام
کو روبہ عمل لائے گا۔ شیڈولڈ ٹرائب و کاسٹ اور دیگر کمزور
طبقہ کے لوگوں کے گھروں میں بجلی فراہم کرنے کی اسکیم سے ۲۰۰۰۰
خاندان مستفید ہوں گے۔ اس اسکیم کے تحت مستفید ہونے والے
لوگوں کے گھروں میں بجلی کے تار مفت لگائے جائیں گے۔

سال رواں میں صنعتی تعلقات میں کافی بہتری ہوئی۔
بونس کے سلسلے میں بہت سارے تنازعات کا دو رخی سطح پر سمجھوتہ
ہو گیا اور ان تمام تنازعات کی تعداد، جہاں ریاستی حکومت کی مصالحتی
مشنری کو مداخلت کرنی پڑی، سنہ ۸۳ء میں ۶۸۰ تھی جو کم ہو کر
سنہ ۸۵ء میں ۲۹۳ ہو گئی۔ لاک آؤٹ کے تحت بند ۲۰ پاٹ ملوں
میں سے ۱۶ پاٹ ملوں کو دوبارہ کھول دیا گیا ہے لیکن پاٹ صنعت کو
بہت سارے شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مسائل میں جدت
کاری کے لئے سرمایہ کی کمی، مالی بدنظمی، بین الاقوامی بازار کی کمی،
خام پاٹ کی غیر مستحکم قیمت اور مالک۔مزدور تعلقات شامل
ہیں۔ مصنوعی پاٹ سے اس پاٹ صنعت کو دشواریوں کا سامنا
کرنا پڑ رہا ہے۔ پرانے پاٹ بستے سے نئے بستے تیار کرنے کے سلسلہ
میں مرکزی حکومت کی پالیسی نے گھریلو مانگ کو اور بھی محدود بنا دیا

ہے اور اس صنعت کی احیاء نو کے لئے اس پالیسی پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ معیشت اور ورکروں دونوں کے مفادات کی خاطر بیمار صنعتی یونٹوں کی احیائے نو اور مناسب انتظام کے لئے عوامی سیکٹر کے اداروں اور مالی اداروں کو مرکوز طور پر اقدامات کرنے چاہئیں۔ فیکٹریز ایکٹ کے تحت قوانین میں ترمیمات لائی جا رہی ہیں تاکہ مزید حفاظتی اقدامات کی اس میں گنجائش رکھی جائے۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کارخانوں کی نظامت کے تحت ایک کیمیکل ونگ قائم کیا جائے تاکہ مسلسل بنیاد پر حفاظتی اقدامات مرتب کئے جاسکیں اور انہیں روبہ عمل لایا جاسکے۔

سال رواں میں اس بات کی امید کی جاسکتی ہے کہ اس ریاست میں مجموعی طور پر ۱۶۰ کیلومیٹر لمبی سڑکوں، چند بڑے اور چھوٹے پلوں کی تعمیر کا کام مکمل ہو جائے گا۔ شاہراہوں کی موڑ پر ۶ پلوں اور ۴ بڑے پلوں کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ اس بات کی تجویز پیش کی گئی ہے کہ آئندہ سال نئی سڑکیں تعمیر کی جائیں گی جن کی مجموعی لمبائی ۵۰ کیلومیٹر ہوگی۔

نقل و حمل کے سیکٹر میں بھی بہت سارے اقدامات کئے گئے ہیں۔ نقل و حمل کے سلسلے میں لوگوں کو مزید سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں نئی بسیں اور ٹرام گاڑیاں حاصل کی گئی ہیں، ڈپو اور ورکشاپ تعمیر کئے گئے ہیں اور ٹرافک انجینئرنگ اسکیموں کو روبہ عمل لایا گیا ہے۔ ریاستی حکومت نے مرکزی وزارت ریل سے بار بار درخواست کی ہے کہ وہ اس ریاست میں کئی جگہوں میں نئی ریلوے لائن بچھائے یا ان کی توسیع کرے تاکہ اہم اہم علاقوں کے درمیان آمد و رفت کی سہولتیں فراہم ہوں۔ بدقسمتی سے ان تجویزوں کو نامنظور کر دیا گیا۔ اب پھر اس موضوع پر حکومت ہند سے بات چیت ہو رہی ہے۔

سال رواں میں ۲۵۰ نئے جونیئر ہائی اسکول کھولے جائیں گے اور ان کے لئے ۵۰۰۰ اساتذہ کی تقرری ہوگی۔ ایک تجویز یہ ہے کہ سنہ ۸۷-۱۹۸۶ء میں مزید ۲۵۰ جونیئر ہائی اسکول اور ۲۰۰ نئے پرائمری اسکول کھولے جائیں۔ غیر رسمی تعلیم مراکز میں زیر تعلیم طلباء کی تعداد سنہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۴۹۰۰۰ سے بڑھ کر سنہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۵۲۱۰۰۰ ہوگئی۔ سنہ ۸۶-۸۵ء میں ۳۰۰۰ نئے غیر رسمی تعلیمی مراکز کے کھولے جانے کی امید کی جاتی ہے۔ ایک تجویز زیر غور ہے کہ ایسے مزید ۳۰۰۰ مراکز کھولے جائیں اور سال کے آخر تک ایسے مراکز میں زیر تعلیم طلباء کی تعداد ۶۲۶۰۰۰ ہو جائے گی۔ چھٹے منصوبے کے دوران تسلیم شدہ ہائی اسکولوں کے کلاس XI اور XII میں زیر تعلیم طلباء کی تعداد ۶۷۸۰۰۰ سے بڑھ کر ۹۰۰۰۰۰ ہو جائے گی۔ اس سال ۵۰ نئے ہائر سکنڈری اسکول کھولے جائیں گے اور ایک تجویز یہ ہے کہ آئندہ سال مزید ۵۰ سکنڈری اسکولوں کو ہائر سکنڈری اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ ۱۵ جنوری سنہ ۸۵ء کو ودیا ساگر یونیورسٹی کو رسمی طور پر افتتاح کیا گیا۔ مرکزی حکومت کی ایک تجویز یہ ہے کہ کلکتہ میں ایک کیندریہ سنسکرت ودیا پیٹھ قائم کیا جائے اور اس کے لئے دو ایکڑ قطعات اراضی منتخب کئے جاچکے ہیں۔ ہلدیہ میں ایک سرکاری کالج کی تعمیر کا کام جاری ہے اور سترہ نئے غیر سرکاری کالج کھولنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

صحت عامہ اور خاندانی رفاہ کے پروگراموں کو دیہاتوں میں لے جایا گیا۔ ۱۲۳۲۴ صحت رہنماؤں کو تربیت دی جاچکی ہے اور اب وہ اپنے اپنے گاؤں میں کام کر رہے ہیں۔ اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ سال رواں میں سالٹ لیک، کلکتہ میں ایک ریاستی عام اسپتال کھول دیا جائے گا۔ اس اسپتال میں مریضوں کے علاج کیلئے ۱۰۰ بستر ہوں گے، نیز ۲ ابتدائی مراکز صحت، ۱۳ معاون مراکز صحت اور دور مضافاتی اسپتال کھولنے کی منظوری دی جاچکی ہے۔

اس ریاست میں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا بہت ہی کم اناج اسٹاک میں رکھتا ہے۔ اس ریاست میں اناج اور چینی کی سپلائی مسلسل جاری نہیں رہتی ہے اور سپلائی کردہ چینی اور اناج مقدار میں ناکافی ہوتا ہے۔ نیز اس ریاست کے تمام علاقوں میں دستیاب غذائی اجناس کی تقسیم کے کام کو ایف سی آئی خوبی سے انجام نہیں دیتا۔ لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود اس ریاست میں عوامی تقسیم کے نظام کو بلا روک ٹوک جاری رکھا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۸۵ء میں عوامی تقسیم کے نظام کے ذریعہ ۱۷٫۷۶ لاکھ میٹرک ٹن اناج تقسیم کیا گیا۔ جلانے کے کوئلہ کی سپلائی میں کافی کمی کی وجہ سے کراسن تیل کی مانگ میں اضافہ

ہوگیا لیکن اس ریاست میں جتنا کراسن تیل سپلائی کیا جاتا ہے اس
سے اس ریاست کی صرف ۷۰ فیصد ضرورت پوری ہوتی ہے۔ عوامی
تقسیم کے نظام کے موثر طور پر کام کاج میں عوام کے نمائندے، پنچایتیں
اور میونسپلٹیاں شامل ہیں۔ اضلاع میں ۹۶ فی صد سے زیادہ لوگوں کو
انفرادی راشن کارڈ سپلائی کئے گئے ہیں۔ پنچایت سمیتیوں کی
کھادیہ و سربراہ استھائی سمیتیاں اور ضلع پریشد اور میونسپلٹیوں
کی نگرانی کمیٹیاں عوامی تقسیم کے نظام کے کام کاج کی دیکھ بھال کرتی
ہیں۔ میری حکومت نے حکومت ہند سے بار بار اس بات کا اصرار کیا
کہ وہ عوامی تقسیم کے نظام کو وسیع بنا دے اور عام لوگوں کی ضرورت
کی ۱۴ ضروری چیزیں اس میں شامل کرلے تاکہ مناسب قیمتوں پر
ایسی چیزیں عام لوگوں کو دستیاب ہوں۔

مرکزی حکومت نے حال ہی میں راشن کی دکانوں سے
فروخت کئے جانے والے چاول اور گیہوں کی قیمتوں میں اضافہ کردیا۔
پٹرولیم کی مصنوعات کی قیمت میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ اس سے
عام لوگوں کی دشواریوں میں اضافہ ہوگا کیوں کہ عوام کراسن تیل استعمال
کرتے ہیں اور آمد و رفت کے لئے بس ٹرام میں سفر کرتے ہیں۔ ایسے
غیر معمولی اضافہ، جس میں بعد میں کچھ کمی کر دی گئی ہے، کی تائید نہیں
کی جاسکتی کیوں کہ پٹرولیم مصنوعات کی بین الاقوامی قیمتوں میں کمی
ہوتی جارہی ہے۔ اس ریاست کے لوگوں نے ۱۱ر فروری سنہ ۸۶ء کو
اس سلسلے میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اس بات کی امید کی جاسکتی
ہے کہ عوام کی باتیں سنی جائیں گی اور ان کی مشکلات کو دور کیا جاسکے
گا۔

عزت مآب ممبران اس بات سے واقف ہیں کہ جون ۸۵ء
میں کلکتہ میونسپل کارپوریشن کا عام انتخاب منعقد ہوا۔ ۷۵ میونسپلٹیوں
مع چندر نگر میونسپل کارپوریشن، کی انتخابی فہرستوں پر آخری بار
اشاعت کے لئے، ابھی نظر ثانی کی جارہی ہے۔ اس بات کی امید کی
جاتی ہے کہ سال رواں میں مال، ضلع جلپائی گوڑی، کلیہ گنج، ضلع مغربی
دیناج پور، سینتھیا، ضلع بیر بھوم اور گسکرا ضلع بردوان میں نئی
میونسپلٹیاں قائم کی جائیں گی۔ میونسپل انتظامیہ کو مستحکم بنانے کے
لئے مختلف میونسپلٹیوں میں ۶۷ ایگزیکیوٹیو افسروں، ۲۶ فنانس
افسروں اور ۳۲ محاسبہ افسروں کی تقرری کی گئی۔

کلکتہ علاقہ کی ترقی کے لئے سی ایم ڈی اے پانی کی سپلائی،
گندے پانی کے نکاس اور زیر زمین دوز نالیوں کی تعمیر کی اسکیموں کو روبہ عمل
لا رہا ہے۔ بستی ترقی اسکیم کے تحت کلکتہ اور ہوڑہ کی بستیوں میں،
جن کی کل آبادی ... لاکھ ہے، اس سال پختہ پائخانے تعمیر کئے
جائیں گے، پائپ کے ذریعہ پانی سپلائی کیا جائے گا۔ پانی کے نکاس
کے لئے زمین دوز نالیاں تعمیر کی جائیں گی۔ سڑکوں کو بہتر بنایا جائیگا
اور سڑکوں میں بجلی بتیاں لگائی جائیں گی۔ آئندہ سال سی ایم ڈی اے
مزید ...۸۰ بستی باسیوں کے لئے ایسی سہولتیں فراہم کرے گا۔
سی ایم ڈی اے کے علاقوں میں ۴۱ میونسپلٹیوں، ۳ کارپوریشنوں اور
دو اعلان کردہ علاقے کے حکام کو یہ ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں کہ وہ اپنے
اپنے وارڈ سطح ترقیاتی اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ فی الحال
۳۵۰۰ اسکیموں کو مختلف میونسپلٹیوں میں روبہ عمل لایا جارہا ہے۔

آرٹ اور ثقافت کے میدان میں ایک آرٹ فلم تھیٹر
کمپلیکس (نندن) کو ستمبر ۸۵ء میں چالو کر دیا گیا اور نئی دہلی
کے پراگتی میدان میں ایک مستقل پویلین کی تعمیر کا کام قریب الاختتام
ہے۔ ریاستی حکومت کی تیار کردہ بنگلہ فلم "کونی" کو قومی فلم تہوار میں
"سورن کمل" کا انعام ملا۔ بڑے بڑے اہم پروجیکٹس جیسے سالٹ لیک
کلکتہ میں رنگین فلم اور آواز کی تجربہ گاہ، سلی گوڑی میں انفارمیشن
سنٹر، باگ بازار میں گریش منچ تھیٹر ہال اور کلکتہ انفارمیشن سنٹر
میں ایک آرٹ گیلری اور نمائش ہال کو آنے والے سال میں مکمل کرلیا
جائے گا اور انہیں عوام کے لئے کھول دیا جائے گا۔ اضلاع میں ۱۸
اسٹیڈیم اور تیرنے کے لئے تین تالاب زیر تعمیر ہیں۔

عام انتظامیہ میں بہتری لانے کے لئے کئی ایک اقدامات
کو روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ مالیاتی کمیشن کے ایوارڈ کے مطابق پولیس کی
رہائش کیلئے مکانات، جیل کے مکانات، دیوانی عدالتوں کیلئے مکانات اور اسٹاف کوارٹرس کی تعمیر کا کام جاری
ہے۔ بولپور میں ایک نیا سب ڈویژن قائم کیا گیا ہے اور ضلع ۲۴ پرگنہ
کو بہت ہی جلد دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ عوامی خدمات میں
بدعنوانی کے خلاف ریاستی چوکسی کمیشن نے اپنی سرگرمیاں جاری
رکھیں۔

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

اسپورٹس ڈے

سالٹ لیک کلکتہ میں کھیل کود اور ثقافتی تقریب

گزشتہ ۲۲ فروری کو سارے مغربی بنگال میں اسپورٹس ڈے (کھیل کود کا دن) بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ چونکہ یہ افتتاحی سال ہے اس لئے اس موقع پر اپنی نوعیت کا سب سے بڑا اور شاندار جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس میں مختلف اسکولوں کے ہزاروں طلباء اور طالبات نے، نیز اسپورٹس اور دیگر تنظیموں اور کلبوں کے ممبروں نے حصہ لیا۔ اس جلوس میں پرانے کھلاڑیوں اور اسپورٹس مین جیسے سیلن منا، چنی گوسوامی، سمر (بدرو) بنرجی، پی کے بنرجی اور دیگر افراد نے حصہ لیا۔ یہ بہت ہی لمبا جلوس تھا۔ طلباء و طالبات رنگین جھنڈے لہراتے ہوئے اس جلوس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان کے بعد طبل بجانے والوں کا قافلہ تھا۔ پھر جلوس میں شامل ہونے والے لوگ تھے اور سب سے آخر میں جھانکیاں پیش کی گئیں جن میں کھیل کود کے جذبہ اور قومی یکجہتی کا اظہار کیا گیا۔

شری کمل بوس، میئر کلکتہ کارپوریشن نے بریگیڈ پریڈ گراؤنڈ میں دن کے ڈیڑھ بجے جھنڈا لہرا کر جلوس کا افتتاح کیا۔ شری بوس نے اس جلوس کی سربراہی کی۔ ان کے ساتھ شری جتن چکرورتی، وزیر تعمیرات عامہ و مکانات، شری کانتی بسواس وزیر ابتدائی تعلیم، شری رادھیکا بنرجی، وزیر خوراک و رسد اور شری سبھاش چکرورتی وزیر ریاست برائے کھیل کود اور خدمات نوجوان بھی تھے۔ یہ جلوس کلکتہ کی مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ۴ بجے سہ پہر کو سالٹ لیک اسٹیڈیم میں پہونچا۔

اولمپیائی جوڑے مسٹر ایمل زاٹوپیک اور ان کی اہلیہ محترمہ ڈانا زاٹوپیک بھی اس جلوس میں شرکت کرنے والے تھے، لیکن ان کا ہوائی جہاز دہلی سے کلکتہ ذرا دیر سے پہونچا اس لئے ان لوگوں کو دمدم ہوائی اڈہ سے سیدھا سالٹ لیک اسٹیڈیم میں پہونچا دیا گیا۔ اس اسٹیڈیم میں شام کے پانچ بجے سے بہت ہی رنگین جشن شروع ہوا۔ اس میں مسٹر زاٹوپیک اور ان کی اہلیہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ رقص کے ساتھ گیت، براتا چاری ناچ، ڈرل، بینڈ باجے اور آتش بازی نے اس جشن کو مزین کر دیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر زاٹوپیک نے کہا کہ اس ریاست کے اسپورٹس پریمیوں کے جوش و خروش سے انہیں بہت زیادہ مسرت حاصل ہوئی۔ وزیر ابتدائی و ثانوی تعلیم شری کانتی بسواس نے کہا کہ مغربی بنگال کے عوام نے اسپورٹس کے لئے اپنی محبت کی کئی ایک مثالیں قائم کی ہیں۔ یوبا بھارتی کریرانگن (اسٹیڈیم) ان مثالوں میں سے ایک ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر مختلف سطحوں پر عوام خود بخود اپنی محبت اور کوششوں کا اظہار نہیں کرتے تو شاید یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔ انہوں نے اس ریاست کے ۵ کروڑ سے زیادہ اسپورٹس کے دلدادہ لوگوں کا پیغام محبت مسٹر زاٹوپیک اور ان کی اہلیہ محترمہ کو پہونچایا۔ انہوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ ان کی مثال اس ریاست کے لوگوں کے لئے مشعل راہ ہوگی۔

اس تقریب میں دیگر لوگوں کے علاوہ کماری پی ٹی اوشا نے اور ان کے کوچ مسٹر نمبیار اور ملک کے دیگر مشہور اسپورٹس مین نے اس جشن میں شرکت کی۔ اس جشن میں ۱۹ پرانے کھلاڑیوں کو ریاستی حکومت نے استقبالیہ دیا

مغربی بنگال کے اضلاع میں منصوبہ بندی

از ڈاکٹر اشیم داس گپتا - ریڈر شعبۂ معیشت، کلکتہ یونیورسٹی
اور ممبر ریاستی منصوبہ بندی بورڈ

(دوسری اور آخری قسط)

سڑکوں کے سیکٹر میں ضلع - سطح کی سڑکیں ضلع اسکیم، دیہی سڑکیں، دیہی اسکیموں اور میونسپل سڑکیں شہری اسکیموں کی مثالیں ہیں۔ اس بات کی کوشش کی جانی چاہئے کہ ایک سیکٹر کیلئے ایک جامع منصوبہ کے جزو کے طور پر ہر سیکٹر میں ضلع، بلاک اور شہری اسکیمیں مرتب کی جائیں ۔ سڑکوں کی ہی مثال لیجئے۔ من مانی طور پر مختلف اقسام کی سڑکیں تعمیر کرنے کی بجائے اس بات کی کوشش کی جانی چاہئے کہ سماجی ضروریات کے پیش نظر اضلاع کے لئے ایک جامع مشترک منصوبہ مرتب کیا جائے اور منصوبہ میں مختلف اقسام کی سڑکوں کو اس منصوبہ کے جزو لاینفک کے طور پر نمایاں کیا جائے۔ ہر سیکٹر کیلئے ضلع، بلاک اور شہری اسکیموں کی شناخت کی جانی چاہئے اور وسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس طرح کی ہر اسکیم پر جو مالی اخراجات ہوں گے ان کا ذکر کرنا چاہئے۔ سڑکوں کی ہی مثال کو لے لیجئے۔ ضلع سڑکوں کی تعمیر کے لئے شعبہ جاتی فنڈ میں گنجائش رکھنی چاہئے، اور زیادہ تر دیہی سڑکوں کی تعمیر کے لئے قومی دیہی روزگار پروگرام یا دیہی بے زمین روزگار ضمانت پروگرام کے تحت فراہم کردہ رقوم سے خرچ کی گنجائش رکھنی چاہئے۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ضلع سطح پر ہر سیکٹر کے لئے ضلع اسکیمیں ہوں گی۔ ان اسکیموں کو غائر غور و خوض کے بعد مرتب کیا جائے گا۔ نیز ایسی اسکیموں کو ڈی پی سی منظور کرے گی اور ڈی پی سی اس کی تصدیق کرے گی۔ اسی طرح ہر بلاک، ہر سیکٹر کے لئے بلاک اسکیموں سے اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے اخراجات سے واقف ہو جائے گا۔ بلاک سطح پر ابتدائی اس سے نیچی سطحوں پر بات چیت کے بعد بلاک منصوبہ بندی کمیٹی (بی پی سی) کی منظور کردہ اسکیموں کو ڈی پی سی کے پاس بھیج دیا جائے گا جو اسے اپنی منظوری دے گا۔ اس کے بعد ڈی پی سی اس منظوری کی تصدیق کر دے گی۔ اسی طرح شہری اسکیمیں بھی میونسپلیٹیوں کی سطح پر مرتب کی جائیں گی اور انہیں منظوری اور تصدیق کے لئے ڈی پی سی اور ڈی پی سی کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ اس طرح ضلع منصوبہ تمام سیکٹروں کی ضلع اسکیموں، بلاک اسکیموں اور شہری اسکیموں کا مجموعہ ہوگا۔

ہر ضلع کے لئے ضلع منصوبہ کو ریاستی سطح پر عام منظوری کے لئے بھیج دیا جائے گا۔ ضلع منصوبوں میں درج ترجیحی اقدامات کو روبہ عمل لانے میں قصداً کوتاہی یا غلطی کرنے سے ریاستی سطح پر ضلع منصوبوں کو روبہ عمل لانے سے روک دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال پانی کے نکاس کی وسیع اسکیمیں، بجلی پروجیکٹس، بڑے پیمانہ کی صنعت کے پروجیکٹس وغیرہ جیسے پروجیکٹس جو کئی ایک ضلعوں پر پھیلے ہوئے ہوں گے، صرف ریاستی سطح پر مرتب کئے جائیں گے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ منصوبہ بند اسکیمیں، خاص طور پر بلاک اور اس سے نچلی سطح پر مرتب کرتے وقت اس بات کی کوشش کی جانی چاہئے کہ پنچایتوں اور میونسپلیٹیوں کے ذریعہ عام لوگوں کو ان اسکیموں کے عمل درآمد لانے کے کام میں شریک کیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر عام جلسے، عام لوگوں سے باضابطہ بات چیت، عام بحث و مباحثہ ضروری ہیں۔

اسکیموں کی تکمیل : بلاک، شہروں اور ضلعوں سے وابستہ ضلع منصوبہ مرتب کرنے کے بعد ہر سیکٹر کے لئے اسکیموں کو مندرجہ ذیل طریقوں سے روبہ عمل لایا جائے گا۔ ان اسکیموں کو، جن کے لئے، پنچایتوں کے ذریعہ مالی رقوم فراہم کی جائیں گی، پنچایتوں کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہونچایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے پنچایتوں کے اسٹاف سے کام لیا جائے گا، نیز ڈی پی سی اور بی پی سی کے تحت مزید اسٹاف فراہم کیا جائے گا۔ قومی دیہی روزگار پروگرام، دیہی بے زمین روزگار ضمانت پروگرام، جامع دیہی [illegible] پروگرام کی ضلع

منصوبہ اسکیمیں وغیرہ کے تحت جو اسکیمیں ہیں انہیں پنچایتوں کے تحت پایۂ تکمیل تک پہونچایا جائے گا۔ اسی طرح ان اسکیموں کو جن کیلئے میونسپلٹیوں کے ذریعہ مالی رقوم فراہم کی جائے گی میونسپلٹیوں کے ذریعہ اور ان اسکیموں کو جن کے لئے متعلقہ شعبوں کے ذریعہ مالی رقوم فراہم کی جائے گی، اس شعبہ کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہونچایا جائے گا۔ چند اسکیمیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جنہیں پنچایتیں اور متعلقہ شعبے مشترکہ طور پر پایۂ تکمیل تک پہونچائیں گے۔ مثال کے طور پر چند سڑکوں کی تعمیر کے سلسلے میں کچی سڑک کی تعمیر کے اخراجات قومی دیہی روزگار پروگرام کے فنڈ سے پورے کئے جائیں گے اور اس سڑک کو پختہ بنانے کے اخراجات شعبہ تعمیراتِ عامہ (سڑک) پورا کرے گا۔

اس بات کی اہم ضرورت ہے کہ ان منصوبہ اسکیموں کا، جنہیں رو بہ عمل لایا جارہا ہے، جائزہ لیا جائے۔ تعمیراتی کام کی باضابطہ دیکھ بھال کی جائے۔ اسکیموں کے پیشِ نظر ریاستی سطح، ڈی پی سی سطح یا بی پی سی سطح سے ان ذمہ داریوں کو نبھایا جائے گا۔ ان جائزوں کے نتائج کے پیشِ نظر آئندہ سال کے لئے متعلقہ منصوبوں کے لئے حسبِ خواہ رقم مختص کی جائیں گی۔

اس سال (۸۶-۸۵ء) میں بلاک منصوبوں پر مشتمل ضلع منصوبہ ہر ضلع کے لئے لامرکزی طور پر مرتب کیا گیا۔ پہلی بار اس ریاست میں اور شاید پہلی بار سارے ملک میں ایسے اقدامات کئے گئے۔ اب ان منصوبوں کو رو بہ عمل لایا جارہا ہے۔ ان کے ساتھ آئندہ سال کے لئے منصوبے بھی مرتب کئے جارہے ہیں۔

منصوبہ بندی کے نظام اور طریقہ کار کے سلسلہ میں یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی قسم کی خوش فہمی اجاگر کرنے کے بیشِ نظر ان منصوبوں کے ذریعہ ریاستی حکومت کے محدود اختیارات کے تحت عام لوگوں کی مدد کے لئے اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔ اضلاع میں نئے منصوبہ بندی کے نظام کے ذریعہ امداد کے کام کو اور بھی اچھے طریقے سے مربوط اور منظم کیا جا سکتا ہے۔ عملی کام میں شرکت کی وجہ سے عام لوگوں پر معیشت کے مختلف شعبوں میں مائل دشواریاں اور بندشیں عیاں ہو جائیں گی اور ان بندشوں پر عوام کو مستقبل میں قابو پانا ہے۔۔۔

بقیہ : اکواء......

اگلے تعلیمی سال یعنی آئندہ اپریل سے کانتی، کلیانی اور مدیاساگر یونیورسٹیوں میں ماہی گیری و ماہی پروری کی تعلیم کے لئے ڈپلوما اور ڈگری کورس چالو کردئے جائیں گے۔

شعبہ اعلیٰ تعلیم کے وزیر شری شمبھو گھوش نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مچھلیوں کی پرورش و پرداخت کے لئے تعلیم اور تربیت دونوں کی اہم ضرورت ہے اور اس سلسلے میں یہ کوششیں کی جانی چاہئیں کہ طلبار کو مشترکہ طور پر تعلیم و تربیت دی جائے۔

مہمانِ خصوصی وزیر ماحولیات شری بھوانی مکھوپادھیے نے اپنی تقریر میں بتایا کہ تخمیناً ۰۰ہم ہیکٹائرس پر پھیلے تالابوں میں چارہ مچھلیوں کی پرورش کی جائے۔ اس تخمینہ کو پورا کر لیا گیا ہے اور اب ۵۰۵۰ ہیکٹائرس میں پھیلے تالابوں میں چارہ مچھلیوں کی پرورش کی جارہی ہے۔ میونسپل علاقوں میں زمینی دوزنالے سے نکلنے والے گندے پانی میں چارہ مچھلیوں کی پرورش کا انتظام کیا گیا ہے۔

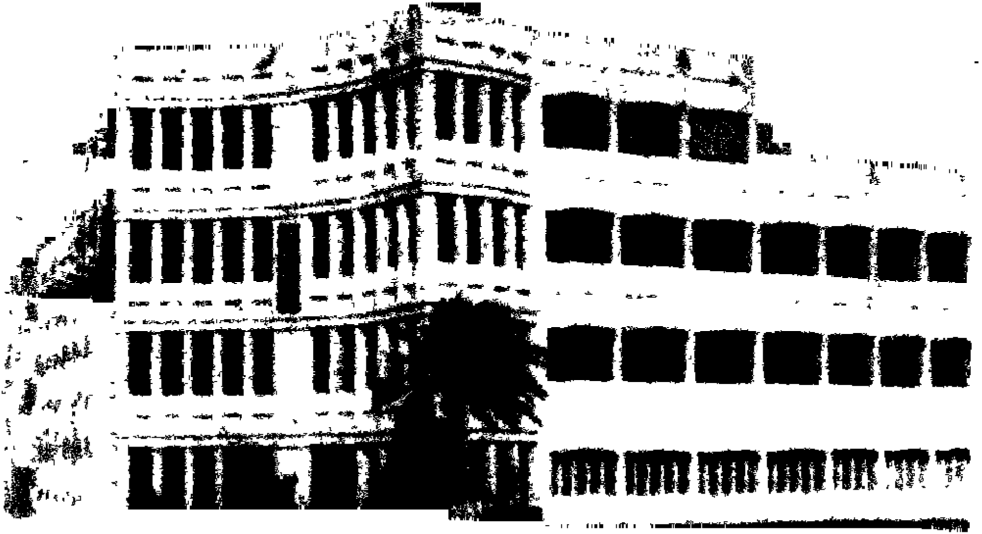
اس تقریب کے اختتام میں ضلع ماہی افسر شری امل کمار مجمدار نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ چارہ مچھلیوں کی پرورش و پرداخت کے سلسلے میں سیمینار منعقد ہوا۔ اس میں مختلف مقرروں نے اپنی تقریروں میں ماہی گیری و ماہی پروری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

اس مچھلی بھون "اکوار" کی عمارت کی تعمیر پر ۱۷ لاکھ روپئے خرچ ہوئے۔ یہاں ماہی گیری کے لئے تربیتی مرکز بھی قائم کیا گیا ہے۔۔۔

بقیہ ، گورنر کا خطبہ......

عزت مآب ممبروں کو موجودہ سیشن میں ان تمام باتوں اور دیگر مسائل پر بحث و مباحثہ کرنے کا موقع ملے گا۔ میں دعا گو ہوں کہ اس ایوان کے عظیم میں آپ لوگوں کی کامیابی سے ہمکنار ہوں۔۔۔

ماہی بھون "اکوا"



شری شمبھو برن گھوش، وزیر شعبۂ اعلیٰ تعلیم حکومت مغربی بنگال نے گزشتہ ۴ مارچ کو ضلع ہگلی کے کھادینا مور پر نو تعمیر مچھلی بھون "اکوا" کا افتتاح کیا۔ اس افتتاحی تقریب میں ریاستی وزیر ماحولیات شری بھوانی مکھوپادھیہ نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ان کے علاوہ اس تقریب میں ہگلی ضلع پریشد کے سبھادھیپتی شری شیو پرشاد مکھوپادھیہ اور ضلع مجسٹریٹ شری کاسیبیہ ساجی بین نے بھی شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت وزیر شعبہ ماہی گیری و پروری شری کرن موئے نندو نے کی۔ سب سے پہلے اس تقریب میں شعبۂ ماہی گیری وماہی پروری کے سکریٹری شری اسیم برمن نے اپنی تقریر میں مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ صدر جلسہ شری کرن موئے نندو نے اپنی تقریر میں کہا کہ مچھلی بنگالیوں کی خوراک کا لازمی جزو ہے۔ اس لئے یہ شعبہ مچھلیوں کی زیادہ سے زیادہ فراہمی کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ چونکہ مچھلیوں کی کمی کو دور کرنا ریاست کے لئے فی الحال مشکل ہے اس لئے ریاستی حکومت کو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دیگر ریاستوں سے بیس چالیس ہزار ٹن مچھلیاں درآمد کرنی پڑتی ہیں۔

انہوں نے مزید کہا کہ مچھلیوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر پروگرام اپنائے گئے ہیں۔ ریاست کے مختلف علاقوں میں ندیوں، تالابوں اور سمندر کے ساحلی علاقوں میں مچھلی کی پرورش و پرداخت کے کام کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ چارہ مچھلیوں کی پرورش کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں انہیں امداد بھی فراہم کی جاتی ہے۔ ماہی گیروں اور خاص طور پر غریب ماہی گیروں کی معاشی حالت سدھارنے کے لئے ریاستی حکومت کی طرف سے بہت سارے اقدامات کئے گئے ہیں۔ ان ماہی گیروں کو ماہی پروری کی سائنسی تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں مچھلی پکڑنے کے جال، کشتیاں اور ماہی گیری کے دیگر ساز و سامان بھی دئے جاتے ہیں۔ نیز انہیں آسان شرطوں پر قرض بھی فراہم کئے جاتے ہیں۔ ریاستی حکومت نے ماہی گیروں کے لئے حادثہ بیمہ اسکیم بھی رائج کی ہے۔ نیز ریاستی حکومت مچھلیوں کی پرورش و پرداخت کے لئے مختلف علاقوں میں تالابوں کی تعداد میں بھی اضافہ کرنے کی بھی کوشش کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں عالمی بینک کی امداد کی فراہمی سے اس کام کو اور بھی تیزی سے روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ چار ہزار ماہی گیروں کی رہائش کے لئے مکانات تعمیر کئے جائیں گے۔ سمندر میں ماہی گیری کے لئے ضلع ہوگلی کے ماہی گیروں کو ۹۶ ہزار روپئے سرکاری امداد کے طور پر دئے جائیں گے جن سے موٹر سے چلنے والی کشتیاں، نائیلون کے جال خریدے جائیں گے۔

(باقی صفحہ ۳ پر)



مغربی بنگال کے وزیر ابتدائی و ثانوی تعلیم شری کانتی بسواس اور وزیر ریاست برائے ابتدائی تعلیم شری عبد الجباری، طلبا کے کھیل کود اور ثقافتی تقریب کے موقع پر کرشنا نگر اسٹیڈیم میں۔ (تصویر از: سومنتو بیر نووس)



کرشنا نگر اسٹیڈیم میں حال ہی میں منعقدہ طلبا کے سہ سالہ اسپورٹس اور ثقافتی تقریبات۔ ابتدائی اور ثانوی اسکول کے طلبہ کے پیش کردہ رو تو چاری کا ناچ



ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کی طالبات کا پیش کردہ لوک ناچ

Postal Regd. No. WB/ CC-52
Vol—33 No.— 6
PRICE—12 Paise

MAGHREBI BANGAL
15th March 1986



وزیر خوراک و رسد شری رادھیکا رنجن بنرجی، باگجولا میں حال ہی میں منعقدہ ایک تقریب
میں پناہ گزینوں کو قطعات آراضی کے پٹے تقسیم کرتے ہوئے ۔





قومی ترقیاتی کاربوریشن کے چیرمین شری پرشنی مکھرجی ۹ مارچ ۱۹۸۶ء کو نندن، کلکتہ میں منعقدہ
'علم کے فروغ میں حکومت مغربی بنگال کا کردار' سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے ۔

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azan., Published by the Information & Cultural Affairs Department, Govt. of West Bengal and Printed by M/s. G. R. T. Printers, 54/1C, Shyampukur Street, Calcutta-700 004.

مغربی بنگال

مدیر اعلیٰ : …بھٹاچاریہ

مدیر : دھریندرا ناتھ دت

مدیر معاون : محمد اعظم

جلد نمبر ۲۳ * یکم اپریل ۱۹۸۶ء * شمارہ نمبر [illegible]

سالانہ : ۳ روپے * فی شمارہ … پیسے

ترسیل زر و خط و کتابت

بنام مدیر !

شعبہ اطلاعات و ثقافتی امور ، حکومت مغربی بنگال

۲۳- آر این مکھرجی روڈ - کلکتہ - ۷۰۰۰۰۱



وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو ریاستی بجٹ ۸۷-۱۹۸۶ء پیش کرنے کیلئے ریاستی اسمبلی میں جاتے ہوئے۔ وزیر اعلیٰ کے بائیں طرف شری پرشانتو سور وزیر بلدیات و شہری ترقی بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔



غزل

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسّر تو آرزو ہی سہی

نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی

کسی طرح تو جمے بزم میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی

گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیضؔ ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

فیض احمد فیضؔ

مغربی بنگال کا بجٹ برائے ۸۷-۱۹۸۶ء

ٹیلی ویژن سیٹ پر سے تفریحی ٹیکس ختم - کھیل تماشے، اسپورٹس، اسکوٹر، موٹر سائیکل وغیرہ میں ٹیکس کی شرحوں میں کمی

نئے بجٹ میں ۵۰ر۵۳ کروڑ روپئے کی بچت - عوام کے لئے راحت بخش بجٹ

ریاستی حکومت کے وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے ۱۲ مارچ ۱۹۸۶ء کو ریاستی اسمبلی میں ۸۷-۱۹۸۶ء کا بجٹ پیش کیا جس میں ۵۰ر۵۳ کروڑ روپئے کی تخمینہ شدہ بچت دکھائی گئی ہے۔ بجٹ پیش کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ نئے بجٹ میں ۲۲۶۹ر۱۴ کروڑ روپئے کی آمدنی (اس رقم میں ابتدائی ۷۵ کروڑ باقی شامل ہے) اور ۲۱۵۹ر۶۱ کروڑ روپئے کے اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ریاست کی معیشت میں ناہمواری اور خامیوں کو دور کرنے میں پیش رفت ہوئی ہے اور زرعی اصلاحات پر زور دیا گیا ہے۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں چھوٹے پیمانہ کی صنعت کی یونٹوں کی تعداد ۳۴ ہزار تک پہونچ گئی ہے اور اس سے [illegible] بے روزگاروں کو روزگار فراہم کیا گیا۔ وزیر اعلیٰ کی بجٹ تقریر کا متن اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے:

محترم جناب اسپیکر صاحب! آپکی اجازت سے میں اس ایوان میں مالی سال ۸۷-۱۹۸۶ء کیلئے حکومتِ مغربی بنگال کا بجٹ اور سالِ رواں کے لئے نظرثانی کردہ تخمینہ پیش کرتا ہوں۔

اس ایوان میں ۸۶-۱۹۸۵ء کے لئے معاشی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس جائزہ میں حالیہ عرصہ میں اس ریاست میں وسیع معاشی رجحانات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ شدید خشک سالی کی وجہ سے ۸۲-۱۹۸۱ء اور ۸۳-۱۹۸۲ء میں شدید دشواریوں کے باوجود گزشتہ پانچ برسوں میں فی کس آمدنی کی شرح سارے ہندوستان کے مقابلے میں بہت ہی اونچی ہے۔ ہمیں بہت ساری معاشی ناہمواریوں اور رکاوٹوں کو، جن سے ریاست کی معیشت بری طرح متاثر ہوئی ہے، دور کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

مضافاتی سیکٹر میں ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے پیداواری اصلاحاتِ اراضی پر زور دیا گیا ہے۔ انتہائی حد سے زیادہ فاضل قطعاتِ اراضی جن پر حکومت کو حقِ ملکیت حاصل ہوگیا ہے، میں سے تقریباً ۸ر۱۰ لاکھ ایکڑ قطعاتِ اراضی غریب اور بے زمین کسانوں کے درمیان تقسیم کردئے گئے ہیں۔ ملک کے کسی بھی علاقے میں اتنے قطعاتِ اراضی کی از سرِ نو تقسیم نہیں ہوئی۔ ریکارڈس میں ۱۳ لاکھ سے زیادہ برگداروں کے نام درج کئے گئے ہیں۔ اصلاحاتِ اراضی کے اقدامات کے تحت غریب اور کام کرنے والے کسانوں کو، ان کے کھیتوں کی آبپاشی کے لئے پانی بھی سپلائی کیا جارہا ہے۔ ان تمام کوششوں میں ضلع اور بلاک سطحوں پر لامرکوز منصوبہ بندی کے ذریعہ مزید تال میل پیدا کیا گیا ہے اور ان تمام طریقۂ کار میں منتخب پنچایتوں کے ذریعہ عام مقامی لوگوں کو شریک کیا گیا ہے۔ ان تمام اقدامات کی وجہ سے گزشتہ چند برسوں سے زرعی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا اور اضافہ کی اس شرح کو برقرار رکھا جارہا ہے۔

یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ خریف کی پیداوار گزشتہ برسوں کی طرح ۸۶-۱۹۸۵ء میں بھی کافی بہتر ہوئی لیکن اس بات سے کہ کسانوں کو خام پاٹ کے لئے بہت ہی کم قیمتیں ملیں۔ ریاستی حکومت کو کافی تشویش لاحق ہوگئی۔ شعبۂ زراعت کے تخمینہ کے مطابق دسمبر ۱۹۸۵ء کے آخر تک اس ریاست میں پاٹ کی پیداوار کا نصف حصہ کم سے کم تائیدی قیمت سے کم قیمت پر فروخت کردیا گیا۔ پاٹ کی پیداوار اور قیمتوں میں استحکام کے لئے ایک جامع پالیسی کی، جو مشرقی اور شمال مشرقی علاقے میں معاشی سرگرمی کے ایک اہم

جز وسے مرکزی حکومت کی کوتاہی کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ امر لازمی
ہے کہ ہندوستان کے پاٹ کارپوریشن غریب پاٹ کاشتکاروں
کے مفاد کی خاطر خام پاٹ کی خریداری کے سلسلے میں اپنا اختیارات
کو بروئے کار لائے اور درمیانی لوگوں کو نکال باہر کرے۔

مساوی کرایہ کی اسکیم کو روبعمل لانے سے قائم بڑی اور
متوسط درجہ کی صنعتوں میں پیدا ہونے والے جمود، مرکزی حکومت کی
لائسنسنگ پالیسی، نیز صنعتوں کی تجدید سے غفلت نے صنعتوں کو
بری طرح متاثر کیا ہے۔ اس ریاست میں بڑی اور متوسط درجہ کی
صنعتوں کے نئے مرکزی سرمایہ کاری کے لئے اور خاص طور پر پیٹرو
کیمیکلس میں مشترکہ مرکزی۔ریاستی سرمایہ کاری کے لئے ہماری
درخواست پر حکومت ہند نے لبیک نہیں کہا۔ اس لئے ہمیں اپنے
محدود وسائل کا سہارا لینا پڑا اور ہم مشترکہ سیکٹر کے ذریعہ اس
ریاست میں صنعتوں کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔
اس سلسلے میں ریاستی صنعتی ترقیات کارپوریشن اور الیکٹرانکس
صنعت ترقیات کارپوریشن گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔
اس کے ساتھ ہی ریاستی حکومت نے، ویسٹ بنگال انڈسٹریل
انفراسٹرکچر ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے ذریعہ، صنعتی علاقوں اور
صنعتی انفراسٹرکچر مرکزوں کی ترقی کے لئے بڑی بڑی سہولتیں
جیسے پختہ سڑکوں کی تعمیر، پانی اور بجلی کی فراہمی وغیرہ فراہم کی
ہیں۔ نیز مال برآمدات پروسیسنگ علاقہ کے لئے بھی حکومت کی طرف
سے کئی گئے ایسے اقدامات کو روبہ عمل لانے کے کام کی رفتار ترقی
کافی تشفی بخش ہے۔

چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی رفتار ترقی کافی تیز ہے۔
چھوٹے پیمانہ کی نئی صنعتی یونٹوں کی تعداد ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۲۷۸۱
تھی جو بڑھ کر ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۲۳۰۰۰ ہو گئی۔ یونٹوں کی تعداد میں
اضافہ سے اب ۵۷۳۶۲ افراد کی جگہ ۷۳۰۰۰ افراد کے لئے
روزگار فراہم کیا جا سکے گا۔ نیز اس بات کی امید کی جاسکتی ہے
کہ پیداوار ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۲۷ کروڑ میٹر سے بڑھ کر ۸۶-۱۹۸۵ء
میں ۳۰ کروڑ میٹر ہو جائے گی۔ ریشم کے کیڑوں یعنی کوؤں کی
پرورش کے لئے شہتوت کے باغات کے رقبہ میں ۸۶-۱۹۸۵ء
میں کافی اضافہ کیا جائے گا۔ پیداوار میں اضافے کے ان اقدامات
سے شہری اور مضافاتی علاقوں میں روزگار کے کافی مواقع پیدا ہوں
گے۔

بجلی کے میدان میں بھی رفتار ترقی کافی تشفی بخش ہے
اور بجلی کی مجموعی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اس بات کی امید
کی جاسکتی ہے کہ کولاگھاٹ اسٹیم II پروجیکٹ کے لئے
ہندوستان کے صنعتی ترقیات بینک اور دیگر مالیاتی اداروں سے
۲۳۲ کروڑ روپئے بطور قرض ملنے کی امید ہے۔ آج اس پروجیکٹ
کے لئے ۷۰۰ کروڑ سے زیادہ روپئے کی ضرورت ہے۔ آئی ڈی بی آئی
اور دیگر مالیاتی اداروں سے فراہم کردہ وسائل کے ساتھ ساتھ
ریاستی حکومت کو اس پروجیکٹ کے اخراجات کے لئے کثیر رقم
فراہم کرنی ہوگی۔ بکریشور میں مجوزہ تھرمل پاور اسٹیشن کی بابت ہمیں
حکومت ہند نے اس بات سے مطلع کیا کہ اسے منصوبہ میں داخل
کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد حکومت ہند نے ہم
لوگوں سے یہ کہا کہ ہم باہر سے اس سلسلے میں تعاون حاصل
کرنے کی کوشش کریں۔ اس بات کے پیش نظر چند غیر ملکی اداروں
کی پیش کش مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کے زیر غور
ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بجلی پروجیکٹس کے لئے ہماری کئی ایک
تجاویز مرکزی حکومت کی منظوری کی منتظر ہیں۔ یہاں یہ بات قابل
ذکر ہے کہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران بجلی سیکٹر میں ریاستی حکومت
نے سرمایہ کاری میں ۲۷ کروڑ روپئے کا اضافہ کیا۔ نیز درگاپور
پروجیکٹس لمیٹڈ کے لئے مزید ۵ء۴ کروڑ روپئے فراہم کئے گئے۔

سارے ملک کے ساتھ ساتھ مغربی بنگال میں بے
روزگاری کا مسئلہ بہت ہی شدید ہے۔ تبادلۂ روزگار کے دفاتر کے
ذریعہ روزگار کے متلاشیوں کی تعداد سارے ملک میں ۲ء۵ کروڑ
اور ہماری ریاست میں ۴۰ لاکھ ہے۔ گزشتہ سال جیسا کہ بجٹ
تقریر میں کہا گیا تھا تبادلۂ روزگار کے دفاتر میں رجسٹرڈ بے
روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے سلسلے میں ہم لوگوں نے جولائی
۱۹۸۵ء سے ایک نئی اسکیم رائج کی تھی۔ اس اسکیم کے تحت
"جیسے" مغربی بنگال میں رجسٹرڈ بے روزگاروں کے لئے خود روزگار

اسکیم کے تحت ہیں۔ ریاستی حکومت ہر بے روزگار کو ۱۵۰۰
روپے کا قرض دے کر خود روزگار پروگرام قائم کرنے میں مدد دیتی ہے۔
اس سلسلے میں ریاستی حکومت کل پروجیکٹ اخراجات کا ۲۵ فیصد
رقم بطور سبسڈی فراہم کرتی ہے نیز ہمارے بینک اخراجات
کا ۷۵ فیصد رقم بطور قرض فراہم کرتے ہیں۔ اب تک اس اسکیم
سے تقریباً ۱۰۰۰ افراد مستفید ہو چکے ہیں۔ ایسے تقریباً [illegible] کیس
کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ اور اس بات کی امید کی
جاتی ہے کہ موجودہ مالی سال کے دوران ایسے بہت سارے بے
روزگار اس اسکیم سے مستفید ہوں گے۔ یکم اپریل ۱۹۸۷ء سے اس
اسکیم کو سارے ریاست میں لاگو کر دیا جائے گا۔

عزت مآب ممبران اس بات سے واقف ہیں کہ
بے روزگاری امدادی اسکیم ۱۹۷۹ء کے تحت بے روزگاروں کو بطور
مدد جو رقم دی جاتی ہیں ان کا نصف حکومت ہند نے برداشت
کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے باوجود ہم نے اس اسکیم کو ایک
ترمیم شدہ شکل میں جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اب ہمارا کام کوشش
یہ ہے کہ [illegible] بے روزگاروں کے نام درج ہیں ان کی مدد کیلئے
[illegible] اسکیم کے تحت خود روزگار پروجیکٹوں
کا پتا لگائیں۔ نیز حکومت ہند کی منصوبے کے تحت ہوگا ایسے بوڑھے
اور معذور بے روزگاروں کو جن کے نام تبادلۂ روزگار کے دفاتر
میں درج ہیں، ہمارے محدود وسائل کے پیش نظر جہاں تک ممکن ہو
سکے، کچھ امداد فراہم کی جائے۔ ان باتوں کے علاوہ بڑی اور چھوٹی
پیمانے کی صنعتوں کی پیداوار میں اضافہ، جیسا کہ قبل ذکر کیا گیا ہے
کہ زرعی اور معاون ترقیاتی پروگراموں کی بنیادوں کے ذریعہ
نکیں سے مزید روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے۔ اس طرح بے
روزگاری کا شدید مسئلہ کچھ حد تک حل کیا جا سکے گا۔

ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ یہاں اس بات کا ذکر کرنا پڑتا
ہے کہ تقسیم ہند کے چالیس سال بعد بھی مغربی بنگال میں آنے
والے پناہ گزینوں کی بڑی تعداد کی بحالی کا مسئلہ تشنۂ حل ہے۔
دیکھنے والوں کو اس ریاست کے تمام شعبوں میں اس عظیم مسئلہ
کا مجموعی اثر نظر آئے گا۔ مرکزی حکومت نے تو صرف اس بات کو
اقرار کیا ہے کہ یہ ایک [illegible] مسئلہ ہے لیکن اسے حل کرنے کی
ذمہ داری سے انکار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں [illegible]
کہ [illegible] اس مسئلہ کو حل کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہے
ہیں۔

اسی سلسلے میں یہاں چھٹے منصوبہ کی بابت جہاں
تک اس کا تعلق مغربی بنگال سے ہے، کچھ کہنا ضروری ہوگا۔ ہم
لوگوں نے ۳۹۰۷ کروڑ روپے کے منصوبے معاونت کی تجویز پیش
کی تھی۔ لیکن ہر سطح پر ہماری پرخلوص کوششوں کے باوجود حکومت
ہند نے اس منصوبہ کو آخری شکل دینے سے انکار کر دیا۔ اور اس
کی وجہ یہ بتائی کہ حسب خواہ وسائل کہیں نظر نہیں آتے۔ عزت
مآب ممبران اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ آٹھویں مالیاتی
کمیشن نے یہ سفارش کی تھی کہ مغربی بنگال کو ۲۰۳ کروڑ سے زائد
روپے دیئے جائیں لیکن مرکز نے اتنی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ یہاں
اس بات کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ اس کمیشن نے چند اثاثے کی
منتقلی کی سفارش کی تھی اور دیگر تمام ریاستوں کے مقابلے میں اس
اثاثے میں مغربی بنگال کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ عزت مآب
ممبران اس بات سے واقف ہیں کہ جنوری ۱۹۸۵ء سے مرکز نے
اوور ڈرافٹ (بینک سے قرض) کی سہولتوں پر پابندی عائد کر دی۔
اس سال مرکزی امداد کے طور پر اس ریاست کو صرف ۴۴ کروڑ روپئے
ملے جبکہ ریاست نے چھٹے منصوبے کے دوران حاصل کردہ منصوبہ
قرض معہ سود ۴۸ کروڑ روپئے ادا کر دیئے۔ یہ ہمارے لیے ایک
چیلنج تھا اور ہم نے محاصل میں اضافہ کرنے کی اور ہمارے غیر منصوبہ
بند اخراجات میں کمی کرنے کی کوششیں کیں۔ مرکز نے اس ریاست
کو ۲۰۳ کروڑ سے زیادہ روپئے دینے سے انکار کر دیا۔ اوور
ڈرافٹ کی سہولتوں پر پابندی عائد کر دی۔ لیکن ان تمام دشواریوں
کے باوجود ہماری کوششوں کے نتیجے میں سال رواں میں منصوبہ کے
تحت اخراجات ۴۸۴ کروڑ روپئے ہو گئے۔ چھٹے منصوبہ کے عرصہ
میں یہ سب سے زیادہ ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ۸۶-۱۹۸۵
میں جب یہ بجٹ پیش کیا گیا تو اس وقت بینک سے لئے گئے اوور

[illegible] کر لیا گیا تھا۔

۱۹۸۰ء میں جو نوشتہ تک ریاستی حکومت نے اوور ڈرافٹ کے ذریعہ ۲۲۰ کروڑ روپئے حاصل کئے تھے۔ پچھلے سال مرکزی حکومت سے بات چیت کرنے کے بعد اس رقم کی ۔ ایک قسم کی تطبیق کے ذریعہ، باقی رقم کو چار سالہ قرض کی شکل میں بدل دیا گیا۔ اس طرح ۲۰۶ کروڑ روپئے جو بطور قرض حاصل ہوئے وہ چار سال کی مدت میں ادا کر دینے ہوں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ جو ناانصافی کی گئی، اس کی بابت ہم نے حکومت ہند کی توجہ مرکوز کی تھی۔ اگر ۳۲۰ کروڑ روپئے، جن کی بابت آٹھویں مالیاتی کمیشن نے سفارش کی تھی، اس ریاست کو دیئے جاتے نیز ہم اوور ڈرافٹ کی رقم واپس کر دیتے، ساتھ ہی ہمارے پاس سال کے آخر میں کچھ فاضل رقم بھی ہوتی۔ لیکن اس رقم کی جو جائز نا جائز ہے، کی منتقلی کی جگہ، اس کا صرف ایک جزو قرض کی شکل میں ہمیں فراہم کیا گیا۔

قومی ترقیات کونسل کی گزشتہ نشست میں، جو نومبر ۱۹۸۵ء کو منعقد ہوئی تھی، ساتویں پنج سالہ منصوبہ پر گفت و شنید کی گئی۔ اس منصوبہ کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے ہم نے یہ کہا تھا کہ اس مجوزہ منصوبہ میں جس رویئے کو اپنایا گیا ہے اس سے ساری معیشت کی رفتار افزائش سست ہو جائے گی اور لوگوں کی بڑی اکثریت کے معیار زندگی بری طرح متاثر ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ بے روزگاری بڑھ جائے گی۔ اور امیروں اور غریبوں کے درمیان حائل خلیج اور بھی وسیع ہو جائے گی۔ لیکن اس کاؤنسل میں مجوزہ منصوبہ کو تسلیم کر لیا گیا۔ ہم لوگوں نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ ہم اس منصوبہ کو، جیسا کہ کاؤنسل نے اسے منظور کر لیا ہے، پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس منصوبہ کی منزل مقصود اور حکمت عملی کی بابت ہماری باتوں کو درج ریکارڈ کر لیا جائے۔

ساتویں منصوبہ اور مغربی بنگال کے سلسلے میں ہم لوگوں نے خاص طور پر یہ باتیں منصوبہ بندی کمیشن کے علم میں لائیں کہ مجوزہ ۴۳۵ کروڑ روپئے کے مصارف بہت ہی ناکافی تھے۔ ہم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ریاست کے خصوصی مسائل کو زیر غور رکھتے ہوئے آبپاشی (سونیستا پروجیکٹ) کے امکانات میں مزید توسیع، پانی کے نکاس اور سیلاب سے تحفظ کے اقدامات، ساتھ ہی کلکتہ میں بڑی بڑی سہولتوں جیسی رسل و رسائل، پانی کی سپلائی وغیرہ میں بہتری کے لئے مرکز کو مزید رقم فراہم کرنی چاہئیں۔ اس سال جنوری میں منصوبہ بندی کمیشن سے میں نے اس سلسلے میں بات چیت کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

عزت مآب ممبران اس بات سے واقف ہیں کہ ۸۶-۱۹۸۵ء کے سال رواں کے لئے مجوزہ منصوبہ کے لئے مصارف کا تخمینہ ۷۱۵ کروڑ روپئے کا کیا گیا تھا۔ منصوبہ پروگراموں اور پروجیکٹوں کی بہتر طور پر تکمیل کے لئے وزرائے اعلیٰ کی سطح پر ان پروجیکٹوں کی رفتار ترقی کا جائزہ لینے کے لئے سہ ماہی نشست کا نظام رائج کیا گیا تھا۔ تدبیر کے طریقۂ کار کے ذریعہ خاص طور پر بجلی، آبپاشی اور صنعتوں کے لئے مزید رقوم مختص کی گئیں۔ مجھے امید ہے کہ جائزہ کی نشستیں منصوبہ کے موثر طریقہ سے تکمیل میں معاون ثابت ہوں گی۔

وسائل پر شدید دباؤ اور منصوبہ کے لئے ہر ممکن طریقہ سے زیادہ سے زیادہ فنڈ کا انگ رکھنے کی ضرورت کی وجہ سے تیار کردہ اثاثوں کو اچھی حالت میں رکھنے کی طرف اکثر حسب خواہ دھیان نہیں دیا جاتا۔ سال رواں ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران عظیم تر کلکتہ ترقیاتی علاقہ میں تعمیر کردہ اثاثوں کو بہتر حالت میں رکھنے کے لئے ۶ کروڑ روپئے مختص کئے گئے ہیں۔ یہ اثاثے خاص طور پر پانی کی سپلائی، سڑکوں کی بہتری اور بستیوں کی ترقی کی اسکیمیں ہیں۔

ایک تجویز یہ ہے کہ آنے والے سال میں اس گنجائش کو بڑھا کر ۱۱ کروڑ روپئے کر دیا جائے۔ اسی طرح سڑکوں اور سرکاری عمارتوں کو اچھی حالت میں برقرار رکھنے اور آبپاشی کے کام کاج کے لئے مختص رقم میں ۷ کروڑ روپئے کا اور تعلیمی

اوزاروں کی عمارتوں کو اچھی حالت میں برقرار رکھنے کے لئے مختص کردہ رقم میں ۵ کروڑ روپئے کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

تیستا پروجیکٹ اس ریاست کا بہت ہی اہم پروجیکٹ ہے جو زیر تعمیر ہے۔ اس پروجیکٹ کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہمیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان سے ہم معزز ممبروں کو روشناس کرانا چاہتے ہیں۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے آخر تک اس پروجیکٹ پر ۱۰۶ کروڑ روپئے خرچ کئے گئے۔ اس رقم میں سے صرف ۵ کروڑ روپئے حکومت ہند نے خصوصی امداد کے طور پر دیئے۔ ہم حکومت ہند سے یہ درخواست کر رہے ہیں کہ وہ اس خصوصی امداد کی رقم کو ساتویں منصوبہ کے عرصہ میں بڑھا کر ۲۰ کروڑ روپئے سالانہ کر دے کیونکہ یہ پروجیکٹ کافی قومی اہمیت کا حامل ہے۔ اب تک حکومت ہند کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ریاستی حکومت نے آبپاشی کے بڑے اور متوسط درجہ کے لئے منصوبہ کے تحت جو رقوم مختص کی ہیں ان کی ۶۰ تا ۷۰ فیصد رقم صرف اس پروجیکٹ پر خرچ کر رہی ہے۔ اس سے زیادہ ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس بات کے پیش نظر ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران اس پروجیکٹ سے کسانوں کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہوں۔ ہم نے سال رواں میں تیستا پروجیکٹ کے لئے ۲۱ کروڑ روپئے کی جگہ ۲۸ کروڑ روپئے مختص کئے۔ کولاگھاٹ اسٹیج II پروجیکٹ کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے میسرز بھارت ہیوی الیکٹریکلس لمیٹڈ کی درخواست پر ہماری یہ تجویز ہے کہ سال رواں میں اس کمپنی کو مزید ۳۵ کروڑ روپئے دیئے جائیں تاکہ وہ اس پروجیکٹ کے لئے ضروری تعمیراتی چیزیں خرید سکیں اور ریاست کے اس بجلی گھر کی تعمیر کے کام کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔

۸۷-۱۹۸۶ء کے لئے منصوبہ کے تحت مجموعی مصارف ۷۷۶ کروڑ روپئے ہے۔ اس میں ۵۴۸ کروڑ روپئے ریاستی وسائل سے حاصل کئے جائیں گے۔ اور ۲۲۸ کروڑ روپئے مرکزی امداد کے طور پر فراہم ہوں گے۔

اس منصوبہ کے مصارف میں کئی ایک مدوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک تو صرف شہر کلکتہ ترقیاتی علاقہ میں بلکہ دیگر شہری علاقوں میں بھی بڑی بڑی سہولتوں جیسے شاہراہوں کی تعمیر، پانی کی سپلائی وغیرہ میں بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے بجٹ میں رکھی گنجائش کے علاوہ مزید ۸ کروڑ روپئے فراہم کئے جائیں۔ اس رقم کا کچھ حصہ بردھمان نگر، جنوبی دمدم اور دمدم علاقوں میں سطحی پانی سپلائی اسکیموں کے سلسلے میں سال رواں میں ابتدائی کام کاج کے لئے دستیاب ہوگا۔

اس موقع پر میں بیان اختصار کے ساتھ اس ایوان میں اس سے قبل پیش کردہ بجٹ تخمینہ سے مالیہ سال کے لئے نظر ثانی کردہ تخمینہ میں چند اہم فرق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ بجٹ تخمینہ میں ٹیکس محاصل ۱۲۲۴ کروڑ روپئے کا تھا، لیکن اب اس مد کے تحت تقریباً ۴ کروڑ روپئے زیادہ حاصل ہوں گے۔ اس غیر ٹیکس محاصل کا نشانہ تقریباً ۱۷۱ کروڑ روپئے مقرر کیا گیا تھا لیکن اب اس مد کے تحت تقریباً ۹ کروڑ روپئے کم موصول ہوں گے۔

اخراجات کی مد نظر ثانی کردہ تخمینہ میں محاصل اکاؤنٹ میں تقریباً ۶۹ کروڑ روپئے کا اضافہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ مزید مہنگائی بھتہ جسے سال رواں میں دینے کی منظوری دی گئی ہے۔ یکم اپریل ۱۹۸۵ء کو حکومت ہند اپنے ملازمین کے لئے مہنگائی بھتے کی جتنی قسطیں منظور کی تھیں ریاستی حکومت اس سے ۱۳ قسطیں پیچھے تھی۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ہم لوگوں نے ۱۲ قسطیں منظور دی لیکن سال کے آخر میں ہم لوگ حکومت ہند سے ۵ قسط پیچھے رہیں گے۔

آنے والے سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے لئے پبلک اکاؤنٹ کو چھوڑ کر مالیہ لین دین پر بجٹ تخمینہ میں ۱۱۲٫۶۲ کروڑ روپئے کی کمی ہے۔ اگر تفویض کی بنا پر سامان کی بین الریاستی منتقلی پر، حکومت ہند مجوزہ قانون نافذ کر دیتی، تو آج میرا کام بہت حد تک ہلکا ہو جاتا۔ لیکن وزرائے اعلیٰ کی اتفاق رائے

سے سفارشات اور منصوبہ بندی کمیشن کی تائید کے باوجود، اس قانون کو اب بھی صبح کی روشنی دیکھنی ہے۔ در حقیقت ہمارے ترقیاتی منصوبوں اور پروگراموں کی بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیش نظر تکمیل کے لئے اور بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے غیر منصوبہ بند اخراجات میں اضافہ کو پورا کرنے کے لئے مزید وسائل کی تلاش کرنی ہے۔ اس لئے میں سنہ ۸۶-۱۹۸۵ء کے لئے مندرجہ ذیل ٹیکس۔ اقدامات کی تجویز پیش کرتا ہوں۔

میں سیلس ٹیکس سے شروع کروں گا۔ یہ اس ریاست میں محاصل کا سب سے بڑا واحد ذریعہ ہے۔ سیلس ٹیکس محاصل میں کافی اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے بہت سارے انتظامی اقدامات اور ریلیف و نقل کے خلاف اقدامات کئے۔ عزت مآب ممبران کو یہ بات یاد ہوگی کہ گزشتہ بجٹ سیشن میں حکومت نے بہتر اور موثر انتظامی اقدامات کے ذریعہ مزید ٹیکس محاصل حاصل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ان اقدامات میں سڑکوں کی جانچ چوکیوں کو مستحکم بنانا، مغربی بنگال میں سامان لے کر آنے والی گاڑیوں کی جانچ کرنا، اس ریاست میں داخل ہونے والی ٹرانسپورٹ گاڑیوں کی جگہ جگہ جانچ کرنا اور کسٹمس، کلکتہ پورٹ ٹرسٹ اور ریلوے حکام کے مابین قریبی تعاون اور تال میل شامل ہیں۔ اس میدان میں ہمیں کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر ریاست کو ریلوے حکام کا مکمل تعاون حاصل ہوتا ہے تو ہمیں اور بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوتی۔ عزت مآب ممبران اس بات سے واقف ہیں کہ سیلس ٹیکس قوانین کے تحت سیلس ٹیکس پرمٹ کے بغیر اعلان کردہ تجارتی اشیاء کو ریلوں کے ذریعہ بھیجنا منع ہے۔ ہم لوگ ریلوے حکام سے اس بات کی درخواست کر رہے ہیں کہ وہ ایسی اشیاء کو مناسب پرمٹ کے بغیر بذریعہ ریل لے جانے کے لئے قبول نہ کریں۔

عزت مآب ممبران اس شدید دشواریوں سے واقف ہیں جن سے ریاستوں کو مزید وسائل اکٹھا کرنے میں دو چار ہونا پڑتا ہے۔ نیز اعلان کردہ چیزوں اور برآمد کئے گئے چیزوں پر سیلس ٹیکس کی

پر عائد شدہ پابندیوں اور بندشوں نے اس سلسلے میں مغربی بنگال میں ہماری صلاحیت کو اور بھی محدود بنا دیا گیا۔ ماضی میں ہم لوگوں نے کوششیں کیں کہ بجلی کی بنیاد پر اس ریاست کو حکومت ہند کی طرف سے کوئلہ پر رائلٹی حاصل ہو۔ لیکن ہماری اس تجویز کا کوئی خاطر خواہ رد عمل نہیں ہوا حالانکہ حکومت ہند نے ہمیشہ اس بات کو واجب سمجھا ہے کہ بار بار کوئلہ کی انتظامی قیمتوں پر نظر ثانی کی جائے۔ اس ریاست میں ترقیاتی اقدامات کو روبہ عمل لانے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مزید وسائل کے سلسلے میں ہماری ضرورتوں کے پیش نظر ہمارے پاس کوئلہ پر ٹیکس کو بڑھانے کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ ہماری یہ تجویز ہے کہ مغربی بنگال ابتدائی تعلیم ایکٹ کے تحت ٹیکس کی شرح کو ۳ فیصد سے بڑھا کر ۵ فیصد اور مغربی بنگال مضافاتی روزگار اور پیداوار ایکٹ کے تحت ٹیکس کی شرح کو ۱۷ فی صد سے بڑھا کر ۲۰ فیصد کر دیا جائے۔ میں یہاں ذکر کر سکتا ہوں کہ ہمارے پڑوس کی ایک ریاست میں ٹیکس کی یہ شرح ۳۰ فیصد ہے۔ یہاں سے باہر بھیجے جانے والے کوئلہ پر عائد کرنے سے مزید ۳۰ کروڑ روپئے حاصل ہوں گے۔ انتظامی قیمتوں میں حکومت ہند کے کئے گئے اضافہ سے عوام پر کافی بھاری بوجھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اس بات کے پیش نظر مزید وسائل اکٹھا کرنے کے لئے ہماری مالیاتی کوشش متوسط درجہ کا ہے۔ اس لئے میری تجویز میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لوگوں کو جہاں کہیں ممکن ہو سکے کچھ راحت پہونچائی جائے، اس کے ساتھ ساتھ کاروبار اور تجارت میں اضافہ کر کے اور بہتر انتظامی کوششوں کے ذریعہ محاصل میں اضافہ کیا جائے۔ ان باتوں کے پیش نظر میری تجویز یہ ہے کہ خیر روٹی اور خیراتی موزے اور بنیان میں ٹیکس کی شرح ۴ فیصد سے کم کر کے ایک فیصد کر دی جائے تاکہ ریاست میں یہ چیزیں بھی مسابقتی میں ان میں مقابلہ کر سکیں۔ مغربی بنگال سے دیگر ریاستوں میں ان چیزوں کی فروخت میں اضافہ کرنے کے لئے ان چیزوں پر بین ریاستی ٹیکس کم کر کے ایک فیصد کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک پوشاک کا تعلق ہے ان کی قیمتوں سے وابستہ سیلس ٹیکس کی شرحیں ۴ فیصد اور

۸ فیصد ہیں۔ ان شرحوں کو کم کرکے ۲ فیصد کر دیا گیا ہے تاکہ مقامی صنعت اور تجارت کو مزید فروغ حاصل ہو۔ اسی طرح [illegible] اور برکی وغیرہ پر سیلس ٹیکس کی شرح ۱۰ فیصد سے کم کرکے ۸ فیصد کر دیا جا رہا ہے۔ بائیسکل اور اس کے پرزے پر فی الحال بنگال فائننس (سیلس ٹیکس) ایکٹ ۱۹۴۱ء کے تحت سیلس ٹیکس کی شرح ۸ فیصد ہے۔ اب ان پر مغربی بنگال سیلس ٹیکس ایکٹ ۱۹۵۴ء کے تحت سیلس ٹیکس کی شرح کم کرکے ۶ فیصد کر دی گئی ہے۔ ٹیکس کی شرحوں میں کمی کی وجہ سے ان چیزوں کی فروخت میں کمی کی وجہ سے ان چیزوں کی فروخت میں کافی اضافہ ہوگا۔ اس طرح محاصل کی صورت میں جو رقوم موصول ہوا کرتی تھیں اب ان سے کہیں زیادہ رقوم حاصل ہوں گی۔ پڑوس کی ایک ریاست میں چند اقسام کی گاڑیوں پر سیلس ٹیکس کی شرح کم کرکے ۵ فیصد کر دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محصول کا رخ مغربی بنگال سے دوسری طرف پھیر دے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے اور اس ریاست کے مفادات کے تحفظ کے لئے ہمارے سامنے کاروباری گاڑیوں پر سیلس ٹیکس کی شرح کو ۱۱ فیصد سے کم کرکے ۶ فیصد کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اسی طرح موٹر اسکوٹر، موپیڈ اور موٹر سائیکل وغیرہ پر سیلس ٹیکس ۸ فیصد سے کم کرکے ۶ فیصد کر دی جائے گی۔ اسی طرح ان تمام چیزوں کی بین ریاستی فروخت پر بھی سیلس ٹیکس کی شرح کم کرکے ۶ فیصد کر دی جائے گی۔ میری تجویز یہ ہے کہ رجسٹرڈ ڈیلروں کے ذریعہ موٹر گاڑیوں کی بین ریاستی فروخت پر ٹیکس کی شرح کم کرکے دو فیصد کر دی جائے۔ مقصد یہ ہے کہ مغربی بنگال میں ایسی گاڑیوں کی فروخت میں اضافہ ہو۔ اسی طرح ان ڈیلروں کے ذریعہ جو رجسٹرڈ نہیں ہیں یا عارضی ہیں کے ہاتھوں موٹر گاڑیوں کی بین ریاستی فروخت پر سیلس ٹیکس کی شرح کم کرکے ۸ فیصد کر دی جائے گی۔ ٹیکس کی شرحوں میں کمی کی وجہ سے ہمارے وسائل میں کمی نہیں ہوگی بلکہ ہم اس بات کی امید کرتے ہیں کہ ان اقدامات کی وجہ سے ریاست میں ان گاڑیوں کی فروخت میں اضافہ ہوگا اور اس طرح

میں تقریباً ۰۵ء۲ کروڑ روپے کے مزید محاصل موصول ہوں گے۔

مغربی بنگال میں واقع گاؤں میں کون کون اور اس سے متعلقہ آلات و ساز و سامان کی فروخت پر سیلس ٹیکس کی رعایتی شرح ۴ فیصد ہے۔ مقامی صنعت کے تحفظ کے لئے اور ان چیزوں کی فروخت میں اضافہ کرنے کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ ٹیکس کی اس رعایتی شرح کا اطلاق بلا لحاظ جائے وقوع تمام کارخانوں پر کر دیا جائے۔ آلات و ساز و سامان کی فروخت میں اضافہ ہوگا اور اس سے ریاستی حکومت کو تقریباً ۲ کروڑ روپے کے مزید محاصل حاصل ہوں گے۔

مارچ ۱۹۸۲ء میں ریاستی حکومت نے عوام کے مفاد میں ایک عام اعلامیہ جاری کیا تھا جس کے تحت یکم اپریل ۱۹۸۲ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء تک مغربی بنگال میں تیار کردہ رنگین ٹی وی سیٹ، وی سی آر اور رنگین ٹی وی مونیٹر کی فروخت پر ڈیلروں کو کوئی ٹیکس ادا کرنا نہیں ہوگا۔ چونکہ ایسی سہولتیں تین برسوں سے جاری ہیں اس لئے میری خواہش یہ ہے کہ ایسی سہولتوں کو تھوڑی سی ترمیمی شکل میں جاری رکھا جائے۔ میری تجویز یہ ہے کہ یکم اپریل ۱۹۸۴ء سے مغربی بنگال میں تیار کردہ تمام ٹی وی سیٹ، ٹی وی مونیٹر اور وی سی آر کی فروخت پر ۴ فیصد کی شرح سے سیلس ٹیکس عائد کیا جائے۔ اس سے ہمیں پانچ کروڑ روپے بطور محاصل حاصل ہونے کی امید ہے۔

میں نے اس بات کو زیر غور رکھا کہ ٹی وی سیٹس پر ٹیکس سے جو رقوم حاصل ہوتی ہیں ان سے اس ٹیکس کی وصولیابی کے لئے انتظامی اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ اس لئے میری یہ تجویز ہے کہ ٹی وی سیٹ پر عائد تفریحی ٹیکس کو یکم جنوری ۱۹۸۲ء سے ختم کر دیا جائے۔ جن لوگوں نے سال ۱۹۸۲ء کے لئے ٹی وی ٹیکس ادا کر دیا ہے انہیں یہ رقم واپس کرنے کیلئے الگ انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے محاصل میں ۵ لاکھ روپے کی کمی ہوگی۔

حالیہ برسوں میں وی سی آر اور وی سی پی کے ذریعہ

فلموں کی کاروباری نمائشوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح ان کے
ذریعہ فلموں کی [illegible] کے
فروغ پر ناگوار اثر پڑتا ہے۔ نیز ان میں سے چند فلمیں بچوں اور
نوجوانوں کو بُری طرح متاثر کرتی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان
واسطوں کے ذریعہ فلموں کی کاروباری نمائش پر کنٹرول کرنے
اور ایسی نمائش کو ضابطہ کے تحت لانے کے لئے جامع قوانین
مرتب کئے جائیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ وی سی آر اور ٹی وی کے ذریعہ
کی فلموں کی عام کاروباری نمائشوں پر فی ہفتہ ۵۰۰ روپے کے ٹیکس
عائد کئے جائیں۔ نیز ایسے ذرائع سے ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور
دیگر عوامی جگہوں پر جہاں الگ سے داخلہ فیس نہیں لی جاتی۔ ایسی
فلموں کی نمائش پر اوسطاً سالانہ ۲۵۰۰ روپے کے ٹیکس عائد
کئے جائیں۔ ان اقدامات سے سالانہ ۴۰ لاکھ روپئے بطور محاصل
حاصل ہوں گے۔

فی الحال بنگال تفریحی ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء میں رکھی
گئی گنجائش کے تحت غیر سینمائی تفریحات جیسے موسیقی کی محفل، طلسمی
نمائش، ناٹک، سرکس، اسپورٹس، کھیل کود وغیرہ کے ٹکٹ پر ۱۰
روپے کے ٹکٹ تک کوئی ٹیکس عائد نہیں تھا۔ اب اس حد کو بڑھا
کر ۱۰ روپے سے ۱۵ روپئے کر دیا گیا ہے۔

مغربی بنگال میں یکم اپریل ۱۹۸۲ء سے ۳۱ مارچ
۱۹۸۵ء کے درمیان تعمیر کردہ نئے سینما ہال کے مالکوں کو سینما
کے چالو ہونے کے پہلے تین سال میں جتنی رقوم بطور تفریحی ٹیکس
موصول ہوتی تھیں وہ سینما کے مالکوں کو بطور امداد واپس کر دی
جاتی تھیں تاکہ تعمیراتی اخراجات کے کچھ حصہ کو پورا کیا جا سکے۔
میری تجویز یہ ہے کہ یکم اپریل ۱۹۸۶ء سے آئندہ تین برسوں کے لئے
اس سلسلے میں ایک نئی اسکیم جاری کی جائے۔ اس نئی اسکیم کے تحت
نئے سینما کے مالک پہلے تین سال میں حاصل کردہ تفریحی ٹیکس کی رقوم اپنے پاس
رکھ سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس نئی اسکیم سے نئے سینما
ہالوں کی تعمیر کے کام کو فروغ حاصل ہوگا۔

ملک گیر ہڑتالوں کی وجہ سے مہینوں میں جو کمی ہوئی
ہے۔ حساب و کتاب میں [illegible] تطبیق کے بعد ٹیکس عائد کرنے

۵ر۴۰ کروڑ روپئے [illegible] نیز ہم اس
بات کی امید کرتے ہیں کہ [illegible] اور چیک
پوسٹ کے کام کاج سے وابستہ انتظامی اقدامات اور بہتر تال
میل کے ذریعہ مزید ۵ر۱۶ کروڑ روپئے حاصل ہوں گے۔ نیز ۴ء۴۷
کروڑ روپئے کی مالیت کے دوسرے محاصل اکٹھا کئے جائیں گے۔ اس
طرح ہماری کل وصولی ۵۸ر۱۰۷ کروڑ روپئے ہوں گے۔ اس
طرح [illegible] کروڑ روپئے کا فاضل بجٹ ہوگا۔ اس رقم میں
۲۸ر۷۵ کروڑ روپئے کا [illegible] باقی شامل ہے۔ نیز ہماری ریاست
کے عظیم تر شہر کلکتہ، ترقیاتی علاقہ اور شہروں میں مواصلات و رسائل
جیسی بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لئے بجٹ میں رکھے مختص
رقوم کے علاوہ مزید ۸ کروڑ روپئے منصوبہ کے تحت خرچ کئے
جانے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں مزید مہنگائی
بھتہ کی قسطوں کو پورا کرنا ہے۔ اس طرح یہ فاضل رقم ان مدوں
کے تحت خرچ کیا جا سکے گا۔

میں نے حزب اختلاف میں یہ حقیقت بیان کر دی ہے
کہ کتنی شدید پابندیوں اور دیگر بندشوں کے تحت ہمیں ریاستی
بجٹ مرتب کرنا پڑا۔ ہماری یہ کوشش رہی اور رہے گی
کہ ہم ان بندشوں کے دائرہ عمل میں رہتے ہوئے اپنی منزل
مقصود تک پہنچنے کے لئے عام لوگوں کو ساتھ لیکر آگے بڑھیں۔
اس عظیم منزل تک پہنچنے کے لئے ہم ہماری ریاست کی فلاح
و بہبود میں دلچسپی لینے والے تمام لوگوں کے تعاون کے متلاشی
ہیں۔ +++

ضیاء گنج میں پانی کی سپلائی

ضلع مرشد آباد کے ضیاء گنج۔ عظیم گنج میونسپلٹی
میں پانی کی سپلائی کی اسکیم کو روبہ عمل لانے کے لئے موجودہ مالی سال
میں ریاستی حکومت ۱۱۵۰۰۰ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔
اس مقصد کے لئے اب تک کل ۲۸۳۴۰۰۰ روپئے بطور عطیہ
دیئے گئے ہیں۔ +++

سرکاری خبریں

سفرِ حج

جناب ایس اے ایم حبیب اللہ، وزیر عملہ و اقلیتی امور مغربی بنگال نے ۱۸ مارچ ۱۹۷۲ء کو نئی دہلی میں منعقدہ مرکزی حج کمیٹی کی نشست میں جو گفت و شنید ہوئی اس کی بابت مندرجہ ذیل پریس نوٹ جاری کیا ہے:

نئی دہلی میں ۱۸ مارچ کو مرکزی حج کمیٹی کی ایک نشست ہوئی۔ اس نشست میں اس سال عازمین حج کے لئے جو انتظامات کئے گئے ہیں ان کا جائزہ لیا گیا لیکن عزت مآب وزیر برائے امور خارجہ شری بی آر بھگت سنگھ کی تقریر سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ آئندہ سال سے جہاز کے ذریعہ حج کے سفر کو ختم کر دیا جائے گا لیکن مشرقی ہندوستان کے نمائندوں نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ جہاز رانی کے انتظامات جاری رہیں کیونکہ مشرقی ہندوستان کے زیادہ تر عازمین ایسے ہیں جو ہوائی جہاز کا کرایہ جو جہاز کے کرایہ سے تین گنا زیادہ ہے، ادا نہیں کر سکتے۔ مشرقی ہندوستان سے ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کرنے والے عازمین حج کی تعداد میں کمی اور مغربی و شمالی ہندوستان میں ایسے عازمین کی تعداد میں اضافے کا ذکر کرتے ہوئے میں نے یہ کہا کہ یہ ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ تو مشرقی ہندوستان کے جن میں مغربی بنگال، اڑیسہ، بہار، آسام اور دیگر ریاستیں یہاں تک کہ مشرقی اتر پردیش بھی شامل ہیں، عازمین حج کو انکے حقوق سے محروم کرنے کا سوال ہے۔ میرے خیال میں شاید مغربی اور شمالی ہندوستان کے عازمین حج کا مرکزی حج کمیٹی اور حکومت ہند پر نسبتاً کچھ زیادہ اثر ہے۔ میرا یہ مطالبہ ہے کہ یا تو جہاز کے انتظام کو جاری رکھا جائے یا ہوائی جہاز کے کرایہ کو آتنا کم کر دیا جائے کہ جس سے مشرقی ہندوستان سے حج کو جانے والے لوگ حج کے حقوق سے محروم نہ رہ جائیں۔ مرکزی حج کمیٹی کے چیئرمین نے جس اس بات کا یقین دلایا ہے کہ وہ حکومت ہند سے اس موضوع پر بات چیت کریں گے۔

ٹاؤن ہال سے پبلک سروس کمیشن کے دفتر کی منتقلی

مغربی بنگال پبلک سروس کمیشن کے دفتر کے امتحان سیکشن کو ٹاؤن ہال، اسپلینڈ رو (ویسٹ) کلکتہ ۱ سے شیڈ بی، بھوانی بھون، علی پور، کلکتہ ۲۷ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

وشودھانندا اسپتال کے لئے سرکاری عطیہ

ریاستی حکومت نے شری وشودھانندا اسپتال اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو سالِ رواں کے اخراجات کی تکمیل کے لئے ۳۰ ہزار روپے غیر مکرر عطیہ کے طور پر دینے کی منظوری دی ہے۔

جھاڑگرام کی سڑکوں کی بہتری کیلئے ۱۸ء۵ لاکھ روپئے

ضلع مدناپور کے جھاڑگرام سب ڈویژن میں واقع سنکرائیل کلمی کری روڈ کی بہتری کے لئے ریاستی حکومت نے موجودہ مالی سال کے دوران ۵۱۸۵۹۰ روپئے دینے کی منظوری دے دی ہے۔ اس اسکیم کو ایگزیکیٹیو انجینئر، مدناپور ہائی وے ڈویژن I پی۔ ڈبلو (روڈ) کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔

جھاڑگرام کے لئے ترقیاتی اسکیم

ضلع مدناپور کے جھاڑگرام سب ڈویژن کے نیاگرام بلاک میں واقع ککراسول بند کی بہتری کے لئے ریاستی حکومت نے ۸۰ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔ اس اسکیم کو نیاگرام پنچایت سمیتی کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہونچایا جائے گا۔

ضلع مدناپور کے جھاڑگرام میں واقع اسٹوڈنٹس ہیلتھ ہوم کی عمارت کی تعمیر کے لئے ریاستی حکومت نے ۴۶۵۵۰ روپئے کی منظوری دی ہے جو دوسری قسط ہے۔

شمالی بنگال کے دستی ٹیوب ویلوں کی تنصیب کے لئے ۱۰ر۵ لاکھ روپئے کی منظوری

شمالی بنگال ترائی ترقیاتی پروجیکٹ کے تحت دستی ٹیوب ویلوں کی تنصیب کے لئے سنہ ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ریاستی حکومت نے مزید ۱۰ر۵۰ لاکھ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔

مغربی بنگال ہائی مدرسہ کا امتحان ۲۸ اپریل ۸۶ء سے

مغربی بنگال کے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے صدر جناب مصطفی بن قاسم نے یہ اطلاع دی ہے کہ ہائی مدرسہ امتحان برائے سنہ ۱۹۸۶ء جو ملتوی ہو گیا تھا اب نئے سرے سے ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۸۶ء سے شروع ہوگا۔ جن پرچوں کا امتحان پہلے شروع ہو چکا تھا انہیں بھی ناگزیر حالات کی بنا پر رد کر دیا گیا ہے۔

ہائی مدرسہ امتحان کے نتائج اس سال ٹھیک وقت پر نکالے جائیں گے تاکہ امتحان دینے والے طلبہ کو ہائر سکنڈری کے درجوں میں داخلہ لینے کے سلسلے میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ پہلے ہونے والے امتحان کو رد کرنے کی وجہ سے طلبا اور ان کے گارجین کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اس پر مغربی بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ نے گہرے تاسف کا اظہار کیا ہے۔ امتحان کے پروگرام چند ہفتوں کے اندر ہی مع مراکز امتحان تمام ممتاز روزناموں میں شائع کئے جائیں گے۔

بقیہ: ہتھ کرگھا صنعت صفحہ ۸۶ سے

ہتھ کرگھے کے کپڑے کی فروخت سے ۴۰ کروڑ روپئے حاصل ہوئے۔

تنتوشری کے چیئرمین ہرو موہن سنگھ نے بتایا کہ اس ریاست کی ہتھ کرگھا صنعت کی فروخت کی راہ میں اہم خاص اشیاء یعنی دھاگے کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے جنوبی اور مغربی ہندوستان کی ریاستوں سے ۸۰ فیصد دھاگے برآمد کئے جاتے ہیں۔ مغربی بنگال میں بھی دھاگے کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے ۲ کارخانے، ایک بانکوڑا میں اور دوسرا مدناپور میں، قائم کئے گئے۔ ان میں سے ہر کارخانے میں سوت کاتنے کی ۲۵ ہزار تکوے ہیں۔ ہر کارخانے کے قیام پر تقریباً ۸ کروڑ روپئے خرچ کئے گئے۔ اس کے علاوہ سری رامپور میں امداد باہمی سوسائٹیوں کے تحت دھاگے کے قائم کارخانے میں تکوے کی تعداد ۱۲ ہزار سے بڑھا کر ۲۰ ہزار کر دی گئی ہے اور اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ آئندہ جون تک تکوے کی تعداد کو بڑھا کر ۲۵ ہزار کر دیا جائے گا۔ ان کارخانوں میں تیار کردہ دھاگے ریاست کی کل مانگ کا ۳۰ فیصد حصہ پورا کریں گے۔ شری سنگھ نے مزید بتایا کہ تنتوجا اور تنتوشری کے تیار کردہ کپڑوں کی برآمدات کے امکانات کافی روشن ہیں۔

ہتھ کرگھے اور سوتی کپڑے کی نظامت کے ڈائرکٹر شری چنچل رائے چودھری نے مہمانوں اور حاضرین جلسہ کو خوش آمدید کہا۔

مغربی بنگال کی دیہی اور چھوٹی صنعت کے شعبے کے سکریٹری شری پردیپ بنرجی نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

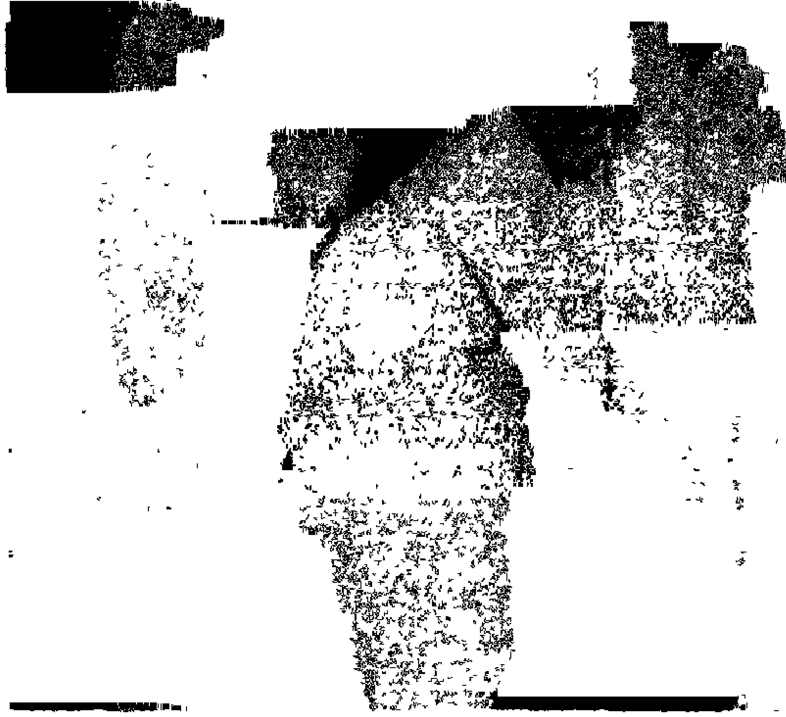
ہتھ کرگھا ہفتہ ۱۹۸۶ء

شری پرالے تالکدار سنہ ۱۹۸۵ء کے ہتھ کرگھے کے اچھے بنکروں کو انعامات تقسیم کرتے ہوئے

ریلیز رسالہ کلکتہ میں گزشتہ ۸ ارمارچ کو ہتھ کرگھا ہفتے کے دوران منعقدہ جلسہ تقسیم اسناد وانعامات میں مغربی بنگال کے دیہی اور چھوٹی صنعت کے وزیر ریاست شری پرالے تالکدار نے ۸۵-۱۹۸۴ء میں ہتھ کرگھا مسابقت میں کامیاب ہونے والے ۲۷ ماہر بنکروں کو ان کے خصوصی ہنر وفن کے لئے اسناد وانعامات تقسیم کئے۔ ایسی مسابقت کا مقصد یہ ہے کہ بنکروں کی ہمت افزائی کی جائے اور خریداروں کی مانگ کو مدنظر رکھتے ہوئے اور ہتھ کرگھے کے تیار کردہ کپڑوں جیسی ساڑی، دھوتی، پردہ، چادر وغیرہ کی کوالیٹی میں مزید بہتری لائی جائے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے وزیر موصوف نے بتایا کہ گزشتہ آٹھ برسوں میں ہتھ کرگھے صنعت کی پیداوار ۷ء ۲۰ کروڑ میٹر سے بڑھ کر ۳۷ کروڑ ہوگئی۔ ریاستی حکومت نے ان مصنوعات کی فروخت کے لئے مختلف علاقوں میں بازار کی سہولتیں فراہم کیں جس کے نتیجے میں ہتھ کرگھے کپڑے کی فروخت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ صنعت کی بقا کے لئے مختلف النوع پیداوار بنیادی شرط ہے اسی لئے گزشتہ آٹھ برسوں میں ہتھ کرگھے سے بنے اونی کمبل، ترکی تولیہ، چیک لنگی، پولسٹر قمیض اور سوٹ، جیکٹ بھی فروخت کے لئے بازار میں پیش کئے گئے۔ وزیر موصوف نے بنکروں کی مالی حالت میں بہتری لانے کے لئے ریاستی حکومت کی طرف سے کئے گئے مختلف اقدامات کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا۔

تنتوجا کے چیرمین شری پنالال ماجی نے جو اس جلسہ کے خاص مہمان تھے، اپنی تقریر میں کہا کہ ہتھ کرگھا صنعت مغربی بنگال کی ایک اہم دیہی صنعت ہے اور روزگار کی فراہمی کے سلسلے میں یہ صنعت دوسرے نمبر پر آتی ہے۔ اس صنعت کی ترقی کے لئے ان بنکروں کی جن کے پاس چرخے نہیں ہیں ۳۱ امداد باہمی سوسائٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ ان سوسائٹیوں کو ۱۰۰ چرخے بطور امداد فراہم کئے گئے اور انہیں کارخانے قائم کرنے کے لئے مالی امداد بھی فراہم کی گئی۔ حالیہ مالی سال میں مزید چھ سوسائٹیوں کی تشکیل زیر غور ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سنہ ۸۶-۱۹۸۵ء سال میں تنتوجا، تنتو شری کے ذریعہ

(باقی صفحہ ۳۱ پر)



شری شمبھو گھوش، وزیر اعلیٰ تعلیم ۱۵ مارچ [illegible] کو کلکتہ انفارمیشن سنٹر میں آرکائیو یعنی قدیم تاریخی دستاویزات پر سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے۔

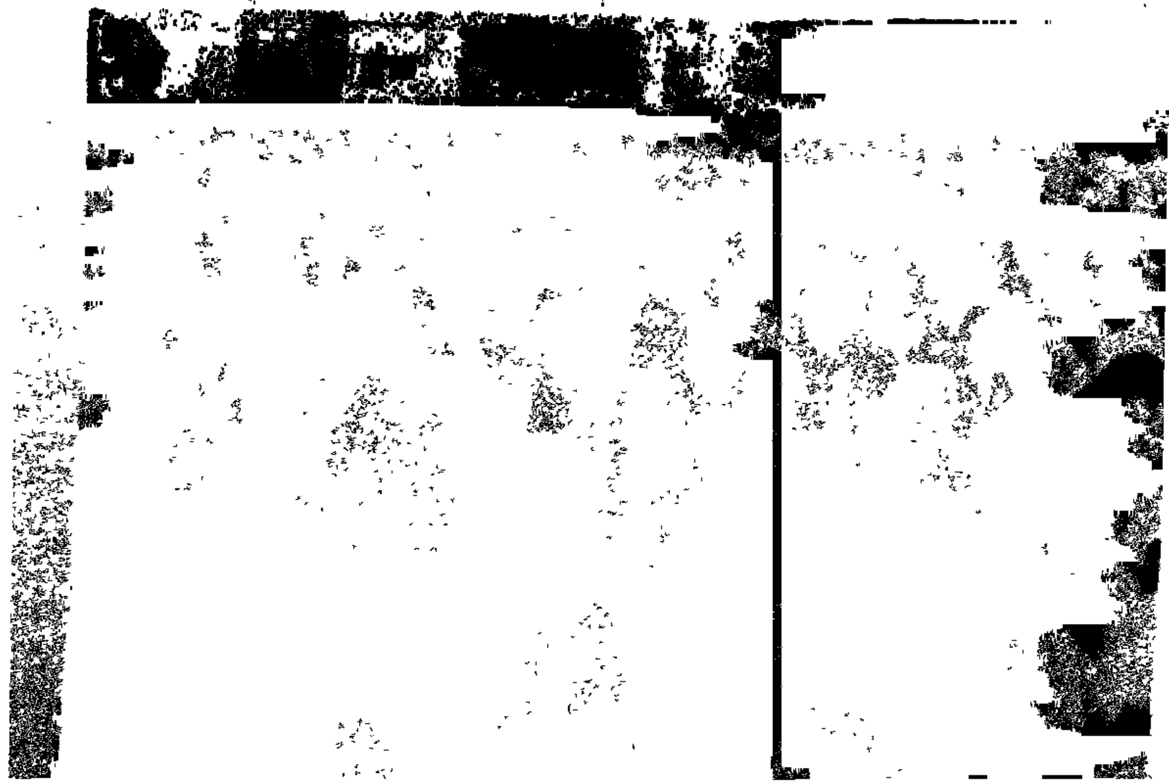
Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azam, Published by the Information & Cultural Affairs Department, Govt. of West Bengal and Printed by M/s. G. R. T. Printers, 54/1C, Shyampukur Street, Calcutta-700 004.

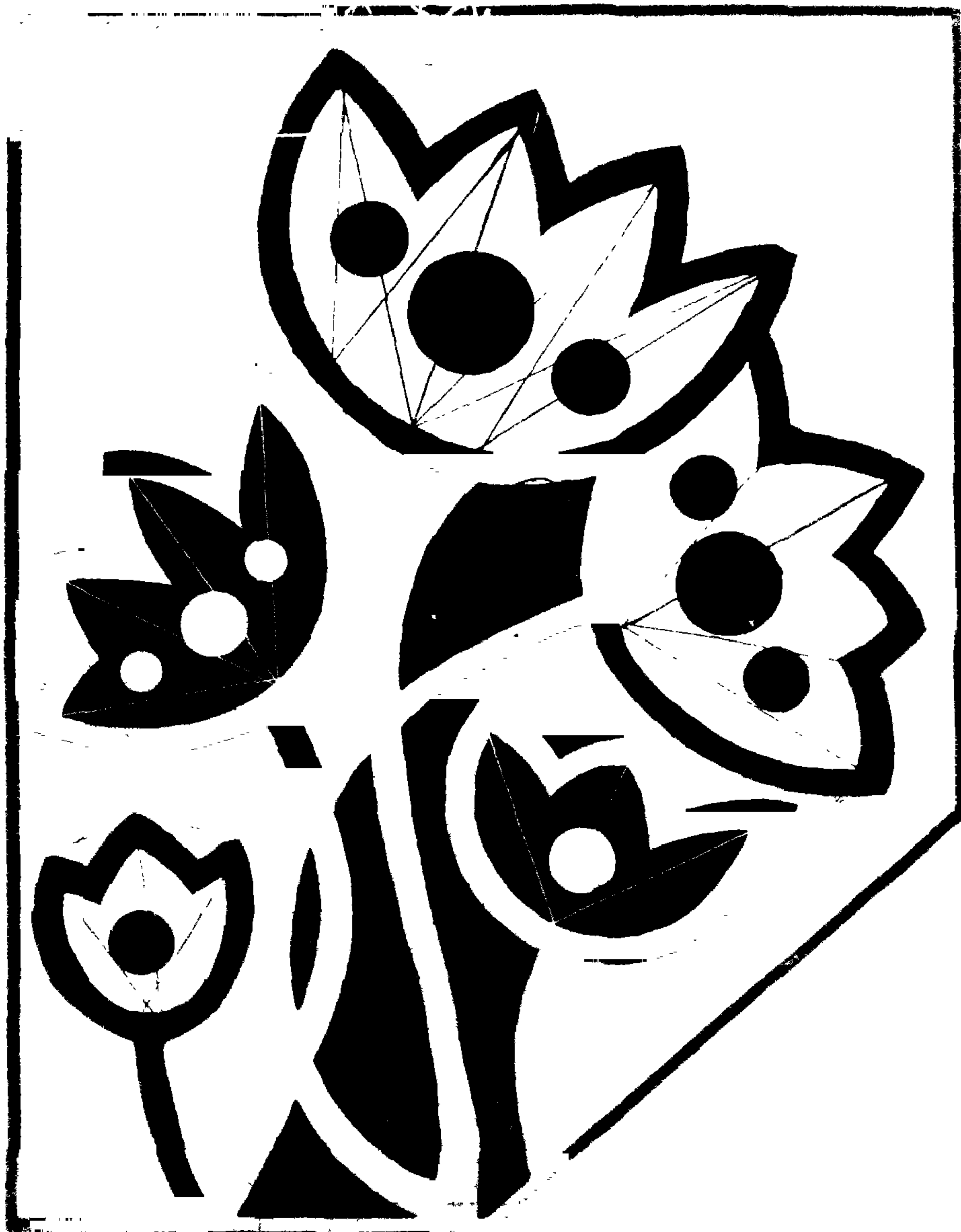
Postal Regd. No. WB/CC-30
Vol—33 No.—5
PRICE—12 Paise



MAGHRIBI BANGAL
1 APRIL 1986

مرکزی حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف کلکتہ کے [illegible] ایک
احتجاجی جلسہ میں ریاستی حکومت کے وزیر شعبہ کھیل کود اور نوجوانوں کی [illegible] تقریر کرتے ہوئے





مغربی بنگال

کلکتہ

مدیر اعلیٰ : پرتیم بھٹاچاریہ

مدیر : دھریندر ناتھ دت

مدیر معاون : محمد اعظم

جلد نمبر ۲۳ ★ ۱۵ راپریل ۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۸

شرح خریداری

سالانہ: تین روپے ★ اس شمارے کی قیمت : ۱۲ پیسے

ترسیل زر کا پتہ :

بزنس منیجر

شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال

۲۳- آر، این، مکرجی روڈ — کلکتہ - ۷۰۰۰۰۱



وزیر ریاست برائے اطلاعات و ثقافتی امور شری پربھاش پھور دیکار نے ۲ راپریل ۱۹۸۶ء کو [illegible] کلکتہ میں منعقدہ ایک تقریب میں شری دھیریندر ناتھ بندوپادھیہ کو ناٹک کا انعام "دینابندھو ایوارڈ" دیئے [illegible]

تصویر از: مدھوسودن گھوش

بھاگ متی

پیار سے آنکھ بھر آتی ہے کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نام وفا آتا ہے

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

دھن کی گھنگھور گھٹائیں ہیں نہ ہُن کے بادل
سونے چاندی کے گلی کوچے نہ ہیروں کا محل
آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
خواجۂ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں

شہر باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے
دلبری باقی ہے دلداریٔ جاں باقی ہے
سرفہرست نگاران جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے تری چشم نگراں باقی ہے

مخدوم محی الدین

شعبہ اطلاعات وثقافتی امور نے زندگی کے ہر طبقے کے لوگوں سے قریبی رابطہ رکھا ہے

شری پرواش چندر بھودیکار، وزیر ریاست، شعبۂ اطلاعات وثقافتی امور

وزیر ریاست، شعبۂ اطلاعات وثقافتی امور شری پرواش چندر بھودیکار نے ۴ اپریل ۱۹۸۶ء کو ریاستی اسمبلی میں شعبۂ اطلاعات وثقافتی امور کا سالانہ بجٹ برائے ۸۷-۱۹۸۶ء پیش کیا۔ اس موقع پر بجٹ تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے شعبہ کی کارگذاریوں کا ذکر کیا۔ وزیر موصوف کی بجٹ تقریر کا متن اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے

شعبہ اطلاعات وثقافتی امور کو حکومت اور لوگوں کے درمیان تال میل برقرار رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اس شعبہ کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ حکومت کے شعبوں کی مجموعی پالیسیوں، اپنائے گئے پروگراموں اور رفتار ترقی کی بابت مختلف واسطوں سے لوگوں کو معلومات فراہم کرے اور لوگوں کے ردعمل اور خیالات کا مناسب مطالعہ کرنے کے بعد عوام کے اعتماد اور سرگرم تعاون حاصل کرکے حکومت کے پروگراموں کی تکمیل کے کام میں مدد کرے۔

انتظامیہ میں علاقائی زبانوں معہ بنگلہ کو رائج کرنا، آثارِ قدیمہ کو محفوظ رکھنا، آثارِ قدیمہ کی کھوج کرنا اور ثقافت کے میدان میں ترقیاتی سرگرمیوں کو جاری رکھنا — یہ تمام اس شعبہ کی ذمہ داریاں ہیں۔

شعبہ اطلاعات وثقافتی امور کے کام کاج کو فی الحال پانچ شاخوں یعنی اطلاعات، ثقافت، فلم، آثارِ قدیمہ اور زبان میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

اطلاعات شاخ

عوام کی وسیع تائید سے مغربی بنگال میں بائیں محاذ

حکومت کے قیام کے بعد سے ہی اس بات پر خصوصی زور دیا گیا ہے کہ حکومت کے بیانات، پالیسیوں اور پروگراموں سے اس ریاست کے اندر اور باہر کے علاقوں کے تمام طبقوں کے لوگوں کو باخبر رکھا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں ہماری وسعت محدود ہے کیوں کہ دو اہم واسطے — ٹیلی ویژن اور ریڈیو — مرکزی حکومت کے زیر انتظام ہیں۔ جہاں تک ان دونوں واسطوں کے ذریعہ خبروں کی نشر کا تعلق ہے۔ یہ ہمارا دردناک تجربہ ہے کہ اس ریاست سے وابستہ بہت سارے اہم مسائل اور حقائق کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں جگہ کبھی نہیں ملتی یا شاذونادر ملتی ہے، اگرچہ اس کے برعکس ہماری حکومت کے خلاف بیانات کو شان وشوکت کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم لوگوں کو ان دونوں واسطوں کے لازمی تعاون سے محروم رہنا پڑتا ہے۔ اپنے کلام کو طویل بنائے بغیر میں، مثال کے طور پر یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں کہ نئی دہلی کے بعد شاید کلکتہ ہی میں یوم جمہوریہ کے موقع پر شاندار پریڈ اور رنگین پروگرام کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس سال بھی اسی پروگرام میں ایسٹرن کمانڈ کی بری، بحری اور ہوائی افواج نے حصہ لیا۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ قومی جمہوریہ کے موقع پر کل ہند ٹیلی کاسٹ کے دوران کلکتہ کے اس پریڈ کو دکھلایا نہیں گیا۔

چھٹے منصوبے کے دوران اضلاع اور سب ڈویژنوں میں مراکز اطلاعات قائم کرنے کے کام کو مکمل کر لیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ساتویں منصوبہ کے عرصے میں بلاک سطح پر بھی مراکز اطلاعات کھولے جائیں — دریں اثنا ہلدیہ میں ایک مرکز اطلاعات کا افتتاح کیا گیا۔ نیز کلیانی، بولپور اور سندربن میں سب ڈویژن کی سطح پر مراکز اطلاعات قائم کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔ سلی گوڑی میں مرکز اطلاعات کی عمارت کی تعمیر کا کام قریب الاختتام ہے۔ اس عمارت میں ایک آڈیٹوریم بھی ہوگا۔ اس عمارت کے تعمیر شدہ حصے میں سلی گوڑی مرکز اطلاعات نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

اضلاع میں فی الحال ۴۲ سمعی۔ بصری یونٹیں کام کر رہی ہیں۔ نیز اضلاع میں ریڈیو تقسیم کرنے کے پروگرام کو روبہ عمل لاتے ہوئے اب تک ۳۸۹۰ ریڈیو سٹ تقسیم کئے گئے اور اجتماعی نمائش کے لئے ۳۱۵ ٹی۔ وی سٹ نصب کئے جا چکے ہیں۔ اس طرح کے اور ۳۲ سٹ اس ریاست میں نصب کئے جائیں گے ایک تجویز یہ ہے کہ آئندہ سال اس پروجیکٹ کے تحت اور ۳۰۰ ریڈیو سٹ اور ۵۰ ٹی۔ وی سٹ تقسیم کئے جائیں گے۔ مضافاتی علاقوں میں اجتماعی طور پر لوگوں کے لیے ٹی۔ وی سٹ کی سپلائی کے لئے مالی اخراجات کو پورا کرنے کی سلسلے میں ریاستی حکومت نے مرکزی حکومت کے پاس ایک تجویز داخل کی تھی، لیکن مرکز کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں ملا۔

گزشتہ مالی سال میں نمائش سیکشن نے ۹۲ نمائشوں کا انتظام کیا۔ ان میں ۱۲ نمائشیں باہر کے علاقوں میں منعقد کی گئیں۔ اس کے علاوہ اس سیکشن کی مدد سے ضلع اور سب ڈویژنل دفاتر اطلاعات نے ۱۰۲ چھوٹی نمائشیں اور بہت ساری پوسٹر سیٹ نمائشیں منعقد کیں۔ اس طرح "رابندر ناتھ کی سائنسی بیداری" "نذر ل کی زندگی اور خدمات" "مغربی بنگال ترقی کی راہ پر" "بنگلہ فلم کا ارتقاء" "تصویری نمائشیں" نیز "سائنس کی پیش قدمی" "عوام کی رفاہ میں بائیں محاذ حکومت کا کردار" اور "انسان کی ترقی" (نیا ایڈیشن) جیسے پوسٹر سیٹوں کی بھی نمائشیں گزشتہ سال منعقد کی گئیں۔

نئی دہلی کے پراگتی میدان میں مستقل پویلین کی تعمیر کے پہلے دور کے کام کو مکمل کر لیا گیا ہے۔ باقی کام سال رواں میں مکمل کر لیا جائے گا۔ کلکتہ یرتھو بسنترا (شمالی) میں، تحریک آزادی کی تاریخ کی مستقل نمائش اب بہت مقبول بن چکی ہے۔ نمائش سیکشن کو مزید مستحکم بنانے کے لئے ایک پروجیکٹ زیر غور ہے۔ ایک رنگین تصویری تجربہ گاہ قائم کرنے کی ایک تجویز زیر غور ہے۔

بائیں محاذ حکومت کی آٹھویں سالگرہ کے موقع پر اس ریاست میں سب ڈویژن سطح پر ہر جگہ اور تامل ناڈو، حیدر آباد، بنگلور، بھوبنیشور اور جزائر انڈمان میں تقریبات اور نمائشیں منعقد کی گئیں۔ باہر کے علاقوں میں ایسی تقریبات منعقد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ متعلقہ علاقہ کے لوگوں کو مغربی بنگال سے روشناس کرایا جائے، مختلف ریاستوں کے لوگوں کے درمیان تبادلۂ خیالات کے مواقع فراہم کئے جائیں اور قومی اتحاد اور یک جہتی کو مستحکم بنایا جائے۔ ایسے جشنوں میں نمائشوں کے ذریعہ ریاستی حکومت کی طرف سے کئے گئے بہت سارے رفاہی پروجیکٹوں کو عیاں کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی یک جہتی پر بہت سارے سمپوزیم بھی منعقد ہوئے۔ مختلف ریاستوں سے ماہرین تعلیم، دانشوروں، سیاست دانوں اور صحافیوں نے ویسے سمپوزیم میں شرکت کی۔ ایسی تقریبات میں اس ریاست سے ثقافتی جشن، فلم شو کے بھی انتظامات کئے گئے، کیوں کہ یہ قومی یک جہتی کے فروغ میں معاون ثابت ہوں گے۔

سرکاری پالیسی اور پروگراموں اور انکی تکمیل کی بابت اطلاعات کا اشتہارات بہت ہی اہم واسطہ ہے۔ اشتہارات کے سلسلے میں ہماری پالیسی بے لاگ جمہوری اصولوں پر مبنی ہے۔ حقیقت تحقیق کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں ریاستی حکومت نے بڑے، متوسط درجہ کے اور چھوٹے اخباروں کے درمیان اشتہارات کی تقسیم کی پالیسی کو آخری شکل دی ہے۔ بلاشبہ ریاستی حکومت کے اشتہار کی پالیسی سے چھوٹے اخباروں کو کافی فائدہ پہونچا ہے۔

یہ شعبہ چھ زبانوں میں ریاستی حکومت کے چھ رسالے

شائع کیا جاتا ہے۔ رسالہ "پنچایتی راج" بھی اسی شعبہ سے شائع کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں ۲۸ پبلیسٹی پمفلٹس کی مختلف زبانوں میں ۳۰،۸۲،۷۰۰ کاپیاں شائع کی گئیں۔ نیز مذکورہ چھ رسالوں کی کُل ۲،۳۱،۵۰۰ کاپیاں شائع کی گئیں۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اور ہندوستان کے باہر کے ملکوں میں بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے ان جریدوں اور رسالوں کی زیادہ سے زیادہ کاپیاں شائع کی جا رہی ہیں۔ نیز مختلف موقعوں پر ان رسالوں کے خصوصی نمبر بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں آٹھویں سالگرہ کے موقع پر مختلف زبانوں میں شائع کردہ کتابچے اور پمفلٹس کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انتظامات کئے گئے ہیں کہ ماہر دانشوروں، مورخوں اور مجاہدین آزادی کے تیار کردہ مزین البم سستی قیمت پر اس شعبہ سے تقسیم کئے جا سکیں اس البم میں ہماری جدوجہد آزادی کی بابت بہت سارے حقائق بھی درج ہیں۔ اس سال یوم مئی کی صد سالہ سالگرہ بڑے بڑے تزک و احتشام سے منائی جائیگی شعبہ محنت کے ساتھ مل کر ہمارا شعبہ مختلف تقریبات، نمائشیں اور پوسٹروں کے ذریعہ یہ یوم منائے گا۔

زبان:

اس شعبہ کے زبان سیکشن کے ذمہ یہ فرائض دئے گئے ہیں: سرکاری کام کاج میں بنگلہ اور نیپالی زبانوں کو رائج کرنا، اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال۔

سرکاری کام کاج میں بنگلہ کو جلد از جلد رائج کرنے کے پیش نظر اس سلسلے میں فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ اس ریاست کے اضلاع میں ہر بلاک کو ایک بنگلہ ٹائپ رائٹر مشین سپلائی کی جائے۔ اس مقصد کے لئے مختلف بلاک دفتروں میں کم از کم ایک بنگلہ ٹائپ رائٹر مشین سپلائی کی گئی ہے اور ان دفتروں میں ایسے اور ۴۰۲ مشینیں سپلائی کرنے کے لئے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ نیز اس شعبہ سے ۲۰۰ بنگلہ ٹائپ رائٹر مشینیں مختلف سرکاری دفتروں (معہ کلکتہ) میں سپلائی کی گئیں۔

ضلع دارجلنگ کے پہاڑی سب ڈویژنوں — دارجلنگ، کرسیونگ اور کلمپونگ میں ضلع مجسٹریٹ کے تحت ایک "نیپالی سیل" قائم کیا گیا ہے۔ ایک خصوصی افسر کو اس سیل کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ غیر نیپالی افسروں کے لئے دارجلنگ، کرسیونگ اور کلمپونگ سب ڈویژنوں میں واقع نیپالی تربیتی مراکز میں نیپالی زبان کی تعلیم دینے کا کام جاری ہے۔ نیز دارجلنگ میں نیپالی ٹائپ رائٹنگ سنٹر میں انگریزی ٹائپسٹوں کو نیپالی ٹائپ رائٹنگ میں تربیت دی جاتی ہے۔

اس ریاست کے ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے حکومت کے کام کاج میں اردو کے زیادہ سے زیادہ استعمال کے لئے اس شعبہ کے تحت تین "اردو سیل" قائم کئے گئے ہیں۔ یہ سیل اسلام پور اور آسنسول کے سب ڈویژنل دفتروں میں قائم کئے گئے ہیں۔ کلکتہ میں اس سیل کا ہیڈ کوارٹرس ہے۔ ان تمام سیلوں میں اردو میں لکھے خطوط کا اردو میں جواب دینے کے انتظامات کئے گئے ہیں۔

فلم:

مغربی بنگال میں فلم صنعت کے بحران کو دور کرنے اور ان کی ترقی کے لئے ریاستی حکومت عرصہ دراز سے کوشش کر رہی ہے۔ حکومت کی کوششوں میں اپنی پروڈکشن یونٹ سے فلمیں تیار کرنا، پرائیویٹ اداروں کے ذریعہ تیار کردہ فلموں کے لئے عطیات دینے کی منظوری دینی، سینما ہال کی تعمیر کے لئے مالی امداد فراہم کرنا، رنگین فلم تجربہ گاہ کی تعمیر، مغربی بنگال فلم مرکز کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔ ۸۶-۱۹۸۷ء میں بھی ان پروجیکٹوں کے لئے رقوم مختص کی گئیں۔

زیادہ سے زیادہ فلمیں بنانے کے لئے ریاستی حکومت نے اپنی عطیہ اسکیم پر نظر ثانی کی ہے اور اس مقررہ معیار کی بنیاد پر مغربی بنگال میں تیار کردہ مکمل اور سنسرڈ فیچر فلموں کو مالی امداد فراہم کرنے کے لئے پروگرام کو اپنایا ہے۔

اپنی فیچر فلمیں تیار کرنے کے لئے حکومت مغربی بنگال کا پروجیکٹ سارے ملک میں اپنا نوعیت کے لحاظ سے انوکھا ہے:

اس پروجیکٹ نے ایک طرف تو منتی اور صحت مند فلمیں تیار کر کے ہندوستان کی فلمی صنعت میں ایک شاندار مثال قائم کی ہے تو دوسری طرف اس نے نوجوانوں اور ابھرتے ہوئے فلم سازوں کا مدد بھی کی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ریاستی حکومت کی تیار کردہ فیچر فلم کونی کو قومی فلم تہوار کے موقع پر ایک تقریب میں صدر ہند کی طرف سے بہترین فلم کا "سنہرا کنول" بطور پہلا انعام ملا۔ اس فیچر فلم میں سماج پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس میں صحت مند تفریح کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سے قبل ۲۴ دستاویزی فلمیں تیار کرنے کی تجویز کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر فلمیں مکمل ہونے کو ہیں۔ گزشتہ سال ۱۱ اطلاعاتی فلمیں بچوں کی ۹ میں سے ۷ فلمیں مکمل کی جا چکی ہیں۔

۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاستی حکومت نے، مرکزی حکومت کے ساتھ مل کر مختلف زبانوں میں تیار کردہ فلموں، اور چین و پولینڈ کی فلموں کے تہوار کا انتظام کیا تھا۔ نیز حکومت کے زیر انتظام، تیار کردہ فیچر فلموں کی نمائش منعقد کی گئی تھی۔ گزشتہ سال حکومت کی تیار کردہ فلموں کی نمائشیں مختلف اضلاع میں منعقد کی گئیں۔ سالِ رواں میں ٹیگور کی ۱۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر، اس سلسلے میں منصوبہ مرتب کیا گیا ہے کہ شاعر کی تحریر پر مبنی فلموں کا تہوار منعقد کیا جائے۔

مغربی بنگال کی اور بلاشبہ سارے مشرقی ہندوستان کی فلم صنعت کے مفاد کی خاطر ریاستی حکومت نے سالٹ لیک کلکتہ میں ایک رنگین فلم تجربہ گاہ قائم کیا۔ یہ حکومت کا ایک اور اہم پروجیکٹ ہے۔ یہ پروجیکٹ مغربی بنگال فلم ترقیات کارپوریشن کے تحت زیر تعمیر ہے اور تعمیر کا کام بہت جلد مکمل ہو جائے گا۔ اس کی تعمیر پر تقریباً ۲٫۷۵ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء سے یہ پروجیکٹ چالو ہو جائے گا۔

فلمی ثقافت کے لئے مغربی بنگال فلم مرکز "نندن" کا رسمی افتتاح گزشتہ سال کا ایک اہم واقعہ ہے۔ افتتاح کے موقع پر اس ہال "نندن" میں فلم تہوار، سیمینار اور نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ نندن کے انتظامیہ کے لئے ۱۷ ممبروں پر مشتمل ورکنگ کمیٹی، اور ۲۹ ممبروں پر مشتمل مشاورتی بورڈ کی تشکیل کی گئی ہے۔ فلم صنعت سے وابستہ نمایاں افراد کو ان دونوں کمیٹیوں میں نامزد کر دیا گیا۔ ان کمیٹی کے چیئرمین شری ستیہ جیت رے ہیں۔

علاقائی فلم ٹیکنیشین کو مالی امداد فراہم کرنے کے لئے ریاستی حکومت نے ایک فنڈ قائم کیا ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں اس فنڈ کے لئے ۲۵ ہزار روپے منظور کئے گئے تھے۔ اس سال بھی اس فنڈ کے لئے رقم مختص کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے۔

ثقافتی امور:

بنی نوع انسان کی ثقافتی ترقی کا انسانی زندگی کے معیار میں بہتری سے بہت ہی قریبی رشتہ ہے۔ اس لئے اس شعبہ کے تحت ثقافتی امور کے لئے ایک الگ سیکشن قائم کیا گیا ہے۔ تمام لوگوں کی، بلا لحاظ ذات، فرقہ اور زبان روایتی ثقافتی میراث کی ترقی اور اسے محفوظ رکھنے کے لئے، اس سیکشن کے ذریعہ بلا روک ٹوک مختلف پروگراموں کو روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ یہ ایک لا مثال واقعہ ہے۔ یہ شعبہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ مختلف زبان جیسی بنگلہ، ہندی، اردو، سنتھالی، نیپالی کے لوگ اپنی ثقافتی سرگرمیاں کو جاری رکھیں اور صحت مند طریقے سے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو جاری رکھیں۔ خاص طور پر صرف ایک سرکاری مشنری کے ذریعہ ایسی جامع اور اہم اسکیم کو روبہ عمل لانا ممکن نہیں۔ اس لئے ثقافتی امور کی مختلف شاخوں میں ممتاز ہستیوں کے مشورے اور تجاویز کی روشنی میں اور ان کی سرگرم مدد کے ذریعہ تمام تسلیم شدہ پالیسیوں اور پروجیکٹوں کو ہم پایۂ تکمیل تک پہونچا رہے ہیں۔

بنگال کی صنعت مختلف النوع تخلیقات کی اپنی ایک شاندار روایت رکھتی ہے۔ لیکن حالیہ برسوں میں ثقافت کی دنیا میں سرمایہ دارانہ طاقت کے ارادے سے تخلیق کے طریقہ کار کو خدشہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ سے صحت مند ثقافتی مذاق کو برقرار رکھنے کے معاملہ میں ایک بحران نمودار ہو گیا۔ اس لئے مختلف النوع شاندار اور صحت مند تخلیقات کو محفوظ رکھنے اور انہیں فروغ دینے کیلئے

مختلف طریقوں سے ڈرامہ، یاترا، موسیقی، رقص، لوک ثقافت،
پینٹنگ اور سنگ تراشی کے میدانوں میں تنظیموں کی ہمت افزائی
کی جاتی ہے اور انہیں مختلف طریقوں سے عطیات جن میں "سیکڑوں
سپھولوں کو کھلنے دو" کے اصول کی بنیاد پر مالی عطیات کی منظوری
شامل ہیں دیئے جاتے ہیں۔ آرٹسٹ جو اپنی جوانی میں مقبولیت
کے بام عروج پر تھے، بڑھاپے میں معاشی بدحالی کے شکار ہو
گئے اس لئے یہ شعبہ ایسے مصیبت زدہ آرٹسٹوں کو مالی امداد
دے کر انکی مدد کرتا ہے۔ ان میں ضعیف لوک۔فنکار بھی ہیں،
جو اکثر زرعی مزدوری کیا کرتے، نیز ان میں چند نمایاں آرٹسٹ
بھی ہیں جو سینما، ڈرامہ اور موسیقی سے وابستہ تھے۔ مغربی بنگال
کے مختلف اضلاع میں بھی بہت سارے میلے منعقد کئے جاتے ہیں
ان میں بہت سارے میلے بنگال کی روایتی ثقافت کے فروغ کے نہ
صرف مرکز ہیں بلکہ یہ سب ہی تمام طبقوں کے لوگوں کی یک جہتی
کی شاندار بنیاد بھی ہیں۔ ثقافتی دنیا کے بہت ساری اہم
شخصیت کے نام پر ایسے میلوں کے نام رکھے گئے ہیں۔ اسلئے یہ شعبہ
ان میلوں کو معاشی عطیہ دے کر اور سرگرم تعاون کے ساتھ
کامیاب بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں جلپائی گوڑی
کا "جلپیش میلہ"، شانتی نکیتن کا "کینڈولی میلہ"، پرولیا،
بردوان کا نندیلا میلہ، ندیا کا کرتی باس میلہ، ہوڑہ کا بھرت
چندر میلہ، پانی تراس کا سرت میلہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

بنگلہ ادب کو اپنی وسعت اور معیار کے لحاظ سے
ساری دنیا میں افتخار کا مقام حاصل ہے لیکن بہت سارے
ادیب پبلیشروں کے تعاون کے فقدان کی وجہ سے اپنی تصانیف
کو شائع نہیں کر سکتے۔ اسلئے گزشتہ چھ برسوں سے یہ شعبہ شاعروں،
ناول نگاروں، ڈرامہ نویسوں، محقق کو بلا لحاظ سیاسی شناخت،
مالی امداد فراہم کر رہا ہے تاکہ وہ اپنی تخلیقات کو شائع کرا سکیں
اس اسکیم کی کامیابی کے ساتھ تکمیل سے نہ صرف بوڑھے اور جوان
تخلیقی مصنفین مستفید ہوتے بلکہ پڑھنے والے بھی، کیونکہ
انہیں مناسب قیمتوں پر اعلیٰ معیار کی کتابیں فراہم کی گئیں۔

منشی پریم چند کے منتخب مضامین (بنگلہ ترجمہ) کی
پہلی جلد موجودہ مالی سال میں پڑھنے والوں کے لئے دستیاب
ہوگی۔ بنگلہ زبان، قواعد اور حروف کی بابت دو دنوں کا سیمینار
منعقد ہوا جس میں مشہور اسکالروں اور ماہرین نے حصہ لیا۔
اس سیمینار میں جو مضامین پڑھے گئے، انہیں کتابی شکل میں
شائع کیا جارہا ہے اور بہت ہی جلد اسے عوام کے سامنے پیش
کر دیا جائے گا۔

موجودہ مالی سال میں ایک بنگلہ اکیڈمی قائم کی جائے
گی اور اس ریاست میں رابندر جینتی کے موقع پر اس کا افتتاح
کیا جائے گا۔

جامنی رائے آرٹ گیلری کو سائنسی لحاظ سے محفوظ
رکھنے کے انتظامات کئے گئے اور سال رواں میں عام لوگوں کے
لئے یہ گیلری کھول دی جائے گی۔ کلکتہ انفارمیشن سنٹر میں
آرٹ گیلری کی تعمیر کا کام مکمل ہونے کو ہے اور بہت ہی جلد
اس کا افتتاح کیا جائے گا۔

راجیہ سنگیت اکیڈمی (ریاستی موسیقی اکیڈمی) قائم کی
گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ رقص اور موسیقی کو فروغ دیا
جائے۔ یہ اکیڈمی بہت سارے پروگراموں کو روبہ عمل لارہی
ہے۔

اس بات کو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس ریاست
کو فنکاروں کی تشکار لوک ثقافت میں نئی روح پھونکنے میں کامیابی
حاصل ہوئی ہے۔ اب تک ضلع، ڈویژن اور ریاستی سطحوں پر
۳۸ فیسٹیول منعقد کئے جا چکے ہیں۔ پہلی بار آسنسول کے کوئلہ
کے علاقہ میں لوک ثقافت پر تہوار اور ورکشاپ منعقد کیا گیا
ہے۔ اس تہوار میں مختلف زبانوں جیسی بنگلہ، پنجابی، چھتیس
گڑھی، گجراتی کے مقامی لوک آرٹسٹوں نے نیز اتر پردیش کے لوک
آرٹسٹوں نے حصہ لیا۔ بہالہ میں لوک ثقافت کے لئے ایک مرکز
قائم کیا گیا ہے۔ لوک ثقافت سے وابستہ بہت ساری چیزیں یہاں
محفوظ رکھی گئی ہیں۔ نیز لوک ثقافت میں اچھی اچھی اور نایاب
کتابیں بھی اس مرکز کی لائبریری میں ہیں۔

موسیقی، ڈرامہ، نقاشی اور سنگ تراشی میں نمایاں

خدمات کے لئے علی الترتیب علاء الدین دینا بندھو اور رابندر ناتھ کے نام میں تین انعامات دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈراما اور یاترا کے میدانوں میں بھی تخلیق کی ہمت افزائی کرنے کے لئے ہر سال بہت سارے ایوارڈ دیئے جاتے ہیں۔

دارجلنگ کے پہاڑی علاقے میں نیپالی اکیڈمی بحسن و خوبی اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہا ہے۔ یہ اکیڈمی نیپالی زبان میں کتابیں اور پبلیکیشن شائع کرتی ہے۔ بنگلہ میں چند کہانیوں اور ناولوں کا نیپالی ترجمہ شائع کیا گیا۔ یہ قومی یکجہتی کے فروغ کی ایک اچھی مثال ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی ۱۲۵ ویں سالگرہ اسی سال میں ہے۔ اس ریاست کے لوگوں کے لئے بہت ہی پاک دن ہے۔ مشہور آرٹسٹوں، ماہرین تعلیم اور ذی شعور لوگوں پر مشتمل ایک انتظامی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اس کمیٹی کے سربراہ عزت مآب وزیر اعلیٰ ہیں۔ بڑی شان و شوکت سے اس قومی تہوار کو منانے کی ذمہ داری اس کمیٹی کو سونپی گئی ہے۔ ماہرین کے مشورے کے مطابق حکومت اضلاع اور کلکتہ میں ٹیگور ثقافت کو فروغ دینے کے پروگرام کو روبہ عمل لا رہی ہے۔ اس پروگرام کے تحت سال بھر سیمینار، نمائش، میلے، کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا گیا ہے۔

آثار قدیمہ:

گزشتہ سال شعبہ اطلاعات و ثقافتی امور کے تحت نظامت آثار قدیمہ نے پانڈو راجاؤں کے ٹیلوں کی کھدائی کی۔ نیز کنگسابتی وادی علاقہ میں بھی آثار قدیمہ کے لئے تحقیقاتی کام کئے جا رہے ہیں، نیز سوسونیا کے پہاڑی علاقوں میں کھدائی کا کام جاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں بنگال کی قدیم تاریخ سے وابستہ بہت ساری چیزیں دریافت کی گئیں۔ بنگال کے آثار قدیمہ کی بابت ایک مستند کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس شعبے نے آثار قدیمہ پر ضلع وار ایک تاریخی کتاب شائع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس سے قبل پانچ اضلاع کے آثار قدیمہ کی بابت کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل بنگال کی حکومت نے گوڑ اور پانڈوا کے آثار قدیمہ پر بہت ہی اچھی کتاب شائع کی تھی۔ موجودہ حکومت اب اس کتاب کو دوسری بار شائع کرنے کے لئے اقدامات کئے ہیں۔

آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنے کے لئے لوگوں کی رائے ہموار کرنے کے لئے اس سال ایک نئے پروگرام کو روبہ عمل لایا گیا۔ آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنے کی تحریک، وسیع پروگرام کے ذریعہ مغربی بنگال کے مختلف اضلاع میں آثار قدیمہ پر نمائشیں اور سیمینار منعقد کئے گئے۔ کلکتہ کے "نندن" اسٹیڈیم میں تین روزہ نمائش اور سیمینار منعقد کئے گئے۔

اس سال بھی بہت سارے پرائیویٹ عجائب خانوں کو مالی امداد فراہم کی گئی۔ بہت سارے آثار قدیمہ کی نادر چیزوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اس سال حسب ضروری اقدامات کئے گئے۔

بلاشبہ آپ لوگوں پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی ہے کہ موجودہ حکومت نے گزشتہ آٹھ برسوں میں شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور کے بجٹ میں نہ صرف بار بار اضافہ کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ہی اس کے کام کاج کی وسعت میں اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں کامیابی نے ہر شعبہ میں ایک نمایاں مثال قائم کی ہے۔ نشر و اشاعت اور ثقافتی امور میں اس شعبہ کی کامیابی زندگی کے ہر شعبہ کے لوگوں سے قریبی رشتہ کو برقرار رکھنا اور ایک مجموعی ثقافتی پالیسی کو اپنانا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہونچانا، آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنا — نمایاں اقدامات ہیں۔ مغربی بنگال کی مجموعی ترقی کی تصویر نے ہندستان کی دیگر ریاستوں میں دلچسپی پیدا کر دی اور ان ریاستوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کی۔ موجودہ سماج کی معاشی، سماجی ڈھانچہ نے عام لوگوں کے روزگار اور ثقافتی زندگی میں مسائل کو اور بھی شدید بنا دیا ہے۔ لیکن ہمارے محدود مالی وسائل کے باوجود ہم امید کرتے ہیں کہ ہم عوام کی اس سلسلہ میں موثر طور پر مدد کر سکتے ہیں کہ وہ ایسی پیچیدہ صورت حال میں بھی صحت مند ثقافت کی راہ میں آگے بڑھ سکیں ...

نئی تعلیمی پالیسی: ایک انحطاطی قدم

از: ——— نرمل بوس

تعلیمی نظام کا از سرِ نو جائزہ لینے اور اس کی نو تشکیل کے طریقہ کار میں تیزی لانے کے لئے، تاکہ یہ مستقبل کی ضرورتوں کو پورا کر سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی صلاحیت اور کوالیٹی کو اور بھی بہتر بنانے کے لئے، کسی بھی تحریک کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں اور اس نقطۂ نظر سے حکومتِ ہند کی حال ہی میں شائع کردہ دستاویز بعنوان "تعلیم کا چیلنج۔ تناظری پالیسی" کا بھی ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں تعلیم کے میدان میں جو مسئلہ حائل ہے، وہ تعلیم کے لئے کسی پالیسی کی کمی کی نہیں، بلکہ یہ اسی پالیسی کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں حکام کی کوتاہی ہے اور یہی بات تعلیم میں تغافل کی ذمہ دار ہے۔ تعلیم کمیشن (۱۹۶۴-۶۶ء) جسے عام طور پر کوٹھاری کمیشن کہتے ہیں، کی رپورٹ اور اس کمیشن کی سفارشات کی بنیاد پر مرتب کردہ قومی تعلیمی پالیسی میں، جس کا ۱۹۶۸ء میں اعلان کیا گیا، ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے کافی مواد موجود ہیں لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ کبھی بھی انہیں پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے شدید کوشش نہیں کی گئی۔

ملک کے نئے تعلیم کے سلسلے میں ایک نئی پالیسی مرتب کرنے سے قبل مرکزی حکومت کو اس بات کی وضاحت کر دینی چاہئے تھی کہ وہ کیوں اپنی ۱۹۶۸ء کی پالیسی کو پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکی۔

ہم ہندوستان اور بیرونی ممالک کے ممتاز ماہرین تعلیم اور منتظمین کے نام سے واقف ہیں جنہوں نے اس تعلیم کمیشن (۱۹۶۴-۶۶ء) کی رپورٹ تیار کی تھی۔ لیکن کن لوگوں نے موجودہ دستاویز تیار کی؟ کیا یہ مرکزی وزارت تعلیم کے چند ضابطہ پرست حکام کے دماغ کی اپج ہے؟ کیا اس دستاویز کو قابلِ اعتبار سمجھا جا سکتا ہے جبکہ ایک بھی ماہر تعلیم اس سے وابستہ نہیں ہے۔

ایک طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "تعلیم کا چیلنج" پر یہ موجودہ دستاویز ایک اقبال نامہ ہے جس میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں اور دیگر متعلقہ اداروں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ تعلیم کے میدان میں وہ سب بالکل ناکام ہوئے۔ اس دستاویز میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ آزادی کے ۳۸ سال کے بعد بھی ہماری آبادی کے ۶۴ فیصد افراد ان پڑھ اور جاہل ہیں (پیرا ۲،۷۷)

ابتدائی تعلیم کے فروغ کی ضرورت کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ نیز اس سلسلے میں ایک تاریخ بھی مقرر کی گئی کہ اس تاریخ تک ہندوستان کے تمام بچوں اور بچیوں کو کم از کم ابتدائی تعلیم سے فیض یاب کیا جائے۔ لیکن اب تک ایسی کوئی ٹھوس تجویز پیش نہیں کی گئی کہ کس طرح اس کام کو انجام دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لئے وسائل اکٹھا کرنے کی ضرورت کی نشاندہی کی گئی۔ پوری آبادی کو علم سے فیض یاب کئے بغیر، نہ ہی ٹکنکی انقلاب اور نہ ہی ملک کو ۲۱ ویں صدی میں لے جانے کے جوشیلے پروگرام کو کامیاب بنانا ممکن ہو سکتا ہے۔ اس دستاویز میں ٹکنکی طور سے ترقی یافتہ، مغربی ممالک کے نئے انتظامی نظام میں رائج اتنے سید ہے طریقوں کے علاوہ مغربی طریقوں کا بھی تجاویز پیش کی

کی گئی تھی۔ یعنی ایسی تجویزیں جو وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر تعلیمی نظام کے لئے مستحکم بنیاد تیار کرنے میں ہماری معاون ہو سکتی ہیں۔

اس دستاویز میں درج نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف چند اعتراضات درج ذیل ہیں:

(۱) نیا تعلیمی نظام نوعیت میں پیچیدہ ہوگا۔ یہ طلبا کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کر دے گا اور جبکہ ایک چھوٹی سی جماعت کے طلبا کو حکومت کی تائید سے بہتر سہولتیں فراہم ہوں گی تو دوسری طرح ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے، خاص طور پر دیہی علاقوں میں اور غریب خاندانوں کے بڑی کثیر تعداد میں طلبا کے لئے ایسی سہولتیں فراہم نہیں ہوں گی۔ اس طرح انہیں کم تر درجہ میں رکھا جائے گا اور ان کے لئے تھوڑی بہت سہولتیں فراہم ہوں گی۔ دستاویز میں یہ کہا گیا ہے کہ " بقا کے لئے جدت کاری کی اشد ضرورت اسکول اور اعلیٰ تعلیم کی سطح پر ایک اعلیٰ درجہ کے ادارہ کا قیام ہے"۔ (پیرا ۳۹ ر ۴)۔ دستاویز میں مزید بتایا گیا کہ ہر ضلع میں ایک کیندریہ ودیالیہ یعنی موڈل اسکول ہوگا۔ اس اسکول کی مالی ذمہ داریاں مرکزی حکومت سنبھال لیگی، اور ضلع میں دیگر اسکول،، جن کی تعداد کم و بیش ایک سو ہوگی، پرائیویٹ انتظامیہ کے تحت ہوں گے۔ ایسے کیندریہ ودیالیے مرکزی حکومت کے زیر انتظام ہوں گے اور تعلیم انگریزی میں دی جائے گی۔ اس بات کا اعلان کیا گیا کہ ۱۹۸۶ء کے آخر تک ایسے ۱۰۰ اسکول قائم کئے جائیں گے اور ساتویں منصوبہ کے ایسے اور ۵۰۰ اسکول قائم کئے جائیں گے۔ مرکزی حکومت کی یہ خواہش ہے کہ چند اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹیوں کو " مراکزِ جوہر " کی طرح فروغ دیا جائے گا (پیرا۔ ۳۴ ر ۴)۔ ایسی صورت حال میں قدرتی طور پر دیگر اسکول غفلت کے شکار بنے رہیں گے۔ " صدیوں سے آکسفورڈ اور کیمبرج اور اب دہائیوں سے ہارورڈ، ییل اور اسٹینفورڈ یونیورسیٹیوں نے اپنے معیار اور کوالیٹی کے ذریعہ دیگر اداروں کو متاثر کیا ہے۔ تعلیم کی مختلف شاخوں میں تمام سطحوں پر تعلیم دینے کے لئے ایسے اداروں کو قائم کرنا چاہئے " (پیرا ۲ر۱۱۱)

اسی طرح اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مٹھی بھر یونیورسیٹیوں کے علاوہ، جو مراکز افضلیت " ہوں گی، ملک کی زیادہ تر یونیورسیٹیوں کو " ہیزمکش حیثیت " حاصل ہوگی۔ مراکزِ جوہر کا تصور یعنی دیگر اداروں کو پرے پھینک کر ایک دو اداروں کی ترقی، ہمارے ملک میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تقریباً ڈیڑھ صدی قبل ہندستان کے لئے میکولے کی بھی یہی خواہش تھی، جب انہوں نے یہ کہا تھا " تمام لوگوں کو تعلیم دینا ممکن نہیں، لیکن یہ بات ممکن ہے کہ ان میں سے چند گنے چنے لوگوں کو، جو خون اور رنگ کے لحاظ سے تو ہندستانی ہوں گے لیکن مذاق، خیالات اور اخلاقیات اور سمجھ بوجھ میں انگریز ہوں گے، انگریزی کے ذریعہ تعلیم دی جائے، پھر ان کے ذریعہ عوام تک تعلیم پہنچائی جائے "۔

مرکز میں کانگریسی حکومت کے سربراہ اب میکولے کی آوازیں بول رہے ہیں، حالانکہ جدوجہد آزادی کے دوران ہمارے قومی سربراہوں نے میکولے کی اس تجویز کو بالکل رد کر دیا تھا جبکہ کوٹھاری کمیشن نے اس بات کی سفارش کی تھی کہ " پڑوسی اسکول " یا عام تعلیم کے لئے عام اسکول قائم کئے جائیں (پیرا۔ ۳۸۔۱۰) یعنی بلا لحاظ جنس، گھرانہ، جائیداد، تعلقات وغیرہ تمام طلبا کے لئے ایک خاص علاقہ میں ایک عام اسکول قائم کیا جائے۔ برخلاف اس کے " مرکزِ جوہر " چند افراد کے لئے حکومتِ ہند کی نئی تعلیمی پالیسی ہے۔ پرائیویٹ انتظامیہ کے تحت نام نہاد عوامی اسکول کے روایتی انگریزی نظام کے خلاف شدید تنقید کرتے ہوئے کوٹھاری کمیشن نے کہا تھا " اسی سے ملتا جلتا ایک نظام انگریز ناظمین نے ہندستان میں رائج کیا تھا اور ہم اب تک اس سے چپکے رہے، کیوں کہ یہ ہمارے سماج کی روایتی اور موروثی ساخت کی طرح ہے۔ اس کے ماضی کی تاریخ کیسی ہی کیوں نہ ہو، اسے اس نئے جمہوری اور اشتراکیتی سماج میں، جس کی تخلیق کے ہم خواہاں ہیں، کوئی جگہ نہیں مل سکتی " (پیرا ۳۸۔۱۰)۔ کمیشن کا یہ خیال تھا کہ تعلیم عامہ کے لئے عام اسکولی نظام، جس کی اس نے سفارش کی تھی، عام طور پر قومی ترقی کے لئے اور خاص طور پر سماجی اور قومی یکجہتی کے لئے ایک زبردست آلہ بن جائے گا۔

(۲) فاصلاتی تعلیم کی تجویزوں کا بھی اس دستاویز میں ذکر کیا گیا ہے۔ جدید آلات رابطہ کے پیش نظر اس امر کو سودمند سمجھا جاتا ہے کہ بہت سارے طلبا کو فاصلے سے ٹی۔وی اور ریڈیو کے ذریعہ ساتھ ہی خط و کتابت کے ذریعہ، جس کے لئے کھلی یونیورسٹی قائم کی جا چکی ہے، تعلیم دی جائے۔ ہم ان تمام رابطوں کا تعلیم میں ان کے مناسب استعمال کے لئے، خیر مقدم کرتے ہیں۔ نیز کھلی یونیورسٹی کے نظام کو سراہتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی غیر رسمی تعلیم کو رسمی تعلیمی نظام کا ضمیمہ ہونا چاہئے، اور یہ غیر رسمی تعلیمی نظام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باضابطہ کلاسوں کے ذریعہ دی جانے والی رسمی تعلیم کے نظام کا بدل اور قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے اب مرکزی حکومت اسی بنیاد پر ابتدائی سے لے کر یونیورسٹی سطح تک غیر رسمی تعلیم رائج کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہمارے مستقبل کی تعلیم کا زیادہ زور غیر رسمی تعلیم پر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے رسمی تعلیم کو مزید وسیع نہیں بنایا جائے گا۔ یہ بات بہت قابل اعتراض ہے۔ ہم اس غیر رسمی تعلیم کے خلاف ہیں جو رسمی تعلیم کی معاون نہیں بلکہ جسے بدل سمجھا جاتا ہے۔ ایک طالب علم جو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باضابطہ کلاس میں شامل ہو کر تعلیم حاصل کرتا ہے اور امتحانات میں کامیاب ہوتا ہے اور ایک اور طالب علم مقررہ اوقات میں ٹی۔وی اور ریڈیو کے تعلیمی پروگراموں کو سن کر اپنی تعلیم مکمل کرتا ہے، ان دونوں طلبا میں تعلیمی معیار کے لحاظ سے کافی فرق ہونا چاہئے۔ مرکزی حکومت تعلیم کے بعد الذکر طریقہ کار کو روبہ عمل لانے کی کوشش کر رہی ہے۔

(۳) تعلیم کے سلسلے میں مالی اخراجات اور تعلیم کے انتظامیہ دونوں کے لئے پرائمری سے یونیورسٹی تک تمام سطحوں پر مرکزی حکومت غیر سرکاری اداروں پر بھروسہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کے لئے اس نے تعلیمی فیس لینے کی بھی گنجائش رکھنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔ (پیرا۔ ۸۹، ۴) ۔ نمایاں طور پر اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ "جہاں ممکن ہو، اس بات کی کوشش کی جانی چاہئے کہ نوجوانوں اور بالغوں کی رسمی اور غیر رسمی تعلیم کی ذمہ داریاں مناسب رضاکارانہ انجمنوں کو سونپی جائے۔" (پیرا۔ ۳۱، ۴) اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے مرکزی حکومت کلی طور پر صنعتی اداروں پر انحصار کرنا چاہتی ہے۔ جب ملک میں تمام درجوں کے اساتذہ کی رائے یہ ہے کہ تعلیم میں پرائیویٹ انتظامیہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے، مرکزی حکومت اس سمت میں اس کے برعکس قدم اٹھا رہی ہے۔ تعلیم کے لئے خاص طور پر نشانہ کی تاریخ تک سبھوں کو ابتدائی تعلیم سے فیضیاب کرانے کے لئے مالی ضرورتوں کے سلسلہ میں مرکزی حکومت کی ذمہ داری کو نبھانے میں ہچکچاہٹ تو پرائیویٹ انتظامیہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے کے برابر ہے۔

(۴) گرچہ مرکزی حکومت تعلیم کے لئے مالی بوجھ برداشت کرنا نہیں چاہتی تاہم یہ تعلیم پر پورا کنٹرول رکھنے کی خواہاں ہے۔ ایمرجنسی کے کالے دنوں میں دستور کی ۴۲ ویں ترمیم کے ذریعہ تعلیم کو دستور ہند کی ریاستی فہرست سے مشترکہ فہرست میں منتقل کر کے بھی مرکزی حکومت کو خاطر خواہ تشفی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ مرکزی حکومت کو تو مزید اختیارات کی ضرورت ہے۔ ضلعوں میں ماڈل اسکولوں پر کنٹرول کے باوجود، مرکزی حکومت سارے ملک میں ایک قومی مرکزی نصاب یعنی ایک ہی نصاب رائج کرنے کی خواہاں ہے (پیرا۔ ۴۶، ۴)۔ اگر ہر ریاست میں یکساں قومی مرکوز نصاب رائج کرنے کی کوشش کی جائے تو ایسی حالت میں مقامی معاملات۔ تعلیمی اور ثقافتی ۔ میں مرکز کی مداخلت کا خدشہ ہمیشہ لاحق رہے گا۔ ہماری ثقافت میں تنوع کی بنیادی نوعیت کو درہم برہم کر دے گا اور اتحاد کو مستحکم بنانے کی جگہ انتشار کی طاقتوں کی مدد کرے گا۔ اس بات کی بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ یو۔جی۔سی جائزہ کمیٹی اور وائس چانسلروں کی کمیٹیوں کی سفارشات کے حوالے سے تمام یونیورسٹیوں کے لئے انتظامیہ کی شکل ایک جیسی ہو۔ یونیورسٹی کے ادارے چھوٹے ہوں گے اور ایک جیسے ہوں گے، اور ان میں ایکس۔آفیشیو اور نامزد ممبران ہوں گے اور ان باتوں کے پیش نظر ایک جامع قانون پارلیامنٹ میں پاس کیا جائے گا۔

تعلیم میں اتنی مرکزیت کی جگہ یہ ضروری ہے کہ تعلیم کو ریاستی فہرست میں لایا جائے۔

(۵) پیشہ ورانہ تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ اور میں اسے خوش آمدید کہتا ہوں۔ لیکن ڈگری کو کام سے الگ رکھنے کی تجویز، موجودہ حالت میں ایک لڑکے یا لڑکی کو نہ روزگار فراہم کر سکے گی اور نہ ڈگری۔ تعلیم میں پیشہ ورانہ تربیت کے نظام کے رائج ہو جانے اور روزگار کے چند اور مواقع پیدا کرنے کے بعد ہی مذکورہ باتوں پر غور کیا جا سکتا ہے۔

(۶) دستاویز میں اس بات کی تجویز پیش کی گئی ہے کہ روایتی طریقے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی مزید توسیع کے کام کو عارضی طور پر ملتوی کر دیا جائے (پیرا۔ ۲۳ اور ۴)، غیر منصوبہ بند طریقے سے ادھر ادھر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام کی روک تھام کی جانی چاہئے کیوں کہ اب بھی دیہی اور پسماندہ علاقوں میں کالج اور یونیورسٹی قائم کرنے کے کافی امکانات ہیں۔ فی الحال ہندستان میں ۱۷ تا ۲۳ سال کی عمر کے نوجوانوں کے صرف ۸ر۴ فیصد کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جبکہ فلپائنس اور جنوبی کوریا جیسے ترقی پذیر ملکوں میں ایسے نوجوانوں کی تعداد ۲۵ فیصد ہے۔

(۷) تعلیم کو سیاست کے دائرہ سے باہر رکھنے کے نام پر مرکزی حکومت ایک طرف تو تعلیمی اداروں کے احاطے میں طلبا، اساتذہ اور غیر معلم ملازمین کے جمہوری حقوق کو چھین لینے کی کوشش کر رہی ہے تو دوسری طرف یہ یونیورسٹی کے انتظامیہ کو، منتخب افراد کو وہاں سے الگ کر کے، غیر جمہوری بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ اساتذہ کی تنظیموں کے کام کاج کی بھی تنقید کی گئی ہے۔ دستاویز میں یہ کہا گیا ہے کہ "گزشتہ چند دہائیوں سے پارٹی سیاست میں اساتذہ کی شرکت سے حاصل ہونے والے تجربات اور اس کی وجہ سے اساتذہ کی تنظیمیں کتنی حد تک سیاسی بن چکی ہیں، ہم ان باتوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ ڈسپلن پر اس کا کیا اثر ہوا؟ اساتذہ کی توجہ کو مختلف سمت موڑنے میں اس نے کیا کردار ادا کیا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنا چاہئے (پیرا۔ ۴ ۵۔ ۳)۔ اس رویہ کو اپنا کر مرکزی حکومت نے ملک میں اساتذہ کی جمہوری تحریک کے خلاف ایک طرح کی جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے اور ہر طرح سے اس کی مزاحمت کی جانی چاہئے۔

آج تعلیم میں ہمارے سامنے جو چیلنج ہے وہ درحقیقت ٹکنکی انقلاب کا چیلنج نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک چیلنج ہے جہالت کو دور کرنے کا، سماج کے سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ میں پیداوار، روزگار اور تغیرات کی ضرورتوں سے تعلیم کو سماجی طور پر وابستہ کرنے کا ○○○

سندربن علاقہ کی ترقی

سندربن ترقیاتی بورڈ کے تحت ساگر اور بستی علاقوں میں مختلف اسکیموں کے لئے ۸۵-۸۶ء کے مالی سال میں ۲۸ لاکھ روپئے دینے کی منظوری دی گئی ہے۔

اس مالی سال کے لئے ساگر بلاک میں سوکھی دتا کھال کی از سر نو کھدائی کے لئے ۱۵ لاکھ روپئے دینے کی منظوری دی گئی ہے۔ اس کھدائی کے کام پر تقریباً ۳۱۰۴۳۶۳ روپئے خرچ ہوں گے۔ اسی بلاک میں سوکھی مہیشا ماری کھال کی از سر نو کھدائی کے لئے ۱۰ لاکھ روپئے دینے کی منظوری دی گئی ہے۔ اس کھدائی کے کام پر تخمیناً ۲۳۶۴۸۹۸ روپئے خرچ ہوں گے۔

موجودہ سال میں بسنتی میں سوکھی بھومرا ماری کھال کی از سر نو کھدائی کے لئے ۵ر۱ لاکھ روپئے اور آشا کھالی کھال کی از سر نو کھدائی کے لئے ۵ر۱ لاکھ روپئے کی منظوری دی گئی ہے۔ ان کھالوں کی کھدائی پر علی الترتیب ۵۶۲۴۳۹ روپئے اور ۴۴۰۲۱۷ روپئے خرچ ہوں گے۔

ان تمام اسکیموں کو سندربن ترقیاتی بورڈ پایۂ تکمیل تک پہونچا رہا ہے ○○○



تھار کا ریگستان

تھار کا ریگستان اب تباہی کا موجب نہیں بنتا۔ اگر اس علاقے کا صحارا یا کالاہاری اور گوبی جیسے ریگستانوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تھار ایسا ریگستان ہے جہاں پیڑ پودے، جانور اور بنی نوع انسان کی گھنی آبادی پائی جاتی ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ راجستھان میں جتنی دھوپ پڑتی ہے اگر اس کے استعمال کا کوئی طریقہ نکال لیا جائے تو ہمارے پورے ملک کی بجلی کی ضروریات کے لئے یہ کافی ہوگا۔ ہمارے ملک کا ۲۳۰ لاکھ مربع کیلومیٹر علاقہ ریگستان پر مشتمل ہے جو ملک کے مجموعی رقبے کا ۱۲ فیصد ہے۔ تقریباً ایک کروڑ نوے لاکھ افراد تھار کے ریگستان میں رہتے ہیں اور ریگستان زیادہ گنجان آباد ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے کیونکہ یہاں ایک مربع کیلومیٹر میں ۶۱ افراد بستے ہیں جبکہ دیگر ریگستانوں میں ایک مربع کیلومیٹر میں صرف تین افراد رہتے ہیں۔ تھار میں مویشیوں کی تعداد جو ۱۹۵۱ء میں ۲۰۲ ر ۷ لاکھ تھی اب بڑھ کر ۲۳۰۳ لاکھ ہوگئی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے دہے میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ تھار کا ریگستان ایک سال میں آدھے میل کے حساب سے سکڑ رہا ہے۔ انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی نے ریگستانی علاقوں کے سائنسی انتظام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس پر توجہ دیتے ہوئے ریگستانی علاقوں کی ترقی سے متعلق یونیسکو کی صلاح کار کمیٹی کی سفارشات کے مطابق حکومت ہند نے ۱۹۵۲ء میں جودھپور میں ریگستان کو جنگل میں تبدیل کرنے سے متعلق اسٹیشن قائم کیا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں اس ادارے نے بنجر علاقوں کی تحقیق سے متعلق انسٹی ٹیوٹ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ آج دنیا میں اس ادارے کو ریگستان کے بارے میں مطالعہ کرنے کے کام میں بانی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس ادارے نے ریگستان کی معیشت کو بہتر بنانے کے لئے بیر، کھجور، امرود، شہتوت وغیرہ کی اقسام دریافت کی ہیں جن کی اس علاقے میں کاشت کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح [illegible] بھی دریافت کیا گیا۔ اسی طرح ریگستان میں کاشت کے لئے یوکلپٹس کی قسم بھی دریافت کی گئی جو ایک اہم خام مال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریگستان میں نشو و نما پانے والے بعض بھیڑوں کی اقسام دریافت کی گئیں۔ ان بھیڑوں سے حاصل ہونے والی اون کی مقدار کو بڑھانے اور اسے بہتر بنانے کے لئے مطالعہ کا کام جاری ہے۔ بھیڑ کی ایک اور قسم "پربت سر" میں دودھ دینے کی کافی صلاحیت موجود ہے۔ ریگستان کے جہاز اونٹ اور جنگلی گدھوں پر بھی سائنس داں کافی توجہ دے رہے ہیں۔ وہاں رہنے والے لوگوں کو ریتیلے علاقے میں کاشت کرنے کی تکنالوجی سے واقف کرایا جارہا ہے۔ مکمل ترقی کے مقصد کے حصول کے لئے دیہی سماج کے کمزور طبقے سے تعلق رکھنے والے دو سو زرعی کنبوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ لوگ جودھپور کے پانچ دیہات میں رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو چھڑکاؤ اور ٹپکاؤ کے ذریعہ سینچائی جیسے کاموں کی تربیت دی جاتی ہے۔ بنجر علاقوں کی تحقیق سے متعلق ادارہ سورج کی توانائی کو استعمال میں لانے کے لئے آلات تیار کرنے میں مصروف ہے۔ یہ ادارہ ہیٹر اور کوکر وغیرہ پہلے ہی تیار کر چکا ہے جو سورج کی توانائی سے کام کرتے ہیں۔ راجستھان کی جلتی ہوئی ریت مذکورہ ادارے کے سائنس دانوں کیلئے کوئی پریشانی کا باعث نہیں ہے۔ چلی، متحدہ عرب جمہوریہ، ایران، عراق، تنزانیہ، قطر، نائیجیریا اور فلپائن جیسے ملک اپنے چھوٹے اور بڑے ریگستانوں پر قابو پانے کے لئے اس ادارے کی مدد حاصل کر رہے ہیں ٭٭٭

چھوٹی آبپاشی اسکیم کے لئے عطیہ

ریاستی حکومت نے شمالی بنگال کے ترائی ترقیاتی پروجیکٹ کے تحت دیناہاٹ II بلاک میں چھوٹی آبپاشی اسکیم پر عمل درآمد کرنے کے لئے ۸۶-۱۹۸۵ء کے مالی سال میں ۵۰ ہزار روپے بطور عطیہ دینے کی منظوری دی ہے ٭٭٭

حال ہی میں
ربندرا سدن،
کلکتے میں
منعقدہ لوک
ثقافتی تقریب
میں پیش
کردہ ہماچل
پردیش کا لوک
ناچ۔







Postal Regd. No. WB/ CC-32
Vol—33 No.— 8
PRICE—12 Paise

MAGHREBI BANGAL
15th APRIL 1986

شنکرپور، ضلع ۲۴ پرگنہ میں ماہی گیری
تصویر از: اجیت داس

Chief [illegible] Kalyan Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azam, Published [illegible] Information & Cultural Affairs Department, Govt. of West Bengal and Printed by M/s. [illegible] Street, Calcutta-[illegible]

مغربی بنگال



پندرہ روزہ

مغربی بنگال

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹا چاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

جلد نمبر ۳۳ ★ یکم مئی سنہ ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر

شرح خریداری

سالانہ : تین روپے ★ اس خصوصی شمارے کی قیمت : ۴۰ پیسے

ترسیل زر کا پتہ

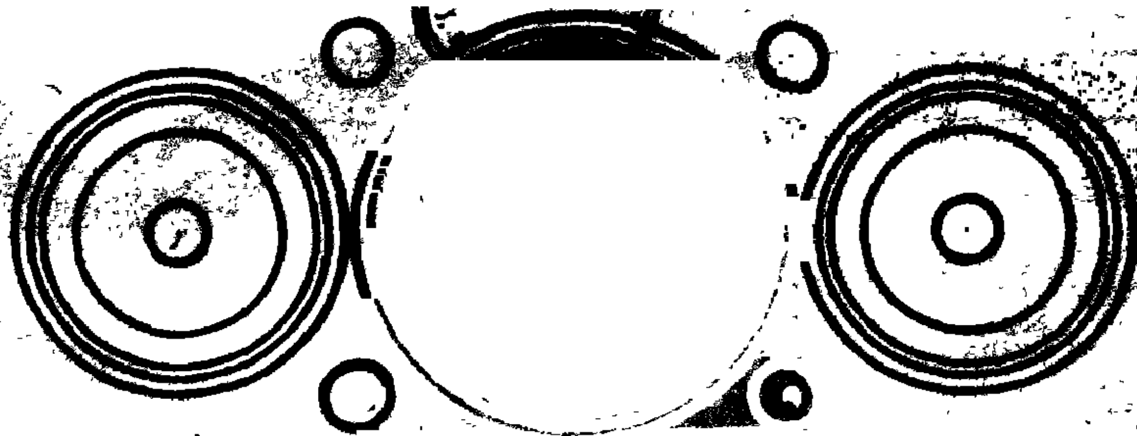
بزنس منیجر،
شعبہ اطلاعات و ثقافتی امور — حکومت مغربی بنگال
۳۳- آر، این، مکھرجی روڈ — کلکتہ - ۷۰۰۰۰۱

یوم مئی نمبر



۱۸۸۶ء میں شکاگو میں یوم مئی کا جلوس

یوم مئی، میل رڈ، سڈنی ۱۹۳۶



حامی گورکھپوری

چاروں طرف جہاں میں اندھیروں کا راج تھا
ظالم حکومتیں تھیں تو جابر سماج تھا
قبضے میں ظالموں کے ہر اک تخت و تاج تھا
آوازِ حق ہی تھی نہ کوئی احتجاج تھا

پہرے لگے ہوئے تھے زبان و بیان پر
سو سو طرح کے ظلم تھے انساں کی جان پر

سرمایہ کی زبانِ ہوس بے لگام تھی
ہر صبح مفلسوں کے لئے غم کی شام تھی
وہ بے بسی کا دور تھا کہ بھوک عام تھی
محنت کشوں کے واسطے روٹی حرام تھی

قصرِ شہنشہی میں بہاروں کا جشن تھا
عیش و طرب تھے، زہرہ نگاروں کا جشن تھا

چڑھتے رہے صلیب پہ مزدور عمر بھر
پہنچا سرِ فلک نہ کبھی آہ کا اثر
کوئی شریکِ درد تھا نہ کوئی چارہ گر
کوڑوں کے زخم کھلتے تھے محنت کی پشت پر

ہاتھوں میں مفلسی کے تھے چھالے پڑے ہوئے
انصاف کی زباں پہ تھے تالے پڑے ہوئے

جب ظلم بڑھ گیا تو کھلی صبر کی زباں
پھر نعرہ انقلاب کا ابھرا جہاں تہاں
ذروں سے خوف کھانے لگے ماہ و کہکشاں
ہر سمت سے جیالے اٹھے بن کے آندھیاں

جو بے خبر تھے خواب سے بیدار ہو گئے
اپنے حق کے واسطے تلوار ہو گئے

اہلِ ستم چڑھانے لگے اپنی آستین
شمشیر بے نیام ہوئی گولیاں چلیں
تھی تر بہ تر لہو میں شکاگو کی سرزمیں
پھر بھی جھکا سکے نہ وہ مزدور کی جبیں

نعرے ہر اک زبان پہ تھے انقلاب کے
گو پھول جل رہے تھے چمن میں گلاب کے

ہم ان کی روشنی میں ابھی ہیں رواں دواں
تاریکیوں سے رک نہ سکے گا یہ کارواں
اک دن قدم کو چومنے آئے گا آسماں
اونچا رہے گا دہر میں مزدور کا نشاں

چمکا تھا خون سے جو سویرا سلام لے
لہرایا تھا جو سرخ پھریرا سلام لے

عالمی فتح، مزدور طبقہ کی جدوجہد اور یومِ مئی

اس سال ساری دنیا کے مزدور یوم مئی کا صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ یکم مئی سنہ ۱۸۸۶ء کو امریکہ میں ۸ گھنٹے کام کرنے کے دن کے مطالبے کو لے کر مزدور طبقہ نے جو منظم اور وسیع ہڑتال اور جدوجہد شروع کی تھی اس سال اسی کی صدی منائی جائے گی۔ وہی دن تاریخ یوم مئی کہلاتا ہے اور یکم مئی سنہ ۱۸۹۰ء سے جو یوم مئی منایا جانا شروع ہوا اسے بین الاقوامی یوم مئی کہا جاتا ہے۔

آج کل یوم مئی کے معنی ہیں بین الاقوامی مزدور طبقہ کا دن ہے۔ اسی ایک ہی دن میں دنیا بھر کے مزدور اس یوم کو منا کر مزدور طبقہ کے بین الاقوامی اتحاد کو ظاہر کرتے ہیں اور سرمایہ داری کے شکنجے، استحصال سے خود کو آزاد کرانے اور اشتراکیتی نظام قائم کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

گزشتہ ایک سو سال سے پوری دنیا کے مزدوروں کی جدوجہد کی بے شمار یادیں اس یوم مئی سے وابستہ ہیں۔ مزدوروں کی جدوجہد، انقلابی تحریکات، فسطائی طاقتوں کی مخالفت، جنگ کی مخالفت اور قومی آزادی کی تحریک کے سلسلے میں ساری دنیا میں جو منظم متحدہ طاقت ابھری ہے یوم مئی کی جدوجہد اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ لہٰذا مزدوروں کی جدوجہد کے سلسلے میں یوم مئی ۔ کبھی نہ ختم ہونے والی ایک پُرجوش آہنگ ہے

۸ گھنٹوں کی جدوجہد :- سرمایہ داری کے دور اوّل میں کام کے لئے گھنٹوں (وقت) کی کوئی قید ہی نہیں تھی۔ ۱۸۴۱، ۱۸۴۲، یہاں تک کہ ۲۰ گھنٹے بھی مزدوروں کو کام کرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا "۸ گھنٹے کام، ۸ گھنٹے آرام اور ۸ گھنٹے کی تفریح" کا نعرہ مزدور طبقہ کی بیداری کی علامت ہے۔ اسی بیداری کے شعور

کے نتیجے ہی میں دنیا کے مختلف حصوں میں آٹھ گھنٹے کے کام کے مطالبہ پر ہڑتالیں اور جدوجہد شروع ہوئیں۔

ہم جانتے ہیں کہ آٹھ گھنٹے کے مطالبے کے سلسلے میں اولین ہڑتال ۲۱ راپریل ۱۸۵۶ء کو ایک دن کے لئے آسٹریلیا میں ہوئی تھی جس کی تفصیلات ہمیں "روزا لکسمبرگ" کی "یوم مئی کی جنم کہانی" اور "الیکزنڈر ٹریکٹنبرگ" کی "تاریخ یوم مئی" نامی کتابچے میں ملتی ہیں۔

اسی مطالبے کے سلسلے میں دوسری ہڑتال اسی مغربی بنگال کے ہوڑہ اسٹیشن میں ۱۸۶۲ء کے مئی میں ہوئی تھی۔ ۱۲۰۰ ریلوے مزدوروں نے کئی دنوں تک اس ہڑتال کو جاری رکھا تھا۔

لیکن یہ سب ہڑتالیں خاص کر ملک کی سرحدوں کے اندر ہی رہیں اور بین الاقوامی مزدور تحریک پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ بعد کے دور میں امریکہ کے مزدوروں نے ہی پوری دنیا میں ایک ہلچل پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ حالانکہ اس جدوجہد کی کامیابی میں بنیادی کردار مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی تنظیم نے ادا کیا۔

تحریک و مطالبے : ۲۰ راگست ۱۸۶۶ء کو امریکہ کے بالٹی مور میں قومی مزدور یونین کے قیام کے دن ۸ گھنٹے کے مطالبے کی مشہور تجویز کو قبول کیا گیا جس میں کہا گیا کہ "اس ملک کے مزدوروں کو سرمایہ داروں کی غلامی کے ہاتھوں سے آزاد کرانے کے لئے موجودہ صورت حال میں اولین اور اہم ترین ضرورت ہے ایک ایسے قانون کو نافذ کرنے کی جس کے نتیجہ میں متحدہ امریکہ کی تمام ریاستوں میں ۸ گھنٹے ہی عام طور پر کام کرنے کے دن کا وقت مقرر ہو سکے جب تک کہ یہ مجوزہ نتیجہ حاصل نہ ہو سکے تب تک ہم اپنی تمام قوت اس جدوجہد میں لگا دینے کا عہد کرتے ہیں۔"

غور طلب بات یہ ہے کہ سرمایہ داری کی زنجیروں سے نجات پانے کی للکار اسی تجویز میں پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد سے ہی امریکہ میں ۸ گھنٹے کی لڑائی رفتہ رفتہ تیز ہوتی گئی اور تاریخ یوم مئی اسی کا نتیجہ ہے۔

کارل مارکس کا کردار : ۱۸۴۸ء میں مارکس اور اینگلس نے کمیونسٹوں کی تاریخ میں پہلی بار یہ اعلان کیا کہ "دنیا کے مزدور ایک ہو۔" "زنجیروں کے علاوہ تمہارے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں ہے"۔ امریکہ کی مزدور تحریک پر بھی اس کا زبردست اثر پڑا لیکن صرف پکار کر ہی مارکس خاموش نہیں رہے۔ ۱۸۶۴ء میں ان کی کوششوں سے اور ان کی ہی رہنمائی میں پہلا بین الاقوامی مزدور یونین وجود میں آیا اور اسی کے نتیجے میں امریکہ کی مزدور تحریک پوری دنیا میں ہلچل مچانے میں پوری طرح کامیاب ہوئی۔

یہ بھی یاد رہے کہ اگست ۱۸۶۶ء میں بالٹی مور میں تجویز قبول کرنے کے بعد کے مہینے میں ہی یعنی ستمبر میں پہلا بین الاقوامی جنیوا کانگریس منعقد ہوا جس میں اس مطالبے کو ساری دنیا کے مزدوروں کے عام مطالبے کے طور پر شامل کرنے کی تجویز پیش ہوئی۔ اسی طرح امریکہ کے باہر ساری دنیا میں ۸ گھنٹے کی لڑائی پھیل گئی۔ کارل مارکس نے نہایت ہی دور اندیشی اور سائنٹفک طور پر اشتراکیتی نظام کو قائم کرنے کی اس طرح مضبوط بنا ڈالی تھی۔

صرف یہی نہیں دوسرے سال یعنی ۱۸۶۷ء میں مارکس کی تصنیف "کیپیٹل" (Capital) کی پہلی جلد شائع ہوئی جس میں اسی ۸ گھنٹے کی تحریک اور تجویز کو مناسب مقام دیا گیا۔

لیکن یکم مئی ۱۸۸۶ء کا انقلاب مارکس دیکھ کر نہیں جا سکے۔ اس کے تین سال قبل ہی ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء کو وہ اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئے۔

مزاحمت کی تیاری :

اس دور میں ۱۲ گھنٹے تا ۱۴ گھنٹے روزانہ مزدوروں کو کھٹا کھٹا کر بہت معمولی اجرت دے کر امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کا جنم ہوا تھا۔ فورڈ، مارگن، روکفیلو، وغیرہ بڑے بڑے سرمایہ دار اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ ایسا کوئی ظلم اور ایسی کوئی ناانصافی نہیں تھی جو ان منافع خوروں نے نہیں کی ہو۔ یہاں تک کہ کنگ کمارشن ایجنسی نامی ایک کمپنی کھڑی کی گئی تھی جس

کا کام تھا ہڑتالیوں کو توڑنا اور ہڑتالیوں پر ظلم ڈھانا اور پولیس
مدد کرنا۔ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ جہاں کہیں ہڑتال ہوتی
وہاں ان غنڈوں (مزدور دشمنوں) کو تعینات کیا جاتا۔ ریلوے ڈاک
سامان کے (Railway Dock Str..) کے مالک جے۔ گولڈ نے
کھلم کھلا کہا تھا کہ "میں مزدوروں میں سے آدھے کو کرایہ پر لے
سکتا ہوں، باقی آدھوں کا خون کرنے کے لئے"۔

ایسے ہی ماحول میں آٹھ گھنٹے کی لڑائی جاری تھی۔
۱۸۸۴ء میں کناڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی منظم ٹریڈ اور
مزدور یونین کا وفاق (سن ۱۸۸۶ء میں جس کا نام بدل کر مزدور
کا امریکی وفاق ہو گیا) نے یہ تجویز منظور کی کہ سن ۱۸۸۶ء پہلی مئی سے
سارے ملک میں ۸ گھنٹے کام کے لئے سارے مزدور متحدہ
طور پر جدوجہد کریں۔

"نائٹس آف لیبر" نامی مزدور انجمن بھی اس وقت
کافی طاقتور ہو اٹھی تھی۔ صرف ایک سال کی مدت میں اسکے
ممبروں کی تعداد ایک لاکھ سے سات لاکھ ہو گئی اور ان میں
۸ گھنٹے کی جدوجہد وسیع پیمانے پر پھیل گئی۔ جن جوتوں کے
کارخانوں میں ۸ گھنٹے کی تحریک کامیاب ہوئی ان جوتوں کے
نام "۸ گھنٹے کے جوتے" پڑ گئے۔ "۸ گھنٹے کے جوتے" پہن
کر اور ہونٹوں میں "۸ گھنٹے کے سگار" دبائے مزدوروں کے جلوس
نعرے لگاتے ہوئے گزرتے جاتے تھے۔

تاریخی موڑ: آخر یکم مئی سن ۱۸۸۶ء کا تاریخی
دن آیا۔ حالانکہ ہڑتال کا مرکز شہر شکاگو تھا لیکن پورے امریکہ
میں ہڑتال کی تحریک پھیل گئی تھی۔ پانچ لاکھ سے بھی زیادہ
مزدوروں نے اس تحریک میں حصہ لیا اور گھبرائے ہوئے مالکان
نے محسوس کیا کہ مزدوروں کی مشترکہ طاقت کیا ہوتی ہے۔ فوری
طور پر اگر حکومت کی مشنری کو مزدور طاقت کے خلاف استعمال
نہ کی جائے تو پھر ان (مالکان) کے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ لہٰذا
۳ مئی کو میکارمک ہارویسٹر کارخانے میں ہڑتالی مزدوروں پر پولیس
کا حملہ شروع ہوا۔ نتیجے کے طور پر چھ مزدور مارے گئے اور
بے شمار زخمی ہو گئے۔ اسی کے خلاف ۴ مئی کو "ہے مارکیٹ
اسکوائر" میں مزدوروں کا ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا اور پھر
شروع ہوئی پولیس کی بربریت۔ مجمع میں ایک بم پھینکا گیا جس
سے ایک سارجنٹ مر گیا۔ اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں رہ گئی
کہ یہ پولیس ہی کی سازش تھی۔ پھر پولیس اور مزدوروں کے
درمیان کھلی شاہراہ پر ایک جنگ سی چھڑ گئی۔ چند منٹوں
ہی میں سات پولیس والے اور ۴ مزدور مر گئے۔ بے شمار
زخمی اور گھائل ہوئے۔ شکاگو کے اس خونیں تحریک کے بعد ہی
سے مزدور رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں اور ان پر
ظلم کا پہاڑ ٹوٹنے لگا۔ اور پھر جھوٹے سجائے ہوئے مقدمات
کا سلسلہ عدالتوں میں شروع ہوا۔

انصاف کے نام پر:

جن لوگوں نے مزدور رہنماؤں کو پہلے ہی سے
"ملزم" گردانا تھا انہی لوگوں کو لے کر انصاف کی جیوری
بٹھائی گئی تھی۔ ۲۱ جون کو جج جوزف۔ ای۔ پاری کی عدالت
میں سجائے ہوئے مقدمے شروع ہوئے۔ لیکن سب ہی مزدور
رہنما بہادر اور نڈر تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے۔ عدالت کے
ہال میں ان کی تقاریر کے وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ صرف
چند مزدور رہنما ہی نہیں بلکہ پورا سماج وہاں آن موجود ہوا
ہے۔ یہاں ذیل میں دو چار اقتباسات پیش کرنا غالباً
نامناسب نہیں ہوگا:

نیبز کی تقریر تلخی اور طنز سے بھرپور تھی۔ "میں نے
دیکھا تھا کہ اس شہر میں روٹی والوں کے ساتھ کتوں جیسا سلوک
کیا جاتا ہے .... میں نے ان کو متحد ہونے میں مدد کی
تھی۔ یہ ایک بڑا قصور تھا۔ ۱۴ یا ۱۶ گھنٹے کے بدلے لوگ اب
دن میں ۱۰ گھنٹے کا کام کر رہے ہیں .... یہ ایک اور
الزام ہے۔ اس سے بھی بڑھکر قصور میں نے کیا ہے۔ صبح اپنے
ساتھیوں کے ساتھ نکلتے وقت میں نے دیکھا کہ شکاگو شہر کے
شراب کے کارخانے میں کام کرنے والے رات کے ۴ بجے کام پر
جاتے ہیں اور وہ لوگ رات کے ۷ یا ۸ بجے گھر لوٹتے ہیں۔ ان
لوگوں نے دن کی روشنی میں کبھی گھر والی یا بچوں کی صورت نہیں

دیکھا .... میں ان لوگوں کو متحد کرنے گیا تھا ....
اور عزت مآب حضور والا! میں نے ایک اور قصور بھی کیا ہے
میں نے مودی خانے میں کام کرنے والے اور اس شہر کے دیگر
مزدوروں کو ۸ اور ۱۰ بلکہ رات کے گیارہ بجے تک کام کرتے
ہوئے دیکھا ہے ۔ میں نے انہیں آواز دی ....
وہ شام کے ۷ بجے تک کام کرتے ہیں اور اتوار کو کام نہیں کرتے ۔
یہ بھی میرا ایک بڑا قصور ہے حضور !"

اپنی مستقل مزاجی کے ساتھ ایک شعر کے ذریعہ
پارسنس نامی ایک رہنما نے یوں کہنا شروع کیا ـــ

غلامی، غریبی اور خوف کو دھول میں ملا دو
روٹی ہی آزادی ہے ، آزادی ہی روٹی ہے

دو دنوں تک مزدوروں کی کہانی سُناتے رہے جو ہڑتالیوں کے
خلاف تشدد، مشتعل کرنے والے اخباروں کے اداریے، مزدوروں
پر کنگ کارٹن کی لاٹھی برسانے والی فوج، پولس کے مظالم، فوج
کے حملوں، گولیوں کے شکار معصوم مزدوروں اور ان کے قتل وغیرہ کے
واقعات سے بھری کہانی تھی ۔ انہوں نے کہا کہ مالکوں کی طاقت
کے استعمال کے جواب میں طاقت استعمال کرنے کے علاوہ میں
نے کبھی تشدد کی وکالت نہیں کی ہے ۔ انہوں نے الزام لگایا کہ
امریکہ کی زندگی سے ۸ گھنٹے کی لڑائی کو مٹانے کے لئے صنعت
کاروں نے "ہے مارکیٹ" میں بم پھینکنے والے کو خریدا تھا ۔ انہوں
نے یہ بھی کہا کہ " .... ہڑتالیوں پر ڈائنامائیٹ بم پھینک
کر دوسروں کو ہوشیار کر دو " ـــ کیا یہ بات انہوں (اجارہ
داروں) نے پہلے نہیں کہی تھی ؟ ـــ "انہیں (ہڑتالیوں کو) زہر
دے دو " ـــ یہ بات کیا "شکاگو ٹریبون" نامی اخبار نے
نہیں لکھی تھی ؟ اور وہی انہوں نے کیا ہے .... ان
ہی لوگوں نے بم پھینکا ہے اور "ہے مارکیٹ" میں ہم رستی کو
جو بم پھینکا گیا تھا وہ ایک اجارہ دار سرمایہ دار کے ہاتھوں
نیویارک سے بھیجا گیا تھا ۔ ۸ گھنٹے کی تحریک کو دھول میں
ملانے کے لئے .... جی حضور سب سے گھناؤنا اور
ذلت آمیز جو شر پسند چال چلی گئی ہے ہم اسی کی بات کر رہے
ہیں ۔"

اسپائز کی تقریر بہت ہی ولولہ انگیز تھی ـــ
" غریبی اور تکلیف سے کچلے ہوئے لاکھوں لوگوں کو اس تحریک
میں اپنی نجات کی امید نظر آتی ہے ۔ اگر آپ لوگوں نے یہ سوچ
رکھا ہے کہ مجھے پھانسی دے کر اس مزدور تحریک کو اکھاڑ پھینکیں
گے ـــ اگر آپ لوگوں کی یہی منشاء ہے تو مجھے پھانسی پر
لٹکا دیجئے ۔ یہاں اس چنگاری پر آپ پیر رکھیں گے، لیکن وہیں
سے آپ لوگوں کے پیچھے، سامنے اور سبھی جگہ اس کی لپٹیں
لپٹیں پھیل جائیں گی ۔ یہ پاتال کی آگ ہے ۔ آپ اسے بجھا نہیں
پائیں گے .... سچی بات کہنے کی ہمت دکھانے کیلئے
اگر آپ لوگ انسان کو پھانسی پر چڑھانا چاہتے ہیں تو فخر اور
لاپرواہی کے ساتھ میں یہ قیمت چکاؤں گا ۔ اپنے جلادوں کو
بلا لیجئے ۔ سقراط، عیسیٰ، گیارڈانو برونو، ہیس، گیلیلیو وغیرہ
کو جس سچ کے لئے پھانسی پر چڑھایا گیا تھا، وہ آج بھی زندہ
ہے ۔ ان لوگوں اور ان کے جیسے دوسروں کی ایک بڑی
جماعت ہم سے پہلے اس راہ پر چل چکی ہے ۔ ان کے راستے
پر چلنے کے لئے ہم تیار ہیں ۔"

یہ ساری باتیں سننے کے باوجود بھی جج پاری نے
۹ ستمبر ۱۸۸۶ء کے دن پھانسی کی سزا سنائی ۔ نیویارک
ٹائمس کے رپورٹر نے لکھا کہ " جج کا منہ زردروں سے کانپ
اٹھا .... اس کے "پھانسی کی سزا دی جاتی ہے" بولتے
وقت اس کا گلا رندھ اٹھا اور وہ بولا جب تک آپ کی موت نہیں
ہوتی ۔ آخر کے الفاظ سنائی نہیں پڑے ۔"

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سپریم کورٹ نے
مقدمہ کے بارے میں پھر سے غور کرنے سے انکار کر دیا ۔ ۱۱ر نومبر
۱۸۸۶ء کو پھانسی دینا طے پایا ۔

امریکہ کے ولیم ڈین ہاولیس، ہنری ڈیمورسٹ
لوئیڈ، جان براؤن، شکاگو کے سیکڑوں ممتاز شہریوں، سیموئل
گمپارس اور دیگر ٹریڈ یونین کے لیڈروں اور ہزاروں انسانوں نے
اعلان کیا کہ سیاسی وجوہات پر انہیں پھانسی کی سزا دی

جارہی ہے۔ پھانسی کی سزا رد کرنے کے لئے انہوں نے سرکار سے اپیل کی۔ فرانس کی پارلیمنٹ نے پھانسی کی سزا رد کرنے کیلئے گورنر سے اپیل کی۔ فرانس، اٹلی، اسپین، روس، ہالینڈ، انگلینڈ وغیرہ کے دیگر بے شمار جلسوں میں بھی یہی اپیل کی گئی۔ انگلینڈ کے مشہور ڈرامہ نگار برنارڈ شا اور شاعر ولیم موریس نے ہزاروں لوگوں کے دستخط کے ساتھ ان لوگوں کو پھانسی سے بچانے کی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

۸ مجرموں میں نیب کو پندرہ سال قید کی سزا دی گئی۔ پھانسی کی تاریخ سے ایک دن پہلے گورنر نے فیلڈن اور اسکواب کو پھانسی کے بدلے تا عمر قید کی سزا سنائی۔ اسی دن ۲۲ سالہ نوجوان لنگ نے خودکشی کی یا جیل کے اپنے کمرے ہی میں قتل کر دئے گئے۔

۱۱ نومبر ۱۸۸۷ء کو مزدور طبقہ کے چار بہادروں اسپائز، فیشر، اینجل اور پارسنس — کو پھانسی دی گئی۔ آخر دم تک وہ بہادر، لاپرواہ اور آزاد بنے رہے۔ ان کے گلے سے زوردار آواز نکلی — "آج تم لوگ ہمارا گلا دبوچ رہے ہو، ہماری خاموشی اس چیخ سے بھی بلند ہوگی، ایسا دن آکر ہی رہے گا۔" یہ تھی اسپائز کی مستقبل سے متعلق پیش گوئی۔

"یہ میری زندگی کا سب سے حسین لمحہ ہے۔" فیشر نے یہ پُرمعنی الفاظ کہے۔

"انارکی زندہ باد" — اینجل (وہ ایک انارکی تھے) نے خوشی سے مچلتے ہوئے کہا۔

"اے امریکہ کے باشندے — مجھے بولنے کی اجازت دی جائے گی کیا؟ شہر کے شریف میکسن! مجھے بولنے دیجئے۔ عوام کی آواز سنی جائے۔" پارسنس نے بے چین ہو کر کہا۔

اس طرح چار دلیر مزدوروں کی زندگی موت سے گلے ملنے لگی اور مزدور تحریک میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

بین الاقوامی مزدور کا دن: دسمبر ۱۸۸۸ء میں مزدوروں کی امریکی فیڈریشن نے سینٹ لوئی شہر میں ہونے والے اپنے سیشن میں فیصلہ کیا کہ یکم مئی ۱۸۹۰ء سے ہر سال امریکہ کے مزدور جلوس نکالیں اور جلسے کریں۔

کارل مارکس اس وقت زندہ نہیں تھے لیکن انکی زندگی بھر کے ساتھی فریڈرک اینجلس نے بڑی لگن کے ساتھ مزدور طبقہ کی بین الاقوامی تنظیم کے قیام کا کام جاری رکھا۔ ۱۴ جولائی ۱۸۸۹ء کو (۱۷۸۹ء کی فرانس کے بورژوا انقلاب کے وقت باسٹل نامی بدنام جیل کے توڑے جانے کی سوویں سالگرہ کے دن) دنیا کے مختلف ممالک کے اشتراکیت پسند پیرس میں دوسری انٹرنیشنل کے قیام کے لئے جمع ہوئے، پیرس کانگریس میں یوم مئی کو بین الاقوامی دن کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا گیا کیوں کہ دسمبر ۱۸۸۸ء میں بمقام سینٹ لوئی، مزدوروں کی ایک فیڈریشن کی کانفرنس میں یکم مئی ۱۸۹۰ء سے ہر سال اس دن کو احتجاجی جلوس اور جلسہ کے دن کے طور پر منانے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس لئے اس دن کو بین الاقوامی احتجاجی جلوس کا دن تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہر ملک کی جو صورتحال ہوگی اس کے مطابق وہاں کے مزدور احتجاجی جلوس نکالیں گے۔ اسی وقت سے مزدور طبقہ نے بین الاقوامی یوم مئی منانا شروع کیا۔ جو یوم مئی صرف امریکہ میں منایا جاتا تھا وہ اب دنیا بھر میں منایا جائے گا۔ آج تک دنیا کے مزدور ملک، ذات، زبان، رنگ سے اوپر اٹھ کر یوم مئی مناتے ہیں اور ایسے غیر طبقاتی سماج قائم کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں جہاں محرومی اور چھین جھپٹ برائے نام بھی نہ ہو۔

سماج کو بدلنے کا مقصد: مارکس کی موت کے بعد مزدور طبقہ کی بین الاقوامیت اور صحیح بیداری کو اور بھی بلند کرنے کے لئے اینجلس مزید جوش و ولولہ کے ساتھ کام کرتے رہے۔ یکم مئی ۱۸۹۰ء کے دن یعنی پہلی بین الاقوامی یوم مئی کو اینگلس نے کمیونسٹ منشور کے نئے جرمن ایڈیشن کے پیش لفظ میں یوم مئی کی اعلیٰ پیمانے پر تشہیر کے مقاصد کو اجاگر کیا۔ زیورک میں ۱۸۹۳ء میں ہونے والی دوسری

بین الاقوامی کانگریس میں اینجلس کی موجودگی میں جو تجاویز
پاس ہوئیں وہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: صرف آٹھ گھنٹے
کے کام کے دن کے لئے ہی یوم مئی نہیں ہے بلکہ سماج میں
تبدیلی لاکر طبقاتی فرق کو مٹا دینے کے لئے مزدور طبقہ کے
اعلیٰ عزم میں مزید استحکام پیدا کرنا لازمی ہے اور اسی
طرح سے اس راستہ پر آگے بڑھنا ہوگا جو سبھی طبقوں کے لئے
شانتی کا راستہ ہے، بین الاقوامی امن کا یہی ایک واحد
راستہ ہے۔

اس کے بعد سے الگ الگ ملکوں کے مزدور طبقوں
نے مزدور طبقہ کی فکر اور بیداری میں یوم مئی سے متعلق علیحدہ
علیحدہ انقلابی مفہوم پیدا کئے۔ لینن کی رہنمائی میں روس میں
یوم مئی مزدور طبقہ کے انقلابی جدوجہد کا ایک مضبوط ہتھیار
بن گیا تھا۔ یوم مئی کی ہڑتال، احتجاجی جلوس، جلسے، اشتہارات
وغیرہ سب کچھ کو انقلابی بیداری اور تنظیم کو بڑھاوا دینے
کے لئے بڑے حسن وخوبی سے لینن نے استعمال کیا تھا۔ یوم
مئی کے لئے لکھے گئے لینن کے بہتیرے اشتہارات آج بھی ہماری
ہمت افزائی کرتے ہیں۔ ان کی ان تھک کوششوں کے پُرمعنی
نتائج ۱۹۱۷ء کے نومبر انقلاب میں ظاہر ہوئے تھے۔

سازش و ہتھکنڈے: یوم مئی کے دوررس
مفہوم اور انقلابی کردار کو امریکہ کے ظالم حکمراں سمجھ گئے تھے۔
امریکہ کے صدر ہوور کے عہد میں اس دن کو بھلا دینے کی
کوشش کی گئی۔ ایک عجیب طریقہ اپنایا گیا جیسے یکم مئی کو بچوں
کا صحت کے دن کے طور پر منانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مزدوروں کی امریکی ایسوسی ایشن
کے ۱۹۲۸ء میں ہونے والی کانفرنس کی ایگزیکیوٹیو کمیٹی
(Executive Committee) کے بیانیہ سے یہ بات
صاف ہوگئی: کمیونسٹ آج بھی یکم مئی کو مزدور کے دن کے
طور پر مناتے ہیں۔ چونکہ کانگریس کی ایک تجویز میں یکم مئی کو
بچوں کی صحت کا دن کے طور پر منانے کے لئے امریکہ کے عوام سے
اپیل کرنے کیلئے صدر کو کہا گیا ہے اس لئے اب سے یکم مئی بچوں
کی صحت کا دن کہلائے گا۔ پورے سال کو بچوں کی صحت کے
تحفظ کے لئے ذہنیت تیار کرنا ہی ہمارا مقصد ہے، یہ ایک عظیم
مقصد ہے۔ اس کے ساتھ ہی اب سے یوم مئی ہڑتال یا
کمیونسٹ یوم نہیں کہلائے گا۔

جو مزدوروں کی انجمن تاریخی یوم مئی کو منظم کرنے والی
انجمنوں میں تھی، آگے چل کر اسی کے رہنماؤں نے مزدور طبقہ کو
بہلاوے میں ڈال دینے کی کوشش کی۔

مزدور طبقہ کی بیداری کی گہرائی میں یوم مئی نے
ایک دائمی مقام بنالیا ہے۔ اس بات سے ہٹلر بھی واقف تھا
اس لئے ۱۹۳۳ء میں اس نے یوم مئی کو "قومی یوم مزدور" اور چھٹی
کا دن قرار دے کر شیطانی رجحانات کا ثبوت دیا۔ ہزاروں
جھنڈوں سے آراستہ برلن کے ہوائی اڈے میں ایک لاکھ مزدوروں
کے جلسے میں ہٹلر نے اپنی تقریر میں کہا کہ جرمن مزدوروں کے
سماج میں صدیوں تک یوم مئی منایا جائے گا۔ یہ شیطانیت
سے بھرا وعدہ کبھی بھی پورا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے اگلے دن ہی
سارے ملک کے مزدور رہنماؤں کو گرفتار کرکے جیل میں ٹھونس
دیا گیا اور ان کی املاک کو ضبط کرلیا گیا۔

شاندار روایت: پچھلے ایک سو برسوں کے
دوران ساری دنیا کی مزدور تحریک نے سرمایہ دارانہ نظام،
شہنشاہیت اور فسطائیت کے خلاف جدوجہد میں اور قومی
آزادی کی تحریک میں بہتیرے ہمت افزا واقعات اور تجربوں
کے ذریعہ یوم مئی کی جدوجہد کی شاندار روایت قائم کی ہے۔
اسی کے نتیجہ کے طور پر ہر سال یوم مئی کے موقع پر مزدور طبقہ
کے دل ودماغ میں نئی امید کی روشنی دکھائی دیتی ہے، انقلابی
ممکنات ابھرتی ہیں اور نئی لگن پیدا ہوتی ہے۔

خاص خاص تاریخی موقعوں پر اس کا ثبوت ملتا ہے۔
مثلاً خانہ جنگی سے پہلے اسپین کے دارالسلطنت میڈرڈ کی
سڑکوں پر ۱۹۳۶ء کے یوم مئی کے موقع پر بڑا بھاری جلوس
ہمیں اسی بات کی یاد دلاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری
دنوں میں ۱۹۴۵ء میں ٹھیک یوم مئی کے قبل سرخ فوج کا
برلن پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی وہی احساس و جذبہ مظہر ہے۔

۱۹۷۵ء میں ویت نام کی عظیم سپاہیوں نے یوم مئی کو بے طوفانی رفتار سے دشمن سے گھیرے سیگون میں داخل ہوئی تھی اور امریکیوں کے خونخوار قبضہ سے ویت نام کو آزاد کرادیا تھا۔

تمام حکمرانوں کی ساری سازشوں، عوام دشمن پالیسیوں کو چکنا چور کرتے ہوئے یوم مئی کی پیش قدمی جاری ہے۔ یوم مئی انقلابی بیداری کا ایک نہ ختم ہونے والا سرچشمہ بن چکا ہے۔

ہندوستان کی دین: ۱۸۵۴ء میں بنگال میں ریلوے کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ اس کے ۸ سال بعد ہی ۱۸۶۲ء کے مئی کے مہینہ میں ہوڑہ اسٹیشن کے ۱۲۰۰ مزدوروں نے روزانہ ۸ گھنٹے کام کرنے کی مانگ پر ہڑتال کی تھی۔ ان دنوں کے زبردست انتہا پسند سیاسی و معاشی ہفتہ وار "سوم پرکاش" (بنگلہ) (۲۳ بیساکھ ۱۲۶۹) کے شمارہ میں اس ہڑتال کی رپورٹ چھپی تھی۔ افسروں سے کہا گیا تھا کہ وہ مزدوروں کی مانگیں تسلیم کریں۔ مانگیں تسلیم نہ کی گئیں تو ریل میں کام کرنے کیلئے آدمی نہیں ملیں گے۔ دوارکا ناتھ ودیا بھوشن اس اخبار کے مدیر تھے اور ایشور چندر ودیا ساگر کے منصوبے کے تحت یہ اخبار نکلا تھا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہندوستان کے صنعتی مزدوروں کی یہی پہلی ہڑتال تھی اور آٹھ گھنٹے کی مانگ کے سلسلے میں دنیا کی دوسری ہڑتال تھی۔

بنگال کے مزدور طبقہ کے یہ شاندار کارنامے آج بھی ہندوستان کے لئے باعث فخر ہیں۔ مختلف ملکوں میں مزدور تحریک جو روایت قائم کر رہی ہے اس میں ہمارے ملک کی دین قابل ذکر ہے۔

ہندوستان میں یوم مئی: ہندوستان کی سرزمین پر پہلی بار یوم مئی ۱۹۲۳ء میں مدراس کے ساحل پر مزدور رہنما سنگارا ویلو چیٹیار کی صدارت میں منائی گئی۔ اس تقریب میں دنیا کے مزدور طبقہ کے اس متبرک دن کو سرکاری چھٹی کا دن قرار دینے کی سرکار سے گزارش کی گئی۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اس تقریب میں آس پاس سرخ جھنڈا نہ ہونے کی وجہ سے کامریڈ چیٹیار نے اپنی بیٹی کی سرخ ساری پھاڑ کر اپنے گھر پر سرخ جھنڈا لہرایا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ۱۹۲۴ء کے کانپور بولشویک سازشی مقدمہ کے آپ خاص ملزم تھے۔

۱۹۲۵ء میں یوم مئی کے موقع پر دس ہزار عورتیں، مرد اور بچے جلوس نکال کر لندن کے ہائیڈ پارک میں جمع ہوئے تھے۔ "ہندوستان کو آزاد کرو نہیں تو ہماری جگہ آجاؤ" یہ نعرہ لکھا ہوا جھنڈا لے کر ایشیائی لوگوں کا ایک جتھا وہاں موجود تھا۔ ۱۹۲۶ء کے یوم مئی میں اسی ہائیڈ پارک میں ہندوستان جہاز یونین کے نمائندے شامل ہوئے تھے۔

۱۹۲۷ء میں یوم مئی کے جلوس میں میونسپلٹی کے مزدور بھی شامل ہوئے تھے اور ان کے سامنے تھے مزدور لیڈران این۔ ایم۔ جوشی، ایس۔ ایس۔ میرجکر، ایس۔ بی۔ گھاٹے وغیرہ۔ اس کے علاوہ پشاور سازش کیس، کمیونسٹ سازش کیس اور میرٹھ سازش کیس کے خاص ملزم میر عبدالمجید کی رہنمائی میں اسی سال تانگے والوں نے لاہور میں پوسٹروں اور سرخ جھنڈوں کے ساتھ یوم مئی منایا تھا۔

۱۹۲۷ء میں کل ہند ٹریڈ یونین کانگریس کے اعلان پر کلکتہ، بمبئی، مدراس وغیرہ شہروں میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ یوم مئی منایا گیا۔ اس سال کا یوم مئی صرف جدوجہد ہی میں نہیں بلکہ ثقافت کے میدان میں بھی اپنا نشان چھوڑ گیا۔ بنگلہ ہفتہ وار "گنوانی" کے مئی کے شمارے میں مزدور طبقہ کے بین الاقوامی ترانے کا بنگلہ ترجمہ کرکے انقلابی شاعر قاضی نذرل اسلام نے "انٹرنیشنل سنگیت" کے نام سے سر کے ساتھ شائع کروایا۔ اتنا ہی نہیں "گنوانی" کے اسی شمارہ میں انہوں نے ایک اور ترانہ "رکتو پتا کا رگان" (خون آلود پرچم کا گیت) لکھا:

لہراؤ، لہراؤ، لال پرچم ؛ اڑاؤ، اڑاؤ، خون آلود نشان
لہرائے چلے افق سے افق تک ؛ لہراؤ، لہراؤ، لال پرچم

اس طرح جدوجہد کے ساتھ ثقافت کی آمیزش سے بنگال کی مزدور تحریک کو ایک نیا راستہ ملا۔

اس کے بعد سے ہر سال بے شمار رکاوٹوں، دشواریوں اور طوفانوں کی پروا کئے بغیر یوم مئی منایا جاتا ہے لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۶ء کو یوم مئی کا ایک یادگار واقعہ پیش آیا۔ انقلابی نوجوان شاعر سوکانتو بھٹاچاریہ نے "یوئی مئے" (یکم مئی) ۱۹۴۶ء نامی نظم لکھی۔ اس میں مظلوم انسانوں سے کہا گیا کہ:

سرخ آگ پھیل چکی ہے اس اور سے اس اور تک
کتنے دنوں سے زندگی گزارنے سے کیا حاصل

کب تک بھلائے رکھوگے پیٹ کی بھوک اور گلہ کی زنجیر
کب تک ہلاتے رہوگے دم
اس سے بہتر ہے کہ اس کی وفاداری سے انکار کرو
غلامی کی نامنظوری

زنجیر کے داغ کو چھپاتے ہوئے آگ آئیں گے
شیر ببر کا ایال ہر ایک کی گردن پر

اسی سال کلکتہ میدان کے عظیم الشان یوم مئی کے اجتماع میں مشہور برٹش کمیونسٹ رہنما رجنی پام دت نے تقریر کی تھی۔ سارا مجمع بین الاقوامی بیداری سے سرشار ہو اٹھا تھا۔

متحدہ محاذ حکومت کا دور: ۱۹۶۷ء میں مغربی بنگال میں متحدہ محاذ حکومت کے اقتدار میں آنے سے قابل ذکر باتیں رونما ہوئیں۔ اسی وقت سے مغربی بنگال کے سبھی سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں اور صنعتوں میں سرکاری طور پر یوم مئی کو چھٹی کا دن تسلیم کیا جا رہا ہے۔

ایمرجنسی اور دہشت: ۱۹۷۲ء سے مغربی بنگال میں بڑے پیمانے پر دہشت کا راج شروع ہوا تھا۔ مزدور طبقہ کانگریسی سرکار اور مالکوں کا مشترکہ حملہ ہونے لگا تھا۔ اسی ماحول میں ۱۹۷۴ء میں سارے ہندستان کے ریلوے مزدوروں کی سب سے طویل اور بڑی ہڑتال ہوئی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ریلوے مزدوروں کی مانگوں میں ۸ گھنٹے کی مانگ بھی شامل تھی۔ ۱۸۶۲ء کے مئی کے مہینہ میں ہوڑہ اسٹیشن کے مزدوروں نے بھی ۸ گھنٹہ کی مانگ کے لئے ہڑتال کی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں سارے ہندستان کے ریل مزدوروں نے دنیا کو بتلا دیا کہ ایک سو بارہ برسوں کے بعد بھی ان کی مانگ پوری نہیں ہوئی ہے۔ اس ہڑتال کے وقت سامراجیت کی حمایتی / عوامی حکومت کی مخالف اور مزدوروں کی دشمن سرمایہ داری کا صرف بدصورت چہرہ ہی سامنے نہیں آیا بلکہ اس کی بے رحمی اور دہشت پسندی کا ثبوت بھی ملا۔

۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی نافذ کی گئی۔ جلوس، جلسہ، ہڑتال وغیرہ غیر قانونی قرار دے گئے۔ سارے جمہوری اختیارات سلب کر لئے گئے۔ اخباروں میں شائع ہونے سے پہلے مواد حکومت کو دکھا کر شائع کرنے کا قانون (censorship) لاگو ہو گیا۔ یہاں تک کہ ٹریڈ یونینوں کی چھپی رپورٹ اور رجسٹر بھی اس کی لپیٹ میں آگئیں۔ دوسری طرف مالکوں کو بے روک ٹوک استعمال کرنے کا حق مل گیا۔ آخر ۱۹۷۷ء میں ایمرجنسی کا دور ختم ہو گیا۔

بایاں محاذ اور مزدور طبقہ: ۱۹۷۷ء میں مغربی بنگال میں طوائف الملوکی کا خاتمہ کر کے عوام نے بائیں محاذ حکومت کو اقتدار میں لایا۔ مزدوروں، کسانوں اور عام لوگوں نے ٹریڈ یونین اور جمہوری حقوق کو دوبارہ حاصل کیا۔ یہاں تک کہ ریاستی سرکاری ملازمین کو بھی ٹریڈ یونین کا حق ملا۔ مزدور طبقہ کی ہر مناسب جدوجہد کو حکومت کی عملی حمایت ملتی ہے۔

اس کے علاوہ کسانوں کے لئے برگہ زمین کا حق دیا گیا غریب کسانوں اور کھیت مزدوروں میں پنچایت کے ذریعہ زمین کی بٹائی، لگان کی معافی اور جمہوریت کی تبلیغ وسیع پیمانے پر ہوئی بنگال کے گاؤں گاؤں میں نئی بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے تعلیم کے میدان میں اس حکومت نے نمایاں خدمات انجام

گئے ہیں۔ اور نچلے ثانوی درجوں تک کی تعلیم مفت کر دی گئی ہے۔ مادری زبان کی ترویج [illegible] ہر مرحلہ پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ ابتدائی تعلیم کو وسیع پیمانے پر عام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ طلبا کے لئے مفت کتابیں اور ٹفن فراہم کیا جاتا ہے۔ ساری ریاست میں نئے نئے اسکول کھولے جا رہے ہیں۔ اس سے عوام میں نئی امنگ پیدا ہو گئی ہے اور ان پر اس کا ایک اچھا اثر پڑ رہا ہے۔

مرکزی حکومت کی امتیاز، تفریق کے نظریوں اور اپنے محدود معاشی ذرائع کے باوجود بھی ریاستی حکومت صنعتوں کی ترقی کے لئے لگاتار کوشش کرتی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں اس سلسلے میں دیگر اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں۔ کہنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ حکومت نے غریبوں پر اندھا دھند ٹیکس کا بوجھ لاد دینے کی کوشش کبھی نہیں کی ہے۔ ان باتوں کی وجہ سے بائیں محاذ حکومت کو قائم و دائم رکھنے کی بیدار کوششیں مزدوروں، کسانوں اور عوام میں نمایاں ہیں۔ کلکتہ سے ریاستی ٹرانسپورٹ ملازمین اور بجلی کے ملازمین میں بھی یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ عوام میں بھی بلا تامل اس سیاسی بیداری کا اظہار پایا جا رہا ہے۔ برسوں کی بے شمار تکلیفوں اور قربانیوں کے بعد بائیں محاذ حکومت وجود میں آئی۔ گاؤں اور شہروں کے بے شمار مزدوروں کی حمایت کے زور پر بائیں محاذ حکومت قائم ہے۔

یہاں اب بھی سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ نہیں ہوا ہے اور اسی نظام کے درمیان اس حکومت کو کام کرنا پڑ رہا ہے۔ حکومت نے جو نمایاں قدم اٹھایا ہے اس کی وجہ سے ایک طرف جس طرح مظلوم لوگوں کے دلوں میں امید کی قندیلیں جل اٹھی ہیں تو دوسری طرف اسی طرح مفاد پرست افراد حکومت پر لگاتار تنقیدیں کرتے رہتے ہیں۔ ریاست کے مسائل کے بارے میں امتیاز اور تفریق کی باتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ سرمایہ داروں کے حامیوں کے درمیان طبقاتی جدوجہد کی روشنی میں مرکز اور ریاست کے درمیان تعلقات نئے طور سے زیادہ ہی پُر معنی بنتے جا رہے ہیں یعنی ایک پیچیدہ صورت حال اختیار کر رہے ہیں۔ بیدار و متحدہ مزدور طبقہ کو آگے چل کر اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

تاناشاہی اور سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کے خاتمہ، مزدور طبقہ کے ہاتھوں ریاستی اقتدار کی منتقلی اور اشتراکیتی نظام کے قیام کے بغیر مزدور طبقہ اور انسانی سماج کی بقا ممکن نہیں ہے۔ مزدور تحریک کی اس بیداری کو رفتہ رفتہ مزید ٹھوس اور واضح شکل دینے کی ضرورت ہے۔

جنگ عظیم کا فوری خدشہ: سرمایہ دارانہ غلامی کی زنجیر سے نجات اور اشتراکیت کے قیام کے لئے دنیا کی مزدور تحریک نے جو ان تھک جدوجہد شروع کی اسی کے نتیجہ میں آج دنیا کے ایک تہائی سے زیادہ حصہ کے لوگ سرمایہ دارانہ ظلم سے چھٹکارا پا کر اشتراکیتی نظام میں زندگی گزار رہے ہیں۔ بھوک، غریبی، بے کاری، ناخواندگی وغیرہ ہمیشہ کے لئے مٹا دی گئی ہے لیکن ساری دنیا کو ابھی تک تاناشاہی اور سرمایہ دارانہ نظام سے آزاد نہیں کیا جا سکا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جب تک سرمایہ دارانہ نظام قائم رہے گا اس وقت تک اشتراکیت کے لئے مزدور طبقہ کی جدوجہد جاری رہے گی۔ آج جب اشتراکیت کو مٹا دینے کے لئے امریکی سرمایہ داری عالمگیر پیمانے پر جنگ عظیم کی تیاری کر رہی ہے، انسانی سماج اور تہذیب کو بربادی کی طرف لے جا رہا ہے تو ایسی صورت حال میں بیداری اور متحد مزدور طبقہ کبھی بھی خاموش تماشائی کا رول ادا نہیں کر سکتا ہے۔ اس لئے عالمی امن کی بحالی کے سلسلہ میں اعلیٰ پیمانے پر جدوجہد کرنا ساری دنیا کے مزدور طبقہ کے لئے ایک بہت اہم فرض بن چکا ہے۔ اسی فوری مقصد کے پیش نظر ہی "دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ" کا نعرہ آج بے شمار جلسوں اور شاندار پیش قدمی میں ساری دنیا کے کروڑوں لوگوں کی زبان سے بلند ہو رہا ہے۔ ٭٭٭

پرچمِ احمر

ولی رضوی

ہزاروں سال ہیں سمٹے ہوئے دنیا کے دامن میں،
اسی میں ایک اٹھارہ سو چوراسی کا سال آیا!
مئی کا پہلا سورج جگمگایا تھا شکاگو میں ——
عجب دن تھا!
یہ دن تھا کامگاروں کا،
یہ دن تھا دل فگاروں کا،
یہ دن تھا اہلِ ثروت کی رعونت کا!

قطار اندر قطار آئے دریدہ دامنوں والے،
سفید ان کے تھے جھنڈے،
اک تمنا تھی نگاہوں میں ——
"انہیں جینے کا حق مل جائے،
کبھی تو مسکرا لیں وہ،
کبھی تو اتنی فرصت ہو کہ بچے گود میں آئیں،
ہنسیں کھیلیں اور اٹھلائیں!
غلامی کے ذرا اوقات کم ہوں،
صورتِ محنت سنور جائے ——"

یہی نعرے لبوں پر تھے!
یکایک اہلِ ثروت کی پولس سے رائفلیں گونجے،
معاً محنت کشوں کے سینوں پر نقش و نگیں ابھرے،
شفق گوں ہو گئے دامن!
لہو دائیں ——
لہو بائیں ——
لہو ہر سو ——
لہو سے ہو گئی شہرِ شکاگو کی زمیں رنگیں!
وہ بیٹے تھے، وہ بھائی تھے، وہ شوہر تھے!
لہو سے سرخ رو ہو کر ——
لہو سے باوضو ہو کر ——
وہ گرتے جا رہے تھے، بڑھتے جاتے تھے!
اچانک اک جیالے نے ——
اٹھایا اپنا پرچم،
اور شہیدوں کے لہو سے اس کو رنگ ڈالا،
اسی دن سرخ جھنڈے نے حیاتِ جاوداں پائی،
سلام اے پرچمِ احمر!!!



یوم مئی
صد قندیلوں کی روشنی میں

از: بھبتوش رائے

ہندوستان میں برطانوی دورِ حکومت میں سامراجی مفادات کی متقاضی جو محدود صنعت بندی ہوئی اس میں بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں قدرتی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے بمبئی، مدراس اور کلکتہ شہر آباد ہوئے اور ان تینوں شہروں کے نواحی علاقوں میں صنعتی پٹیاں پھیل گئیں۔ بنگال میں پٹ سن کی وجہ سے جوٹ ملیں کھلیں۔ چائے باغات وجود میں آئے، کوئلے اور ابرق کی کانیں کھوج نکالی گئیں، سوتی ملیں بنیں اور ریلوے کے نظام نے تمام صنعتی پیداوار کو ایک نظام کے تحت پہونچانے میں کلیدی رول ادا کیا۔ سمندری جہازوں کے ذریعہ برطانوی حکومت نے ہندوستان اور انگلستان کے مابین تجارت میں اضافہ کیا لیکن دونوں طرف کی تجارت کا فائدہ انگریز تاجروں کو ہی زیادہ ہوا کرتا تھا جس کی وجہ سے بنگال میں اجرت کی سطح بہت کم رکھی گئی اور اسی چیز نے مزدوروں کو ٹریڈ یونین تحریک کی طرف مائل کیا۔

برطانوی دورِ حکومت میں مزدوروں کے کام کے گھنٹے یکساں نہیں تھے۔ نہ پراویڈنٹ فنڈ یا گریجویٹی کا انتظام تھا۔ بونس کی ادائیگی بھی برطانوی دور کے آخری زمانے میں کی جانے لگی جس کے لئے کافی تحریکیں چلیں۔ کام کے دوران زخمی ہو جانے یا موت کا شکار ہو جانے پر کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ بیماری کی چھٹی نہیں تھی اور ملازمت کی سلامتی کے نام پر کوئی چیز نہیں تھی۔ مزدوروں کے رہائشی حالات غیر انسانی تھے جو ابھی تک ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی ان کی زندگی بہت کرب ناک اور مصیبت زدہ تھی۔

۱۹۲۶ء میں انڈین ٹریڈ یونین ایکٹ پاس ہوا اور مزدوروں کی تنظیم بنانے کا حق قانوناً تسلیم کر لیا گیا لیکن عملاً کارخانے دار یونین بنانے پر بہت ناراض ہوئے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ مزدور ان کے کارخانے میں یونین میں منظم ہوں۔ بنگال کی چٹکل صنعت میں صنعت گیر یونین چٹکل مزدور یونین کا جنم ۱۹۳۷ء کی ہڑتال کے اندر سے ہوا۔ یونین بنانے کے جرم میں ان گنت مزدوروں کو اپنی روزی سے محروم ہونا پڑا۔ اس کے باوجود ٹریڈ یونین تحریک آگے بڑھتی گئی۔

۱۹۴۷ء میں ملک کو سیاسی آزادی حاصل ہو گئی اور

انگریزی دورِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۴۸ء میں صنعتی تنازعات ایکٹ اور فیکٹریز ایکٹ جیسے قوانین بنے جن کے لئے ٹریڈ یونین تحریک بہت سرگرداں تھی۔ ان قوانین میں مزدوروں کے چند حقوق تسلیم کئے گئے۔ کارخانوں کی انگریزی ملکیت تیزی سے ہندوستانی ملکیت میں تبدیل ہونے لگی جس کے ساتھ ہی مزدوروں کے کام کے حالات پر حملے ہونے لگے۔ استحصال کی شرح میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔

بنیادی اصلاحاتِ اراضیات نہ ہونے کی وجہ سے پورے ملک میں غریب اور درمیانی کسانوں کی حالت بگڑتی گئی۔ کھیت مزدوروں اور بٹائی داروں کی تنگ دستی انہیں شہروں کی طرف ڈھکیلنے لگی اور دیہاتوں میں بسنے والے ۷۰ فیصد لوگوں کی قوتِ خرید میں برائے نام بھی اضافہ نہ ہونے کی وجہ سے ملک کی صنعت بندی کو زبردست نقصان پہونچا۔ نئے کل کارخانے بہت کم بنائے گئے۔ خاص کر مغربی بنگال میں ۱۹۵۶ء کے بعد کوئی ایک جدید کارخانہ نہیں بنا۔

ان حالات کے تحت مغربی بنگال کے مزدور اور کسان اپنے حقوق اور جمہوری مطالبات کے لئے لڑتے رہے۔ ان تحریکوں کی ہی دین ہے کہ ۱۹۶۷ء میں اس ریاست میں ایک سیاسی تبدیلی آئی۔

اس کے بعد کے دس سال کا دور نہایت نشیب و فراز کا دور تھا لیکن اس ریاست کے عوام کی سیاسی سمجھداری میں اضافہ ہوتا گیا اور ۱۹۷۷ء میں مضبوط بنیادوں پر پھر بایاں محاذ کی وزارت بن گئی ــــ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

بایاں محاذ نے اپنے انتخابی منشور میں ریاست کے عوام کو سبز باغ نہیں دکھایا تھا بلکہ موجودہ تاریخی حالات اور محدود اختیارات کے تحت عوام کو جس حد تک راحت پہونچائی جا سکتی ہے ۳۶ نکاتی منشور میں اسی کا وعدہ کیا اور پانچ سال کے اندر ان وعدوں کو پورا کر دکھایا۔ جوش و خروش کے ساتھ سنجیدگی میں بھی اضافہ ہوا۔ زندگی نے ایک نئے تجربے کا موقعہ فراہم کیا۔

اس منشور میں مزدوروں کے لئے مکمل ٹریڈ یونین حق کی ضمانت دینے کا وعدہ تھا۔ یہ وعدہ بھی پورا کر دیا گیا۔ مزدوروں اور بالخصوص سرکاری ملازمین کے لئے جو ضرر رساں قوانین تھے انہیں بدل دیا گیا اور تمام صنعتوں میں مزدوروں نے ہڑتالوں کے ذریعے اور کہیں کہیں بغیر ہڑتالوں کے اپنی تنخواہ مہنگائی بھتہ اور مکان کے کرایہ میں اضافہ کرنے پر کارخانہ داروں کو مجبور کیا۔ مزدوروں کی جائز تحریک کو بائیں محاذ حکومت کی تائید ملتی رہے۔ بایاں محاذ یہ جانتا ہے کہ نوے فیصد ووٹ دینے والے غریب اور درمیانی طبقے کے لوگ ہیں۔ انہیں متحد کئے بغیر سماجی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی چنانچہ ان کے مفادات کی حفاظت کی جائے تو اس کام میں مدد ملے گی اور سماجی تبدیلی کے اس عمل میں ہر موڑ پر ان کی حمایت بھی برقرار رہے گی۔ اسی نقطۂ نگاہ کے تحت مزدور پالیسی مرتب کی گئی تھی۔

محاذی دورِ حکومت میں کسی کارخانے یا صنعت میں ہڑتال ہونے کی صورت میں ٹریڈ یونین لیڈروں کو گرفتار کرنا تو دور کی بات ہے کارخانے کے گیٹ پر پولس جاتی بھی نہیں ہے۔ محاذی حکومت کی اس پالیسی نے مزدوروں کو بہت کچھ سمجھا دیا۔

۱۹۸۲ء کے الیکشن میں بایاں محاذ دوبارہ کامیاب ہوا اور دوسرے دور کی حکومت کا یہ آخری سال ہے۔ ان ۹ برسوں میں پورے ہندوستان کا معاشی بحران بہت بڑھ گیا ہے جس سے مغربی بنگال بھی باہر نہیں ہے۔ اس بحران کی بہت سی خوفناک علامتیں صاف دیکھی جا رہی ہیں ــــ یعنی بے کاری میں بے پناہ اضافہ اور ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں تیز رفتار چڑھاؤ ــــ مغربی بنگال کا محنت کش طبقہ اس کے خلاف مسلسل جد و جہد کر رہا ہے جلسہ جلوس، احتجاج، اجتماع، ہڑتال اور بند کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معاملے میں یہ ریاست ملک میں سب سے آگے ہے۔ بیکاری اور مہنگائی دونوں مسئلے جڑواں ہیں اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے ساتھ ان کا چولی دامن کا تعلق ہوتا ہے۔ ریاستی حکومت کی پالیسی کے دائرے میں یہ مسائل نہیں آتے اس لئے ماہرینِ اقتصادیات نے ان مسائل کے لئے ریاستی حکومت کو قصوروار نہیں ٹھہرایا بلکہ

لہذا اسے مرکزی حکومت کی پالیسی سے منسوب کیا ہے۔ ریاستی حکومت نہ ان مسائل کو جنم دیتی ہے اور نہ انہیں حل کرسکتی ہے۔

بائیں محاذ حکومت نے چھوٹی چھوٹی صنعتوں کا جال پھیلا کر کئی لاکھ مزدوروں کی روزی کا سامان مہیا کیا ہے جس کی وجہ سے مسئلے کی سنگینی میں کچھ راحت پہونچی ہے۔ اسی طرح ۴۲ لاکھ بیگھا زمین پر قبضہ کرکے اسے بے زمین کسانوں میں مفت تقسیم کرکے ملک میں اولین مقام حاصل کرلیا ہے جس سے اناج کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۸۴ میں جیوٹ کے مزدوروں نے ۴۸ دنوں کے لئے جو ہڑتال کی تھی اس کی وزیراعلیٰ جیوتی باسو نے کھل کر حمایت کی تھی اور ٹریڈ یونین مبصروں کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس ہڑتال کی کامیابی اور مطالبات کے تصفیے میں بائیں محاذ حکومت نے ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ یہ ہڑتال بڑے صبر آزما حالات میں ہوئی تھی اور اگر بائیں محاذ کی حکومت مغربی بنگال میں نہ ہوتی تو ہڑتال کی کامیابی مشکوک تھی۔ تنخواہ، مہنگائی بھتہ، مکان کے کرایے میں اضافہ کئے جانے کے علاوہ گریڈ اسکیل کا نفاذ عمل میں آیا جو ایک نمایاں کامیابی ہے۔

بائیں محاذ کی حکومت مغربی بنگال کے مزدور طبقے کے بنیادی مسائل حل نہیں کرسکتی کیوں کہ ان مسائل کا تعلق بنیادی سماجی تبدیلی سے ہے۔ ہندوستان میں سرمایہ داری کی تعمیر ہورہی ہے اور ملک کو ارتقاء کے سرمایہ دارانہ راستے پر چلایا جارہا ہے۔ بائیں محاذ کا کہنا یہ ہے کہ یہ راستہ عوام کے مفاد کی حفاظت کی طرف نہیں لے جائے گا بلکہ مسائل میں روز افزوں اضافے کی طرف لے جائے گا۔ اس لئے اس راستے کو ترک کرکے ایک ایسے راستے پر قدم رکھنا ہوگا جو ملکی اور غیر ملکی کثیر الاقوام کارپوریشنوں کی معاشی لوٹ سے ملک کو نجات دلاکر بنیادی اصلاحات آراضی کی بدولت اسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی طرف لے جائے۔

ملک کے عوام کی اکثریت کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی ہے۔ بایاں محاذ ان حالات میں بہت سوچ سمجھ کر ریاستی حکومت کی قیادت کررہا ہے اور محاذی حکومت مغربی بنگال کے معاشی میدان میں نئی اسکیموں کے ذریعہ مزدوروں اور کسانوں کو جس قدر ممکن ہوسکے راحت پہونچانے کے ساتھ غریب عوام کے اتحاد پر غیر معمولی زور ڈال رہی ہے۔

یہ بات محض اتفاقی نہیں ہے کہ جب پنجاب سے آسام تک فرقہ پرست علیحدگی پسند طاقتیں سر ابھار رہی ہیں ان حالات میں بھی مغربی بنگال میں بسنے اور کام کرنے والے ان مزدوروں کو کوئی آنکھ نہیں دکھا سکتا جو بنگالی نہیں ہیں اور جن کی تعداد کل مزدوروں کی تعداد کی ساٹھ فیصد ہے۔ بلا امتیاز مذہب، زبان، رنگ اور نسل کے بایاں محاذ تمام مزدوروں اور محنت کشوں کو یکساں عزیز رکھتا ہے اور سب کے لئے پُرامن ماحول میں روزی روٹی حاصل کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔

جب مختلف ریاستوں سے فرقہ وارانہ فسادات کی رپورٹیں مسلسل آرہی ہیں ان حالات میں مغربی بنگال میں مکمل سکون ہے اور فرقہ وارانہ امن و بھائی چارگی قائم ہے۔ اسلئے اقلیتوں کو سکون قلب حاصل ہے۔ مسلمان مزدور رات کو بے فکری سے سوتے ہیں اور اگر کسی مزدور علاقے میں شرپسند عناصر کوئی فتنہ انگیزی کرتے ہیں تو علاقے کے جمہوریت پسند انصاف پسند لوگ بھی حرکت میں آتے ہیں اور سرکاری انتظامیہ اور عوام کے چنے ہوئے نمائندے بھی مستعدی سے حالات کو سنبھالتے ہیں۔

ملک کی دیگر ملوں کی طرح مغربی بنگال میں بھی کچھ کارخانے بند ہیں جن سے لاکھوں مزدور پریشان ہیں۔ بائیں محاذ کی حکومت بار بار مرکزی حکومت سے مطالبہ کررہی ہے کہ ان کارخانوں کو سرکاری انتظام میں لے لیا جائے اور جیوٹ صنعت اور سوتی ملوں کو قومیا لیا جائے۔ اس مطالبے پر بنگال کی پوری ٹریڈ یونین تحریک کو فعال ہونا پڑے گا۔ محاذی حکومت ایسی ہر تحریک کی بھرپور حمایت کرتی ہے اور کرے گی۔





یومِ مئی کی پکار

از: سُنیل باسودے

یہ یوم مئی ۱۹۸۶ء ہے۔ ایک صدی ختم ہوگئی۔ محنت کش طبقہ یومِ مئی کی دوسری دہائی میں قدم رکھنے والا ہے۔ گذر جانے والی صدی نے سرمایہ دارانہ دنیا میں بہت ساری بنیادی تبدیلیاں دیکھیں۔

یوم مئی تحریک ۸۔ گھنٹہ کام کے دن کی تحریک تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اوائل دور میں کام کرنے کے اوقات مقرر نہ تھے۔ مزدوروں، جن میں عورت اور بچے مزدور شامل تھے، کو دن میں مسلسل ۱۶/ ۱۸ اور ۲۰ گھنٹوں تک کام کرنا پڑتا تھا، اس وقت کے تمام سرمایہ دارانہ ملکوں میں یہی سرمایہ دارانہ نظام رائج تھا۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غریب محنت کشوں کے خون سے سرمایہ داری کی پرورش ہوئی۔

برسوں گزر گئے۔ مزدوروں میں بیداری پیدا ہونے لگی۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ کام کرنے کے دن مختصر ہونے چاہئیں اور اجرتیں زیادہ ہونی چاہئیں۔ اس سلسلہ میں یہاں محنت کشوں کی شاندار طبقاتی جدوجہد "چارٹسٹ تحریک" (۱۸۳۲ء – ۴۸ء) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس تحریک کو برطانیہ نے منظم کیا تھا۔ یہ تحریک کمیونسٹ منشور، کے ظہور سے قبل شروع ہوئی تھی۔ تاریخ میں پہلی بار اس کمیونسٹ منشور میں اسی پکار کو "دنیا کے مزدورو ایک ہو" درج کیا گیا۔

ارنسٹ فیشر اپنے مضمون "مارکس — اپنے الفاظ میں" (پنگوئن، ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۴۷) میں یوں رقم طراز ہیں:

"برطانوی ٹریڈ یونین تحریک کی ابتداء ۱۸ ویں صدی میں ہوئی اور اسی وقت سے اجرتوں اور کام کرنے کے حالات کی بابت قوانین کو رد کر دینے کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ ۱۷۹۹ء سے لیکر ۱۸۲۴ء تک ٹریڈ یونینوں پر پابندی عائد کر دی گئی لیکن اس کے بعد کے عرصہ سے ٹریڈ یونین تیزی سے ترقی کرنے لگی"

(پہلا ٹریڈ یونین کانگریس ۱۸۶۸ء)

۱۸۴۸ء کے کمیونسٹ منشور کے بعد ۲۸ ستمبر ۱۸۶۴ء میں محنت کشوں کی بین الاقوامی ایسوسی ایشن میں مارکس کا افتتاحی خطاب ہے۔ ہمیں اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ مارکس اور اینجلس نے سماجی ترقی کے لئے سائنسی نظریہ کی بنیاد پر بین الاقوامی مزدور تحریک کے تصور کو اجاگر کیا تھا۔

(پنگوئن ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۴۵)

مارکس نے کام کے دن کے مختصر اوقات کے لئے محنت کشوں کی جدوجہد کو کافی اہمیت دی۔ اپنے افتتاحی خطبے میں انہوں نے کہا:

"کام کرنے کے اوقات کو قانونی طور پر محدود بنا دینے کی بابت اس جدوجہد نے اور بھی شدت اختیار کر لی۔ سرمایہ دار،

طبقے کو خوف و ہراس لاحق ہو گیا۔ بلاشبہ اس نے سیلاتی اور مانگ کے اندھے قوانین جن کی وجہ سے متوسط طبقہ کی سیاسی معیشت کی تشکیل ہوتی ہے اور معاشی دور اندیشی کے زیر انتظام سماجی پیداوار جو محنت کش طبقہ کی سیاسی معیشت کی تشکیل کرتی ہے کے درمیان عظیم مسابقت کو اجاگر کیا۔ اس لئے دس گھنٹے کا بل نہ صرف ایک عظیم سیاسی کامیابی تھی بلکہ یہ تو اصول کی فتح تھی۔ تاریخ میں پہلی بار بالکل عیاں طور پر محنت کش طبقہ کی سیاسی معیشت کے سامنے متوسط درجہ کی سیاسی معیشت نے گھٹنے ٹیک دیئے "۔

یہیں ہم سرمایہ دار طبقہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

دو سال بعد یعنی سنہ ۱۸۶۶ء میں انٹرنیشنل کے جنیوا کانگریس میں "کام کرنے کے آٹھ گھنٹے کے دن کا مطالبہ کیا گیا اور ٹریڈ یونینوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ تو سرمایہ کی مرکوز سماجی طاقت کا مقابلہ کرنے کے ذرائع ہیں۔

اس طرح پہلے انٹرنیشنل نے سنہ ۱۸۶۶ء میں کام کرنے کے آٹھ گھنٹے کے دن کی پکار دی۔ اس کے بعد محنت کش طبقہ کی تحریکیں بھی بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھیں۔ مارکس نے محنت کش طبقہ کی تحریک میں مختلف رجحانات کو دیکھتے ہوئے، مزدوروں کو اس بات سے خبردار کیا کہ "محنت کش کے عام جذبات اور رجحانات ان حالات سے، جن سے وہ سب دوچار ہیں سے رونما ہوتے ہیں۔ یہ بات اس طبقہ کے لئے عام ہے، اور مختلف شکلوں میں رونما ہونے والی تحریکیں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پہلا انٹرنیشنل ہی تھا جس نے سنہ ۱۸۶۶ء میں کام کرنے کے آٹھ گھنٹے کے دن کے لئے آواز اٹھائی۔ اس کے بعد سے محنت کش طبقہ کی تحریک میں وسعت پیدا ہونے لگی۔ مارکس نے، محنت کش طبقہ کی تحریک کے اندر مختلف رجحانات کی بابت، جن سے اس طبقہ کو نقصان پہونچ سکتا ہے، محنت کشوں کو ہوشیار کرتے ہوئے کہا "محنت کش طبقہ کا عام خواہشات اور رجحانات تو ان حالات سے، جن میں یہ طبقہ خود کو سمو پاتا ہے، وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ بات تمام طبقوں کے لئے عام ہے اور اس طبقہ کی تحریک، بہت ہی مختلف شکلوں میں اس کی عکاسی کرتی ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے جاری طبقاتی جدوجہد کی گہرائیوں کو سمجھنے والے یعنی کمیونسٹ نظم و نسق کی ایسی غلطی شاید ہی کر سکیں۔ (پال لفارگ کو مارکس کا خط ۱۸ اپریل ۱۸۷۰ء)

(۲)

کام کے دن کسے کہتے ہیں؟ محنت کش طبقہ کی تحریک سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ جیسے کہ اینجلس نے اپنے تبصرہ "سرمایہ کی بابت کارل مارکس کے خیالات میں" کہا:۔ کام کرنے کے وقت کو جہاں مزدور اپنی محنت، طاقت کی قدر کو از سر نو پیدا کرتا ہے، اسے مسٹر مارکس نے "ضروری محنت" کہا ہے۔ اس کے بعد کام کئے جانے کے وقت کو، اور جس دوران فاضل قدریں تیار کی جاتی ہیں، انہوں نے "فاضل محنت" کہا ہے۔ ضروری محنت اور فاضل محنت دونوں مل کر کام کے دن کی تشکیل کرتے ہیں۔ کام کرنے کے دن میں ضروری محنت کے لئے جتنے وقت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ دے دیا جاتا ہے۔ لیکن فاضل محنت کیلئے کتنے وقت کی ضرورت ہوتی ہے اسے کسی بھی معاشی قانون کے تحت اجاگر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ایک محدود دائرہ کے اندر لمبا بھی ہو سکتا ہے اور مختصر بھی۔ لیکن یہ کبھی بھی صفر کے برابر نہیں ہوتا۔ چیزوں کے تبادلے کے قوانین کا مطالبہ یہ ہے کہ کام کرنے کے دن کی لمبائی کسی بھی حالت میں مزدور کی حسب معمول فرسودگی کے لئے ناموافق نہیں ہوتی ہے۔ لیکن حسب معمولی فرسودگی کیا ہے؟ روزانہ کتنے گھنٹے کی محنت سے اس کی مناسبت ہے؟ یہاں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے خیالات میں بہت فرق ہے۔ چونکہ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے کوئی اعلیٰ حاکم نہیں ہے اسلئے یہ سوال طاقت سے حل کیا جاتا ہے۔ کام کرنے کے دن کی لمبائی تعین کرنے کی تاریخ اجتماعی سرمایہ داروں اور اجتماعی مزدوروں کے درمیان کام کرنے کے دن کی حد کی بابت جدوجہد کی تاریخ ہے۔

سرمایہ نے فاضل محنت ایجاد نہیں کی۔ جب بھی سماج کا ایک طبقہ پیداوار کے ذرائع پر بلا شرکت غیرے اجارہ دار ہو جاتا ہے، وہاں مزدور۔ غلام یا آزاد۔ کو اپنے بسر اوقات کے لئے حسب ضروری محنت کے ساتھ ساتھ اپنی

محنت میں اضافہ کرنا پڑتا ہے تاکہ بسر اوقات کے مزید ذرائع پیدا کئے جاسکیں، اور مزدور کی یہ دونوں محنت ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہے۔

پیداوار کے طریقہ کار اور جدید ترین ٹکنالوجی کا کام کرنے کے دن کے سوال پر براہِ راست تعلق ہے۔ وہ کہتے ہیں "پہلے تو قانون کا پہلا مقصد یہ ہے کہ مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک کام کرنے پر مجبور کیا جائے۔ مزدوروں کے پہلے قانون (۲۳ واں ایڈورڈ سوئم ۱۳۴۹ء) سے لے کر اٹھارہویں صدی تک حکمراں طبقے مزدوروں کی مکمل محنت، جہاں تک ہو سکے، حاصل کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ لیکن بھاپ اور جدید مشینوں کے رائج ہونے کے ساتھ صورت حال بالکل مختلف یا برعکس ہوگئی۔ عورت مزدوروں اور بچہ مزدوروں کی اتنی تیزی سے کام کاج فراہم کئے گئے کہ اس نے کام کرنے کے اوقات کی تمام حدود کو توڑ کر رکھ دئے۔ اس طرح مزدوروں کو حد سے زیادہ وقت تک کام کرانے کی اسکیم ۱۹ ویں صدی کے شروع سے ہی رائج ہوگئی اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اور اس بات کے پیشِ نظر ۱۸۰۲ء میں ہی قانون سازوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ کام کرنے کے اوقات کو محدود بنانے کے لئے قانون نافذ کریں۔

مارکس نے محنت کش طبقہ کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرتے ہوئے کہا، "مشینیں اور بھاپ براہِ راست یا بلا واسطہ حد سے زیادہ کام کراتی ہیں۔ صنعت کی ایسی شاخیں ہیں، جہاں مشینیں استعمال نہیں ہوتیں، مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ وقت تک کام لیتی ہیں، کیوں کہ انہوں نے براہِ راست پیداوار کے طریقہ کار کو اپنایا تھا۔ کارخانوں میں عورتوں اور بچوں کو بطور مزدور کام کرنے کی اجازت دینے سے مرد مزدور انفرادی طور پر انفرادی مزاحمت کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں اور اس طرح اسے اجتماعی مزاحمت کا سہارا لینا پڑتا ہے یعنی طبقہ کے خلاف طبقہ کی، اجتماعی سرمایہ داری کے خلاف اجتماعی مزدوروں کی جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔

سرمایہ دار مزدور کا استحصال کرتا ہے۔ کام کرنے کے نسبتاً لمبے دن میں اسے کام کرنے پر مجبور کرتا ہے، کارخانوں میں مشینوں میں اس سے مرکوز طور پر کام کراتا ہے۔ نیز عورت اور بچوں کو بھی کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ پیداوار میں اضافہ بھی ایک اور طریقہ ہے جو محنت کی قدر کو کم کر دیتا ہے اور ضروری محنت کی مدت کو مختصر بنا دیتا ہے۔

ضروری کام کرنے کے دن کے اوقات میں کمی کرنے کے سلسلے میں کام کرنے کے آٹھ گھنٹے دن کے لئے جدوجہد محنت کش طبقہ کی ایک عام جدوجہد بن چکی تھی، اور جدید ترین ٹکنالوجی کو رائج کرنے سے ایسی جدوجہد لازمی بن گئی۔

اس کے بعد پیرس کمیون میدانِ عمل میں ظاہر ہوا۔ مارکس نے اس کمیون کے مزدوروں کی بہادری، ان کی قربانیوں اور بروقت ریت کی پیسی ڈکٹیٹرشپ کے جھنڈے کو بلند رکھنے کے لئے ان کے عزم کو سراہا لیکن بہت ساری وجوہ کی بنا پر یہ کمیون زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ یورپ کے بُرژواؤں ۔ جاگیرداروں کے مشترکہ حملے کے سامنے فرانس کا محنت کش طبقہ آگے بڑھ نہ سکا اور اسے پیچھے رہنا پڑا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں محنت کش طبقہ کی نجات کے لئے جدوجہد یہیں ختم ہوگئی۔

۱۸۷۳ء میں فرسٹ انٹرنیشنل کو توڑ دیا گیا۔ محنت کش طبقہ کی تحریک کی رفتار وقتی طور پر سست ہوگئی لیکن ۱۸۷۲ء کے دھچکے کے بعد سے یہ تحریک آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ کام کرنے کے آٹھ گھنٹے کے دن کا مطالبہ زور پکڑتا ہے۔

۱۸۷۸ء میں انجلس نے یوں لکھا: "محنت کش طبقہ کی تحریک مستحکم ہوتی جارہی ہے اور روزمرہ کی سیاست میں پیش پیش رہتی ہے۔ (بین الاقوامی محنت کش طبقہ کی تحریک ۔ مسائل، تاریخ اور تھیوری، ماسکو، ۲، صفحہ ۲۰۹)۔ گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی کے آخری دور سے سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف عوامی ہڑتال جدوجہد ایک طاقتور ہتھیار بن گئی۔ ایسی ہڑتال لمبے عرصہ تک جاری رہیں اور وسیع پیمانہ پر ہوئیں۔

محنت کشوں کی ہڑتال - جدوجہد سنہ ۱۸۷۵ء - سنہ ۱۸۹۴ء

سال	مقام	صنعت	ہڑتال کرنے والے مزدوروں کی تعداد	ہڑتال کی مدت	ہڑتال کرنے کی وجہ
۱۸۷۵ء	فال ریور ممالک متحدہ امریکہ	سوتی کپڑے	۱۵۰۰۰	۸ ہفتے	(۱) کم اجرت
" "	پنسلوانیہ	کان	—	۷ مہینے	(۲) کام کرنے کی اور رہائش کی ناگفتہ بہ حالت
۱۸۷۸ء	لنکاشائر، برطانیہ	سوتی کپڑے	۳۰۰۰۰	۱۰ ہفتے	(۳) انتظامیہ اور سرمایہ داروں کا ظلم
۱۸۸۶ء	ڈیکازے وائل (فرانس)	کان	۲۰۰۰	۵ مہینے	
					ہڑتال کرنے والے مزدوروں کے مطالبات
۱۸۸۸ء	برلن	معماری اور بڑھئی گیری	۲۵۰۰۰	۲ مہینے	(۱) اعلیٰ اجرت
۱۸۸۹ء	لندن	ڈوک اور جہاز سازی	۶۰۰۰۰ (ڈوک، جہازی کا اسٹرکوویز)	۵ ہفتے	(۲) کام کرنے کے ۱۰ گھنٹے کے دن اسکے بعد آٹھ گھنٹے کے دن
	جرمنی	کان	۱۵۰۰۰ کان مزدور	ایک مہینہ سے زیادہ	(۳) بیماری، معذوری، ضعیفی بیمہ
۱۸۹۰ء مئی	فرانس	رَوبیکس سوتی کپڑے	۲۴۰۰۰	—	(۴) عورتوں اور بچوں کے روزگار پر پابندی
۱۸۹۱ء	رُوہر، جرمنی	کان	۲۰۰۰۰ کان مزدور	—	(۵) مزدوروں کے تحفظ کے قانونی اقدامات
	فرانس	شیشہ سازی	تمام مزدور	—	
					(۶) صنعتی حادثات کی روک تھام
۱۸۹۲ء	سار، جرمنی	کان	۲۵۰۰۰ (کان مزدور)	—	(۷) جرمانے کے نظام کو ہمیشہ کے لئے اٹھا لینا
۱۸۹۴ء	الینوئس، ممالک متحدہ امریکہ	—	لاکھوں مزدور جس میں ٹھیکہ مزدوروں کی تعداد ۱۵۰۰۰ تھی	سارے ملک میں وسیع پیمانہ پر	(۸) بہتر رہائشی سہولتیں
۱۸۹۶ء	جرمنی	—	۵۰۰ ہڑتالوں میں ۱۳۰۰۰ مزدور	—	

ہڑتال کرنے والے مزدوروں کو مالکوں اور حکومت نے طاقت کے ظالمانہ طریقے سے دبا دیا۔ سنہ ۱۸۷۵ء کی پنسلوانیہ کلان مزدوروں کی ہڑتال کو توڑنے کے لئے مالکوں نے ظلم کے بازار کو گرم رکھا۔ ان لوگوں نے چوکسی کے لئے بدمعاشوں کو کرایہ پر رکھا اور انہیں ہتھیاروں سے لیس کر دیا اور انہیں اس کارپوریشن کے کوئلہ اور لوہا پولیس کے عملہ میں داخل کر دیا۔ یہ نڈر اور بہادر کان مزدوروں پر راستہ میں حملہ کرتے، ان کا اغوا کر لیتے اور انہیں جان سے مار ڈالتے تھے۔ اسکے ساتھ ہی سجے سجائے مقدمے میں ہڑتال کرنے والوں کے ۱۹ سربراہوں کو موت کی سزا ملی اور انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

(۴)

یہی پس منظر تھا۔ ممالک متحدہ امریکہ کے محنت کش طبقہ کی تحریک میں مئی سنہ ۱۸۸۶ء ایک سنگِ میل ہے۔ یہ عظیم تحریک بہت ہی جلد دنیا کے تمام ملکوں میں سرمایہ کے استحصال کے خلاف مزدوروں کی بین الاقوامی طبقاتی تحریک بن گئی۔

مورخین نے سنہ ۱۸۸۶ء کے واقعہ کو یوں درج کیا ہے:

"امریکہ میں نیویارک سے لیکر سان فرانسسکو تک سارے ملک میں مظاہرے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مزدوروں کا اہم مطالبہ کام کرنے کے آٹھ گھنٹے کا دن تھا۔ اس جدوجہد کا مرکز شکاگو تھا۔ یکم مئی سنہ ۱۸۸۶ء کو عام ہڑتال ہوئی۔ اس ہڑتال کے دن ...... مزدور کام چھوڑ کر سڑکوں پر آ گئے۔ مزدور منظم اور پُرامن تھے۔ ہڑتال اور مظاہرے مزید دو دنوں تک جاری رہے لیکن ۳ مئی کو میک کورمک فارم مشینری پلانٹ میں ہڑتال کرنے والوں اور ہڑتال توڑنے والوں کے درمیان جھڑپ کا بہانہ بنا کر پولس نے مزدوروں پر فائرنگ کر دی، جس سے چھ مزدور مارے گئے اور ۵۰ زخمی ہوئے۔

اس کی وجہ سے وسیع پیمانہ پر لوگوں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ ۴ مئی کو سنٹرل اسکوائر، شکاگو میں مزدوروں کا وسیع اجتماع ہوا۔ سازش کرنے والوں کے ایک ایجنٹ نے اس مجمع پر ایک بم پھینک دیا۔ اس کے بعد پولس نے گولی چلانی شروع کر دی۔ مزدوروں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا، انہیں بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ بعد میں آٹھ سربراہوں کو گرفتار کیا گیا۔ ایک دکھاوے کی عدالتی کارروائی کرنے کے بعد عدالت نے سات سربراہوں کو پھانسی دے دی اور ایک کو یعنی اوسکر نیب کو ۱۵ سال کی قید کی سزا دی۔

وسیع پیمانہ پر احتجاج کی وجہ سے الینوئس کے گورنر فیلڈن اور اسکوب کی پھانسی کی سزا کی جگہ قید بامشقت کی سزا دی۔ ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۸۷ء کو لارڈ لنگ نے قید خانہ میں خودکشی کر لی۔ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۸۷ء کو البرٹ پارسنس، اگست اسپائس، جارج اینجل، اڈولف فیشر کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

یہاں میں کہنا چاہتا ہوں کہ محنت کش طبقہ اسپائس کے آخری الفاظ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ وہ الفاظ یہ تھے:

'ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ہماری خاموشی ہماری آواز سے بھی تیز اور واضح ہو جائے گی۔'

فیلڈن، اسکوب اور نیبی کو سنہ ۱۸۹۳ء میں رہا کر دیا گیا۔ بعد میں یہ بات معلوم ہوئی کہ انہیں کسی طرح بھی مجرم ثابت نہیں کیا جا سکا۔ مئی سنہ ۱۸۸۶ء کے بعد کے عرصہ میں ہڑتال کا سلسلہ بلا روک ٹوک جاری رہا۔ پرولتاری استحکام بڑھتا اور پھیلتا ہی گیا۔ " سنہ ۱۸۸۰ء کے درمیانی عرصہ میں ۸ گھنٹہ کام کے دن کے لئے جدوجہد نے عوامی نوعیت اختیار کر لی۔ ممالک متحدہ امریکہ میں شکاگو، نیویارک، ملوکی، بالٹی مور، منیسوٹا کے بڑے صنعتی مراکز کے مزدوروں نے پُرعزم اقدامات کئے۔ نیز بوسٹن، پٹسبرگ، واشنگٹن اور سینٹ لاوٗس کے مزدوروں نے اپنے عزم مصمم کا اظہار کیا۔

اس دہائی کے آخر میں اور خاص طور پر سنہ ۱۸۹۰ء کے عرصہ میں یورپ میں کام کرنے کے ۸ گھنٹے کا دن مزدوروں کا ایک اہم مطالبہ بن گیا۔ سنہ ۱۸۹۰ء کے عرصہ میں ہڑتال کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ مزدوروں کے مطالبات میں معاشی اور سیاسی مطالبات بھی شامل تھے۔ پرولتاریت کے طبقاتی بیداری اور بہتر تنظیم کے یہ راہ راست نتیجے ہیں۔

اس سلسلے میں مزدوروں کے انٹرنیشنل سوشلسٹ

کانفرنس کی ۱۴ جولائی ۱۸۸۹ء میں پیرس میں ایک نشست ہوئی جس میں یورپ، امریکہ، ارجنٹینا کے بیس ملکوں کے ۳۹۰ نمائندوں نے شرکت کی۔ پیٹریل ہال کے، جہاں یہ نشست منعقد ہوئی تھی، آڈیٹوریم میں دیوار پر ایک بڑے جھنڈے پر "تمام ملکوں کے مزدورو، ایک ہو جاؤ" آویزاں کیا گیا تھا۔ مسٹر پال لفارگ نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے کہا کہ "یورپ اور امریکہ کے نمائندے جو اس ہال میں یکجا ہوئے ہیں وہ کسی سہ رنگی دیگر قومی جھنڈے تلے متحد نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ سب لال پرچم، بین الاقوامی پرولتاریہ کے پرچم تلے متحد ہوئے ہیں۔ اس کانگریس میں مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

- قانون کے تحت آٹھ گھنٹے کام کرنے کا دن مقرر کیا جائے
۱۔ بچہ مزدوری کی ممانعت کردی جائے
۲۔ نوجوانوں اور عورت مزدور پر پابندی عائد کردی جائے۔
۴۔ رات کے کام اور جان جوکھم کے کام کے لئے خصوصی قانون مرتب کئے جائیں
۵۔ قانونی طور پر ہفتہ میں آرام کا دن منظور کیا جائے
۶۔ اجناس یا کارخانوں کے زیر انتظام دکانوں کے کام کے لئے اجرت کی ادائیگی کو ممنوع قرار دیا جائے
۷۔ کارخانہ انسپکٹروں کا ریاستی ادارہ قائم کیا جائے۔
۸۔ مرد اور عورتوں کے لئے، بلا لحاظ قومیت مساوی کام کے لئے مساوی تنخواہ دی جائے
۹۔ بلا روک ٹوک یونین کی مکمل آزادی

ایک دوسری قرارداد میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سنہ ۱۸۹۰ء سے یکم مئی کو سارے ملکوں میں یکم مئی سنہ ۱۸۸۶ء کی یاد میں منایا جائے۔ آج تمام ملکوں میں ـــ اشتراکیتی اور سرمایہ دارانہ، دونوں ملکوں میں آزاد مزدور اور اجرتی مزدور بڑے تزک و احتشام سے یکم مئی کی صد سالہ تقریبات منا رہے ہیں۔

گزشتہ صدی کی نویں دہائی نے سرمایہ داری کی افزائش میں بڑی تبدیلی دیکھی۔ جیسا کہ لینن نے اپنے مضمون "سامراجیت ـــ سرمایہ داری کا اعلیٰ ترین مقام" میں کہا:

صنعت کی شاندار افزائش اور ترقی اور بڑے بڑے اداروں میں پیداوار کی مرکزیت کا تیز تر طریقہ کار سرمایہ داری کی ایک انوکھی خصوصیت ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لینن نے اختتام میں یہ کہا: مسابقت آخر میں اجارہ داری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کام کرنے کے طریقہ کار کو اشتراکیتی بنانے میں اس کی وجہ سے کافی ترقی ہوتی ہے۔ خاص طور پر ٹکنکی ایجادات اور ترقی کے طریقہ کار اشتراکیت کا رنگ نکھر آتا ہے۔ پرانے قسم کی مسابقت ختم ہو جاتی ہے۔ اجارہ داری کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ وہ تیزی سے غیر متناسب طور پر ترقی کرتے ہیں۔ اب چھوٹی اور بڑی صنعتوں کے درمیان یا ٹکنکی لحاظ سے ترقی یافتہ اور پسماندہ صنعتوں کے درمیان کوئی مسابقت جاری نہیں رہ سکتی۔ یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اجارہ داران لوگوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں جو ان کی اطاعت نہیں کرتے اور ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے۔ لینن نے اجارہ داروں کے اس دعوے کو رد کردیا کہ کارٹلس بحران کو دور کردے گا۔ برخلاف اس کے جب صنعت کی مخصوص شاخوں میں اجارہ داری رونما ہوتی ہے تو نہ مجموعی طور پر سرمایہ دارانہ پیداوار میں جبلی طوائف الملوکی کو بڑھا دیتی ہے بلکہ اسے اور بھی مرکوز بنا دیتی ہے۔ صنعت اور زراعت کی ترقی کے درمیان تفریق، جو سرمایہ داری کی خصوصیت ہے، بڑھ جاتی ہے۔ مالی سرمایہ کو سب سے زیادہ اہم مقام حاصل ہوتا ہے۔ سرمایہ کی برآمد قانونی بن جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ ملکوں کے درمیان دنیا کی تقسیم کا کام مکمل ہو جاتا ہے۔ سامراجیت کا دور شروع ہوتا ہے۔

سامراجیت کا دور پرولتاری انقلاب کا بھی دور ہے۔ پیداوار کے طریقہ کار میں بہتری اور نئی ٹکنالوجی، نئے انتظامیہ اور نئی انتظامی تنظیموں کو مدعو کرتی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد بھاپ اور بجلی کے ساتھ ساتھ خود کار مشینوں کا بھی اضافہ ہوا۔ پیداواری نظام زیادہ سماجی بن جاتا ہے لیکن جو دولت پیدا کی جاتی ہے وہ اب بھی زیادہ تر چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتی ہیں۔ مزدوروں کی اجرتوں میں کمی ہوتی جاتی ہے اور مٹھی بھر اجارہ دار

امیر سے امیر تر بنتے جاتے ہیں

ممالک متحدہ امریکہ کے اجارہ داروں نے بہ بانگِ دہل کہا، "ہم سب ایک سنہرے مستقبل کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ مزدوروں کو با امید نہ کہ با خوف انتظار کرنا چاہئے۔ خود حرکتی ایک جادوئی کنجی ہے جو دولت کے خزانے کا منہ کھول دیتی ہے۔ یہ تباہی کا ایک خام آلہ نہیں ہے۔ مزدوروں کی تعلیم اور فن کو، خودکار مشینوں کی لگمی اور انتھک سرگرمیوں، جنہیں الیکٹرونک آلات کی رہنمائی حاصل ہوگی، سے آنے والے شاندار دور میں، انعامات و اکرام سے مالا مال کیا جائے گا۔ ہماری آزاد معیشت کا جادوئی قالین ایسے افق کی طرف اڑ رہا ہے، جس کی بابت ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔" (آٹومیٹک جیوں ۔ ور سمان از بینو کے گوش، فرسٹ ایڈیشن، ستمبر ۱۹۷۶ء صفحات ۱۵۱-۱۵۰)۔
یہاں تک کہ مزدوروں کے امریکی فیڈریشن نے، جس کا طبقاتی جدوجہد پر اعتقاد نہیں ہے، بھی یہ کہا "نئی مشینیں لوگوں کو بندھا ٹکا اور یکساں نوعیت کی محنت سے آزاد کر دیں گی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ انسان کو کام اور اجرت سے محروم بھی کر دیں گی۔ یہ معیارِ زندگی میں خاطر خواہ حد تک بہتری لا سکتی ہیں اور فراوانی پیدا کر سکتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فاضل مزدوروں کی تعداد میں اضافہ کرنے میں معاون بھی ہو سکتی ہیں، فاضل مزدوروں کو بروئے کار لایا نہیں جا سکتا کیوں کہ صارفین میں حسبِ ضروری خریداری کی طاقت کا فقدان ہوگا۔ فی الحال یہ کہنا ناممکن ہے کہ کیا خودکاری سے پیداوار میں کثرت ہوگی یا اس کے برخلاف غربت میں اضافہ ہوگا (اے۔ ایف۔ ایل سکریٹری برائے انٹرنیشنل ڈیپارٹمنٹ، ڈیلانے، کی رپورٹ صفحہ ۱۲۵)۔ پروفیسر نار برٹ وینر، مشہور ماہر علم ریاضی اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں: "یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اس کی وجہ سے بے روزگاری کی ایک ایسی صورتحال رونما ہوگی کہ جس کے سامنے ۱۹۳۰ء کا سرد بازار بھی مدھم نظر آئے گا۔"

محنت کشوں کی تحریک نے بھی ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ یکم مئی ۱۸۸۶ء کے بعد ایک دہائی کے عرصے میں یا یوں کہئے کہ دوسرے انٹرنیشنل کے افتتاحی سیشن میں محنت کش طبقہ کو سامراجیت، سرمایہ داری کی اعلیٰ ترین شکل کا سامنا کرنا پڑا۔ سرمایہ دارانہ ادارے، روبہ عمل لائی گئی تکنک اب پہلے کی طرح نہیں رہی۔ سامراجیت نے بھی سرمایہ داری کی پرانی اور نئی ضدوں کو عیاں کر دیا اور سامراجی طاقتوں میں سامراجیت ناگزیر بن گیا۔ اس طرح کام کرنے کے آٹھ گھنٹے کے دن کے لئے جدوجہد ایک نئے دور میں داخل ہوئی جہاں محنت کش طبقہ ۔ اگر منظم ہو جائے تو ایک ملک یا ملکوں میں سامراجیت ۔سرمایہ داری کا خاتمہ کر سکتا ہے، اور اس طرح محنت اور سرمایہ کے درمیان تضاد کو دور کر سکتا ہے۔ محنت کش طبقہ کے لئے وقت آچکا ہے کہ وہ خود کو پرولتاریت کی ۔ حکمراں طبقہ کی ڈکٹیٹرشپ میں تبدیل کر دے اور یہ کامیابی اشتراکیت کو جلا بخشے گی۔

اس لئے محنت کش طبقہ آج سیاسی تحریک کے دور میں بھی داخل ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے قانون نے اسے غیر مساوی ترقی کا سبق سکھایا ہے۔ جرمنی میں کسانوں کی جنگ کے تجربہ اور پیرس کمیون نے اسے مزدور۔کسان کے اتحاد کی تعلیم دی ہے۔
لینن نے مارکس اور اینجلس کی مارکسزم کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنا کر محنت کش طبقہ کو نظریاتی، تنظیمی اور فوجی لحاظ سے بھی تیار کیا تاکہ وہ اقتدار پر قبضہ کرے، محکوم کی جگہ حاکم بن جائے اور بنی نوعِ انسانی کی آخر میں کمیونزم کی طرف تغیر کے لئے تمام طبقوں کو منہدم کرنے کے لئے میدان تیار کرے۔
یہی وجہ ہے کہ روس میں بولشیوک پہلی عالمی جنگ میں مداخلت کر سکے۔ زار سرمایہ داروں اور زمین داروں کو ہمیشہ کے لئے مغلوب کر دیا گیا۔ سامراجیت نے ہوا کے رخ کو موڑنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ "اس دن جنہوں نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا" نے اس دنیا میں اشتراکیت لائی۔

سرمایہ داری — اجارہ دارانہ سرمایہ داری

کمزور ہوتی گئی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد ساری دنیا ۱۹۳۰ء کے معاشی بحران سے دوچار ہوگئی۔ سرمایہ دارانہ اور نوآبادیاتی

ملکوں میں مزدوروں کو بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا، ان کی
اجرتوں کو منجمد کر دیا گیا۔ سرمایہ داری کے میعادی بحران، مستقل
بحران میں تبدیل ہو گئے۔ سامراجیت نے ہی فاشزم کو جنم دیا۔
دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ سامراجیت اور فاشزم
کے مابین ہوئی۔ فاشسٹوں نے بعد میں روس پر حملہ کر دیا، لیکن آخر
میں اشتراکیت کی فتح ہوئی۔ فاشزم کو شکست فاش ہوئی۔
سامراجیت بھی کمزور تر بن گئی۔ اسے اپنی کالونیوں سے ہاتھ
دھونا پڑا۔ یکم مئی ۱۹۴۵ء کے بعد جب برلن کے رحستاگ میں
لال فوج نے لال جھنڈا لہرایا تھا، اس کے دس برسوں میں اشتراکیت میں
تبدیلی کا ایک اور دور شروع ہوا۔ اشتراکی دنیا نمودار ہوئی۔
غلام ملک آزاد ہو گئے۔

جیسا کہ قبل ذکر کیا گیا ہے کہ ٹکنکی انقلاب، جسے
عام طور پر ایس ٹی آر کہتے ہیں، جس نے تمام پیداواری نظام، اس
کے انتظامیہ، اس کی خدمات اور اس کے نقل و حمل کو اپنے قبضہ
میں کر لیا ہے، محنت کش طبقہ کو بھی تبدیل کر رہا ہے۔ ایس ٹی آر
کا یہ مطالبہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تمام ضدوں کو ہمیشہ کیلئے
ختم کر دیا جائے۔ محنت کش طبقہ کی تحریک کو اس حقیقت کے پیش
نظر رکھنا چاہیے۔

سرمایہ دارانہ بحران بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ یہ بحران حجم
میں، وسعت میں اور گہرائی میں بڑھتا جا رہا ہے۔ پورا نظام گویا
مکڑی کے جالے میں پھنس گیا ہے۔ سرمایہ داری ان بحرانوں کو حل
کرنے میں ناکام رہی۔ اس لئے اب وہ تیسری عالمی جنگ، خلائی جنگ
چھیڑنے کا منصوبہ تیار کر رہی ہے تاکہ وہ اشتراکی نظام کو اور
سب سے پہلے سوویت یونین کو ختم کر سکے۔

یوم مئی کی بین الاقوامی روایت جسے یوم مئی ۱۹۴۵ء
نے اور بھی شاندار بنا دیا، اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ آج کے
محنت کش طبقے کو اشتراکی دنیا کی، امن کی، اور سرمایہ دارانہ
ملکوں میں مزدوروں اور عوام کے حقوق کی دفاع کے لئے تیاری
کرنا چاہیے اور رائے عامہ کو ہموار کرنا چاہیے۔

یوم مئی، دوسری صدی کی پہلی صبح کو محنت کش
طبقہ جدید سرمایہ داری یا سامراجیت کے سامنے کھڑا ہے۔
ظاہر ہے بہت طاقتور بن چکا ہے کیونکہ اس کے پاس ایس ٹی آر
یعنی ایک روبوٹ ہے، جو اس کے حکم کا غلام ہے۔ لیکن روبوٹ
طبقاتی جدوجہد کو وافر اور متروک نہیں بنا سکتا ہے بلکہ اس کی
وجہ سے جدوجہد اور بھی تیز اور ہمہ گیر بن جاتی ہے۔

محنت کش طبقہ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے
کہ بورژوا، جب تک اس کے ہاتھوں میں پیداوار کے ذرائع ہوں گے،
اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ مزدوروں کو پیداوار کے
ذرائع سے فائدہ پہنچے۔ برخلاف اس کے مزدوروں کے رہائش
اور کام کرنے کے حالات ابتر ہوتے جائیں گے۔

آج ہندوستان میں نجات کے لئے اس عظیم طبقاتی
جدوجہد میں ٹریڈ یونین تحریک کو اپنے فرض کی ادائیگی سے کوتاہی
نہیں کرنا چاہیے۔ اس جدوجہد کے دوران، جمہوری تحریک میں
شرکت کر کے، کسانوں کی تحریکوں میں خود کو شامل کر کے،
ٹریڈ یونین کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ ہندوستان کے
جمہوریت پسند لوگوں کو اشتراکیت کے راستہ پر گامزن کر دے۔
یوم مئی کے جذبہ کے پیش نظر ہم فتحیاب ہوں گے۔

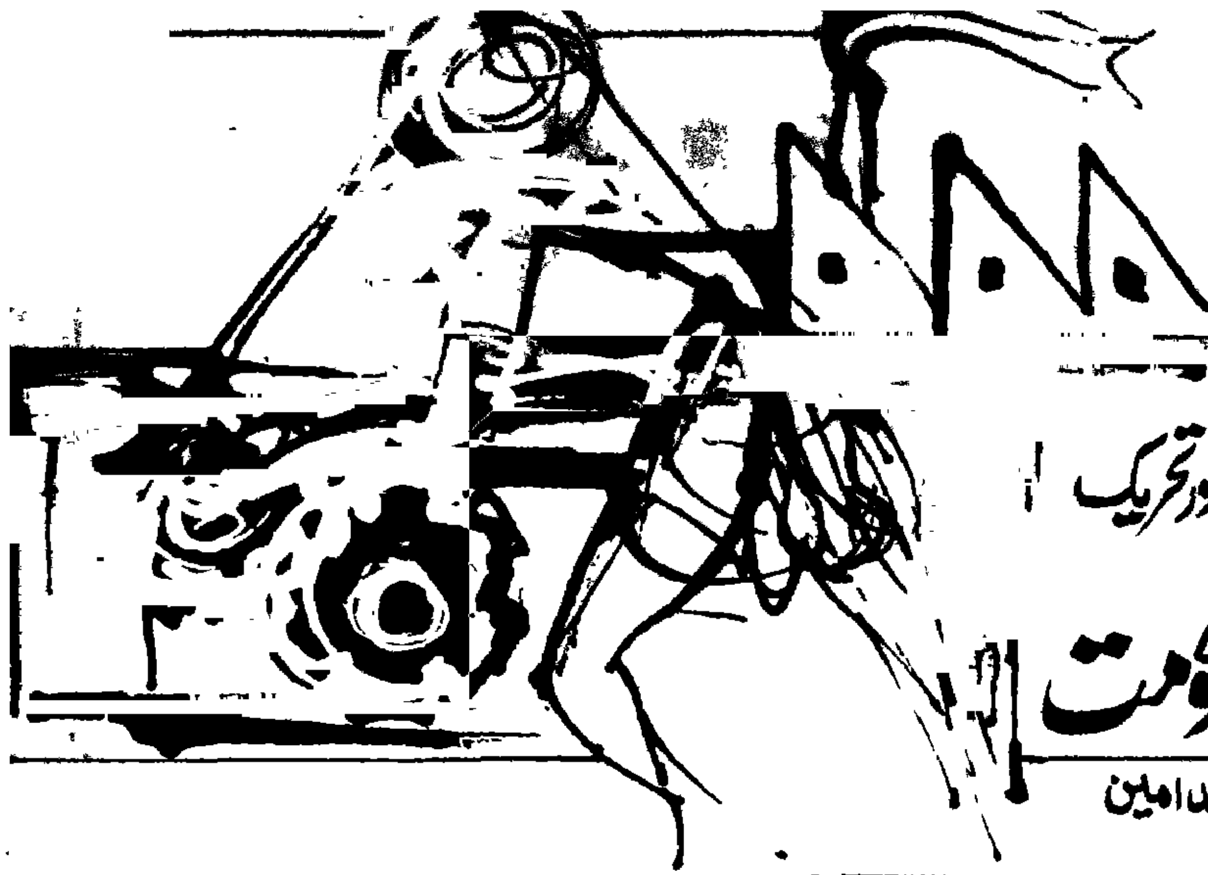


یوم مئی

تابش عظیم آبادی

آج سے سو سال پہلے
شہر شکاگو کے "ہے مارکیٹ" میں
کامگاروں کا ہوا تھا اجتماع
مالکوں کے استحصال و جبر کے خلاف
گونج اٹھے تھے نعرہ ہائے احتجاج
آٹھ گھنٹے یومیہ محنت کا تھا مطالبہ
اور اگر زیادہ ہو کام
یومیہ سے ہو الگ اس کا شمار
مالکوں کو جو کہ نامنظور تھا
سینکڑوں محنت کشوں کو
قتل و خوں کے سکوں میں اجرت ملی
دار پر جانبازوں کو کھینچا گیا
موت کے منھ میں انہیں جھونکا گیا
لیکن!
حق اور استحصال کی اس جنگ میں
سامراجی طاقتوں کی ہار ہوئی
محنت کش (مزدور) فتح مند ہوئے
محنت کش (مزدور) فتح مند ہیں
اور سدا یوں ہی رہیں گے فتح مند
آج بھی تاریخ کا وہ واقعہ
باعث صد افتخار و باعث صد احترام

دستِ محنت زندہ باد و احمریں پرچم سلام



مغربی بنگال میں مزدور تحریک اور بائیں محاذ حکومت

محمد امین

یہ سال یعنی ۱۹۸۶ء یوم مئی کی صدسالگرہ کا سال ہے۔ محنت کش لوگ خاص طور پر مزدور طبقے کے لوگ ساری دنیا میں اس سال کا جشن منائیں گے اور اس موقع پر ان شہیدوں کو بہت ہی احترام سے یاد رکھیں گے جنہوں نے ایک سو سال قبل کام کرنے کے آٹھ گھنٹے کے دن کے لئے جدوجہد کی اور اپنی جان عزیز کی قربانیاں دیں۔ ہمارے ملک میں بھی ٹریڈ یونینیں اس صدسالگرہ کو تزک و احتشام کے ساتھ منانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔

شکاگو امریکہ میں "ہے۔ مارکیٹ اسکوائر" کے واقعہ کے بعد سے بنی نوع انسان نے سو برسوں تک زمانے کے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے سال ۱۹۸۶ء میں قدم رکھا ہے۔ مارکیٹ اسکوائر کے اس واقعہ کے بعد سے یوم مئی کو اجرتی غلامی کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے بین الاقوامی استحکام کے دن کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقع پر یہ مناسب ہوگا کہ ہم ماضی کی تاریخ کو دہرائیں۔

ہے مارکیٹ اسکوائر کا واقعہ ۱۸۸۶ء میں رونما ہوا۔ ۱۸۸۶ء کے بعد سب سے پہلا اہم واقعہ روس میں اشتراکیتی انقلاب کی تاریخی فتح اور روس۔ آئی۔ لینن کی سربراہی کے تحت پہلی سوشلسٹ ریاست کا قیام ہے۔ اس واقعہ کی اہمیت اس حقیقت سے عیاں ہو جاتی ہے کہ روس میں اشتراکیتی انقلاب کے ذریعہ انسان کا استحصال سے پاک سماج کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، اور عملی طور پر ایسا سماج قائم کیا گیا۔

اس عرصہ نے دو عالمی جنگ دیکھیں۔ پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک اور دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک۔ ان دونوں جنگوں کی وجہ سے بنی نوع انسان کو وسیع پیمانے پر تباہی اور بربادی اور لاانتہا آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ نیز ان جنگوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی جنگ پیدا کرنے والی میراثی خصوصیت کو عیاں کر دیا اور یہی خصوصیت آج بھی ساری دنیا میں اپنا پرچم لہرا رہی ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں فاسسٹ طاقتوں کو شکست [illegible]

شکست سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں اشتراکیتی نظام کی برتری عیاں ہو جاتی ہے۔ اور فاشزم کی کالی طاقتوں پر جمہوریت اور اشتراکیت کی طاقتوں کی فتح کے ساتھ ساتھ یورپ کے کئی ایک ممالک اشتراکیت کے دائرۂ عمل میں آ گئے۔ سن ۱۹۴۹ء میں چین اشتراکیتی ملک بن گیا اور اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ کیمپ کے مقابلے میں ایک طاقتور سوشلسٹ کیمپ کی تشکیل کی گئی۔ دنیا میں طاقتوں کا ایک نیا توازن قائم کیا گیا۔ سامراجیت اب عالمی واقعات میں تعین کرنے والی واحد طاقت نہیں رہی۔ آج پوری دنیا کی ایک تہائی آبادی سماج کے اشتراکیتی نظام کے دائرۂ عمل میں آ چکی ہے۔

آج جب ساری دنیا یوم مئی کی سالگرہ منا رہی ہے، وہاں عالمی صورت حال میں جو تفوق ہے 'یعنی سن ۱۸۸۶ء میں کیا تھی اور سن ۱۹۸۶ء میں کیا صورت حال ہے،' اسے بھی زیر غور رکھنا چاہئے اور اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ انسان اور صرف انسان ہی نے ان تھک محنت کرنے کے بعد یہ تبدیلی لائی۔

ایک اور بھی فرق ہے۔ ۱۹ ویں صدی کے آخری دور میں سائنس اور ٹکنولوجی کی ترقی، سرمایہ داری کی افزائش اور فروغ میں معاون ثابت ہوئی تھی اور آج ۲۰ ویں صدی کے آخر میں سائنس اور ٹکنولوجی اتنی زیادہ ترقی کی راہ میں آگے بڑھ گئی ہے کہ اب انہیں سرمایہ دارانہ نظام کے طبقاتی رشتوں کے دائرہ میں رکھنا مشکل ہے۔

اب سماج میں نئی ضدیں رونما ہوئی ہیں اور انہیں سماج کے موجودہ ڈھانچہ کو نئے ڈھانچہ سے بدل کر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ روس، چین، ویت نام اور دیگر ملکوں کی سوشلسٹ ریاستیں اب ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ہم اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں کہ سائنس اور ٹکنولوجی کی تیز تر اور بہترین ترقی سے ظاہر ہونے والی ضدوں کو اشتراکیتی سماج میں ایک نئے طریقہ سے حل کیا جا رہا ہے۔ جبکہ سرمایہ دارانہ سماج میں آج سائنس اور ٹکنولوجی کو خاص طور پر صرف اس مقصد کے لئے روبہ کار لایا جا رہا ہے کہ استحصال کو اور بھی مرکوز بنا کر اور عوام کے مصائب اور تکالیف میں اضافہ کر کے زیادہ سے زیادہ نفع کمائے جائیں۔ دوسری طرف اشتراکیتی سماج میں لوگوں کے کاندھے کے بوجھ کو زیادہ سے زیادہ ہلکا کرنے کے لئے سائنس کی نئی دریافتوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے اور جدید ترین تکنیک بھی استعمال کی جاتی ہے اور اس طرح عوام کیلئے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں کہ وہ پھولیں پھلیں۔

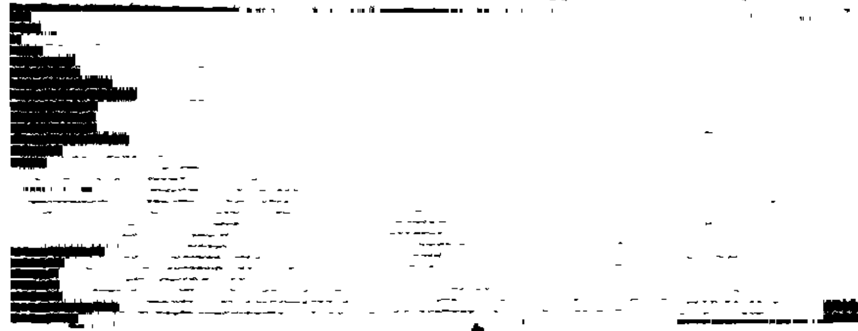
یہ تو سن ۱۸۸۹ء کی بات ہے جب سوشلسٹوں کی عالمی کانگریس پیرس میں منعقد ہوئی تھی تو وہاں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ سن ۱۸۹۰ء سے ہر سال پہلی مئی کو یوم احتجاج اور بین الاقوامی استحکام کے طور پر منایا جائے۔ اسی سال سے ساری دنیا میں یوم مئی منانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ سوشلسٹ انٹرنیشنل کی کانگریس میں جو سن ۱۸۹۳ء میں منعقد ہوا تھا، فریڈرک اینگلس موجود تھے اور اس کانگریس نے یوم مئی کی تعریف میں ایک نئی بات کا اضافہ کیا۔ اس کانگریس میں اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ یوم مئی نہ صرف ۸ گھنٹہ کے کام کرنے کے دن کیلئے مظاہرہ کا دن ہوگا بلکہ پر سماج میں تبدیلی لا کر تمام استحصال کو ہمیشہ کیلئے دور کرنے کے لئے عہد کرنے کا دن بھی ہوگا۔

زیر بحث سو برسوں میں مصلحین اور انقلاب پر آمادہ لوگوں نے بھی یوم مئی کی جدوجہد کی نوعیت کو اپنانے کی کوششیں کیں۔ امریکہ میں صدر ہوور کے دنوں میں یوم مئی کو بچوں کی صحت کے تحفظ کے دن کے طور پر منانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ ٹریڈ یونین تحریک کے انقلابی رہنماؤں نے بھی اس بات کی کوشش کی کہ یوم مئی کو تعطیل کے طور پر منایا جائے نہ اس عزم کے ساتھ منایا جائے کہ طبقاتی جدوجہد کے ذریعہ سماج کو بدل دیا جائے۔

فی الحال سامراجی کیمپ کی سرپرستی، صدر ریگن کی سربراہی کے تحت ممالک متحدہ امریکہ کی حکومت ہے۔ یہ بین الاقوامی اجارہ داروں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اشتراکیت کی طاقتیں دن بہ دن مضبوط اور مستحکم ہوتی جا رہی ہیں اور زیادہ سے زیادہ لوگ اشتراکیتی نظام کو اپنا رہے ہیں۔ اس لئے ریگن

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

یوم مئی کی صد سالگرہ:



تاریخ کی روشنی میں

تواریخ کے مطابق ضابطہ پرست معاشی نظام ملّت کا کام کرنے والے مزدوروں کے خون پسینے کی قیمت پر جاگیردارانہ نظام کی قدیم میراث سے تشکیل ہوئی۔ ٹھیک اس کے بعد ہی استحصال کی نئی شکل میں سرمایہ دارانہ نظام وجود میں آیا۔ اسی طرح اجرت والی غلامی کی ابتدا ہوئی۔ مزدور اور سرمایہ دار میں ٹکراؤ ہوا۔ شروع سے مزدوروں نے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پیداوار کے نظام کو اپنی غلامی کو برداشتی سبب بتایا اور اس نظام کے خلاف وہ احتجاج میں شریک ہوتے۔ استحصال کا پہیہ بنا مزاحمت آسانی سے حرکت کر سکتا۔

اٹھارہویں صدی کی ساتویں دہائی سے ہی سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پیداوار کا یہ نظام بڑے پیمانے پر صنعتی انقلاب میں کامیاب ہوا۔ پہلے انگلستان میں، اس کے بعد فرانس، جرمنی، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں، یورپ کے باقی حصوں میں اور ساری دنیا میں ایک زبردست تبدیلی آئی۔ مزدور اور دوسرے انسانی ہاتھ سے چلنے والی مشینوں کی جگہ خودکار مشینیں آگئیں۔ عوام جتھوں کی شکل میں مزدوروں کی جماعت میں شامل ہوگئے۔ جو نادار (Have Not) تھے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے نئے اصول کو منظرِ عام پر لایا گیا۔ نادار ہونے کے ناطے صنعتی مزدوروں نے سماج میں ایک بڑے منظم طبقہ کی تشکیل کی۔ ایک سرمایہ دار کا سرمایہ جو مزدور کے پسینے کا ماحصل ہے، مزدوروں کے روم روم سے خون چوس کر جمع ہوا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے ان مزدور غلاموں کو جو عملی طور پر سرمایہ داروں کا حکم بجا لاتے تھے ایک پلیٹ فارم میں لاکھڑا کیا۔ اس طرح سرمایہ داروں نے صنعتی مزدور طبقہ کی تشکیل کرکے خود اپنی قبریں کھودیں۔

مشینوں کے آنے سے ہنرمند مزدوروں کی مانگ اور ان کی مزدوری دونوں ہی گھٹ گئی۔ مزدور کے کام کرنے کا کوئی مقرر وقت نہ تھا۔ ۲۴ گھنٹے کو سارا دن کام کے لئے تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے سب ہی بنا کسی فرق و امتیاز کے مزدور سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اجرت کی شرح میں امتیاز برتا جاتا تھا۔ مزدور مردوں کی شرحِ اجرت کچھ اور تھی، عورتوں کی اجرت کی شرح مردوں سے مختلف تھی اور مزدور بچوں کی اجرت کی شرح ان دونوں سے الگ تھی۔ مزدور ایک طبقہ کی حیثیت سے طبقاتی تشکیل کے وقت سے ہی، نہ ہی اپنے کام کی ضمانت کا مستحق تھا اور نہ ہی مستقبل میں اسے کسی بہتری کی امید تھی۔

اپنی تشکیل کے وقت سے ہی مزدور کا طبقہ عام معاشی اور سیاسی حقوق سے محروم رہا ہے۔ جب تک عنانِ حکومت سرمایہ داروں کے ہاتھوں رہی تب تک مزدوروں کے مفاد کے خلاف قوانین مرتب ہوتے رہے۔ مزدور یونین کی تشکیل کرنا اور ظلم کے خلاف احتجاج بلند کرنا بھی غیر قانونی تھا۔ ایشیا اور لاطینی امریکہ کے نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی علاقوں میں اور ان ممالک میں جو معاشی طور پر دوسروں کے دستِ نگر تھے، مزدور

طبقہ پر ظلم کا پہاڑ توڑا جاتا تھا۔

مزید براں انسانیت دوست برتاؤ پانے کی خواہش اور انسانیت دشمن قوانین کی بندش سے نجات حاصل کرنے کے لئے مزدور طبقہ نے معاشی جدوجہد شروع کی۔ اسٹرائک مظاہرے بورژوا طبقہ کے خلاف جدوجہد اور احتجاج ابتدائی محاذ آرائیاں تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ جدوجہد سیاسی تحریک کا ایک لازمی جز بن گئی۔ نادار مزدوروں کی پرانی تنظیم خفیہ طور پر غیر مستقل ٹریڈ یونین کی شکل میں موجود تھی جس کا مقصد مزدوروں کے مفاد کی حفاظت کرنا اور مزدور تحریک کی رہنمائی کرنا تھا۔

ٹریڈ یونین تحریک سرمایہ داروں کو اپنے کچھ حقوق ماننے پر مجبور کرتی ہے لیکن یہ مزدور طبقہ کی صحیح رہبری کا کوئی خاطر خواہ راستہ نہیں تھا۔ عہد وسطیٰ کے سنہ ۱۶۴۹ء میں مذہب کے پردے میں کسانوں کی جدوجہد اور توقعات کے پس منظر انسانیت اور ملوکیت نوازوں نے ساری دنیا میں نظریاتی اور تصوراتی معاشرے کی تبلیغ کی۔ سیاسی جدوجہد میں مزدور طبقہ ان نظریوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔

سرمایہ دار اور ان کے استحصال کے خلاف،

انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کو ختم کرنے کے لئے انیسویں صدی کے آغاز میں تحریک چلائی گئی۔ طبقاتی جنگ، مزدوروں کی یکجہتی اور ریاستوں پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے ان تحریکوں میں کوئی مقصد پنہاں نہیں تھا۔ تیس اور چالیس دہائی کے اول ربع حصہ میں تمام یورپ میں مزدور طبقہ کی انقلابی جدوجہد نے سیاسی زندگی کے رخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ سنہ ۱۸۳۰-۳۱ء کے دوران فرانس کی انقلابی جدوجہد، اور انگلستان کی کلیسائی تحریک نے پوری دنیا کو متاثر کیا تھا۔ کلیسائی تحریک نے سنہ ۱۸۴۷ء میں بورژوا طبقہ کو دس گھنٹے کام کا وقت مقرر کرنے کے لئے قانون وضع کرنے پر مجبور کیا۔ یہ مزدور طبقہ کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ نادار طبقہ کی انقلابی تحریک کے اسی نتیجے نے سماج وادی اور مارکس وادی تحریک کو جنم دیا۔

کارل مارکس اور فریڈرک اینجلس نے سنہ ۱۸۴۷-۴۸ء کے دوران اپنے کمیونسٹ کتابچہ میں اشتراکیت تحریک کو جگہ دی۔ مارکسزم نے تمام دنیا میں سائنسی اقتدار مزدور طبقہ کے ہاتھوں میں دے دیا۔ یہی نظریہ مزدور طبقہ کی نجات کا بے شک واحد ذریعہ تھا۔

سنہ ۱۸۴۸-۵۰ء کے دوران جرمنی، فرانس اور تمام یورپ میں انقلابی تحریک کا سیلاب امنڈ آیا۔ مزدور طبقہ کا یہی انقلاب مارکسزم کے لئے اول تاریخی امتحان تھا۔ نئی تحریک ہر جگہ پھیل گئی ہے۔ اسی ۱۲ مہینے کی انقلابی تحریک کے تجربہ نے اس نظریہ کو اور بھی پھیلانے کی ضرورت کو محسوس کیا کیوں کہ انقلاب ہی تاریخ کا انجن ہے۔

اس نظریے کو کارل مارکس کی کتاب کیپٹل (۱۸۶۷ء) میں جگہ دی گئی ہے۔ جو بورژوا طبقہ کے خیال میں ایک جنگی ہتھیار تھا۔ دوسری طرف مزدور طبقہ کے بین الاقوامی اتحاد کو فروغ دینے کے لئے انجمن قائم کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔ مزدوروں کی تحریک، اور یورپ میں انقلابی تحریک کے دوران مارکس اور اینجلس کی رہبری میں ایک منظم بین الاقوامی مزدوروں کی انجمن 'انٹرنیشنل' سنہ ۱۸۶۴ء میں قائم ہوئی جو کہ مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی انجمن تھی۔ ساری دنیا میں مزدور تحریک کو فروغ ملا۔ جینوا بین الاقوامی کانفرنس میں دن میں ۸ گھنٹے کام کا دعویٰ کیا گیا اور مالی مطالبے پیش کئے گئے۔

سرمایہ دارانہ نظام مقام اعلیٰ پر پہونچنے کے قبل ہی خطرے میں پڑ گیا۔ سنہ ۱۸۴۸-۵۰ء کے دوران انقلاب کی ناکامی نے مزدور طبقہ کی آزادی کی تحریک کو اور بھی تیز کیا۔ اسے جلا بخشی۔ اسی پس منظر میں سنہ ۱۸۷۱ء میں پہلی بار دنیا میں مزدوروں کے انقلاب نے وسیع پیمانے پر زبردست ہلچل پیدا کردی جو پیرس کمیون کے نام سے مشہور رہے۔ مختلف کمزوریوں کی بنا پر مزدور طبقہ ریاستی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں نہ رکھ سکا لیکن کمیون کے آدرش میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آئی اور وہ طاقتور ہی رہا۔ اور اسی نے نجات کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ مزدور طبقہ میں اپنی سیاسی جماعت قائم کرنے اور اسے طاقتور بنانے

ضرورت محسوس کی گئی۔ اس کے تئے ساری دنیا میں تحریک شروع ہوگئی۔ مارکس اور اینجلس نے اپنے نظریات کو زیادہ فروغ دیا اور اسے ٹھوس شکل دی۔

پیرس کمیون کے بعد ساری دنیا میں مزدور طبقہ کی عظیم قربانیاں اور جدوجہد شروع ہوگئیں۔ ۱۸۸۶ء میں نیویارک سے سن فرانسسکو تک آٹھ گھنٹے کے کام کے سلسلے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مزدور تحریک کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یکم مئی سے شہر شکاگو میں چالیس ہزار مزدوروں نے زوردار ہڑتال کی۔ پولیس کی اندھادھند گولی سے چار مزدوروں کی موت ہوگئی۔ چار مئی کو اس کے احتجاج میں شہر شکاگو کے مرکزی علاقہ میں زبردست احتجاج ہوا۔ اس کے نتیجے میں پولیس نے ظلم و ستم کا بازار گرم کردیا۔ ایک سجے سجائے ہوئے مقدمے کے فیصلہ میں سات مزدور رہنماؤں کو موت کی سزا ہوئی۔ ایک شخص جسے حکومت نے اس سازش کے لئے مقرر کیا تھا اس نے اس راز کو فاش کردیا۔ اس واقعہ کے خلاف احتجاج میں ساری دنیا میں زبردست تحریک پھیل گئی۔

اینجلس کی موجودگی میں ۱۸۸۹ء میں پیرس میں دوسری بین الاقوامی کانگریس کی افتتاحی کانفرنس میں ۱۸۹۱ء کے یکم مئی کے واقعہ کو ساری دنیا میں یوم مئی کی حیثیت سے منانے کی تجویز منظور ہوئی۔ آج ایک سو سال سے مزدور طبقہ اس سرخ جھنڈے کو لے کر ہر طرف یوم مئی مناتے ہیں۔

شدید سرمایہ دارانہ بحران کے دنوں ۱۹۱۴ء میں سامراجی طاقتیں آپسی اختلافات کر جب میدانِ جنگ میں لے آئیں تب دوسری انٹرنیشنل تنظیم میں شامل زیادہ تر پارٹیاں مزدور طبقہ کو دغا دے کر نوآبادیات کے پرچم تلے جنگ میں شامل سامراجی حکومتوں کے ساتھ ہوگئیں اور اس طرح دوسری انٹرنیشنل کا خاتمہ ہوا۔ سامراجیت اور پرولتاری انقلاب کے اس متضاد دور میں پرولتاریوں کی شدید طبقاتی جدوجہد کے نتیجے میں نئی طرح کی انقلابی پارٹیوں کو متحد کر کے کمیونسٹ انٹرنیشنل کو متحد رکھنے کی ضرورت فوری طور پر پیش آئی۔

روس کا نومبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب دنیا کی تاریخ میں ۲۰ویں صدی کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ سرمایہ داری نے جب ایک طرف ترقی کر کے سامراجیت کے عہد میں قدم رکھا تب دوسری طرف لینن نے کمیونسٹ تحریک کو دنیا کے مزدور طبقہ کے لئے مارکسزم کا نیا ہتھیار دیا۔ پیرس کمیون نے قدیم عالمی نظام کو توڑ کر سرمایہ داری کی زنجیروں کو کاٹتے ہوئے مزدور طبقہ کی راہ ہموار کردی۔ نومبر انقلاب سائنٹفک طور پر اشتراکیت کی بنیادوں کو مستحکم کرتے ہوئے اسی رخ کو پائی۔ جس کی بین الاقوامی اہمیت ناقابلِ انکار ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے زمانے ہی سے مزدور تنظیم کی انقلابی جدوجہد کو لے کر ایک اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کی تعمیر کرنے کا کام لینن نے شروع کردیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں ماسکو میں منعقدہ کانگریس نے تیسری کمیونسٹ انٹرنیشنل قائم کی۔ یہاں سامراجیت کے سلسلے میں لینن کی تعلیمات اور سوشلسٹ انقلاب کے سلسلے میں ان کے نقطۂ نظر کو تسلیم کیا گیا جس میں کہا گیا کہ ایک نیا زمانہ آیا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کے تنزل کا دور ہے اندر ہی اندر سے اس میں انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا زمانہ، پرولتاری کمیونسٹ انقلاب کا زمانہ۔ اس اجلاس میں سامراجیت کے خلاف نوآبادیاتی عوام کی بیداری اور جدوجہد کے حق میں کھل کر اعلان کیا گیا۔

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر سامراجیت سماج جنگ کے بعد زبردست معاشی بحران سے سنبھلے بھی نہ پایا تھا کہ تاریخ کے سب سے بھیانک معاشی بحران میں مبتلا ہوگیا۔ (۱۹۲۸-۳۲ء) — یہی وہ زمانہ ہے جب اسٹالن کی رہنمائی میں سامراجی معیشت کے پھندے کو توڑ کر روس نے اشتراکی نظام کی تعمیر کی طرف تیز قدم بڑھایا۔ جرمنی، اٹلی اور دیگر فسطائیت پسند قوتوں میں یعنی سامراجیت کے کیمپ میں اندرونی اختلافات شدید تر ہوا ٹھے۔ دنیا کا پہلا اشتراکی ملک سوویت یونین کو نیست و نابود کرنے کیلئے اور پھر کل دنیا پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے فسطائیت پرست قوتوں نے دوسری جنگِ عظیم

پیری کمیون میں شامل ہونے والے مزدوروں کے رہنماؤں
پر پولیس کا جارحانہ حملہ۔

بالٹی مور ریل مزدوروں پر ریل روکو تحریک کے دوران
پولیس کا ظلم۔

[illegible] ۱۹۳۹-۴۵ء) شروع کردی۔ پوری دنیا میں فسطائیت کے خلاف مزدور طبقہ کی طاقت کو متحد کرنے میں کمیونسٹ انٹرنیشنل نے نہایت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ اس جدوجہد نے دنیا میں فسطائیت کو پھیلنے سے روکا اور اس طرح فسطائیت کی شکست ہوئی۔

فسطائیت کی شکست کے بعد دنیا کے کئی ملکوں کی حکومتیں مزدور طبقہ کے ہاتھوں میں آئیں اور وہ اشتراکی سماج کی تعمیر کی طرف آگے بڑھے۔ مختلف ممالک میں آزادی کی جدوجہد نے وسعت پائی اور یکے بعد دیگرے محکوم اور غلام ممالک آزاد ہوتے گئے۔ دوسری طرف سامراجیوں کا خاص سرپرست بن کر ریاستہائے متحدہ امریکہ ایک اور عالمگیر جنگ کی تیاریاں کرنے لگا ہے۔ لہٰذا وہ تمام سرمایہ دار ممالک کو ان کے آپسی اختلافات کے باوجود متحد کرنے کی کوشش کرنے لگا جس کا خاص نصب العین سوویت یونین اور دیگر تمام سوشلسٹ کیمپوں کا خاتمہ کرنا ہے۔

یوم مئی کا صدی کے اس موڑ پر ایٹمی جنگ کے خوف سے تمام دنیا آج تاریخ کے سب سے بھیانک عہد اور عظیم خطرہ کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ کرۂ ارض کے ایک تہائی حصہ میں سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ دنیا کے باقی حصہ کے مزدور اور بھی تیزی سے اشتراکیتی نظام کو قائم کرنے کی طرف جدوجہد کی راہ پر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سرمایہ دار ممالک امریکہ کی رہنمائی میں جس جنگ کی تیاری کر رہے ہیں اس جنگ کے خطرے کے خلاف عوام کے ہر طبقہ کو متحد ہونا ہے اور مزدور طبقہ کے بین الاقوامی اتحاد کو بلند کرنا ہی آج مزدور طبقہ کے سامنے سب سے اہم اور ضروری بین الاقوامی فرض ہے ÷ ÷ ÷

وحید عرشی



اداس خواب

کہیں نہ نیند کی وادی نہ خواب کے سائے
یہ راہ فکر کی کس دشت سے گذرتی ہے
اداس خواب بھٹکتے ہیں دور آنکھوں سے
تمام رات خیالوں کی دھول اڑتی ہے

درد

جب کبھی آخرِ شب
چاند کا داغ ٹپکتا ہے لہو بن بن کے
جب کبھی انجمِ سحر
جھلملاتے ہیں کسی آنکھ میں آنسو بن کے
جب کبھی تپتی کرن
بوسے لے لے کے جھلس دیتی ہے لب کلیوں کے
تب
اسی وقت
بھٹکا ہوا قتالِ خزاں
ایک انجانا سا درد آتا ہے
اور بن جاتا ہے احساس کے دامن کی شکن



وحید عرشی کی شاعری

حیدر صفت

ایک سرسری جائزہ

مغربی بنگال کے اردو شاعروں میں جو لوگ ۱۹۷۰ء کے آس پاس اپنی شناخت بنانے کی جدوجہد میں معروف تھے ان میں اقبال کرشن، کامل اختر اور وحید عرشی ایسے نام تھے جنہیں اسی وقت نئی نسل کے نمائندہ شعراء کہا جاتا تھا۔ اقبال کرشن ان میں سب سے زیادہ معتبر نام تھا، کامل اختر ایک سب سے زیادہ مشہور اور وحید عرشی ایک کم گو مگر قابل توجہ شاعر۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک تنظیمی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کر تخلیقی سطح پر اپنی آخری ہچکی لے رہی تھی پھر بھی اس کے اثرات باقی تھے۔ یہ مقدر صرف مغربی بنگال کا نہیں تھا۔ پورے برصغیر ہند و پاک میں ترقی پسند تحریک کے ہمنواؤں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا، خود اس تحریک کے علمبرداروں کے اسلوب میں ایک نمایاں تبدیلی آنے لگی تھی کہ شراب نئی بوتلوں میں بھری جا سکی۔ بعد میں اسی کو ترقی پسند ناقد محمد حسن نے ترقی پسندی کی توسیع یا ادب کی تیسری آواز کہا۔ دوسری طرف نئی نسل اسلوب کے ساتھ ساتھ موضوعات میں بھی تبدیلی کی خواہاں تھی اور بقول وزیر آغا اب اردو شاعری کا سفر باہر سے اندر کی طرف تھا۔ نئے موضوعات اور نئی لفظیات سے نامانوس قاری بھی اس نئی شاعری میں اجنبیت کے باوجود ندرت کا احساس پا رہا تھا۔

مگر اس نئی نسل میں بھی کچھ لوگ ترقی پسند خیالات کو نئی دلکشی کے ساتھ اپنا رہے تھے، بہت ہی خلوص اور سچائی کے ساتھ۔ وحید عرشی کا شمار ہم ایسے ہی نوجوان شاعروں میں کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بنا کوئی لیبل چپکائے اور بغیر شرمائے ہوئے اپنے محسوسات کے اظہار ہی کو شاعری سمجھا تھا۔ حالانکہ اس وقت خود کو جدید کہلوانے کا شوق سکہ رائج الوقت کی طرح رواں تھا مگر انہوں نے اپنی شاعری کو اس سکے کے پاس رہن نہیں رکھا۔

دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح انکی شاعری بھی اپنی ابتدا میں رومانیت کے اثرات سے مملو نظر آتی ہے لیکن ان کی رومان پسندی کے پیش منظر عدم مساوات یا نابرابری کا وہ معاشی فلسفہ نہیں جو ترقی پسند شاعروں کے غم یار کی بنیادی وجہ ہوا کرتی ہے اور اسی لئے ہر ترقی پسند شاعر محبت کو اسی تناظر میں دیکھتا ہے۔ وحید عرشی کی شروع کی غزلوں میں رومانیت کی جو فضا ملتی ہے اس میں معاشی فلسفہ پر دھیان کم ہی دیا گیا ہے۔ مثلاً انکے یہ اشعار

دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے میری پلکوں میں
کتنے تاج محل ڈوبیں گے پانی کی ان بوندوں میں

بحر غم دوراں میں اک اک چیز تمہاری پھینک دی میں نے
یاد مگر بن بیٹھی ساحل ڈوب سکی نہ موجوں میں

تم کو کھویا تم کو پایا بات انوکھی اس میں کیا ہے
پر وہ خوشبو چبھ جاتی ہے بس جو گئی ہے بانہوں میں

* * *

ناکامی کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں جن میں تاج محل پانی میں ڈوب جاتے ہیں، یادیں ساحل بن کے بیٹھ جاتی ہیں موجوں میں ڈوب نہیں پاتیں۔ خوشبو بانہوں میں چبھ جاتی ہے ـــ ان احساسات

کی سچائی سے انکار ممکن نہیں۔ یہ غزل کوئی بیس بائیس سال پہلے کی ہے۔ ظاہر ہے اس وقت وحید عرشی کی عمر بھی اتنی ہی ہوگی۔ اس عمر میں ایسے جذبات کا اظہار در حقیقت حقیقت کا اظہار ہے۔ ان کی ایک اور غزل جو تقریباً اسی زمانے کی ہے

کیسے سناؤں غم کی کہانی سانسوں پر ہے بار بہت
ماضی کہتا ہے کہ جاؤ حال کو ہے انکار بہت
بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا اونچی ہے دیوار بہت
ٹوٹا ماضی کا آئینہ بکھری یادوں کی کرچیں
زخمی ہیں احساس کے تلوے چلنے سے بیزار بہت

***

ان اشعار میں بھی نوجوانی کے انہی جذبات کا اظہار ہے مگر ان میں ایک شدت ہے، شاعر کا شعور زندگی سے اور قریب تر ہو گیا ہے اسی لئے ان کے غم میں وسعت ہے اور کائنات کی جھلک بھی۔ اپنی ابتدائی شاعری کے زمانہ میں جب ذرا سا آگے بڑھ کر وہ یہ کہتے ہیں سہ

غم حیات کی کیلیں تھیں دستِ دپا میں جڑی
تمام عمر رہے ہم صلیب پر لٹکے

تو ان کا احساس ذاتی نہیں رہ جاتا بلکہ عہد حاضر کا مقدر بن جاتا ہے اور قاری اس شعر کے آس پاس اپنی زندگی کی پرچھائیاں ڈھونڈنے لگتا ہے۔ چھوٹی بحروں میں انہوں نے جو غزلیں کہی ہیں ان سے غزل کی وہ روایت ملتی ہے جو میر سے عبارت ہے مگر میر کی دریافت انہوں نے ناصر کاظمی یا خلیل الرحمٰن اعظمی کے حوالوں سے نہیں کیا۔ یہاں بھی ان کی ایک الگ پہچان ملتی ہے سہ

ایسے کھوئے کہ پھر نہ پائے گئے
دور تک جستجو کے سائے گئے

وحید عرشی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں جو ان کے خیالات کو اور واضح طور پر پیش کرتی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک نظم ہے "مریم"۔ اس نظم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ریلوے پلیٹ فارم پر ایک لڑکی بیٹھی کھیل رہی ہے۔ کسی کے جوتے سے اس کا پاؤں کچل جاتا ہے۔ وہ ساختہ گالی دے دیتا ہے "حرامی" اور پھر اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونوں سے کھیلنے لگتا ہے۔ اس نظم میں جو علامتیں ہیں ان سے سماج کے مختلف طبقوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ خاص کر وہ طبقہ جو استحصال ہونے کے بعد صرف گھگھیانے پر ہی اکتفا کرتا ہے اور پھر اپنے ٹوٹے کھلونوں سے بہل جاتا ہے۔

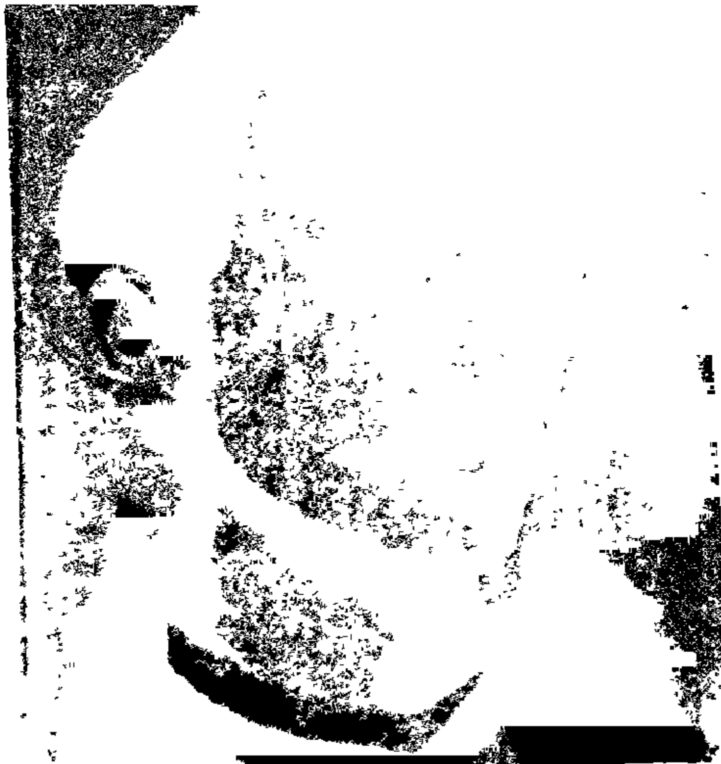
وحید عرشی سے ہم اور بھی بہت کچھ امید کر رہے تھے مگر ان کی بے وقت موت سے ان تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وحید عرشی اب اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ بہت کم کہنے اور اس سے بھی کم چھپنے کے باوجود ان کی شاعری مغربی بنگال کی اردو شاعری کے معیار کا پتہ دیتی ہے۔ وکیل اختر کے بعد وحید عرشی کی موت سے مغربی بنگال میں اردو شاعری ایک زبردست سانحہ سے دوچار ہوتی ہے۔ آخر میں ہم انہی کے ایک شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کر رہے ہیں:

بے اختیار آج بھی آنسو نکل پڑے
جب کچھ بھی چھپانے کی کوشش کرے کوئی

بقیہ: یوم مئی — ص ۲۷ سے آگے

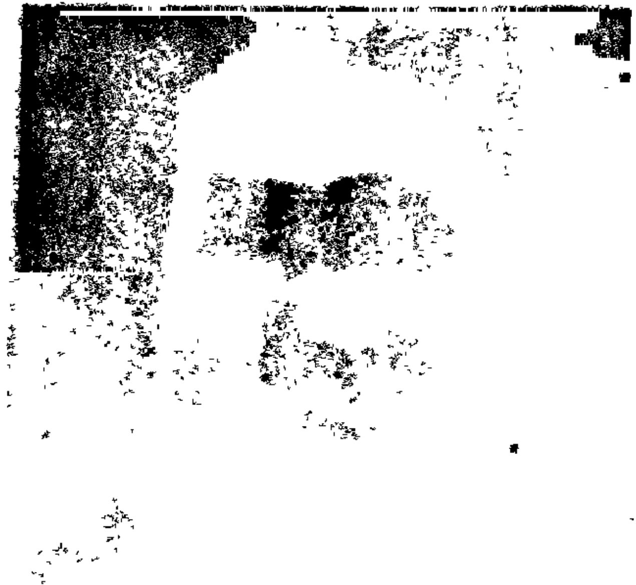
انتظامیہ اشتراکی کیمپ کو ختم کرنے کے کام میں سرگرم عمل ہو گیا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر، نیز موجودہ شدید معاشی بحران سے، جس نے سرمایہ دارانہ معیشت کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، باہر نکلنے کے لئے سب سامراجی قوتیں، جن کے سربراہ ممالک متحدہ امریکہ ہے، اس بات کی حتی الامکان کوششیں کر رہی ہیں کہ کسی طرح سے بھی تھرمو نیوکلیئر جنگ شروع کر دی جائے۔ اس سے امن پسند لوگوں کو خدشہ لاحق ہو گیا ہے اور ساری دنیا میں وہ سب احتجاج میں اپنی آوازیں بلند کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ سرمایہ دارانہ ملکوں میں بھی لوگ باہر نکل پڑے ہیں اور جنگ کے خلاف اور امن کے لئے جدوجہد میں شامل ہو رہے ہیں۔ اشتراکی ممالک، خاص طور پر سوویت یونین، انسانیت کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کے لئے اس جدوجہد میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس عالمی پس منظر میں ہم یوم مئی کی صد سالہ گرہ منانے جا رہے ہیں۔ اسی لئے ہم اسے بہت ہی خلوص کے ساتھ منائیں گے اور اس دن طبقاتی جدوجہد کو اور بھی تیز بنانے، آٹھ گھنٹے کام کے دن، اجرتی غلامی کو ختم کرنے اور جنگ کے خلاف امن کے لئے عہد کریں گے ***









دائیں سے بائیں: شکاگو، امریکہ کے "ہے مارکیٹ" میں مزدوروں کے پُرامن احتجاجی اجتماع پر سرمایہ داروں اور سامراجی حکومت کے مظالم ـــ سامراجی حکومت کی سازش کے شکار (۱) البرٹ پارسنس (۲) سیموئیل فیلڈن (۳) مائیکل اسکواب جنہیں مزدوروں کی سربراہی کے جرم میں تاریکیٔ زنداں اور حلقۂ دار ملا۔

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azam,
Published by the Information & Cultural Affairs Department. Govt. of West Bengal and Printed by M/s.

R UNI

8 HOURS LABOUR

8 HOURS RECR ATION

8 HO RS R



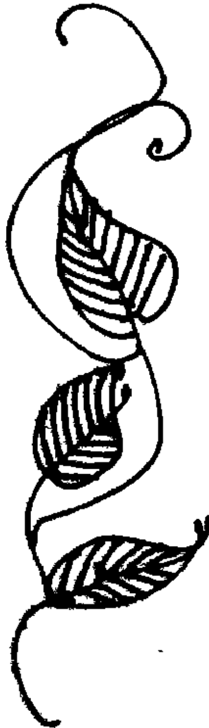
مغربی بنگال

ٹیگور نمبر









تزئین کار ——— تارا پرشاد داس

جلد ۳۳ * مئی ۱۹۸۶ء * شمارہ ۱۰

پندرہ روزہ

مغربی بنگال

کلکتہ

ٹیگور کی ۱۲۵ ویں سالگرہ

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

اس شمارے میں :



زرِ سالانہ تین روپئے

اس خصوصی شمارے کی قیمت ۴۰ پیسے فی کاپی



ٹیگور

سالک لکھنوی

ٹیگور ـــــ !
وہ اک نابغہ، وہ شاعرِ اعظم
جس نے ادبِ بنگ کی تہذیب بدل دی
تہذیب بدل کر نئی تاریخ عطا کی !
انشا ہو، ڈراما ہو کہ افسانہ و ناول،
"کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور"
ٹیگور نے تعمیر کیا اپنا جہاں اور !
اندازِ سرتؔ چند کو اک راہ دکھائی
نذرلؔ کو دعا دی،
خوکانت بھٹاچارج کو آواز عطا کی !

وہ ایک مغنّی ـــــ

گیتوں کا شہنشاہ !
راگوں کی ملاوٹ سے نئے راگ جگائے
ہر راگ کے دامن میں کوئی عزم چھپائے
"جب تیری صدا پر نہ کوئی ساتھ دے تیرا
تنہا ہی چلا چل، تو اکیلا ہی چلا چل !"[1]

ہر راگ میں اک درد بھرے دل کی کسک ہے
ہر دل میں کسی گیت کی پوشیدہ للک ہے
ہر آرزو ٹیگور کے نغموں میں ہے آباد
ثابت ہوا بنگال کے جادو میں اثر ہے !

وہ ایک مصوّر ـــــ

لیئنارڈو ونسی[2] کی طرح زندگی اس کی،
آئندہ زمانے کیلئے نقشِ قدم چھوڑ گئی ہے

وہ ایک معلّم ـــــ

ہر ہجوم میں اک شانتی نکتن کو بسایا
بنجر جو زمیں تھی اسے گلزار بنایا !
ثابت کیا ـــــ
انسان کے اندر بھی خدا ہے !



ع۱ : ترجمہ از "ایکلا چلو رے"
ع۲ : اٹلی کے سب سے مشہور شاعر، مصوّر اور سائنسداں

ٹیگور کی شاعری میں روحانیت

ڈاکٹر عبدالرؤف

بر ہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائیست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایمانیست

(سخن کا کمال یہ ہے کہ راز کی بات بے پردہ نہ کہی جائے، اہلِ خلوت اپنے دل کی بات رمز و ایما کے سہارے بیان کرتے ہیں)

فن کے آفاقی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے کلام کی اساس رمز و ایما پر رکھی جو مختلف عنوانات سے Spirit Of Man یعنی روحِ انسانی کی شرح و تفسیر کرتا ہے۔ ٹیگور کی شاعری میں رمز و ایما بذات خود مقصد نہیں یہ ایک علامت یا پیرایۂ بیان ہے جس کے ذریعہ روحانیت مختلف روپ اور شیوؤں کے ساتھ جلوہ ریز ہوتی ہے۔ روحانیت کی تلاش کی ضرورت نہیں، ان کی شاعری میں یہ اس طرح جاری و ساری ہے "شاخ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم" البتہ ان کے حلقۂ سخن میں بیٹھنے اور اس سے مستفیض ہونے کے لئے ان شرطوں کا برتنا ضروری ہوگا، جو ایک تلمیذ یا طالبِ فیض کے لئے ضروری ہیں۔

والٹ وھٹمین (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۲ء) جس کا عہد رابندر ناتھ ٹیگور (۱۸۶۱ء تا ۱۹۴۱ء) سے بہت قریب ہے اپنی نظموں میں برملا رشد و مدے روحانیت کی افادیت پر زور دیتا ہے۔ اس کی ایک نظم کا بند ملاحظہ فرمائیں ؎

زندگی روح کی اور اس کے بیاں کا جوہر
بر بطِ شعر سے جب تک کہ نہ ہو بال کشا
ایسے اشعار کے کیا معنی ہیں؟ کیا مقصد ہے؟
شعر اگر تم سے نہ منسوب ہو تخصیص کے ساتھ
فائدہ کچھ بھی نہیں ایسی نوا سنجی سے

(اقتباس از والٹ وھٹمین کی ۲۱ نظمیں۔ ترجمہ عبدالرؤف)

ٹیگور، تلاش معرفت میں — پینٹنگ: گگنندرا ناتھ ٹیگور

یہ حسنِ اتفاق ہے اور رابندر ناتھ ٹیگور کی عظمت کی دلیل بھی کہ وہ اس عظیم آفاقی شاعر کے معترف اور مداح تھے۔ اپنے ایک مضمون کے بارے میں وہ والٹ وھٹمین کے بارے میں فرماتے ہیں "وھٹمین کا نام بلندی کی انتہا کو چھو لیتا ہے، شعر میں تخلیق جدت اور بے ساختگی کی ضرورت ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک ایسی وسعتِ فکر کی بھی جو اس بات کی غمازی کرتی ہو کہ شاعر نے کائنات کو گہری نظر سے دیکھا ہے اور یہ کہ انسانیت کا عرفان حاصل ہے۔ وھٹمین ہمیں تصویریں دیتا ہے — تصویریں: ہمارے ملک کی تہذیب و روایات جن عناصر سے

مل کر بنی ہیں، ان میں روحانیت کا عنصر امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ قبل از تاریخ کے قدیم ہندستان کے سینے میں جھانک کر دیکھا جائے تو وہاں بھی "قندیل رہبانی" کی مانند روحانیت کا دیپک اپنی مدھم لَو کے ساتھ روشنی بکھیرتا گھر بھون کو راستہ دکھاتا نظر آئے گا۔ ہمارے ملک میں روحانیت کی ایک تاریخ ہے جو تسلسل رکھتی ہے اور بلندیوں اور پستیوں سے گزرتی اپنا راستہ ہموار کرتی رہی ہے۔ روحانیت زماں و مکاں کی حدود سے بالاتر ہوتی ہے اور پیوستہ بھی۔ جب ہم روحانیت کو حدِ بیان میں لانا چاہیں گے تو اسے ایک اضافی شکل دینا ہوگی یعنی وہ زماں و مکاں سے مربوط (Related) ہوگی۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی بنا پر روحانیت کا تصور بدلتا رہا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ توہمات کے انبار نے روحانیت کے دیپ کو ڈھک لیا اور ایسا بھی ہوا کہ اس کی روشنی پھیلتی، بڑھتی رہی۔ جبر و استبداد اور ذاتی ملکیت کے دور میں روحانی اقدار کی محافظت کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ سماج اور معاشرے سے ترکِ تعلق کیا جائے، عزتِ نفس اور مطالبۂ خودی کی پاسداری نہ کی جائے اور یہ کہ معاشرے کے خلاف کوئی احتجاج نہ کیا جائے (حالانکہ خودی کا یہ دبا دبا سا جذبہ نعرۂ منصور اور آوازۂ سرمد بن کر مختلف اوقات میں نمایاں ہوتا رہا)۔ ترکِ نفس، ترکِ خواہشات، ترکِ دنیا پر پورا پورا زور دیا گیا۔ کسی کلاسیکی شاعر کا مشہور مصرعہ ہے جو ضرب المثل بن گیا ہے۔

ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ ترک

بڑھتی ہوئی سائنسی ترقی اور استدلال پسندی نے انسانی نفسیات کی تہوں پر روشنی ڈالی اور عالمِ نفس کے کچھ توہمات زائل کئے۔ انسان کو اپنے لاشعور کا جو علم تھا اس میں کچھ اضافہ ہوا۔ نتیجے کے طور پر اربابِ نظر نے مطالبۂ نفس کا نیا مفہوم سمجھا اور اس کی روشنی میں سماج کے بندھے ٹکے اصولوں کے خلاف احتجاج کی آواز بھی بلند کی۔ یہ آواز گوئٹے کی شاعری میں ایک طمطراق کے ساتھ اور ہمارے یہاں اردو میں میر امن دلی والے کے مقدمہ چہار درویش میں نرم سُروں میں سنی جا سکتی ہے۔

جوگ، تپسیا روحانی اقدار کے حصول کے لئے ضروری ہو سکتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ روحانی عظمت کا تصور پہلے سے ذہن میں موجود ہو۔ دوسرے معنوں میں طالب کے سامنے کوئی روحانی نصب العین ہونا چاہیئے۔

انیسویں صدی کی نشاۂ ثانیہ نے جن عظیم مفکروں، ادیبوں اور شاعروں کو جنم دیا ان میں سے ایک رابندر ناتھ ٹیگور بھی تھے۔ رینا ساں (Renaissance) کی انقلاب انگیز لہروں کا تموج ٹیگور کے سازِ شاعری کی سروں میں مدغم ہوتا نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ٹیگور کی ایک نظم "نجات" ملاحظہ فرمائیں ۔

"دعائے نجات"

روحانی ریاضت سے جو نجات حاصل ہو وہ نجات میری نجات نہیں ہے
بے شمار بندھنوں کے درمیان مہا آنند سے بھری
نجات کی لذت پاؤں گا اس زمین کے
مٹی سے بنے ہوئے برتنوں کو بار بار بھر کر
تم بار بار ڈھالو گے اپنا امرت
کئی رنگوں اور خوشیوں سے بھرا۔ چراغ کی طرح
میرا سارا سنسار بتیوں میں
جگمگائے گا تمہارے ہی شعلے کی لَو سے
تمہارے مندر کے بھیتر
حواسِ خمسہ کے دروازے
بند کر کے جوگ سادھنا، یہ میرا مسلک نہیں
نظاروں میں، خوشبوؤں میں، نغموں میں جو کچھ بھی آنند ہے
تمہارا آنند اسی کے بیچ بسے گا
میری مجاز پرستی اور میرے رشتہ ہائے تعلقات نجات کے روپ میں
جگمگا اٹھیں گے
میرا پریم بھگتی کے روپ میں پھلا ہوا رہے گا
(نئے دیگھ جوت، جولائی ۱۹۰۱ء ترجمہ: فراق گورکھپوری "ایک سو ایک نظمیں")

مکتی یا نجات کا جو تصور شاعر نے پیش کیا ہے وہ ان
روایتی تصورات سے مختلف ہے جن کا پرچار روحانیت کے دعویدار
صدیوں سے کرتے چلے آئے ہیں۔ شاعر نے کھلے الفاظ میں بتا دیا کہ
ہے کہ حواس پر پابندی عائد کرنا نجات کی دلیل نہیں بن سکتا اور
یہ کہ نظارے جو ضیافت نظر کا سامان مہیا کرتے ہیں، خوشبو
جو مشام جاں کو معطر کرتی ہے اور نغمے جو ہمارے ذوق سماعت
کو تسکین بخشتے ہیں، وہ نجات یا مکتی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔
ایک دوسری نظم میں جس کا عنوان "خاکی عبادت
گاہ" ہے۔ شاعر نے بتایا کہ تاریکیوں میں چھپ کر مالا جپنے کا نام
عبادت نہیں ہے۔ بلکہ اصل عبادت یہ ہے کہ محنت و مشقت
کی جائے جو دوسرے انسانوں کے لئے نفع بخش ہو۔ یہ نظم جسمانی
محنت اور اسکی افادیت کو جو معاشرے سے براہِ راست
ربط رکھتی ہے، اجاگر کرتی ہے اور انسان کی محنت کے وقار کو مسلم
کرتی ہے، شاعر تاکید کرتا ہے کہ نجات یا مکتی کو رنگے کپڑوں
اور صاف ستھرے چہروں میں تلاش نہیں کرنا چاہئے بلکہ نجات
وہاں ملے گی جہاں مشقت کی شدت سے کپڑے پھٹ گئے
ہوں اور چہروں پر بالو اور گرد جم گئی ہو۔
نظم کا عنوان ہے "خاکی عبادت گاہ"

بھجن، پوجا، سادھنا، دعا سب کچھ پڑا رہے
بند دروازے والے مندر کے کونے میں تو کیوں بیٹھا ہے!
تاریکی میں چھپ کر اپنے دل سے
کس کی تو پوجا کرتا ہے پوشیدہ جذبات کیساتھ،
آنکھیں کھول کر دھیان سے دیکھ تو ——— دیوتا گھر میں نہیں ہیں۔

وہ وہاں گئے ہیں جہاں مٹی توڑ کر کسان کھیتی کرتا ہے
جہاں پتھر توڑ کر مزدور راستہ بنا رہا ہے بارہ مہینے محنت کرتا ہے
دھوپ اور بارش میں وہ ہیں سب کے ساتھ
خاک دھول ان کے دونوں ہاتھوں میں لگی ہے
ان کی طرف صاف کپڑے اتار کر آ جا دھول میں

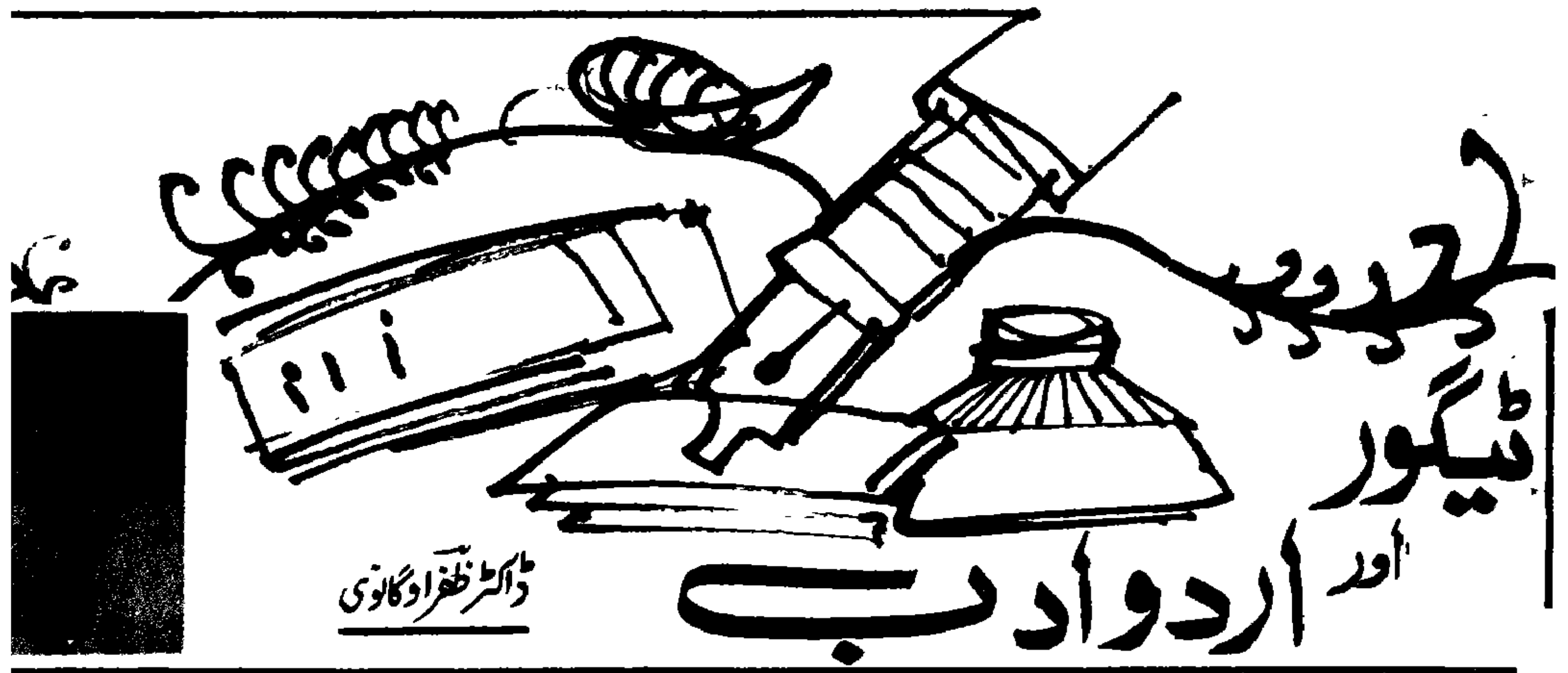
نجات؟ ارے نجات کہاں پائے گا تو، نجات ہے کہاں!
بھگوان خود سنسار کے بندھن میں سب کے ساتھ بندھ گئے ہیں
رہنے دے دھیان کو، رہنے دے پھول کی ڈالی کو،
کپڑے پھٹیں، دھول بالو لگے ——— کرم جوگ میں ان کے ساتھ ایک
ہو کر پسینہ بہا کر گرے

(گیتانجلی ۱۱ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء ترجمہ: فراق گورکھپوری)

مجموعی طور پر ٹیگور کی نظمیں تمثیلی ہوا کرتی ہیں، عہد قدیم
اور عہد وسطیٰ میں برتا جانے والا تمثیلی پیرایۂ بیان اپنی افادیت اور
تاثیر کے ساتھ فن شعر و ادب کی میراث بن چکا ہے۔ ٹیگور نے
اس اندازِ بیان کو اپنایا جو عہد قدیم و جدید کے شاعروں اور
فنکاروں سے انہیں ورثے میں ملا تھا۔
ٹیگور کا پیغام یکسر و بیشتر روحانی ہے۔ لیکن ان
کے کلام اور ان کے نظام فکر سے مستفیض ہونے کے لئے یہ امر
ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ٹیگور کی روحانیت انسان اور اس
کے معاشرے سے علیحدہ کوئی چیز نہیں بلکہ وہ زماں مکاں سے
پیوستہ انسان اور اس کے معاشرے کے ساتھ ساتھ ہے ؞؞

بقیہ: مرینالینی دیوی ....

انہیں اس بات کی امید بھی تھی کہ اگر وہ زندہ رہتیں تو وہ انکی تمام
خواہشات اور تمناؤں کو پورا کر دیتیں۔ اس سلسلہ میں رابندر ناتھ
ٹیگور کے اپنی بیوی کے نام ایک خط کا ذکر کر کے میں اس مضمون
کو ختم کرتی ہوں۔ خط یہ ہے:
"شاید تمہیں یہ نہیں معلوم ہے کہ میں اپنے دل کی
گہرائیوں سے تمہیں یہ بتا رہا ہوں، تمہارے ساتھ میری محبت،
تمہارے لئے میرے دل میں احترام، یہ سب مضبوط بندھن ہیں جو
ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہے ہیں۔ انکی وجہ سے
ہماری زندگی کے سکھ چین اور پیار محبت کی عظمت نے ہمارے
روز مرہ کے دکھ اور دشواریوں کو اپنے دائرہ میں لے رکھا ہے اور
ان کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ آجکل میری آنکھوں کے سامنے ایک
منور تصویر ابھرتی رہتی ہے۔" ؞؞



دنیا کی زبانوں کے ادب کی تاریخ کو سیاسی اور سماجی حالات کی تاریخ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے رابندر ناتھ ٹیگور کے دانشورانہ رفتار کی بات کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان تاریخی حالات کی بھی بات کی جائے جن سے اس عظیم شاعر کا مزاج تیار ہوا ہے۔ اس وقت کا ہندوستان ۱۸۵۷ء میں آزادی کی پہلی جنگ ہارنے کے بعد ایک آخری جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ جنگ تو اس کی تھی کہ انگریزوں سے اپنا ملک کس طرح واپس لیا جائے اور ہم آزاد قوم کی حیثیت سے پھر اپنا سر ایک فخر کیساتھ اونچا کر سکیں۔ لیکن اس جنگ کو جیتنے کے لئے گاؤں گاؤں اور کھلیان کھلیان بیداری کو پہونچانے کے لئے ایک لمبے عرصے کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے دو تین نسلیں کام آئیں۔ دوسری طرف ایشیا پر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا پر پہلی جنگ عظیم کا خوف بھی منڈلا رہا تھا۔ نوآبادیاتی نظام جس تیزی کے ساتھ بڑھا اور جس تیزی کے ساتھ مادیت نے دولت کی تقسیم کے صحیح طریقہ کار کو نقصان پہونچایا اس سے دنیا کے ہر ایک ملک کی دہلیز پر بھیانک پرچھائیں کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسے میں تلاش تھی ایک ایسے راستے کی جس پر چل کر سکون تک پہونچا جا سکے۔ تھکے ذہنوں کو ایک خوشگوار مل سکے۔ ایسے میں اس وقت کی دنیا کو اس پورب کے ملک سے دو عظیم شاعر مل گئے۔ اس وقت کے تھکے ہارے ہندوستان کو ایک نئی طاقت بخشنے کے لئے ٹیگور اور اقبال سامنے آئے۔ دونوں کا مقصد ایک تھا۔ دونوں کا پیغام ایک تھا۔ صرف اپنے ملک کیلئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے لیکن شکتی و شانتی کا پیغام دو الگ الگ سروں میں تھا۔ انسانیت کا درد دونوں میں تھا۔ دونوں وطن کی محبت سے لبریز تھے، دونوں وطن کی آزادی کے جذبے سے سرشار تھے۔ ۱۹۰۴ء میں اقبال 'ہمارا دیس' کے نام سے رسالہ "مخزن" میں ایک نظم چھپواتے ہیں اور ۱۹۱۲ء میں ٹیگور قومی کمپوز کرتے ہیں۔ یعنی دونوں ہی قومی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ٹیگور جلیانوالہ باغ کے سانحہ کا اثر لیتے ہیں۔ آزادی کی تحریک اور جدوجہد سے اپنے آپ کو جوڑے رکھتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ سبھا میں شریک ہو کر یہ گیت گاتے ہیں "آمرا میلے چھی آج ماں ایر ڈاکے" لیکن اقبال دین اسلام میں یقین رکھتے ہیں۔ اسلامی قدروں میں اپنے ذہن کو فلسفے کا روپ دے کر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور ٹیگور اپنیشد اور ویدانت کو اپنے لئے ماخذ سمجھتے ہیں۔ وہاں انہیں اس طاقت کی تمنا ہے جو محبت سے حاصل ہوتی ہے اور جس کا دوسرا نام انسانیت ہے۔ وہ کہتے ہیں:

مجھے طاقت دے کہ میں انسان کی خدمت کے لئے اپنی محبت کو
کامیاب کر سکوں

مجھے طاقت دے کہ میں کبھی بھی غریبوں کو اپنا کہنے سے انکار نہ کر سکوں
اور ضدی اقتدار اور طاقت کے سامنے نہ جھک سکوں

غرض کہ یہ دو بڑے شاعر اس وقت کی سیاسی اور سماجی پرنالیوں سے تقریباً ایک ساتھ ایک ہی طرح متاثر ہوئے۔ الگ الگ راستوں سے گزر کر آنے والی نسلوں تک پہونچے۔ دونوں کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے ملک کی زبان کے ادب کو مالامال کیا بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں کے عظیم شاعروں کو بھی متاثر کیا۔

جہاں تک اردو ادب پر ٹیگور کے اثرات کا تعلق ہے۔ اس کا پہلا نقش اردو میں ۱۹۱۳ء میں اس وقت نظر آتا ہے جب ۱۹۱۳ء میں گیتانجلی کو "نوبل پرائز" ملا۔ اس کا انگریزی ایڈیشن جہاں ہاتھوں تک پہونچا وہاں اس وقت کے مشہور نقاد، ناول نگار، انشاپرداز اور بہت ہی اہم رسالے "نگار" کے ایڈیٹر نیاز فتح پوری کے بھی ہاتھ لگا۔ ڈبلیو بی ییٹس کی طرح نیاز بھی ایک طرح جھومتے ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"میں نے اپنے بیتاب ہاتھوں سے اسے کھول کر ان پہلے جملوں کا مطالعہ کیا کہ "اے خدا تو نے مجھے غیر مختتم ہی بنا دیا۔ تیری مرضی ایسی ہی ہے۔ اس کمزور ظرف (ہستی) کو تو بار بار خالی کرتا ہے اور پھر ہمیشہ ایک تازہ زندگی سے اسے معمور کرتا ہے۔" تو کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ پڑی اور دل دکھ کر رہ گیا کہ یورپ نے کیوں اس کی عزت کر کے ہماری یہ تنہا مسرت یقینی چھین لی کہ اگر یورپ مادیت کا شیدا ہے تو ہم روحانیت پر فدا ہیں اور اس طرح اس سے کسی طرح کم نہیں۔"

یعنی ۱۹۱۲ء میں پہلی بار باضابطہ طور پر نیاز فتحپوری نے اردو والوں کو ٹیگور سے نوازا۔ اور یہ اتفاق بھی دلچسپ ہے کہ اسی سال یعنی ۱۹۱۲ء میں ہی پروفیسر امیہ چکرورتی، شعبہ بنگالی، کلکتہ یونیورسٹی نے بھی پہلی بار اقبال کو بنگلہ زبان سے ان کی مشہور نظم "ترانہ ملی" "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" کا ترجمہ کر کے متعارف کرایا۔ بہر کیف نیاز فتح پوری نے گیتانجلی پڑھ کر اردو والوں کو پہلی بار ٹیگور کے بارے میں یہ تاثر بھی دیا کہ:

"جس طرح ٹیگور جذبات عالیہ سے بحث کرتا ہے اسی طرح اس نے زبان بھی مترنم پائی ہے۔ .... سب سے پہلا تاثر جو اس کی نظموں کو دیکھ کر ہوتا ہے، وہ موسیقی کا تاثر ہے یعنی وہ فطری موسیقی جو نہ صرف انسان بلکہ ہر ذی روح مخلوق کا خمیر اولین ہے، لرزش میں آجاتی ہے اور سننے والا ایسا محسوس کرتا ہے گویا وہ اس عالم میں ہے ہی نہیں اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ ٹیگور نے خود بہترین اشاراتِ غنا سے کام لیا ہے۔"

اور اس پہلے تعارف اور پہلے تاثر کے ساتھ ہی اردو میں ٹیگور کے نغمے فضا میں گونجنے لگے اور دیکھتے دیکھتے "گیتانجلی" کے اردو ترجمے کی اشاعت کا فخر ہر پبلیشر حاصل کرنے کی فکر میں لگ گیا۔ میرے مطالعے میں گیتانجلی کے بعض ایڈیشن ایسے بھی آئے ہیں جن پر ترجمہ کرنے والے کا نام اور پتہ تک نہیں ہے۔ یہ ایڈیشن بھی بہت مقبول تھے اس لئے ان کے پانچ چھ ایڈیشنز چھپ جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بہر حال ٹیگور کی اردو میں قبولیت کی یہ پہلی منزل تھی۔ لیکن جن مستند شاعروں اور فنکاروں نے ٹیگور کے اشعار اور گیتانجلی کا ترجمہ کیا ان میں نیاز کے علاوہ کچھ نام یہ ہیں: عبدالرحمن بجنوری (نامکمل)، جوش، فراق، عبدالعزیز خالد، حامد اللہ افسر اور عبدالمجید سالک۔

اردو دانشوروں کی ایک کھیپ نے ٹیگور کی سوانح عمری اور اس کے فلسفۂ تصوف پر بھی کام کیا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور نام مخدوم محی الدین کا ہے ---- بعد ایسے شاعروں کی بھی بہت بڑی تعداد ہے جس نے ٹیگور کی عظمت کو تسلیم کر کے

خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان میں کچھ قابلِ ذکر نام یہ ہیں :
مجاز لکھنوی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی وغیرہ اور
اگر صرف بنگال کے اردو شعراء کی بات کی جائے تو تنگ بیگ ہر ایک
نے ٹیگور سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

ان کے علاوہ اردو کے ناقدوں کے لئے بھی ٹیگور کی
حیثیت اپنوں کی سی ہو گئی۔ احتشام حسین، شمس الرحمٰن فاروقی،
قمر رئیس، ڈاکٹر اشفاق اور عبدالمغنی اسی سلسلے کے سامنے کے نام
ہیں۔ مختصر یہ کہ نیاز سے لے کر عبدالمغنی تک اردو ادب کی
ساٹھ سالہ تاریخ ٹیگور کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ خالی نہیں
ہے بلکہ کہیں کہیں ٹیگور کے نام کے بغیر کام نہیں چلتا ہے۔ مثلاً
اگر سرسید کی نثر کے بعد کی اس نثر کا ذکر کیا جائے جس کو مہدی
افادی نے ادبِ لطیف، بمعنی لائٹ لٹریچر کہا تو محسوس ہوتا ہے
کہ ٹیگور اس نسل کے سامنے تھے۔ اصل میں قصہ یہ تھا کہ ۱۹۱۲ء
سے پہلے اردو نثر سرسید کے ہاتھوں جس حد تک مقصدی
اور سپاٹ ہو چکی تھی اور اس اسلوب سے ان کے ہی دوست
محمد حسین آزاد "نیرنگ خیال" کی نثر میں ان سے الگ ہو چکے تھے۔
اسی طرح آزاد کی پیروی یا سرسید کے اسلوب کی مخالفت میں کچھ
نوجوان آگے آئے۔ اور پھر کچھ یوں بھی تھا کہ :

"اس وقت کے نوجوان نثر نگار اپنے دور سے
مطمئن نہیں تھے۔ مغرب کے اثرات نے انکی زندگی
کو متاثر کیا لیکن ان کی انانیت نے یہ گوارا نہ کیا
کہ مغرب کا غلام بن جایا جائے۔ مذہب کے
شدید اثرات، مولویت اور دقیانوسی خیالات کی
ان افراد نے مخالفت کی۔ یلدرم، مہدی، نیاز اور
سجاد انصاری کے یہاں یہ خیالات بڑے
واضح ہیں"

" یہی مہدی افادی وہ ہیں جنہوں نے محمد حسین آزاد کو
اگرچہ اپنا قائد تسلیم کیا اور اردو میں رومانی تحریک کا شروعات
کی لیکن ٹیگور کے "عرض نغمہ" گیت انجلی نے اس نسل کے ذہن کو جس
طرح اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تھا اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں

ہے کہ اردو کی رومانی نثر پر ٹیگور کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ اردو کے ترقی پسند ناقد پروفیسر احتشام حسین نے ٹیگور کے اثر
کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکالا :

"ٹیگور کے اثرات قبول کرنے والے اردو
کے مصنفین دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے
ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جنہیں ٹیگور کے فلسفے نے
ان کی انسان دوستی اور امن پسندی اور اتحاد کے
جذبے نے متاثر کیا"

ٹیگور کے خیالات اور فلسفے کو قبول کرنے والوں میں
پریم چند کا نام خصوصی طور پر احتشام حسین اور قمر رئیس بھی لیتے ہیں۔
قمر رئیس نے بتایا ہے کہ پریم چند نے اس کا دو موقعوں پر اعتراف
بھی کیا ہے کہ ابتدا میں ٹیگور کی کہانیاں پڑھکر انہیں افسانے لکھنے
کی تحریک ہوئی۔ کہا جا سکتا ہے کہ آزادیٔ نسواں، کاشتکاروں
اور مزدوروں سے ہمدردی، روسی انقلاب، اشتراکیت کے اثرات
کے علاوہ ٹیگور کے بھی اثرات پریم چند کے پیش خیمہ بنے۔

اردو شاعری میں رومانویت کی جڑیں بہت گہری
ہیں۔ سرسید کے اثرات سے نجات پانے والے شعراء رومانی
شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ خود عبدالرحمٰن بجنوری جنہوں نے
گیتا انجلی کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا اپنی شاعری کو اسی "بلینک ورس"
(نظم معریٰ) کے ڈھانچے میں ڈھالتے رہے جو گیتا انجلی کا مخصوص
وصف تھا۔ اسی طرح کی شاعری بجنوری سے ہوتے ہوئے ن۔ م۔
راشد، میرا جی اور عبدالعزیز خالد تک پہونچی۔ جہاں تک موضوعات
کا معاملہ ہے اگر صرف "نئے انسان کے تصور" کے موضوع ہی کو
سامنے رکھا جائے تو معنی خیز نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ ٹیگور کا خیال
ہے :

" وہ عظیم ہستی آئے گی جو دھرتی کی دھول کو لرزا دیگی
آسمان میں نقارے بج رہے ہیں
انسان کی دنیا میں فتح کے ڈھول بجائے جا رہے ہیں۔
اس عظیم ہستی کی پیدائش کی گھڑی آن پہنچی "

اور یہ خیال جوش کے یہاں اس طرح استعمال ہوا ہے

۹

لیکن انہوں نے اس کا عنوان "آغازِ بیداری" دیا ہے ؎

رکاب چوم رہے ہیں نجوم و شمس و قمر
یہ کون توسنِ دہر پہ ہو رہا ہے سوار
قدم قدم پہ بچھے جا رہے ہیں سرو و سمن
یہ گلستاں میں در آیا ہے کون جانِ بہار

اسی نئے آدمی کا شعور اقبالؔ کے یہاں بھی ملتا ہے ؎

قدم در جستجوئے آدمی زن ۔ خدا ہم در تلاشِ آدم ہست

اب فراقؔ کے ان اشعار کو پڑھئے ؎

پاس رہنا کسی کا رات کی رات ۔ میہمانی بھی میزبانی بھی

موت اک گیت رات گاتی تھی ۔ زندگی جھوم جھوم جاتی تھی

ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سوتی ہے
دبے پاؤں کسی نے آ کے خوابِ زندگی بدلا

ان اشعار میں جذبات بھی ہیں اور حسن کی کشش بھی ہے اور ٹیگور کا اندازِ اظہار بھی ہے لیکن فراقؔ جسم سے روح کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکے۔ ایک تاثر ہے لیکن مجازی اور ظاہری۔ فراقؔ ٹیگور کے روحانی احساسات کو چھونا نہیں چاہتے اور اخیر میں:

"یہ عبادت (نغمہ و سرود) یہ تسبیح خوانی چھوڑ
دروازہ بند کر کے خانقاہ کے سنسان اور تاریک گوشے میں
تو کس کی پرستش کر رہا ہے
آنکھیں کھول! دیکھ تیرا خدا تیرے روبرو نہیں ہے
وہ وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں ہل چلا رہا ہے
جہاں سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے
وہ ان کے ساتھ دھوپ اور بارش میں ہے
اور اس کا لباس خاک میں اٹا ہوا ہے
یہ خرقۂ اَنار کے پھینک دے
اور اس کی طرح خاک زمین پر اتر آ"

یہ ترقی پسند خیالات وہ تھے جن کے نقوش پر باضابطہ ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی اور لکھنؤ میں سنہ ۱۹۳۶ء میں اس کی پہلی کانفرنس ہوئی۔ ٹیگور کو بھی اس میں دعوت دی گئی تھی لیکن وہ شریک نہیں ہو سکے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں روس کے دورہ کے بعد روس کے حالات سے ٹیگور جس طرح متاثر ہوئے تھے اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ترقی پسند مصنفین کی راہبری کریں۔ معنوی قیادت ٹیگور کے حصے میں آئی اور اردو کی اس نسل نے کسی نہ کسی طرح ٹیگور سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا۔ اور ٹیگور کی حرکت و عمل کا یہ تصور بہر حال پورا ہوا ؎

زندگی ہر لمحہ نئے روپ میں آ
نت نئے رنگ میں آ، خوشبو میں آ
نت نئے نغموں میں آ، نئے انداز میں آ

●●

بقیہ: ٹیگور — محبِ وطن۔

آؤ اے پست اقوام کے لوگو! دعدکرو اپنی توہین کا بوجھ
ماں کے آغوشِ محبت میں آؤ، جلد آؤ منگل گھٹ ابھی بھرا نہیں گیا
سب کے چھوئے ہوئے پاک تیرتھ کے پانی سے
ہند کی عظیم انسانی آبادی کے سمندر کے ساحل پر
(گیتانجلی)

اس بات کا اظہار انہوں نے اپنے ناول "گورا" میں گورا کے کیریکٹر میں کیا ہے۔ گورا یہ کہتا ہے — "آج میں ایک ہندوستانی ہوں، میرے دل میں ہندو، مسلمان، عیسائی کسی کیلئے بھی نفرت نہیں ہے۔ آج سارے ہندوستانیوں کا مذہب میرا مذہب ہے"۔ اس کے ساتھ ہی قومی یکجہتی سے سرشار ہو کر شاعر نے "بھارت ویدھاتا" نظم لکھی جو آج ہندوستان کا قومی ترانہ ہے۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے کلکتہ میں مہاجاتی سدن کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ ایک عوامی سدن ہے جہاں ہندوستان کے سبھی لوگ آ سکتے۔ اس طرح انہوں نے قومی یکجہتی اور بین الاقوامی بھائی چارگی کو فروغ دینے کے لئے وشو بھارتی قائم کیا۔ یہاں ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے اور دنیا کے دیگر ملکوں سے طلباء و طالبات آ کر تعلیم سے فیض یاب ہوتے ہیں ٭٭٭

ٹیگور کے ڈرامے

بنگلہ ادب میں ایک نئی جہت

ظہیر انور

ڈرامے کی تاریخ کا مطالعہ انسانی کشمکش اور بلندی، دکھ اور سرخوشی کا مطالعہ ہے اور ماہرین فن بتاتے ہیں کہ ڈرامے کا فن انسان کے انتہائی قدیم اور ارتقائی امکانات سے وابستہ رہا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس قدیم اور باوقار فن میں سوائے یونان کے، ہندوستان کی ہم عصری کا منصب کسی کو میسر نہیں۔ ناٹیہ شاستر کے ڈرامائی اصول کی ترتیب سے لے کر عہد جدید کے فنکاروں تک ہندوستان نے اہم اور قدآور ڈراما نگار پیدا کئے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی شخصیت بنگال کے ڈرامے کی تاریخ میں ایک لازوال شخصیت ہے۔ ٹیگور صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ شعر کی غنائی سرحدوں کے پار ان کے کارنامے بہت وسیع ہیں ادب کی مختلف اصناف پر ان کی طبع آزمائی اور مسلسل درد و کرب سے گزر کر نئے چاند اور ستاروں کی تخلیق نے ٹیگور کو انتہائی محترم اور معتبر بنا دیا ہے۔

ڈرامے کی تخلیق بڑے فنکاروں کا شیوہ رہی ہے کالی داس، شیکسپیئر، سوفکلز سے لے کر بیکیٹ، پیرانڈیلو اور بریخت تک ڈراموں کی فہرست نے زندگی کے ہزار جہت لہجے کی آبیاری کر کے اس فن کو ارفع مقام بخشا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بڑے فنکار کا یہ پسندیدہ میدان رہا ہے۔ ٹیگور بنگلہ ڈرامے کا سنگ میل ہے ——— ایک ایسی پہچان جو زندگی کے ہزاروں رنگوں سے سجے گیتوں اور ڈراموں کا شاندار اشاریہ ہے۔

ٹیگور کو ڈرامے کی روایت ورثہ میں ملی ہے اور دوسرے بڑے ڈرامہ نگار کی طرح ٹیگور کو اس فن سے انسیت کم سنی میں ہی ہوئی ٹیگور خاندان کا علاقہ ادب اور آرٹ سے شدید رہا ہے اور ان کا خاندانی مکان ادب و آرٹ کا ایک حسین گہوارہ ہے۔ ٹیگور کی پیدائش سے قبل ہی جوڑاسانکو کے خاندانی مکان کی ادبی تاریخ اور جمالیاتی افکار کا ایک زمانہ معترف ہے۔ جیتندر ناتھ ٹیگور جو بیسویں صدی کے اس عظیم غنائی شاعر کے بڑے بھائی تھے ڈرامے لکھا کرتے تھے اور یہ ڈرامے ذاتی اسٹیج پر پیش بھی ہوا کرتے تھے۔ ٹیگور نے سب سے پہلے بہ حیثیت اداکار ان کے ڈرامے میں اپنے جوہر دکھائے جو ثابت کرتا ہے کہ ہمارے شاعر کو پیشکش کی نزاکتوں اور ضرورتوں کا کس قدر گیان رہا ہوگا۔ اور اپنی تخلیق میں ان کے ذہن رسا نے کیا کچھ ملحوظ رکھا ہوگا۔

بنگلہ ادب میں یہ ڈرامے کس قدر اضافہ ہیں اور بنگلہ اسٹیج اور تھیٹر کی پرورش و روئیدگی میں ٹیگور نے کیسے چراغ جلائے۔

پیش کرتے [illegible] ہوگا کہ ہم ترتیب وار ان کے ڈراموں
کا مطالعہ کریں [illegible] وقت کو [illegible] میں رکھیں جو تحریر کے درمیان
صرف ہوئے [illegible] درحقیقت ٹیگور کی وابستگی فن اداکاری اور
ڈرامہ نگاری سے نہایت کم سنی میں ہوگئی۔ لیکن جب ٹیگور شانتی
نکیتن میں بہ حیثیت اداکار آخری بار سامعین کے روبرو آئے تو اس
فن میں ان کی زندگی کا تقریباً پچاس سال صرف ہو چکا تھا۔ لہٰذا ان
پچاس سالوں میں ٹیگور نے کیسے کیسے ڈرامے لکھے اور ان کا فارم
(Form) کس قدر شکست و ریخت اور پُرپیچ خارزار وادیوں
سے گزرا، اس کا اشارہ مضمون کے موضوع کو متعین کرنے میں یقیناً
مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

ٹیگور نے پہلی بار ۱۸۸۱ء میں رامائن کا مشہور
زمانہ ادیب والمیکی پر ایک موسیقی ریز واقعاتی ڈرامہ "والمیکی پرتبھا"
لکھا اور خود بھی اس میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ یہ ڈراما اوپیرا کی
روایت سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۸۲ء میں "کل مرگیا"
بالکل پہلے ڈرامے کے ماڈل پر تحریر کیا گیا۔ دو سال کے عرصے کے بعد
ٹیگور نے "پراکرتیر پرتیشودھ" لکھا۔ اس ڈرامے میں ٹیگور نے
فلسفیانہ گہرائی پانے کی کوشش کی اور ڈرامے میں زندگی پر ان کے
تصورات کے واضح خاکے ملتے ہیں۔ یہ ڈراما ٹیگور کی شاعری سے
قریب اور ان کے گیتوں سے ہم آہنگ ہے۔ ۱۸۸۴ء میں انہوں
نے ایک اور ڈرامہ اپنی کہانی پر لکھا جو اسٹیج تک نہ پہنچ سکا۔
اب درمیان میں پانچ سال کا عرصہ گزرتا ہے۔
۱۸۸۹ء میں ٹیگور شولاپور (دکن) سے ایک منظوم
ڈراما "راجا و رانی" لے کر آتے ہیں۔ فرض اور محبت کے موضوع اور
شاہوں کے کرداروں کی تخلیق اس منظوم ڈرامے کے اہم مدارج ہیں۔
اپنی کچھ کمزوریوں کے باوجود یہ ڈراما ٹیگور کا ایک اہم ڈراما تھا اور
جس کے وسیلے سے ٹیگور کے مرتبے میں پختگی آئی۔ ۱۸۹۰ء میں ٹیگور
نے ایک اور اہم اور منظوم المیہ تحریر کیا۔ "وسارجن" — اور یہ اسٹیج
پر پوری کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ٹیگور نے چند
ڈرامائی گیت اور چھوٹے چھوٹے پلے (PLAY LETS) تحریر کئے
اسی دوران انہوں نے طنز و مزاح سے بھرپور ڈراموں کی طرف رخ

گیا، اور "سیر اکاریر سبھا" (کنواروں کی انجمن) اس صدی کی آمد کے
ساتھ تحریر کیا۔ اس ڈرامے کا لب و لہجہ اور انداز طربیہ ہے۔ بعد
میں اسے عامیانہ طربیہ (FARCE) میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس
کے علاوہ "مبوردھی" (۱۹۲۶ء) بھی اسی قبیل کا ڈرامہ ہے۔
اب ٹیگور شانتی نکیتن تشریف لاتے ہیں۔ ٹیگور
کے خیالات میں تبدیلی ہوئی۔ شاعر اور ڈراما نگار انتہائی سنجیدہ،
باوقار، روحانیت اور رہبانیت سے قریب تر ہوتا ہے۔ خیال تہ در تہ
دبیز ہوتے جاتے ہیں، تجربہ وسیع تر ہوتا ہے اور سنگیت کا رس پوری
تخلیقی فضا کو اثر انداز کرتا ہے۔ یہاں جو ڈرامے اسٹیج ہوئے
اور جنہیں کافی شہرت ملی ان میں "پھالگنی" (۱۹۱۵ء) کو بہت
اہمیت حاصل ہے۔ پرانی کہانیوں اور کتھاؤں پر مبنی ایسے ڈرامے فطرت
اور بدلتے ہوئے موسموں کی رفتار میں روح کے آہنگ کو بھی زیر بحث
لاتے ہیں۔

اب ٹیگور کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس کو ہم علامتی
ڈراموں کے دور سے تعبیر کرتے ہیں اور ۱۹۱۰ء میں تحریر کیا ہوا
ڈرامہ "راجا" اسی سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ "اکالا یاتن" (ٹھہرا
ہوا ادارہ) ۱۹۱۱ء میں لکھا گیا تھا اور یہ دونوں ڈرامے سات
مہینے کے عرصے میں تخلیق کئے گئے جو علامتی ڈراموں کی فضا تیار
کرتے ہیں۔ "ڈاک گھر" (۱۹۱۲ء) کے بعد ۱۹۲۲ء میں "مکتا دھارا"
لکھا گیا جو علامتی ڈراموں کو ڈرامہ نگار کے سامنے اہم بنانے میں
دوسری بار مدد کرتا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں ٹیگور نے اپنا مشہور ترین
اور سخت ترین علامتی ڈراما تخلیق کیا۔ "رکتا کرابی" یہ نہ صرف مکمل
ڈراما ہے بلکہ انتہائی فلسفیانہ بھی ہے۔ "گرہ پرویش" (۱۹۲۴ء)
آسان اور صاف ڈراما ہے۔ اس علامتی ڈراموں کے بعد ٹیگور
ڈانس ڈراموں (۱۹۳۲ء) کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ "ناٹیر پوجا"
(۱۹۲۶ء)، "کنڈلیکا" (۱۹۳۳ء)، "تاشیر دیش" (۱۹۳۳ء) —
تمام ڈانس ڈرامے ہیں۔ آخری سالوں میں ٹیگور کے ڈانس ڈراموں
میں "شیاما" (۱۹۳۸ء) کافی مشہور ہے۔ یہ ڈرامے میوزیکل ڈراموں
میں آخری اڑان ہیں جو ٹیگور کے شعور کو مکمل کرتے ہیں۔
ٹیگور کے ڈرامے اور اس فن میں ان کے کارناموں کے

سلسلے میں ناقدین اور مورخین کے خیالات بھی مختلف ہیں۔ بنگلہ ادب میں ان کی سمتوں اور کارناموں کو حقیقی اور سچے پس منظر میں دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم بنگلہ ڈراموں کے ماضی کی طرف تھوڑا بہت جھانک لیں اور یہ اندازہ لگائیں کہ ٹیگور سے قبل بنگلہ ڈراموں کے غالب رجحانات کیا تھے اور ادب میں ان ڈراموں نے کیسی ساکھ بنائی۔ بنگلہ ڈراموں کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کا عوفانی سال انتہائی اہم اس لئے ہے کہ جاترا کا سفر کرتے ہوئے بنگلہ ڈراموں نے اسی سال سے نئے عہد کا ابتدائی اور کئی اہم ڈرامے کلکتہ کے ذاتی تھیٹر (Private Theatre) کی زینت بن سکے۔ اس عہد میں بلگچھیا میں ایک تھیٹر ہوا کرتا تھا اور یہیں سے بنگلہ ڈراموں کے ایک زبردست کردار مائیکل مدھو سدن دت کی بھی اس فن میں ابتدا ہوئی۔ ۳ ستمبر ۱۸۵۹ء میں سرمیستھا (Sarsmistha) اسٹیج پر پیش کیا گیا اور بنگال کی ڈرامائی تاریخ میں ایک نئے عہد کی بشارت ملی۔ ڈرامے کی للک بڑھی اور اداکاروں کی آمد کے ساتھ ڈراموں کا کارواں بڑھتا گیا۔ ایسے ڈراموں کو بہ حیثیت پیشکش یا ادب وہ بلندی نصیب نہ ہوئی جو عظیم ڈراموں کی پہچان ہوا کرتی ہے۔ لیکن بنگال والے اس حقیقت سے نہ ہی صرف باخبر ہیں بلکہ مغرور بھی ہیں کہ نیل درپن (۱۸۶۰ء) کے اسٹیج تک آتے ہی بنگلہ ڈراموں نے عصری حالات کو اسیر کر لیا تھا۔ یہ ڈراما بنگال اسٹیج کے لازوال لمحے کی یادگار رہے۔ اس سے پہلے بنگلہ زبان میں ترجمے تھے اور ماضی کے اوراق کو عیاں طور پر پیش کرنے کے سلسلے تھے۔ لیکن "نیل درپن" کا ڈراما نگار دینا بندھو مترا عصری حالات اور اس کے بھیانک مسائل سے باخبر تھا۔ نیل تحریک کی دراصل یہ بہترین تاریخ ہے جو بنگلہ ڈراموں میں (تھیم اور پیشکش سے قطع نظر) میلو ڈراما سے حقیقت نگاری کی طرف ایک زبردست چھلانگ ہے۔ اس ایک ڈرامے نے بنگلہ ڈراموں کو نئی روح پھونکی، یہی وجہ ہے کہ کوئی مورخ آج تک اس شاندار روایت کے سامنے بے ادب ہونے کی جرأت نہیں کرتا۔ دینا بندھو کے ساتھ بنگلہ زبان کی ڈرامائی ادب میں کردار کے واضح خدوخال، حالات کا صحیح ادراک اور ڈرامائی شدت کی

وابستگی کے پہلو بہ پہلو کردار راجاؤں، حکمرانوں اور مذہبی اسطور سے اتر کر عوام تک آ پہنچا تھا۔ انہیں ڈراموں کے وسیلے سے حقیقتاً بنگال کو عظیم نیشنل تھیٹر نصیب ہوا جو بنگال کے ڈراموں کی تجدید کی دوسری اہم کڑی ہے۔

اس تھیٹر کے قیام نے تھیٹر کو زندگی سے جوڑ دیا اور اب ٹیگور ہم سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ چراغ سے چراغ جلے اور ذاتی گھروں سے لے کر تھیٹر ہال تک ڈرامے کی رونق ہوتی رہی اور ۱۸۷۴ء سے لیکر ۱۸۷۹ء تک کے درمیان ٹیگور کے بڑے بھائی جیتندر ناتھ ٹیگور نے ڈرامے لکھے اور پیش بھی کیا۔ ان ڈراموں کے مرکزی خیالوں میں وطن پرستی کا جذبہ بے پناہ تھا۔ اپنے بھائی کے ڈراموں کو قریب سے دیکھنے اور اداکاری کرنے کے مواقع ٹیگور کو ملے۔ ساتھ ساتھ گریش گھوش اور شیشر بھادری جیسے بے مثال اور مکمل تھیٹرمین نے ڈراموں کو اپنی رگوں سے خون پلایا اور روایت کی جڑیں مضبوط کیں لیکن ڈراموں کی بے پناہ مقبولیت کے ساتھ ساتھ سین پینٹنگ، پرشور انداز، جاترا کا رنگ اور ناٹک ڈراموں پر چھایا رہا۔ ایسے تاریخی لمحوں میں بہت سے اداکار بنگلہ اسٹیج کو نصیب ہوئے جو انقلاب کے پیش خیمہ بنے۔

رابندر ناتھ ٹیگور جب ڈرامے لیکر اسٹیج تک پہنچے تو اسٹیج کی شامیں روشن ضرور تھیں لیکن کوئی اہم انقلابی تحریک سامنے نہیں تھی اور نہ ہی کوئی شاندار تبدیلی جو ڈراموں کو سنسکرت ڈراموں کے "اوور کوٹ" سے نکال سکتی۔ بلاشبہ مرکزی خیال میں انحراف کی لے سنائی دینے لگی تھی لیکن فارم میں تبدیلی کے امکانات رقم نہیں ہوئے تھے۔ اور نہ ہی ڈراموں کی پیش کش میں تجربے ہو رہے تھے۔ ٹیگور کی ذات بلند تر تھی، ان کے خیالات واضح اور گہرے تھے اور خوش نصیبی سے ٹیگور کو بیرونِ ملک کا دورہ بھی میسر ہوا۔ لہٰذا بنگلہ اسٹیج کو ایک مسیحا ملا جس نے ڈرامے کی روایت کو برقرار رکھا۔ ٹیگور کے ڈراموں کی پوری داستان دراصل نئے تھیٹر اور نئے فارم کی تلاش ہے۔ یہ بات اور ہے کہ ڈراموں کی روایت کو برقرار رکھنے کے علاوہ

سے آگے بڑھانے یا اثر انداز کرنے میں ٹیگور کا کارنامہ کس قدر اہم ہے۔

میرا خیال ہے کہ ٹیگور نے ڈراموں کو صرف پیشکش تک محدود نہیں سمجھا بلکہ ادب سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ پہلی بار ان کے ڈراموں میں کردار کا ایک باطنی کردار بھی نظر آیا۔ انھوں نے انسان کے اندر کی جنگ کو ڈراموں میں سمو کر پیش کیا ہے۔ اور یہ بنگلہ ڈراموں میں نئے اور زیادہ پیچ دار سمت کی طرف مثبت قدم ہے۔ ڈرامے کلکتہ اسٹیج پر اپنی بہار دکھا رہے تھے لیکن اس کی وجہ دراصل وہ زبردست اداکار تھے جو سامعین کو سکتے میں ڈال سکتے تھے اور جن کی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ٹیگور نے اندر کے آدمی کو بھی ڈرامے کے ذریعہ عوام کے روبرو پیش کیا جو صرف طبعی حالت میں ہی متحرک نہیں بلکہ ذہنی اور تصوراتی فضا میں حرکت کرتا ہے۔ اپنے ایک مقالے The Religion of An Artist میں ٹیگور نے فن کے سلسلے میں اپنے خیالات درج کرتے ہوئے لکھا تھا:

But in all great arts, literary or otherwise, man has expressed his feelings that are unusual in form that is unique and yet not abnorm

ان سطروں میں ٹیگور نے ادب سے متعلق اپنے واضح تصورات رقم کئے ہیں اور زبان و فارم کی سادگی کو بھی زیر بحث لایا ہے لہٰذا ان کے ڈرامے، خاص کر ابتدائی ڈرامے اس سادگی سے عبارت ہیں جو بے مثال بھی ہیں اور پرانے زمانے میں مقابل بھی۔ ان ڈراموں کا طرز اور لہجہ جدا ہے جو ڈراموں کو نئی سمت دے یا نہ دے نئے لکھنے والوں کے لئے ایک غیر آباد راستہ کی نشاندہی ضرور ہے۔

زبان کے معاملہ میں بھی ٹیگور نے بنگلہ ڈراموں کی رہنمائی کی ہے۔ پرانے ڈراموں کے لہجے سے انحراف کرتے ہوئے انھوں نے مختلف انداز کے ڈرامے تخلیق کئے ہیں۔ ٹیگور نے پہلی بار اوپیرا کی روایت کو پائیدار زمین عطا کی۔ ان کا پہلا ڈرامہ

اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے۔ ڈراموں کی فہرست کو غور سے دیکھا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ منظوم ڈرامے کی تخلیق کے علاوہ نثری ڈرامے، علامتی ڈرامے، ڈانس ڈرامے اور غنائی المیے سے بھی ٹیگور نے بنگلہ زبان و ادب کو مالا مال کیا ہے۔ المیہ ڈراموں کی تاریخ میں "راجہ و رانی" کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ زبان کے سلسلے میں یہ ڈراما تقریباً تمام دوسرے عصری فن پاروں پر سبقت لے جاتا ہے۔ صرف بات یہیں نہیں ختم ہوتی۔ ٹیگور کی ڈرامے کی زبان پر مہارت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے چالیس سال بعد "راجہ و رانی" کو دوبارہ تحریر کیا اور پہلے جو خامیاں تھیں انہیں پاک کر کے نثر میں لکھا۔ اور نثر بھی ایسی کہ بولتے ہوئے لفظوں کا سارا الزام اٹھائے۔ نثری ہوں کہ منظوم ڈرامے، ڈراما کی گیت ہو کہ طربیہ ڈراما، ٹیگور نے زبان کو اسٹیج کی نزاکتوں پر نظر رکھتے ہوئے اور شاعرانہ سلیقے سے برتا۔ ٹیگور کے اندر ہر لمحہ شاعر ہمکتا رہا بالکل اسی طرح جس طرح آئرلینڈ کی سرزمین میں ڈبلن کے ایٹس (YEATS) کے سینے میں نغمگی پرورش پاتی رہی۔ شاعری ٹیگور کا مذہب اور ایمان رہی لہٰذا جب ٹیگور نے روحانیت کی طرف رُخ کیا تو اپنے عہد کی توہم پرستی اور جدید تہذیب کے گھاؤ کو اجاگر کرنے کے لئے علامتی ڈراما لکھا اور اسی غنائی زبان کے توسط سے عظیم اور بلند مرتبہ مرکزی خیال کو پیش کرنے کی راہ دکھائی جو ان سے پہلے ڈراموں میں تقریباً مفقود تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب ٹیگور نے "چترانگدا" کو شہر کلکتہ میں اسٹیج کیا تو بنگلہ اسٹیج کی تاریخ کا یہ ایک اہم موڑ تھا۔ چترانگدا کے ساتھ ساتھ ان کے ڈانس ڈرامے بالخصوص شیاما نے اظہار کا نیا سلیقہ بنگلہ ادب کو دیا جہاں جمالیاتی اظہار کے ساتھ ساتھ عصری حسیت کا ادراک بھی بھرپور ہے۔ یہ ٹیگور ہی کی ذات ہے جو بنگلہ اسٹیج کو ڈانس اور موسیقی کے امتزاج کی ایک خوبصورت تکنیک عطا کرتی ہے۔

ٹیگور کے علامتی ڈرامے بنگلہ ادب میں ایک نئی سمت کا اعلان تھے۔ ان علامتی ڈراموں میں "رکتا کرابی" اور "ڈاک گھر" بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ڈراموں کی اہمیت

اور یہ اس بات میں ہے کہ یہ نہ صرف علامتی سطح پر بلند ہیں بلکہ پیشکش کی سطح پر رائج ڈرامائی دستور کے خلاف ایک زبردست احتجاج بھی ہیں۔ اس زمانے میں شیکسپیئر کے ڈراموں کی نقالی کا چلن عام تھا اور اسٹیج کے پس منظر میں بھی ایسی نقالی کی جا رہی تھی۔ کردار بھی شان و شوکت والے رقم کئے جاتے، جو باطنی اظہار کے بجائے ظاہری دکھاوے کی مثال تھے۔ ٹیگور کے ان ڈراموں میں اسٹیج کرافٹ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اسٹیج کی پشت پر منظر اور نقالی ٹیگور کو گوارہ نہیں کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ ڈراما کی شاعری اور روح میں ڈراما کا مقام (Locale) متعین کیا جا سکتا ہے۔ وہ ڈرامے کو معنوی سطح پر بھی اسی قدر بلند تر دیکھنا چاہتے تھے جس طرح وہ کرداروں کی طبعی حرکات میں زندگی سے بھرپور اظہار کے خواہاں تھے ـــ یہ چیزیں ٹیگور سے پہلے کہاں تھیں؟ ٹیگور کے ہاتھوں ڈراما پہنچ کر جدید لہجوں سے سنورتا گیا۔ ٹیگور نے ۱۹۰۲ء میں ہی لکھا تھا کہ:

"(بغیر منظر یا پس منظر کے) ایک درخت کمرہ یا دریا کا تصور انتہائی آسان ہے" اور یہیں سے نئے اسٹیج کی بشارت نئے لکھنے والوں کو ملی۔

ٹیگور کے ڈراموں کی پیشکش میں بے مثال کامیابی بنگال میں شمبھو مترا کو ملی ہے۔ شمبھو مترا انتہائی باوقار اور زبردست اداکار ہے جس نے اداکاری کے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"ذاتی طور پر مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ٹیگور دنیا کے بہترین ڈراما نگاروں میں جگہ پانے کے حقدار ہیں۔ اگر ڈرامے کی اہم ضرورتوں کو مد نظر رکھا جائے تو وہی ڈراما بلند تر ہوتا ہے جو ڈراما نگار کے وژن کا اظہار کر سکے اور اسٹیج پر کامیابی سے پیش کیا جا سکے......... مسئلہ یہ ہے کہ ایک ڈرامائی اکائی میں ایسے کردار تخلیق کئے جائیں جو آرکی ٹائپل اور آفاقی بھی ہوں اور بیک وقت عام اور زمینی بھی۔ (ٹیگور) کے کردار انفرادیت کا روپ دھارنے کے ساتھ ساتھ اپنا آفاقی، آرکی ٹائپل اور علامتی رنگ بھی برقرار رکھتے ہیں۔"

اور یہی ٹیگور کی بلندی ہے کہ انہوں نے ایسے ڈرامے لکھے جو بحیثیت ادب بھی لوگوں کو خوشی دیتے رہے ہیں اور پیشکش کے اعتبار سے بھی لائق اعتنا سمجھے گئے ہیں ـــ ہندستان میں ٹیگور کا مقام وہی ہے جو یورپ میں ڈبلیو بی ایٹس (W.B.Yeats) کا ہے ـــ !!

بقیہ: ٹیگور کا دورۂ روس

پروفیسر نے اس صد سالہ تقریبات کے دوران ٹیگور پر پانچ اہل دستاویزی فلموں کی بھی نمائش کی۔ یہ فلم گرچہ سوویت روس میں ٹیگور کے دورہ کی بابت تھی تاہم اس میں ٹیگور کی بابت بہت ساری باتوں کی نمائش کی گئی۔ اس فلم میں ٹیگور کی تخلیقات کا ذکر کرنے کے ساتھ اس دستاویزی فلم میں نہ صرف شانتی نکیتن اور جوڑاسانکو کا بلکہ سلائی داہ کی کوٹھی باڑی کی بھی نمائش کی گئی۔ مجھے یہ فلم بہت پسند آئی۔

ٹیگور کی تحریروں میں لینن کی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے پیٹرو نے مجھے کریملین میں لینن کی ذاتی لائبریری میں جانے کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا "اس لائبریری میں ٹیگور کی پانچ کتابیں ملیں گی"۔ میں اس لائبریری میں گیا، وہاں مجھے ٹیگور کی یہ کتابیں ملیں ـــ گیتانجلی، قوم پرستی، گھر اور باہر، اور باغبان، پانچویں کتاب کا نام مجھے یاد نہیں۔ یہ کتابیں روسی زبان میں یا جرمن زبان میں لکھی تھیں۔ میں نے "قوم پرستی" کتاب کا جرمنی زبان میں ترجمہ تھا۔ اس کتاب کے بہت سارے اوراق میں لفظوں کے نیچے پنسل کے داغ نظر آئے، اور اس عورت نے جو مجھے لائبریری دکھا رہی تھی مجھے یہ بتایا کہ پنسل کے یہ داغ لینن نے دئے ہیں، اور ان کی اہمیت کو لینن ہی سمجھ سکتے تھے۔

اتفاق سے مجھے روس کے انگریزی رسالے "سوویت وش" میں ٹیگور کے ناٹک "راجہ" پر داستان سلوسکی (روس کے بہت بڑے تھیٹر آرٹسٹ) کا تبصرہ دیکھا۔ اس آرٹسٹ نے "راجہ" کو بولشوئی، اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا تھا ***

روحِ نغمگی

آج پھر ہے نالہ برلب زندگی
آج پھر ہے سر بہ زانو روشنی
آج پھر قیدِ خودی میں ہے جنوں
آج پھر صیدِ انا ہے آگہی
آج پھر کانٹے بچھے ہیں راہ میں
آج پھر ہے پا شکستہ رہ روی
آج پھر ہے خاک بر سر میکدہ
آج پھر تقدیرِ رنداں تشنگی
آج پھر ہے لفظِ بے معنی وفا
آج پھر نفرت کی ہے جادوگری
آج پھر رقصاں ہے شیطاں ہر طرف
آج پھر انساں کی منزل بے بسی
آج پھر ہیں دل گرفتہ فکر و فن
آج پھر ہے سر برہنہ شاعری
آج پھر ہے حکمراں باکرّوفر
نام پر جمہوریت کے قیصری
آج پھر ہے کوہ کن کا امتحاں
کس ادا سے خندہ زن ہے خسروی
آج پھر زندانیٔ تقدیر ہے
اے گرودیو! تیری روحِ نغمگی

مہیب تر ساعت یہ سماں ہے حشر کا
آدمی ہے کرب سے رشتہ بپا
آرزو ہے اس گھڑی ہر گام پر
تیری انساں دوستی ہو رہنما
ذہن و دل ہوں مدح خوانوں کے ترے
روح سے گیتوں کی تیرے آشنا
ہر دلِ رنجور کی دھڑکن بنے
تیرے جاں افروز نغموں کی صدا
سرمۂ چشمِ خرد ہوں تیرے گیت
اور جنوں کو بھی دکھائیں راستا
زندگی کی راہ میں ہوں شمع وہ
تیرے شعروں نے جو چھوڑے نقشِ پا
ہند والوں کو، میرے 'ٹیگور'، ہو
سربلندی تیرے نغموں کی عطا

علقمہ شبلی

رابندرا ناتھ ٹیگور

محبِّ وطن

از: کے۔ این۔ سانیال



آج نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا شدید بحران سے دوچار ہے۔ اس شدید صورت حال میں قومی اور بین الاقوامی امور کی بابت رابندرا ناتھ ٹیگور نے جن جن باتوں کا اظہار کیا ہے وہ آج بنی نوع انسان کے لئے امیدوں کی نئی شعاع بن چکی ہیں۔ تمام تضاد کو پرے رکھکر انہوں نے اپنے اہل وطن کے دلوں کو قومی اتحاد سے سرشار کر دیا۔ اپنے سینکڑوں مضامین میں انہوں نے ہندوستان کی ثقافتی عظمت کا ذکر کیا اور کثرت میں وحدت کے اصول کو فروغ دیا۔

رابندرا ناتھ ٹیگور محب وطن تھے اور سارے ملک میں حب الوطنی کو فروغ دینے میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی نظر میں قومیت اور بین الاقوامیت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، کیونکہ حب الوطنی، پیار، محبت، بھائی چارگی اور قومی اتحاد کو فروغ دیتی ہے۔ ان کی وجہ سے صحت مند رشتہ کو فروغ حاصل ہوتا ہے، اور اسی رشتہ سے مختلف ممالک ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ اس طرح حب الوطنی اور بین الاقوامیت ایک دوسرے کے قریب آجاتی ہے اور ایک دوسرے میں ضم ہو جانے کی کوشش کرتی ہے۔ رابندرا ناتھ کے دل میں حب الوطنی کا جو جذبہ بیدار ہوا اس کے لئے وہ اپنے والد مہارشی دیبندرا ناتھ کے رہین منت ہیں۔ اپنی سوانح عمری میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

"میرے والد محب وطن تھے، ان کی سرگرمیوں میں حب الوطنی کا جذبہ کارفرما تھا، اور گھر کے سبھی لوگوں میں یہ جذبہ رونما ہوا۔ رابندرا ناتھ نے اس سلسلے میں "فرزندگانِ ہند" کے ساتھ ایک گیت لکھا جسے ان کے بڑے بھائی ستیندرا ناتھ نے شروع کیا۔ یہ گیت بہت مقبول ہوا، کیونکہ اس گیت میں قومی یکجہتی اور اتحاد کا پیغام ہے۔ ٹھاکر خاندان میں "ہندو میلہ" کو کافی اہمیت حاصل تھی اور ہر سال ٹیگور گھرانے کے لوگ اس میلہ کا انتظام کیا کرتے۔ اس سلسلے میں رابندرا ناتھ نے یوں کہا "اس میلہ سے مادرِ وطن کا تصور اجاگر ہوا اور مادرِ وطن کی خدمت کرنے کے لئے لوگ تیار ہو گئے۔"

رابندرا ناتھ نے جس گھرانے میں جنم لیا، جہاں انہوں نے بچپن کے دن گزارے، وہاں امن، شانتی اور پیار و محبت کا ماحول تھا۔ اس ماحول نے بچپن ہی سے ان کے دل میں قومی یکجہتی اور اتحاد کے جذبہ کو اجاگر کیا۔ جب وہ پندرہ سال کے تھے تو انہوں نے یہ گیت لکھا:

مختلف افکار و آراء کے ہم
بندھے ہیں ایک ہی دھاگے میں ہم
ایک ہی ذمہ داری کو نبھا نے
سرگرم عمل ہیں ہزاروں ہم

بندے ماترم

[illegible] کے لئے انہوں نے بہت ساری نظمیں لکھیں اور [illegible] سامنے انہیں پڑھا، سامعین نے انکی تعریف کی۔ ان کے ہر گیت میں قومی اتحاد کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں "تقسیم بنگال" کے خلاف جب لوگوں نے احتجاج کیا تو وہ بھی اس میں سرگرم طور پر شریک ہو گئے۔ اسی وقت انہوں نے بنگال میں "راکھی بندھن" کو دوبارہ رائج کیا، اور اس تقسیم کے خلاف بنگالیوں کو متحد ہونے کا پیغام دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک گیت بھی لکھا۔ "تقسیم بنگال" کے خلاف تحریکوں کے عرصہ میں انہوں نے بہت سارے گیت اور نظمیں لکھیں اور ان کے ذریعہ انہوں نے بنگالیوں کے درمیان قومی یک جہتی اور حب الوطنی کو فروغ دیا۔

"بنگال کی مٹی"، "بنگال کے پانی" نے تو ضرور ا نہیں ابھارا تھا، لیکن صحیح معنوں میں وہ ہندوستان کے سفیر تھے، ہندوستان کے عرصہ دراز کی قومی میراث کی ان کی نظموں میں جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ عرصہ دراز سے اپنیشد، رامائن اور مہابھارت نے ہماری ثقافت کو مالا مال کیا اور ہندوستان کے لوگوں میں قومی یک جہتی اور قومی اتحاد کو فروغ دیا۔ ربندرا ناتھ کی تحریروں میں ہمیں اپنیشد کی تعلیم، رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں کے اثر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اپنے لکھے ڈرامے "کال مریگیا" اور "بالمیکی پراتیبھا" اور ان کی نظمیں "آہولار پروتی"، "پوتی تا"، "بھاشا او چھندو" میں انہوں نے رامائن کی عظمت کو اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے مہابھارت کی اہمیت پر بہت سارے مضامین بھی لکھے۔ اس کے علاوہ ان کے ڈرامے "چترانگدہ"، "کوچ و دیبجانی"، "گاندھاری آبے دون"، "کرنو کونتی سونگباد" وغیرہ مہابھارت کی کہانی پر مبنی ہیں۔

گوتم بدھ کی انسان سے محبت اور عدم تشدد کی تعلیم نے بھی ربندرا ناتھ کو بہت متاثر کیا۔ اشوک کی انسان دوستی اور محبت نے بھی ان کے دل میں ایک نئی جوت جگا دی۔ اس طرح ربندرا ناتھ کی تحریروں اور تصانیف میں انسان محبت اور عدم تشدد کا پیغام ہمیں ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں انکی "نالینی"، "نوشیر پوجا"، "چنڈالیکا" اور اپنا دیوان "کوتھا کہانی" کی "سریشٹھو بھیکا"، "مولو پراپتی" نظموں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

ربندرا ناتھ کی قومی بیداری اور قدیم ہندوستان کی تہذیب اور ثقافت سے ان کی دلی وابستگی میں ہمیں "کالی داس" کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں "اے کال"، "اوسے کال"، "میگھ دوت"، "برشا منگل"، "ودن بھوشیتر پورے"، "سے کال" اس سلسلہ میں بطور ثبوت پیش کی جا سکتی ہیں۔

ان لوگوں کو جنہوں نے مذہبی تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر انسانیت اور محبت کو اپنایا ہے ربندرا ناتھ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ مذہبی تنگ نظری سے آزاد ہو کر روحانیت میں غرق ہونے والوں کا وہ خیر مقدم کرتے ہیں، مذہب کے نام پر جہالت اور تنگ نظری کو انہوں نے کبھی بھی قبول نہیں کیا۔ شری چیتنیا اور گرونانک کی بنی نوع انسان کے لئے محبت اور خلوص سے بھی شاعر بہت متاثر ہوئے تھے۔ شہنشاہ اکبر کی مذہبی سیاسی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ "اکبر نے نہ صرف سیاست کے ذریعہ بلکہ محبت کے ذریعہ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اور سارے ہندوستان کے لوگوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔" انہوں نے راجہ رام موہن رائے کو اخوت اور محبت کی دنیا کا ہندوستانی سفیر کہا۔ انہوں نے سکھوں، مرہٹوں اور راجپوتوں کے کارناموں پر مشتمل بہت ساری کہانیاں لکھیں۔ ہندوستان کی تاریخ ان بہادروں کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ ان کے کارنامے تمام مذاہب کے ہندوستانیوں کے دلوں کو اعلیٰ مطمع نظر اور قوم پرستی سے سرشار کر دیا۔

ربندرا ناتھ اس بات سے واقف تھے کہ مختلف علاقوں کی ثقافتوں اور روایتوں کا علاقوں کے درمیان تبادلہ کے بغیر قومی یک جہتی کا فروغ ممکن نہیں۔ انہوں نے اس بات کو اپنی نظم "بھارت تیرتھ" میں اجاگر کیا ہے۔

آؤ اے آریے، آؤ اے غیر آریے، ہندو مسلمان
آؤ آؤ آج تم اے اہل فرنگ، آؤ آؤ اے عیسائی
آؤ اے برہمن پاکیزگی قلب کے ساتھ، سب کا پکڑو ہاتھ

(باقی صفحہ [illegible] پر)

ٹیگور اور جدوجہد آزادی

از

ھیرن مکھرجی



رابندرا ناتھ ٹیگور اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کلکتہ کے تہذیبی سدن میں۔

اپنی سوانح حیات میں رابندرا ناتھ نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کیا۔ کلکتہ کی ایک بستی میں ایک کچا مکان یا جھونپڑا تھا۔ وہاں وہ اکثر چوری چھپے جایا کرتے۔ یہاں رازداری برتی جاتی۔ جو یہاں آتے وہ خاموش رہتے۔ اس پرسکون ماحول میں آہستہ آہستہ وید کے منتر پڑھے جاتے۔ چند لوگ، نوجوان اور بوڑھے یہاں آتے اور ایک بند کمرہ میں، جس کی کھڑکیاں بھی بند کر دی جاتیں، ایک انسانی کھوپڑی اور اس کے پاس ہی رکھی ننگی تلوار پر ہاتھ رکھ کر حلف لیتے کہ وہ اس وقت تک آرام نہیں کریں گے جب تک کہ ہندوستان آزاد نہ ہو جائے گا۔ ان کے ایک بڑے بھائی جیوتیندرا ناتھ کے زیر اہتمام ایسی عجیب و غریب نشستیں منعقد ہوتیں اور راج نارائن باسو وید پڑھا کرتے تھے۔ شری باسو عمر میں گرچہ بڑے تھے لیکن بچہ کی طرح بالکل معصوم تھے۔ ٹیگور نے ایسی نشستوں کا ذکر کیا ہے جہاں برسرپیکار ہندوستان کی خصوصی ناکامی کا ذکر ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ایک عزم مصمم کا، جس کی اس ناکامی کے جگر میں بھی شناخت کی جا سکتی تھی، یہ ملک پھر اٹھ کھڑا ہوگا۔ ان کے بچپن کی باتیں اس فضا کی بھی تصویر کھینچتی ہیں، جن میں شاعر نے جنم لیا اور پرورش پائی۔ ٹیگور جنہوں نے اپنے لافانی کلاموں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں آزادی کی جوت جلا دی اور بین الاقوامیت کا جھنڈا ساری دنیا میں لہرایا، کے رگ و ریشے میں حب الوطنی کوٹ کوٹ

کر بھری ہوئی تھی۔ وہ جنگجویانہ قوم پرستی کے جذبے سے آزاد تھے لیکن وہ اپنی میراث پر فخر کرتے تھے۔ بقول گاندھی جی وہ اپنے ملک کی عزت اور خودداری کے عظیم چوکیدار تھے۔ اس بات کا عکس ہم ان کی مشہور تقریر "ہمارا اپنا سماج" (۱۹۰۴-۰۵ء) میں پاتے ہیں۔

ان لوگوں کو جو اس بات کو بالکل اہمیت نہیں دیتے کہ طاقتوں کے در پر جا کر فریاد کرنے سے ملک کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا، ان کے مخالفین قنوطی کہتے ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ صرف بھیک مانگنا ہی غربت اور افلاس کے مستقل علم ہیں — صحیح قنوطی، میں یہ کبھی نہیں کہوں گا کہ ہم لوگوں کے لئے کوئی راہ نجات نہیں ہے سوائے اس کے کہ بستہ بدن میں ڈالے، بدن میں راکھ مل کر اپنے آقاؤں سے درخواست کرنی ہوگی۔ مجھے اپنے ملک پر یقین کامل ہے اور میں اس طاقت کو، جو ہم سبھوں میں ہے، خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

۱۸۷۵ء میں رابندرا ناتھ نے جب ان کی عمر ۱۴ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی "ہندو میلہ" میں شرکت کی اور وہاں حب الوطنی پر لکھے اپنے گیت کو گا کر سنایا۔ یہ میلہ ہر سال منعقد ہوتا ہے، اگرچہ اس کا نام ہندو تھا تاہم اس کا مقصد اور نظریہ قومی تھا۔ یہ میلہ ۱۸۶۷ء سے کلکتہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں ہر سال منعقد ہوتا۔

جب دہلی میں ایک دربار منعقد ہوا تو اس کا مقصد یہ
اکہ ہندوستان کے لوگوں کے سامنے یہ اعلان کیا جائے کہ
لینڈ کی وکٹوریہ ہندوستان کی ملکہ ہیں۔ اس وقت ہندوستان
ے لوگ شدید قحط اور بدحالی سے دوچار تھے لیکن ان غریبوں
ی غربت کا مذاق اڑاتے ہوئے ہندوستان کے راجا رجواڑوں نے
ی شان و شوکت کے ساتھ اس تقریب کو منایا۔ اس موقع پر
جوان ٹیگور نے، جن کی عمر ۱۶ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی، ایک نظم
لکھی جس میں انہوں نے بے حس اور سنگدلوں کے اس جشن کا مذاق
اڑایا۔ سترہ سال کی عمر میں انہوں نے ہندوستان کے غموں کا اظہار
کیا۔ ساتھ ہی دنیا والوں کی ناعاقبت اندیشی کا ذکر کیا، جو ایک
خیالی دنیا یوٹوپیا کا خواب دیکھ رہے تھے۔ عام لوگ اس وقت
تو کسی طرح غلامی کی زندگی میں پنپ رہے تھے، لیکن تعلیم یافتہ
طبقہ کے لوگوں نے موجودہ صورت حال میں خود کو ڈھال دیا تھا۔
یہ طبقہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے جیسے نوکری اور روزگار، یا محدود
پیمانے پر مقامی علاقوں میں خود اختیار حکومت کے لئے کبھی کبھی
شور و غل مچایا کرتے، لیکن نوجوان ٹیگور کو ان کا یہ رویہ پسند نہ تھا۔

جب ٹیگور سترہ سال کے ہوئے تو ان کے گھر والوں
نے انہیں لندن بھیج دیا۔ انہیں امید تھی کہ وہ وہاں سے بیرسٹر بن کر
واپس آئیں گے، لیکن ان کے گھر والوں کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو
سکا، کیوں کہ ٹیگور ۱۸ مہینے کے بعد گھر واپس آگئے۔ ان کے
زمانے میں امیر طبقہ کے لوگوں کے دو مقاصد ہوتے۔ ایک تو تعلیم
حاصل کرکے بیرسٹر بننا اور دوسرا سیول سروس میں داخل ہونا۔
ٹیگور نے ان دونوں مقاصد کو تیاگ دیا۔ ۱۸ مہینے کے بعد جب وہ
واپس آئے تو ان کے پاس وہی تجربہ تھا جو انہیں انگریزوں کے
ساتھ رہنے سے حاصل ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں جب ان کی عمر ۱۹ سال
کی ہوئی تھی تو انہوں نے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے
برطانیہ کی شدید مذمت کی کہ برطانیہ کی اپنے شاہی مفاد کی خاطر
یہی کوشش ہے کہ چین کے باشندوں کے حلق کو افیون سے بھر دیا
جائے۔

ٹیگور نے اپنی عمر کے بیس تا تیس سال کے عرصے میں
اپنے ملک کے لئے اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار کیا۔ لیکن
پھر بعد میں انہیں اپنی بے حسی کا بھی احساس ہوا اور انہوں نے
اس کا ذکر اپنے مضمون "نئے اور پرانے" (۱۸۹۱-۹۲ء) میں یوں
کیا۔

"یاد رکھو، اس دنیا میں جس دن سے تم حرکت کرنا چھوڑ
دو گے اسی دن سے تم تباہی کے دلدل میں دھنستے جاؤ گے۔ آخر
میں تم اس موڑ پر پہنچ جاؤ گے جس کے آگے کوئی راستہ نہ ہوگا،
لیکن دوسرے لوگ جنہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا، آگے
بڑھتے ہی رہیں گے۔ تم عالمی امور کے مد و جزر میں سب کے ساتھ
کاندھے سے کاندھا ملا کر چل نہ سکو گے۔ تمہاری سست رفتاری
تمہاری کمر توڑ دے گی اور تم تھک جاؤ گے اور تنزل کے جال میں تم بری
طرح پھنس جاؤ گے۔ بلا رکے آگے بڑھتے جاؤ اور اپنی زندگی گزار لو یا
کسی کے محکوم بن جاؤ اور ہمیشہ کے لئے لعنت کا تمغہ لئے پھرو۔
یہی دنیا کا قانون ہے۔"

۱۸۹۱-۹۲ء میں انہوں نے اشتراکیت پر کئی ایک
مضامین لکھے جن میں انہوں نے، اس مطمح نظر کے لئے اپنی ترجیح کا
اظہار کئے بغیر، اس نئے رجحان کو خوش آمدید کہا جو انہوں نے
مغرب میں سماجی تعلقات میں استحصال اور بے انصافی کا مقابلہ
کرنے اور اشتراکیت کے مقاصد میں دیکھا۔ اس سلسلہ میں انہوں
نے ۱۸۹۳ء میں ایک مضمون لکھا: "یورپی قومیں جب غیر ملکوں میں
کام کرتی ہیں تو وہ انسان دوست، رحمدل اور انصاف پسند نہیں
ہوتیں جیسا کہ وہ اپنے ملکوں میں ہوتی ہیں۔" ایک اور مضمون
"انگریز اور ہندوستان" (۱۸۹۳ء) میں انہوں نے اس نقطہ کو
اجاگر کیا کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان تنازعہ ذاتی مفاد کا ہے،
ایک تنازعہ جو اتنی تاریکی پھیلاتا ہے جسے ۱۹ویں صدی کی ثقافت
کی روشنی بھی منور نہیں کر سکتی"۔ نیز انہوں نے اس مضمون میں
ہندوستان میں برٹش راج کی تصویر بھی پیش کی۔

وقت گزرتا گیا اور انگریزوں نے اس ملک میں لوٹ
کھسوٹ کے بازار کو گرم رکھا۔ ان کی نظر میں ہندوستان ان کے شاہی
کھسال میں رکھی ایک موٹی تازی دودھ دینے والی گائے ہے۔ وہ اس

کھڑال کو صاف رکھتے، گائے کو چارہ دیتے۔ وہ اس منتقلہ جائیداد
کو اچھی حالت میں رکھتے اور اس کی سینگ کی نوک کو توڑ دیتے تاکہ یہ
کسی کو ڈھونس (سینگ) نہ مار سکے، جب یہ غصہ میں آ جائے۔
صبح و شام اس گائے کو دوہتے اور اس کے پیتے دیتے بچھڑوں کے
لئے کچھ دودھ چھوڑ دیتے۔ ان باتوں سے انگریزوں کا ذاتی مفاد بالکل
عیاں ہو جاتا ہے۔"

اسی دوران انڈین نیشنل کانگریس نے (جسے
۱۸۸۵ء کو قائم کیا گیا تھا) اپنا پہلا سیشن کلکتہ میں دسمبر ۱۸۸۶ء کے
آخری ہفتہ میں منعقد کیا۔ یہاں بھی ٹیگور نے جو اس وقت ۲۵
سال کے نوجوان تھے، اس جلسے میں اپنے لکھے گیت گائے۔ انہوں
نے ان گیتوں کو رام پرشاد سین کی موسیقی میں ترک دُھن میں گائے۔ اس
کے چند برسوں بعد کلکتہ میں پھر کانگریس کا سیشن منعقد ہوا۔ اس موقع
پر بھی ٹیگور نے افتتاحی گیت گائے۔ اس وقت انہوں نے بنکم چندر
چٹرجی کے گیت لکھے "بندے ماترم" گائے۔ آزادی سے قبل تک یہی
گیت ہندوستان کا قومی ترانہ تھا۔ آزادی کے بعد ان کا گیت
"جن۔ گن۔ من" ہندوستان کا قومی ترانہ بن گیا۔ اس سلسلے میں
شاعر کے بیٹے نے ایک واقعہ کا ذکر کیا۔ یہ بات ۱۸۹۲ء کی تھی۔
کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس ہوا تھا۔ اس موقع پر ایک انگریزی
عشائیہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ٹیگور کو بھی مدعو کیا گیا تھا کہ وہاں جائیں اور
مہمانوں کو اپنے گیتوں سے مسحور کر دیں۔ ٹیگور کا وہاں جانے کا ارادہ
نہیں تھا لیکن مجبوراً انہوں نے شرکت کی۔ انگریزوں کے شایانِ
شان "عشائیہ" میں دھوتی پہنے اور چادر اوڑھے ٹیگور ہال گئے
اور وہاں ایک گیت گائے۔ یہ گیت محکوم ہندوستانیوں کیلئے
دکھ درد کی آواز تھا، ساتھ ہی اس میں حاکموں کے خلاف غم و غصہ
کا بھی اظہار کیا گیا تھا۔ اس گیت سے پوری محفل میں خاموشی
چھا گئی اور اس کے بعد یہ پارٹی منتشر ہو گئی۔ ان کے اس گیت کے
چند مصرعے یہ ہیں:

مجھے گیت گانے کو نہ کہو، میری التجا ہے، مجھے ایسا کرنے کو نہ کہو،
کیا یہاں ہم صرف خوشیاں منانے اور ہنسنے کھیلنے کیلئے آئے ہیں،
اور بھلے دار جھوٹی باتیں کہنے،

آج کون جاگے گا، خدمت کرے گا، اور پوچھے گا
اپنی ماں کے آنسو
اور پیش کرے گا اس کے چرنوں میں اپنی تمام دلی خواہشات
اور پُرخلوص خدمات

+ + + + +

جب انہوں نے ۱۸۹۷ء میں نٹور میں بنگال صوبائی
کانفرنس میں شرکت کی تو یہی جذبہ ان میں کارفرما تھا۔ وہاں بھی انہوں
نے اس بات پر زور دیا کہ تمام تقریریں بنگلہ میں ہونی چاہئے، لیکن
وہاں موجود دیگر سربراہوں نے ایسا کرنے سے معذرت کا اظہار کیا
تو انہوں نے کہا کہ وہ خود ان کی تقریروں کا ساتھ ساتھ بنگلہ میں ترجمہ
کرتے جائیں گے، اور انہوں نے ایسا کر کے دکھایا بھی۔
۱۸۹۸ء میں وہ عوامی امور پر طنز و مزاح سے پُر
مضامین لکھے۔ اپنے ایک مضمون "منھ میں تالا" میں وہ یوں رقمطراز
ہیں:

"وقتاً فوقتاً ہمیں اس امر کا احساس ہوتا ہے اور ہمیں
تعجب بھی ہوتا ہے کہ ہمارے برٹش حکمراں، اعلیٰ خود مختار حاکم اور حد
سے زیادہ طاقت ور بھی اس ملک میں خوف و ہراس میں زندگی بسر
کر رہے ہیں۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ دور سے روس کے قدموں
کی آواز انہیں یکایک تھرا دیتی ہے۔ کیوں کہ جب کبھی بھی ان کا دل
دھڑکنا شروع کر دیتا ہے، تو گویا ان کے خزانہ میں ایک زلزلہ
آ جاتا ہے، اور ہمارے مادرِ وطن کا خزانہ بالکل خالی ہو جاتا ہے، اور
خوراک کے دو چار لقمے بھی، جو بچ رہتے ہیں، اور جو غریب اور
استحصال کے شکار لوگوں کے بھوکے پیٹ کیلئے ہوتے ہیں، چشم زدن
میں توپ کے سخت آہنی گولہ بن جاتے ہیں، اور یہ اس قسم کی خوراک
نہیں ہے جسے ہم آسانی سے ہضم کر سکتے ہیں۔"

اسی طرح ٹیگور نے پیکل نوشی (۱۸۹۸-۹۹ء) سے
ہم ان باتوں سے واقف ہوتے۔ زیادہ

کانگریس ہمارے لوگوں کے دلوں میں صرف اسی
وقت گھر کر سکتا ہے جب یہ اپنے ذاتی وسائل سے ملک کی پائیدار
خدمت کرے۔ برخلاف اس کے، اگر یہ مختلف مزاج میں اپنے کاموں

کے سامنے اپنی دستوری قدم کے چلانے کو اپنا فرض سمجھتا ہے تو اسے اس کی خدمت کے لئے ایک دن ایک ٹکڑا روٹی کا نصیب ہوگا، تو دوسرے دن لات، اور آخر میں سڑک کے کنارے اس کی لاش پڑی ملے گی۔"

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ گاندھی جی کے تعمیراتی پروگرام سے کم از کم ۲۵ سال پہلے ٹیگور نے یہ باتیں کہی تھیں۔

بیسویں صدی کے شروع ہی سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رابندرا ناتھ نے ساری دنیا کو اپنے افکار و آرار کے دائرہ میں لانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ وہ خلوت پسند تھے اور اب ان کے خیالات وسیع ہوتے جا رہے تھے اور انہیں اس بات کا یقین کامل ہو گیا تھا کہ اب مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے سے ملنا چاہئے، آزادی اور دوستی کی فضا میں ـــــ اپنے مضمون "سماج اور تفریق" (سنہ ۱۹۰۱-۱۹۰۲ء) میں انہوں نے لکھا۔

"جدید عرصہ میں یورپ میں اندھی دشمنی نے تہذیب کی طمانیت کو دغا غدار بنا دیا ہے۔ جب راون دشمنی سے پاگل ہو کر بدی کی راہ پر گامزن ہو گیا، تو اسے فوراً لکشمی نے ایسا کرنے سے باز رکھا، کیوں کہ فلاح و بہبود کی دیوی نے جدید یورپ کے مندروں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں بوئر کے علاقوں میں اشتعال انگیزی کی آگ بھڑک اٹھی۔ چین میں ظلم نے اپنا ظاہری لبادہ اتار کر رکھ دیا اور بربریت ننگی ہو کر سامنے آگئی۔ مذہبی مبلغوں کی خشک باتوں نے مذہب کی روح کو مُردہ بنا دیا ہے۔"

سنہ ۱۹۰۴-۱۹۰۵ء میں انہوں نے یہ اعلان کیا کہ کس طرح غیر مسلح، غریب اور بیکسی کے شکار ہندوستان کی کمزوری حکومت برطانیہ کی موت ثابت ہوگی۔ انہوں نے اپنے لوگوں کو پکارتے ہوئے کہا:

"غم کے دنوں میں سچائی کی شناخت کی جا سکتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اس طرح کی سوچ وچار کے بغیر لوگوں کو نجات نہیں ملی۔ خود کو قربان کر دینے کی ضرورت ہے، اور الفاظ کی بھرمار سے ہم اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ قسمت نے ہمیں یہ غم دیا تاکہ ہم حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔"

اس طرح پبنا (ابھی بنگلہ دیش میں ہے) میں بنگال صوبائی کانفرنس (جنوری سنہ ۱۹۰۸ء) کو اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے "سودیشی تحریک" کی شگفتگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ آزادی کے لئے ہندوستان کی جد وجہد کا پہلا عظیم دور ہے۔ اس کانفرنس میں مغربی بنگال کے گورنر لارڈ کرزن بھی موجود تھے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے شاعر ٹیگور نے کہا "بنگال کو انگریزوں کی حکومت دو حصوں میں منقسم کر دینا چاہتی ہے۔ یہ تحریک اس تقسیم کے خلاف ہے۔ اس تحریک نے ایک ہی نعرہ کو جنم دیا ہے جسے ہم مغرب سے مشرق تک سنتے ہیں۔ "ہم بنگالی ہیں، ہم ایک ہیں!" کیا اس سے پہلے ہم لوگوں کو کبھی بھی اس حقیقت کا احساس ہوا ہے کہ ہر جگہ کے بنگالی ایک ہیں، ہمارا خونی رشتہ ایک ہے، اور اسی رشتہ نے ہمارے درمیان اتحاد کے شعور کو اجاگر کیا۔ دیگر دریافتوں کی طرح، ہم لوگوں کی یہ نئی دریافت بھی ہمارے سامنے ایک محدود مقصد کی کامیابی کے لئے عارضی ضرورت کے طور پر رونما ہوئی۔ لیکن بعد میں ہم نے یہ دیکھا کہ یہ عارضی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو ایک خزانہ ہے، ہماری طاقت کا اظہار ہے۔

طاقت کے اس اچانک احساس نے، جو ہمارے اندر موجود ہے، ہمارے عوام کو خود اعتمادی کا شربت مفرح پلا دیا کیونکہ اس شربت کے بغیر ہم بلا روک ٹوک اتنے دنوں تک مصائب کا شکار بنے نہیں رہتے۔ جیسا کہ ہم لوگوں نے بائیکاٹ تحریک میں کیا۔ محض طیش میں کبھی بھی برداشت کی اتنی قوت نہیں ہوتی، اور خاص طور پر طاقت وروں کے خلاف کمزوروں کا غصہ اتنے نمایاں طریقے سے عیاں نہیں ہوتا۔"

شاعر کے دل میں ملک اور اس کے عوام کے لئے کتنی گہری محبت تھی، شاید اس کی ہم اچھی طور پر وضاحت نہیں کر سکیں گے۔ کمزور و ناتواں سیاست کے تناظر نے انہیں بُری طرح مجروح کیا۔ اس سلسلے میں اپنے ایک دوست کو خط میں بیان کیا:

"جب تک کہ ہم خود کو حق بجانب قرار نہ دے سکیں، اس وقت تک ہمیں چھپ کر رہنا چاہئے۔"

پھر سنہ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے تن تنہا شانتی نکیتن میں اپنا اسکول قائم کیا۔ اس اسکول کے کُل اخراجات وہ خود برداشت

کہتے حالانکہ اس وقت ان کی ذاتی آمدنی دو سو روپیے ماہانہ بھی نہ تھی۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ان کی بیوی نے موت سے قبل (ان کا ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا) تقریباً اپنے تمام زیورات فروخت کر دیے۔ لیکن سودیشی تحریک نے انہیں پھر بولپور سے باہر بلا لیا اور ۱۹۰۴-۱۹۰۷ء کے دوران وہ قومی جدو جہد میں سرگرم عمل ہو گئے۔ بہت سارے مضامین لکھے۔ جگہ جگہ تقریریں کیں، عوامی مظاہروں میں بذات خود شرکت کی اور قومی تعلیم، جسے انہوں نے خود مرتب کیا تھا، کے کام میں سرگرم عمل ہو گئے۔

۱۹۰۹ء تک بہت ساری ازائد ہم کے باوجود ٹیگور نے تحریک کے لئے اپنی سرگرمیوں کو خاص طور پر تعلیم کے میدان میں جاری رکھا، لیکن سیاست کے تنگ مزاجی ان کی بیدار روح کو راس نہ آئی، اور ایک بار پھر خود کو وہ تنہا اور ایک بندھن میں جکڑے ہوئے پایا۔ اسی سال انہوں نے سیاست کو خیرباد کہا اور نہ صرف شانتی نکیتن میں بلکہ اپنی خاندانی زمین داری کے علاقوں میں اپنی دیہی نوتعمیر اسکیموں کو روبہ عمل لانے کی کوشش کی۔ مختلف ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد انہیں جو زرعی اور متعلقہ کام کاج کے جو تجربات حاصل ہوئے تھے، انکی روشنی میں انہوں نے مذکورہ اسکیمیں مرتب کی تھیں۔ یہ عرصہ "گیتانجلی" کا عرصہ تھا، جب شاعر امن کی، ایک توازن کی، مکمل سوجھ بوجھ کی تلاش میں خودی میں غرق ہو گئے۔ لیکن عرصہ دراز تک روحانیت کی دنیا میں خود کو محو کر نہ رکھ سکے، کیوں کہ بار بار اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ اسی وقت اپنی دنیا سے بھی وابستہ تھے۔ اور اس کے سورما بھی تھے۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے وہ گیت لکھا جو آج ہمارا قومی گیت بن چکا ہے۔ اسی سال کلکتہ میں منعقدہ کانگریس کے سیشن میں انہوں نے یہ گیت گایا تھا۔

ہندوستان میں حکومت برطانیہ ربندرا ناتھ ٹیگور کو ناپسندیدہ شخص میں شمار کرتی تھی۔ گرچہ انہیں "نائٹ ہڈ" یعنی "سر" کا خطاب ملا تھا اور ۱۹۱۳ء میں انہیں ان کے مجموعۂ کلام "گیتانجلی" پر انہیں "نوبل پرائز" بھی دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء میں جب ٹیگور جاپان کا دورہ کر رہے تھے تو اس وقت بنگال کے گورنر لارڈ کارمائیکل نے، جو ان کے آرٹ کے دلدادہ تھے، ٹوکیو میں برٹش سفیر کو تعارف کا ایک خط لکھا۔ جب یہ بات ریاستی سکریٹری برائے ہندوستان تک پہونچی تو وہ غصہ میں آگ بگولہ ہو اٹھا اور یہ خط لکھا کہ لارڈ کارمائیکل کو ایک شخص کی بابت تعارف کا خط نہیں لکھنا چاہیئے تھا، جس کا ارادہ اور طور طریقہ حکومت ہند کی نظر میں مشکوک ہے۔ اس خط کے ملتے ہی ٹوکیو میں سفیر کے نام ایک ایکسپریس ٹیلی گرام بھیجا گیا جس میں انہیں ان تمام باتوں سے آگاہ کیا گیا کہ چوں کہ لارڈ کارمائیکل اعلیٰ سیاسی رسوخ کے آدمی تھے، اس لئے انہیں انگلینڈ میں واپس نہیں بلایا گیا۔

آزادی کے لئے ہندوستان کے مطالبات کو برٹش حکومت سُنی ان سُنی کر دیتی۔ برٹش حکومت کی اس بے رُخی کے خلاف ربندرا ناتھ نے بہت سارے مضامین لکھے، بیانات جاری کئے جنہوں نے سیاسی منظر کو منور کر دیا۔ اگست ۱۹۱۷ء میں انہوں نے ایک مضمون "تجھے فرمانبرداری کرنی ہوگی" لکھا:

"اگر ایک قوم کو ترقی کی راہ پر انچ انچ کھسکنا پڑے، آہستہ آہستہ قدم بہ قدم آگے بڑھنا پڑے، تو وقت کو بذاتِ خود اپنی شکست تسلیم کرنی ہوگی، آج کسی بھی قوم کو آزادی پانے کی مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا اگر اس قوم کے لوگوں کو ترقی کے لئے امکانات کے مستحق ہونے کے قبل یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ آزادی پانے کے لئے بالکل تیار ہو چکے ہیں۔"

برطانیہ کے مونٹاگو اعلانیہ ۱۹۱۷ء کا یہ منہ توڑ جواب تھا۔ اس اعلانیہ میں یہ کہا گیا تھا کہ ہندوستان بتدریج خود اختیار حکومت کی طرف آگے بڑھ سکتا ہے لیکن اس سے پہلے ایسی ذمہ داری کو سنبھا لنے کے لئے ہندوستان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا یا نہیں اس بات کا فیصلہ برٹش حکومت کرے گی۔ ۱۹۱۷ء میں کانگریس کے کلکتہ سیشن میں شاعر نے شرکت کی اور اپنی نظم "ہندوستان کی دعا" پڑھی۔ اس منظر کی گگنا نندرا ناتھ ٹیگور نے اپنی پینٹنگ میں بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ اس وقت بھی کانگریس اندرونی تفریق کا شکار تھا اور کچھ رجعت پسند طاقتوں کا منصوبہ یہ تھا کہ مسز اینی بسنٹ کو اس سیشن کی

صداقت نہ کی [illegible] جاتے۔ ان تمام دشواریوں پر قابو پانے کے لئے ٹیگور نے استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین بننے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد ہندوستان میں برٹش حکومت کو ہندوستان کے لوگوں کی جدوجہد آزادی سے خدشہ لاحق ہو گیا، تو اس وقت اس حکومت نے ہندوستانیوں پر ظلم کا پہاڑ توڑ دیا، اور عوام کو اس طرح دبانے کی کوشش کی کہ یہ پھر کبھی ابھر نہ سکے۔ اس وقت (۱۹۱۹ء) میں ٹیگور نے اپنے غم و غصہ کا یوں اظہار کیا:

"ہمارے نوجوانوں کو، یہاں تک کہ ہمارے بچوں کو خفیہ پولس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے — یہ کس قسم کی ریاستی پولس ہے؟ اس کی مثال تو یوں دی جا سکتی ہے کہ بھینسوں کے جھنڈ کے جھنڈ کو غلّے کے لہلہاتے کھیتوں میں چھوڑ دیا جائے۔ اس کے نتیجہ میں کسان اپنی قسمت کو روئیں گے اور مویشی کے مالکان اس بات کا افسوس کریں گے کہ ان کی مویشیوں کو چرنے کے لئے کچھ نہیں رہا۔"

جلیان والا باغ (۶ر اپریل ۱۹۱۹ء) کے نتیجے لوگوں کے قتلِ عام کے بعد وہ اپنے لوگوں کے ساتھ غم و اندوہ میں ڈوب گئے۔ انہوں نے ۳۰ر مئی ۱۹۱۹ء کو وائسرائے کو ایک احتجاجی خط لکھا اور اپنا "سر" کا خطاب حکومت کو واپس کر دیا۔

گاندھی جی اسی وقت ہندوستان کی تاریخ کے اسٹیج پر نمودار ہوئے اور جن لوگوں نے انہیں پہلی بار "مہاتما" (عظیم روح) کے نام سے پکارا ان میں ٹیگور بھی شامل تھے۔ اسی طرح گاندھی جی نے ٹیگور کو "گرودیو" (معزز استاد) کہا۔ ان دونوں کے مابین بہت اچھے تعلقات تھے، حالانکہ کبھی کبھی ان دونوں میں کسی موضوع پر اختلاف بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر جب ۱۹۲۱ء میں شاعر مغربی ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد واپس آئے تو اس عدم۔تشدد (اہنسا) کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں گاندھی جی سے ان کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ چوں کہ یہ عدم۔تشدد کی تحریک ہے اس لئے اسے دل و دماغ کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہئے۔ جب یہ مختلف روایتوں اور ثقافتوں کے لاکھوں لاکھ لوگوں کی تحریک ہے، اور جسے جبر و تشدد سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کے لئے لمبے عرصے تک جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ ٹیگور اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں:

"گاندھی جی نے اصرار کیا تھا کہ ہم روزانہ آدھے گھنٹے تک چرخہ چلائیں، لیکن صرف آدھا گھنٹہ کیوں؟ ۸½ گھنٹہ تک کیوں نہیں، اگر اس ملک کو مدد ملے گی۔" انہیں گاندھی جی کے اس طلسم پر جو سارے ملک میں پھیل چکا تھا، یقین نہ تھا کہ چھ مہینے تک چرخہ چلانے سے ملک کو سوراج (آزادی) حاصل ہو جائے گی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ٹیگور نے اس سلسلے میں کہا تھا کہ اگر سوراج اس طرح سے حاصل کیا جائے تو وہ قابلِ حصول نہیں ہے۔ اگر انہیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ ایک پجاری کے چرنوں کی پوجا کرنے سے انہیں سورگ میں جگہ ملے گی تو ایسے سورگ میں جانا پسند نہ کریں گے گرچہ اس پوجا اور پرستش کی کچھ خاص اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں گاندھی جی اور ٹیگور کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی، ان کا ذکر رومین رولینڈ نے بہت ہی اچھے طریقے سے کیا ہے۔ گرچہ ہندوستان کی یہ دو عظیم ہستیاں ایک دوسرے سے اتفاق نہ کر سکیں تاہم اتنی شدید تفریق کے باوجود، وہ ایک دوسرے کا بہت خلوص کے ساتھ احترام کیا کرتیں۔ شاعر گاندھی جی کے جذبہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کی زندگی میں بہت ہی اہم اور عظیم تبدیلیاں لائیں۔

۱۹۲۱ء میں ٹیگور نے سی۔ ایف۔ اینڈریوس کو اس سلسلے میں خط لکھا:

"سودیشی، سوراج عام طور پر ہمارے ہم وطنوں کے دلوں میں شدید جذبہ کو اجاگر کرتا ہے، کیوں کہ اس سے لوگوں کے دلوں میں غم و غصہ کی جگہ لگن پیدا ہوتی ہے۔ یہ کہا نہیں جا سکتا ہے کہ میں اس گرمی اور تحریک سے متاثر نہیں ہوا، لیکن شاعر ہونے کے ناطے میرا مذاق ایسا ہے کہ میں ان مقاصد کو قطعی قبول نہیں کر سکتا۔ ایک محبِ وطن یا ایک با اخلاق آدمی کے سامنے ایک مکمل انسان کو قربان نہیں کرنا چاہئے۔"

۱۹۲۱ء میں اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ اور

غیر ملکی کپڑوں کے جلانے کی مہم کے عرصہ میں ٹیگور نے اینڈریوس کو ایک خط لکھا:

"مجھے وہ دن یاد ہے کہ بنگال میں سودیشی تحریک کے دوران نوجوان طلباء نے ہمارے "ویچترا" گھر کی دوسری منزل میں مجھ سے ملاقات کی۔ ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں انہیں حکم دوں کہ وہ سب اسکول کالج چھوڑ دیں، تو وہ سب فوراً انکی اطاعت کریں گے۔ لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور طلباء غصے سے واپس چلے گئے، ان میں میری حب الوطنی پر شک پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس عام جوش و خروش کے عرصہ سے قبل میں نے اس تحریک کے لئے ایک ہزار روپئے کا چندہ دیا تھا، جبکہ میرے پاس اپنا پانچ روپیہ بھی نہ تھا۔ میں نے ان طلباء کو اسکول نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ کھوکھلے پن کی آمریت نے کبھی بھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچا اگرچہ اس آمریت کو ایک عارضی اقدام کی طرح اپنایا جاتا ہے۔ مجھے اس رکاوٹ سے خدشہ لاحق ہے، جو جیتی جاگتی حقیقت کو پس انداز کر دیتی ہے۔ یہ طلباء تو میرے سامنے مصنوعی مشین نہ تھے۔"

ٹیگور نے گاندھی جی کو جتنا خراجِ تحسین پیش کیا، شاید ہی کسی اور نے کیا ہو:

"گاندھی جی ہزاروں غریب اور نادار لوگوں کی کٹیا میں جاتے، ان لوگوں کی طرح وہ لباس پہنتے، وہ ان لوگوں کی زبان میں ان سے باتیں کرتے، آخر کار یہیں ایک زندہ حقیقت ہے۔ یہ کسی کتاب کا اقتباس نہیں ہے۔ اسی وجہ سے "مہاتما" کا جو نام ہندوستان کے لوگوں نے انہیں دیا وہی ان کا صحیح نام ہے۔ انکی طرح کس نے یہ محسوس کیا کہ تمام ہندوستانی ان کے جسم کے گوشت پوست ہیں۔ حقیقت سے براہِ راست وابستگی سے روحانی طاقت رونما ہوتی ہے، اور جب محبت ہندوستان کے دروازہ میں آئی، اس کے تمام دروازے کھلے ملے۔ گاندھی جی کی پکار پر ہندوستان میں نئی عظمت کے پھول کھل اٹھے۔ ٹھیک اسی طرح جب گوتم بدھ نے تمام زندہ مخلوقات کے لئے محبت کی حقیقت کو بیان کیا تھا۔"

رولینڈ کے کہنے کے مطابق ٹیگور کو جب کوئی بات پسند نہیں آتی، تو وہ اس سے دور رہتے۔ عدم تعاون کے سلسلہ میں ٹیگور نے ان سے کہا تھا: "اگر تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی تاریخ کے ایک عظیم ترین بحرانی دور میں، قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے، تو ایسا نہ کہو کہ وہ غلطی پر ہیں اور تم صحیح راستہ پر ہو، بلکہ تم اپنے عہدہ سے ہٹ جاؤ اور اپنی شاعری کی دنیا میں واپس جاؤ۔" لیکن اس تحریک نے شدت اختیار کر لی اور وہ اکتوبر میں اپنے خلوت کدہ سے اپنے ایک مضمون "مسیحائی کی پکار" کے ساتھ باہر نکلے:

"محبت کیلئے گاندھی جی کی صلاحیت میں ہمارے عقیدے میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔ ماہرین معاشیات، ماہرین تعلیم اور میکانیکی انجینئروں کو اس سلسلہ میں اپنی خدمات فراہم کرنی چاہئے۔ سبھوں کو گاندھی جی نے کہا "چرخہ چلاؤ اور بنو" "چرخہ چلاؤ اور بنو" کیا سرگرم عمل لوگوں کے لئے یہی نئے دور کی پکار ہے۔ یہ پکار تو شہد کی مکھی کے لئے نہ کہ انسان کے لئے موزوں ہے۔ انسان خود اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب اس کی بہترین صلاحیت کی مانگ ہوتی ہے۔"

یہ ایک بیکار سی بات ہے کہ ہم ایک مختصر عرصہ کیلئے چرخہ کات کر سوراج حاصل کر لیں گے۔ اگر انسانی زبان سے اس پیشین گوئی کو تسلیم کریں تو ہماری ہزاروں توہم پرستی میں مزید ایک کا اضافہ ہوگا۔

اگر ہم سائنسی طریقہ سے سوچ و چار نہ کر سکیں، تو ہماری پہلی جنگ تو دماغی حالت کے خلاف ہونی چاہئے۔ ایسی نااہلی تو بنیادی گناہ ہے جس سے یہ تمام بیماریاں پھیلتی ہیں۔

میں اپنے لباس کو جلانے کے لئے تیار ہوں، لیکن کسی ہدایت کے اندھے دباؤ کے تحت نہیں۔ ماہرین کو چاہئے کہ اس سوال پر غور کریں۔ ہمیں اپنے دعوے اور دلیل سے اس بات کا یقین دلائیں۔

اس سازگار صبح کو کیا ہم دوسروں کی خامیوں کا شمار لائیں گے اور اپنے تعمیراتی پروگراموں کی بنیاد ناسازگار احساسات پر رکھیں گے۔

رولینڈ یہاں ٹیگور کا شاندار اور خوبصورت نظم "سو

[illegible] کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہیں بھی اس بات کا احساس [illegible] گاندھی جی بھی صحیح راستہ پر گامزن تھے کیوں کہ موجودہ دور [illegible] مطالبات لازمی تھے ۔ گاندھی جی نے اپنے ہفتہ واری رسالہ "ینگ انڈیا" (۳/ اکتوبر ۱۹۲۱ء) میں ہندوستان کے عظیم نگہبان کو جن لفظوں سے مخاطب کیا ان سے ہندوستان کے مصائب و آلام کے شکار لوگوں کے لئے شدید ہمدردی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہاں رومین رولاں نے ٹیگور کے الفاظ کو یوں دہرایا "یہاں ہم آرٹ اور شعور و فن کے خواب کے سامنے دنیا کی ملاکت کو ابھرتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔ مجھ سے میری زندگانہ چھینو ۔ کرن ایسا ہے جیسے گاندھی جی کے جذباتی حالت سے ہمدردی نہیں ہے اور اس میں حصہ نہیں لینا چاہتا"

ٹیگور نے سیاست کی دنیا سے پھر کنارہ کشی اختیار کرلی اور پھر اپنی تخلیق کی جادو نگری میں واپس آ گئے ۔ عدم تعاون تحریک کے سلسلے میں ٹیگور نے اپنی مایوسی کا یوں اظہار کیا ؎

"اس پر بھی یہ خلفشار
غم کی آتشیں بھاپ، آسمان پر چھا گئی ہے
اور تن تنہا، تن تنہا، اس تمتماہٹ میں
ضیا بار گیتوں میں
میں تعمیر کرتا ہوں اپنے خوابوں کی دنیا
اس سلسلے میں ٹیگور نے یوں کہا،

مجھے یقین ہے کہ یہ بات لازمی ہے کہ سارے ملک میں مراکز قائم کئے جائیں، سوراج کی ذمہ داری کو پورے طور سے قبول کیا جائے، نہ کہ گھر میں کاتے دھاگے کی طرح ۔ جسم اور روح، دونوں کی صحت، تفریح اور سرگرمیوں کو ایک دوسرے میں ضم ہو جانا چاہئے، کیوں کہ وہ تصویر کو مکمل بناتے ہیں ۔ یہ بات ہمارے پیش نظر ہے کہ نئی روح ڈالی زندگی کے مختلف شکلوں کی مثالیں ہمارے ملک کے بہت سارے علاقوں میں موجود ہیں ۔ افسوس شکل میں اشتراکی مختاریت کا فروغ اور اس سے رونما ہونے والی باطنی شان و شوکت، یہ سب سوراج کے لئے مستحکم بنیاد ہوگی، اس کا فقدان، بیرونی اور اندرونی، ہمارے مطالبات کی اہم وجہ ہے، خوراک، صحت اور تعلیم کے لئے ہماری ضرورتوں سے انحراف اور دور اندیشی اور خوشی کا فقدان ۔ جذبات کی اس مفلسی کے باوجود یہ سوچنا کہ سوراج ایک حقیقت بن جائیگی، ایک بیکار سی بات ہے!"

عدم تعاون کے سال میں یعنی ۱۹۲۱ء میں ٹیگور کی عالمی یونیورسٹی وشو بھارتی کا افتتاح کیا گیا اور اس کے ساتھ شری نکیتن بھی قائم کیا گیا ۔ گاندھی جی بھی ٹیگور کے ہم خیال تھے کہ تعلیم کو کبھی بھی لوگوں کی زندگی کی لہر سے الگ رکھنا نہیں چاہئے ۔ معاشی ضرورتیں تو عالم گیر نوعیت کی ہوتی ہیں، انہیں تعلیم کے طریقہ کار کے ذریعہ پورا کرنا چاہئے ۔ عالمی بھائی چارگی کی تصور سے سرشار شاعر نے بار بار غیر ملکوں کا دورہ کیا ۔ وہ چین، جاپان گئے، جنوبی امریکہ اور جنوبی مشرقی ایشیا، کناڈا اور یورپ کا بھی دورہ کیا ۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۲ء میں جب ان کی عمر ستر سال کی ہو چکی تھی وہ ہوائی جہاز سے ایران اور عراق پہونچے اور اس وقت وہاں کے حالات ناساز گار تھے، اس کے باوجود انہوں نے ان ملکوں کا دورہ کیا ۔ لیکن ان دوروں میں بھی کہیں بھی گئے اپنے ملک کی آزادی کا تصور ان کے دل و دماغ میں ہمیشہ اجاگر رہا ۔ انہوں نے گاندھی جی کی ہمیشہ تعریف کی کہ گاندھی جی نے ہمت اور خودداری کو ہماری سیاسی زندگی میں پرو دیا ۔ اس سلسلہ میں وہ یوں رقم طراز ہیں :

پرانے دنوں میں حکومت کے در کے سامنے ہماری چیخ و پکار، ہچکچاہٹ سے پُر ہوتی اور ہم کاسۂ گدائی لئے پھرتے ۔ ہم لوگ ایک طوطے کی طرح تھے، جو پنجرہ میں رہتا ہے اور آزادی کے لئے اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتا اور وہ اس بات کی درخواست کرتا ہے کہ اس کے پاؤں کی زنجیر کچھ ڈھیلی کر دی جائے ۔ آج ہم نہ پنجرہ کی اور نہ زنجیر کی سوچتے ہیں، کیوں کہ ہم آزاد سوراج کے آسمان میں اڑنے کیلئے پر جھاڑ رہے ہیں ۔

۱۹۳۰ء کے اوائل سے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا ایک نیا عظیم باب شروع ہوا ۔ اس وقت ٹیگور بیرونی ممالک میں مصروف تھے ۔ آکسفورڈ میں "انسان کا مذہب" پر تقریر کی، پیرس، برلن اور ماسکو میں ان کی پینٹنگس کی نمائشیں ہوئیں ۔ ان کی پینٹنگس نے ساری دنیا کو دنگ کر دیا کیوں کہ ان کے آرٹ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا ۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں رونما

ہونے والی بہت سی باتوں سے انہیں دلی تکلیف پہونچی۔ لیکن بعد کے عرصہ میں ان کی یہ ذہنی تکلیف دور ہو گئی۔

۲۴ مئی سنہ ۱۹۳۰ء کو اپنے ایک خط میں انہوں نے یوں لکھا:

"جب میں اپنے ملک میں رونما ہونے والے حالیہ واقعات کی بابت خبریں اخباروں میں پڑھتا ہوں تو اس سے میرے ملک کی شان و شوکت اجاگر ہوتی ہے۔ بھڑکتے شعلوں کی روشنی اس کے منھ پر پڑتی ہے اور اس سے اس کا پورا چہرہ منور ہو جاتا ہے۔ ہمارے درمیان فاصلے سکڑ جاتے ہیں اور دکھ درد سے میرا دل میرے ملک کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس سے کوئی مضائقہ نہیں کہ میں ابھی ہندوستان سے دور ہوں ...... شاید فاصلہ سے میں اس کی خدمت کر سکتا ہوں"

انہوں نے یہی فرمایا تھا۔ اسی سال وہ سوویت روس گئے جہاں انہیں اپنے لئے اور اپنے ملک کے لئے عظیم تجربہ حاصل ہوا۔ کیا وہاں سے انہوں نے اپنے گھر خطوط نہیں لکھے جن کے الفاظ آگ کے ستون جیسے تھے اور جو تاریک راتوں کو منور کر دیتے تھے:

"ہم سنگدلوں کے جور و ستم سے ڈرتے ہیں لیکن اس خوف میں بھی احترام کا ایک جذبہ پوشیدہ رہتا ہے، لیکن ہم ایک بزدل کی سنگدلی سے نفرت کرتے ہیں۔ آج برٹش حکومت سے ہم حقارت کرتے ہیں۔ یہ حقارت ہمیں طاقت عطا کرے گی اور اسی حقارت کی وجہ سے ہم جیت جائیں گے۔ ابھی حال ہی میں میں روس گیا تھا۔ وہاں میں نے یہ بات دیکھی کہ روس کے شہیدوں کی تکالیف کے مقابلے میں ہمارے ملک کی ترقی اور آزادی کی طرف جانے والی سڑک خطرات سے کتنی پُر ہے۔ روسی مجاہدین پر ڈھائے گئے ظلم کے مقابلہ میں پولس کے حملے تو گویا پھول برسانے کے مترادف ہیں۔ جاؤ اور ہمارے عوام کے فرزندوں سے کہو کہ ابھی بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اپنی ملبس بہت ہو چکا۔ کہنا نہیں چاہئے کیوں کہ اس کے معنی پولس کے لاٹھی چارج کو خراج عقیدت پیش کرنا ہو جائے گا۔"

سنہ ۱۹۳۱ء میں شاعر کی ۷۰ویں سالگرہ کے موقعہ پر بنگال کے بکسا جیل میں سیاسی قیدیوں نے اپنی نیک خواہشات بھیجیں۔ ان کے جواب میں شاعر نے ایک خوبصورت نظم لکھی جسے حکومت نے بذریعہ ڈاک بھیجنے سے انکار کر دیا۔ جب ہجلی جیل میں دو سیاسی قیدیوں کو قتل کر دیا گیا تو اس وقت ٹیگور بہت برہم ہوئے۔ انہوں نے جگہ جگہ عوامی جلسے منعقد کئے اور بہت سارے مضامین لکھے جن میں انہوں نے اس ظلم کی شدید مذمت کی۔ "خدا کیا تو ان لوگوں کو معاف کر سکتا ہے جنہوں نے تیری ہوا میں زہر گھول دیا اور ہماری روشنی کو بجھا دیا"۔ جب سنہ ۱۹۳۲ء میں مہاتما گاندھی نے، جب وہ جیل میں تھے، تین ہفتہ تک بھوک ہڑتال یا فاقہ کشی کی۔ سارے ملک کے لوگوں میں بڑی بے چینی پیدا ہو گئی، لیکن اس موقعہ پر ٹیگور نے کلکتہ سے یرودا جیل تک یعنی تقریباً دو ہزار میلوں کا سفر طے کیا اور جب گاندھی جی نے اپنے تین ہفتے کی بھوک ہڑتال کو ختم کیا تو ٹیگور نے انہیں لیمو کا رس پیش کیا اور ان کے سامنے میٹھے میٹھے گیت گائے جس سے مہاتما کو ایک دلی سکون حاصل ہوا۔

پھر سنہ ۱۹۳۲ء میں جب شاعر کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ برطانیہ کے رائل ایئر فورس نے بغداد کے نزدیک گاؤں کے نہتے اور معصوم لوگوں پر حملہ کیا ہے تو اس درندگی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"اگر ایک بڑے سلسلے میں انسان کی ظالم تاریخ اپنی آدم خوری کی لالچ اور برادر کشی کی درندگی کے ساتھ مقدس زمین پر حملہ کرنے کے لئے اپنے کالے پروں کو پھیلا ئے، تو اس بے باک بے حرمتی کے لئے ہم سبھوں پر خدا کا قہر نازل ہو گا اور آدمی کی دنیا پر، جس سے خدا خود شرمندگی محسوس کرتا ہے، آخری بار پردہ کو گرا دیا جائے گا۔"

مارچ سنہ ۱۹۳۳ء کے شروعات میں سر جون اینڈرسن نے جو اس وقت بنگال کے گورنر تھے اور جو آزادی کی تحریکوں کو دبانے میں ماہر تھے، ایک سرکاری دورے پر شانتی نکیتن

گئے یہاں احتیاط کے طور پر پولس نے بہت وسیع اور اچھا انتظام کیا تھا۔ اس "جائے امن" کو پولس کیمپ میں تبدیل کر دینے کے خلاف بطور احتجاج ٹیگور نے شانتی نکیتن کے تمام طلباء و طالبات کو وہاں سے تین میل کی دوری پر واقع سری نکیتن لے گئے اور برٹش گورنر کو ویران شانتی نکیتن کے مناظر پر قناعت کرنا پڑی۔ بلاشبہ ٹیگور اپنے لوگوں میں اتنے سرگرم عمل رہتے اور ان تنازعات میں، جنہیں وہ حقیقی طور پر اہم سمجھتے، رائے دیتے، جو ایک پارٹی کے حق میں ہوتی تو دوسری کی مخالف۔ اس لئے سنہ ۴۰-۱۹۳۸ء میں انہوں نے گاندھی جی کے مداح ہونے کے باوجود سبھاش چندر بوس کی ایسے وقت میں تائید کرنے سے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جب گاندھی جی کے ارد گرد رجعت پسند کانگریسیوں نے انہیں کانگریس سے ہٹانے کی کوششیں کیں ۔۔ اسی سنہ ۱۹۴۰ء میں ٹیگور، اپنی بیماری کی حالت میں کلکتہ آئے اور یہاں "مہا جاتی سدن" کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس سدن کا منصوبہ سبھاش چندر بوس نے تیار کیا تھا۔ اس موقع پر ٹیگور نے بہت ہی اچھی تقریر بھی کی:

بجھتی شمع کے شعلے بجھنے سے قبل جس طرح بھڑک اٹھتے ہیں، ٹھیک اسی طرح یہ بات ہم شاعر کی تقریر 'تہذیب کا بحران' (مئی سنہ ۱۹۴۱ء) کے وقت پاتے ہیں۔ انہوں نے سوویت یونین کے عام لوگوں اور قبائلیوں کو دیکھا تھا۔ صرف چند سال قبل یہ لوگ سب خانہ بدوش تھے، جابر اور سفاک تھے، لیکن انکی ہمت افزائی کی گئی، انہیں تربیت دی گئی۔ انہیں تہذیب کے فوائد سے خود کو مستفید کرانے کی آزادی دی گئی اور اس طرح انہیں تہذیب کے دائرہ میں لایا گیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ، جب میں اپنے ملک کو دیکھتا ہوں، تو مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اعلیٰ ذہن اور عام لوگ آہستہ آہستہ وحشیانہ جہالت کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ حکومت کے ان دونوں نظاموں کا جب میں نے موازنہ کیا، ایک امداد باہمی پر مبنی ہے اور دوسری استحصال پر، اور دونوں میں بھی فرق ہے۔" انہوں نے اس بات پر اپنی حیرت کا اظہار کیا

کہ کس طرح برٹش جیسی ایک عظیم قوم کے اخلاق میں سامراجی لالچ اتنی بد نما تبدیلی لا سکتی ہے:

اس سلسلہ میں انہوں نے یہ کہا:

"ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ آج وہ ایک غیر ملکی قوم کے زیر حکومت ہے۔ ہندوستان کی یہ بدنصیبی ہے کہ آج اسکی کم سے کم ضروریات زندگی جیسے خوراک، پوشاک، تعلیم کے لئے حسب خواہ گنجائش اور طبی سہولتیں، کی فراہمی کے کام سے قصداً غفلت برتی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود اس سے زیادہ ناخوشگوار بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو تقسیم کر کے ہم لوگوں میں نفرت کو اب تحرک کیا جا رہا ہے۔"

یہ ظاہر ہے کہ تقسیم ہند کے لئے تحریک کا علم انہیں تھا، اور اسے ان کی خوش قسمتی کہہ سکتے ہیں، وہ تقسیم کو دیکھنے سے قبل ہی اس دار فانی سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئے۔ تقسیم ہند کی اس تحریک کی سامراجیت نے مسلسل تائید کی۔ زندگی کے آخری دنوں تک ٹیگور لوگوں کے حالات سے واقف تھے اور ان کے خیال میں آزادی ہی انہیں اس زنداں سے نجات دلا سکتی تھی۔ اپنی آخری نثری تحریر میں انہوں نے مس ایلینور رتھبون، پارلیمنٹ کے برٹش ممبر کو، جنہوں نے اس ملک میں برطانیہ کی کارگذاریوں کیلئے ہندوستانیوں کو خراج تحسین ادا کرنے کو کہا تھا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا:

"برٹش نے، جو دو صدیوں سے زیادہ عرصہ میں ہماری قوم کا کیسہ بند کرنے کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے اور ہمارے ملک کے وسائل کا استحصال کر رہے ہیں، ہمارے غریب لوگوں کے لئے کیا کیا؟ میں چاروں طرف دیکھتا ہوں اور ہر جگہ مجھے روٹی کے لئے چیختے ہوئے بھوک مرے نظر آتے ہیں۔ میں نے عورتوں کو گاؤں میں چند قطرے پینے کے پانی کے لئے خندق کھودتے دیکھا ہے، کیونکہ اس زمانہ میں ہندوستان کے دیہاتوں میں اسکولوں سے زیادہ کنوؤں کی کمی تھی۔ میں نے اپنے لوگوں کو ملیریا کا شکار ہوتے دیکھا ہے۔ پڑوس کے ضلع سے کسی نے بھی ان کے درد تک ایک

(باقی ص ۳۰ پر)

سوال

تخلیق : ربندرناتھ ٹیگور   ترجمہ : اعزاز افضل

میرے معبود! تو نے دور بدور
اس کرم ناشناس دنیا میں
بار بار ایسے لوگ بھیجے ہیں

درسِ مہر و وفا و عفو و کرم
دیا دنیا کو جن کی باتوں نے
جن کی تعلیم ہے کہ دور کرو
زہر کینے کا اپنے سینے سے

دہر میں یادگار ہیں وہ لوگ
ارفع و ارجمند ان کا مقام
مگر آج ایسا وقت ہے کہ انہیں
در سے لوٹا رہا ہوں کر کے سلام

میں نے دیکھا ہے وہ چھپا ہوا بغض
رات کے خوفناک سائے میں
بے سہاروں کو جس نے روندا ہے

میں نے دیکھا ہے نوجوانوں کو
پاگلوں کی طرح بھٹکتے ہوئے
اور پتھر پہ سر پٹکتے ہوئے
ہائے کس جاں کنی سے مرتے ہیں

آج رندھنے لگا ہے میرا گلا
بانسری میری کھو چکی ہے گیت
شبِ تاریک کے یہ محبسِ تنگ
تلخ اور خوفناک خواب تلے
میری دنیا کو ہیں دبائے ہوئے
یہی باعث تو ہے کہ بن کے سوال
دیدۂ تر ہیں ڈبڈبائے ہوئے

جن عناصر نے تیری دنیا میں
کر دیا ہے ہوا کو زہر آلود
روشنی کو تری بجھایا ہے
کیا انہیں کر دیا ہے تو نے معاف
کیا تجھے پیار ان پہ آیا ہے

رابندرناتھ ٹیگور
اور
عالمی دوستی

——— ایم۔ اے۔ نسیم



شاعرِ اعظم رابندرناتھ ٹیگور کا کوئی مخصوص سیاسی ایجنڈا نہ تھا۔ نہ وہ کسی جماعت کے فن کار تھے اور نہ وہ ایک سیاسی رہنما تھے۔ بلکہ وہ ایک عظیم تخلیقی فن کار تھے جنہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دیا، قومی تحریک کو جلا بخشی اور لوگوں کو بیدار کیا۔ وہ مجاہد بھی تھے اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کی آزادی کے خواہاں اور کوشاں بھی اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ انسان کی آزادی اور نجات کے لیئے سرگرم عمل رہے۔

ہندستان میں یورپی سامراجیت کے بلا روک ٹوک ظلم وستم اور لوٹ کھسوٹ اسی کے ساتھ ہی ہندستانیوں کی سیاسی تحریک کی ظاہری سست رفتاری نے ان کے دل میں ایک ہلچل سی پیدا کردی تھی اور وہ سب کو آزاد کرانے اور ہرجگہ بین الاقوامی سوجھ بوجھ کے ذریعہ قومی نازعات کو حل کرنے کے لیئے میدانِ عمل میں کود پڑے۔

انہوں نے ہمیشہ نادار اور کمزوروں پر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ بدیسی حکومت کے ظلم وستم اور سامراجیت کے خلاف احتجاج کیا۔ انہوں نے اپنی نظموں اور تحریروں میں مظلوموں کے حق کے لیئے اور ظالموں کے خلاف بار بار آواز اٹھائی۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، رابندرناتھ ٹیگور ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے قوم پرست بھی تھے۔ انہوں نے اپنی نظموں اور گیتوں کے ذریعہ قوم کی خودداری کا سبق پڑھایا۔ اپنے ہم وطنوں میں خود اعتمادی اور جاں نثاری کا جذبہ بیدار کیا اور قوم کو اس کی صحیح منزل کا راستہ دکھلایا۔

ٹیگور بہت بڑے مفکر بھی تھے۔ مختلف قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ان کی بہت ساری تفکر آرا تحریریں ہیں۔ وہ عالمی دربار کے پہلے سفیر تھے اس لیئے انہیں محدود حب الوطنی اور قومیت اپنے دائرۂ عمل میں نہ رکھ سکیں۔ اسی لیئے وہ یہ کہتے ہیں ؎

اے میرے دیش کی مٹی، تجھے میں سجدہ کرتا ہوں
عالمی ماں نے تجھے اپنے آنچل کے سائے میں رکھا ہے۔

ٹیگور انسان دوست بھی تھے اور انکی تحریروں میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے ایک مضمون "عظیم تر ہندوستان" میں یوں ذکر کیا ہے:

"ہندوستان میں بنی نوع انسان کی تاریخ ایک خصوصی تصور کی توسیع اور اسے جامع شکل میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس سے بنی نوع انسان مستفید ہوں گے۔ یہی ہم سبھوں کا مقصد ہے اور اس کام میں سبھوں کو بلا لحاظ مذہب وملت شرکت کرنی چاہیئے۔ عظیم تر ہندستان کی تعمیر میں ہم سبھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔"

شاعر نے اس موضوع کو بار بار عیاں کیا کہ ہندوستان صرف عالمی رابطہ اور تعاون کے ذریعہ ہی مکمل طور پر ترقی کر سکتا ہے۔ ان کے خیالات سے ہندستان کے بڑے بڑے مفکر اور سربراہ بھی اتفاق کرتے تھے۔ شری جواہر لال نہرو نے اس سلسلے میں یوں کہا:

"رابندرناتھ ٹیگور نے ہماری قوم پرستی کو بین الاقوامی نظریہ دیا اور اسے آرٹ اور موسیقی اور سحر انگیز الفاظ سے مالا مال کر دیا اور

آج یہ ہندستان کے بیدار جذبے کا علمبردار بن چکا ہے۔"
(گولڈن بک آف ٹیگور)

شاعر ٹیگور بہت ہی سوچ وچار کے بعد اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ بین الاقوامی سوجھ بوجھ اور تعاون ہی عصر جدید کا اہم کام ہے۔ ان کے خیالات میں ہندستان اس فرض کو آسانی سے انجام دے سکتا ہے کیوں کہ عرصہ دراز کی ہندوستانی روایت اس نقطہ سے ہم آہنگ ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ – ۱۸ء کی پہلی عالمی جنگ نے ان کے اس نقطۂ نظر کو بالکل عیاں کردیا۔ اس جنگ کے عرصہ میں انہوں نے جتنے مضامین لکھے ان میں بنی نوع انسان کے روشن مستقبل کی منور جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے اپنے دوست سی۔ ایف۔ اینڈرسن کو ایک خط میں لکھا :-

"اب ہم لوگوں پر یہ حقیقت عیاں ہو رہی ہے کہ ہمارے مسائل عالمی نوعیت کے ہیں اور اس دنیا کی کوئی بھی قوم خود کو دوسروں سے الگ رکھکر اپنی نجات کے لئے خدمات انجام نہیں دے سکتی۔ یا تو ہم سب ملکر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچائیں گے یا سب ایک ساتھ تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔ اس حقیقت کو دنیا کی عظیم شخصیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ ان میں بنی نوع انسان کے غیر منقسم جذبہ کی مکمل بیداری پائی جاتی ہے۔"

آج عالمی تاریخ کے اس اہم لمحہ میں کیا ہندستان اپنے محدود دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنے اس عظیم مطلع نظر کو، جس سے اس دنیا کے مختلف لوگوں کے درمیان ہم آہنگی اور تعاون کو فروغ حاصل ہوگا، پیش نہیں کر سکتا؟ کمزور اعتقاد کے لوگ یہ کہیں گے کہ ساری دنیا کے لئے اپنی آواز کو بلند کرنے کے لئے ہندستان کو مضبوط اور امیر ہونا پڑے گا ــــ لیکن مجھے ان باتوں پر یقین نہیں۔ یہ بات کہ انسان کی عظمت کا اندازہ اس کے مادی وسائل سے لگایا جاسکتا ہے ایک عظیم سراب ہے جو آج کی دنیا پر اپنا سایہ ڈال رہا ہے۔ یہ انسان کی بے حرمتی ہے۔ یہ تو مادی لحاظ سے کمزوروں کی طاقت ہے جو دنیا کو اس سراب سے باہر نکالے گی اور ہندستان اپنی غربت اور شکست کے باوجود بنی نوع انسان کو اس سراب سے باہر نکالنے کے لئے آگے بڑھ سکتا ہے۔

خورشید محبت کی روشنی میں آزادی وہ ہے جو غیر فانی زندگی کی عقل کو پختہ بنا دیتی ہے، لیکن جذبات ہمارے لئے زنجیریں تیار کرتے ہیں۔ روحانی انسان نمودار ہونے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ اور آزادی کے لئے ہماری جدوجہد، اس کی نجات کے لئے ہے۔ قومی ضرورت کے نام پر خطرناک علیحدگی کی فصیل کی تعمیر اس کے نمودار ہونے میں سد راہ ثابت ہو رہی ہے۔ نجات کا واحد راستہ انسانیت کے مطلع نظر کا فروغ ہے۔"

رابندرناتھ کی بین الاقوامیت ایک خیالی تصور نہیں تھی، کیوں کہ ایک مخصوص منزل تک پہونچنے کے لئے یہ کوئی میکانیکی طریقہ کار نہیں، اور نہ یہ کسی خاص فرقہ یا قوم کا تصور تھا۔ انسان دوستی کا ان کا یہ نظریہ بہت ہی وسیع تھا۔ مثال کے طور پر ایشیا اور افریقہ کے مظلوم لوگوں کے لئے ان کے دل میں درد تھا۔ وہ ظلم کو کسی بھی شکل میں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جب جاپان نے چین پر حملہ کر دیا تو اس وقت جاپان کے شاعر یونے نوگوچی نے، انہیں ایک خط لکھا جس میں اس نے ایشیائی قدروں کو مالا مال کرنے کے لئے جاپان کی خدمات کو سراہا اور جاپان اور چین کے مابین اس جنگ میں بطور مصلح اقدامات کرنے کو ان سے درخواست کی۔ ٹیگور نے جاپان کے اس شاعر کو جواب میں دو خط لکھے :-

"ــــ لیکن یقیناً انصاف اصول پر مبنی ہوتا ہے اور اس حقیقت کو خصوصی وکالت بھی تبدیل نہیں کر سکتی۔ مغرب سے سیکھے ہوئے تمام خطرناک طریقہ کار کے ساتھ چینی عوام پر ظالمانہ حملہ کر کے جاپان نے ان تمام اخلاقی اصولوں کو توڑ دیا جن پر تہذیب کا انحصار ہوتا ہے۔ آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جاپان ایک انوکھی صورت حال سے دوچار تھا، حالانکہ آپ نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ فوجی صورت حال انوکھی ہوتی ہے، اور فیاض جنگجو راجاؤں نے، اپنے ظلم کو حق بہ جانب قرار دیا اور ان لوگوں نے وسیع پیمانے پر ظلم وستم کے بازار کو گرم رکھنے کے لئے مخصوص معاہدے کرنے سے انکار نہیں کیا۔"

"آپ کا ایشیائیوں کے لئے ایشیا جس کا ذکر آپ نے اپنے خطوط میں کیا ہے، کا مسلک سیاسی بلیک میل کرنے کا ایک آلہ ہے اور اسے میں رد کرتا ہوں ــــ" (اشارۂ شاعر)

رابندرناتھ مغربی سامراجیت کے شدید نقاد تھے لیکن
اس کے باوجود انسان دوستی پران کے اعتماد میں لرزش نہیں ہوئی مغرب
کی خاص طور پر سائنس کی دنیا میں ترقی کو انہوں نے کافی سراہا اور
ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان بھی سائنس کو اپنائے اور دنیا کے
لوگوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلے اور یہ ایک اہم وجہ تھی
کہ انہوں نے گاندھی جی کے عدم۔ تعاون کے تصور کو قبول نہیں کیا۔ اسے
ہم ایک تخلیقی فن کار کا ردِ عمل کہہ سکتے ہیں کیوں کہ تخلیق ہی اس کی
زندگی کا فلسفہ ہوتی ہے۔

انیس صدی کی دوسری دہائی میں انہوں نے عدم۔ تعاون
تحریک کے دوران گاندھی جی کو خطوط لکھے جن میں دیگر باتوں کے علاوہ
انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو قومیت کے تنگ نظریہ کے خطرے سے
آگاہ کیا ہے

"اب سے ایک قوم جو اپنے ملک کے سلسلے میں الگ
تھلگ نظریہ کو اپناتی ہے، نئے دور کے جذبات سے سرشار نہیں
ہوگی اور راس اس کے لئے خواب و خیال بن جائے گا۔ اب سے ہر ملک کو
جو اپنے تحفظ اور فلاح کی بابت سوچ و فکر کرتا ہے، دنیا کی فلاح و
بہبود کے لئے فکر کرنی ہوگی۔"

دنیا اب جاگ اٹھی ہے، اس کی اس صبح میں اگر ہم اپنی
قومی کوششوں میں عالمی خواہشات کا خیال نہ رکھیں، تو اس سے ہمارے
جذبات کی مفلسی ظاہر ہوگی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا
کہ ہمارے ہاتھ میں جو کام ابھی ہے اسے نہ کریں، یا اسے چھوڑ دیں۔
لیکن صبح کی روشنی چڑیا کو بیدار کرتی ہے، تو اس بیداری کے ساتھ
ساتھ وہ خوراک کی تلاش میں نکل نہیں پڑتی۔ وہ تو پہلے سنہرے
آسمان کی پکار پر لبیک کہتی ہے اور پر پھیلائے اڑتی رہتی ہے۔ نئی
روشنی کی خوشی میں اس کے گلو سے گیت نکلتے رہتے ہیں۔ عالمی
انسان دوستی نے بھی آج ہمارے لئے یہی پیغام بھیجا ہے۔ ہم اپنی زبان
میں اسے لبیک کہیں۔ کیوں کہ لبیک کہنا ہی زندگی کی صحیح نشانی ہے۔
(ایتھکس آف ڈسٹرکشن)

دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹیگور کا خیال
یہ تھا کہ اگر ہندوستان کو ایسے مواقع سے مستفید ہونا ہے تو اسے
جدید ترقی کی راہ پر گامزن ہو جانا چاہئے۔ مسائل کو الجھانا نہیں چاہئے
کیوں کہ برسوں بعد ایسے مسائل سے پیدا ہونے والی الجھنیں ان لوگوں کے
لئے وبالِ جان بن جائیں گی جنہوں نے ان مسائل کو سلجھانے کے لئے پہل
کی تھی۔

ٹیگور نے بین الاقوامی موجھ بوجھ کے کام کو شانتی نکیتن
میں اپنے تعلیمی تجربوں کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی کوشش کی۔
دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی عالمی سیر و سیاحت، اہم
بین الاقوامی مسائل میں ان کی سرگرم دلچسپی اور اس عنوان کے
تحت ان کے مضامین اور ان کی تقریریں، ان تمام باتوں نے دلیس باسیوں
کے دل و دماغ میں بین الاقوامیت کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ اس طرح
ہندوستان کی سیاست پر بھی ان کا کافی گہرا اثر پڑا۔

یہاں اس بات کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ گرچہ
ٹیگور نے وقت کی ضرورت کی تشخیص کر لی تھی تاہم قومی مسائل کی
جگہ بین الاقوامی مسائل کے سلسلے میں ان کا رویہ جذباتی رہا۔ پیچیدہ
مسائل کو بھی وہ سائنسی طریقے سے نہیں بلکہ اخلاق اور انسان
دوستی رویہ سے حل کرنا چاہتے تھے۔ بین الاقوامی تعلقات کی بابت
ان کی معلومات، ان تعلقات کے پس پردہ سیاسی اور معاشی اور
سماجی مسائل کے غائر مطالعہ پر مبنی نہ تھیں۔ لیکن ایک بات ہمیں
کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا دماغ نئے خیالات اور نئی تحریکوں کیلئے
ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔

عالمی امور کا انہوں نے زندگی بھر جائزہ لیا اور اپنی زندگی
کے آخری دنوں میں انہوں نے اپنی ناامیدی اور امید کا اظہار کیا۔
اپنے روسی تجربات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے شانتی نکیتن میں
تعلیمی اداروں کے ممبروں سے کہا:۔

"مجھے یہ دیکھنے کا شرف حاصل ہوا کہ کتنی تیزی اور
توانائی سے سوویت روس مرض اور جہالت سے مقابلہ کرنے کی کوشش
کر رہا ہے۔ سوویت روس کی صنعت اور صنعتی اقدامات اس کے
عظیم ملک سے جہالت اور غربت کو دور کرنے میں کافی معاون
ثابت ہوئے۔ روسی عوام طبقاتی تفریق نہیں کرتے۔ انہوں نے
خود غرضی سے پاک اور بالآخر انسانی تعلقات کو دور دور تک پھیلا

دیا۔ ان کی حیرت انگیز ترقی سے مجھے بے حد خوشی حاصل ہوئی، اسکے ساتھ ساتھ میرے دل میں رشک بھی پیدا ہوا ہے۔"
(شانتی نکیتن کی آٹھویں سالگرہ کے موقع پر حاضرین جلسے سے خطاب)

اپنی جوانی میں ربندرا ناتھ نے ہندستان کی ریاستوں کا دورہ کیا تھا، اور ان ریاستوں اور ان کے راجاؤں اور نوابوں کی بابت لکھی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، اور اس طرح انہوں نے ایک خوبصورت سی تصویر تیار کر لی تھی۔ لیکن روس کے دورہ کے بعد انکی یہ تصویر چکنا چور ہو گئی۔ جب ان پر حقیقت عیاں ہو گئی تو انہوں نے اپنی دلی کیفیت کا یوں اظہار کیا :۔

"یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ ہندستان ہی ہے جو برٹش لوگوں کی تجوریوں کو بھرتا ہی جا رہا ہے۔ انسان دوستی کے مطمع نظر کی یہ نقل، یہ عکاسی اور وہ بھی نام نہاد مہذب قوموں کی ذہنیت میں، کروڑوں مجبور ہندستانیوں کے ساتھ ایسا مجرمانہ اور نفرت انگیز سلوک، میں تو ان باتوں کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے انگریز قوم کے اخلاق کو تہذیب کے اعلیٰ ترین تصور سے وابستہ کر لیا تھا اور یہ باتیں مجھے ان کی ادبی تخلیقات سے معلوم ہوئی تھیں...

ایک دن میں نے انگریزوں کو دیکھا تھا۔ صحت مند قوم، نوجوانی کے جوش میں رچا بسا، ضرورت مندوں کی مدد کو ہر وقت آمادہ، اور آج میں انہیں دیکھ رہا ہوں، وہ وقت سے پہلے بوڑھے ہو چکے ہیں اور بدی کے طاعون نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہے......

اب یہ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم تہذیب کے اس مذاق کو برداشت کریں، جو طاقت کے بل بوتے پر حکومت کرنے پر یقین رکھتی ہے اور آزادی پر جس کا کوئی اعتقاد نہیں ہے، اپنی تہذیب کے جوہر سے ہمیں محروم رکھ کر، ہندستانیوں کو صحیح انسانی تعلقات سے دور رکھکر، انگریزوں نے بہت ہی موثر طریقہ سے ترقی کی تمام راہوں کو بند کر دیا ہے۔"
(آٹھ سال)

قومی اور بین الاقوامی امور میں عقیدہ سے زیادہ حقائق بولتے ہیں۔ بلا شبہ ٹیگور اس بات کو تسلیم کر لیتے کہ صرف اعتقاد کی تبدیلی سے کوئی بنیادی سماجی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ لیکن انکی بنیادی فراخدلی ہمیشہ اس حقیقت کو مکمل طور پر تسلیم کرنے میں سد راہ ثابت ہوئی ہے۔ اس لئے ان باتوں نے انہیں دنیا کے سیاسی ڈھانچہ میں بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت کو محسوس کرنے سے باز رکھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ بلا جد و جہد رسموں میں جکڑا ہوا سماجی نظام نئے نظام کے لئے راہ نہیں کھولتا۔ وہ بین الاقوامی ڈھانچہ، جسے شاعر قائم کرنے کے خواہاں تھے، بلا شبہ جد و جہد اور تنازعات سے رونما ہوا۔ یہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب مصالحت اور اصلاحات کے موجودہ تمام امکانات مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔ یہ اسی وقت ظاہر ہوگا جب معاشی اور سیاسی تبدیلیاں اسے لازمی بنا دیں گی۔ آج کی ضرورت یہ ہے کہ ان باتوں کو فروغ دیا جائے جو بنیادی سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیاں لاتی ہیں۔ آج ضرورت ہے عوامی نظام کی +++

بقیہ: ٹیگور ایک مصور۔

ان کی نقاشی کو جلا بخشی، اور حسن کی تخلیق جبلی طور پر ان کی زندگی سے وابستہ ہو گئی۔ ان کی تیار کردہ تصویروں میں زندگی کی جیتی جاگتی شکلیں نظر آتی ہیں۔ دوسرے دور کی مصوری میں انہوں نے خشکی کے مناظر کی بھی عکاسی کی۔ بچپن ہی میں ٹیگور کا قدرتی مناظر سے ایک لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، اور سیلائی داہ اور شانتی نکیتن کے ماحول نے اس لگاؤ کو اور بھی مستحکم بنا دیا۔ اس دور کی مصوری میں ان کی یادداشت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ تیسرے دور کی مصوری میں انہوں نے انسانی چہروں کی، جن میں آپ کا اپنا چہرہ بھی شامل ہے، نقاشی کی۔ اس دور میں ان کی بنائی ہوئی تصویروں میں انسانی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے عورتوں کی تصویریں بنائیں جن کے چہرے کی بے رونقی اور زردی آج بھی سربستہ راز ہے۔ ان تصویروں کی خاموشی ایک خصوصی جذبہ کو ابھار کرتی ہے۔

جس طرح بحر اور اوزان شعروں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں اسی طرح ٹیگور کی مصوری میں لکیروں اور رنگوں کے تناسب نے نئی نئی شکلوں اور مناظر کو ابھار کر رکھا ہے۔ ان کی مصوری ان کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتی ہے +++

ٹیگور کی نظر میں تعلیم کی اہمیت

از: اشفاق احمد

رابندرناتھ ٹیگور نہ صرف عالمی ادب کے ایک ممتاز رکن ہیں بلکہ تعلیم، سیاست، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، مذہب اور سماجی میدان کے وہ ایک بلند پایہ مفکر بھی ہیں۔ علم وفن کے باب میں آپ کی ہمہ گیر شخصیت کی نظیر دوسری جگہ مشکل ہی سے مل سکے گی۔ ٹیگور کی پیدائش اس وقت ہوئی جب بنگال ایک طوفانی دور سے گزر رہا تھا۔ جب ملک تین تحریکوں کی لہروں سے آشنا ہو چکا تھا۔ راجہ رام موہن رائے کی انقلابی تحریک (برہمو سماج)، بنکم چندر کا ادبی احیاء اور ہندوستان کی قومی تحریک نے مل جل کر بنگال کی نشاۃ الثانیہ مکمل کر دی تھی۔ بنگال وہ پہلا خطہ تھا جو خوابِ غفلت سے بیدار ہوا تھا اور ٹیگور کا خاندان بھی رجعت پسند بیز فرسودہ سماجی کوائف سے آزاد ہونے میں اولیت کا حکم رکھتا تھا۔ جاگرتی کے اس پس منظر میں ٹیگور کی ذہنی نشوونما ہوئی۔ انہوں نے مروجہ انداز سے تعلیم حاصل نہیں کی لیکن خداداد ذہانت اور قوتِ مشاہدہ سے وہ اشیاء و مظاہر کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس کے بعد علم وفن کے مختلف شعبوں میں انہوں نے جو نتائج و آرا پیش کئے، وہ ہماری مشترکہ تہذیب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ رقص، موسیقی، مصوری، ناٹک، کہانی، ناول، شاعری کے علاوہ فلسفہ، مذہب، سیاست، عمرانیات اور تعلیم کے متعلق ان کے اظہارات ہمارے تہذیبی ارتقاء کی ایک تابناک منزل ہے۔ چوں کہ ہمیں صرف ان کے نظریۂ تعلیم سے بحث ہے اس لئے ذیل میں اس کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

تعلیم کا مقصد ایک طالب علم کو کامل انسان بنانا ہے۔ یعنی تعلیم و تربیت سے اسے اس قابل بنایا جائے کہ آگے چل کر وہ سماج کی خدمت کر سکے۔ یہ نقطۂ نظر کم و بیش ہر اس نظامِ تعلیم کا ہوتا ہے جو کسی ملک میں رائج ہو۔ مگر ٹیگور اپنے عوامی تعلیمی نظام سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں ایسے گریجویٹ پیدا کر رہی ہیں جو ملکی ترقی میں کارآمد نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے تعلیم اور اس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اسے ہر مرد و عورت کے لئے ناگزیر بتایا ہے لیکن حصولِ تعلیم کے خاص ڈھنگ کی طرف انہوں نے واضح ارشادات بھی کئے ہیں۔

ٹیگور اپنے طرزِ تعلیم میں فطرت کو ایک اہم مقام دیتے ہیں کیوں کہ فطرت انسان کے کردار کی تشکیل کر سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر ایک مثالی ادارہ بنانا ہے تو اس کی تعمیر اس جگہ کرنی چاہئے جو انسانی آبادی سے دور تنہائی میں، کھلے آسمان کے نیچے، وسیع میدان میں پیڑ پودوں کے درمیان ہو۔"

ان کے خیال میں فطرت ایک ان دیکھا معلم ہے جس کے اقدار نہایت محترم ہوتے ہیں۔ حیاتیاتی، عقلی اور فلسفیانہ طور پر فطرت آدمی کو بہت کچھ سکھاتی رہتی ہے۔ فطرت کا گہرا مطالعہ بچوں کے شخصی ارتقاء کا موجب ہے۔ اس سے تعلق قائم کرنے سے زبردست تخلیقی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی مقصد کے تحت ٹیگور نے شانتی نکیتن کی بنیاد ڈالی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے فریڈرک بوس کو ایک خط میں لکھا کہ "فطرت سے انسیت اور تمام جاندار سے

ہمدردی دراصل تعلیم کی طرف پہلا قدم ہے۔" اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیگور کی نظر میں تعلیم کا ایک ایسا ڈھانچہ تھا جس میں فطرت (Nature) کی حیثیت اساسی تھی۔

ٹیگور کے تصورِ تعلیم کا دوسرا عنصر ہندوستانیت ہے۔ ان کا دور وہ تھا جب مغربی علوم و افکار ایک ریلے کی طرح ہندوستانی خمیر میں داخل ہو رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں ترک و اختیار کا ایسا معیار وضع ہونا تھا جو نئی نسلوں کے مستقبل کی تشکیل کر سکتا ہو۔

"مغرب سے اکتساب کرتے وقت ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہر شئے ہندوستانی روحانیت سے ہم آہنگ ہو۔ ہر شئے ہماری قومی عینیت کی تابع ہو اور قومی عینیت کی بنیاد ہر حال میں محفوظ رکھی جائے۔"

سوامی وویکانند کا یہ پیغام اس ہندوستان کے لئے تھا جو مغرب کی طرف ڈھلنے لگا تھا اور جو یورپی میکانکیت، قومیت اور ہوسِ اقتدار کا شکار ہو رہا تھا۔ ٹیگور نے یہی پیغام سنایا مگر انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے قومی عینیت کی تشریح بین الاقوامی زبان میں کی اور قومی و بین الاقوامی عینیت میں ایک مطابقت پیدا کی۔

ایک خوب تر معاشرہ کی تشکیل کے لئے تعلیمی اصول وضع کئے جاتے ہیں۔ ٹیگور اس امر کا خاص لحاظ کرتے ہیں کہ فرد سماج کا ایک رکن ہے اور سماج افراد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس لئے آپسی تال میل کی نئے پر ایک سماج بنانا چاہئے۔ ہر شخص کا مطمحِ نظر یہی ہو اور ہر معلم کے ذہن میں یہ بات نقش رہے تو مطلوبہ خوب تر معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔ یہ وہ نقطہ ہے جس پر توجہ کرتے ہوئے ہمیں ٹیگور کی فکری دنیا خاصی کشادہ نظر آتی ہے۔ انہوں نے تعلیم کو ہمیشہ اس منصب کا آئینہ سمجھا ہے۔

مشہور مغربی مفکر اور فلسفی برٹرینڈ رسل نے ٹیگور کے طرزِ تعلیم پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ "تعلیم کا مقصد عالمی ریاست کی اطاعت ہونا چاہئے۔ مستقبل قریب کی ایک اہم ضرورت ایک عالمی شہریت کا شعور پیدا کرنا ہے۔ وشوا بھارتی لازمی طور

پر اس ضرورت کا لحاظ کرتی ہے۔" ٹیگور نے بذاتِ خود اعتراف کیا تھا کہ "میں نے وشوا بھارتی کو ایک اسکول کی حیثیت سے اس لئے قائم کیا ہے کہ اس میں مختلف تہذیبوں اور روایتوں کے حامل افراد آپس میں رہنا سہنا سیکھیں۔" گویا ٹیگور کے مطابق غیر قومی یا بین الاقوامی طریقِ تعلیم وہ واحد طریق ہے جس کی ہندوستان اور دنیا کو آج ضرورت ہے۔ تعلیم زندگی اس طرح رہنمائی کرے کہ وہ سماجی امور میں صحیح طور سے ہاتھ بٹا سکے۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ٹیگور فرد کی انفرادیت کا بقا چاہتے ہیں اور افراد کے ہجوم میں فرد کی انفرادیت بحال دیکھنا چاہتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو تعلیم کی ایک جہت داخلی اور گہری ہو جاتی ہے۔ یعنی تعلیم کا تفاعل صرف یہ نہیں کہ ایک بہتر سماج وجود میں آئے بلکہ دیکھنا بھی ہوگا کہ اس سماج کے افراد اپنی بھرپور شخصیت کے ساتھ مصروفِ کار ہوں۔ اس باب میں ٹیگور کی نظر سب سے پہلے بچے پر پڑتی ہے۔ وہ بچہ کو فطرت کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ بچہ کو آزاد ہونا چاہئے۔ استاد اس کا رہبر ہوتا ہے۔ اسے بچے کی تمام تر ذمہ داریاں قبول کرنا ہے۔ اس کی مثال وہ آشرم سے دیتے ہیں جہاں چیلا ہمیشہ گرو کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ تعلیم کی باہری ترغیبات پر اصل کو قربان نہیں کرتی اور طالب علم کو روحانیت کی غذا ملتی رہتی ہے۔

ٹیگور تعلیم کی ابتدا میں اسباب و آلات کا استعمال ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس بچوں کے لئے ایک ایسا آزاد ماحول بنا دینا چاہتے جس میں رہ کر وہ اپنے طور پر چیزوں کو تلاش کرنے کا جذبہ توانا کر سکیں۔ کیوں کہ چیزوں کی آسان فراہمی بچے کو بزدل کر دیتی ہے۔ وہ مہیا کی ہوئی چیزوں سے اپنا کام کرنے لگتے ہیں مگر جب یہ چیزیں سامنے نہ ہوں تو وہ ان کی جستجو کی فکر کرتے ہیں اور اس طرح تخلیق کے راستے ہموار ہونے لگتے ہیں۔ گویا اپنی مدد آپ کا اصول تخلیق کا سرچشمہ ہے۔

اپنی مدد آپ کا اصول آشرم کے ماحول کا متقاضی ہے۔ چنانچہ آشرم کی تربیت کی وکالت کرتے ہوئے ٹیگور کہتے ہیں کہ "آشرم میں تعلیم دینے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہاں

روزمرہ کی زندگی میں تعاون کرنے کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔ بہترین تجویز یہ ہو سکتی ہے کہ تعلیم کے ابتدائی عہد میں بچے پر غیر ضروری چیزوں کا بوجھ نہیں رکھنا چاہیئے۔ ہمارا احساس اس وقت مردہ ہو جاتا ہے جب ہم صرف مادی چیزوں سے الجھنے لگتے ہیں۔ بچے کو اپنی مدد آپ اور خود اعتمادی کی تربیت ملنی چاہیئے۔ ہمارے ملک میں تعلیم کے اس پہلو کی افسوسناک کمی ہے۔ بچے کو اپنی خوشی کے مطابق ان چیزوں کو ایجاد کے لئے چھوڑ دیا جائے کہ وسیلہ کی خاطر جو چیز بھی سامنے آ گئے استعمال میں لائیں۔ اس کے لئے انہیں ایسے استاد مہیا کئے جائیں جو درسی کتابوں سے آگے جا کر بچوں کو قریبی ماحول سے مربوط اور فطرت کے بلاواسطہ مشاہدے کا درس دینے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

ٹیگور کے شانتی نکیتن کا عملی تجربہ ایک جرأت مند تجربہ ہے۔ انہوں نے بچوں کو ان کے احساسات کی مکمل ترجمانی کا حق دیا ہے۔ وہ روزانہ کے معمول اور امتحانات کے خوف کے بغیر اپنی تخلیقی قوتوں کے بل پر مظاہر کا تجربہ کرتے رہیں۔ شانتی نکیتن کا ماحول آشرم کا ماحول تھا۔ تدریس کی بنیاد مشرقیت پر تھی۔ مغرب کی درسگاہیں جس طرح طلبا کو یہ سکھاتی ہیں کہ یورپ والوں نے مغربی تہذیب کی تعمیر کس انداز سے کی۔ بعینہٖ یہاں بھی مشرقی روایات کی روشنی میں اپنا مزاج استوار کرنے کا سبق دیا جاتا تھا۔ ٹیگور صحیح معنوں میں آفاقی روح کے مالک تھے۔ انہوں نے سختی سے اس تنگ نظر قومیت کی مخالفت کی جس سے موجودہ خلفشار مچا ہوا ہے۔ نہرو نے کہا تھا کہ برہمن ازم وہ قومی اور بدھ مت وہ بین الاقوامی مذاہب ہیں جنہیں دنیا کو ہندوستان نے عطا کیا۔ ٹیگور بین الاقوامیت کا مجسمہ ہیں جو سمجھتا ہے کہ تمام افراد و اقوام برابر ہیں۔ ٹیگور کی آفاقیت یا بین الاقوامیت دراصل دنیا کی خرابیوں کا مداوا ہے۔ اس کا منتہا یہ ہے کہ انسان کا آدرش بلند ہو، ایک انسان دوسرے انسان کی عزت کرنا سیکھے، مساوات کی تعلیم عام ہو اور انسان میں دردمندی، محبت و ایثار کا وہ جذبہ فروغ پائے جس کی بدولت اسے عالمی شہری ہونے کا شرف حاصل ہو جائے۔ ٹیگور بنیادی طور پر غیر رسمی تعلیم کے ذریعہ بچوں کی

کی بہبود چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد خاص یہ ہے کہ وہ کسی ایک مقام کے بجائے پوری دنیا کا شہری بن جائے۔ اسی شہریت کے ذریعہ صحیح جمہوریت عمل میں آئے گی جس میں طبعی، روحانی اور اخلاقی طور پر انسان اپنے فرائض انجام دے گا اور بنیادی حقوق حاصل کرے گا۔ یہی ایک بے غرض سماج کا صرف آغاز ہوگا جس میں انصاف اور راستی کا بول بالا ہوگا۔ ٹیگور کا نظریۂ تعلیم نہایت جامع ہے۔ اس میں روحانی اور جمالیاتی اقدار کی فراوانی ہے۔ یہاں ڈسپلن کا سبق اوپر سے مسلط کرنے کے بجائے آزادی اور حریت کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تعلیمی نظریے میں نوع انسانی کا تجربہ پوشیدہ ہے۔ بچے کی نفسیات کا نباض ہونے کے باعث ٹیگور ان کی تربیت کا واضح شعور رکھتے ہیں۔ اس طرز تعلیم کا پروردہ ہی بچہ "Father of Man" بننے کا اہل ہو سکتا ہے ÷÷÷



شانتی نکیتن میں موسم بہار کا تہوار



ایک چلّو پانی

——— سرین مکھوپادھیے ———

رابندرا ناتھ ٹیگور نے تین رقص۔ ڈرامے "شیاما"، "چترانگدا" اور "چنڈالیکا" لکھے، ان میں سے چنڈالیکا اپنی نوعیت کے اعتبار سے شیاما اور چترانگدہ سے کچھ مختلف ہے۔ گرچہ بعد الذکر ناٹکوں کی طرح ہے اور اس کا مقصد پیار و محبت کو اجاگر کرنا ہے۔ تاہم اس ڈرامہ میں محبت کا اظہار ہیرو اور ہیروئن کے عمل اور ردِ عمل سے نہیں ہوتا، بلکہ اس رقص۔ ڈرامہ میں ماں اور بیٹی کے درمیان بات چیت، عمل اور ردِ عمل اور جد و جہد سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ نیپالی بدھ مت کی کتاب "ساردول کورنا ابودان" سے "چنڈالیکا" کی کہانی لی گئی ہے۔ اس رقص۔ ڈرامہ میں دیگر باتوں کے علاوہ سماج کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ چھوت چھات کے خلاف گاندھی جی نے جو تحریک چلائی تھی، شاعر ٹیگور نے اس تحریک کو بڑھاوا دیا اور "چنڈالیکا" میں یہ نقطہ بالکل عیاں ہو جاتا ہے۔ صرف اس رقص۔ ڈرامہ میں ہی نہیں شاعر ٹیگور کے اس دور کی دیگر تخلیقات میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ٹیگور نے بہت ساری کہانی۔ نظمیں لکھیں۔ اسی طرح کی ان کی ایک نظم "پانی اٹھانے کا پیالہ" کے ابتدائی مصرعوں سے پوری نظم کا مقصد ظاہر ہو جاتا ہے۔ پہلا مصرعہ یہ ہے ؎

میری بات سنو،

کیچڑ میں اُگے کنول کی کوئی ذات نہیں ہوتی ہے

ٹھیک اسی طرح "چنڈالیکا" میں بھی انہوں نے اپنا خیال پیش کیا ہے ؎

میں جو آدمی ہوں، تم بھی، لڑکی، وہی آدمی ہو

"چنڈالیکا" رقص۔ ڈرامہ کی اہم بنیاد محبت ہے، اور پورا ڈرامہ انسانی تعلقات پر مبنی ہے۔ اس سے ہمارے شاعر رابندر ناتھ کی جگہ ایک پریمی رابندر ناتھ کو پہچاننے میں دشواری نہیں ہوگی۔ پوری کہانی میں مختلف سماجی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے لیکن اس میں انسان کی محبت کو ایک مختلف شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ آنند نے جس وقت پرکرتی کے ہاتھ سے پانی پیا اس وقت سے پرکرتی کی زندگی میں جوار آ گیا۔ اس جوار نے اس کے دل میں آزادی کی جوت جلا دی، ساتھ ہی اس کے دل میں ایک ہیجان بھی پیدا کر دیا۔ اور ہم ان تمام باتوں کی کس طرح تشریح کر سکتے ہیں؟ پرکرتی کی آرزو ہے یا اس کی محبت؟ اوپنیشد میں دو جملے درج ہیں "جو میری خواہش ہے، اور جس چیز کی مجھے خواہش ہونی چاہئے"۔ ان دونوں جملوں میں کافی فرق ہے۔ دنیا کے لوگوں کو ان دونوں جملوں نے مختلف طریقوں سے اپنے دائرۂ عمل میں رکھا ہے، لیکن جو "جس چیز کی مجھے خواہش ہونی چاہئے" کو اپناتے ہیں وہ منگل ہوتے ہیں، اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ "جو میری

خواہش ہے، کہاں جاتے ہیں وہ انسانی دنیا اور انسانی تصورات سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ انسان میں ایک چیز کی نہیں بہت ساری چیزوں کی خواہش ہوتی ہے اور محبت ان میں سے ایک ہے۔ شاید اسی وجہ سے ویشنو نظموں میں جسمانی خواہشات کو الگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن بعد میں یہی خواہشات روحانیت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ "آنند کو پانی پلانے کے بعد پروکرتی کے دل میں جو خیالات ابھر رہے ہیں، اسے جو خوشی حاصل ہوتی ہے اس کا مقابلہ ہم عام درجے کے عشق سے نہیں کر سکتے، بلکہ یہی تو حقیقی محبت ہے، یہ کوئی جسمانی خواہش نہیں ہے، پروکرتی کے کیریکٹر کا تجزیہ کرنے سے یہ بات اور بھی عیاں ہو جاتی ہے۔

پروکرتی ایک عام لڑکی نہیں تھی، اچھوت خاندان میں اس کا جنم ہوا تھا۔ اس بات سے وہ واقف تھی، اس لئے وہ اس بات کو کسی طرح بھی تسلیم نہ کر سکی کہ دیوتا کے راج میں اس کی معصوم زندگی پر دوسروں کے پاپ کا مُہر لگ جائے۔ احتجاج کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

جس نے مجھے اس بے عزتی کی تاریکی میں بھیجا ہے
میں اس کی پوجا نہیں کروں گی، کبھی نہیں کروں گی،
اس دیوتا کو
کیوں پھول چڑھاؤں گی، کیوں پھول چڑھاؤں گی
کیوں پھول چڑھاؤں گی

میں اسے،
جس نے مجھے ساری زندگی ایک بے عزتی کے مقام پر رکھا۔

اب پروکرتی کے صحیح کیریکٹر کی شناخت کرنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں ہو سکتی۔ وہ جذباتی تھی اس لئے اپنی عزت آپ کرو کا گہرا احساس تھا۔

ایک راجہ کے بیٹے نے جنگل میں شکار کرتے ہوئے، اس کی شکل دیکھ لی تھی، بس وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اور اسے شاہی محل میں لے جانا چاہا۔ پروکرتی نے اس شاہی تجویز کو نفرت سے رد کر دیا۔ اس سلسلہ میں اس کی ماں نے اس سے پوچھا کیوں تو راجہ کے گھر نہیں گئی۔ تیرا روپ دیکھ کر تو وہ

سب کچھ بھول چکا تھا؟ پروکرتی نے جواب دیا "جی ہاں، وہ تو بھول ہی چکا تھا، وہ یہ بھول چکا تھا کہ میں ایک آدمی ہوں۔ ہماری نظروں میں جانور بہت خوبصورت نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک کشش بھی ہوتی ہے اور ہم اس جانور کو باندھنے کی کوشش کرتے ہیں سونے کی زنجیروں سے؟"

پروکرتی خوشی سے بے چین ہو اٹھی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس لمحہ آنند نے پروکرتی کے ہاتھوں سے پانی لیا، اسی وقت اسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ بھی تو ایک آدمی ہے۔ اس کے لئے ایک چلو پانی ایک اتھاہ سمندر بن گیا۔

پہلی نظر ہی میں آنند نے پروکرتی کو پہچان لیا تھا۔ اس نے اس میں ایک روحانی کشش محسوس کی تھی۔ اسی لئے پروکرتی اپنی ماں سے کہتی ہے — "ماں بلاشبہ میں اسے چاہتی ہوں، مجھے اس کی ضرورت ہے، اس کے سامنے میں اپنے اس جنم کی پوجا کی ڈالی پیش کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے ان کے قدم ناپاک نہیں ہو جائیں گے۔ جو دیکھنا چاہے دیکھے ہماری ہمت کو، غرور سے میں کہنا چاہتی ہوں کہ میں صرف تمہاری خادمہ ہوں، ورنہ اس سنسار میں ہمیں ہمیشہ داسی بن کر سبھی کے قدموں کے نیچے پڑے رہنا پڑے گا۔"

آنند نے پروکرتی کو ایک آدمی ایک انسان کی حیثیت سے تسلیم کیا، اس سے اسے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی تھی۔ اس لئے کہ اب اسے ذلت کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہونے کیلئے ہمیشہ آنند کی ضرورت ہے۔ لیکن آنند کو جسمانی طور پر پانا اس کے لئے ناممکن ہے۔ آنند نے پروکرتی کو آزادی دی ہے، اس کے سامنے انسانیت کا ایک واضح نقشہ پیش کیا ہے۔ اب پروکرتی کے تصور میں آنند ہی بہترین آدمی ہے۔ اس آنند کو یادی لحاظ سے فراموش کر دینے کی اس میں صلاحیت نہیں تھی۔ پروکرتی کی باتوں سے یہ عیاں ہو جاتا ہے:

وہ جو جا رہے ہیں،
مڑ کے دیکھا نہیں، مڑ کے دیکھا نہیں،
اس کے اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ اس نئی تخلیق کو،

اور دیکھا نہیں مڑ کر وہ
آنند کی اسے اتنی ضرورت کیوں ہے، اس سلسلے میں
پروکرتی کہتی ہے:

میں اسے چاہتی ہوں
جنہوں نے مجھے خدمت کرنے کا اعزاز بخشا
بکھرے پھول کو
جنہوں نے دھول سمیت دائیں ہاتھ سے اٹھایا
اے پربھو، اے پربھو،
اس پھول کا مالا تیار کرو
اپنے گلے میں پہنو
اسے غیر مطمئن نہ ہونے دو

٭٭٭

پروکرتی کو جو کہ محبت میں دیوانی ہو گئی تھی، فوق الفطرۃ چیزوں کا سہارا لینا پڑا۔ ورنہ اس کے نئے جنم کا تصور ایک خام خیال ثابت ہوتا۔ اس تصور کو اس نے محبت کے جال میں پرو کر رکھا تھا۔ اس محبت پر وہ خود کو قربان کر دینا چاہتی ہے اور اس کے لئے اسے آنند کی اتنی ضرورت ہوتی ہے۔ آنند کو اپنے بس میں لانے کے لئے اس نے اپنے بے قرار دل سے، اپنی ماں سے درخواست کی تھی "ماں تم منتر پڑھو، تاکہ فوق الفطرۃ کا یہ جال اٹھ جائے، کیوں کہ اس جال کے پیچھے وہ چھپا بیٹھا ہے۔"

پروکرتی محبت میں خود کو قربان کر دینا چاہتی تھی "
آج میں نے جانا کہ میں بدنصیب نہیں ہوں
اس لئے میں دوں گی، ایسا دوں گی
دل و جان سے
خود کو قربان کر کے

جی ہاں خود کو قربان کر کے وہ آنند کو پانے کی متلاشی ہے۔ آنند کو اپنے بس میں کرنے کے لئے پروکرتی بے چین ہو اٹھی، اور کہنے لگی "

پڑھو تو سب سے مشکل منتر
گول گول داغ دے کر، جکڑ کے پکڑ لے
پکڑ لے بکھرے دل کو،
جہاں بھی رہو گے
مجھ سے دور رہنے کی کوشش میں
نہیں کامیاب ہو گے
نہیں کامیاب ہو گے "

٭٭٭

پروکرتی کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں خاموش نہ رہ سکی، اور اپنی بیٹی کو سحر سے دور رکھنے کے لئے اپنے شاگردوں کو بلایا۔

ربندرا ناتھ کے تین رقص ڈراموں کا جائزہ لینے کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان تینوں کے رومانی پہلو ایک جیسے ہیں۔ محبت کی دیوانی چنڈالیکا کی ہم جو شکل دیکھتے ہیں ویسی ہی دیوانی شکل چترانگدہ" اور "شیاما" میں بھی دیکھتے ہیں۔ شیاما بھی محبت کی آگ میں جل رہی تھی لیکن اس کی یہ محبت مادی محبت نہ تھی۔ گرچہ بجر وسین اور اوتیو کی موت کے لئے شیاما قربانی دیتی ہے۔ وہ راج محل کی شاہی ٹھاٹ باٹ کو ترک کر کے بجر وسین کے فراق میں جوگن بن جاتی ہے اور یہ کہتی پھرتی ہے "تمہارے ساتھ" ہم بھی ایک ہی لہر میں بہہ گئے "۔ اس کی قربانی ایک ادنیٰ قربانی نہیں تھی۔ اس پریم کی پجارن نے سب کچھ ترک کر کے زندگی اور موت میں خود کو پربھو کے قدموں پر نثار کر دیا۔ اس کے بھی چنڈالیکا کی طرح کمالیت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ چترانگدہ میں بھی ہم یہی تصویر دیکھتے ہیں۔ صرف شکل بدلتی ہے۔ جذبات اور محبت کی تصویریں ایک جیسی ہیں۔ چترانگدہ اپنے محبوب ارجن کو فراموش کرنا چاہتی تھی۔ اس کی یہ محبت ہم لوگوں کے دلوں کو بھی ہلا دیتی ہے۔ گرچہ محبت کے اثرات مختلف شکلوں میں نمودار ہوتے ہیں تاہم شیاما اور چترانگدہ کی محبت شروع سے آخر تک ایک عالمی تصور ہے۔ ان ڈراموں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ محبت کی ارتقا دھیرے دھیرے ہوتی ہے اور دھیرے دھیرے محبت عیاں ہوتی جاتی ہے۔ پروکرتی کی محبت میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ محبت تو قدرتی تحفہ ہے، جس کی بتدریج نشوونما ہوتی رہتی ہے۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

بچوں کیلئے

ٹیگور کی ایک نظم

ترجمہ: عین رشید

کل رات میں نے سپنے میں دیکھا
کلکتہ ہلتے ڈولتے خود کہیں جا رہا ہے
درختوں مکان سیدھے چل رہے ہیں
اژدہے کی طرح راستے چل رہے ہیں
ان کی پیٹھوں پر "دھوپ دھاپ" ٹرامیں گر رہی ہیں
بازار، دکانیں سب اٹھ رہی ہیں اور بیٹھ رہی ہیں
ہوڑہ برج کسی مست بچھو کی طرح چلا ہے
اور اس کے پیچھے پیچھے ہری سن روڈ
منومنٹ کسی پاگل ہاتھی کی طرح سرمست ہے
باتیں سن کر متوالوں کی طرح سونڈ ہلاتا ہے

رکو رکو ٹھہرو بھئی، یہ کیا پاگل پن ہے
کلکتہ ٹھہرتا نہیں، اپنی دھن میں چلا ہے
ناچ کا نشہ، ستون اور دیوار
میں دل ہی دل میں سوچ رہا ہوں نشہ تو نہیں
جانے دو اگر بمبئی جا رہا ہو تو
دہلی، لاہور، جائے نہ اگر ہے
سر پر دوں گا "پگڑی" پاؤں میں ناگرے
یا شاید وہ ولایت کی طرف دوڑے
انگریز ہوں گے سبھی، ہیٹ پینٹ، کوٹ
اسی درمیان میری آنکھیں کھل گئیں
اور دیکھا کلکتہ اسی کلکتے ہی میں ہے





ٹیگور اور بچّے

فیروز عابد

ازل سے ابد تک رابندر ناتھ ٹیگور نے تین دریاؤں کو عبور کیا — بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ ان کی زندگی کی ان تین ندیوں نے ان کو بہت کچھ دیا اور ان سے بہت کچھ چھینا۔ کھونے اور پانے کے مسلسل عمل کے دوران ٹیگور کے جذبات، احساسات، خیالات اور تاثرات نے بنگلہ ناول، افسانہ، ڈرامہ، شاعری اور سنگیت کو ایک ایسے خزانے سے آشنا کیا جو ٹیگور ہی کا حصہ ہے۔

ٹیگور کسی اسکول کا نام نہیں۔ ٹیگور تو ایک تہذیب کا نام ہے۔ گیت، نظمیں اور دوسرے اصنافِ ادب جن کا تعلق ٹیگور کی ذات سے تھا، ان سے پیار کرنے والے، انہیں بغور مطالعہ کرنے والے، آنکھیں موند کر ان کی نظمیں اور گیت گانے اور سننے والے پوری دنیا میں موجود ہیں۔ ٹیگور سے لوگوں کی بے انتہا عقیدت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ٹیگور شاعر نہیں ایک تہذیب تھے۔ ٹیگور نے نہ صرف یہ کہ اپنے معاصرین کو متاثر کیا بلکہ انہوں نے نئی نسل کو بہت کچھ دیا۔ بنگلہ ادب کے عاشق آج بھی ٹیگور سے ترقی پسندی اور جدت پسندی دونوں کا درس حاصل کر رہے ہیں۔

ٹیگور کو اسکول میں داخل کیا گیا، بھاگ آئے۔ اسکول کی چہار دیواری اور اس چہار دیواری کے اندر کے ماحول میں ان کا دم گھٹنے لگا۔ ٹیگور اسکول نہیں گئے، کالج کا منہ نہیں دیکھا، گھر کے آنگن میں جسم کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن، ان کے دل، ان کے خیالات اور ان کے تجربے پروان چڑھتے گئے۔

ٹیگور کو کھلونوں سے کھیلنے نہیں دیا گیا۔ ٹیگور نے اپنے ذہن میں خیالی کھلونے بنائے۔ ان کھلونوں کو سیاہ اور سفید رنگ کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر اجاگر کیا۔ ان کے گھر کے ادبی ماحول نے ان کے احساسات کی پرورش کی، باشعور نوکروں کی صحبت نے ٹیگور کو نت نئی کہانیوں کے خیالی دنیا سے آشنا کروایا۔

ٹیگور گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی رہتے تھے۔ باہر نکلنے کا نہ تو اس وقت رواج تھا اور نہ حکم۔ آج جس طرح بچے سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہیں اس طرح بچے اس عہد میں نہیں گھوما کرتے تھے۔ ٹیگور خاندان کے اصول بڑے پختہ تھے۔ ٹیگور گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ اپنے گھر ہی کے اندر اپنی پوری دنیا بسائے ہوئے تھے۔

اپنے اس مضمون میں مجھے دو باتیں عرض کرنی ہیں اور ان دو باتوں کے تعلق سے کچھ اور باتیں بھی ہمارے سامنے آئیں گی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ چھوٹے رابندر ناتھ یا بچہ "ربی" کو گھر کی چہار دیواری کے اندر رکھا گیا۔ جنہوں نے اسکول کی چہار دیواری کو قید سمجھا ہو گھر کی چہار دیواری کے اندر ان کے احساسات، جذبات

خیالات نے کیسی کیسی انگڑائیاں لی ہوں گی۔ فکر کی بلندی نے کہاں
کہاں کی سیر کی ہوگی اور انہوں نے ہر چیز کو کس کس طرح اور کس
انداز سے برتا ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ ٹیگور ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان
کی شادی ہوئی، دو بچے ہوئے اور پھر ۱۹۰۲ء کو جب ٹیگور ام
سال کے تھے تو ان کی شریک حیات مگراں کو بیماری ہو گئیں۔ ہم ان
دو باتوں کی روشنی میں جو کچھ عرض کریں گے ان کا تعلق ٹیگور اور بچے
سے ہوگا۔ بچپن (رابندر ناتھ ٹیگور) زیادہ تر وقت کھڑکی کے قریب بیٹھ کر
گزارتے تھے۔ وہ راہگیروں کو، پھیری والے کو، گاڑیوں کو، آسمان،
بادل، چاند، سورج اور ستاروں کو دیکھتے رہتے تھے اور سوچ و فکر کی
دنیا میں کھو جاتے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے بچوں کے لئے نظمیں بھی لکھی ہیں، کہانیاں
لکھیں اور مکالماتی ڈرامے بھی۔ اپنی ان تخلیقات میں ٹیگور کا اپنا بچپن
ہے۔ ان کے اپنے احساسات اور جذبات ہیں اور ان کا اپنا ذاتی
تجربہ ہے۔ بچوں کے لئے ٹیگور نے ان گنت نظمیں لکھی ہیں۔ میں یہاں
ان کی نظم "بی چتر سادھ" (Bichitra Saadh) کا ذکر کروں گا۔
اس نظم میں ایک نابالغ طالب علم ایک بچے کے احساسات و جذبات کا
بہت ہی خوبصورت اظہار کیا گیا ہے ——— ٹیگور نے اس
نظم کو تین بند میں مکمل کیا ہے۔ پہلا بند یوں ہے — اسکول جاتے
ہوئے ایک طالب علم نے ایک پھیری والے کو دیکھا جو ٹوکری میں چینی
مٹی کے کھلونے فروخت کر رہا ہے۔ پھیری والا آزاد ہے۔ چاہے تو
کھلونے فروخت کرتا رہے، چاہے تو گھر چلا جائے۔ جب جی بھر آیا
کھا پی لیا۔ اپنی مرضی کے مطابق کام کیا۔ وہ بالکل آزاد ہے۔ بچے نے
اس کی آزادی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھا اور سوچا کہ کاش وہ
پھیری والا ہوتا۔

دوسرا بند یوں ہے۔ شام کو ساڑھے چار بجے وہ
اسکول سے واپسی میں دیکھتا ہے کہ مالی باغ میں کدال سے مٹی ادھر
ادھر کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں مٹی میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ کپڑوں
میں مٹی لگی ہے۔ اسے اس طرح ہاتھ پاؤں اور بدن پر مٹی لگا لینے پر نہ
تو کوئی روکتا ہے اور نہ ڈانٹتا ہے جب کہ اس کی ماں اسکول سے گھر پہنچے
جیسا ہی گندے ہاتھ پاؤں کو دیکھ کر اور گرد آلود ہاتھ پاؤں کو دیکھ کر اسے
ڈانٹتی ہیں اور اس کے منہ ہاتھ دھلا کر اس کے کپڑے بدلتی ہیں۔ وہ
سوچتا ہے کاش وہ مالی ہوتا اور مٹی سے جی بھر کر دوستی کرتا۔

تیسرا بند یوں ہے۔ ابھی رات پوری طرح اتر بھی نہیں پائی
ہے کہ اس کی ماں اسے زبردستی تھپک تھپک کر سلانا چاہتی ہے۔ وہ
کھڑکی سے دیکھتا ہے، دور پہرے دار پگڑی باندھے گیس بتی کی روشنی
میں ہاتھ میں لالٹین تھامے گھر کے دروازے پر پہرا دے رہا ہے۔ سامنے
اندھیری گلی ہے جس سے شاید ہی کبھی کوئی گزرتا ہے۔ رات کے دس گیارہ
بج جاتے ہیں مگر وہ اسی طرح کھڑا رہتا ہے۔ اسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔
اس طرح کھڑے رہنے اور جاگتے رہنے پر اسے کوئی منع نہیں کرتا ہے۔
اب وہ سوچتا ہے کہ کاش وہ پہرے دار ہوتا اور اپنی خواہش کے
مطابق سوتا جاگتا۔

اپنی بات کو وزن دار بنانے کے لئے آئیے ایک مکالماتی
کہانی کا ذکر کریں۔ اس کہانی کا عنوان ہے "امل اور دہی والا"۔ ایک
بچہ امل اپنی کھڑکی کے قریب بیٹھا ہے۔ دہی والے کی صدا سنکر اسے
آوازیں دیتا ہے ——— دہی والا اس سے پوچھتا ہے کہ کیا وہ دہی
خریدے گا۔ تب ہی وہ بچہ جواب دیتا ہے کہ دہی خریدنے کے لئے اس
کے پاس پیسے نہیں ہیں (یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ ٹیگور کے عہد میں بچوں
کو پیسے نہیں دئے جاتے ہیں اور آج بھی بعض گھروں میں بچوں کو
پیسے دینا یا لینا معیوب بات سمجھی جاتی ہے)۔

دہی والا مایوسی کے لہجے میں کہتا ہے کہ پھر وہ اسے
کیوں بلا رہا ہے۔ تب بچہ جواب دیتا ہے وہ بھی دہی والے کی طرح
آوازیں لگاتا ہوا دور دور، نگر نگر، گاؤں گاؤں جانا چاہتا ہے۔ دہی
والے کو بچے کی بات عجیب لگتی ہے۔ وہ دہی کا مٹکا زمین پر رکھ
دیتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے کہ بچے تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔
بچہ جواب دیتا ہے کہ حکیم صاحب نے اسے باہر نکلنے سے منع کیا ہے
اسی لئے وہ دن بھر یہاں بیٹھا رہتا ہے۔ ہمدردی کے لہجے میں دہی
والا اس سے اس کی بیماری پوچھتا ہے۔ بچہ اسے بتاتا ہے کہ وہ
پڑھا لکھا نہیں ہے اس لئے وہ نہیں جانتا کہ اسے کیا بیماری ہے۔ بچہ دہی
والے سے اس کے گاؤں کا پتہ پوچھتا ہے۔ دہی والا اسے بتاتا ہے کہ

اس کا گاؤں بہت دور پہاڑ کی ترائی میں واقع ہے۔ بچہ دہی والے کو دیکھ کر اپنے گاؤں کا نقشہ بتاتا ہے۔ تالاب، پگڈنڈی اور تالاب سے گاگر میں پانی بھر کر گاؤں میں جاتی ہوئی عورتیں جو لال پاڑھ کی ساڑیاں پہنے ہوئے ہیں۔ گائیں گھاس چر رہی ہیں۔ دہی والا حیرانگی سے پوچھتا ہے کہ بچہ کیا کبھی اس کے گاؤں گیا ہے۔ تب بچہ جواب دیتا ہے کہ وہ کہیں نہیں گیا اور کبھی نہیں گیا اس لئے کہ حکیم صاحب نے اسے کہیں جانے سے منع کر دیا ہے۔ دہی والا کہتا ہے کہ وہ ایک دن بہت بڑا عالم بنے گا۔ بچہ کہتا ہے کہ وہ عالم بننا نہیں چاہتا۔ وہ تو اسی کی طرح دہی والا بننا چاہتا ہے۔ وہ دہی والے سے وعدہ لیتا ہے کہ دہی والا اسے اس کے گاؤں لے جائے گا۔ وہ بھی دہی والے کی طرح آواز لگا لگا کر دہی فروخت کرنا چاہتا ہے۔ گھر سے دور گاؤں گاؤں، نگر نگر جانا چاہتا ہے۔

دہی والا اسے ایک بھانڑ (پیالا) دہی مفت دیتا ہے۔ تب بچہ اس سے کہتا ہے کہ اس کی وجہ سے اسے دیر ہو گئی۔ دہی والا جواب دیتا ہے، اسے دیر نہیں ہوئی اور نہ کوئی نقصان ہوا بلکہ آج اس بچے نے اسے سکھایا کہ دہی فروخت کرنے میں کتنا سکھ اور کتنا مزہ ہے۔

کہانی کے اختتامی جملے پر غور کیجئے اور پوری کہانی کے تاثر کو اپنے سینے میں اتار لیجئے۔ بچوں کی اس کہانی میں ایک عجیب کیفیت ہے

ایسی ایک نہیں کتنی ہی کہانیاں ہیں اور کتنی ہی نظمیں ہیں جن میں ربندر ناتھ نے اپنے بچپن کے تاثرات کو بیان کیا ہے اور بچوں کے انداز میں، بچوں کے لئے کیا ہے۔

۱۹۰۲ء میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا۔ اہلیہ کی موت کے بعد ٹیگور پر اپنے دو ننھے بچوں کی ذمہ داری آ گئی۔ غم و اندوہ میں ڈوبے، بچوں کے معصوم چہروں نے ٹیگور کے دل کو ایک بار پھر شدت سے غم زدہ کر دیا۔ "شیشو" کی نظمیں ان ہی دنوں کی یادگار نظمیں ہیں جو درد، غم، جذبات، شفقت، محبت اور ہمدردی سے پُر ہیں۔

بقول ڈاکٹر سوکمار سین، ان تمام نظموں میں شاعر کا اپنا دل دھڑکتا ہوا ملا۔ زندگی اور کائنات کا راز ملا۔ ان کی شاعری کا بچہ عام انسانی بچہ ہے۔ اس کی فطرت انسانی ہے۔ وہ عام بچوں کی زندگی کا ترجمان ہے۔

"شیشو" اور "کوڑی و کومل" بچوں کی نظموں کے مجموعے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا بچوں کے ساتھ ساتھ یہ بڑوں کے لئے بھی دلچسپ ہیں۔ "شیشو" کے بعد انہوں نے "شیشو بھولا ناتھ" کو مرتب کیا۔ یہ نظمیں ۱۹۲۲ء میں لکھی گئیں۔ یہ نظمیں بھی "شیشو" کی طرح ہیں۔ حسرت، ناکامی، نا امیدی اور آرزوؤں کی شکست کا ذکر اس میں شاعر نے کیا ہے۔ ان نظموں کا بچہ بھی وہ خود ہی ہے۔ ان نظموں میں اس نے اپنے ہی آپ کو پیش کیا ہے۔ اپنی ہی آرزوؤں کا ذکر کیا ہے۔

"کاپ چھاڑا" (یہ مجموعہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا) اس میں جو نظمیں ہیں وہ بھی بچوں کی نظمیں ہیں۔ ان میں بھی عجیب کیفیت ہے۔ بچے ان نظموں کو پڑھ کر خوش ہوتے ہیں اور بڑے ٹیگور کی عظمت کا لوہا مانتے ہوئے ان نظموں کی گہرائی میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں اور زندگی کی بھاگ دوڑ کو ٹھہراؤ کے قریب لا کر اس کا نرالا اور انوکھا انداز دیکھتے ہیں۔

بچے سب کو اچھے لگتے ہیں۔ ٹیگور کو بہت اچھے لگتے تھے۔ ٹیگور نے جہاں بڑوں کو بہت کچھ دیا وہاں انہوں نے بچوں کے ادب کو بھی مالا مال کیا۔ بچوں کے لئے بھی بہت کچھ کیا۔ ٹیگور بچوں کے بھی تھے +++

بقیہ: ٹیگور اور جدوجہد آزادی

گاڑی چادل تک نہیں بھیجا۔"

یہی اس شاعر اعظم کی آخری پکار تھی اور اس کے بعد موت نے انہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ لیکن ٹیگور زندہ ہیں، ہمارے دلوں میں، ملک کی یادداشت میں اور یہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی یادداشت میں +++

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر،
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۲۳۔ آر۔ این۔ مکھرجی روڈ۔ کلکتہ۔ ۱

ٹیگور کا دورۂ روس
چند باتیں چند یادیں

از: چمن موہن سیہانویس



ٹیگور روس میں، ستمبر ۱۹۳۰ء

رابندرا ناتھ ٹیگور نے روس کا دورہ کیا، اور اپنے دورہ کے دوران انہوں نے روس سے بہت سارے خطوط لکھے جو یکے بعد دیگرے "پراواسی" میں شائع ہوتے رہے۔ ان خطوط سے مجھے پہلی بار پیٹرو فائیڈورووِیک کا نام معلوم ہوا، نیز جب یہ خطوط کتاب کی شکل میں شائع کئے گئے تو تب اس میں ٹیگور کے ساتھ ان کی تصویر بھی دیکھی۔ جب ۲ دسمبر ۱۹۶۹ء کو لینن گراڈ سے ماسکو واپس آیا تو میں نے اپنے گائیڈ کو تیار کھڑا پایا کیونکہ وہ پیٹرو سے میری ملاقات کیلئے وقت لے چکا تھا۔ مجھے ان سے ملاقات کرنے کا بے حد شوق تھا کیوں کہ مجھے یہ معلوم تھا کہ وی۔ او۔ کے۔ ایس۔ غیر ملکوں سے ثقافتی تعلقات کے لئے تنظیم۔ کے سربراہ ہونے کے ناطے سوویت یونین میں ٹیگور کے دورے کی ذمہ داریاں انہیں سونپی گئی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ ۹۴ سال کے ہو چکے تھے، اور میں نے اپنے گائیڈ کو اس بات کی تاکید کر دی تھی کہ وہ ان سے یہ کہے کہ جب انہیں فرصت ہو تو اس وقت ملاقات کا وقت دیں۔ میرا خیال تھا کہ میں انہیں کسی بستر پر لیٹے یا کسی آرام کرسی پر بیٹھے دیکھوں گا۔ لیکن ۴ جنوری ۱۹۷۰ء کو دن کے گیارہ بجے میں نے ان سے ملاقات کی تو حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے انہیں ایک کرسی پر سیدھا بیٹھے دیکھا اور میز پر روس میں اکتوبر انقلاب سے اس وقت تک سائنس کی ترقی پر سوویت لغات کے ایک باب کی ادارت کر رہے تھے۔ ان کی عمر ۹۴ سال کی تھی، لیکن آنکھوں کی روشنی اچھی تھی سننے کی طاقت اچھی تھی اور یادداشت بہت تیز تھی۔ اس سے پہلے میں نے رسل اور جارج برنارڈ شا کے متعلق سنا تھا لیکن پیٹرو سے آمنے سامنے ملنا میرے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔

ایک سائنس داں (طبی سائنس) ہونے کے باوجود پیٹرو لینن، کروپسکایا، گورکی اور لوناکرسکی کے قریبی دوست تھے۔ جس وقت میں نے ان سے ملاقات کی تھی اس وقت وہ ساری دنیا میں سب سے عمر دراز بولشیویک تھے۔ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ۹۴ سال کی عمر کا آدمی اتنا مشکل کام کر سکتا ہے۔ میں پیٹرو سے جو پوچھنا چاہتا تھا وہ سوویت یونین میں ۱۹۳۰ میں ٹیگور کے دورہ کی بابت تھا، کیوں کہ اس دورہ میں وہ ٹیگور کے گائیڈ تھے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا ۱۹۲۶ء میں لوناکرسکی نے جنیوا میں ٹیگور سے ملاقات کی تھی اور سوویت یونین کا دورہ کرنے کے لئے مدعو کیا تھا؟ پیٹرو نے جواب دیا "ہاں مجھے معلوم ہے کیوں کہ اس وقت میں لوناکارسکی کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اس کے تمام خطوط میرے ہاتھ سے گزرتے"۔ ۱۹۳۰ء کے دورہ کے دوران شاعر نے پیٹرو سے بہت ہی اعتماد کے ساتھ یہ باتیں کہی تھیں کہ اس دورہ سے قبل ان کے بہت سارے دوستوں نے انہیں روس کے دورہ پر جانے سے روکنے کی کوشش کی اور اس کی انہوں نے تین وجوہ بتائیں۔ پہلی یہ کہ یہاں اتنی شدید سردی پڑتی ہے کہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکیں گے، دوسری یہ کہ یہاں کی خوراک اتنی خراب ہے کہ اسے کھایا نہیں جا سکے گا اور تیسری یہ کہ یہاں ان کی طرح باشعور

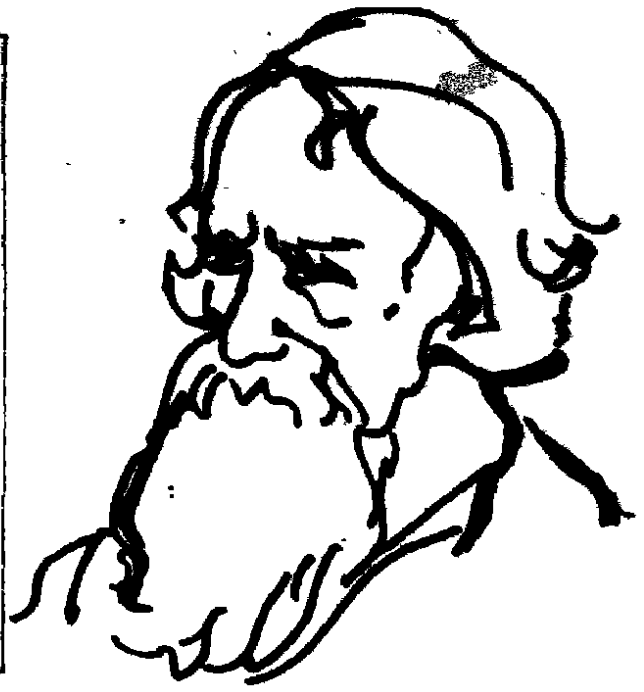
اور عام لوگوں کی کمی ہے، اس لئے وہ اس کمی کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ پیڑو نے مجھے بتایا کہ انہوں نے شاعر سے یہ پوچھا تھا کہ اس سیر و سیاحت سے انہوں نے کیا محسوس کیا، خاص طور پر کیا انہیں ایک ایسا باشعور اور عام شخص نہیں ملا جس سے انہوں نے دل کھول کر باتیں کیں۔ شاعر جواب دینے سے قبل دل کھول کر ہنسے، لیکن انہوں نے بتایا کہ اتنی احتیاط کے باوجود انہیں سردی لگ گئی۔ پیڑو نے پھر کومسومل میں شاعر کے دورہ کی بابت ایک دلچسپ بات بتائی۔ کومسومل روس میں بچوں کی تنظیم کا نام ہے۔ وہ ٹیگور کو لے کر کومسومل میں پہونچے تو وہاں ٹیگور نے بچوں کو مسکراتے اور کسی کو ہنستے ہوئے پایا۔ انہوں نے پیڑو سے پوچھا "بچے سب کیوں ہنس رہے ہیں؟ کیا میری سفید داڑھی کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں؟" پیڑو نے بتایا "نہیں، وہ ہنس رہے ہیں اس لئے کہ اس سے قبل انہوں نے اتنے شاندار اور خوبصورت شخص کو نہیں دیکھا"۔ شاعر نے کہا "بچوں سے کہہ دیجئے کہ میری داڑھی کو دیکھ کر گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ اصلی نہیں بلکہ نقلی داڑھی ہے۔ جب میں بڑے لوگوں جیسے پیڑو سے ملنے جاتا ہوں تو یہ ڈاڑھی لگا لیتا ہوں تاکہ ان لوگوں پر میرا اثر ہو۔ درحقیقت، اس بات کا انہیں یقین دلائیے کہ میں ان ہی کی عمر کا ایک بچہ ہوں۔"

میری جستجو کی پیاس بڑھانے کے لئے پیڑو نے کہا کہ لینن، اناتولے فرانس اور جی۔ بی۔ سی کے ساتھ ساتھ ٹیگور کو بھی ادبی دنیا کا ستارہ سمجھتے تھے۔ لینن نے ان کی چند کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا، اور اپنی لائبریری کے لئے بھی ٹیگور کی چند کتابیں حاصل کی تھیں۔ کروپسکایا، عوامی تعلیم کے وزیر ہونے کے ناطے ٹیگور کی درس و تدریس کی تحریک کی بابت معلومات اکٹھا کرنے کیلئے کوشاں تھیں اور انہوں نے اپنی کتاب "تعلیم کا عالمی نظام" میں تعلیم کے سلسلے میں ٹیگور کے نظریہ کا اور تعلیم کے میدان میں ان کے تجربوں کا ذکر کیا ہے۔

لینن نے اس کتاب کی ایک کاپی میکسم گورکی کو خبریرہ کاپری میں بھیج دی تھی اور اس کتاب کی بابت انکی رائے طلب کی تھی۔ جواب میں گورکی نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی تھی۔ پیڑو کا یہ خیال تھا کہ ٹیگور کو بھی اس کتاب کی بابت یہ بات معلوم تھی۔ کروپسکایا اور لینن دونوں ہی نے فطرت اور محنت کے ساتھ تعلیم کو وابستہ کرنے کے لئے ٹیگور کے نظریہ کو کافی اہمیت دی۔ گورکی کا ذاتی خیال یہ تھا کہ ٹیگور بہت بڑے آرٹسٹ اور ماہر تعلیم ہیں۔ اور پیڑو کے خیال کے مطابق لونا چارسکی ٹیگور کے شاگرد ار جمند بن گئے تھے۔ جب وہ اعلیٰ تعلیم اور ثقافت کے شعبے کے عوام کے کمیشنر تھے تو انہوں نے ٹیگور سے ایک سے زیادہ بار ملاقاتیں کیں۔ میں نے پیڑو کو بھی ٹیگور کی نقاشی سے بہت متاثر ہوتے دیکھا۔ انہوں نے مجھے بار بار یہ بتایا کہ ٹیگور کی نقاشی اگرچہ کچھ حد تک تصوراتی ہے تاہم اس میں گہرے خیالات اور انسان دوستی کے جذبے کو اجاگر کیا گیا تھا۔ سوویت یونین کے دو ہفتہ کے دورہ کے دوران وہاں حکام کی طرف سے ٹیگور کی نقاشی کی نمائشوں کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ پیڑو نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا کہ مشہور ناقد اور ٹریٹیاکو عجائب خانہ کے ڈائریکٹر اکرستائی اس موقع پر موجود تھے اور انہوں نے پیڑو سے ٹیگور کی نقاشی کی بابت بہت سے سوالات کئے۔

آئندہ سال مجھے میڈم بائی کورا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میڈم ماسکو اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں بہت ہی مشہور ماہر لسانیات تھیں۔ میں نے ان سے ٹیگور کے سوویت یونین کے دورہ کی بابت بات چیت کی۔ انہوں نے ماسکو یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر، پروفیسر ویڈوڈین سے میرا تعارف کرایا۔ روس میں ۱۹۶۱ء میں ٹیگور کی صد سالہ تقریبات بڑی شان و شوکت سے منائی گئی اور یہ پروفیسر اس تہوار کے منتظمین میں سے ایک تھے۔ میرے خیال میں انہوں نے یا میڈم بائی کورا نے سوویت پوسٹر کی ایک فوٹو کاپی دی تھی۔ اس پوسٹر میں ٹیگور کے چترانگدا (وہ اسے چترا کہتے ہیں) کو اسٹیج کرنے کا اور ٹیگور کی چند نظموں کی نغمہ سرائی کا ذکر تھا۔ یہ دونوں فروری ۱۹۲۲ء میں اکسپریمنٹل تھیٹر میں منعقد کئے گئے۔ اس

(باقی صفحہ ۵۱ پر)



مرینالینی دیوی

ربندراناتھ کی شریکِ حیات

شریمتی سوتاپا چکرورتی

اگر ہم عظیم ہستیوں کی شخصیت، عظمت اور خوبیوں پر غور کریں تو ہمیں ان کے ارد گرد خوبیوں کی ایک جھرمٹ بھی نظر آئے گی اور ایک عظیم ہستی کی زندگی میں ایسی جھرمٹ کی خدمات کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہوتی۔

اس سال ربندر ناتھ ٹیگور کی ۱۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر میرے ذہن میں ایک بات بار بار ابھر رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ربندر ناتھ کی تحریروں یا یوں کہئے کہ ربندر ادب میں دیگر باتوں کے علاوہ ان گنت لوگوں کا ذکر تو ہے، لیکن کہیں بھی ان کی شریکِ حیات کا ذکر نہیں ہے یا یوں کہئے کہ نفی کے برابر ذکر ہے۔ ربندر ناتھ نے اپنی کتابوں کو بہت سارے لوگوں کے نام سے منسوب کیا لیکن اپنی بیوی کے نام ایک بھی نہیں کیا۔ صرف ان کے مجموعۂ کلام "سمرن" (یادیں) میں انہوں نے اپنی بیوی کا ذکر کیا ہے۔ ایسا انہوں نے کیوں کیا؟ یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔

ٹیگور کی اپنی بیوی مرینالینی دیوی کی بابت خاموشی کی لوگوں نے اپنے نقطۂ نظر سے تشریح کرنے کی کوششیں کیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ بیوی کی بابت کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بعض کا یہ خیال تھا کہ شاعر غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے، برخلاف اس کے ان کی اہلیہ محترمہ سیدھی سادی اور معصوم عورت تھیں، اس لئے وہ اپنے شوہر کی زندگی پر اثر انداز نہ ہو سکی اور نہ ہی ان میں کسی قسم کی بیداری پیدا کی۔ اسی لئے شاعر نے اپنی بیوی کا اپنے کلام میں ذکر کرنے سے پرہیز کیا۔ تو یہ تھا سبھوں کا خیال، لیکن یہ خیال غلط تھا، غیر معمولی ربندر ناتھ کی معمولی بیوی، ۱۹ سال کی شادی شدہ زندگی میں، ٹھاکر باڑی میں جہاں امیرانہ ٹھاٹ باٹ اور ثقافت کی فضا چھائی رہتی تھی، اپنا خصوصی مقام بنانے میں کامیاب ہوئی۔ شاعر کے قریبی رشتہ داروں اور خطوط اور تحریروں سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں ان کی بیوی کی اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ ان کی بیوی نے، اپنے شوہر کی طرح قابل نہ ہونے کے باوجود خود کو علوم و فنون سے مالا مال کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ان میں اپنے شاعر شوہر اور ان کی شاعری کو سمجھنے کی صلاحیت تھی۔

یہ باتیں ان دونوں یعنی میاں بیوی کے خطوط سے عیاں ہو جاتی ہیں۔ یہ خطوط اگرچہ گھریلو معاملات کی بابت ہوتے لیکن ان کا طرزِ اظہار بہت ہی انوکھا ہوتا۔ اور وہ سب رسیلے الفاظ سے پُر ہوتے۔ ربندر ناتھ نے اپنی بیوی کو ۳۶ خطوط لکھے اور آج یہ خطوط کتابی شکل میں دستیاب ہیں۔ ان کی بیوی کو ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ تھا اسی لئے انہوں نے ان خطوط کو بڑی حفاظت سے ایک صندوق

میں بند رکھا تھا۔ ان خطوط سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ رابندرا ناتھ ٹیگور اپنے گھر کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان خطوط کی روشنی میں ہم رابندرا ناتھ کو ایک نئی شکل میں دیکھتے ہیں۔ یہ رابندرا ناتھ اپنی بیوی کو، جب وہ خط کا جواب دینے میں تاخیر کرتی، محبت سے پُر غصہ کا اظہار کرتے، خوابوں میں سلائی داہ سے اڑ کر جوڑاساکو آتے اور اپنی بیوی اور بچوں کے بستروں کے آس پاس گھومتے پھرتے، بیوی بچوں کے لئے اس کا دل بے قرار ہو جاتا۔ جی ہاں رابندرا ناتھ بہت ہی اچھے شوہر تھے، جو اپنے خطوط کے ذریعہ اپنی بیوی کو اس سنسار کی خبریں دیتے اور خبریں موصول کرتے۔ ان کی بیوی سنسار کے کام کاج میں الجھی رہتیں۔ وہ اپنی بیوی کو مشورہ دیا کرتے کہ وہ اپنے دل کو اس دنیا کی الجھنوں سے بالاتر رکھیں۔

رابندرا ناتھ بہت ہی مشفق سنساری تھے، اور ان کی گھریلو زندگی میں بھی ان کے خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کام میں ان کی بیوی کا حصہ کچھ کم نہ تھا۔ ان کی بیوی کوئی رئیس خاندان کی بیٹی نہ تھی۔ ان کے والد کا نام بینی مادھو رائے چودھری تھا اور یہ ضلع کھلنا (ابھی بنگلہ دیش میں واقع ہے) کے دکھن ڈیہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ٹیگور خاندان کی زمینداری کے ایک عام ملازم تھے۔ ان کی بیٹی کا نام بھبوتارانی تھا۔ جب ان کی بیٹی گیارہ سال کی ہوئی تو ان کی شادی رابندرا ناتھ سے ہوگئی، چونکہ میاں بیوی دونوں ہی پیرالی برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کی شادی ہوگئی۔

ٹھاکر باڑی یعنی سسرال میں آنے کے بعد بھبوتارانی کا نام مرینالینی ہوگیا۔ سبھوں کا یہ خیال ہے کہ خود رابندرا ناتھ نے اپنی بیوی کو یہ نیا نام دیا تھا۔ اپنے والدین کی پسند کردہ اس دلہن کو رابندرا ناتھ نے بھی خوشی خوشی قبول کیا۔ سنتے ہیں کہ شادی کی رات کو "باسور گھر" میں (شادی کی رات کو دلہا دلہن کو لے کر ان کے سونے کے کمرے میں ان کے رشتہ دار خوشیاں مناتے اور ناچ گانے میں ساری رات گزار دیتے ہیں۔ اس رات اس جوڑے کو سونے نہیں دیا جاتا ہے) رشتہ داروں کی درخواست پر رابندرا ناتھ نے بھی گیت گائے تھے۔ شادی کے بعد ان کے سسر مہارشی

دیبندرا ناتھ ٹھاکر نے اپنے چھوٹے بیٹے یعنی رابندرا ناتھ کی بیوی کی تعلیم کے لئے انتظامات کئے، تاکہ یہ بھی گھر کی دیگر بہو بیٹیوں کے مساوی مقام حاصل کر لے۔ اس کام میں رابندرا ناتھ نے بھی پہل کی۔ انہوں نے نہ صرف انگریزی کی تعلیم بلکہ بنگلہ اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر کے بھتیجے بلیندرا ناتھ ٹھاکر، جو بہت اعلیٰ درجہ کے مصنف بھی تھے، انگریزی، بنگلہ اور سنسکرت میں جو کچھ پڑھتے وہ اپنی چھوٹی چچی کو سنا دیتے۔ ٹیگور کے بیٹے رتیندرا ناتھ نے اس سلسلے میں یوں ذکر کیا:

"بولو دادا سے سن سن کر ان تینوں زبانوں کے ادب سے ماں اچھی طرح واقف ہوگئیں۔"

مرینالینی نے نہ صرف اچھی تعلیم حاصل کی بلکہ وہ ایک مصنفہ بھی بن گئیں۔ اس کا ثبوت ان خطوط سے ملتا ہے جو انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو لکھا تھا۔ زبان کی سادگی اور روانی کی مثال آج بہت ہی کم ملتی ہے۔ ان کا طرز بیان بھی بہت ہی نرالا ہوتا۔

شاعر ٹیگور کو سادگی پسند تھی۔ وہ معمولی لباس پہنا کرتے تھے۔ چمک دمک سے دور بھاگتے تھے۔ ان کی بیوی بھی سادگی پسند تھیں اور اپنے شوہر کی طرح معمولی لباس زیب تن کرتیں۔ وہ زیورات استعمال نہیں کرتیں۔

مرینالینی میں خود کو ماحول کے مطابق ڈھال لینے کی قوت تھی۔ جوڑاساکو میں ان کے گھر میں جب پہلی بار ٹیگور کے ناٹک "راجہ اور رانی" کو اسٹیج کیا گیا تو اس وقت اس میں ستیندرا ناتھ ٹھاکر، گیانندا نندنی دیوی نے اور رابندرا ناتھ کے ساتھ نرائینی کا کردار مرینالینی نے ادا کیا۔ ان کی ایکٹنگ کی سبھوں نے تعریف کی۔

ٹھاکر باڑی کے سنسار میں مرینالینی کو گھریلو معاملے میں اختیار کلی حاصل تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے سبھوں سے پیار و محبت کا برتاؤ کیا۔ وہ اپنے سسر کا بہت احترام کیا کرتیں، سنسار کے دیگر افراد سے وہ پیار و محبت سے پیش آتیں۔ سبھوں کے سکھ سے سکھی ہوتیں اور دکھ سے دکھی ہوتیں۔ اس طرح انہوں نے سبھوں کو اپنا لیا تھا۔

سیالدہ کی کوٹھی باڑی میں جب وہ رہتیں تو وہاں
بھی بڑوں اور چھوٹوں کا خیال رکھتیں۔ سبھوں کا احترام کرتیں۔ وہاں
بھی گویا وہ سبھوں کی ماں بن چکی تھیں۔ وہاں جب بھی انہیں وقت
ملتا، وہ اپنی بیٹیوں کو لے کر اپنے گھر کے باغیچے میں سبزیاں اگاتیں،
پھر اپنے باغات کی سبزیاں اپنے ملازمین کے گھروں میں بھیجتی رہتیں۔
وہاں اپنی زمینداری کے علاقہ میں غریب مزدوروں کے لئے کم خرچ
پر کھانے کا انتظام کیا تھا۔ ٹھاکر اسٹیٹ سے ہی اس خرچ کو پورا
کیا جاتا۔ نیز اس کام کے لئے جو ملازم رکھے گئے تھے انہوں نے
انہیں تنخواہ دینے کا بھی انتظام کیا۔ ان کے اس اقدام سے بہت
سارے غریب لوگ مستفید ہوئے۔ جب وہ اس کوٹھی باڑی سے
واپس آئیں تو وہاں کے لوگوں نے رو رو کر انہیں الوداع کہا۔

اس سلسلہ میں وشوبھارتی کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے۔
اس بات سے تو سبھی واقف ہیں کہ وشوبھارتی کے قیام کے لئے
شاعر ٹیگور کو کتنی انتھک محنت کرنی پڑی تھی اور انہیں کن کن
دشواریوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن مرینالینی دیوی
نے اس سلسلے میں کیا کردار ادا کیا یہ بات شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔
وشوابھارتی کے اخراجات کو پورا کرتے کرتے ربندرا ناتھ کا دیوالہ
پٹ گیا تھا۔ اس وقت اگر مرینالینی دیوی اپنے شوہر کے آڑے نہ
آتیں تو وشوبھارتی کا وجود قائم رہتا یا نہیں رہتا، اس کی بابت
کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مرینالینی دیوی نے اخراجات کو پورا کرنے
کے لئے اپنے زیورات دے دئے۔ نیز انہوں نے آشرم کے
ستار کے انتظامیہ کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں اور ان ذمہ داریوں
کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے آشرم کے بچوں کو
کھانا کھلاتیں۔ وہ بذات خود اچھا کھانا پکا سکتی تھیں۔ اپنے
شوہر کی فرمائش پر نئے نئے اقسام کے سالن پکاتیں۔ شاعر ٹیگور
اپنے گہرے دوستوں کو اپنے گھر میں مدعو کرتے اور انہیں اپنی بیوی
کے پکائے کھانے پیش کرتے۔

شانتی نکیتن کے برہموچاریہ آشرم میں بچوں کو
بھائی چارگی، خیرسگالی، ربط و ضبط، مذہب اور انسان دوستی کی
تعلیم دی جاتی تھی اور تعلیم کے اس عظیم کام میں مرینالینی دیوی
بھی حصہ لیتیں۔ نیز وہ آشرم کی ماں کی طرح بچوں کی دیکھ بھال
کرتیں۔

لیکن زیادہ دنوں تک وہ ان خدمات کو انجام نہ دے
سکیں کیوں کہ صرف ۲۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان
کی موت کی ایک وجہ ان کی انتھک محنت تھی۔ وہ بہت شدید بیمار
ہو گئیں، بستر پر پڑی رہتیں، اٹھنا بیٹھنا کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔
بیوی کو اس حالت میں دیکھ کر ربندرا ناتھ کو شاید پہلی بار انکی اہمیت
کا احساس ہوا۔ وہ گویا پاگل کی طرح دوا دارو کا انتظام کیا کرتے۔
ہر وقت بیوی کے پاس بیٹھے ہوئے رہتے، ہر وقت ان کے ہاتھ میں ایک
پنکھا ہوتا جسے وہ جھلتے رہتے۔ وہ اپنی بیوی کی خود تیمار داری کرتے۔

بیوی کی موت کے بعد شاعر ٹیگور نے اس صندوق کو
کھولا جس میں ان کی بیوی نے ان کے خطوط بڑے قرینے سے سجا کے
محفوظ رکھا تھا۔ ان خطوط کی روشنی میں شاعر نے بہت ساری
نظمیں لکھیں اور اپنے اس مجموعہ کو 'سمرن' کے نام سے شائع کیا۔
'سمرن' کی پہلی نظم کے پہلے شعر سے

دیکھا، کتنے پرانے خطوط
پیار و محبت کی زندگی کے دو چار نشانات

سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی بیوی کی موت سے ان کے
دل میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ مرینالینی دیوی کو اپنی مختصر زندگی
میں اس سے کچھ زیادہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، تاہم ہم ربندرا ناتھ
کی ساری زندگی میں ان کا اثر دیکھتے ہیں۔ بعد کے عرصہ میں ربندرا ناتھ
نے اپنی بیوی کے سلسلے میں یوں لکھا تھا۔

"وہ میری شریک حیات تھی، میرے تمام کام کاج میں
میرا ہاتھ بٹاتی۔ گرچہ مصری طریقہ سے ہماری شادی نہیں ہوئی لیکن
اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم ایک دوسرے کا احترام کیا کرتے۔ اسکی
یہ خواہش تھی کہ شانتی نکیتن کے کام میں ہماری ساتھی بن جائے۔
خاص طور پر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اسکی دلی خواہش یہ تھی
کہ وہ یہاں میری جگہ لے لے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے فوراً
بعد ہی وہ شدید مرض میں مبتلا ہو گئی۔"

شاعر ربندرا ناتھ کو اپنی بیوی پر پورا بھروسہ تھا۔

(باقی صفحہ ۶ پر)

اے شاعرِ اعظم!

مصطفیٰ اکبر

اے شاعرِ اعظم!

دلدادہ ترے نغمۂ شیریں کا اک عالم
ہر راگ میں پوشیدہ ترے روح کی سرگم
ہر بول ترا زخمِ دلِ دوستاں کی مرہم
تو عظمتِ آدم

اے شاعرِ فطرت!
کی میں نے بہت فن میں ترے مشق و ریاضت
مل جائے مجھے بھی ترے لہجے کی حلاوت
کچھ شعر سے میں بھی کروں زخموں کی عیادت
افسوس کہ قسمت

ہر شعر ہے پھیکا
کیا کیجئے جب رنگِ بہاراں بھی ہو پھیکا
اخلاص بھی مصنوعی ہو، اخلاق بھی جھوٹا
جب دل سے نظر تک ہو کھنچی درد کی ریکھا
کیا بول ہو میٹھا

جب آنکھیں ہوں ویران

جب بجھ گیا نظروں میں رنگ و نور کا سامان
جب بچوں کے چہروں پہ نہ ہو پھول سی مسکان
جب فتنۂ غم سے ہو ہر اک چہرہ پریشان
ویران شعرستان

کیا نقش ابھاروں
نہ پھول، نہ مہتاب، نہ جگنو کہ پکاروں
نہ حسنِ دل افروز ہے کہ روپ اتاروں
نہ جلوۂ خوش رنگ کہ نظروں کو سنواروں
دل کس پہ میں واروں

جب تجھ سا ہے دمساز
کیوں بال بریدہ ہو مرے فکر کی پرواز
کیوں مہر بہ لب ہو دلِ رنجور کی آواز
جو بول ہے تیری ہی عقیدت کا ہے غماز
اے مردِ خوش انداز

ٹیگور، شانتی نکیتن اور تعلیم

محمد اعظم

شانتی نکیتن، بولپور سے دو میل کی دوری پر واقع ہے۔ آج یہ علوم وفنون کا مرکز ہے۔ یہاں وشوا بھارتی بین الاقوامی یونیورسٹی ہے اور بقول رابندر ناتھ ٹیگور "وشوا بھارتی ہندوستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے پاس ذہنی دولت ہے جو سبھوں کے لئے عام ہے۔ وشوبھارتی کو ہندوستان کی اس ذمہ داری کا احساس ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ ترین قدروں کو اپنے مہمانوں کی نذر کرے۔ ساتھ ہی وہ ہندستان کے اس حق کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ وہ دوسروں کی بہترین قدروں کو اپنائے۔" آج یہاں نہ صرف ملک کے مختلف علاقوں سے بلکہ دنیا کے تمام ملکوں سے طلبا آتے ہیں اور تعلیم سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ نیز شانتی نکیتن اور اس کے پڑوس میں واقع شری نکیتن سیر وسیاحت کی آماجگاہ بن چکے ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔

لیکن یہی شانتی نکیتن کل کیا تھا، یعنی آج سے سو سال قبل اس کی کیا حالت تھی۔ شانتی نکیتن سطح مرتفع پر واقع ہے۔ اس وقت چٹیل میدان تھا۔ خشک اور ادھر ادھر اکا دکا درخت نظر آجاتے۔ اس سے کچھ دور کے فاصلہ پر "سال" درختوں کا گھنا جنگل تھا اور اس کے مشرق کی طرف تاڑ درختوں کے جنگلات تھے۔ یہاں بھیڑیئے ادھر ادھر گھومتے رہتے۔ کبھی کبھی چیتے بھی نکل آتے۔ اس علاقہ کے چاروں طرف کھیتوں میں لوگ دھان کی کاشتکاری کیا کرتے اور اس کاشتکاری کا انحصار بارش پر ہوتا۔ نیز یہاں کسانوں کے پاس مویشی بھی ہوتے۔ اگر شاعر کا جیون دیوتا ان کی فطانت کے فروغ کیلئے کسی جگہ کی تلاش کرتا تو شاید اس سے بہتر جگہ اور کوئی دوسری نہیں ہوتی۔

رابندر ناتھ کے ایک دوست شاعر ستیش چندر رائے کی ڈائری سے شانتی نکیتن کی جغرافیائی تصویر بہت عیاں ہو جاتی ہے۔ شری رائے ایک شاعر تھے اور ٹیگور کے قائم کردہ آشرم۔ اسکول میں معلم بھی تھے۔ اس علاقہ کی بابت یہ باتیں ان کی ڈائری (روزنامہ) میں درج ہیں:

بولپور کے چاروں طرف ایک وسیع میدانی علاقہ ہے یہاں دھوپ میں بہت گرمی اور بڑی شدت ہے۔ جب یہ ہوا چلتی تو طوفانی انداز اختیار کرلیتی۔ یہاں کے بادل اور بارش تو ہمیں اندرا کی یاد دلاتی ہیں اور چاند اور ستارے اپنی جگمگاتی روشنی کے ساتھ رات کی تاریکی کو اس طرح سجاتے اور سنوارتے ہیں کہ ہمیں "اشوینی کمار" یاد آجاتے ہیں۔ ایسی خاموش جگہ میں اپنے سے انسان کے دل ودماغ میں امن ہی امن چھا جاتا ہے۔"

شانتی نکیتن کی تاریخ کی ابتدا مہارشی دیبیندر ناتھ سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں مہارشی کھلے میدان میں دو خوبصورت چھتیم درختوں کے نیچے گیان میں بیٹھے رہتے۔ یہ جگہ ٹیگور نے بہت پسند کی۔ یہاں کے مناظر قدرت اور یہاں کی خاموشی نے ان کا دل موہ لیا، اس لئے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔" میں نے خود سے کہا کہ ہمیں اپنی میراث کی تلاش کرنی چاہئے اور اس سے ہم اس دنیا میں اپنے صحیح مقام کو خرید لیں گے۔ ان کے ان خیالات کی وجہ سے انہوں نے یہاں ایک آشرم مع تعلیم گاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا یہ تصور تھا کہ یہ آشرم نہ صرف ہندوستان

کی روحوں کی بلکہ سارے عالم کی روحوں کی آماجگاہ ہوگا۔ رابندرا ناتھ کو بنگال میں اس وقت رائج جدید تعلیمی نظام سے بالکل اتفاق نہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ مشین کی تیار کردہ تعلیم تھی اور ایک غیر ملکی زبان کو رٹ لینا ہی تعلیم کا نام تھا۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے بچپن میں اسکولوں میں بہت ہی تلخ تجربہ حاصل ہوا تھا۔ ان کے زمانہ میں اساتذہ بچوں کو پیٹ پیٹ کر پڑھایا کرتے تھے کیوں کہ وہ "بیت کو چھوڑو تو بچے خراب ہو جائیں گے" کے اصول کو اپنا کر بچوں کو زدوکوب کے ذریعہ تعلیم دیا کرتے تھے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور نے سنہ ۱۹۰۱ء میں شانتی نکیتن میں اپنا اسکول قائم کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنے اور اپنے دوستوں کے بچوں کو ان دشواریوں سے نجات دلائی جائے جنہیں ان کو اپنے اسکولوں کے دنوں میں برداشت کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں وہ یوں رقمطراز ہیں "اسکول کی ابتدا کی بنیاد سے میں ناواقف ہوں۔ یہ تعلیم کی کوئی نئی تھیوری نہیں ہے بلکہ یہ تو میرے اسکول کے دنوں کی یادداشت ہے" (میرا اسکول)۔ گرچہ ظاہراً انہوں نے تعلیم کی کوئی نئی تھیوری پیش نہیں کی، لیکن انکی اپنی ایک تھیوری تھی، اپنا ایک طریقہ تھا اور جنہوں نے ہندوستان کے ماہرینِ تعلیم کو ایک نئے راستے پر گامزن کر دیا۔

بلاشبہ ان کی تعلیمی تھیوری یہ تھی کہ اگر انسانی بچہ کو اس کے قدرتی ماحول سے الگ رکھا جائے تو اسکی پوری طرح نشوونما نہیں ہو سکتی۔ اس زمانہ میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اس سے تعلیم پانے والے کچھ زیادہ مستفید نہیں ہوتے تھے کیوں کہ ان کی شخصیت ابھرتی نہیں اور بعد میں وہ سماجی غیر توازن کا ذریعہ بن جاتے۔ اس لئے معلم کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ بچوں کو فطرت کی گود میں ڈال دے، کیوں کہ انسانی ماں کی طرح فطرت بھی اسے خوراک اور پیار دونوں ہی فراہم کرے گی۔ اس سلسلہ میں رابندرا ناتھ نے یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔ "یہ تو قدرتی نظام ہے کہ بچوں کی خوراک اس کی ماں کا دودھ ہے۔ وہ جب ماں کا دودھ پیتے ہیں تو انہیں خوراک اور ماں دونوں ایک ساتھ ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے یہ مکمل تغذیہ جسمانی اور روحانی ہے۔ اس عظیم حقیقت سے پہلی بار ان کا تعارف ہوتا ہے کہ دنیا سے انسان کا حقیقی رشتہ ذاتی پیار کا ہے نہ کہ کسی قسم کے میکانیکی قانون کا۔ بچوں کے دل و دماغ میں اس شعور کو اجاگر کرنا چاہئے کہ وہ ایک ایسی انسانی دنیا میں پیدا ہوا ہے جو آس پاس کی دنیا سے ہم آہنگ ہے۔"

ان باتوں سے ایک اور چیز دریافت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ صحیح تعلیم کی بنیاد ہمدردی اور پیار و محبت ہے۔ بچہ کی جذباتی ضرورتوں کو پرے رکھ کر اگر اس کے دماغ پر یا جسم پر زیادہ زور دیا جائے تو اس سے اس کی لیاقت میں کمی ہو جائے گی۔ بچہ کے دماغ کو مناسب طور پر کام کرنے اور اس کی ترقی کے لئے، اس تخلیقی دنیا کے لئے محبت کے جام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی استاد اور شاگرد کے درمیان ہمدردی کی سوجھ بوجھ ہونی چاہئے۔ شاعر ٹیگور کے الفاظ میں ۔

"ہم علم سے بہت طاقتور بن سکتے ہیں، لیکن ہمدردی اور پیار سے بامِ عروج تک پہونچ سکتے ہیں۔ اعلیٰ ترین تعلیم وہ ہے جو ہم لوگوں کو صرف اطلاعات فراہم نہیں کرتی بلکہ جو ہماری زندگی کو تمام موجودات سے ہم آہنگ بنا دیتی ہے۔ ہمارے بچپن ہی سے ہماری عادات کی تشکیل کی جاتی ہے اور ہمیں اس طرح سے تعلیم سے سرفراز کیا جاتا ہے کہ ہماری زندگی فطرت سے دور چلی جاتی ہے اور ہماری زندگی کے شروع سے ہی ہمارے دماغ اور دنیا کو ایک دوسرے کے مخالف کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس عظیم تعلیم سے جس کے لئے ہم پیدا کئے گئے تھے، غفلت برتی جاتی ہے اور ہمیں اپنی دنیا کو کھو دینا پڑتا ہے اور اس کی جگہ ہمیں تھیلی بھر معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ بچہ انسانی دنیا میں پیدا ہوتا ہے لیکن ایک زندہ گرامو فون کی دنیا میں اسے جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ چوں کہ وہ معصوم پیدا ہوتا ہے اس طرح گویا اسے یہ سزا دی جاتی ہے۔"

فطرت اور ہمدردی کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ٹیگور کا یہ خیال تھا کہ تعلیم کی حصولیابی تو رضاکارانہ طریقے سے ہونی چاہئے۔ بچوں کو جس طرح خوراک دی جاتی ہے۔ اسی طرح

ـسی ڈھنگ سے اسے تعلیم بھی دی جانی چاہئے، لیکن موجودہ
ـں میں تعلیم تو بچوں میں زبردستی ٹھونسی دی جاتی ہے۔ اس
ـہ انہوں نے بچوں کی تعلیم میں تحتی ضمیر پر زور دیا۔ ان کے خیال
ـں:

"بچوں کا تحتی ضمیر ان کے ضمیر سے زیادہ باشعور
ـتا ہے، اور اس تحتی ضمیر کے ذریعہ اسے بہت ساری اہم
ـوں کا سبق دیا جاتا ہے۔ ہماری بے شمار نسلوں کے تجربات
ـر ہماری فطرت میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ اس سے ہمیں خوشی
حاصل ہوتی ہے۔ تحتی ضمیر میں پوشیدہ علم تو ایک لالٹین نہیں
ہے جسے باہر سے جلایا یا بجھایا جا سکتا ہے، یہ جگنو کی روشنی
ہے جو اس کی زندگی کے طریقہ کار کو روبہ عمل لانے سے منور ہوتی
ہے۔"

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر وہ شئے جو سوجھ بوجھ
اور تخیلات کو اجاگر کرتی ہے، بچوں کی تعلیم کے لئے لازمی ہے۔
اس نقطہ نظر سے رابندرا ناتھ بچوں کو ذمہ دار ہستی سمجھتے تھے اور
بڑوں سے انہیں بنیادی طور پر مختلف نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس
تصور کے بالکل مخالف تھے کہ بچوں کے فائدہ کے لئے انہیں علم
گھول کر پلا دی جائے۔ "اپنی یادداشت" میں بچوں کی نفسیات
پر انہوں نے یوں روشنی ڈالی ہے:

"ادبی آبِ حیات کو پانی میں ملا کر بچوں کو پلا دیا جاتا
ہے۔ اس وقت صرف اس نقطہ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ یہ
تو صرف بچے ہیں، یہ ابھرتے ہوئے انسان نہیں ہیں۔ یہ غلط طریقہ
ہے۔ اس لئے بچوں کے لئے جو کتابیں لکھی جائیں ان میں ایسی
باتیں درج ہوں جن میں کچھ بچے پڑھ کر سمجھیں اور کچھ نہ سمجھیں۔
ہمارے بچپن میں ہم تمام دستیاب کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ پڑھ کر
کچھ سمجھتے اور کچھ نہیں بھی سمجھتے۔ بچوں کے ضمیر پر بیرونی دنیا کا
یہی اثر ہوتا ہے۔ بچہ اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اور
جن باتوں کو وہ ابھی نہیں سمجھ پاتا ہے آگے چل کر خود بخود سمجھ
لیتا ہے۔"

شاعر نے ان تصورات کو اپنے اسکول میں عملی جامہ
پہنایا۔ ان کے گیت، ناٹک، مضامین، مختصر کہانیاں اور ناول تو
شانتی نکیتن کی اسکولی زندگی کے تانے بانے ہیں۔ کتنی حد
تک ان کی تخیلات کے جذبات سے اسکول کے طلباء اور طالبات
محظوظ ہوئے۔ اس کا انہوں نے یوں ذکر کیا ہے:

"ایک مصنف بہت ہی شش و پنج میں پڑا رہتا
ہے کہ دیکھیں اس کے ناٹک کو لوگ کس طرح پیش کرتے ہیں،
لیکن مجھے میرے بچوں سے کبھی نا امیدی حاصل نہیں ہوئی، اور میں
نے اساتذہ کو کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ طلباء جب
میرے ناٹک کو اسٹیج کرتے ہیں تو وہ مداخلت کریں۔"

یہ ایک تخلیقی تعلیم ہے جو آخر میں انہوں نے خود اپنی
زندگی سے یہ دریافت کیا کہ کوئی بھی تعلیم اس وقت تک تخلیقی نہیں
ہو سکتی ہے جب کہ اسے بچوں کو ان کی مادری زبان میں نہ دی جائے۔
بلا شبہ ان کی اپنی ذہنی اور ادبی ترقی کی غیر معمولی کامیابی اس حقیقت
پر مبنی ہے کہ انہوں نے اپنے بچپن میں تعلیم اپنی مادری زبان میں یعنی
بنگلہ میں حاصل کی تھی۔ اپنی سوانح عمری میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو ہماری اپنی زبان
میں تعلیم دی گئی۔ اس لئے ہم لوگ بہت جلد بہت کچھ سیکھ
گئے۔ خوراک کو ہضم کرنے کے جو طریقہ کار ہیں، تعلیم کو اسی طریقہ
کار سے روبہ عمل لانا چاہئے۔ پہلے لقمہ کے ساتھ ساتھ منہ
میں مزہ پیدا ہو جاتا ہے، پھر پیٹ بھی گویا بیدار ہو جاتا ہے،
اور خود کو تیار کر لیتا ہے تاکہ اس کے ہاضمی رس پوری طرح اپنا
کردار ادا کر سکیں، لیکن اس طرح کی کوئی بات رونما نہیں ہوتی۔
جب ایک بنگالی لڑکے کو انگریزی سکھائی جاتی ہے۔ انگریزی کے
ہجے اور قواعد تو اسے دھر پکڑ کر یاد کرائے جاتے ہیں۔ جب اس کا
باطن تشنہ رہ جاتا ہے اور جب اس کی تعلیم کا مزہ اسے محسوس
ہوتا ہے تو اس کی بھوک غائب ہو جاتی ہے۔ اگر دل و دماغ
شروع ہی سے کام نہ کریں تو آخر میں بغیر نشوونما کے رہ جائیں گے۔"
(میری یادداشت)

اپنے اسکول کے نمونے کے لئے انہوں نے قدیم
ہندوستان کے نمونے کو اپنایا۔ قدیم ہندوستان میں رشی منی آبادی

سے بہت دور پُر امن جنگلات میں اپنی کُٹیا میں رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے اہل و عیال اور ان کے شاگرد بھی ہوتے۔ وہاں فطرت کی گود میں وہ اپنے شاگردوں کو تعلیم دیا کرتے اور سچائی، امن اور روحانی آزادی کی فضا میں انہیں لافانی زندگی کا سبق دیا کرتے۔" ان جنگلاتی کٹیوں کی بابت وہ یوں رقمطراز ہیں:

"دورِ جدید کے نقطۂ نظر سے یہ نہ اسکول ہے اور نہ خانقاہ ہے۔۔۔۔ گرچہ یہاں اساتذہ سماج سے باہر رہتے ہیں، تاہم سماج میں ان کو وہی مقام حاصل ہے جو سیاروں کے درمیان سورج کو ـــــ چنانچہ قدیم ہندستان میں جہاں زندگی ہوتی وہیں اسکول بھی ہوتا۔ وہاں طلبہ کا وظیفہ اور علم کی تعلیمی فضا میں پرورش نہیں کی جاتی بلکہ جیتی جاگتی آدرشوں کی فضا میں انہیں تعلیم دی جاتی۔" (میرا اسکول)

قدیم روایت پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اسکول کو آشرم کہا اور اس میں اپنے جدید تجربات کی روشنی میں اسی طرح کے ماحول قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایک چھوٹے سے آشرم سے اس کی ابتدا ہوئی اور آج اسے بین الاقوامی اہمیت کا ایک اعلیٰ مقام حاصل ہو چکا ہے۔ شاعر ٹیگور کے نظریے کے مطابق اس آشرم کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کی آزادی، امن، حسن اور محبت کی فضا میں، پرورش کی جائے اور انہیں تعلیم دی جائے۔ اپنے اسکول کے نصب العین کی بابت شاعر یوں رقمطراز ہیں:

"ایسے تو ایک آشرم ہونا چاہئے، جہاں زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین تک پہو نچنے کے لئے قدرتی امن کے ماحول میں لوگ اکٹھا ہوتے ہیں۔ جہاں زندگی صرف گیان دھیان میں نہیں گزرتی بلکہ اپنی سرگرمیوں میں تیزی سے سرگرم عمل ہو جاتی ہے، جہاں بچوں کے دل و دماغ میں اس بات کو ٹھونسا نہیں جاتا کہ قوم کی خود پرستی کا شعور ہی ان کے لئے حقیقی شعور ہے جنہیں انہیں قبول کرنا چاہئے۔ جہاں انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس بات کو محسوس کریں کہ انسان کی یہ دنیا خدا کی حکومت ہے اور جس کے شہری بننے کے لئے انہیں کوشاں رہنا چاہئے۔ جہاں طلوعِ آفتاب، غروبِ آفتاب اور ستاروں کی خاموش شان و شوکت کو روزانہ نظر انداز نہیں کیا جاتا، جہاں لوگوں کو قدرت کے خوبصورت پھولوں اور پھلوں سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ جہاں بچے اور بوڑھے، استاد اور طالب علم ایک ہی میز پر ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں، جہاں ابدی زندگی کی خوراک انہیں ملتی ہے۔"

ہندستان میں تقسیم بنگال کے دوران تعلیم پہلی بار ایک قومی مسئلہ بن گئی۔ اس وقت اس صوبہ کے بہت سارے مفکر اس حقیقت سے بیزار ہوگئے کہ انگریزی سرکار کے تحت جو تعلیم دی جاتی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو ایک غیر ملکی طاقت کے سیاسی تسلط میں رکھا جائے۔ اسی لئے اس وقت تمام سرکاری اسکولوں کا بائیکاٹ کیا گیا اور سارے بنگال میں قومی اسکول کھولے گئے۔ ٹیگور نے اس تحریک کی دل و جان سے تائید کی اور قومی تعلیم پر بنیادی تصورات کو مرتب کرنے میں سربراہی کی۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے بار بار اس نقطۂ نظر کو اجاگر کیا کہ پوری تعلیم تو وہاں کے لوگوں کی سماجی سرگرمیوں کی جزو لاینفک بن گئی۔ اس کی جڑیں قومی زندگی میں مستحکم ہو گئیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان لوگوں نے تعلیم کے لئے مثبتی رویہ کو اپنایا۔ انہوں نے نصاب اور طریقہ تعلیم کو ہم عصر بنانے پر زور دیا۔

"لیکن جہاں اسکول پوری سماجی زندگی کے ساتھ ایک نہیں ہوتا وہاں یہ اسکول سماج پر ایک بوجھ بن جاتا ہے، خشک اور بے جان۔ جو کچھ ہم اس سے سیکھتے ہیں وہ بڑی مشکل سے سیکھتے ہیں جب اسے عملی طور پر روبہ عمل لانے کا موقع آتا ہے تو ہم اسے اچھی طرح روبہ عمل نہیں لا سکتے۔ ہم لوگ اپنا سبق زبانی یاد کر لیتے ہیں! اس کا ہمارے اردگرد کے لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ہماری اسکولی تعلیم کی گھر پر اور اپنے دوستوں کے درمیان کہیں بھی گونج سنائی نہیں دیتی۔ ایسی حالت میں اسکول تو ایک مشین بن جاتا ہے جو بے جان چیزیں تیار کرتی ہے۔" (تعلیم کے مسائل)۔

اس کمی کو دور کرنے کے لئے شاعر نے قومی سطح پر اپنے اہم تعلیمی خیالات اور تجربات پیش کئے اور انہوں نے نہ صرف سماجی مسائل اور انفرادی طور پر لوگوں کے درمیان قریبی تعلقات کی بلکہ تعلیم کی فطری نوعیت پر بھی زور دیا۔ صحیح معنوں میں ایک تخلیقی قوم نہ صرف سماجی ضرورتوں اور کوششوں سے نمودار ہوگی بلکہ عالمگیر انسانی علم سے ہم آہنگ ہوگی۔ اس سلسلہ میں یوں رقمطراز ہیں کہ بنی نوع انسان کے درمیان اتحاد کا ایک جزو تعلیم ہے اس لئے کسی کو بھی اتحاد کی بیداری اور شعور سے اجاگر ہونے والی خوشیوں سے محروم نہیں رکھنا چاہئے۔"

(تعلیم کی گاڑی)

تعلیم میں ٹیگور نے ہمیشہ قومی زبان اور ادب کی اہمیت کو ترجیح دی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بہت سارے مضامین لکھے۔ اپنے مضمون "تعلیم کی گاڑی" میں انہوں نے لکھا، "جو کچھ مغرب کو پیش کرنا تھا، اس نے پیش کر دیا اور جاپان نے اسے اپنا لیا، اور پھر جاپان نے اپنی زبان میں اس مغربی تعلیم سے اپنے عوام کو روشناس کرایا۔"

ٹیگور تعلیم اور تربیت دونوں پر زور دیتے تھے۔ انہوں نے جب روس کا دورہ کیا تو وہاں پر رائج نظامِ تعلیم کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہاں سے انہوں نے بہت سارے خطوط لکھے۔

" لیکن مشین بذاتِ خود کوئی مصرف کی چیز نہیں جب تک کہ اسے چلانے والا بذاتِ خود ایک انسان نہ ہو۔ روس میں زمین کی کاشت کے ساتھ ساتھ دماغ کی کاشت جاری ہے۔ یہاں تعلیم زندہ جاوید ہے .... یہاں تعلیم بہت اہمیت کی حامل بن چکی ہے، کیوں کہ اسکول کی حد روزمرہ کی زندگی سے اسے الگ نہیں رکھتی۔ یہاں امتحانات کے لئے یا اسکالر پیدا کرنے کیلئے تعلیم نہیں دی جاتی، بلکہ ایک مکمل انسان بنانے کے لئے تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں اسکول ہیں، لیکن دماغ تعلیم سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ توانائی اطلاعات سے زیادہ عظیم ہوتی ہے، چھپے الفاظ کے بوجھ تلے، اتنی توانائی باقی نہیں رہتی کہ ہم اپنے دماغ کا استعمال کر سکیں۔ کتنی بار میں نے اپنے بچوں کو بحث و مباحثہ کے لئے بلایا لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے پاس پوچھنے کو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ان میں بذاتِ خود علم اور کچھ جاننے کی خواہش کے درمیان رشتہ کو کاٹ دیا گیا ہے۔ انہیں کبھی بھی اس بات کی تعلیم نہیں دی گئی کہ انہیں جاننے کی ضرورت ہے۔ شروع ہی سے گول مول اور خشک طریقہ سے انہیں صرف اطلاعات فراہم کی جاتی ہے اور جو کچھ انہیں سکھایا جاتا ہے وہ انہیں امتحان میں دہرا کر اچھے نمبر حاصل کرتے ہیں۔"

روس کے دورے سے شاعر کو تعلیم کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ٹھوس نظریہ کی قدروں کا یقین ہو گیا۔ تواریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سماجی موضوعات کے مطالعہ میں صرف یہ کافی نہیں ہوتا کہ ان کے سلسلے میں صرف تھیوریٹیکل یعنی کتابی تعلیم دی جائے، بلکہ ان موضوعات کی تعلیم تو اس وقت مکمل ہوگی جب تعلیم کو تخیلات کی دنیا سے باہر نکال کر ٹھوس تجربہ کی دنیا میں لایا جائے۔ وہ یوں رقمطراز ہیں: "علاقائی تعلیم خوش اسلوبی سے روس میں دی جاتی ہے، مقامی مرکزوں میں ماضی کی تاریخ اور موجودہ معاشی حالات کی بابت تعلیم دی جاتی ہے۔ زمین کی پیداوار کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور معدنیات کی کھوج لگائی جاتی ہے۔ ان مرکزوں سے منسلک عجائب خانوں کے ذریعہ تعلیم کی اشاعت ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ وسیع علاقائی تعلیم اور ان سے منسلک عجائب خانے، تعلیم کے نئے دور میں ترقی کے چند اہم ذرائع ہیں، اور سوویت روس میں اس اصول کو روبہ عمل لایا جاتا ہے۔"

ربندرا ناتھ نے شانتی نکیتن میں اپنے اسکول میں ان طریقہ کار کو اپنانے کی ساتھ ہی اسے سارے ہندوستان میں پھیلانے کی کوشش کی۔ نیز روس کے دورہ سے ٹیگور پر تعلیم کے ایک ذریعہ کے طور پر سیر و تفریح کی اہمیت عیاں ہو گئی۔ روس کی طرح ہندوستان بھی بہت بڑا ملک ہے اور یہاں تعلیم کے لئے سیر و تفریح بہت ہی معاون ثابت ہوگی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بتایا کہ سوویت روس کے لوگوں کو حکومت کی طرف سے سیر و تفریح کی بہت ساری سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ وہ ملک

بہت بڑا ہے اور وہاں مختلف فرقے کے لوگ آباد ہیں۔ زار کی حکومت میں ان لوگوں کو ایک دوسرے کو جاننے کا شاید ہی موقع ملتا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس زمانہ میں سیر و تفریح کا تو عشرت میں شمار ہوتا تھا، صرف امیر لوگ ہی سیر و تفریح کے لئے جا سکتے تھے۔ آج سوویت روس کی عوامی حکومت کی یہی کوشش ہے کہ ایسی سہولتیں سبھوں کے لئے فراہم ہوں۔ ہندوستان میں بھی تعلیمی سیر کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

"دیکھ کر سیکھنے کا ایک ذریعہ سیاحت ہے۔ آپ سبھوں کو معلوم ہے کہ کتنے عرصے سے میں سفری اسکولوں کی بابت سوچ و فکر کر رہا ہوں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور اس میں ہر لحاظ سے تنوع پایا جاتا ہے۔ اس لئے صرف ہنٹر کی 'گزیٹرس' پڑھ کر اس ملک کی بابت مکمل معلومات حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ایک زمانہ میں ہمارے ملک میں پد یاترا کا رواج تھا۔ ہندوستان کے تمام علاقوں میں ہمارے مقدس مقامات ہیں، اور یہ سب ہندوستان کی دولت کی شہادت دیتے ہیں۔ اگر صرف تعلیم کے مقصد کے لئے بچوں کو سارے ہندوستان کی پانچ برسوں کے لئے سیر کرائی جائے تو اس سے انکی تعلیم مکمل ہو جائے گی۔"

"جب دماغ بیدار ہوگا تو وہ مطالعہ کے موضوعات کو خود میں آسانی سے سمو لے گا۔ جس طرح چارا دینے کے ساتھ ساتھ گائے کو چرنے کے لئے چھوڑ دینا پڑتا ہے، اسی طرح باضابطہ تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ دماغ کی افزائش کیلئے تعلیم بذریعہ سیاحت بہت ہی ضروری ہے۔ ایک ساکت اسکول کی چار دیواری میں بے حس کلاسوں میں کتابوں کی روشنی سے دماغی صحت کو تندرست حالت میں برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ کتابوں کو پرے رکھا نہیں جا سکتا۔ علم کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ اسے صرف میدان سے چن چن کر اکٹھا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے گودام گھر سے کچھ علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر طلبا جب وہ سفرت کے اسکول سے گزرے تو اپنے ساتھ کتابوں کے اسکول کو بھی ساتھ رکھ سکے، تو انہیں تعلیم کے لئے اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

ہندوستان میں تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ تعلیمی سیاحت کے امکانات کافی روشن ہیں۔ تعلیمی سیاحت کو اسکولوں کے نصاب میں جگہ دینی چاہئے اور تاریخ، جغرافیہ، حیاتیات اور دیگر موضوع پر تعلیم کے لئے تو تعلیمی سیاحت لازمی ہے۔ ٹیگور کے اس نظریہ کو آج مغربی بنگال اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں کچھ حد تک رو بہ عمل لایا جا رہا ہے۔

پہلی عالمی جنگ کے آخر میں ٹیگور کے تعلیمی نظریہ میں اور بھی وسعت پیدا ہو گئی۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب ایک شخص کے لئے ایک تعلیمی مینار کے اندر بند پڑے رہنا ممکن ہے اور نہ حسب خواہ ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ان کے اپنے اسکول میں تعلیم کو وسیع بنا کر تعلیم کے قومی نظام میں کوئی تبدیلی کر دینا چاہئے اور اس نظام میں دیگر ملکوں کی ترقی پذیر تعلیم کے عناصر کو شامل کر لینا چاہئے۔ پہلی عالمی جنگ نے ساری دنیا میں وسیع پیمانے پر ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا، کافی مالی اور جانی نقصانات ہوئے تھے۔ نیز اس جنگ نے قوموں کے درمیان نفرت پیدا کر دی تھی۔ اس صورت حال میں ٹیگور کو مختلف قوموں کے درمیان سوجھ بوجھ، بھائی چارگی اور اخوت کو فروغ دینے کی اہمیت عیاں ہو گئی۔ ان کے خیال میں ہر جگہ اس کام کو تعلیم یافتہ لوگ ہی انجام دے سکتے ہیں۔ نیز اپنے ملک میں اور دنیا کے دیگر ملکوں میں بڑھتے ہوئے معاشی بحران سے انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ صحیح تعلیم کے لئے ایک مستحکم معاشی بنیاد کا ہونا ضروری ہے۔

۱۹۲۱ء میں دشو بھارتی، بین الاقوامی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مضافاتی تعمیر نو کا ادارہ بھی قائم کیا گیا، یہ دونوں ٹیگور کے تصورات کی ٹھوس شکلیں ہیں۔ انکی اصل تھیوری یہ تھی کہ مضافاتی معیشت کی احیاء نو کو تو ہندوستان کی معاشی بحالی کی بنیاد ہونی چاہئے۔ مضافاتی تعمیر نو کی مدد کے لئے تعلیم کو لا کر ٹیگور نے اپنے اس تھیوری کو عملی شکل دینے کی کوشش کی۔ ٹیگور کے اس تعلیمی تجربہ میں امداد باہم

کے تصور کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"تعلیم یافتہ اور زیرِ تعلیم لوگوں کو اپنے اردگرد کے باشندوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے، کاشتکاری کرنی چاہئے، مویشیوں کی پرورش کرنی چاہئے، کپڑا بُننا چاہئے، تیل کے دانے سے تیل نکالنا چاہئے، انہیں ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزوں کو خود تیار کرنا چاہئے، تیار کرنے کے لئے بہترین طریقۂ کار کو اپنانا چاہئے، بہترین خام اشیاء استعمال کرنی چاہئے اور جدید سائنس کی مدد لینی چاہئے۔ ان تمام باتوں کا امداد باہمی کے اصول پر کی گئی صنعتی سرگرمیوں کی کامیابی پر انحصار ہونا چاہئے اور امداد باہمی کے اصول پڑوس میں رہنے والے تمام اساتذہ، طلباء اور وہیں باشندوں کو سرگرمِ عمل رکھیں گے۔ نیز اس سے عملی صنعتی تربیت کا موقع فراہم ہوگا، اور اس تربیت کا مقصد نفع خوری نہیں ہوگی۔ (وشو بھارتی میں ٹیگور کا خطبہ اپریل ۱۹۲۴ء)۔

ٹیگور نے موجودہ دور کے ایک صحیح رہبر ہونے کے ناطے اپنی تعلیمی پالیسی میں بین الاقوامی سوجھ بوجھ کو، خاص طور پر مشرق اور مغرب کے درمیان فروغ دینے پر زور دیا، اور اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے وشو بھارتی میں مختلف موضوعات، ادبی، سائنسی، نقاشی، گیت سنگیت، کی تعلیم دینے کا سلسلہ جاری کیا اور یہاں مختلف ملکوں کے طلباء اور طالبات تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتی ہیں۔

ان کے خیال میں ایک دوسرے کی ثقافت کی بابت معلومات کے تبادلہ سے مشرقی اور مغربی ملکوں کے درمیان مناسب اور پائیدار سوجھ بوجھ کیلئے مستحکم بنیاد تیار ہوگی۔ اس مقصد کی حصولیابی کے لئے انہوں نے دو طریقۂ کار اپنائے۔ پہلا تو ایک مرکز فراہم کرکے، جو مشرق کی پوری ثقافتی ورثہ کی عکاسی کر سکے اور دوسرا اس مرکز کو تمام ثقافتوں کی آماجگاہ بناکر۔ اور وشو بھارتی ان دونوں طریقۂ کار کا مرکز ہے ٭٭٭

بقیہ: ایک چُلّو پانی

روحانی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور زندگی میں رچ بس جاتا ہے۔

چنڈالیکا کی فطرت تو ایک تخلیقی کیریکٹر ہے۔ پہلے ایک طبقہ کی نمائندہ تھی۔ آنند سے ملاقات کے بعد اس میں انفرادیت نکھر آئی، لیکن اس کی شخصیت میں یہ نکھار اتنی آسانی سے نہیں آئی۔ اسے دنیا کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، چوٹ برداشت کرنی پڑی، دنیا سے الجھنا پڑا، اسے اونچی نیچی، پتھریلی کانٹے دار سڑک سے گزرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی اسے روحانی آزادی نصیب ہوئی۔ مرد کے لئے عورت کی یہ قربانی، عام رابندرا ادب میں بہت کم ہے۔

ہم نے اس عورت کا طبقاتی روپ بھی دیکھا ہے۔ ہم نے اسے چترا نگدہ اور شیاما میں بھی دیکھا ہے۔ رابندرا ناتھ کے ان رقص۔ ڈراموں میں ہم ایک اور خوبی بھی پاتے ہیں۔ انہوں نے جنسی خواہشات کا اظہار اشارہ اور کنایہ میں کیا۔

'بلاکا' میں شاعر ٹیگور نے کہا ہے

سچ اگر نہ ملے دکھ کے ساتھ لڑتے رہو
پاپ اگر نہ مرے اپنی شرمندگی سے

اس معرفہ میں پروکریتی کی ذہنی حالت کی عکاسی کی گئی ہے۔ پروکریتی نے یادوں کی ایک دنیا آباد کر رکھی تھی آرزوؤں اور تمناؤں کا محل بنا رکھا تھا، لیکن اس کی شرم و حیا سے اس کے یہ قلعے مسمار ہو جائیں گے۔ اسی لئے اس کی ماں نے اپنی پوجا پاٹ سے فوق الفطرت کی ضرورت محسوس کی۔ پروکریتی کی محبت تو خوشی کو مدہوش کرتی، لیکن اس کی ماں کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اس کی بیٹی کو دلی مسرت حاصل ہو، اسی لئے اس نے جادو منتر کا بھی سہارا لیا۔ جب آنند بے ہوش اور بے بس ہو جاتا ہے تو اسے اس حالت میں دیکھ کر پروکریتی شش و پنج میں پڑ جاتی ہے کہ وہ آنند کو کیسے جگائے اور یہیں اس پر حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ انسان جو کچھ چاہتا ہے اتنا آسانی سے اسے پا نہیں سکتا۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اعتقاد کو سحر انگیز تعلیم بھی منتزلزل نہیں کر سکتی۔ درحقیقت چنڈالیکا میں دنیاوی محبت کو اجاگر کیا گیا، برخلاف اس کے پروکریتی روحانی محبت کی علمبردار تھی ٭٭٭

ٹیگور ایک مصوّر

تاراپرشاد داس

بائیہ نازادر شہرۂ آفاق ادیب اور شاعر رابندرانا تھ ٹیگور کے اچھے مصور بھی تھے۔ گرچہ انہوں نے کسی اسکول میں مصوری کی تعلیم حاصل نہیں کی تاہم ان کی تیار کردہ تصویروں نے اپنی انفرادیت کی وجہ سے آرٹ کی دنیا میں اپنا ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔ انکی بنائی ہوئی تصویروں پر اگر ہم غور کریں تو ان کی ضوفشانیوں میں ہمیں آرٹ کی دیگر شکلوں جیسے ادب اور موسیقی کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ انسانی افتاد طبع کا ان کو کتنا گہرا علم تھا' یہ بات کاغذ پر انکی بنائی ہوئی تصویروں سے عیاں ہو جاتی ہے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹیگور مصوری کی باقاعدہ تربیت حاصل کرتے تو ان کی یہ تربیت بھی اچھے آرٹ اور اچھی مصوری کی طرف ان کی اتنی بہتر طریقے سے رہنمائی نہیں کر سکتی تھی جتنی کہ ان کی جبلت نے کی۔ اس وجدانی کیفیت نے ان کے لئے وہ ماحول اور فضا تیار کر دی جو ان کی مصوری میں معاون ثابت ہوئی۔ ان کی بنائی تصویروں میں گویا ان کی روح ہم زبان ہوتی نظر آتی ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے کیوں اور کب سے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے لسانی سرحد کو پار کر کے خطوط اور رنگوں کی زبان کو اپنایا' اس کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے۔ جب ان کی عمر ۶۰ سال کی ہوئی تو اس وقت ان میں مصوری کا شوق پیدا ہوا۔ اس شوق کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "مصوری میرے بڑھاپے کی معشوق ہے۔ جس طرح نشہ اور شراب پینے والے کو مخمور کر دیتا ہے اسی طرح اس نے مجھ پر اثر کیا"۔

ٹیگور کا قوت مشاہدہ بہت تیز تھا۔ وہ مناظر قدرت کا بہت ہی گہرا اور عمیق مشاہدہ اور مطالعہ کیا کرتے' ان مشاہدات سے ابھری تصویریں ان کے دماغ کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھ جاتیں۔ جب وہ نظم لکھتے تو آہستہ آہستہ یہ ذہنی تصویریں نظموں کی شکلوں میں ڈھلتی جاتیں۔ اسی طرح جب وہ نظم لکھتے تو مصور کی طرح نقاشی کرتے اور مصوری کرتے تو شاعر کی طرح کام کرتے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے خود کہا کہ "میری تصویریں خطوط اور رنگوں کی شکلوں میں میری نظمیں ہیں"۔

یوں تو زندگی کے آخری ایام میں ٹیگور نے مصوری کی دنیا میں قدم رکھا' لیکن یہاں یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ان میں بچپن سے ہی تصویر بنانے کا یعنی ڈرائنگ کا شوق تھا۔ بچپن میں اپنے لکھنے کی کاپیوں کے ساتھ ساتھ ایک ڈرائنگ کاپی بھی وہ اپنے ساتھ رکھتے اور اس میں کچھ نہ کچھ الٹی سیدھی تصویریں بنایا

کرتے۔ بچپن ہی سے ان میں مشاہدہ کرنے کی عادت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی بچپن میں وہ اپنے گھر کے ماحول، گھر کے باغات وغیرہ کا غائر مطالعہ کیا کرتے اور ان چیزوں کی ڈرائنگ کرنے کی کوشش کرتے۔ اپنی سوانح حیات میں وہ اپنے بچپن کے تجربات کا یوں ذکر یوں کرتے ہیں:

"جب میں اپنے کمرہ میں بستر میں لیٹا رہتا تو کمرہ کی مدھم روشنی میں دیوار کو دیکھتا۔ چوں کہ دیوار میں جگہ جگہ سے پلاسٹر اکھڑ گئے تھے اس لئے روشنی اور سایہ میں مجھے طرح طرح کی شکلیں نظر آتیں اور ان شکلوں پر غور کرتے کرتے میں سوچا تا!"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں گھر کے ایک کمرہ کے کونے کے فرش پر بچھے قالین پر بیٹھ کر دوپہر کے وقت اپنی تفریح طبع کی خاطر کچھ تصویریں بنایا کرتا!"

یوں تو ٹیگور اپنے بچپن میں اپنی کاپیوں میں کچھ نہ کچھ ڈرائنگ کر لیا کرتے، لیکن صحیح معنوں میں انہوں نے مصوری کی دنیا میں سنہ ۱۹۲۴ء میں قدم رکھا اور اس وقت سے لیکر اپنی زندگی کے آخری دنوں یعنی سنہ ۱۹۴۱ء تک انہوں نے مصوری کی۔ سولہ برس کے اس عرصہ میں انہوں نے مختلف شکلوں اور اقسام کی تقریباً ۲۵۰۰ تصویریں کاغذ، بانس پر، لکڑیوں کے ٹوٹے پلاؤں پر، الماریوں پر یہاں تک کہ مٹی کے برتنوں پر بنائیں۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے اپنے دوست جگدیش چندر بوس کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے اس بات کا ذکر کیا کہ انہوں نے اسکیچ بک پر ڈرائنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی تھی، کیوں کہ سنہ ۱۹۲۴ء سے قبل انہوں نے مصوری کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا تھا، گرچہ اس عرصہ میں ان کی بنائی ایک دو تصویریں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ ان کی مصوری اور نقاشی ان کے ڈرائنگ سے شروع ہوتی ہے۔ انکے تخیل کی جولانی کا اثر ان کے لکھے مسودہ کے صفحات پر نظر آتا ہے۔ انہوں نے جہاں جہاں تصحیح کی یا جہاں لفظوں کو رد کر کے دوسرے الفاظ لکھے، وہاں وہاں لکیریں، چھوٹی بڑی، سیدھی ترچھی کھینچ دیں۔ ان لکیروں سے اس مسودہ میں ایک تصویر ابھر آتی ہے۔ اپنی نظموں کے مجموعہ "پورَوی" میں انہوں نے ایسے مسودوں کی ہو بہو کاپیاں شائع کیں۔ ان مسودوں کی نظموں کو، ان کی کھینچی لکیروں نے اور بھی زیادہ جاذب نظر بنا دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لکیروں کو کھینچتے وقت وہ مصوری کے نشہ میں مست تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لکیروں سے نظموں میں تصویروں کی تشکیل کی کوششیں کی گئی ہیں۔ نظموں کے صفحات پر لکیروں نے گویا اپنے ہاتھوں میں مبتی مشعل لے کر ادھر ادھر دوڑنا شروع کر دیا تاکہ ان میں پوشیدہ تصویریں ابھر آجائیں۔ تصویروں میں کہیں لکیروں کی کثرت ہے تو کہیں تعمیر۔ موسیقی یا رقص میں دھیما پن اور تیزی ہوتی ہے، یا نظم پڑھتے وقت بیتوں کو وقفہ وقفہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کا مقصد سامعین کی توجہ کو اپنی طرف مرکوز کرانا ہے۔ اسی طرح ان لکیروں کا مقصد بھی یہی ہے کہ قارئین پر ان لفظوں کو اجاگر کر دیا جائے جن کا دائرہ ان لکیروں نے کیا ہے۔

اتنی باتیں تو ان کی ڈرائنگ کی ہوئیں اب آئیے ان کی پینٹنگ (رنگین مصوری) کا ذکر کریں۔ ایک اچھی مصوری یا یوں کہئے کہ ایک مصور کی تیار کردہ تصویر جہاں مصور کے موضوع یا خیال کو عیاں کرتی ہے وہاں مصور کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ یہ مصوری نہ صرف فطرت اور اخلاق کا ذکر کرتی ہے بلکہ عکاسی کے وقت اس کے ذوق اور ذہنی حالت کو بھی عیاں کرتی ہے۔ دیگر مصوروں کے ساتھ ساتھ ٹیگور پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ ان کی بہت سی تصویروں میں تناؤ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو ان کے تناؤ کی، جن سے وہ دوچار تھے، اور اس سے ہم سب واقف ہیں، عکاسی کرتی ہیں اور تصویروں میں رنگ بھرنے کی اضطرابی کیفیت انکی ذہنی اضطراب کی عکاسی کرتی ہے۔

ٹیگور کی مصوری کے دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور کی مصوری میں رنگین عکاسی بہت نمایاں ہے، کیوں کہ اس دور میں انہوں نے اس دنیا کی مخلوقات کو، اور ہوا اور پانی کو اپنی نقاشی میں جگہ دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دنیا کا ہم شے میں انہیں ایک قدرتی حسن نظر آتا اور خوشی کے اس مصور نے

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

ٹیگور کی مصوری



Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Editor : Md. Azam, Published by the Information & Cultural Affairs Department. Govt. of West Bengal and Printed by M/s. G. R. T. Printers. 54/1C, Shyampukur Street, Calcutta-700 004.

Vol—33 No.—10

PRICE—60 Paise

9th May, 1986





پندرہ روزہ

مغربی بنگال کلکتہ

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
دائرہ دان : محمد اعظم

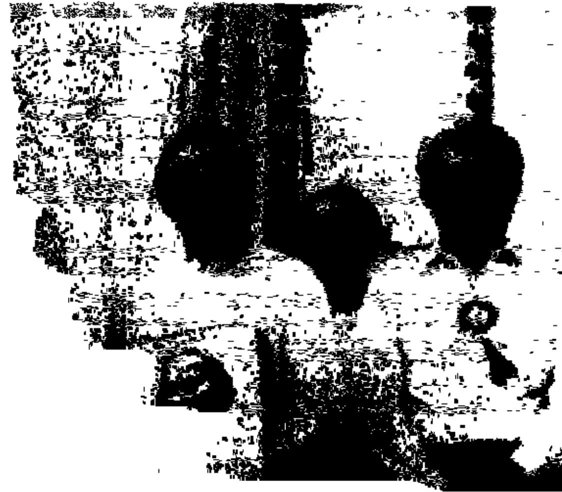
جلد نمبر ۳۲ ★ یکم اور ۱۵ جون ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۱۱، ۱۲

شرح خریداری

سالانہ: تین روپے ★ اس شمارے کی قیمت: ۱۵ پیسے

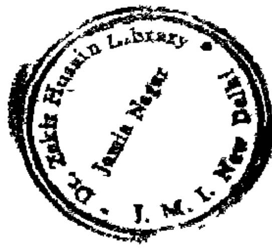
ترسیل زر کا پتہ

بزنس منیجر!
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۳۳- آر اپن، مکھرجی روڈ — کلکتہ - ۷۰۰۰۰۱





ٹیگور کی ۱۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر کلکتہ کارپوریشن کے زیر اہتمام منعقد ایک تقریب میں شری کمل باسو، میئر کلکتہ کارپوریشن، وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو کو، میونسپل گزٹ کے ٹیگور نمبر کی دوسری اشاعت کی ایک کاپی دیتے ہوئے۔ یہ گزٹ تقریباً ۲۵ سال قبل امل ہوم کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ تصویر میں وزیر اعلیٰ کی بائیں طرف شری پرشانتو سور، وزیر بلدیات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔



آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو!
دور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن
کھل کے ہنسنے کے دن، گیت گانے کے دن
پیار کرنے کے دن، دل لگانے کے دن

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں

آج کا دن زبوں ہے مرے دوستو
آج کے دن تو یوں ہے مرے دوستو
جیسے درد و الم کے پرانے نشاں
سب چلے سوئے دل کارواں کارواں
ہاتھ سینے پہ رکھو تو ہر استخواں
سے اٹھے نالۂ الاماں الاماں

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو
کب تمہارے لہو کے دریدہ علم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں دھل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے درد و الم سارے جور و ستم
دور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لو
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

خورشیدِ محشر کی لو

فیض احمد فیض

زیادہ سے زیادہ لوگوں کے درمیان رابندرناتھ ٹیگور کو پہنچا دینا ہے

وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو

شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے درمیان رابندرناتھ ٹیگور کو پہنچا دینا ہم لوگوں کا مقصد ہے۔ شاعر اعظم ٹیگور کی ۱۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ۸ مئی ۱۹۸۶ء کو حکومت مغربی بنگال کے زیر اہتمام، رابندرا سدن میں منعقد ہو رابندرا جینتی کی افتتاحی تقریب میں وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے یہ باتیں کہیں۔

وزیر اعلیٰ نے مزید کہا ”ہم اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہمیں رابندرناتھ کی ۱۲۵ ویں سالگرہ منانے کا موقع ملا۔ تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ اور ان پڑھ لوگوں کے سامنے رابندرناتھ کی افکار و آراء کو ناٹک، [illegible] کے ذریعہ اجاگر کرنا ہے۔ اس لئے تعلیم کے فروغ اور اسے مقبول عام بنانے کے پروگرام کو رو بہ عمل لاکر ہم رابندرناتھ کو خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رابندرناتھ کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی خیالات بہت حد تک حقیقت پر مبنی اور عملی ہیں۔ مغربی بنگال میں سال بھر مختلف النوع تقریبات منانے کے پروگرام کو اپنایا گیا ہے۔ اس بات کے سلسلہ میں کہ دیگر ریاستوں میں بھی اس شاعر اعظم کی سالگرہ منائی جائے، بات چیت ہو رہی ہے۔ ہم لوگ تقریبات کا انتظام کریں گے۔ دوسری ریاستوں سے یہ خبر موصول ہوئی ہے کہ وہ سب اس تقریب میں شرکت کرنا چاہتی ہیں۔ ہم لوگوں نے ان کو مدعو کیا ہے۔“

وزیر اعلیٰ نے اپنی تقریر میں اس بات کا بھی ذکر کیا تھا کہ برٹش سامراجیت کے دور حکومت میں استحصال کے شکار ہندوستان کے گاؤں کی [illegible] کو [illegible] دیکھ کر رابندرناتھ نے مغموم ہو کر قلم اٹھایا تھا۔ اس طرح استحصال کے خلاف انہوں نے احتجاج کیا تھا اور وہ ہندوستان کے کثیر تعداد لوگوں کو تعلیم کی روشنی سے محروم دیکھ کر پریشان ہو اٹھے تھے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ آزادی کی جدوجہد کے دوران تعلیم کے فروغ کیلئے جو وعدہ کیا گیا تھا، وہ وعدہ وعدۂ فردا بن کر رہ گیا۔ یہ بہت ہی افسوسناک بات ہے کہ آج بھی ملک میں لوگوں کی اکثریت تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ عوام سخت معاشی بدحالی میں مبتلا ہیں اور اس معاشی ڈھانچہ میں چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں بھی اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹانے کے لئے سخت محنت و مشقت کرتی ہیں۔ بہرحال تعلیم کو مفت اور عام کرنے اور ناخواندگی کو دور کرنے کے لئے ہم حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں لیکن مکمل طور پر اس مسئلہ کو حل کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ غریبی دور کرنے کے لئے غریب ماں باپ کے چھوٹے چھوٹے بچے پڑھائی لکھائی کو چھوڑ کر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ”ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ملک کے بنگلہ شاعر رابندرناتھ ٹیگور عظیم عالمی شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے صرف گھر کی چار دیواری میں رہ کر شاعری نہیں کی بلکہ ملک کے بحرانی دور میں بھی وہ گھر سے نکل کر گلی کوچے میں نکل آئے۔ سامراجیت کے خلاف انہوں نے قلم اٹھایا۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو کلکتہ میں شہید مینار کے نیچے ہجلی جیل کے قیدیوں کی رہائی کے لئے اگرچہ احتجاجی تقریر کی۔ جاپانی سامراجیت کے خلاف بھی وہ آگے بڑھے۔ جاپان

کے ستائش [illegible] کرا [illegible] خطوط ۔ اور بہت سارے خطوط
بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے روس کا
دورہ کیا اور وہاں کے اشتراکیتی نظام سے وہ بہت خوش ہوئے۔
ان کی یہ باتیں ان کے روس سے خطوط میں درج ہیں۔ تعلیم کے سلسلے
میں انہوں نے نہ صرف عملی اصولوں پر زور دیا بلکہ اس مقصد کے
پیشِ نظر انہوں نے شری نکیتن کی تعمیر کی"۔

وزیر اعلیٰ نے مزید کہا "میں یہاں یہ بات سبھوں کے
گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ تعلیم کے فروغ اور پینے کے پانی کی سپلائی
میں اضافہ کے سلسلے میں اس سال ہم لوگ اور بھی زیادہ کوشش
کر رہے ہیں اور ان باتوں کو پورا کرنے کے لئے ہم ریاستی بجٹ میں
زیادہ سے زیادہ رقوم کی گنجائش رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

اختتام میں انہوں نے کہا کہ "ربندرا ناتھ سے ہم لوگوں
نے جو کچھ سیکھا، اس سے عام لوگوں کو فیضیاب کرنے کے مقصد کو
پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم لوگ منصوبہ تیار کر رہے ہیں"۔

ریاستی حکومت کے شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور کے
وزیر ریاست شری پروبھاش پھودیکار نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے
ہوئے اپنی تقریر میں بتایا کہ ربندرا ناتھ کی ۱۲۵ ویں سالگرہ کی
تقریبات منانے کے لئے ریاستی حکومت نے سال بھر کا پروگرام
مرتب کیا ہے۔ مختلف اضلاع اور مختلف مراکز میں ایسی تقریبات
منانے کی ذمہ داریاں ریاستی حکومت نے لی ہیں۔ ممتاز اور عالم لوگوں
کی نیک رائے اور مشورے اور عام لوگوں کے تعاون سے ریاستی
حکومت اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوشاں ہے۔

ہندوستانی ثقافت کے ماہر اور سوویت یونین کے
ہیرو [illegible] پی۔ گتا تلک والی او چک نے کہا کہ "آج اس تقریبات
میں شرکت کرتے ہوئے میں انتہائی فخر اور خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ میں
ان کامیاب کوشش اور انتظام کے لئے منتظمین کو مبارکباد پیش
کرتا ہوں"۔

شری والی او چک ۱۹۱۳ء سے روس اور انقلاب کے
[illegible] سوویت یونین میں ربندرا ناتھ کا کیا اثر روسی زندگی پر پڑا، اس
[illegible] کیا انہوں نے اختصار کے ساتھ وضاحت کی۔

سشیلا رنجن مجمدار نے ربندرا سنگیت پر روشنی ڈالتے
ہوئے انہوں نے ربندرا ناتھ کے ساتھ اپنی وابستگی کا فخر اور بڑی
خوشی کے ساتھ اظہار کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ ربندرا ناتھ کی واحد
تمنا یہ تھی کہ اس کے گیت اس کے بنائے ہوئے سُروں میں گائے جائیں۔
ربندرا سنگیت بنگالیوں کی زندگی، ان کے حالات، ان کے سکھ دکھ،
غم و خوشی کے درمیان اٹوٹ رشتہ قائم ہے۔

شری سندو گوپال سین گپتا نے کہا کہ حالات کی تبدیلی
کے ساتھ ربندرا ناتھ کی تخلیقات میں بھی تبدیلی آئی۔ اس لئے ربندرا
ناتھ کی تخلیقات کو اپنی کے غور و فکر سے خود کو منسلک کر کے ربندرا ناتھ
کو جاننا ہوگا، سمجھنا ہوگا۔ ابھی بھی عام لوگوں کے درمیان ربندرا
ناتھ کی تحریریں بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئیں۔ یہی بات ربندرا ناتھ
ہر وقت کہا کرتے تھے۔ اس لئے اس سلسلے میں ہمیں موثر قدم اٹھانا
ہوگا۔

صدر مجلس آنندا شنکر رائے نے کہا کہ نثری ادب میں
ٹیگور نے ایک تبدیلی لائی۔ کالی داس کے بعد اتنا بڑا ادیب اب
تک پیدا نہیں ہوا اسی لئے زبان اور ادب کی ترقی کے لئے ربندرا
ناتھ ہمارے رہنما ہیں۔

افتتاحی گیت کا انتظام لوک رنجن ساکھا نے کیا تھا۔ اس
کے علاوہ اس تقریب میں شریمتی بینو کا نھا کر، شری شورشیل [illegible]
اور شریمتی سوچترا مترا نے گانے گائے۔

شریمتی آموا شنکر کے زیر اہتمام ناچ۔ ناٹک "نشٹ نیڑ
کموتی" (کچھ نقصان) بھی پیش کیا گیا +++

گفتگو سے دلِ ترفتہ خاموشی تک آ گئے
اور حرفِ مدعا کو مختصر کیا کیجیے!
—————— اعزاز افضل

ٹیگور میری نظر میں

ننداگوپال سین گپتا

میں نے یہاں رابندر ناتھ ٹیگور کی، جیسا کہ میں نے اپنی جوانی میں دیکھا ہے، چند ذاتی باتوں کا ذکر کروں گا۔ آپ اسے اتفاق کہہ سکتے ہیں کہ مجھے ٹیگور کے بالکل قریب آنے کا موقع ملا، کیونکہ انہوں نے ہی مجھے اپنے ذاتی اسسٹنٹ میں ادبی سکریٹری کی حیثیت سے شامل کر لیا۔ اس کے علاوہ میں وشو بھارتی میں ادب کا لیکچرار بھی تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ میں نے ٹیگور کو بہت ہی قریب سے دیکھا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کئی برسوں تک میں ان کے ساتھ ان کے گھر پر ہی رہا۔ ان برسوں میں تمام حالات میں مجھے انہیں دیکھنے کا اور ان کا مطالعہ کرنے کے کافی مواقع ملے ہیں۔ انہیں اچھی صحت میں، بیماری کی حالت میں، اور ایسی حالت میں جب ان کی طبیعت ناساز رہتی تھی دیکھا۔ میں نے انہیں پڑھتے ہوئے، لکھتے ہوئے، بات کرتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے اور سونے کے لئے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس لئے میں نے ان میں اس عظیم شخصیت کو دیکھا جو شاعر بھی تھی اور فلسفی بھی۔

پہلے ان سے متعلق میری کچھ بدگمانی تھی وہ اب بالکل دور ہو گئی۔ میں جب بچہ تھا تو اس وقت مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ شاعر عام لوگوں سے ملاقات نہیں کرتے، وہ شاہانہ زندگی بسر کرتے اور باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ لیکن برخلاف اس کے مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ تو بہت محنتی انسان تھے، بہت فیاض تھے، سبھوں سے ملتے جلتے اور ہمیشہ چوکس رہتے اور ان کی عادات و اطوار میں ایسی کوئی بات نہ تھی جسے فضول یا ناگفتہ بہ کہہ سکیں۔

وہ ہر روز صبح کے ساڑھے پانچ بجے سو کر اٹھتے، غسل کرتے، پھر اپنی میز پر جاتے، ٹفن اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتے۔ دنیا کے تمام علاقوں سے درجنوں خط آتے۔ ان میں جانے پہچانے لوگوں اور انجانے لوگوں کے خطوط ہوتے۔ اپنے خط میں کسی نے ان سے مشورہ طلب کیا ہے، تو کسی نے اپنے نوزائیدہ بیٹے یا بیٹی کیلئے نام تجویز کرنے کی درخواست کی ہے کسی نے چار سطروں کی ان کی لکھی نظموں کی درخواست کی۔ وہ تمام خطوط کو پڑھتے اور خود جواب لکھتے۔ مختلف علاقوں سے لوگ ان سے ملنے آتے اور وہ بلا تفریق سبھوں سے ایک ایک کر کے ملاقات کرتے اور ان سے باتیں کرنے سے کتراتے نہیں۔ ان تمام مصروفیات کے درمیان وہ اپنے روزمرہ کے کام کاج کو جاری رکھتے اور ایسے کام کرتے انہوں نے کبھی بھی جھنجھلاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کی غرض سے لیٹتے نہیں۔ وہ ایک لکڑی کی کرسی میں بیٹھ جاتے، پڑھتے لکھتے اور کبھی کبھی نقاشی کیا کرتے۔ وقت کو بیکار ضائع کرنے سے انہیں سخت نفرت تھی۔ یہاں ان کی پوشاک اور خوراک کا

بابت ایک دو باتوں کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ وہ لمبا کرتا اور ڈھیلا ڈھالا پائجامہ پہنتے۔ سال کے ہر موسم میں ان کا یہی لباس رہتا۔ سردی کے موسم میں وہ کبھی کبھی ایک رنگین ٹوپی پہن لیتے۔ انکی خوراک بھی مسالہ دار یا چٹ پٹی نہیں ہوتی۔ اچھی خوراک سے تو یہ مراد نہیں ہے کہ کھانا بہت زیادہ تیل یا مسالہ سے تیار کیا جائے۔ وہ خوراک کے سلسلے میں بہت احتیاط برتتے اور خود مختلف اقسام کی ترکاریاں تیار کرتے اور تجرباتی طور پر انہیں پکاتے۔

ان کی شام عام طور پر کانفرنس میں، یا موسیقی کی پارٹیوں کے ساتھ یا ناٹک کی کارگزاری میں گزر جاتی۔ ان کے اخلاق میں ایک نمایاں بات یہ تھی کہ وہ ایک ہومیوپیتھ ڈاکٹر بھی تھے۔ انہوں نے ہومیوپیتھک کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا اور جسے بھی ضرورت ہوتی وہ اس کے لئے ہومیوپیتھک دوا تجویز کرتے لیکن ان کی روزمرہ کی زندگی کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ بذلہ سنج بھی تھے۔ سبھوں سے خوش مزاجی سے ملتے اور مذاق بھی کیا کرتے۔ اپنے مہمان اور رشتہ دار، دوست اور ساتھی، یہاں تک کہ گھر کے نوکر چاکر سے بھی مذاق کر لیا کرتے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ ان کا یہ مذاق صرف تفریح کے لئے ہوتا۔ انہوں نے مذاق سے کبھی بھی کسی کو چوٹ پہونچانے کی کوشش نہیں کی۔ جن سے وہ مذاق کیا کرتے وہ سب بھی اس ہنسی خوشی میں شامل ہو جاتے۔ وہ مذاق میں لفظوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے اور موقع کے لحاظ سے فی البدیہہ شعر بھی کہہ دیتے اور اسی طرح ان کے سامعین پھڑک اٹھتے۔ یہ ہنسی خوشی اور مذاق اتنی عظیم شخصیت کو ایک عام زندگی کی گہما گہمی کی سطح تک لا کھڑا کر دیتا ہے۔

لیکن کیا یہی سب کچھ تھا۔ کیا ان تمام ذاتی باتوں کے عام مطالعہ سے کوئی شاعر اور انسان کی شخصیت کا احاطہ کر سکتا ہے؟ نہیں، کوئی نہیں کر سکتا۔ اندرونی آدمی کو، میرا مطلب ہے روحانی شکل سے اس حقیقی آدمی کو کوئی پہچان نہ سکا۔ وہ حقیقی آدمی ایک لمحہ میں خود کو ایسی دنیا میں لے جا سکتا ہے جہاں تک ہماری پہونچ ہی نہیں ہے اور تمام دنیاوی تفکرات سے بالا تر ہو جاتا ہے اور خود کو مادی شکل سے تخیلاتی شکل میں تبدیل کر لیتا ہے۔ بہت سارے مواقع میں مجھے اس اندرونی آدمی کو دیکھنے کا موقع ملا جو یکایک اس آدمی کو، جو ہمارے درمیان رہتا تھا، دبا کر خود باہر نکل آتا۔

لیکن اس بات کا ذکر کرنا باعث مسرت ہے کہ ایک ہی ٹیگور کی دو شکلیں ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں۔ ایک عالم اور ایک عام آدمی دونوں ہی ٹیگور تک پہونچ سکتے ہیں۔ اول الذکر ان کے دل و دماغ کے اندرونی علاقہ میں گہرائی تک جا سکتا ہے اور بعد الذکر ان کی انسانی سخاوت سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ فوراً ہم میں سے ایک ہو جاتے ہیں، پھر ہم سے بالا تر ہو جاتے ہیں۔ روحانی شخص تو برسوں زندہ رہے گا۔ چھان بین کرنے والے اسکالر تصانیف سے نئی سمت نئی باتیں دریافت کر سکیں گے، لیکن افسوس کہ وہ مادی دنیاوی شخص آج ہمارے درمیان نہیں اور آنے والی نسلیں اس حقیقت سے کبھی واقف نہ ہو سکیں گی کہ اس شاندار ہستی کا اپنے ہم عصروں میں کیا مقام تھا ٭٭٭

عوامی خیراتی شفاخانے کو عطیہ

حکومت مغربی بنگال نے بری نگر میونسپلٹی کو اور عوامی خیراتی شفاخانے اور زچہ خانے کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے ۸۶-۱۹۸۵ء سال میں ۱۵ ہزار روپئے بطور عطیہ دینے کی منظوری دی ہے ٭٭٭

گشتی طبی یونٹ کو عطیہ

حکومت مغربی بنگال نے میڈیکل یونٹ سب کمیٹی کل ہند نسواں کانفرنس، کلکتہ شاخ کو گشتی، دیہی علاقوں میں غریب مریضوں کو طبی خدمات فراہم کرنے اور اس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ۸۶-۱۹۸۵ء سال میں ۱۶ ہزار ۵ سو روپئے بطور عطیہ دینے کی منظوری دی ہے ٭٭٭

مغربی بنگال ترقی کے راستے پر گامزن

جانتی چکرورتی

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ تعلیم، غذائی پیداوار، مکانات اور رسل و رسائل کے نظام کی ترقی سے متعلق ضروری پروگراموں کی غیر موجودگی ترقی کی راہ پر گامزن ملک کو بہتر مستقبل کی طرف بڑھنے نہیں دیتی۔ حکومت مغربی بنگال کے شعبہ جات تعمیرات عامہ، تعمیرات عامہ (سڑک) اور مکانات کی عوامی خدمات کا تجزیہ کرنے سے قبل ہم آئیے چند منٹوں کے لئے پیچھے مڑ کر ماضی کو دیکھیں۔

اس ریاست میں برٹش راج کے دوران جتنی سرکاری عمارتیں اور قومی شاہراہیں تعمیر کی گئیں ان کا مقصد یہ تھا کہ کالونیائی حکمرانوں کے لئے فوجی اور کاروباری سہولتیں فراہم کی جائیں۔ آزادی کے بعد اس سلسلے میں جن پروگراموں کو اپنایا گیا ان سے کالونیائی میراث کی بو آتی ہے اور یہ چند گنے چنے لوگوں کے مفادات کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے ہی یہ مایوس کن تصویر بالکل بدل گئی کیوں کہ اس نے بہت ہی دور اندیشی سے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اقدامات کئے۔ مالی بندشوں کے باوجود بائیں محاذ حکومت کا شعبۂ تعمیرات عامہ نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اپنے پروجیکٹوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے کام کو جاری رکھا ہے، اس کی سرگرمیاں، سابق حکومت کی سرگرمیوں کی طرح صرف شہروں تک محدود نہیں رہیں، بلکہ اس ریاست کے دور افتادہ علاقوں تک پھیل گئیں۔ اس شعبہ کی بہت ہی وسیع تعمیراتی سرگرمیاں ہیں، ان میں چند تعمیراتی پروگراموں کو پنچسالہ منصوبوں میں جگہ ملتی ہے اور چند کو نہیں۔ منصوبوں میں دفتروں، انتظامیہ کی عمارتوں، تعلیمی اور ثقافتی مراکز کی تعمیر اور پرانے پلوں کی مرمت کا کام شامل ہے۔ ۱۹۷۷ء سے لیکر ۱۹۸۶ء کے عرصہ میں بہت ساری عمارتیں تعمیر کی گئیں جن میں پے اینڈ اکاؤنٹس آفس، پورتا بھون، بدھان نگر، سرکاری مہمان خانہ، کلکتہ اور بردوان میں کثیر منزلہ عمارتیں شامل ہیں۔ آٹھویں مالیاتی کمیشن کی سفارشات کے مطابق اس شعبہ نے پولس افراد کی رہائش کے لئے عمارتوں کی اور نئے جیل کی عمارتوں، جن میں تمام جدید سہولتیں فراہم ہوں گی، کی تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے۔ ادب، سیاست اور حب الوطنی کے میدانوں میں قومی رہنماؤں کے مجسمے جگہ جگہ نصب کر دئے گئے ہیں۔

اس شعبہ نے گزشتہ ۸ برسوں میں مجموعی طور پر ۲۲۵۰ کیلو میٹر لمبی نئی سڑکیں تعمیر کیں۔ اس شعبہ کو مرکزی حکومت کی جانب سے بہت ہی کم مالی امداد فراہم کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اس ریاست کے دور افتادہ علاقوں میں آمد و رفت کی کم از کم سہولتیں فراہم کرنے کے لئے کئی ایک پلوں کی تعمیر کا کام مکمل کر لیا گیا ہے۔ تعمیر کردہ پلوں میں سے چند یہ ہیں:

ہگلی ندی پر ماتنگنی سیتو، سوبرن ریکھا پر سیدھو، کانو، برسا سیتو، کوچ بہار میں سون موئے ندی پر پنچانن سیتو اور نوادیپ میں گورنگو سیتو۔ اس طرح کے اور بھی کئی پل زیر تعمیر ہیں۔

مرکزی حکومت کے فراہم کردہ ناکافی فنڈ کی وجہ سے چند پروجیکٹوں، جن میں بلگھریا ایکسپریس وے شامل ہے، کے تعمیراتی کام کی رفتار ترقی تشفی بخش نہیں ہے۔ اس کے باوجود درگاپور ایکسپریس وے سے وابستہ تعمیراتی کام بہت جلد ہی شروع کر دیا جائے گا۔

بشمول بردشری رام پور، جادب پور اور آسنسول میں ریلوے لیول۔کراسنگس پر فلائی اوور (پل) کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ان پلوں کی تعمیر کے بعد ان صنعتی اور گنجان آبادی کے شہروں کے مابین آمد و رفت کی مزید سہولتیں فراہم ہوں گی نیز قومی شاہراہوں کے پاس واقع گنجان آبادی کے شہروں میں ذیلی سڑکیں بھی تعمیر کی جا رہی ہیں۔

عرصہ دراز سے شعبۂ تعمیرات عامہ رہائشی مکانات کی تعمیر کے پروجیکٹوں کو روبہ عمل لا رہا ہے لیکن اب تک اس میدان میں اس شعبہ کو جو کامرانیاں حاصل ہوئی ہیں وہ عوام کی توقعات پر پوری نہیں اتریں۔ مرکزی حکومت کی ناقص پالیسیوں کی وجہ سے تعمیراتی اشیاء کی قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور یہ سب نئے مکانات کی تعمیر کے سلسلے میں انفرادی طور پر لوگوں اور سرکاری اداروں کے لئے سدِ راہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود شعبۂ مکانات کم اور متوسط آمدنی والے طبقے کے لوگوں، معاشی لحاظ سے سماج کے کمزور طبقے کے لوگوں اور مختلف آمدنی سطحوں کے سرکاری ملازمین کے لئے چار الگ پروجیکٹوں کو روبہ عمل لا رہا ہے۔ گزشتہ آٹھ برسوں میں اس طرح کی ۷۰۰۰ رہائشی یونٹیں تعمیر کی جا چکی ہیں۔ ان رہائشی یونٹوں یعنی فلیٹوں کو کرایہ پر دیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ، چند فلیٹیں سلی گوڑی، درگاپور اور بسالا میں لوگوں کے ہاتھ فروخت کی جا رہی ہیں۔ اس طرح کی ۱۹۲ فلیٹس بسالا میں فروخت کر دی گئی ہیں۔ نیز عنقریب مستقبل میں درگاپور میں مزید ۷۲ فلیٹس فروخت کی جائیں گی۔ مرکزی حکومت کی فراہم کردہ مالی امداد سے شمالی بنگال کے چائے باغات کے علاقوں میں مزدوروں کے لئے ۹۴۱۶۵ رہائشی یونٹوں کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا ہے۔

دوسری طرف شعبۂ مکانات کے تحت مغربی بنگال مکانات بورڈ نے درگاپور، سلی گوڑی اور کلیانی میں مختلف آمدنی والے طبقوں کے لئے فلیٹس اور مکانات تعمیر کئے۔ ایسے پروجیکٹوں سے اس بورڈ کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اب تک اس بورڈ نے تقریباً ۱۲۳۰۸ فلیٹس اور مکانات تعمیر کئے۔ اور اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ سنہ ۱۹۹۲ تک مزید ۲۲۲۲ فلیٹس اور مکانات تعمیر کئے جائیں گے

عوام کی اس حکومت سے جن کی تشکیل کیلئے انہیں سخت جانفشانی کرنی پڑی، بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ ہم لوگوں کا یہ عہد بھی ہے کہ ہم ان امیدوں پر پورا اتریں گے اور لاکھوں لاکھ لوگوں کے خوابوں کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے نئی نئی اسکیموں اور پروجیکٹوں کو روبہ عمل لائیں گے۔ تمام حوصلہ شکن اثرات کو قابو میں لاکر ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ گزشتہ ۸ برسوں سے ہم جس جوش و خروش کے ساتھ ترقیاتی اقدامات کر رہے ہیں اپنا یہ جاری رکھیں گے۔ کچھ دشواریاں پیش آسکتی ہیں، ماضی میں بھی بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن دوراندیشی سے نیا دن رونما ہو رہا ہے۔ ملک شاندار مستقبل کی طرف آگے بڑھ رہا ہے ٭٭ ●

مغربی بنگال میں مجرموں کی پیشہ ورانہ تربیت اور بحالی

مجرموں کو پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ جیل سے رہائی کے بعد سماج میں بحال ہو سکیں۔ اس مقصد کے تحت درج ذیل تربیت سے مع پیداواری مراکز جیلوں میں چالو ہیں:

(۱) چھاپہ خانے
(۲) ہتھ کرگھا
(۳) سرسوں سے تیل نکالنے کی مشین
(۴) چھتری کی تیاری
(۵) کمبل کی تیاری
(۶) بڑھئی گیری کا مرکز
(۷) درزی کا کام
(۸) دری اور شطرنجی کا کام
(۹) فینائیل کی تیاری
(۱۰) کتابوں کی جلد سازی۔
(۱۱) صابن تیار کرنے کا کام

یہ ساری صنعتیں نہایت ہی تشفی بخش طور پر چل رہی ہیں اور قیدیوں کو تربیت دے رہی ہیں۔

ستم نصیبوں کو توفیقِ ضرب کاری دے

نہ اور حوصلۂ صبر و بُردباری دے
ستم نصیبوں کو توفیقِ ضرب کاری دے

بدل چکا ہے زمانے کی سازشوں کا چلن
مِرے جنوں کو بھی کچھ طرزِ ہوشیاری دے

ٹھٹھرتی روحوں کی کب سے ہے منجمد آواز
زبانِ خامہ کو اب حکمِ شعلہ باری دے

ہمارے شوق کی منزل ابھی نہیں آئی
ہمارے دِل کو ابھی اور بے قراری دے

مرے شعور کو محوِ غرور ہونا تھا
مرے غرور کو تھوڑی سی خاکساری دے

مصطفیٰ اکبر

ترقی پسند تحریک اور اردو ادب

ڈاکٹر نریش

ادب کی تخلیق میں ترقی پسندی کا عمل ایک مسلسل عمل ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں نے اپنے معاشرے کے حالات سے اثر قبول کیا ہے اور اپنے ماحول کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ مگر یہ شدتِ احساس شاعر یا ادیب کے تخیل کو جب بے سمت منزلوں کے سفر پر لے نکلتی ہے تو اس کا احساس صرف ایک نقطے پر سمٹ آتا ہے اور وہ نقطہ ہے فرار۔ میں ان ادیبوں یا شاعروں کو کم حساس ہونے کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوں جن کی تمام تر صلاحیتیں طلسمی یا سطحی قسم کے ادب کی تخلیق میں صرف ہو کر رہ گئی تھیں۔ اگر وہ ادیب حساس طبع نہ رہے ہوتے تو شاید وہ ادب تخلیق ہی نہ کر پاتے۔ اپنے معاشرے کی گھٹن سے بیزار، اپنے ماحول کی پراگندگی سے بدظن، اپنے گرد و پیش پھیلے ہوئے رجعت پسندی کے رجحانات سے اپنے معاشرے کو آزاد کرانے کی جب کوئی صورت ان کے سامنے نہ تھی تو وہ اپنے قاری کو بہلاوا دیکر فرار کی راہ پر لے نکلے تاکہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی، وہ ان آلام سے، اس گھٹن سے، ماحول کی اس پراگندگی سے نجات تو حاصل کر سکے۔ اس عمل میں ایسے ادوار کے ادیب بھی اپنا فرض سرانجام دے رہے ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان کا ادب معاشرے کو کوئی نئی سمت دے کر نئی منزلوں کی طرف گامزن کرنے کی صلاحیت سے تہی ہوتا ہے اس لئے نہ ان کا ادب ہی دیرپا ہوتا ہے اور نہ وہ اصلاحِ معاشرہ کی اپنی ذمہ داری سے سرخرو ہو پاتے ہیں۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل تقریباً ایسی ہی فضا موجود تھی جس میں تخلیق کار قاری کو بہلاوا تو دیتا تھا مگر اسے زندگی کا آئینہ دکھا کر اس کے خط و خال کی بد نمائی سے دوچار نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کے کئی اسباب بھی تھے۔ ہمارا معاشرہ تعلیم کی روشنی سے محروم، اپنی ذہنی طور پر شکست خوردہ معاشرہ تھا۔ غیر مساوی تقسیمِ زر سے پیدا ہوئی رجعت پسندی کو ہر دوسرے احساس پر سبقت حاصل تھی۔ ہمارے معاشرے کے شعور و لاشعور پر بعض ایسے اثرات بھی حاوی تھے جو رجعت پسندی کی اس سازش میں شریک تھے کہ عام آدمی کو دنیا کی بے ثباتی کا درس دے کر اس کی تمام تر توجہ عاقبت سنوارنے پر ہی مرکوز رکھی جائے تاکہ وہ اپنے ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہمارے ملک میں آزادی کی پہلی جنگ لڑی جا رہی تھی تو ہمارا ادب مجموعی طور پر، تخیل کے پر پرواز لے کر ان دیکھے ان جانے پریوں کے دیس کی سیاحت میں مصروف تھا۔ اگرچہ اس دور کے شعراء وادبا کے یہاں بھی کہیں کہیں دبی زبان میں وہ ٹیس مل جاتی تھی جسے فنکار کا ایماندارانہ ردِ عمل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اکثر تو یہ ٹیس علامتوں اور استعاروں کے بار تلے دب کر رہ گئی تھی اور جہاں کہیں علامتوں اور استعاروں سے کام نہیں لیا گیا تھا وہاں یہ ٹیس نقار خانے میں گم ہونے والی طوطی کی آواز ہو گئی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے ملک کے عظیم شعراء سورداس ہوں، تلسی داس، میر ہوں یا غالب، کسی کا کلام بھی اپنے معاشرے کا آئینہ دار بننے اور اسے آئینہ دکھانے کی صلاحیت سے عاری تھا۔ مجھے ان شعراء کی عظمت سے انکار نہیں ہے لیکن میں اس تکلیف دہ حقیقت سے انحراف بھی نہیں کرنا چاہتا کہ "سورساگر" جیسا ضخیم دیوان پڑھکر یہ تک معلوم نہ ہو کہ اس کا مصنف تاریخ کے کس دور میں تخلیق کر رہا ہے اور اس کے معاشرے کی کیا خوبیاں اور کیا خامیاں تھیں۔

ان اسباب میں سب سے اہم سبب ہے معاشرے کی خوابیدگی۔ معاشرے کو بیدار کرنے کی جو ذمہ داری ادیب اور شاعر کی ہوتی ہے، انفرادی احساس کے ذریعہ اسے پورا کرنا مشکل ہوتا ہے اس لئے ضرورت ہوتی ہے ایک اجتماعی کوشش کی اور جب جب بھی ایسی کوئی

اجتماعی کوشش ہوتی ہے ہم نے اسے تحریک کا نام دیا ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستانی ادب میں کئی صدیاں بغیر کسی تحریک کے ہی نکل گئی تھیں اور یہ احساس کہ ہمارا معاشرہ گردش میں بدلنے لگا تھا مگر چلا ادب اسے جھنجھوڑنے یا جگانے میں معاون نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا جب اردو کے ادیبوں نے صف آرا ہو کر اجتماعی طور پر معاشرے کو بیدار کرنے کا فیصلہ کیا تو گویا ایوانِ ادب کے در و دیوار لرز اٹھے اور اس ایوان کے اندھیرے بند کمروں کو کھلی فضا، ٹھنڈی ہوا اور تازہ دھوپ کی حاجت محسوس ہوئی۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے پہلی مرتبہ ترقی پسند تحریک کے توسط سے ادب کا رشتہ عام آدمی سے جوڑنے کی بھرپور کوششیں شروع کیں تو اردو ادب مسحور کن وادیوں کے سفر کے بجائے دھرتی کی سوندھی خوشبو سے مہکنے لگا۔ ادبی دنیا میں یہ پہلا موقع تھا جب ادیبوں اور شاعروں نے زیر و زبر نظامِ معاشرہ پر صرف احتجاج کرنے کے بجائے معاشرہ کو بدلنے کے عمل میں شرکت کی۔ اس عمل کے نتیجے میں تیز رفتاری سے اردو ادب کا کایا کلپ ہوا۔ ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے سے پہلے ہمارے سیاسی اور سماجی فکر میں جو نئی سوچ جنم لے رہی تھی، شعراء و ادباء نے اس سوچ کے دھارے کے لئے ایک راستہ متعین کیا اور ایک واضح مستقبل کی طرف اشارہ کیا جس کی طرف قدم بڑھانا ناممکنات میں شامل نہ تھا۔ چونکہ راستہ اور منزل دونوں واضح تھے اس لئے ایک پورا قافلہ اس پر گامزن ہو گیا اور ترقی پسند تحریک کی بانگِ درا کے نیچے دوسری تمام آوازیں دب کر رہ گئیں۔ ترقی پسند ادب کی اس درجہ مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہی تھا کہ ہمارے معاشرے میں جو نئی سوچ، معاشرے کی زبوں حالی کے ردِ عمل کے طور پر پنپ رہی تھی، اس میں عام آدمی شریک ہو چکا تھا اور وہ منتظر تھا کہ کوئی اسے صحیح راستہ دکھائے اور اس کے لئے منزلوں کی نشاندہی کرے۔ اردو ادب نے اس فریضہ کو سرانجام دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لی تو عوام نے انکی تخلیقات کو سر آنکھوں پر لیا اور ترقی پسند نظریات اردو ادب کا معراج بن گئے۔

ترقی پسند تحریک کے توسط سے اردو ادب نے دوسرا کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ عام ہندوستانی قاری کو گلوب دکھا کر یہ بتایا کہ سمندر پار کی دنیا شہزادوں اور پریوں کی دنیا نہیں ہے بلکہ وہاں بھی انسان رہتے ہیں جو ہماری ہی طرح کے ہیں۔ روس کے عظیم انقلاب کی مثالیں دے کر اسے بتایا گیا کہ تم نے جس نظامِ معاشرہ کو اپنا مقدر مان لیا ہے، اس نظام کو بدل ڈالنا مشکل نہیں، صرف اس کے لئے اجتماعی ارادہ بنانے اور صحیح سمت میں سعی کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں غلامی، رجعت پرستی، غیر مساوی تقسیمِ زر اور زندگی کی محرومیوں کے خلاف جنگ کر رہے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے بارے میں جب اسے تفصیلات معلوم ہوئیں تو عام آدمی کو یہ یقین ہونے لگا کہ اگر وہ اس جہاد میں شامل ہو گا تو کامیابی یقینی ہے۔ غلامی اور محرومی کو پچھلے جنموں کے کرموں کا پھل ماننے والے عام ہندوستانی کے لئے یہ نئی سوچ خاصی انقلابی سوچ تھی جس نے نئے طبقاتی جنگ کے احساس کو جنم دیا تھا۔ غلامی اور محرومی کے خلاف جنگ کر رہے دیگر ممالک کے اپنے جیسے انسانوں کو برسرِ پیکار دیکھ کر اسے یہ احساس ہوا کہ اگر وہ اس انقلاب پر لبیک کہے گا تو وہ اس جہاد میں تنہا نہیں ہو گا۔ انفرادی احساس اجتماعی ہوتے ہوتے عالمگیر ہو گیا اور عام آدمی یہ محسوس کرنے لگا کہ غلامی اور محرومی کی چکی میں وہ تنہا ہی نہیں پس رہا ہے بلکہ دنیا کے کروڑوں انسان اس چکی میں پس رہے ہیں۔ اس احساس کا ردِ عمل قدرتی طور پر یہ ہوا کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس چکی میں پسنے سے انکار کر دے اور اپنے لئے بہتر زندگی کی تلاش جاری کرے۔

چوں کہ ادب نے پہلی بار نظامِ معاشرہ کو تبدیل کرنے کی انقلابی کوشش کی تھی، اس لئے رجعت پرست طاقتوں نے اسے ادب اور سیاست کے گڈمڈ ہونے کا نام دیکر اس کی مخالفت بھی کی کیوں کہ عام طور پر ادیب کو تماش بینی سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے تو سکتا تھا، اس کی خامیوں پر آہ و بکا بھی کر سکتا تھا مگر اسے یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ احتجاج کی سُر کو اتنا اونچا کرے کہ لوگ اس کی آواز سننے پر مجبور ہو جائیں۔ ادب کو جمالیاتی تسکین اور روحانی کیف و سرور کی حد بندیوں میں مقید رکھنے والے اس تغیر کو قبول بلکہ برداشت کرنے سے معذور تھے۔ مگر ان کی یہ سوچ قدامت

پرستی اور طبقاتی خود غرضی پر مبنی تھی۔ جب جب بھی معاشرے کو کسی چیلنج کا سامنا کرنا پڑا ہے ہمارے سیاسی اور سماجی رہنماؤں نے ادیبوں اور شاعروں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ آگے آئیں اور اس شورش کو تمام کرنے میں اپنا فرض پہچانیں۔ ہر کڑے وقت میں ادیبوں اور شاعروں سے مدد طلب کرنے والے لوگوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ معاشرے کی تکمیل نو میں یا معاشرے کی قسمت لکھنے یا سنوارنے میں ادیبوں کو کب شامل کیا گیا ہے کہ وہ از خود اس چیلنج کو شدتِ احساس کے ساتھ قبول کریں۔ مگر ادیب چونکہ بنیادی طور پر حساس ہوتا ہے اور چونکہ اس کا ایمان "ادب برائے ادب" نہ ہو کر "ادب برائے زندگی" ہوتا ہے اس لئے وہ اپنا فرض پہچاننے میں کوتاہی نہیں کرتا اور وقت کی آواز پر لبیک کہہ دیتا ہے۔ مگر جیسے ہی وہ چیلنج ختم ہونے لگتا ہے، ادیب اور شاعر کی ضرورت بھی کم ہونے لگتی ہے۔ محروم عوام کی صف میں سے وقتی طور پر آگے لائے گئے ادیب اور شاعر لوٹ کر پھر اسی عوامی صف میں چلے جاتے ہیں جہاں بھوک، افلاس اور محرومی پہلے ہی سے انکی منتظر ہوتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کی کامیابی اور اس درجہ مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندستان کے شاعر اور ادیب، معدودے چند ناموں کے استثنیٰ کے ساتھ اس طبقے سے متعلق تھے جو طبقہ بھوک، افلاس، غلامی اور محرومی کے اندھیروں میں زندگی گزار رہا تھا۔ آگ جب ان کے اپنے دروازے تک پہونچی اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس آگ کو بجھایا بھی جا سکتا ہے تو وہ پوری تندہی کے ساتھ اس آگ کو بجھانے میں جُٹ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تخلیقات میں وقت کی ہولناک سچائیاں گونج اٹھیں اور اردو ادب وہ آئینہ بن گیا جس میں ہم اپنے معاشرے کے تمام بدنما داغوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ کسی بھی مرض کا علاج اس کی تشخیص کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں نے سماجی امراض کی تشخیص کا کام سرانجام دیا تو عام قاری پر یہ مژدہ وا ہوا کہ بقول اکبر الہ آبادی ؎

وہ کہتے ہیں کہ یہ کیڑے پڑے کیوں
میں کہتا ہوں کہ تم پہلے سڑے کیوں

شاعر اور ادیب چونکہ اس طبقے کے لوگ تھے جس کے سڑنے کی وجہ سے اس کے جسم میں کیڑے پڑے تھے۔ اس لئے انہوں نے انہی جسموں میں رینگتے ہوئے ان کیڑوں کی آواز کو بھی سنا اور ان کے رینگنے کو بھرپور شدت کے ساتھ محسوس بھی کیا۔ تشخیص ان کی اپنی تھی اور علاج انہیں معلوم تھا۔ عوامی بیداری اور عوامی انقلابات کا علاج دیگر مقامات پر کامیاب ہو چکا تھا لہٰذا اپنے لئے اس علاج کا تعین کرنے میں کسی قسم کے پس و پیش کی گنجائش کم تھی۔ احساس کی شدت، نظر کی گہرائی، ایمانداری اور سچائی یہی وہ اوصاف ہیں جن سے اعلیٰ ادب تعمیر ہوتا ہے اور جو ادیب عارضی طور پر دوسروں کے دکھ درد کو اوڑھنے کے بجائے بذاتِ خود اس دکھ و درد کی بھٹی میں تپ رہا ہوتا ہے، اس کی تخلیق کا کندن بن کر نکلنا ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ اس فطری عمل نے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کو مقبولیت بھی عطا کی اور اسے کامیابی کی بلندیوں تک بھی پہونچا دیا۔

باوجود بعض نقادوں کے اس اعلان کے کہ ترقی پسند تحریک کے زوال پذیر ہونے پر جدید اردو ادب کا آغاز ہوا ہے، میں نہ تو یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ترقی پسند تحریک اپنے زوال کو پہونچ چکی ہے اور نہ یہ کہ جدید اردو ادب ترقی پسندی کی نفی کا نام ہے۔ جیسا میں نے شروع میں عرض کیا کہ ترقی پسندی ایک عمل مسلسل ہے اور مسلسل عمل تب تک اپنے اختتام تک نہیں پہونچتا جب تک کہ اس کے قدم اس کی آخری منزل کو نہ چھو لیں۔ آج بھی ہمارا معاشرہ ان مسائل سے نبرد آزما ہے جن کے خلاف جنگ کا اعلان ترقی پسند تحریک نے سنہ ۳۵ء اور سنہ ۳۶ء میں کیا تھا۔ معاشرہ کسی حد تک تبدیل ضرور ہوا ہے۔ عوامی بیداری اس عہدِ جدید کا بہت بڑا ماحصل ہے۔ اس بیداری کے طفیل بہت سے مسائل کے حل بھی تلاش کئے گئے ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت سے تغیرات بھی رونما ہوئے ہیں۔ لیکن انسانی معاشرہ ایسا پیچیدہ معاشرہ ہے کہ اس کا کایا کلپ ہونے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ جدید اردو ادب میں بھی معاشرے کی صحت مند قدروں کے ٹوٹنے کا کرب شدید موجود ہے۔ جدید ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں کے یہاں بھی محرومی، بھوک، افلاس اور ذہنی غلامی کے خلاف احتجاج کی لَے موجود ہے۔ اس لئے میں جدید اردو ادب کو ترقی پسند ادب کی توسیع کہنا بہتر سمجھتا ہوں۔ مسئلہ ہے تو صرف اپنی الگ شناخت کا اور جداگانہ پہچان تسلیم کرانے کا۔ چونکہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء و ادبا کو عوامی مقبولیت نے ایسا قد آور بنا دیا ہے کہ ان کے قد کا ہونا ذرا مشکل معلوم ہونے لگا تھا اس لئے بعض جدید اردو ادیبوں نے اپنا قد بڑھانے کے بجائے بیان بازی کے

ذریعہ نہیں سکے خود کو چھوٹا کرنا آسان سمجھا۔ وہ اپنی الگ شناخت کی
اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں اس سے بحث نہیں ہے۔
انہوں نے بت شکنی کا جو شیوہ اختیار کیا تھا اس کے پس منظر میں ان کے
عمل کی مقبولیت سے سراسیمہ نفسیات ہی کارفرما تھی۔ بت پرستی اور
بت شکنی، دونوں کا جنون سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اگر آپ جنون کی حد
تک مذہب پرست نہیں ہیں تو آپ بت شکن نہیں ہو سکتے اور اسی طرح
اگر آپ کے اندر وحدانیت کا جذبہ جنون کی حدوں کو نہیں چھو رہا ہے تو آپ
بت شکن نہیں ہو سکتے۔ دونوں صورتوں میں شرط جنون کی ہے اور دونوں
صورتوں میں جو نفسیات کارفرما ہے وہ یہ کہ دونوں الگ الگ طور پر اپنی
انفرادیت کا لوہا منوانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ اس سے ایک بڑا نقصان یہ
ہوا ہے کہ جدید اردو ادب ترقی پسند ادب کی کتاب کا ایک باب بننے کے
بجائے اس کتاب کا ضمیمہ بنتا جا رہا ہے۔ جدید اردو ادب کی تمام تر
توجہ معاشرے سے ہٹ کر فرد پر مرکوز ہو گئی ہے۔ فرد معاشرے کی
نہایت اہم اکائی ہے لیکن کسی بھی معاشرے کی اصلاح کے لئے، بالخصوص
ایسے معاشرے کی اصلاح کے لئے جہاں انسانوں کی تقسیم طبقوں میں ہو چکی ہو،
فرد کے مسائل کا رونا رونے سے ہی نظامِ معاشرہ نہیں بدل سکتا۔ بلکہ
اس کے برعکس اس سے فرد کا احساسِ شکست تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔
جداگانہ حیثیت کے منوانے کے متمنی ادیب یہ بھول جاتے ہیں کہ منتشر کر
منتشر رہنے سے قافلہ بکھر جایا کرتا ہے۔ اس برعکس اگرچہ قافلے کے سبھی
افراد اپنی اپنی جگہ چل رہے ہوتے ہیں اور ہر فرد یہ محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ
وہ اپنا فرضِ راہروی بخوبی سرانجام دے رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ قافلے
سے بھٹک جانے کا غم اس کے سرور راہروی پر حاوی ہونے لگتا ہے اور
وہ فرد کو تنہا پا کر احساسِ شکست کا شکار ہونے لگتا ہے۔ ترقی پسند
تحریک کے پاس ایک واضح نشانہ رہا اور ترقی پسند ادیبوں کا قافلہ منظم رہا
اس لئے جس تیز رفتاری اور یقین و اعتماد کے ساتھ انھوں نے منزلیں
سر کی ہیں ان کا حصول بغیر صف آرائی اور بغیر تنظیم کے اگر ناممکن
نہیں تو بہت دشوار ضرور تھا۔ انفرادی کوششوں کے خاطر خواہ نتائج سے
مجھے انکار نہیں ہے اور اس سے میری مراد یہ بھی نہیں ہے کہ کسی تنظیم
میں شامل ہوئے بغیر کوئی ادیب ادب تخلیق ہی نہ کرے۔ اس سے میری
مراد یہ ہے کہ اگر کسی دور کے ادب مجموعی طور پر ایک ہی کرب کو چھو رہے

حلقوں کے لئے زیادہ موثر اور زیادہ کارگر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مل
جل کر ایک مشترکہ لائحۂ عمل مرتب کر لیں اور ادب کے لئے ان سمتوں
کا تعین کر لیں جن سے حصولِ منزلِ مقصود کے امکانات قوی ہوتے
ہوں۔ اس کا ایک سیدھا سا نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ تغیر کے عمل کی رفتار
تیز ہو جاتی ہے اور عوامی بیداری کے راستے کی مشکلیں نسبتاً آسان
ہو جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جدید اردو ادب کی جن تخلیقات کو دریا
قرار دیا جائے گا اور جن ادیبوں کی قدآوری مسلم ہو گی ان کی تخلیقات میں
وہ تمام اوصاف کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوں گے جو ترقی پسند
ادب سے منسوب رہے ہیں۔ چونکہ جدید اردو ادب کسی تحریک کا نام
نہیں ہے بلکہ ترقی پسند تحریک کے مسلسل عمل کا ہی ایک حصہ ہے۔
ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم سے اپنی بیزاری کے اعلان کے باوجود جدید
ادب کے خالقوں کو یہ معلوم ہے کہ سچا اور کھرا ادب وہی ہو گا جو اپنے
سماج کا آئینہ بنے گا اور جس میں اپنے سماج کو آئینہ دکھانے کی
صلاحیت موجود ہو گی۔

یہ حقیقت ہے کہ بعض مسائل ترقی پسند تحریک کے
شروع ہونے سے لیکر آج تک جوں کے توں موجود ہیں۔ مثلاً آج بھی
ہمارا معاشرہ غریب اور امیر کے دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ آج بھی
غریب آدمی مجبور اور محروم ہے لیکن آج اس مسئلہ کی صورت وہی نہیں
جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ اگلے وقتوں میں مجبور اور محروم لوگ مجبوری اور محرومی
کو اپنا مقدر مان کر مذہب پرستی کے ذریعہ اپنی عاقبت، اپنا پرلوک
سدھارنے میں لگ کر اپنے ماحول سے فرار کی راہ تلاش کیا کرتے تھے
لیکن آج اس طبقے کے لوگ سیاسی اور سماجی طور پر بیدار ہیں۔ انہیں
معلوم ہے کہ انہیں اس لئے نہیں لوٹا جا رہا ہے کہ یہ ان کے پچھلے جنم کے
کرموں کا پھل ہے بلکہ اس لئے کہ دوسرا طبقہ ان سے زیادہ مضبوط،
زیادہ منظم اور زیادہ موثر طبقہ ہے۔ اس بیداری کے لانے میں ترقی پسند
ادب نے جو رول ادا کیا ہے اسے کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جا
سکتا۔ جنگ ہمارے دور کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ہم سے پہلی
نسل کے لوگوں نے دو عالمی جنگوں کے ہولناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے
ہیں اس لئے ترقی پسند ادیبوں نے جنگ بازوں کے خلاف مہم چلائی
تھی۔ آج بھی تیسری عالمی جنگ کا اندیشہ ہمارے ذہنوں میں ہیں

تحریف پرستی کی ہوا آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک کو متاثر کر رہی ہے۔ آج بھی مذہب، ذات، رنگ، نسل اور زبان کے نام پر قتل و خون کا بازار گرم ہوتا ہے۔ آج بھی کرۂ ارض کے مختلف حصے معصوم، بے گناہ لوگوں کے خون سے رنگے جاتے ہیں۔ آج بھی دنیا کے بیشتر انسان بھوک، افلاس، بے درد رسم و رواج اور بے رحمانہ سماجی قوانین کا شکار ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ نظامِ معاشرہ کے بدلنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ ہم اپنی ذمہ داری کس حد تک کس ایمان داری سے نبھا رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک ایک ادبی تحریک تھی اور ادبی تحریک ہے۔ ترقی پسند ادیبوں نے مجبور اور محروم انسانوں کی حمایت میں جو تلوار اٹھائی، وہ لفظوں کی تلوار تھی۔ سنسکاروں سے بندھے ذہنوں کو آزادی دلانا ہی اپنے آپ میں ایک مشکل مرحلہ تھا مگر یہاں ترقی پسند ادیب بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اب جو نئے مسائل ہمارے سامنے ہیں یا پرانے مسائل کی جو بدلی ہوئی صورتیں ہمارے سامنے ہیں ان کا مقابلہ بھی اسی ہمت، استقلال اور جواں مردی کے ساتھ کرنا ہوگا جس کی گھن گرج تحریک کے ابتدائی برسوں میں سنائی دیا کرتی تھی۔

ترقی پسند تحریک کے توسط سے اردو ادب نے ہمیں وہ شعری سرمایہ عطا کیا ہے جس نے ہمارے ذہنوں کو آزادیٔ فکر، دلوں کو گرمیٔ شوق اور نظر کو وسعتیں عطا کی ہیں۔ ایسے افسانے اور ناول دئے ہیں جن سے مجہول سماجی اور اخلاقی قدروں کی پختہ دیواریں گری ہیں۔ وہ تنقیدی بصارت دی ہے جس نے تخلیقِ ادب کو اعلیٰ مقصدیت کے ساتھ وابستگی عطا کی ہے۔ مگر افسوس کہ آج اس تحریک کی رفتار قدرے مدھم پڑ گئی ہے۔ اس سے اردو ادب کو ایک بہت بڑا نقصان یہ پہونچا ہے کہ بقول سردار جعفری "آج اردو میں وسیع پیمانے پر ایک ایسا رجحان پایا جاتا ہے جس کے پرچم پر اس قسم کے نعرے لکھے ہوئے ہیں کہ — میں بکھر گیا ہوں، میں ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں، میں کھو گیا ہوں، کوئی مجھے تلاش کرے، میں اندھیرے کی گرفت میں ہوں، کوئی مجھے نکالے، میں بے چہرہ ہوں، تمام نظریے مر چکے ہیں، تمام آدرش دم توڑ چکے ہیں، الفاظ بے معنی ہو چکے ہیں، انسان مجبور ہے۔" (گفتگو جون [illegible] پیش گفتار) - اور یہ واقعہ ہے۔ اس صورت حال میں ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ آج یہ ذمہ داری اپنے جاری کردہ مشن کو پورا کرنے کی ذمہ داری ہی نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری بھی اس میں شامل ہو گئی ہے۔ جو آج اردو ادب کو درپیش ہے۔ مجھے سردار جعفری کے اس زاویۂ نظر سے اتفاق نہیں ہے کہ دورِ حاضر کے اس خطرناک ادبی رجحان کو "دیوانگی" کا نام دے کر اس کے جواب میں بہتر ادب، بہتر شاعری اور بہتر تخلیق کا نعرہ بلند کر دیا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی اس تنظیم کو پھر سے وہ توانائی حاصل ہو جس سے نئے ادیبوں کی صلاحیتوں کو گمراہی کے راستے پر چلنے سے روکا جا سکے۔ اگر ادب کی تخلیق کو غیر مقصدی اور غیر افادی ہونے دیا گیا تو ہمیں اپنے سفر کو لوٹ کر پھر وہیں سے شروع کرنا ہوگا جہاں سے ہم پچاس برس پہلے سرفروشوں کی طرح سوئے منزل رواں ہوئے تھے +++

بیاضِ غم

حامی گورکھپوری

(وحید عرشی کی موت سے متاثر ہو کر)

وہ روپ آفتاب کا — وہ ہم نوا گلاب کا
وہ لب ہنسی کے پاسباں — بیاضِ غم کے رازداں
وہ لب خموش ہو گئے — اداسیاں برس گئیں
وہ لب کبھی جو کھل گئے — ظرافتیں چھلک پڑیں
جراحتیں ٹپک پڑیں — صداقتیں مہک پڑیں
کہاں گئے وہ پیارے لب — وہ پھول اور ستارے لب
ہر اک سے پوچھنے لگی — وہ کھوئی کھوئی سی ہنسی
وہ پیکرِ سخن کہاں — متاعِ علم و فن کہاں
وہ قد نہیں وہ سر نہیں — وہ فکر کی نظر نہیں
وہ روشنی جو تیز تھی — بہت حیات خیز تھی
وہ روشنی کہاں گئی — وہ آگہی کہاں گئی

ہندوستان میں مزدوروں کی اہم ہڑتال / کام بندی

۱۹ ویں صدی سے لیکر سنہ ۱۹۱۴ء تک یعنی پہلی عالمی جنگ کے شروع ہونے سے قبل تک

سال مقام	صنعت / تجارتی ادارہ کا نام جہاں ہڑتالیں یا کام بندی ہوئی
مئی سنہ ۱۸۲۷ء۔ کلکتہ	کلکتہ کے پالکی ڈھونے والے مزدوروں کی ہڑتال۔ یہ ہندوستان کی سب سے پہلی ہڑتال تھی۔
سنہ ۱۸۵۳ء۔ کلکتہ	دریائی رسل ورسائل کے قلیوں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۶۲ء۔ کلکتہ	بیل گاڑی کے گاڑی بانوں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۶۲ء۔ ہوڑہ	ریلوے ورکروں کی ہڑتال۔ اس زمانہ میں ریلوے لائن بھی بچھائی گئی تھی اور اس میں تقریباً ۱۲۰۰ مزدوروں نے اپریل مئی سنہ ۱۸۶۲ء میں کام کرنے کے آٹھ گھنٹے کے دن کے مطالبہ پر ہڑتال کی تھی۔ یہ آٹھ گھنٹے کام کے دن کی مانگ کے لئے ساری دنیا میں پہلی منظم ہڑتال تھی۔
سنہ ۱۸۶۲ء۔ بمبئی	بمبئی میں حجاموں کی ہڑتال۔ داڑھی بنانے کے لئے جن کا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے لئے ۲ آنے فی کس، مسلمانوں کے لئے ۲½ آنے فی کس اور پارسیوں کے لئے ۴ آنے فی کس۔
سنہ ۱۸۶۲ء۔ بمبئی	دھوبی کے یہاں کام کرنے والے مزدوروں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۶۶ء۔ بمبئی	میونسپل کارپوریشن کے گوشت بیچنے والوں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۷۳ء۔ کلکتہ	گھوڑا گاڑی کے کوچ بانوں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۷۳ء۔ بمبئی	چھاپہ خانے کے کمپوزیٹروں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۷۳ء۔ احمدآباد	میدان میں اینٹ تیار کرنے والے مزدوروں کی ہڑتال۔ اس کے بعد دیگر صنعتوں کے مزدوروں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۷۳ء۔ مدراس	بھیڑیوں پر ٹیکس عائد کر دینے کے خلاف گوشت بیچنے والوں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۷۷ء۔ ناگپور	اجرت کی شرحوں کے مسئلہ پر ناگپور امپریس مل کے مزدوروں کی کام بندی۔
سنہ ۱۸۸۰ء۔ سکھر	ایک برٹش افسر کی منتقلی کے مطالبہ پر ایسٹ انڈیا ریلویز کے پرکنسٹی مین کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۸۱ء۔ کلکتہ	گھوسری کاٹن مل میں مزدوروں کی وسیع پیمانے پر ہڑتال جو دس دنوں تک جاری رہی۔
سنہ ۱۸۸۲ء۔ سورت	۱۳ اور ۱۴ نومبر سنہ ۱۸۸۲ء کو غلام بابا اسپننگ اینڈ ویونگ ملس کے مزدوروں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۸۲ء۔ سورت	۱۸ اور ۲۰ دسمبر سنہ ۱۸۸۲ء کو مذکورہ بالا ملس کے مزدوروں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۸۲ء۔ واردھا	۲۶ سے ۲۸ دسمبر سنہ ۱۸۸۲ء تک ہنگن گھاٹ مل کے مزدوروں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۸۷ء۔ واردھا	۲۷ سے ۲۹ اپریل سنہ ۱۸۸۷ء تک مذکورہ گھاٹ مل میں مزدوروں کی ہڑتال۔

/

سنہ / مقام	واقعہ
سنہ ۱۸۸۸ء – واردھا	۲۶ سے ۳۰ مارچ تک مذکورہ گھاٹ مل میں مزدوروں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۸۸ء – کرلا	سودیشی ملس کے مزدوروں کی ہڑتال جو تین دنوں تک جاری رہی۔
سنہ ۱۸۸۹ء – واردھا	۲۵ سے ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۸۹ء تک ہنگن گھاٹ مل مزدوروں کی چار دنوں کے لئے ہڑتال۔
سنہ ۱۸۹۰ء – کلکتہ	گھوسری کاٹن ملس میں مزدوروں کی تین دنوں تک ہڑتال
سنہ ۱۸۹۱ء – کوئمبٹور	۱۰ سے ۱۲ مئی سنہ ۱۸۹۱ء تک کوئمبٹور اسپننگ اینڈ ویونگ ملس میں مزدوروں کی ہڑتال۔ اس مل کے ۳۵۰ مزدوروں میں سے ۳۰۰ مزدوروں نے شرکت کی۔
سنہ ۹۰-۱۸۹۱ء – مدراس	ساؤدرن انڈیا اسپننگ اینڈ ویونگ کمپنی لمیٹڈ کے مزدوروں کی پانچ بار ہڑتال۔
سنہ ۹۰-۱۸۸۹ء – بمبئی	وروسبی واڈیا اینڈ سنس میں دو ہڑتالیں۔
سنہ ۱۸۹۲ء – بمبئی	اکتوبر سنہ ۱۸۹۲ء میں کے ایم ہیرا مانک اینڈ کمپنی کی تین ملوں میں ہڑتال
سنہ ۹۴-۱۸۹۳ء – بمبئی	بمبئی میں تقریباً ۱۲۰۰۰ تا ۱۵۰۰۰ سوتی مل مزدوروں کی وسیع پیمانے پر ہڑتال۔
سنہ ۱۸۹۵ء – احمدآباد	۸۰۰۰ صنعتی مزدوروں کی مل مالکوں کی ایسوسی ایشن کے خلاف تقریباً دو مہینے کے لیے صنعتی ہڑتال
سنہ ۱۸۹۵ء – بج بج	بج بج پاٹ مل میں مزدوروں کا ۲ ہفتوں کے لیے وسیع پیمانے کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۹۶ء – بج بج	بج بج پاٹ مل میں آٹھ دنوں کے لیے مزدوروں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۹۶ء اکتوبر – شیبپور	شیب پور پاٹ مل مزدوروں کی ہڑتال
سنہ ۱۸۹۶ء – کلکتہ اور ۲۴ پرگنہ	ٹیٹا گڑھ، کمرہٹی، اسونکا ناراہ، گارڈن ریچ، بج بج پاٹ ملوں میں بہت ساری ہڑتالیں / مزدوروں کی جدوجہد
جنوری سنہ ۱۸۹۷ء – کلکتہ	ریلوے گارڈوں کی چار دنوں کے لئے ہڑتال۔ تعطیل اور اعلیٰ اجرت ان کا مطالبہ تھا۔
سنہ ۱۸۹۷ء – بمبئی	اجرت کا ماہانہ ادائیگی کی جگہ روزانہ ادائیگی کے لئے بمبئی شہر کی مزدوروں کی علامتی ہڑتال۔
سنہ ۱۸۹۹ء – پونا	جی آئی پی ریلویز کے سگنل ڈیپارٹمنٹ کے ورکروں کی ہڑتال ۔ اس ہڑتال میں ۴۰۰ ہندو، مسلمان اور عیسائی مزدوروں نے ایک ساتھ مل کر ہڑتال کی
سنہ ۱۹۰۳ء – مدراس	اعلیٰ تمام اجرتوں کے مطالبہ پر حکومت مدراس کے پریس ورکروں کی ہڑتال۔
سنہ ۱۹۰۵ء – کلکتہ	حکومت ہند کے پریس اور بنگال سکریٹریٹ پریس کے تقریباً ۲۰۰۰ ورکروں نے ایک مہینہ تک ہڑتال کی۔ ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء کو اسی ہڑتال کے نتیجے میں ملک کا سب سے پہلا ٹریڈ یونین 'بنگال پریس ورکرس یونین' قائم ہوا۔
سنہ ۱۹۰۵ء – کلکتہ	برن اینڈ کمپنی میں ہڑتال
سنہ ۱۹۰۵ء – کلکتہ	کلکتہ ٹرامویز کمپنی کے کنڈکٹروں کی ہڑتال
سنہ ۱۹۰۵ء – کلکتہ	کلکتہ کارپوریشن کے چپراسیوں اور اسی درجہ کے دیگر اسٹاف کی ہڑتال۔
سنہ ۱۹۰۵ء – کلکتہ	ایسٹ انڈیا ریلویز کے گارڈوں کی ہڑتال ۔ اس ہڑتال میں تقریباً ۱۰۰۰ گارڈوں نے حصہ لیا۔
اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء – بمبئی	بمبئی کے کاٹن ٹیکسٹائل مل کے مزدوروں کی ہڑتال کے دوران بہت سارے مزدوروں کو گرفتار کیا گیا جن میں چھ سولہ بچے بھی تھے۔ ہڑتال کے بعد ہڑتال کرنے والے مزدوروں کے خلاف انتظامیہ کی طرف سے جبر کے اقدامات کیے گئے۔

۱۹۰۵ء - کلکتہ آسام [illegible] اور ریل کمپنی	ایسٹ انڈیا ریلوے ورکروں کی ہڑتال - ریلوے کے تمام سیکشن کے مزدوروں اور ملازمین کی شرکت اور منظم جدوجہد۔
۱۹۰۶ء - کلکتہ اور آسام	آسام بنگال ریلویز، بنگال ناگپور ریلویز اور نارتھ ویسٹرن ریلویز میں ورکروں کی وسیع پیمانہ کی ہڑتال۔
۱۹۰۶ء - کلکتہ	کلکتہ بندرگاہ میں کلکتہ پورٹ کمشنر میں ڈاک جیٹیز کے قلیوں کی ہڑتال۔
۱۹۰۸ء - کلکتہ	کانکی نارا جاٹ مل ورکروں کی ہڑتال - پولس نے ہڑتال کرنے والے مزدوروں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا - پولس نے ایک مزدور کو جس کا نام دھانی تھا گولی مار کر ہلاک کر دیا اور ۶ مزدوروں کو گرفتار کیا۔
۱۹۰۸ء - کلکتہ	سوتی کپڑے کی ملوں نے میں تلک کی گرفتاری کے خلاف ورکروں کی چھ دنوں تک وسیع ہڑتال - اس ہڑتال نے سیاسی نوعیت اختیار کر لی اور یہ ہڑتال پولس اور انتظامیہ کے خلاف مزدور کی شدید جدوجہد میں تبدیل ہو گیا۔ لینن نے اس ہڑتال کی تائید کی - انہوں نے اس ہڑتال کو عوام کی بیداری اور سیاسی جدوجہد کہا - ہڑتال چھ دنوں تک جاری رہی - تلک کو چھ سال قید کی سزا دی گئی تھی - یہ ہڑتال ورکروں نے بطور احتجاج کیا تھا - یہ پہلا واقعہ تھا جب محنت کش طبقہ نے ایک سیاسی مسئلہ پر ہڑتال کی۔

سرکاری خبریں

دیہی پانی سپلائی اسکیم کے لئے عطیہ

ریاستی حکومت نے حالیہ مالی سال میں کم از کم ضروریات پروگرام کے تحت دیہی پانی سپلائی اسکیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے سلسلے میں انیس اضلاع میں ۱۷۹۱ ٹیوب ویل کے کل پرزے کی خریداری کے لئے ۷۶۳،۰۷، ۹۷ روپئے بطور عطیہ دینے کی منظوری دی ہے ٭ ٭ ٭

جیل قانون نظرثانی کمیٹی کی سفارشات اور انکی تکمیل

مغربی بنگال سنٹرل قانون ساز سے صلاح و مشورہ کے بعد جیل قانون نظرثانی کمیٹی کی منظور سفارشات کی موجودہ جیل قانون میں فوری ترمیم لاکر پایۂ تکمیل تک پہونچایا جا رہا ہے - ان خدمات کے لئے زیادہ رقم کی ضرورت نہیں پڑتی ہے - چند ترمیمات درج ذیل ہیں :

(الف) جیل کے حکام کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ زیر سماعت مقدمیں کے قیدیوں کو قانونی امداد فراہم کرنے کے لئے قانونی امداد کمیٹی سے رابطہ قائم رکھیں۔

(ب) جیل کے حکام کا یہ فرض ہے کہ وہ قیدی کو جیل میں لے جانے کے فوراً بعد ہی اس کے قریبی رشتہ داروں کو اس کی اطلاع دے دیں۔

(ج) جیل حکام کو چاہیئے کہ وہ جیل میں داخل کردہ تمام قیدیوں کی بابت تفاصیل رجسٹر میں درج کریں اور اس رجسٹر کو برقرار رکھیں۔

(د) بورڈ یا یونیورسیٹیوں کے تحت امتحانات پاس کرنے والے قیدیوں کو مختلف شرح پر رعایت۔

(ہ) قیدیوں کی منتقلی ان جیلوں میں ہونی چاہیئے جہاں ان کے ذہنی رجحان کے مطابق ان کو تربیت دینے کی سہولتیں موجود ہوں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

تہذیب وتمدّن میں بحران

"......... بربریت کا عفریت تمام تصنع کو چھوڑ چکا ہے اور اپنے دانتوں کو باہر نکالے نمودار ہوا ہے اور غارت گری کی خرمستی میں انسانیت کے پرخچے اُڑانے کے لئے تیار ہے۔ دُنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک نفرت کا زہریلا دُھواں فضا کو سیاہ بنا چکا ہے...... ایک دن آئے گا جب شکست خوردہ انسان تمام رکاوٹوں کے باوجود اپنی گم شدہ انسانی میراث کی بازیابی کیلئے فتح کی راہ کو پالے گا"

رابندرناتھ ٹیگور

رابندرناتھ ٹیگور کی
۱۲۵ ویں سالگرہ پر
ہماری طرف سے
خراجِ عقیدت۔

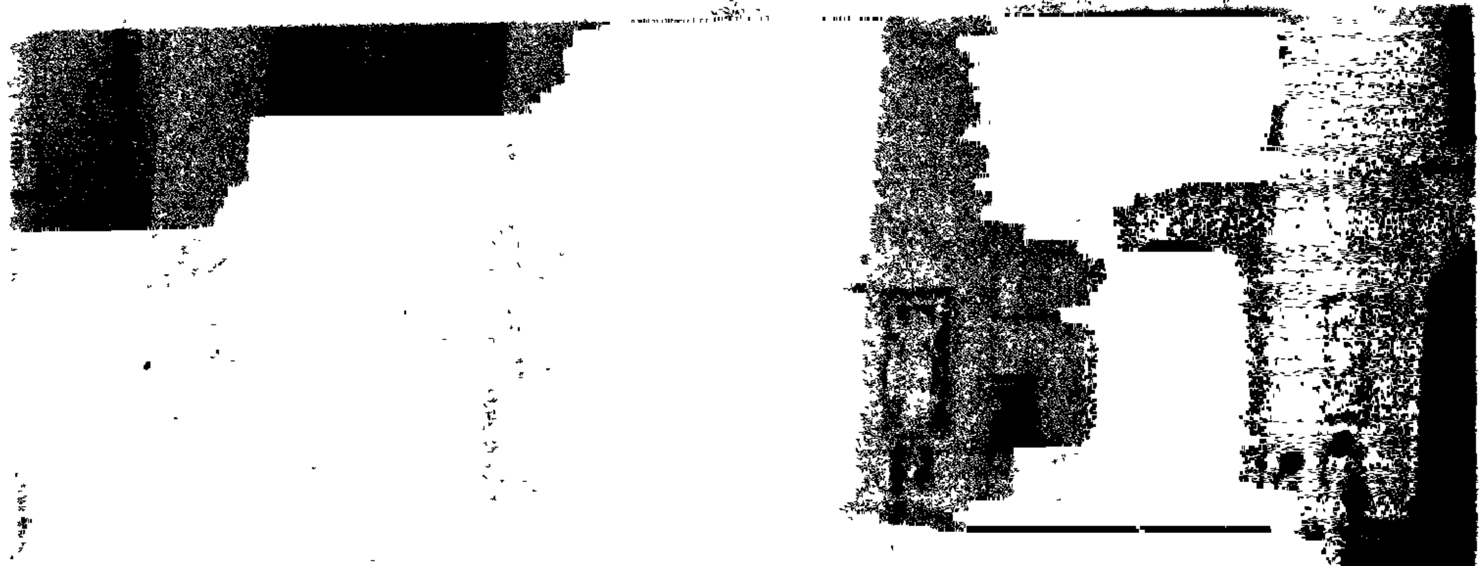
حکومتِ مغربی بنگال

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta. Associate Md. Azam
Published by the Information & Cultural Affairs Dept. of Govt. of West Bengal and Printed by G. R. I
Printers. 54/1C, Shyampukur Street, Calcutta-700004.

MAGHREBI BANGAL
15 JUNE 1986

Postal Regd. No. WBC C-52
Vol—31 No — 11, 12
PRICE Paise 15





رابندرا ناتھ ٹیگور کی ۱۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں کلکتہ کارپوریشن کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تقریب میں وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو تقریر کرتے ہوئے



پندرہ روزہ مغربی بنگال کلکتہ

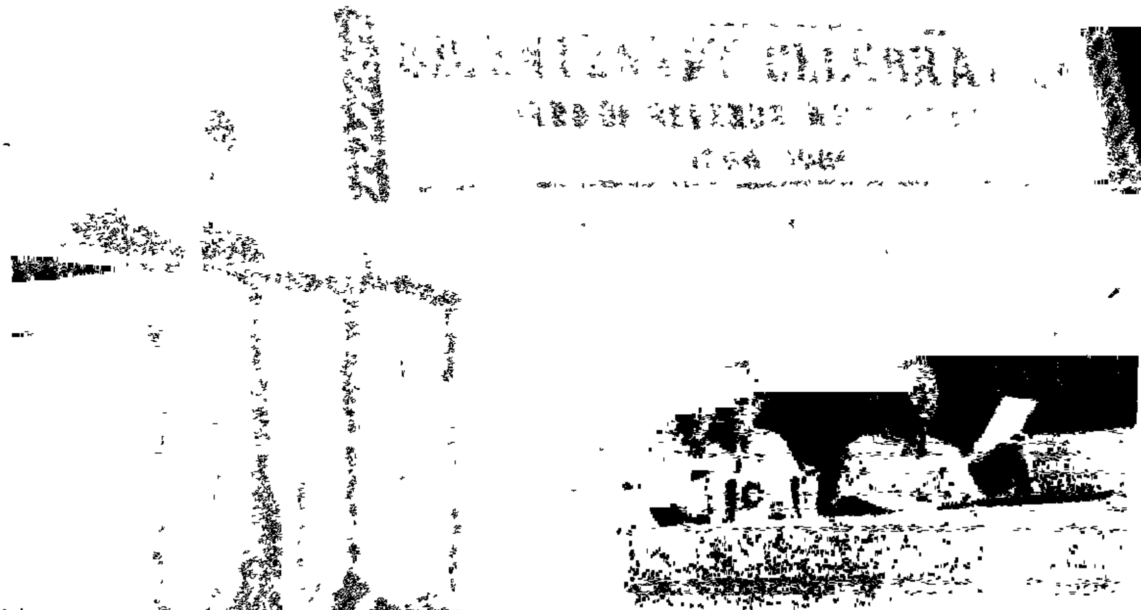
مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

جلد نمبر ۳۳ ★ یکم جولائی ۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۱۳

شرح خریداری

سالانہ : تین روپئے — اس شمارے کی قیمت : بارہ پیسے

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر!
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۲۳۔ آر این ۔ مکھرجی روڈ ۔ کلکتہ — ۷۰۰۰۰۱



مغربی بنگال بورڈ آف ریونیو کے دو سو سالہ تقریب کے موقع پر ۲۷ جون ۸۶ء کو سسر منچ کلکتہ میں منعقدہ سمپوزیم میں وزیر آراضی و اصلاحات آراضی شری بنوئے کرشنا چودھری افتتاحی تقریر کرتے ہوئے۔

تصویر از : اجیت داس

مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت نے نو۹ سال مکمل کر لئے

کلکتے اور سارے اضلاع میں تقریبات

وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے ۲۱ر جون ۱۹۸۶ء کو رابندر اسدن کلکتہ میں منعقدہ ایک تقریب کا افتتاح کیا مغربی بنگال میں بائیں محاذ نے اپنی حکومت کے ۹ سال مکمل کر لئے ہیں یہ تقریب اسی سلسلے میں منعقد کی گئی تھی۔ اس تقریب میں بائیں محاذ کمیٹی کے چیئرمین شری سروج مکھرجی اور مغربی بنگال کے چند وزراء نے بھی شرکت کی اور تقریریں کیں۔ وزیر ریاست برائے اطلاعات و ثقافتی امور شری پر د بھاش پھودیکار نے اس تقریب کے سلسلے میں منعقدہ مذکورہ جلسے کی صدارت کی۔

اس جشن کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے کہا کہ ایک جاگیردارانہ۔ سرمایہ دارانہ ڈھانچے میں کام کرتے ہوئے اور مرکز کے عائد کردہ رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بائیں محاذ حکومت مغربی بنگال میں اپنے فرائض کو بحُسن و خوبی انجام دے رہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ بائیں محاذ حکومت کا فرض بھی ہے کہ وہ لوگوں کو مرکز کی پالیسیوں اور منصوبوں سے، جن کی وجہ سے لوگوں کی ترقی کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، آگاہ کرے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مغربی بنگال کی بائیں محاذ حکومت نے جمہوریت کی توسیع کے لئے ہمیشہ جدوجہد کی ہے، کیوں کہ جمہوریت زندگی کے تمام شعبوں کے لوگوں کے لئے ثمر آور ثابت ہوتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بائیں محاذ حکومت پر لوگوں کے اعتماد نے اس کی ذمہداریوں میں اضافہ کر دیا ہے اور اس طرح ریاستی حکومت کی روزمرہ کی سرگرمیوں سے یہ ذمہ داری عیاں ہو جائے گی۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ بائیں محاذ حکومت نے اس ریاست میں جمہوری اصولوں کو مستحکم طور پر قائم کر دیا ہے اور لوگوں کو ان کی اپنی طاقت سے آگاہ کیا ہے۔ صنعت، زراعت، تعلیم وغیرہ کے میدانوں میں بہت سارے ترقیاتی پروجیکٹوں کی مثال پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ریاستی حکومت اور لوگوں کے درمیان مستحکم طور پر اتحاد قائم ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ لوگوں کی مکمل تائید کی وجہ سے ہی مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت ترقی کی راہ پر تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔

بائیں محاذ کمیٹی کے چیئرمین شری سروج مکھرجی نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مغربی بنگال میں بائیں محاذ نے اپنی حکومت کے دسویں سال میں قدم رکھا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بہت سارے لوگوں کی قربانیوں کی وجہ سے اس ریاست میں بایاں محاذ برسر اقتدار آیا اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ اس ریاست میں بائیں اور جمہوری طاقتوں کو مستحکم بنانے کے لئے بائیں محاذ حکومت برسر اقتدار رہی۔ انہوں نے کہا کہ بائیں محاذ حکومت نے اس بات کا حلف اٹھایا ہے کہ وہ عام لوگوں کے مفادات کی حفاظت کرے گی۔ انہوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ لوگ آنے والے دنوں میں بائیں محاذ حکومت کی تائید کریں گے کیوں کہ یہ حکومت لوگوں کو چاہتی ہے، ان کی رفاہ کے لئے کام کرتی ہے اور ان کی طاقت پر بھروسہ کرتی ہے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دستوری بندشوں، مرکز کا عوام دشمن رویہ اور مالیاتی بندشوں کے باوجود بائیں محاذ حکومت نے مغربی بنگال میں بہت ساری کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ لوگوں کی متحدہ طاقت اور باہمی

دوستی نے تمام افتراق پسند طاقتوں کو دبا کر رکھ دیا ہے۔

شری بدھو دیو بھٹاچاریہ، جنہوں نے اس جشن کی صدارت کی، تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ ۹ برسوں میں مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سارے اقدامات کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ شری پربوش ٹوسور، وزیر ریاست برائے شہری ترقی نے اپنی تقریر میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس جشن میں شری کمل گوہا، وزیر زراعت شری نونی بھٹا چاریہ، وزیر آب پاشی و آب رسانی اور دیگر وزراء نے بھی تقریریں کیں۔ اس جلسہ کے شروع ہونے سے قبل شعبہ اطلاعات کے ڈائریکٹر شری پی۔ کے۔ بنرجی نے آنجہانی شری شمبھو گھوش، جن کا حال ہی میں انتقال ہوا، کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اس جشن کے قبل وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے کلکتہ انفارمیشن سنٹر میں منعقدہ "بائیں محاذ حکومت اور رفتار ترقی" پر ایک نمائش کا افتتاح کیا۔

اس ریاست کے ہر ضلع اور سب ڈویژن میں ایسے جشن منائے گئے۔ شعبۂ اطلاعات اور ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال نے ایسے جشن کا انتظام کیا۔

رابندر اسرووَر میں یہ جشن تین دنوں تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ ++

بچوں کا قومی بورڈ

مغربی بنگال کے وزیر برائے جیل اور سماجی رفاہ شری دیبابرت بندو پادھیہ کو نوتشکیل شدہ "بچوں کا قومی بورڈ" میں شامل کیا گیا ہے۔ اس بورڈ کے صدر وزیر اعظم شری راجیو گاندھی ہیں۔ یہ بورڈ ۳۱ ممبروں پر مشتمل ہے جس میں چھ مرکزی وزراء ہیں اور مغربی بنگال، پنجاب، تامل ناڈو اور راجستھان سے ایک ایک وزیر شامل ہیں۔ یہ بورڈ پورے ہندوستان میں بچوں کی رفاہ کے لئے منصوبے اور پروگراموں کی تکمیل کے کام پر نظر ثانی کرے گا۔ ++

جیل اسٹاف کیلئے رہائشی کوارٹر

ریاستی حکومت نے مغربی بنگال کے سولہ جیل اور ۲۷ ماتحتی جیل کے ملازمین اور وارڈرس کے لئے اسٹاف کوارٹر تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کوارٹروں کی تعمیر پر تقریباً ۲ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۸۸-۱۹ء تک کوارٹروں کی تعمیر کا کام مکمل ہو جائے گا۔ ریاست میں پہلی بار جیل اسٹاف کو اس طرح کی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ ++

شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب طلباء کیلئے نئے اسکالرشپ

حکومت مغربی بنگال کے شیڈولڈ کاسٹ اور ٹرائب کی رفاہ کے شعبہ نے ثانوی درجوں کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے شیڈولڈ کاسٹ اور ٹرائب طلباء کو اسکالرشپ دینے کے لئے ۸۶۷۷۲۵۰ روپئے دینے کی منظوری دی ہے ++

ہومیوپیتھک میڈیکل کالج کو عطیہ

ریاستی حکومت نے نئے ڈاکٹروں کے وظائف کی ادائیگی کے لئے ۳۱ مئی ۱۹۸۶ء تک کی مدت کے اخراجات کے لئے چار ہومیوپیتھک میڈیکل کالجوں کو ۱۴۴۱۹۰ روپئے دینے کی منظوری دی ہے ++

کھڑگپور ریاستی اسپتال میں خون بینک کا قیام

ریاستی حکومت نے مدناپور ضلع کے کھڑگپور ریاستی جنرل ہسپتال میں جدید طرز کے خون بینک کے قیام کے لئے غیر مکرر عطیہ کے طور پر ۹۵ ہزار روپیہ دینے کی منظوری دی ہے۔ مکرر اخراجات کیلئے ۲۴۵۰۰ روپئے بھی فراہم کئے گئے ++

اصلاحات آراضی ایکٹ کی دوسری ترمیم (سنہ ۱۹۸۱ء)

از: بینوئے چودھری وزیر آبپاشی و اصلاحات آراضی، حکومت مغربی بنگال

کیوں اس قانون کو نافذ کرنا پڑا

ساتویں پنجسالہ منصوبہ (سنہ ۱۹۸۰-۸۵ء) مرتب کرتے وقت اس بات کا ذکر کیا گیا تھا کہ تمام ریاستوں میں انتہائی حد سے زیادہ قطعاتِ آراضی کے قانون کے نافذ ہونے کے باوجود انتہائی حد سے زیادہ فاضل قطعاتِ آراضی کو اپنے دخل میں لانے کا کام حکومت کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ اسی لئے موجودہ قانون میں جو خامیاں ہیں انہیں دور کرنے کے لئے قانون میں حسب ضروری ترمیم لانی چاہئے اور انتہائی حد سے زیادہ قطعاتِ آراضی کے قانون کو عملی طور پر تیزی سے روبہ عمل لانا چاہئے۔ ۱۴ر جون سنہ ۱۹۷۹ء کو مرکزی وزارت زراعت کے شائع کردہ اعداد و شمار سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اسی وقت سارے ہندستان میں انتہائی حد سے زیادہ ۴۸۶۰۰۰۰ ایکڑ فاضل قطعات آراضی تھے۔ ان میں سے ۴۴۰۰۰۰۰ ایکڑ قطعات آراضی کو فاضل قطعاتِ آراضی قرار دیا گیا، اور ان میں سے ۲۳۳۰۰۰۰ ایکڑ فاضل قطعاتِ آراضی پر حکومت کو حقوقِ ملکیت حاصل ہو گئے اور ان میں سے صرف ۱۵۸۰۰۰۰ ایکڑ قطعاتِ آراضی تقسیم کئے گئے۔ اعداد و شمار کے مشہور ماہر پروشانتو مہالونبیس کے حساب کے مطابق کل ۳۵ کروڑ ایکڑ قطعاتِ آراضی میں کم سے کم ۴ لاکھ ایکڑ قطعات پر حکومت کو حقوقِ ملکیت حاصل ہو جانا چاہئے تھا۔

مغربی بنگال زمین داری حصولیابی ایکٹ کے سلسلے میں گفت و شنید کے دوران جو اعداد و شمار پیش کئے گئے تھے ان میں یہ کہا گیا تھا کہ ۱۸ لاکھ سے ۲۰ لاکھ ایکڑ تک فاضل قطعاتِ آراضی حاصل کئے جا سکتے ہیں، لیکن یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اس وقت ایک خاندان کے پاس کتنی زمین ہو سکتی ہے، اس کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ صرف زرعی زمین کی انتہائی حد ۲۵ ایکڑ تھی۔ اب فی خاندان قطعاتِ آراضی کی انتہائی حد، ان علاقوں میں جہاں آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہیں ۱۷ ایکڑ ہے۔ لیکن مقررہ حد سے زیادہ تقریباً ۳۰/۳۵ لاکھ ایکڑ فاضل قطعات آراضی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ کل ۱۳۷۰۰۰۰۰ ایکڑ قطعاتِ آراضی پر کاشتکاری کی جاتی ہے۔ لیکن ۳۱ر دسمبر سنہ ۱۹۸۰ء تک حکومت کو فاضل ۱۲۱۱۷۱۶۷۵ ایکڑ قطعات آراضی پر حقوقِ ملکیت حاصل ہو گئے۔ ان میں زمین داری حصولیابی ایکٹ کے تحت ۲۲۷۴۳۱۰۶۱ ایکڑ اور اصلاحاتِ آراضی ایکٹ کے تحت ۲۳۴۳۴۷۴۱۴ ایکڑ فاضل قطعاتِ آراضی حاصل کئے گئے تھے۔ چنانچہ یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ فی کس قطعات آراضی کی انتہائی حد مقرر کرنے اور فی خاندان قطعاتِ آراضی کی حد بندی کرنے کے باوجود اچھے نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ قانون کی مختلف خامیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، قطعاتِ آراضی کی انتہائی حد کے قانون کو پرے رکھ کر بڑے بڑے جوتدار زیادہ سے زیادہ قطعاتِ آراضی اپنے پاس رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی لئے ان خامیوں کو دور کرنے اور انتہائی حد سے زیادہ قطعات آراضی پر دخل کرنے کے لئے یہ قانون لاگو کیا گیا ہے۔

اس قانون سے ۹۹ فیصد کسان مستفید ہوں گے

سنہ ۱۹۷۰-۷۱ء کے زرعی اعداد و شمار کے مطابق پٹے یا اجارے پر دیئے گئے قطعات آراضی یعنی ہولڈنگ کی تعداد ۴۲۱۹۳۳۲۷ تھی۔ ان میں سے ۱۲ ایکڑ سے کم ہولڈنگس جہاں آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہیں، کی تعداد ۴۱۲۰۵۹۵ تھی اور ۱۲ ایکڑ سے ۱۷ ایکڑ تک کی ہولڈنگس، جہاں آبپاشی کی سہولتیں فراہم نہیں ہیں ان کی تعداد کم از کم ۵۰۰۰۰ تھی۔ ان میں سے ۲۱۷۵۹۵۱ ہولڈنگس اس قانون سے متاثر نہیں ہوں گی۔ لیکن ۴۱۰۰۰ ہولڈنگس کے مالکان اور قطعات آراضی کی انتہائی حد کے قانون سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے ہی اس قانون سے متاثر ہوں گے۔ ۹۹ فیصد کسانوں کے پاس جو باغات، تالاب اور دیگر قطعاتِ آراضی ہیں، وہ رقبہ میں انتہائی حد سے کم ہیں۔ سنہ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری سے اس صورتحال میں اور بھی تبدیلی ہوئی اور اب اور بھی کم ہولڈنگس اس قانون کے تحت آئیں گے۔

قطعاتِ آراضی کی بابت معلومات

قطعاتِ آراضی میں زرعی اور غیر زرعی دونوں زمینیں شامل ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مرکزی حکومت کے سنہ ۱۸۹۴ء کے قطعاتِ آراضی حصولیابی ایکٹ اور زمینداری دخل قانون کے دائرۂ عمل میں زرعی اور غیر زرعی دونوں زمینیں آتی ہیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اصلاحاتِ آراضی قانون، زمین داری دخل قانون کے مشابہ ہے لیکن یہاں غیر زرعی زمین کے علاوہ دیگر تمام اقسام کی زمینوں کو اس قانون کے دائرہ میں رکھا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگوں نے زرعی زمینوں کو غیر زرعی زمینوں کی طرح پیش کرکے انتہائی حد سے زائد قطعاتِ آراضی اپنے نام کر رکھا ہے۔ ضلع ۲۴ پرگنہ میں زرعی قطعاتِ آراضی میں پانی داخل کرکے، انہیں مچھلیوں کی پرورش کے لئے جھیلوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ سندر پور تھانہ کے شانگ پرتا موضع میں ۳۳ ایکڑ کی جھیل کو بڑھا کر ۲۰۲ ایکڑ پر پھیلا دیا گیا ہے۔ صرف ضلع ۲۴ پرگنہ میں ۵۳۰۰۰ ایکڑ زرعی قطعاتِ آراضی کو جھیل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ایک جائزہ کے مطابق سارے مغربی بنگال میں میٹھے پانی کے ۶۸۲۲۱۹ ایکڑ پر مشتمل جھیلوں میں گندے پانی کا کلکتہ کے آس پاس ۱۰۰۰۰ ایکڑ پر مشتمل جھیلوں میں اور نمکین پانی کے ۶۹۵۳۱۵۱ ایکڑ پر مشتمل جھیلوں میں مچھلیوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ باغات کے سلسلہ میں اضلاع مالدہ اور مرشدآباد میں جو رعایتیں دی گئی ہیں ان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہزارہا ہزار ایکڑ قطعات آراضی کو باغات کی طرح دکھا کر لوگوں نے اپنے دخل میں رکھا ہے۔

قدرتی طور پر قطعاتِ آراضی کی انتہائی حد کے قانون سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اگر باغات اور جھیلوں کی شکلوں میں انتہائی حد سے زیادہ قطعاتِ آراضی رکھنے کی اجازت دی جائے، نیز موجودہ دور کی سائنسی ترقی کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج ہر قطعہ آراضی پر کسی نہ کسی قسم کی کاشتکاری کی جا سکتی ہے۔ زرعی اور غیر زرعی قطعات آراضی کے درمیان معاشی فرق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح باغات اور جھیلوں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ جو لوگ پھلوں کے باغات لگانے یا مچھلیوں کی پرورش کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں ۵۲ بیگھہ زمین پر ایسا کرنے کی اجازت ہے لیکن کچھ لوگ یہ شور مچا رہے ہیں کہ انہیں ۵۲ بیگھہ زمین کاشتکاری کے لئے دی جائے اور اس سے زیادہ قطعات آراضی پر ماہی پروری یا باغات لگانے کی اجازت دی جائے۔ اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ سماجی جنگلات کی ہمت افزائی کرنے کے سلسلے میں اس ترمیم کی آٹھویں دفعہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

پچھلی دو مخصوص تاریخوں سے قانون کی دفعات کو روبہ عمل لانے کا سوال۔

اگر یہ بل قانون بن جائے تو اس سلسلے میں اقدامات کئے گئے ہیں کہ ۷ اگست سنہ ۱۹۶۹ء سے نافذ کر دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت سبھوں نے اس بات کا گمان

گیا تھا کہ اب تو عنقریب قطعاتِ آراضی کی انتہائی حد کا قانون لاگو ہو جائے گا اور اسی طرح لوگوں نے بھی حسبِ ضروری اقدامات کئے۔ سپریم کورٹ نے بھی ۹ رمئی سنہ ۱۹۸۰ء کو اس قانون کے حق میں اپنا فیصلہ صادر کیا۔ نیز دستور کے تحت بھی اس قانون کے سلسلہ میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگوں نے اپنے بہت سارے قطعاتِ آراضی کو "بے نامی" قطعاتِ آراضی میں تبدیل کر کے خود کو اس قانون سے باہر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ایسے پوشیدہ قطعاتِ آراضی کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے محاصل افسروں نے ۵ رمئی سنہ ۱۹۵۴ء سے کام شروع کر دیا تھا اور انہوں نے بہت سارے "بے نامی" قطعاتِ آراضی کی کھوج لگائی۔ ان کی سرگرمیوں پر اگر ہم غور کریں تو اس کی وجہ بھی ہمیں معلوم ہو جائے گی، کیوں کہ اسی تاریخ کو گزیٹ میں اس قانون کو شائع کر دیا گیا تھا کہ زمینداری حصولیابی قانون کے تحت زرعی اور غیر زرعی دونوں زمینوں پر قطعاتِ آراضی کی انتہائی حد کا قانون لاگو کر دیا گیا ہے۔ کسی کسی کو اس ایکٹ کے خلاف یہ شکایت ہے کہ اس کے نتیجے میں چھوٹے اور درمیانی درجے کے کاشتکار، جنہوں نے بڑے زمینداروں سے وہ قطعاتِ آراضی خریدے ہیں جو انتہائی حد سے زیادہ تھے، اس قانون کی زد میں آ جائیں گے۔ بہت سارے کیس اور مقدمے بھی ہوں گے، چھوٹے اور متوسط درجہ کے کسانوں نے اگر صحیح معنوں میں ایسے قطعاتِ آراضی خریدے ہیں تو اسی بات کے پیشِ نظر کہ انہیں دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے، موجودہ ترمیمی قانون کی دفعہ ۴۴ کی تحتی دفعہ ۲ میں یا مذکورہ قانون کی دفعہ (۴) ۵۲ میں ان کی دشواریوں کو دور کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس لئے انہیں ناحق پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور رہا معاملہ و مقدمہ شروع کرنے کا؟ تو خوشحال جوتدار غریب کسانوں کو مصیبت میں ڈال کر اپنے مفاد کو برقرار رکھنے کے لئے، ایک نہ ایک بہانہ سے عدالت کا سہارا لیتے ہیں۔ حقیقی برگداروں کے نام رجسٹرڈ کرنے کے لئے کئے گئے حق بجانب اور صحیح اقدامات کے خلاف ۳۰ تا ۳۲ ہزار مقدمے دائر کئے گئے ہیں۔ معاملہ مقدمہ تو ہوتے رہیں گے لیکن ہم سماجی اور ترقی یافتہ قانون مرتب کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔

برگداروں کے نام ریکارڈ میں درج کرنے سے چھوٹے کاشتکاروں کو سہولتیں

برگداروں کے نام ریکارڈس میں درج کرانے کی وجہ سے چھوٹے جوت دار مالکوں کی، ان کی ضرورت کے وقت ان کے اپنے قطعاتِ آراضی کی فروخت کے سلسلے میں دشواریوں کو دور کرنے کے لئے اس ترمیمی ایکٹ کی دفعہ ۴۳ کے تحت ریاستی اور ضلعوں کی سطح پر زمین کارپوریشن قائم کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ آبپاشی کے علاقے میں ایک ہیکٹائر اور غیر آبپاشی کے علاقہ میں ڈیڑھ ہیکٹائرس تک قطعاتِ آراضی کے مالکان، جن کے روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اس زمین کی آمدنی ہی ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ ہے، ان سہولتوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ زمین کارپوریشن زمین کی بازاری قیمت کے مطابق اتنے روپئے اس زمین کو رہن رکھ کر برگدار کو قرض دے گا۔ برگدار یہ رقم زمین کے مالک کو دے دیگا۔ پھر قرض ادا کرنے کے بعد برگدار اس زمین کا مالک بن جائے گا۔

پٹہ داروں اور برگ داروں کے لئے کوآپریٹو سوسائٹی

اس ترمیمی بل کی دفعہ ۳۶ کے تحت پٹہ داروں اور برگداروں کی مدد کرنے کے لئے کوآپریٹو سروس سوسائٹی قائم کرنے کے لئے اقدامات کئے گئے ہیں۔ کسی بھی علاقہ میں سات یا اس سے زیادہ پٹہ دار یا برگ دار، جو ایک ایکڑ زمین میں کسی بھی شرط پر کاشتکاری کرتے ہیں، ایسی سوسائٹی قائم کر سکتے ہیں۔ یہ سوسائٹی کاشتکاری میں مدد کرنے کے لئے کاشتکاری کے لئے بیل، اعلیٰ قسم کے بیج، آبپاشی کی سہولتوں کا اور آسان سود پر قرض کا انتظام کرے گی اور نیز تیار فصل کی فروخت کا اچھا بندوبست کرے گی۔ ایک تجزیے

یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ پٹہ داروں کو فی کس دو بیگھہ زمین ملی ہے۔ انہیں نئے بیل، ہل، بیج، کھاد وغیرہ کے لئے سرکار سے یا بنکوں سے کسی قسم کی امداد فراہمی کا انتظام نہ ہونے سے ان کے لئے کاشتکاری کرنی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ برگداروں کو بھی اسی طرح کی امداد کی ضرورت ہے، ورنہ یہ سب زمین کے مالکوں سے زیادہ سود پر قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس طرح قرض کے بوجھ سے وہ غلام بن جاتے ہیں۔ پٹہ داروں اور برگداروں کی ان دشواریوں کو دور کرنے کے لئے ایسی کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کرنے کے لئے پہل کیا گیا۔ بلاشبہ ان سے پٹہ دار اور برگدار بہت مستفید ہوں گے۔

زمین کے استعمال میں تبدیلی لانے کے لئے حکومت کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے

ترمیمی قانون کی دفعہ ۹ میں کہا گیا ہے کہ اصل قانون کی دفعہ ۱۴ ایم کے بعد دفعہ ۱۴ ایس کا اضافہ کرنا ہوگا۔ دفعہ ۱۴ ایس میں کہا گیا ہے کہ اگر ایک رعیت اپنی زمین کے رقبہ میں یا زمین کے استعمال میں کوئی تبدیلی لانا چاہے تو اسے اس کے لئے کلکٹر کے پاس درخواست داخل کرنی ہوگی۔ کلکٹر کی اجازت حاصل کئے بغیر زمین کے استعمال میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ حکومت کی اجازت حاصل کئے بغیر ریت کی کھدائی، اینٹ کی تیاری، دھان کھیت کو جھیل میں تبدیل کر کے مچھلیوں کی پرورش وغیرہ کا کام اتنی تیز رفتاری سے شروع ہوا ہے کہ اگر اس کی جلد روک تھام نہ کی جائے تو اس سے قومی ملکیت کا کافی نقصان ہوگا اور بہت سارے کاشتکاروں کا مستقبل برباد ہو جائے گا۔ بہت سے لوگوں نے احتجاج کیا کہ اس سے کسانوں کی دشواریوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن ایسی تشویش کی کوئی بنیاد نہیں۔ کھیتی باڑی کی زمین پر کسان اپنی رہائش کے لئے گھر، تالاب اور کنویں تعمیر کر سکتے ہیں، باغیچہ میں پودے اگا سکتے ہیں لیکن کھیتی باڑی کی زمین کو پورے طور پر دوسرے کام کے لئے استعمال میں لانے کے سلسلہ

میں حکومت سے اجازت حاصل کرنی ہوگی۔ اس بات کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے کہ ایسی منظوری حاصل کرنے میں غیر ضروری تاخیر نہ ہو اور کسانوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا نہ پڑے۔

آدی باسی اور برگداروں کو نئی سہولتیں

ترمیمی قانون کی دفعہ ۱۱ (اصل قانون کی دفعہ ۱۵) میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ برگدار جس زمین پر کھیتی باڑی کرتے ہیں، اگر اس زمین کو فروخت کرنی ہو تو برگداروں کو پہلی ترجیح دی جائے گی اور وہ اس زمین کو خرید سکتے ہیں۔ آدی باسیوں کی منتقل کردہ زمین کو واپس لینے کے لئے اس قانون کو اور بھی مستحکم اور عملی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مذہبی اور خیراتی ٹرسٹ

تفتیش کے بعد یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ بہت سارے مذہبی اور خیراتی ٹرسٹ کی آمدنی اس مقصد کے لئے خرچ نہیں کی جاتی جس کے لئے ٹرسٹ قائم کیا گیا ہے۔ اسی لئے اس بات کے پیش نظر کہ ٹرسٹ کی آمدنی مکمل طور پر ٹرسٹ کے بنیادی مقصد پر صرف کی جائے ترمیمی قانون میں ایسی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس قانون کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ٹرسٹ کے کام کاج میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ اس سلسلے میں جو شور و غل مچایا جا رہا ہے، اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

گذشتہ پانچ برسوں تک ٹال مٹول کرنے کے بعد ۱۷ مارچ ۱۹۸۶ء کو صدر ہند نے اصلاحات آراضی کی دوسری ترمیم (۱۹۸۱ء) کو اپنی منظوری دے دی۔ بلاشبہ منظوری دی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاستی حکومت سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ مندرجہ ذیل نکات میں ترمیم لائی جائے:

۱۔ چائے باغات کے لئے کتنی زمین کی ضرورت ہے، اس کا اندازہ لگاتے وقت اس بات کو بھی نظر رکھنا ہوگا کہ فی الحال چائے باغات کے تحت جو زمین ہے اس کے رقبہ کو کم کیا جائے۔

۲- موجودہ لاگو قانون کے تحت اگر کوئی اتھوریٹی قائم کی گئی ہے تو اس پر انتہائی حد کا قانون لاگو نہیں ہوگا۔

۳- کھیت مزدور اور رعیت کی املاک اور حقوق اور سرکاری خاص زمین اور ان کی حد بندی کے سلسلہ میں جو قانونی طریقہ کے لئے حکم نامہ ۹ ستمبر ۱۹۸۰ء کو (اسی دن ریاستی اسمبلی میں یہ ترمیمی بل بھی منظور ہوئی تھی) جاری کیا گیا تھا اس کا ذکر ہونا ضروری ہے۔

۴- زرعی زمین کو چھوڑ کر دیگر زمینوں کی انتہائی حد مقرر کرتے وقت منتقلی اور تقسیم کے لئے اس قانون میں حسب ضرورت دفعات کی گنجائش رکھنی چاہئے۔

۵- زمین کی غیر حقیقی منتقلی کے سلسلہ میں زمین کی حصولیابی کے قانون سنہ ۱۹۵۳ء کو روبہ عمل لانا ہوگا۔

۶- ریونیو افسر کے ذریعہ نئے سرے سے تفتیش کے دوران ، زمین کے رقبہ میں تبدیلی، حدود میں الٹ پھیر کرنے کی وجہ سے اگر کوئی واقعہ رونما ہوا یا تحریری دستاویز میں ترمیم، تبدیلی یا کی گئی یا اس طرح کی اور کوئی بات" ہو تو اس کا ذکر اسی تفتیشی رپورٹ میں ہونا چاہئے۔

۷- ضلع کلکٹر کی پہلے سے منظوری حاصل کئے بغیر کسی بھی زمین کے رقبہ، شکل، استعمال وغیرہ میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی ہے لیکن موجودہ قانون کے مطابق ملکیت کی منتقلی یا تقسیم کی وجہ سے زمین کے رقبہ میں کمی بیشی کے واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے۔

۸- ضلع کلکٹریٹ کی پہلے سے منظوری حاصل کئے بغیر زمین کا رقبہ، شکل اور استعمال وغیرہ کی تبدیلی کی بابت منظوری حاصل کرنے کا طریقہ اور قانون کی خلاف ورزی کرنے کے سلسلے میں سزا کا سلسلہ اس قانون کے نفاذ کے ساتھ ہی ساتھ جاری ہو جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

صدر ہند کی منظوری کے پانے کے بعد ۴ مارچ کو کلکتہ گزٹ میں اس ترمیمی قانون کو شائع کر دیا گیا۔ مذکورہ بالا ترمیمات کے سلسلہ میں اس بات کی پوری کوشش ہو رہی ہے کہ ایک اور ترمیمی بل پیش کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ترمیمی بل مرتب کرنے کیلئے انتظامات کئے گئے ہیں۔ اس قانون کی دیگر دفعات جن میں کوئی ترمیم لانے کی بات نہیں ہوئی ہے انہیں روبہ عمل لانے کے لئے ضروری قانون یا ضمنی قانون وغیرہ مرتب کئے جا رہے ہیں تاکہ انہیں جلد از جلد روبہ عمل لایا جا سکے اس قانون کو روبہ عمل لاتے وقت بہت احتیاط برتا جائیگا تاکہ کوئی غیر ضروری ردِ عمل رونما نہ ہو ✦✦✦

ریاستی ٹرانسپورٹ اتھوریٹی کی تشکیل

ریاستی ٹرانسپورٹ اتھوریٹی کی مندرجہ ذیل ممبروں کی شمولیت سے از سر نو تشکیل کی گئی ہے۔

۱) سکریٹری، شعبۂ نقل و حمل، حکومت مغربی بنگال جو اتھوریٹی کے چیئرمین ہوں گے۔

۲) چیف انجینیئر، شعبۂ تعمیرات عامہ (سڑک) حکومت مغربی بنگال۔

۳) پولس کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل، ٹرافک اور ریلوے، حکومت مغربی بنگال۔

۴) ریاستی حکومت کا ایک افسر جنکی اتھوریٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے تقرری ہوگی۔

۵) شری کرشنا چندر ہالدار (۶) شری شیتل چندر گانگولی (۷) شری نالینی گرہا (۸) شری بمل داس۔

مدناپور ہومیوپیتھک میڈیکل کالج کو عطیہ

ریاستی حکومت کے شعبۂ صحت و خاندانی رفاہ نے مدناپور ہومیوپیتھک میڈیکل کالج کو اس کے تدریسی اور غیر تدریسی ملازمین کی تنخواہ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ۱۱۶۵۰۰ روپے بطور غیر مکرر عطیہ دینے کی منظوری دی ہے ✦✦

اعلیٰ تعلیم کے وزیر شری شمبھو گھوش کا انتقال

آل انڈیا فارورڈ بلاک کی ریاستی کمیٹی کے ممبر اور مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ تعلیم شری شمبھو گھوش کا گزشتہ ۱۵ر جون کو جنوبی کلکتہ کے ایک نرسنگ ہوم میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۵۸ سال تھی۔

شری شمبھو گھوش عرصہ دراز سے گلے کے کینسر کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ علاج کے لئے انہیں روس، برطانیہ اور امریکہ لے جایا گیا تھا۔ جمعہ کو انہیں تنفس کی تکلیف ہو رہی تھی۔ انہیں اسی دن نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا۔ سنیچر کی رات کو ان کی حالت ابتر ہوگئی۔ اتوار کی صبح کو حرکت قلب کے بند ہوجانے کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا۔

شری شمبھو گھوش کے جسد خاکی کو ایک جلوس کی شکل میں سب سے پہلے علیم الدین اسٹریٹ میں واقع بائیں محاذ کے صدر دفتر لے جایا گیا جہاں وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو، سی پی ایم کی ریاستی یونٹ کے سکریٹری اور بائیں محاذ کے چیئرمین شری سروج مکھرجی اور ان کی کابینہ کے ساتھیوں نے انہیں گلہائے عقیدت پیش کئے۔

مغربی بنگال کے گورنر شری اوما شنکر دکشت کی جانب سے ڈاکٹر گھوش کی لاش پر پھول چڑھائے گئے۔ شری دکشت اس دن دہلی میں تھے۔

ان کے جسد خاکی کو کچھ دیر کے لئے فارورڈ بلاک کے دفتر ہیمنت بوس ایونیو بھی لے جایا گیا جہاں پارٹی ممبروں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ جلوس کی شکل میں لاش اسمبلی ہاؤس اور رائٹرس بلڈنگس بھی لے جائی گئی۔ اس کے بعد ان کی لاش ان کے آبائی گاؤں ہوگلی کے چنسورہ لے جائی گئی۔

اتوار کو ان کی موت کے سوگ میں سرکاری عمارتوں پر قومی پرچم سرنگوں کر دئے گئے۔



وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے ڈاکٹر شمبھو گھوش کی موت پر گہرے صدمے کا اظہار کیا اور انکی موت کو ایک عظیم نقصان بتایا۔ انہوں نے کہا کہ شری گھوش مغربی بنگال میں بائیں اور جمہوری تحریک کے اہم لیڈر تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۹ء کے متحدہ محاذ کے دورِ حکومت میں چھوٹی اور گھریلو صنعت کے وزیر کی حیثیت سے پھر ۱۹۷۷ء سے حکمراں بائیں محاذ کے اعلیٰ تعلیم کے وزیر کی حیثیت سے پے چیدہ سے پے چیدہ مسائل کو حل کرکے یہ ثابت کردیا کہ وہ انتظامیہ کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔

شری سروج مکھرجی نے ان کے اہل و عیال اور فارورڈ بلاک کو تعزیتی پیغام بھیجا اور ان کی موت پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

سوموار کے دن انکے جسدِ خاکی کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ان کے آبائی گاؤں چنسورہ میں نذرِ آتش کر دیا گیا۔

شری شمبھو گھوش چنسورہ، ضلع ہگلی میں دسمبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی انہوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کی۔ مشہور انقلابی پروفیسر جیوتش چندر گھوش ان کے معلم تھے۔ فارورڈ بلاک کے کارکن ہونے کے ناطے ۱۹۳۹ء میں وہ نیتاجی سبھاش چندر بوس کے بہت قریب آگئے۔ ۱۹۴۸ء میں آپ کل طلبا رکانگریس کے تنظیمی سکریٹری بنے اور بعد میں اسی پارٹی کے نوجوانوں کی شاخ، کل ہند نوجوان لیگ کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ آپ فارورڈ بلاک کی ثقافتی شاخ لوک سنسکرتی سنگھ کی ریاستی کمیٹی کے بھی صدر تھے۔

شری گھوش نے ہگلی کالج سے بی۔ اے کیا اور ۱۹۵۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ آپ نے کچھ عرصہ تک سیلجر کالج میں لکچرار کی حیثیت سے کام کیا پھر بعد میں آپ الوبڑیا کالج چلے آئے جہاں آپ شعبہ فلسفہ کے صدر بن گئے۔

شری گھوش چنسورہ اسمبلی حلقہ انتخاب سے ۱۹۶۲ء اور ۱۹۸۲ء کے درمیان ۵ بار ریاستی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ دوسری متحدہ محاذ حکومت کے دور میں دیہی اور گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کے شعبہ کے وزیر تھے اور موجودہ بائیں محاذ حکومت کے وزیر اعلیٰ تعلیم تھے۔

پروفیسر گھوش نے اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کی تنخواہ کی شرحوں میں بہتری لانے اور ان اساتذہ کو دیگر سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا۔ موجودہ قومی تعلیمی پالیسی کی بابت ان کے تنقیدی نظریے نے بہت سارے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرائی ÷÷÷

مضافاتی پانی سپلائی اسکیم کے لئے عطیہ

ریاستی حکومت نے موجودہ مالی سال میں اس ریاست کے ۱۲ ضلعوں میں پانی کے ذرائع جیسے ٹیوب ویل / کنویں کی از سر نو کھدائی / تبدیلی / کھدائی کے کام کے لئے ۲۵ لاکھ روپئے کی منظوری دی ہے۔ اس پروگرام کو مندرجہ ذیل ضلعوں میں روبہ عمل لایا جائے گا۔ بانکوڑا، مالدہ، جنوبی اور شمالی ۲۴ پرگنہ، ہگلی، ہوڑہ، ندیا، مرشدآباد، مدناپور، مغربی دیناج پور، بیر بھوم، بردوان اور پرولیا۔

سیاحوں کی رہائش کیلئے میونسپل ٹورسٹ لوج

کوچ بہار اور جلپائی گوڑی کے میونسپل حکام نے کوچ بہار اور جلپائی گوڑی شہروں میں سیاحوں کی رہائش کے لئے دو ٹورسٹ لوج تعمیر کئے۔ ان لوجوں میں علی الترتیب ۴۲ اور ۵۴ بستر ہوں گے۔ ان میں سیاحوں کے لئے بہت ساری سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ ایک بستر کے کمرے میں غسل خانہ بھی منسلک ہے۔ نیز بڑے بڑے کمرے بھی یہاں ہیں جہاں بہت سارے بستر ہیں۔ یہاں رہائش کے لئے سیاح ان میونسپلٹیوں کے پاس درخواست داخل کر سکتے ہیں ÷÷

عام میونسپل انتخابات ۱۹۸۶ء

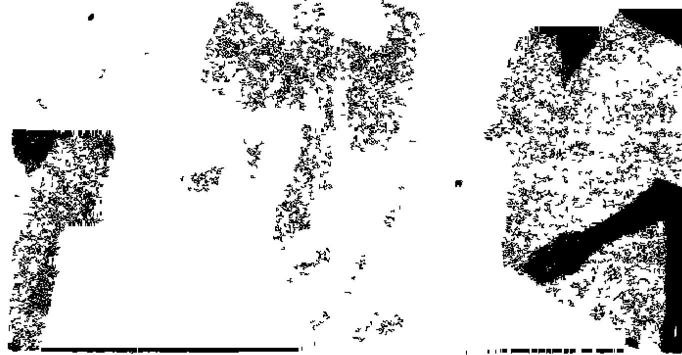
بائیں محاذ کی نمایاں کامیابی

مغربی بنگال میں کل ۹۶ میونسپلٹیاں ہیں۔ ان میں سے ۷۵ میونسپلٹیوں میں، جن میں ایک میونسپل کارپوریشن بھی شامل ہے، ۱۵ر جون کو عام انتخابات ہوئے جن میں ۹۵۲۴ امیدواروں نے حصہ لیا۔ باقی ۲۱ میونسپلٹیوں کے لئے بہت ہی جلد انتخابات ہوں گے۔ ان انتخابات میں کم و بیش ۳۲ لاکھ ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔ ان انتخابات میں نئی بات یہ ہوئی کہ پہلی بار ۱۸ سال کے نوجوانوں کو بھی ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا۔

ان انتخابات کے لئے ۳۷۰۳ پولنگ بوتھ قائم کئے گئے جہاں تقریباً ۱۵ ہزار پولنگ افراد نے جو ریاستی حکومت کے ملازمین ہیں بحسن و خوبی اپنے فرائض انجام دئے۔ ہر پولنگ بوتھ میں ووٹ ڈالنے والوں کی تعداد اوسطاً ۸۰۶ تھی۔ پولنگ صبح ۷ بجے شروع ہوئی اور ساڑھے تین بجے دن تک جاری رہی۔ ہر جگہ پولنگ کے دوران مجموعی طور پر امن و امان بحال رہا۔

ان انتخابات میں بائیں محاذ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور ۷۵ میونسپلٹیوں میں سے ۵۶ میں بائیں محاذ کو اور گیارہ میں کانگریس (آئی) کو اکثریت حاصل ہوئی۔ ایک میونسپلٹی میں آزاد امیدواروں کو اکثریت حاصل ہوئی اور سات میونسپلٹیوں میں کسی بھی پارٹی کو اکثریت حاصل نہیں ہوئی۔

ان انتخابات میں بائیں محاذ کی کامیابی پر بائیں محاذ کے چیئرمین شری سروج مکھرجی اور وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو دونوں نے مغربی بنگال کے عوام کا دلی شکریہ ادا کیا۔ شری سروج مکھرجی نے اپنے بیان میں کہا کہ چناؤ کے نتائج سے تمام پیشین گوئیاں غلط ثابت ہو گئیں۔ ووٹروں نے ریاست کی فرقہ پرست اور تفریق پسند قوتوں کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے ریاست کے لوگوں سے کہا کہ وہ سب رجعت پسند، تفریق پسند اور فرقہ پرست قوتوں کی عوام دشمن تحریک سے چوکس رہیں اور ریاست میں



مغربی بنگال میں عام میونسپل انتخابات، ۱۹۸۶ء کی پولنگ کا ایک منظر ——— تصویر: مدھوسدن گھوش

اتحاد اور پرامن جمہوری ماحول برقرار رکھیں۔

وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ انتخابات کے نتائج سے ایک بار پھر یہ ظاہر ہو گیا کہ عوام پختگی کے ساتھ بائیں بازو اور جمہوری قوتوں کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ "نتیجے نے ہمارے ہاتھ اور مضبوط کر دئے ہیں اور ذمہ داریوں میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ہم میونسپل علاقوں میں ترقیاتی پروگرام کے سلسلے میں اپنے عہد کو پورا کرنے کی پرخلوص کوشش کریں گے۔"

میونسپل انتخابات کی بابت اعداد و شمار درج ذیل ہیں:

مغربی بنگال میں میونسپلٹیوں کی تعداد	۹۶
انتخابات ہوئے	۷۵
ووٹروں کی تعداد	۲۲۵۶۴۸۱
وارڈوں کی کل تعداد	۱۲۴۱
امیدواروں کی تعداد	۴۲۵۸

امیدواروں کی تعداد پارٹی کے لحاظ سے

سی پی آئی (ایم)	۸۱۱
سی پی آئی	۱۲۶
فارورڈ بلاک	۱۰۷
آر ایس پی	۸
کانگریس (آئی)	۱۲۰۹
کانگریس (ایس)	۲
جنتا	۴۱
بی جے پی	۱۴۷
سی پی آئی (ایم ایل)	۱
لوک دل	۱
آزاد	۱۷۴۸
کل	۴۲۵۸

انتخابات کے نتائج:

بایاں محاذ ــــــــ رانی گنج، کلنا، رامپورہاٹ، بولپور، بانکوڑا، رام جیون پور، کھرپال، کھوار، کھڑگپور، چندن نگر کارپوریشن، تارکیشور، جاپدانی، کون نگر، رشڑا، بدیا باٹی، اتر پاڑہ، آرام باغ، چنسورہ، بانس بڑیا، بالی، جلپائی گوڑی، اولڈ مالدہ، کلیمپونگ، بلوربگھاٹ، رائے گنج، کوچ بہار، دین ہاٹا، پرولیا، پالاشہر، گرولا، بارکپور، جگت پاڑا، ٹیٹاگڑھ، نئی ہاٹی، بیگم پور، نارتھ ڈم ڈم، ساؤتھ ڈم ڈم، بارا نگر، چندر کونا، بادوریا، شمالی بارکپور، نا رائے پور، برآئی پور، بابا سات، بشیر ہاٹ، بج بج، کنچراپاڑہ، راناگھاٹ، نوادیپ، بیرنگر، شانتی پور، گوبر ڈانگا۔ (کل ۵۶)

کانگریس (آئی): ــــــــ تملوک، برہمپور، ضیاگنج، جنگی پور، جھلدا، بنگاؤں، ابجے نگر، جھیل پور، سوری، سرامپور، کاندی، بشنو پور (کل ۱۱)۔

مذکورہ ۷۵ میونسپلٹیوں اور ایک میونسپل کارپوریشن

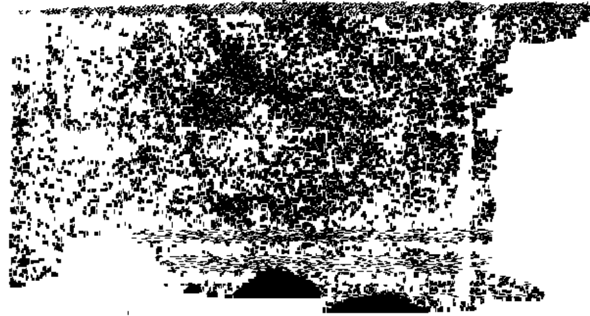


مغربی بنگال میں عام میونسپل انتخابات ۱۹۸۶ء ـ ووٹوں کی گنتی کا ایک منظر

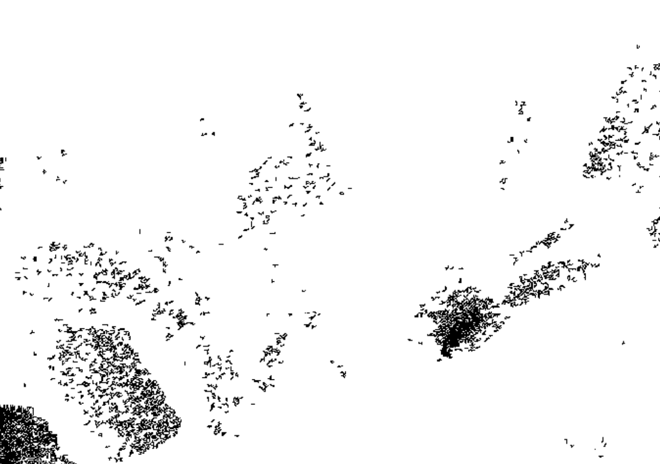
جہاں انتخابات ہوئے، کاؤنسلروں کی کل نشستیں ۱۲۴۱ ہیں۔ ان میں سے ۹۳۷ نشستوں میں بائیں محاذ کے امیدوار منتخب ہوئے اور ۲۲۳ نشستوں میں کانگریس (آئی) کے امیدوار، ۸۱ نشستوں میں دیگر پارٹیوں سمیت آزاد امیدوار منتخب ہوئے۔ ان ۱۲۴۱ نشستوں کے لئے جو امیدوار منتخب ہوئے ان میں امیدوار اگر شامل ہیں جنہیں بائیں محاذ کی مختلف پارٹیوں کی تائید حاصل تھی۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ بائیں محاذ نے ۱۲۴۱ نشستوں میں ۸۰۰ سے زیادہ وارڈوں میں کامیابی حاصل کی۔

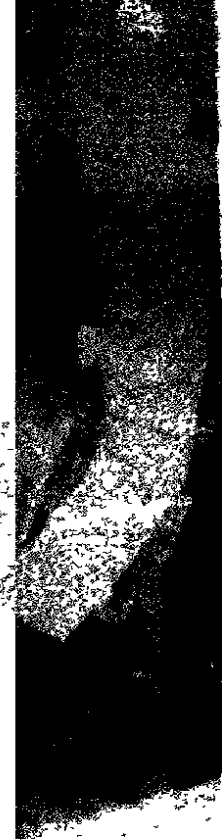
انتخابات کے ضلع وار نتائج

ضلع	میونسپلٹی	بائیں محاذ	کانگریس آئی	نہ بائیں محاذ اور نہ کانگریس (آئی) کو اکثریت حاصل ہوئی	آزاد
بردوان	۳	۳	×	×	×
بیر بھوم	۳	۱	۱	۱	×
بانکوڑا	۳	۱	۱	۱	×
مدنا پور	۸	۷	۱	—	×
ہگلی	۱۱	۹	۱	۱	×
ہوڑہ	۱	۱	×	×	×
اتر ۲۴ پرگنہ	۲۱	۱۹	۱	×	۱
دکھن ۲۴ پرگنہ	۴	۲	۱	۱	×
ندیا	۴	۴	×	×	×
مرشد آباد	۶	—	۴	۲	×
جلپائی گوڑی	۱	۱	×	×	×
مالدہ	۱	۱	×	×	×
دارجلنگ	۱	۱	×	×	×
مغربی دیناجپور	۲	۲	×	×	×
کوچ بہار	۲	۲	×	×	×
پرولیا	۳	۱	۱	۱	×
چندن نگر کارپوریشن	۱	۱	×	×	
	۷۵	۵۶	۱۱	۷	۱







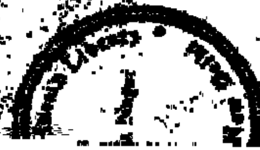


وزیر بلدیات و شہری ترقی شری پرشانتو سور ۲۴ر جون ۸۶ء کو پرمود نگر میں پناہ گزینوں کو زمین کی دلیل پیش کرتے ہوئے۔
نیچے: وزیر موصوف یو-سی-آر-سی کی قیادت میں نو آبادکاری مرکز کی تعمیراتی سرگرمیوں کا معائنہ کرتے ہوئے۔
تصویر: مدھوسودن گھوش



Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Associate Md. Alam

[illegible]
1st JULY 1986



Postal Regd. No. WB/C C-52
Vol—31 No — 13
PRICE 15 Paise

باگ بازار کلکتہ میں حکومت مغربی بنگال کا تعمیر کردہ تھیٹر گریش منچ کی افتتاحی تقریب :
اوپر — مشہور ڈرامہ نویس اور فنکار شری مون موہن رائے منچ کا افتتاح کرتے ہوئے ۔
نیچے — افتتاحی تقریب میں وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو بحیثیت مہمان خصوصی تقریر کرتے ہوئے ۔

تصویر از : اجیت داس

مغربی بنگال

۵ر جولائی ۱۹۸۶ء



مغربی بنگال

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ

مدیر : دھریندر ناتھ دت

مدیر معاون : محمد اعظم

شرح خریداری

سالانہ: تین روپے ٭ اس شمارے کی قیمت : بارہ پیسے

ترسیل زر کا پتہ

بزنس منیجر

شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور

حکومتِ مغربی بنگال

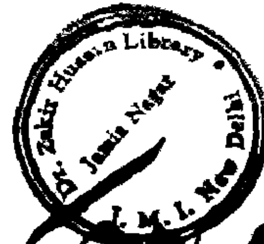
۲۳- آر، این، مکھرجی روڈ

کلکتہ - ۷۰۰۰۰۱

جلد نمبر ۳۳ ٭ ۱۵ر جولائی ۱۹۸۶ء ٭ شمارہ نمبر ۱۴



حال ہی میں صنعتی علاقوں کو آلودگی سے پاک رکھنے کے پروگرام کے تحت ہلدیا میں وزیر جنگلات شری اچنتو رائے پودا لگاتے ہوئے۔



بائیں محاذ حکومت — ترقی کی راہ پر گامزن

از: شری جیوتی باسو، وزیراعلیٰ مغربی بنگال

بائیں محاذ حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے و سال ۲۱ رجون ۱۹۸۲ء کو مکمل ہو گئے۔ ان برسوں میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے وقت جن پروگراموں کو ہم لوگوں نے پیشِ نظر رکھا تھا، انہیں پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے ہم نے مسلسل کوششیں کیں۔ ہم نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ عوامی رفاہ کے بہت سارے اقدامات کو پایۂ تکمیل تک پہونچا کر عام لوگوں کی دشواریوں کو دور کیا جائے۔

ہم لوگوں نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ ہمارے عوام کے تمام طبقوں کے جمہوری حقوق اور شہری آزادی برقرار رہے۔ ایسے حقوق اور آزادی کو، جنہیں جمہوریت میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، کانگریسی دورِ حکومت میں جبراً چھین لیا گیا تھا۔

اپنے اعلان کردہ پالیسی کے مطابق ہم لوگوں نے عوام سے انکی نمائندہ تنظیموں کے ذریعہ مسلسل رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ سیاسی نظریہ سے مرکزی حکومت نے ہمیں سماجی انصاف سے محروم رکھا ہے، اسکی وجہ سے، ساتھ ہی موجودہ سرمایہ دارانہ ـ جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے ہم جن مسائل اور دشواریوں سے دوچار ہیں، ان سے ہم عوام کو وضاحت کے ساتھ روشناس کرا رہے ہیں۔ ہمارے برسرِ اقتدار آنے سے قبل بھی برسوں تک مغربی بنگال مرکز کی نظرِ کرم سے محروم رہا۔ چند محاذوں پر چھٹی دہائی کے درمیانی عرصہ میں ہماری ریاست کی غیر تشفی بخش ترقی کی وجہ حکومت ہند کی تفریقی اور ناموافق رویہ ہے۔ ہم اس بات پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہمارے نظریے کو کم و بیش مغربی بنگال کے عوام نے تسلیم کر لیا۔

گرچہ عوام زندگی کی مختلف شعبوں میں مسلسل مسائل سے دوچار ہیں لیکن اس کے باوجود وہ سب ہماری حکومت کے ساتھ پرخلوص تعاون کر رہے ہیں۔

عوام اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر ماضی کی کانگریسی حکومتوں اور ہماری حکومت کے درمیان بنیادی فرق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہماری ریاست کی آبادی کی اکثریت کو کافی حد تک بیدار کر دیا گیا ہے اور اب وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ریاستی حکومت بنیادی تبدیلی نہیں لا سکتی، بس یہ عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے چند اقدامات کر سکتی ہے۔ عوام کی شدید ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اہم اقدامات کرنے سے کانگریسی حکومتوں نے کافی غفلت برتی ہے۔ ہمارے عوام میں اس بات کا احساس بڑھتا ہی جا رہا ہے کہ ایک حکومت، جیسی کہ ہماری ہے، مرکزی حکومت کے ناانصافی پر مبنی اور عوام دشمنی اقدامات کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتی ہے۔ ہماری حکومت پہلی حکومت ہے جس نے وفاق کے صحیح جذبہ کے تحت مرکز ـ ریاست تعلقات کو ازسرِ نو مرتب کرنے کا زبردست مطالبہ کیا ہے۔

ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ تمام جمہوری اداروں میں انتخابات منعقد کئے جائیں۔ اس ریاست میں کانگریسی حکومت نے تقریباً دو دہائی کے عرصہ میں پنچایتوں اور شہری اداروں کے لئے انتخابات نہیں کرائے۔ لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ ہماری حکومت کے تحت مقررہ عرصہ کے بعد پنچایت اور میونسپل انتخابات منعقد ہوتے ہیں۔ صرف چند دنوں قبل ۷۵ میونسپلٹیوں

میں انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں لوگوں کی بڑی اکثریت نے ہمارے حق میں ووٹ ڈالے۔ اس نے ہماری ذمہ داریوں کو اور بھی مستحکم بنا دیا ہے اور میونسپلیٹوں کے ترقیاتی پروگراموں کے سلسلے میں ہم لوگوں نے جو وعدے کئے تھے انہیں پورا کرنے کے لئے ہم بھرپور اور پرخلوص کوشش کریں گے۔

گزشتہ ۹ برسوں سے مختلف شعبوں میں ہم ترقی کی راہ پر بڑی تیزی سے گامزن ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اب لوگوں کی خود اعتمادی اور خود احترامی کی بحالی کے مثبتی نشانات رونما ہوئے ہیں۔ گزشتہ ۹ برسوں میں مغربی بنگال میں تشدد اور فسادات کے اہم واقعات رونما نہیں ہوئے۔ چند گمراہ عناصر کو، جو فسادات پھیلاتے رہتے ہیں، دبا کر رکھا گیا۔ اس ریاست میں مختلف مذہبی، لسانی اور ثقافتی فرقہ کے لوگ امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں ہریجنوں، اقلیتوں اور عورتوں کو ظلم کا نشانہ نہیں بنایا جاتا۔

زرعی اور صنعتی سیکٹروں میں چند نمایاں تبدیلی لانے کے لئے بائیں محاذ حکومت کی کوششیں ثمر آور ثابت ہوئیں۔ زراعت میں ہم نے بہت سارے اقدامات کو روبہ عمل لایا۔ اس کی وجہ سے زرعی پیداوار میں بتدریج اضافہ ہوا۔ صرف متواتر شدید خشک سالی کے دو برسوں میں پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا۔ ۸۷-۱۹۸۶ء کے لئے زرعی اجناس کی پیداوار کا نشانہ ۷۹ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا ہے۔ گزشتہ سال ہم لوگوں نے ڈچ امداد کے ساتھ مغربی بنگال میں ترائی کے پسماندہ علاقے میں ایک پروگرام شروع کیا تھا۔ اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ ان علاقوں میں زرعی پیداوار میں اضافہ ہو۔ مضافاتی ترقی کے پروگرام میں اصلاحات آراضی پر کافی زور دیا گیا ہے۔ یہ کچھ اہم کامیابی نہیں ہے کہ ۱۹۸۵ء تک ۸ر۱۰ لاکھ ایکڑ قطعات آراضی ۲ر۱۶ لاکھ غریب اور بے زمین کسانوں میں تقسیم کئے گئے۔ مستفید ہونے والوں میں شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کی تعداد نصف تھی۔ برگداروں کے نام کو ریکارڈس میں درج کرنے کا کام جاری ہے۔ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ سال کے ستمبر مہینہ کے آخر تک ۳۳ر۱۳ لاکھ برگداروں کے نام رجسٹر میں درج کئے گئے۔

دیہی ترقی کے کام میں پنچایتی ادارے بہت ہی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اسلئے انہیں دیہاتوں کی حالت میں بہتری لانے سے وابستہ تمام اہم اسکیموں اور پروگرام کی تکمیل کی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ بلاشبہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دیہی علاقوں کے مختلف مسائل کو حل کرنے میں یہ ادارے بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں، میں یہاں ان باتوں کو دہرانا چاہتا ہوں جو میں نے ۱۶ راگست ۸۵ء کو وزیراعظم کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ "ان تمام سرگرمیوں میں پنچایتوں کی کارگزاری قابل ستائش ہے، اصلاحات آراضی کے میدان میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری ریاست کو سارے ملک میں افتخار کا خصوصی مقام حاصل ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پنچایتوں کے ذریعہ عام مقامی لوگوں نے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی طرح ہماری ریاست میں کام کے لئے خوراک / قومی مضافاتی روزگار پروگرام اور مضافاتی بے زمین بے روزگار ضمانت پروگرام کی کامیابی کے ساتھ تکمیل میں عوام کی شرکت نے نمایاں کردار ادا کیا۔ منصوبہ بندی کمیشن کے اعداد و شمار کی تنظیم کی آخری رپورٹ میں یہ باتیں درج ہیں کہ مغربی بنگال میں پنچایتوں کی شرکت سے پروگراموں کی منصوبہ بندی اور تکمیل کے کام میں بہتر تال میل پیدا ہوئی ہے۔ ۸۶-۸۵ء سے بلاک سطح تک لامرکوز منصوبہ بندی کو رائج کرنے سے منصوبہ بندی کی طریقہ کار میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس تجربہ کو ہر جگہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ پورے منصوبہ بندی کے نظام میں لوگوں کو شامل کرنا ایک جرأت مندقدم ہے۔ منصوبوں میں صحیح طور پر توجہ کو مرکوز رکھنے کے لئے منصوبے مرتب کرنے میں نچلی سطح سے پہل کافی اہمیت کی حامل ہے۔ ہم ریاستی سطح سے بلاک سطحوں کے مابین مسلسل باہمی گرفت اور تال میل پر زور دیتے ہیں۔

اب مغربی بنگال کی صنعتی فضا منور ہوتی جا رہی ہے۔ چند برسوں قبل تک مغربی بنگال میں صنعتی جمود چھایا ہوا تھا اور اس کی وجہ مرکزی حکومت کی سرمایہ کاری میں کمی اور پرائیویٹ کاروباریوں کو مالیاتی اداروں سے قرض کی بہت ہی کم سہولتوں

کی فراہمی ہے۔ بہت سے کیسوں میں تو مغربی بنگال میں صنعت کاروں کو صنعتی لائسنسوں سے محروم رکھا گیا۔ ہمیں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ چند پرائیویٹ سرمایہ کار بھی مغربی بنگال میں سرمایہ کاری کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھے۔ اس ریاست میں صنعتی سرگرمیوں کا انحصار خاص طور سے حکومت ہند کی پالیسیوں اور اقدامات اور مرکزی حکومت اور عوامی مالیاتی اداروں کی سرمایہ کاری کی کمیت پر ہوتا ہے۔ بڑے صنعتی سیکٹر کے میدان میں ریاستی حکومت بہت ہی محدود کردار ادا کر سکتی ہے۔ مرکزی حکومت نے لمبے عرصہ تک مغربی بنگال سے بے التفاتی برتی، نیز مرکز نے ہمارے ساتھ بڑے مشترکہ سیکٹر کے صنعتی اداروں میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان باتوں کے پیش نظر ہم لوگوں نے متوسط درجہ کے اور بڑے پیمانہ کے صنعتی سیکٹروں میں پرائیویٹ سرمایہ کاروں کے ساتھ مشترکہ پروجیکٹوں کا خیر مقدم کیا ہے۔ ہم لوگوں نے مشترکہ سیکٹر کے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے اپنی تسلیم شدہ پالیسی پر نئے سرے سے زور دیا ہے۔ پرائیویٹ کاروباریوں اور صنعت کاروں نے ہماری اس پالیسی کا خیر مقدم کیا ہے اور اب انہوں نے ہمارے ساتھ مشترکہ سیکٹر میں ایسے پروجیکٹوں کے قیام کے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ پسماندہ علاقوں میں زیادہ تر سرمایہ کاری اور نئے افزائش مراکز کے امکانات کافی روشن ہیں۔ ہالدیہ پٹرو۔کیمیکل کومپلکس کے قیام کی راہ میں حائل اہم اہم دشواریوں کو دور کر دیا گیا ہے اور اب ہم اس پروجیکٹ کو چالو کرنے کے لئے حکومت ہند کی اجازت کے منتظر ہیں۔ سالٹ لیک، کلکتہ میں الیکٹرونکس صنعت میں مشترکہ سیکٹر اداروں نے معاشی سرگرمیوں کے نئے مواقع کی راہیں کھول دی ہیں۔ اس ریاست کے مختلف علاقوں میں مراکز افزائش کو ہماری صلاحیت کے مطابق ضروری سہولتیں فراہم کی گئی ہیں تاکہ وہ ترقی کریں اور نئے سرمایہ کاروں کو مدعو کریں۔ خاص میں برآمدات پروسیسنگ علاقہ کی بہت ہی اچھی شروعات ہوئی۔
گزشتہ نو برسوں میں دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی، جن میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار فراہم ہوتا ہے، احیائے نو اور ترقی کی رفتار قابل ذکر ہے۔ اس سیکٹر کی ترقی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ہماری حکومت ان صنعتی علاقوں میں، جن پر ہمیں خاطر خواہ اختیارات حاصل ہیں، تیزی سے اقدامات کرتی ہے۔

صنعتی شعبہ میں، ہم لوگوں نے ایک مناسب فضا کو برقرار رکھا۔ محنت کش طاقت نے ہم لوگوں میں ایک ایسی حکومت کو پایا جو ان کے کاز کی ہمدرد ہے۔ ہم لوگ مزدوروں کے جائز مطالبات کے لئے انکی جدوجہد میں ان کے پاس کھڑے ہونے کی ہمیشہ کوشش کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ اس ریاست کی معاشی ترقی میں بہت ہی نمایاں کردار ادا کریں۔ ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تنازعہ کے تصفیہ ہونے کے بعد سمجھوتے کی شرائط پر مزدور اور مالک دونوں عمل کریں۔

اس سال ہماری ریاست میں بہت ہی خلوص کے ساتھ یوم مئی کی صد سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ مزدوروں نے ایک بار پھر عہد کیا ہے کہ وہ سب اپنے اتحاد اور استحکام کو برقرار رکھیں گے۔

اس ریاست میں بجلی کی پیداوار میں اضافہ کے لئے حکومت کے کئے گئے اقدامات کی وجہ سے، بجلی کی صورت حال میں کافی بہتری ہوئی ہے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء اور ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران بجلی کی پیداوار کی تنصیبی صلاحیت میں ۱۷۰۰ سے زیادہ میگاواٹ کا اضافہ ہوا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بجلی کی پیداوار ۱۹۸۴ء کے مقابلہ میں ۱۹۸۵ء میں مسلسل زیادہ ہوئی۔ چونکہ بجلی کی مانگ میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اسلئے اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم لوگ مناسب اقدامات کر رہے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے کے چند نئے پروجیکٹوں کے تعمیراتی کام بہت جلد شروع کر دئے جائیں گے۔ اب اس بات پر بھی زور دیا جا رہا ہے کہ بجلی کی صورت حال کو مستحکم بنانے کے لئے بجلی پلانٹس کی پیداواری صلاحیت میں بہتری لائی جائے۔

تعلیم کے میدان میں ہم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ حسب معمول صورت حال کو برقرار رکھا جائے اور موجودہ صورت حال کے تحت جہاں تک ممکن ہو سکے طلباء کو تعلیمی سہولتیں

فراہم کی جا سکیں تاکہ وہ خوشگوار اور پُرامن ماحول میں اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکیں۔ ہم لوگوں نے حکومتِ ہند کی مرتب کردہ نئی تعلیمی پالیسی کی بابت اپنے خیالات کا واضح طور پر اظہار کر دیا۔ ہمارے خیال میں اس پالیسی کی بنیاد روادارانہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ سماج کے مٹھی بھر لوگوں کے مفادات کی خدمت کی جا سکے۔ ہمارے اختیارات محدود ہیں اور ہمیں بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لیکن ان کے باوجود ہم تمام شعبوں میں سرگرمیوں میں تیزی لانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ہم اس سے واقف ہیں کہ چند علاقوں میں ابھی بھی مسائل موجود ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے مسلسل اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

شاعرِ اعظم رابندر ناتھ کی ۱۲۵ویں سالگرہ کے موقع پر ہماری حکومت نے سال بھر کے لئے ایک جامع پروگرام کو اپنایا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شاعرِ اعظم کی تحریروں کے مختلف پہلوؤں کے دور رس اثرات کی اشاعت کی جائے۔ اس پروگرام کا پہلا دور خیر و عافیت سے پایۂ اختتام تک پہنچا۔ دوسرے ادوار شروع ہونے والے ہیں۔ اس موقع پر ٹیگور کے تصورات اور مطمحِ نظر سے وابستہ بہت سارے لمبے عرصہ کے پروجیکٹوں اور پروگراموں کو روبہ عمل لانے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔

اختتام سے قبل میں عوام سے پُر زور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ملک کی یکجہتی اور اتحاد کو برقرار رکھیں کیوں کہ چند شرپسند عناصر ہمارے قومی ڈھانچہ کو کمزور بنانے میں سرگرمِ عمل ہیں۔ افتراقی طاقتیں جگہ جگہ سر اٹھانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ ملک کے تمام صحیح سوچ و چار کی طاقتوں کو اس بات کا از سرِ نو عہد کرنا چاہئے کہ وہ ان تفریق پسند طاقتوں کے ناپاک ارادوں کو کچل کر رکھ دیں گے اور ملک کی یکجہتی اور اتحاد کے علم کو بلند کر کے لہرائیں گے۔

اُردو پڑھیے لکھیے اور بولیے

بقیہ: غالب کے مقطعے

میرا لاشہ بے کفن اسدِ خستہ جاں کا ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اپنے ایک عزیز کی موت پر یوں گویا ہوتے ہیں؂

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

خطوط میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

"ہندی کلام میں صرف ڈیڑھ شعر یاد آ گیا ایک مقطع اور ایک مصرعہ جو میرے حسبِ حال ہے"

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

جس خصوصیت نے ان کے اشعار میں امتیازی رنگ بھر دیا وہ شوخی اور ظرافت تھی؂

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کے طرزِ بیان کی خوبی یہ تھی کہ ایک بڑے مضمون کو ایک شعر میں ادا کر دیتے تھے بلکہ ان کے کلام میں تشبیہیں اور استعارے نئے نئے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً؂

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور؂

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

آج غالب کے ہزاروں مقطعے ہر کس و ناکس کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور روزمرہ کی بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے؂

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

★★ (شکریہ "پاسبان" چنڈی گڑھ)

بائیں محاذ حکومت کے ۹ سال

محنت کشوں کی فلاح و بہبود

لیبر پالیسی اور پروگراموں کی کامیابی

بائیں محاذ حکومت نے مغربی بنگال میں برسر اقتدار آنے کے نو سال پورے کر لئے۔ اس عرصہ میں مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے ریاستی حکومت کی لیبر پالیسی میں خاص طور پر ایک صحت مند اور مستحکم ٹریڈ یونین کی افزائش اور فروغ پر زور دیا گیا ہے، کیونکہ ایسے ٹریڈ یونین ہی محنت کش طبقہ کی ضرورتوں اور تمناؤں کو پورا کرنے کے سلسلے میں معاون ثابت ہوں گے۔ بائیں محاذ حکومت نے ریاستی لیبر مشاورتی بورڈ کی احیا نو کی اور اب اس سہ طرفی فورم میں مزدوروں کی بابت تمام اہم معاملات پر بحث کیا جاتا ہے۔ حکومت نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس ریاست میں پر امن اور سازگار صنعتی ماحول قائم رکھا جائے اور محنت کش طبقہ کے حقوق اور مفادات سے وابستہ تمام امور پر مرکزی ٹریڈ یونین تنظیموں سے بات چیت جاری رکھی جائے تاکہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر مزدوروں کو حقیقی اجرت اور تنخواہ ملے۔ ریاستی حکومت اس پالیسی پر عمل پیرا ہے کہ صنعتی تنازعات کا مختلف سطحوں پر مسلسل بات چیت کے بعد تصفیہ ہو۔ موجودہ ڈھانچہ کے تحت ایک ریاستی حکومت کو بہت ساری بندشوں کے دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے کام کرنا پڑتا ہے، لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود مغربی بنگال میں گزشتہ ۹ برسوں میں لمبے عرصے کے صنعت وار سمجھوتے ہماری لیبر پالیسی کی کامیابی کی دلالت کرتے ہیں۔ اس ریاست میں بڑی بڑی صنعتوں میں بیشتر مزدوروں کی زر نقد اجرتوں کی کم از کم شرحوں میں مسلسل اضافہ مندرجہ ذیل حقائق سے عیاں ہو جاتا ہے کہ ۱۹۷۷ء میں پاٹ، سالی کپڑے اور انجینئرنگ صنعتوں میں یومیہ اجرتیں اور دار جلنگ میں چائے باغات کے مزدوروں کی یومیہ اجرتیں علی الترتیب ۱۵ر۳۶۰ روپے، ۲۰ر۴۵ء۳ روپے، ۴۰ر۳۸۱ روپے اور ۲ر۹۲ء۳ روپے تھیں جو بڑھ کر ۱۹۸۵ء میں علی الترتیب ۸۹۹ روپے، ۹۵ر۹۳ء روپے، ۴ر۳۴ء۹ روپے اور ۸۷ر۱۰ روپے ہو گئیں۔

مرکزی حکومت کی رو بہ عمل لائی گئی معاشی اور صنعتی پالیسیوں کی وجہ سے یہ ملک شدید سماجی۔ معاشی بحران میں گھر چکا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تالابندی، بیکا، چھنٹائی وغیرہ کی وجہ سے بے روزگاری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تمام ضروری چیزوں کی قیمتوں میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ملک مسلسل افراطِ زر سے بھی دوچار ہے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے محنت کش طبقہ نے مسلسل جدوجہد سے جو مراعات حاصل کی تھیں وہ سب بے اثر ہو گئیں۔ مغربی بنگال میں آجروں کی طرف سے بڑھتے ہوئے حملوں اور اشتعال کے پیش نظر بیدار محنت کش طبقہ نے اس صورت حال کی بابت بہت ہی منصفانہ سوجھ بوجھ اور ضبط و تحمل کی نمائش کی۔ ۱۹۸۵-۸۶ء کے عرصہ میں ۱۱۳۶ تالا بندی کی وجہ سے کام کرنے کے ۲۷ر۷ کروڑ دن اور ۵۹۵ ہڑتالوں کی وجہ سے کام کرنے کے ۴۵ر۴ کروڑ دن ضائع ہوئے۔ اس بات سے یہ ظاہر ہے کہ صرف تالا بندی سے تقریباً ۷۰ فیصد کام بندی اور کام کرنے کے دن ضائع ہوئے ہیں۔

ٹریڈ یونین کے حقوق:

بائیں محاذ حکومت کا یہ پختہ اعتقاد ہے کہ آجروں کے من مانی حقوق کو دبانے، صحت مند اور ہم آہنگ صنعتی تعلقات کو برقرار رکھنے اور مالکوں سے مزدوروں کی طرف سے بات چیت کرنے کے ایک تشفی بخش نظام کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے کہ ٹریڈ یونین حقوق کی حفاظت کی جائے اور مالکوں سے بات چیت کرنے کے لئے مناسب لوگوں کو منتخب کیا جائے۔ ٹریڈ یونینس (مغربی بنگال ترمیمی) بل ۱۹۸۳ء میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ ریاستی لیبر مشاورتی بورڈ کے مشورہ سے پوشیدہ ووٹنگ کے ذریعہ بات چیت کرنے کے لئے ایجنٹ منتخب کئے جائیں اور پھر منتخب ایجنٹوں کے نام کو صدر کی منظوری کے لئے بھیج دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ حکومت ہند اس بل کی دفعات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے ۔ خاص طور پر پوشیدہ ووٹ سے وابستہ دفعہ کو ۔ لیکن یہ نظام بہت [illegible] اور جمہوری ہے اور چند صنعتی یونٹوں میں اسے کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لایا گیا ہے ۔

پاٹ صنعت :

پاٹ صنعت کے مزدور عرصہ دراز سے ایک بہت ہی مشکل صورت حال سے دوچار تھے ۔ مغربی بنگال کی ۵۵ پاٹ ملوں میں تقریباً ۲ لاکھ مزدور برسرِ روزگار ہیں ۔ یہ قدیم صنعت آج بہت ساری دشواریوں جیسی صنعت کے ذریعہ فنڈ کی منتقلی، جدید پلانٹس اور آلات کے لئے سرمایہ کاری کی کمی، مالیاتی بدنظمی، کاروبار سالمیت کی کمی، بازار کی کمی، درمیانی لوگوں اور با اثر پاٹ ملوں کے ذریعہ خام پاٹ کی ذخیرہ اندوزی، خام پاٹ کی قیمتوں میں استحکام کی کمی وغیرہ سے دوچار ہے ۔ پاٹ صنعت کو قومیانے کے سلسلے میں ریاستی حکومت کی اور اس ریاست میں تمام مرکزی ٹریڈ یونین تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں کی سفارشات کے معاملہ میں مرکز کی بےرخی سے ریاستی حکومت کو شدید خدشہ لاحق ہو گیا ہے ۔ اس صنعت کے لئے مصنوعی مابدل مصنوعات تیار کرنے کے سلسلہ میں مرکزی حکومت کی پالیسی نے مزید مسائل پیدا کر دئے ہیں ۔

ہر سال مختلف مدتوں کے لئے تقریباً ۱۵ پاٹ ملوں میں انتظامیہ کی طرف سے تالہ بندی کا اعلان کر دیا جاتا ہے ۔ یہ انتظامیہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ مزدوروں کا نقصان کر کے مزدوروں کے مسائل کو حل کیا جائے ۔ پاٹ ملوں میں تالہ بندی کو اٹھانے اور مزدوروں کے روزگار اور دیگر حقوق اور سہولتوں کے تحفظ کے لئے بائیں محاذ حکومت اور ریاستی مصالحتی ادارے مسلسل کوششیں کر رہے ہیں ۔

بونس کے معاملے میں ریاستی حکومت تنازعات کے بات چیت کے ذریعہ باہمی سمجھوتے پر یقین رکھتی ہے ۔ بہت سارے معاملات میں بونس کے سلسلے میں تنازعات کا دو طرفی سطح پر تصفیہ ہو گیا اور ایسے تنازعات جہاں ریاستی حکومت کی مصالحتی

مشینری کو مداخلت کرنی پڑی ان کی تعداد کم ہو گئی ۔ بہر حال بائیں محاذ حکومت کا یہ خیال ہے کہ قیمتوں کی بڑھتی ہوئی سطح کے پیش نظر کم از کم بونس کو ۳۳ر۸ فی صد سے بڑھا کر کم از کم ۱۰ فیصد کر دیا جائے اور ۲۰ فیصد کی انتہائی حد کو ختم کر دیا جائے ۔

کارخانوں میں مزدوروں کے تحفظ اور صحت کے لئے حسب ضروری اقدامات کرنے کے سلسلے میں نفاذ مشنری کو مستحکم بنانے کے لئے اقدامات کئے گئے ہیں ۔ کارخانوں کی نظامت میں ایک کیمیاوی شاخ قائم کرنے کی منظوری دی گئی ہے ۔ اس شاخ کے سربراہ کیمیاوی انجینئرس ہوں گے ۔ اس نظامت کی صنعتی صحت سیکشن کو بھی کارخانوں کے مزید میڈیکل انسپکٹرس کی تقرری کے ذریعہ اور بھی مستحکم بنایا جائے گا ۔ بوئیلرس نظامت کا ایک شاخ ۔ دفتر فراخاہ کے نزدیک واقع ایک علاقہ میں قائم کیا گیا ہے تاکہ فراخاہ میں سوپر تھرمل پاور پلانٹ کی جانچ کے کام میں آسانی ہو ۔ اس دفتر کے ذریعہ شمالی بنگال میں واقع دیگر بوائیلروں کی بھی جانچ کی جائے گی ۔

ملازمین کی ریاستی بیمہ اسکیم :

اس اسکیم کے تحت طبی مراعات کے انتظامیہ کی ذمہ داری ریاستی حکومت کی ہے ۔ اس اسکیم کے آغاز سے بیمہ شدہ مزدوروں اور ان کے خاندانوں کے لئے پوری طبی مراعات کی توسیع میں ماہر طبی افسروں اور نرسوں کی کمی ایک اہم مسئلہ بن چکی ہے ۔ ماہرین کی اس کمی کو کچھ حد تک پی ایس سی کے ذریعہ نئی بھرتی سے اور مختلف طبی شاخوں میں پوسٹ گراجویٹ تربیت کے لئے جنرل ڈیوٹی میڈیکل افسروں کی تقرری سے، پورا کیا جا رہا ہے ۔ مانک تلہ میں ۱۹۸۵ء میں نرسوں کے لئے ایک تربیتی مرکز قائم کیا گیا ۔ اس سے مختلف ای ایس آئی شفا خانوں اور ہسپتالوں میں نرسوں کی کمی کو دور کیا جا سکے گا ۔ ۱۲ ای ایس آئی ہسپتالوں میں، جن میں ۳۱۸۰ بستر ہیں، ۲۱ سروس شفا خانوں، ۵۰ راجیہ بیمہ اشودھ الیہ اور ۱۹۳۲ بیمہ ڈاکٹروں کے ذریعہ طبی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں ۔ اس کے علاوہ [illegible] میں مانک تلہ، کلیانی [illegible]

اور بالی گورٹی میں زچگی کے ۲۰ بستروں کا اضافہ کیا گیا ہے اور اضلاع ندیا اور شمالی چوبیس پرگنہ اور کلکتہ تبادلہ روزگار کے دفاتر کے تقریباً ۱۳٫۴ لاکھ ملازمین کو پوری طبی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

گزشتہ ۹ برسوں میں ریاستی حکومت نے اس ریاست میں تبادلۂ روزگار کے مزید ۲۲ دفاتر اور ۳۴ اطلاعات روزگار اور امداد بیورو قائم کئے۔ ضلع پرولیا کے رگھوناتھ پور میں ایک اور ضلع مالدہ کے چنچل میں ایک تبادلۂ روزگار کے مزید ۲ دفاتر کھولنے کی منظوری دی گئی ہے۔ ایسے دفاتر میں بے روزگاروں کے نام درج کئے جاتے ہیں اور ریاستی حکومت کی پالیسی کے مطابق دفاتر تبادلۂ روزگار کے ذریعہ مختلف دفاتر میں اسامیاں پُر بھی کی جاتی ہیں۔

آج مغربی بنگال میں تبادلۂ روزگار کے دفاتر میں ۴۰ لاکھ بے روزگاروں کے نام درج ہیں، جبکہ سارے ہندستان میں رجسٹرڈ بے روزگاروں کی تعداد ۲۵۰ لاکھ ہے۔ مذکورہ تعداد میں ایسے بے روزگار بھی شامل ہیں جنہیں روزگار فراہم تو ہو گیا لیکن جن کے بے روزگاری کے کارڈس کو آجروں نے تبادلۂ روزگار کے دفاتر میں واپس نہیں بھیجے۔ ایسے کارڈس حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک مہم جاری ہے۔

گزشتہ ۹ برسوں میں مغربی بنگال میں تبادلۂ روزگار کے دفاتر سے تقریباً ۱۱۵۰۰۰ بے روزگار افراد کو برسرِ روزگار کر دیا گیا۔ اس صورت حال میں مزید بہتری ہوتی اگر اس ریاست میں مرکزی حکومت کے دفاتر اور ادارے اور پرائیویٹ ادارے تبادلۂ روزگار کے دفاتر کے ذریعہ اسامیوں کی بھرتی کرتے۔

خود روزگار اسکیم:

ریاستی حکومت کے شعبۂ محنت نے ۸۶-۱۹۸۵ء کے درمیانی عرصے اضلاع کلکتہ، ۲۴ پرگنہ اور ہوڑہ میں اور دیگر ضلعوں کے ہنرکاروں میں رجسٹرڈ بے روزگاروں کے لئے خود۔ روزگار اسکیم اپنائی۔ اس اسکیم کے تحت ایک پروجیکٹ کے لئے ۲۵۰۰۰ روپئے ملتے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کی شرائط کو اور بھی آسان کر دیا گیا اور اس کی وسعت میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس ریاست کے زیادہ سے زیادہ بے روزگار افراد اس سے مستفید ہو سکیں۔ پروجیکٹ کے کل اخراجات کا ۲۵ فیصد ریاستی حکومت بطور امداد فراہم کرے گی۔ ۱۸ تا ۴۰ سال کی عمر کے ایک بے روزگار شخص جس کا نام ایک سال سے زیادہ عرصہ سے دفتر تبادلۂ روزگار میں درج ہے، اور جس کے خاندان کی ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہے، اب اس اسکیم کے تحت رجسٹریشن کا مستحق ہے، معذور لوگوں اور شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے لوگوں کے لئے ان شرائط میں مزید نرمی برتی گئی ہے۔ اس اسکیم میں شریک بنکوں نے ریاستی حکومت کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ یکم اپریل ۱۹۸۶ء سے اس اسکیم کو ساری ریاست میں پھیلا دیا جائے۔ اب تک اس طرح کے ۶۰۰۰ کیسوں میں سے ایک ہزار سے زیادہ کیسوں کو بنکوں نے اپنی منظوری دے دی ہے ٭٭٭

بقیہ: اصلاحاتِ اراضی

جائیں گے اور پھر ان قطعات اراضی کو بے زمین لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس ترمیمی ایکٹ کی دفعہ ۳۶ میں ایک تجویز یہ ہے کہ ایک ریاستی آراضیات کارپوریشن اور علاقائی آراضیات کارپوریشن قائم کئے جائیں گے۔ ان کارپوریشنوں سے برگدار، جن کے نام ریکارڈس میں درج ہیں، زمین کے مالکوں سے زرعی زمین خریدنے کے لئے قرض حاصل کر سکتے ہیں۔ اس ایکٹ کی دفعہ میں ایک امداد باہمی عام خدمات سوسائٹی قائم کر سکنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ یہ سوسائٹی چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی کے مالکوں کو قرض اور دیگر سہولتیں فراہم کر سکتی ہے ٭٭٭

مغربی بنگال نرسنگ کونسل کو عطیہ

ریاستی حکومت نے حالیہ مالی سال کے دوران مغربی بنگال نرسنگ کونسل کو اس کے مناسب اخراجات کے لئے غیر مکرر عطیہ کے طور پر ۴۰ ہزار روپئے دینے کی منظوری دی ہے ٭٭

بائیں محاذ حکومت کے نو سال

اصلاحات آراضی

بائیں محاذ حکومت کے اصلاحات آراضی پروگرام کے اہم مقاصد یہ ہیں کہ پیداوار کے جاگیردارانہ اور نیم جاگیردارانہ نظام کو ختم کردیا جائے، زرعی پیداوار کی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کیا جائے اور کاشتکاری کو صحیح مقام پر بحال کیا جائے۔

سنہ ۱۹۷۷ء سے بائیں محاذ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے مضافاتی ترقی کے میدان میں جامع ترقیاتی اقدامات کو روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ سنہ ۱۹۵۳ء اور سنہ ۱۹۵۵ء کے زمینداری موقوفی ایکٹ کے نفاذ کے بعد سے اصلاحات آراضی دو دہائی سے زیادہ عرصہ سے نافذ ہے لیکن اس قانون کی دفعات اور ان کے اطلاق کے درمیان کافی فرق ہے۔ برسر اقتدار آنے کے بعد بائیں محاذ حکومت نے ان قوانین کو روبہ عمل لاکر اس صورت حال کو تبدیل کرنے کا عزم کیا۔ گذشتہ ۹ برسوں سے اس بات کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے کہ انتظامیہ میں بہتری لائی جائے تاکہ اصلاحات آراضی کے قوانین کی دفعات کو مناسب طور پر نافذ کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی اصلاحات آراضی کے پروگراموں کو روبہ عمل لانے کے لئے ہر علاقہ میں کسانوں کی تنظیموں کے تعاون اور پنچایتوں کی سرگرم شرکت حاصل کی گئی۔ اس ریاست میں پہلی بار ترقیاتی پروگراموں میں لوگوں کی اور لوگوں کے نمائندوں کی براہ راست شرکت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

اصلاحات آراضی پروگرام کا پہلا مقصد یہ ہے کہ آراضیات کی ملکیت اور آراضی کے نظام میں حسب ضروری تبدیلی لاکر مضافاتی معاشی ڈھانچہ میں تفرق اور بے ضابطگی کو کچھ حد تک دور کردیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر ایک جامع کثیر المقاصد پروگرام کو روبہ عمل لایا گیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت بے زمین کسانوں کے درمیان فاضل قطعات آراضی تقسیم کئے گئے اور برگداروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اقدامات کئے گئے۔ نیز برگداروں اور قطعات آراضی کے نئے مالکوں کو حسب ضرورت زرعی ساز و سامان فراہم کئے گئے، نیز انہیں ادارہ جاتی قرض بھی فراہم کئے گئے۔ مضافات میں بسنے والے چند طبقوں کے لوگوں کو ان قطعات آراضی کے، جہاں ان کے مکانات ہیں اور جہاں وہ رہتے ہیں، حقوق ملکیت دے دئے گئے ہیں۔ موجودہ حکومت کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس ریاست میں قانون کے تحت قطعات آراضی کی انتہائی حد سے زیادہ فاضل قطعات آراضی کی کھوج لگائی جائے اور انہیں حکومت کے حوالے کردیا جائے۔ اگر اس کام کو تیزی سے روبہ عمل نہ لایا جائے تو بیشتر سارے مفاد پرست اس رائج قانون کو پس انداز کرکے انتہائی حد سے گریز کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس بات کے پیش نظر انتظامیہ ان لوگوں کے خلاف جنہوں نے چاپلوسی سے فاضل قطعات آراضی کو اپنے پاس رکھا ہے قانونی اقدامات کرنے میں مصروف عمل ہے۔ انتہائی حد سے زیادہ قطعات آراضی کی کھوج لگانے کے کام میں پنچایتوں کی مدد بھی لی جارہی ہے۔ اب تک انتہائی حد کے دو قوانین کے تحت انتظامیہ کی مسلسل کوششوں کے ذریعہ ۲۱٫۵ لاکھ ایکڑ زرعی زمین کے حقوق ملکیت حکومت کو حاصل ہوگئے ہیں۔

ان قطعات آراضی جن کے حقوق ملکیت حکومت کو حاصل ہوگئے ہیں ان کی تقسیم کے سلسلہ میں حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے قطعات آراضی بے زمین کسان کو دئے جائیں تاکہ وہ خود کفیل بن جائے۔ اگر ان کسانوں کو زرعی ساز و سامان اور مضافاتی قرض دئے جائیں تو ان قطعات آراضی میں پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے اس کے علاوہ ان غریب کسانوں کو ذرائع روزگار کے ذرائع جیسے مویشیوں کی پرورش، ماہی گیری، شجرکاری وغیرہ بھی فراہم کئے گئے۔ ان تمام اقدامات کا مقصد یہ ہے کہ ان کی معاشی ترقی ہو اور اس ترقی کی رفتار تیز تر ہو۔ پنچایتیں بھی اسی کام میں سرگرم عمل ہیں۔ مشترکہ کوششوں سے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء تک ۸٫۱۳ لاکھ ایکڑ قطعات آراضی جن کے حقوق ملکیت حکومت کو حاصل

ہوگئے ۔ ۲۰ر۱۷ لاکھ کسانوں کے درمیان تقسیم کئے گئے ۔ یہاں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے کہ ان کسانوں میں ۵۵ فیصد کسان شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے ہیں ۔

برگداروں کے حقوق کا تحفظ اور اس بات کا خیال رکھنا کہ برگدار محفوظ طریقے سے کاشتکاری کر سکیں اس پالیسی کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے ۔ اس مقصد کے پیش نظر ۱۹۷۸ء کے بعد سے برگداروں کے نام کو ریکارڈس میں درج کرنے کے کام کو اعلیٰ ترین ترجیح دی گئی ۔ ۱۹۷۷ء میں صرف ۳ لاکھ برگداروں کے نام ریکارڈ میں درج تھے ۔ تب ریاستی حکومت نے "آپریشن برگہ" مہم کا آغاز کیا اور ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۵ء تک ۳۹ر۱۳ لاکھ برگداروں کے نام ریکارڈس میں درج کئے گئے ۔ برگداروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اور اس بات کے لئے کہ وہ محفوظ طریقے سے کاشتکاری کر سکیں قانون میں حسب ضروری ترمیمات لائی گئیں جن کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف مضافاتی معیشت کو مستحکم بنایا جائے تو دوسری طرف برگداروں کو اس بات کی ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے اپنے قطعات آراضی سے پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کریں ۔

حکومت اس بات پر کڑی نگرانی رکھ رہی ہے کہ اصلاحات آراضی سے مستفید افراد کو بنکوں اور دیگر اداروں سے زراعتی سازوسامان ، امداد ، عطیات اور قرض وغیرہ کی سہولتیں فراہم ہوں ۔ آئی ۔ آر ۔ ڈی ۔ پی اور این ۔ آر ۔ ای ۔ پی جیسے مضافاتی ترقی کے مختلف منصوبوں کے ذریعہ پٹہ داروں (حکومت کے زیر اختیارات قطعات آراضی کی منتقل الیہ) اور برگداروں کو ترجیح دی گئی ہے ۔ ۱۹۷۸ء میں اس منصوبہ کے تحت ۵۰۰۰ لوگوں کو قرض دئے گئے جبکہ ۱۹۸۵ء کے خریف موسم میں ایسی سہولتوں سے ۲ر۵ لاکھ لوگ مستفید ہوں گے ۔

رہائشی زمین کی حصولیابی ایکٹ کے نفاذ کے سلسلے میں بھی کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے ۔ اس پروجیکٹ کے ذریعہ ۲ر۰۸ لاکھ افراد کو پنچایتوں کی مدد سے رہائش کے لئے قطعات آراضی دئے گئے ۔

شعبۂ آراضی اور اصلاحات آراضی کی مسلسل کوششوں کے ذریعہ ۱۹۸۵ء کے آخر تک اس ریاست کے شہری علاقوں میں ۴۷ر۱۱ لاکھ مربع میٹر قطعات آراضی پر ریاستی حکومت کو حقوق ملکیت حاصل ہوگئے ۔

۱۸ر جنوری ۱۹۸۲ء سے کلکتہ ٹھیکہ رعیتی ایکٹ کی وجہ سے کلکتہ اور ہوڑہ ٹھیکہ رعیتوں اور رعیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے ۔ کلکتہ کے ۲۴۰۰۰ ٹھیکہ رعیتوں اور ۹۰۰ زمین کے مالکوں سے باضابطہ رپورٹ مع اعداد و شمار حاصل کی گئی ہے ۔ ہوڑہ سے حاصل کردہ ایسی رپورٹوں کی تعداد ۴۹۰۰ ہے ۔

پرولیا اور مغربی دیناج پور کے اسلام پور سب ڈویژن میں آراضی کے ریکارڈ جس میں قبائیلیوں کے نام کے سلسلہ میں تصحیح کے کام کی رفتار کافی تشفی بخش ہے ۔ اس کام کے مکمل ہونے کے بعد قبائیلیوں کے پٹہ یا اجارہ پر دئے گئے زمین پر حقوق مستحکم ہو جائیں گے ۔

بائیں محاذ کے دور حکومت میں اصلاحات آراضی کے میدان میں بہت دوررس تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور اصلاحات آراضی کے قانون کی دفعات کے ذریعہ جہاں بھی ممکن ہو سکا سماجی انصاف کی توسیع کی گئی ۔ یہ شعبہ ابھی مضافاتی اور شہری دونوں علاقوں میں قطعات آراضی کے مناسب طور پر استعمال کی پالیسی کے تمام پہلوؤں پر غائر غور و خوض کر رہا ہے ۔ اس پالیسی کی تکمیل سے ایک متوازن معیشت کی افزائش اور ایک پرامن اور روشن مستقبل کے لئے کافی مدد ملے گی ۔

ریاستی اسمبلی نے اپریل ۱۹۸۱ء میں مغربی بنگال اصلاحات آراضی (ترمیم) بل پاس کیا تھا اور اسے منظوری کے لئے صدر کے پاس بھیج دیا گیا تھا ۔ گزشتہ پانچ برسوں سے بائیں محاذ حکومت کی مسلسل کوششوں کے ذریعہ حال ہی میں ایسے بل کو صدر کی منظوری حاصل ہوئی ۔ لیکن اس منظوری میں چند باتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کے لئے اس قانون میں چند ترمیمات کی ضرورت ہوگی ۔

بہرحال اہم نقطہ یہ ہے کہ موجودہ ترمیمی بل کے پیش نظر قطعات آراضی کی تعریف میں کافی وسعت پیدا ہو جائے گی ۔ اس سے کافی قطعات آراضی پر حکومت کو حقوق ملکیت حاصل ہو

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

غالب کے مقطع

شاکر پرشارتھی

بہ ظاہر یہ عنوان کچھ عامیانہ سا نظر آتا ہے، لیکن اس
حقیقت میں شک کی گنجائش نہیں کہ غالب کے مقطعے ادبی اور سوانحی
حیثیت سے بہت اہم ہیں۔ ان میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کا
لطف موجود ہے۔ وہ خود اپنی روئیدادِ زندگی کچھ اس طرح بیان کر
جاتے ہیں کہ یہ مقطعے ان کی خود نوشتہ منظوم سوانح عمری معلوم
ہوتے ہیں۔ یہ مقطعے بعض اوقات ہنگامہ آرائی کا سبب ہوئے۔
مثلاً مرزا غالب نے جب شہزادہ جواں بخت کا سہرا کہا تو مقطع
پر ہنگامہ بپا ہو گیا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ اور استادِ شہ کو یہ ناگوارِ خاطر ہوا۔ چنانچہ
مرزا کو معذرت کرنا پڑی کہ ؎

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

لیکن غالب بھی بات کے دھنی تھے اور اپنی بات پھر
مقطع میں کہہ گئے ؎

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اسی طرح مرزا جعفر کی شادی پر ایک قطعۂ تاریخ
آپ نے لکھا جس میں کہا ؎

ہوئی جب مرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالب نے تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"

"انشراحِ جشنِ جمشید" سے مرزا جعفر کی شادی کا سن
۱۲۷۰ ہجری نکلتا ہے۔

غالب نے اکثر اپنے مقطعے میں ممدوحین کا ذکر کیا ہے
جن میں بادشاہ، امراء، شعراء سبھی شامل ہیں۔ بہادر شاہ نے
ذوق کے رحلت کر جانے کے بعد اپنا کلام مرزا کو دکھانا شروع کیا
چنانچہ غالب نے قصائد کے علاوہ اکثر غزلوں کے مقطعے میں بہادر شاہ کی
ثنا و توصیف کی ہے ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں
غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

اسی طرح ایک دفعہ جب بہادر شاہ نے بیماری سے
شفا پائی تو آپ نے کہا ؎

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

فارسی شعراء میں غالب بیدل کے بڑے مداح تھے۔
مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آباد کے رہنے والے تھے اور مرزا غالب
ان کے شیدائی تھے۔ فرماتے ہیں ؎

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیِ بیدلؔ پسند آیا

مطربِ دل نے میرے تارِ نفس سے غالبؔ
ساز پر رشتۂ پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا

بلکہ ایک جگہ تو یہاں تک فرما گئے ہیں ؎

اسدؔ قربان لطفِ جورِ بیدلؔ
خبر لیتے ہیں لیکن بے دلی سے

مگر غالبؔ کو آخر طرزِ بیدلؔ کی دشواریوں کا معترف ہونا پڑا ؎

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

اردو شاعروں کے سرتاج میر تقی میرؔ کے غالبؔ بھی معتقد تھے۔ میرؔ کے اشعار جا بجا غالبؔ کے خطوط میں ملتے ہیں اور غالبؔ میرؔ کا نام بڑے احترام اور عقیدت سے لیتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

بلکہ ایک جگہ تو اتنا فرما گئے ہیں کہ ؎

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں گا تم سے
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

غالبؔ کے مقطعے واقعات و حوادث پر کچھ اس طرح صادق آتے ہیں جیسے کہ انہوں نے پیش گوئی کی ہو اور شاید یہی سبب ہے کہ ان کے مقطعے زبان زدِ خلائق ہیں اور خود مرزا کا یہ حال تھا کہ جب کوئی واقعہ بیان کرتے تو اپنا مقطع یاد آجاتا۔ مرزا نے مرنے سے آٹھ برس پہلے اپنی تاریخِ وفات کا مادہ نکالا تھا جو ۱۲۷۷ھ نکلتا تھا۔ حسنِ اتفاق دیکھئے اسی سال شہر میں وبا آئی لیکن مرزا غالبؔ بچ گئے۔ اسی امر کی بابت خطوط میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

"قتلِ عام، لوٹ ایسی سخت اور کال ایسا پڑا تو پھر وبا کیوں نہ ہو جبکہ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اور میرے لئے ایسی وبا میں مرنا کسرِ شان تھی۔"

اسی طرح اپنے خطوط میں ایک جگہ اور رقمطراز ہوتے ہیں ؎

"ستّرہ بہترہ ترجمہ پیر خرف ہے۔ میری عمر ۷۳ سال کی ہے۔ اب یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی طور پر پرسشِ حال سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام۔ دوپہر کو گوشت کا پانی، سرِ شام تلے ہوئے کباب، سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ سامعہ باطل بہت دنوں سے تھا۔ رفتہ رفتہ اب وہ معدوم ہے۔ حرارتِ غریزی کا زوال ہے اور یہ حالت ہے کہ ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں اعتدال کہاں

اسی موقع پر ایک اور جگہ فرمایا ؎

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی کو حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ایک مشاعرے میں غزل سنائی، نواب شیفتہؔ اور صدر الدین آزردہؔ کو چھوڑ کر حاضرین میں سے کسی نے داد نہ دی۔ پھر سے مشاعرے میں صرف دو آدمیوں کی داد کے متعلق یوں کہا ؎

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

غالبؔ کی بادہ نوشی فرضی یا برائے شعر گفتنی نہ تھی بلکہ

وہ واقعی رندِ بلانوش تھے اور اس کا اقرار کھلم کھلا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

"مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں جس پر
مرتے ہیں اسی کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی
مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ
ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا تھا۔ حالانکہ
اس واقعے کو اب ۴۰ برس ہو گئے ہیں لیکن
اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں تو
کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

مرزا کی عادت تھی کہ شراب اور گلاب ملا کر پیتے تھے جیسا کہ ان کے مقطع سے ظاہر ہے ؎

آسودہ بادہ خاطرِ غالب کہ اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

شاید اپنی بادہ نوشی کی کیفیت دیکھ کر انہوں نے فرمایا ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

لہٰذا گردشِ زمانہ اور بادہ نوشی نے جب قیدِ فرنگ میں ڈال تو لباس کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تو فرمایا ؎

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یہ غالب کے ادائے بیان کی خوبی تھی کہ وہ خود اپنے کسی عزیز کی موت پر اظہارِ الم کریں یا کسی کے سفر کا ذکر کریں لیکن ان کے کلام کی کشش اور دلآویزی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مایوسی اور رنج کا بیان کرتے وقت یوں کہتے ہیں:

"نہ جزا نہ سزا، نہ نفریں نہ آفریں، نہ عدل
نہ ظلم، نہ لطف نہ قہر۔ پندرہ دن پہلے تک
دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ اب
صرف روٹی مل جاتی ہے شراب نہیں۔ نلدار کی
کے زمانے میں جس قدر کپڑا بچھونا اور اوڑھنا
گھر میں تھا سب بیچ کر کھا لیا۔ گویا اور لوگ
روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔ بے
رزق جینے کا ڈھب آ گیا ہے۔ رمضان کا
مہینہ روزے کاٹ کاٹ کر کھایا۔ آئندہ
خدا رزاق ہے۔ اگر اور کچھ کھانے کو نہ ملا
تو غم ہے اور پینے کے واسطے اشک۔
سو میاں! ہم تو بے غم ہو گئے۔ تم اپنی فکر
کرو۔" ؎

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

جب زمانہ کی بے رحمی نے ثابت کر دیا کہ دنیا میں کوئی بھی کسی کا غم خوار نہیں ہے تو فرمایا ؎

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

آخری عمر میں دنیا سے بے دلی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں اب انتہائے عمرِ ناپائیدار کو پہنچ کر
آفتابِ لبِ بام اور ہجومِ امراضِ جسمانی سے
زندہ در گور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیے
نظم و نثر کے قلم رو کا التزام ایزد تعالیٰ کی عنایت
و اعانت سے خوب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے
چاہا تو قیامت تک میرا نشان باقی اور قائم
رہے گا۔"

غالب بقول حضرتِ حافظ بہ فیضِ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

لیکن اردو میں اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ؎

مغربی بنگال میں زراعت اور آبپاشی

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta. Associate Md. Azam
Published by the Information & Cultural Affairs Dept. of Govt. of West Bengal and Printed by G. R. T. Printers, 54/1C, Shyampukur Street, Calcutta-700 004.

MAGHREBI BANGAL
15 th - July 1986

Postal Regd. No. WBC C-
Vol—33 No — 14
PRICE 15 Paise



مغربی بنگال میں ترقیاتی سرگرمیاں

اوپر : مانک چک مالدہ میں آمدورفت کے لئے پختہ سڑک
نیچے : گاجول مالدہ میں آدی باسیوں کے لئے معائی اسکول





مغربی بنگال

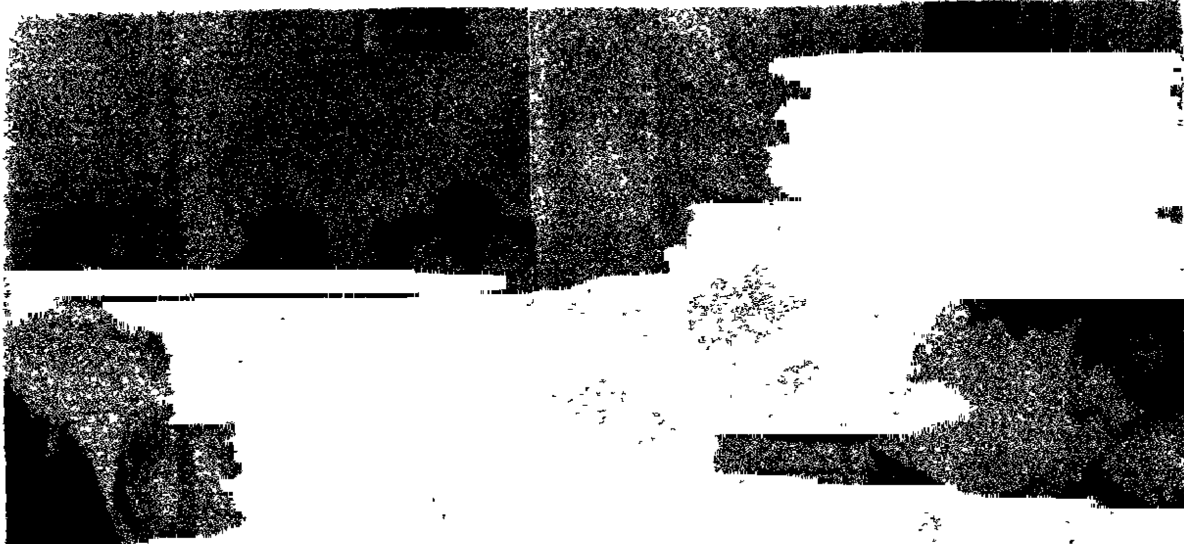
مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون: محمد اعظم

جلد نمبر ۲۳ ★ یکم اگست ۸۲ء ★ شمارہ نمبر ۱۵

شرح خریداری

سالانہ: تین روپے ★ اس شمارے کی قیمت: ۱۲ پیسے

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور۔ حکومت مغربی بنگال
۲۳۔ آر، این، مکھرجی روڈ۔ کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۰۱



مغربی بنگال کے وزیر اطلاعات و ثقافتی امور شری پربھاش پھودیکار، تریپورہ کے وزیر ثقافت شری انیل سرکار اور مشرقی ہندوستان کی ریاستوں کے نمائندے کلکتہ میں مشرقی علاقائی ثقافتی مرکز، بولپور کے سلسلے میں منعقدہ اپنی ایک نشست میں ثقافتی امور کی بابت گفت و شنید کرتے ہوئے

تم اپنی کرنی کر گزرو

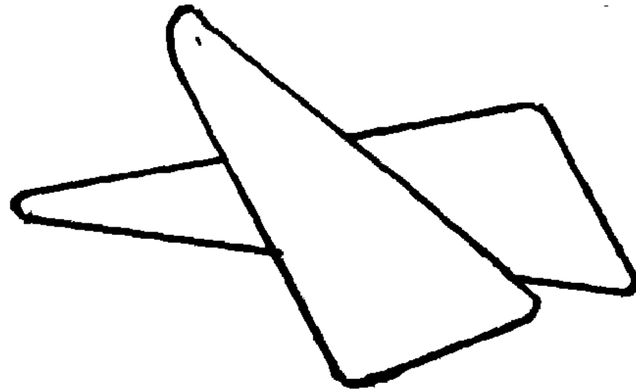


اب کیوں اس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے

یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اجڑ گئے
سو بار لٹے اور بھر پایا

اب کیوں اس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف و خطر سے در گزرو

جو ہونا ہے سو ہونا ہے
گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہوگا دیکھا جائے گا



فیض احمد فیض

مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت کے دس سال

مضافاتی ترقی

سنہ ۱۹۷۷ء میں جب مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت برسرِ اقتدار آئی تو اس وقت یہاں پوری آبادی کے تقریباً ۵۰ فیصد لوگ غربت کی سطح سے بھی نیچی سطح پر زندگی گزارتے تھے۔ انکی مالی سدھار کے بغیر مغربی بنگال میں مجموعی طور پر سماجی اور معاشی تبدیلی لانی ممکن نہ تھی، اور گزشتہ چند برسوں میں بائیں محاذ حکومت مختلف پروجیکٹوں کے ذریعہ مضافاتی غریبی کو بہت حد تک دور کرنے میں کامیاب ہوئی۔ سنہ ۸۲-۸۳ء میں قومی نمونہ جائزہ رپورٹ کے مطابق مغربی بنگال کے دیہی علاقوں میں غربت کی سطح سے بھی نیچی سطح پر رہنے والے لوگوں کی تعداد گھٹ کر ۸ر۴۳ فیصد رہ گئی۔

مضافاتی ترقی کے لئے کسی بھی منصوبہ بندی میں اصلاحاتِ آراضی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے بائیں محاذ حکومت نے دیہی ترقی کے لئے، جہاں اصلاحاتِ آراضی ایک اہم کردار ادا کر سکتی ہیں، ایک جامع نظریہ کو اپنایا ہے۔ اصلاحاتِ آراضی کا اہم مقصد یہ ہے کہ زمین پر درمیانی لوگوں کے حق کو ختم کر دیا جائے اور ان پر حقیقی کسانوں کے حقوق کو بحال کیا جائے۔ اس کام میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ قطعاتِ آراضی کی انتہائی حد سے زیادہ قطعات کی حصولیابی کے قانون کے نفاذ سے ایسے اقدامات کئے گئے ہیں کہ فاضل قطعاتِ آراضی کے سلسلہ میں حکومت کو حقوق ملکیت حاصل ہو جائیں۔ یہاں ریاستی حکومت کی کارگزاری ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے مقابلہ میں کافی شاندار ہے جبکہ سارے ہندوستان میں کل دستیاب قطعاتِ آراضی سے صرف ۲ فیصد فاضل قطعات برآمد کئے گئے جبکہ مغربی بنگال میں کل قطعاتِ آراضی کے دس فیصد فاضل قطعاتِ آراضی برآمد کئے گئے، سارے ہندوستان میں ۷ لاکھ فاضل قطعاتِ آراضی برآمد کئے۔ جبکہ صرف مغربی بنگال میں ۵ر۱۲ لاکھ ایکڑ فاضل قطعاتِ آراضی برآمد کئے گئے برآمد شدہ قطعاتِ آراضی میں سے ۸۱۰۰۰ ایکڑ قطعاتِ آراضی ۱۴۰۰۰ حاشیائی اور بے زمین کسانوں

کے درمیان تقسیم کئے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ بٹائی داروں کے نام کو رجسٹروں میں شامل کرنے کا کام تشفی بخش طور پر جاری ہے۔ سنہ ۱۹۷۷ء تک صرف ۳ لاکھ سے کچھ زیادہ برگاداروں کے نام ریکارڈس میں درج کئے گئے تھے جبکہ گزشتہ ۹ برسوں میں مزید دس لاکھ سے زیادہ ایسے برگاداروں کے نام ریکارڈس میں درج کئے گئے۔

بے زمین کسانوں کو دئے گئے قطعاتِ آراضی یا برگادار کو شرکت پر کاشتکاری کرنے کیلئے دئے گئے قطعاتِ آراضی سے پیداوار پر مکمل طور پر انحصار کرنے سے یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کا خاندان معاشی لحاظ سے خود کفیل بن جائے۔ موجودہ حکومت کی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ دیہی ترقی کے لئے حکومت کے تمام منصوبوں اور پروگراموں سے دیہی خاندان پورے طور پر مستفید ہو۔ اس مقصد کے پیشِ نظر پنچایتی تنظیموں کو اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ پروجیکٹوں کی تکمیل کے کام سے پنچایتی تنظیمیں نہ صرف براہِ راست وابستہ ہیں بلکہ مختلف مضافاتی ترقیاتی پروجیکٹوں کے سلسلے میں یہ حکومت فیصلہ کرنے اور تکمیل کے کام کی ذمہ داری پنچایتی تنظیموں کو آہستہ آہستہ سونپ رہی ہے۔ مختلف سطحوں پر سرکاری ملازمین کے سرگرم تعاون کے ساتھ پنچایتیں کام کر رہی ہیں۔

منصوبہ بندی اور منصوبہ کی تکمیل کے کام کو لامرکوز بنانے کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ کام کے لئے خوراک پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ذمہ داری پنچایتی تنظیموں کو سونپی گئی۔ بعد میں اس پروگرام کی جگہ قومی مضافاتی روزگار پروگرام نے لے لی۔ حکومت ضلع وار فنڈ فراہم کرتی ہے۔ ایسے فنڈ کے پانے کے بعد ضلع پریشد اور گرام پنچایتیں اسکیمیں مرتب کرتی ہیں اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہیں۔

گرام پنچایتیں چھوٹی اسکیموں کو اور ضلع پریشد بڑی اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ دیہاتوں کی مجموعی ترقی کے لئے بڑی بڑی سہولتیں، جیسے سڑکوں کی تعمیر، بجلی کی سپلائی، پانی کی فراہمی وغیرہ فراہم کی گئیں۔ حکومتِ ہند کے منصوبہ بندی کمیشن کی تشکیل کردہ پروجیکٹس اعداد و شمار کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق اس اسکیم کے لئے پنچایتی تنظیموں کی مرکوز اور سرگرم شرکت بہت معاون ثابت ہوئی ہے۔ قومی مضافاتی روزگار پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ مضافات

کے لوگوں کو سال بھر حسب ضرورت روزگار کے مواقع فراہم ہوں۔ اس پروگرام کا ایک اور مقصد یہ ہے کہ مختلف اسکیموں کی تکمیل کے ذریعہ مضافاتی وسائل پیدا کئے جائیں۔ گزشتہ ۹ برسوں میں "کام کے لئے خوراک پروگرام" اور "قومی مضافاتی روزگار پروگرام" کے تحت کام کرنے کے ۲۶۷۹۰۰۰۰ دن پیدا کئے گئے۔ ان دونوں پروگراموں کے تحت ۷۷-۷۸ء سے لیکر ۸۵-۸۶ء تک کتنے اخراجات ہوئے اور کام کرنے کے کتنے دن پیدا کئے جا سکے، ان کی تفاصیل درج ذیل ہیں:

کام کے لئے خوراک پروگرام کے تحت اخراجات اور کام کرنے کے دن

سال	اخراجات (لاکھ روپئے میں)	کام کرنے کے دن پیدا کئے گئے (لاکھ میں)
۷۷-۷۸ء	۱۰۴۴/۳۵	۲۱۸/۴۳
۷۸-۷۹ء	۵۲۸۲/۲۸	۵۲۳/۴۴
۷۹-۸۰ء	۴۰۱۰/۴۲	۵۴۰/۵۰
۸۰-۸۱ء	۱۶۴۲/۶۳	۲۹۲/۲۳
(۳۱ دسمبر ۸۰ء تک)	۱۱۹۷۹/۶۸	۱۵۸۴/۶۰

این آر ای پی کے تحت اخراجات اور کام کرنے کے دن

سال	اخراجات (لاکھ روپئے میں)	کام کرنے کے دن پیدا کئے گئے۔ (لاکھ میں)
۸۰-۸۱ء (۱۵ دسمبر ۸۰ء سے)	۹۷۹/۱۴	۳۶/۲۸
۸۱-۸۲ء	۱۹۳۳/۰۹	۱۹۵/۳۸
۸۲-۸۳ء	۲۴۲۳/۶۹	۳۶۰/۲۲
۸۳-۸۴ء	۲۴۱۸/۷۴	۲۸۷/۷۸
۸۴-۸۵ء	۲۲۸۵/۶۱	۲۱۱/۸۷
۸۵-۸۶ء	۲۱۹۱/۴۹	۱۰۲/۸۴
کل	۱۲۲۳۲/۰۶	۱۱۹۴/۳۷

تکمیلی مضافاتی ترقیاتی پروجیکٹ کی تکمیل کی خاص ذمہ داری پنچایت کمیٹیوں کو سونپی گئی۔ اس سلسلہ میں بلاک ترقیاتی افسر اور ان کے اسٹاف پنچایت کمیٹیوں کی مدد کرتے ہیں۔ ضلع پریشد اور ڈی۔ آر۔ ڈی۔ اے کے منصوبوں میں تال میل پیدا کرنے اور قائم رکھنے کے لئے ضلع پریشدوں کے سبھاپتی اور چند نمائندوں کو ڈی آر ڈی اے کا ممبر اور ضلع پریشد کے سبھاپتی کو چیئرمین بنا دیا گیا ہے۔

اصلاحاتِ آراضی کے میدان میں اس ریاست نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ۱۶ لاکھ بے زمین اور حاشیائی کسانوں کے درمیان قطعاتِ آراضی تقسیم کئے گئے۔ ان میں سے زیادہ تر افراد کو ایک سے دو بیگھا قطعاتِ آراضی دئے گئے۔ ان کے علاوہ ہر سال ایسے کئی لاکھ کسانوں کی تخم، کھاد اور مختصر مدت کے قرض سے مدد کی جاتی ہے۔

چھٹے منصوبہ کے پانچ سال کے اعداد وشمار درج ذیل ہیں

سال	مستفید ہونے والے خاندانوں کی تعداد	مستفید ہونے والے شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب خاندان کی تعداد	مجموعی اخراجات مع امداد (لاکھ روپئے میں)	دئے گئے قرض (لاکھ روپئے میں)	فی خاندان دی گئی رقم (روپئے میں)
۸۰-۸۱ء	۲۸۴۸۱	۱۱۸۱۹	۸۰/۵۳	۱۳۸/۶۳	۷۶۹/۵۰
۸۱-۸۲ء	۵۸۱۱۶	۲۴۰۵۵	۲۲۶/۱۶	۳۶۱/۸۳	۱۰۱۶/۰۰
۸۲-۸۳ء	۹۶۶۱۶	۳۴۵۹۷	۷۴۷/۲۸	۱۰۹۷/۴۳	۱۱۷۵/۲۳
۸۳-۸۴ء	۲۳۶۱۵۰	۹۰۹۰۸	۱۹۰۸/۵۸	۳۰۴۱/۵۵	۲۰۲۷/۰۵
۸۴-۸۵ء	۲۷۵۴۰۶	۱۰۱۸۰۶	۲۳۹۲/۲۳	۴۰۰۳/۴۱	۲۳۱۲/۳۰

جولائی ۱۹۸۵ء میں دوسرا [illegible]

بائیں محاذ حکومت کے نو سال

اعلیٰ تعلیم

قومی اور ملک کی تعمیر میں تعلیم کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے بائیں محاذ حکومت مغربی بنگال میں گزشتہ نو برسوں سے تعلیمی سہولتوں میں بہتری اور توسیع کی پالیسی کو روبہ عمل لانے کے کام میں سرگرم عمل ہے۔ تعلیم کے میدان میں ابتری کی جو فضا چھائی ہوئی تھی ۱۹۷۷ سے اس ریاست کے اساتذہ، طلبا اور تعلیم دوست لوگوں کی مدد سے ہمیشہ کے لئے دور کر دیا گیا ہے۔ اب تعلیمی اداروں کو مناسب طریقہ سے چلانے کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا کیا گیا ہے۔

اس ریاست میں اعلیٰ تعلیم کی تیز تر ترقی اس حقیقت سے عیاں ہو جاتی ہے کہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں اس مد کے تحت بجٹ میں ۸۲ء۲۷ کروڑ روپئے کی گنجائش رکھی گئی تھی اور اب ۸۶-۱۹۸۵ء میں اسی مد کے تحت ۹۵ر۸۱ کروڑ روپئے کی گنجائش رکھی گئی۔ اس طرح کالجوں کی تعداد ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۲۸۰ تھی جو بڑھ کر ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۳۲۸ ہو گئی۔

سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقوں کے لوگوں کے لئے نیز ان لوگوں کے لئے بھی جو اپنی معاشی، سماجی بدحالی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہیں، ریاستی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ریاست میں ایک کھلی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک بل مغربی بنگال قانون ساز اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے زیر غور ہے۔

مدناپور میں ودیا ساگر یونیورسٹی نے کام کرنا شروع کر دیا ہے اور اب اس کی تعمیر کردہ تعلیمی عمارت میں باضابطہ کلاسیں منعقد ہو رہی ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے ۱۵ر جنوری ۱۹۸۶ء کو اس یونیورسٹی کا رسمی طور پر افتتاح کیا تھا۔ ضلع مدناپور میں واقع ۳۱ کالجوں کو اس یونیورسٹی سے [illegible] ہے۔

زرعی مسائل میں ملوث نئے غیر سرکاری کالجوں کو منظور کیا گیا ہے ساتھ ہی گیارہ ڈگری کالجوں میں مستقل طور پر زرعی یا فنی کورس قائم کئے گئے ہیں۔ ۳۵ غیر سرکاری کالجوں میں نئے نئے موضوعات میں تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا ہے اور اس کے لئے ۸۰ لیکچررون کی تقرری کی گئی۔

ریاست میں انجینئرنگ اور تکنیکی تعلیم کی توسیع کے سلسلے میں بنگال انجینئرنگ کالج میں اساتذہ کی ۳۲ نئی اسامیوں اور جلپائی گوڑی سرکاری انجینئرنگ کالج کے لئے ۷ نئی اسامیوں کو منظوری دی گئی۔ سیرامک ٹکنالوجی کالج، کلکتہ اور جلپائی گوڑی انجینئرنگ کالج جلپائی گوڑی میں کمپیوٹر کی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے اقدامات کئے گئے ہیں۔ بنیادی سائنس کے لئے ایس این بوس نیشنل سنٹر کے قیام کے لئے سالٹ لیک کے علاقہ میں ۱۰ ایکڑ قطعات آراضی مفت فراہم کرنے پر ریاستی حکومت نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے۔

۸۶-۱۹۸۵ء میں بالغوں کی تعلیم کے میدان میں ۱۵ مرکزی سیکٹر مضافاتی عملی خواندگی پروجیکٹس، ۴۶ ریاستی سیکٹر مضافاتی عملی خواندگی پروجیکٹس اور دیگر ۱۰۰ ریاستی تعلیم بالغاں پروجیکٹس چلائے۔ زیر غور عرصہ میں آٹھ نئے مرکزی سیکٹر پروجیکٹس قائم کئے گئے۔

بائیں محاذ حکومت قوم کی بنیادی ثقافتی روایت میں تعلیم کے لئے فراہم سہولتوں میں مزید اضافہ کرنے کی خواہاں ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ریاستی حکومت نے کلکتہ میں کیندریہ سنسکرت ودیا پیٹھ قائم کرنے کے سلسلے میں اقدامات کرنے کے لئے پہل کی ہے۔ حکومت نے اس مجوزہ ودیا پیٹھ کے لئے ایسٹرن میٹروپولیٹن بائی پاس کے نزدیک تقریباً ۳ ایکڑ قطعات آراضی الاٹ کر دئے۔ اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ یہ ادارہ سنسکرت کالج کلکتہ میں بھی تحقیق کے کام میں مدد دیگا اور تعلیم کی سہولتوں میں بہتری لانے میں معاون ثابت ہوگا۔ یہاں اس بات کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ کیندریہ سنسکرت ودیا پیٹھ اس ریاست میں اپنی نوعیت کا انوکھا ادارہ ہے۔

اس ریاست میں جسمانی ورزش کی تعلیم کے اساتذہ کے تربیتی پروگرام کی مزید توسیع کی گئی اور اس سلسلہ میں اسی سال ودیا ساگر بیلار میں عورتوں کے لئے جسمانی ورزش کی تربیت کے لئے ایک غیر سرکاری کالج کھولا گیا۔ اس سے اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ عورتوں کے لئے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

بائیں محاذ حکومت کے نو سال

کھیل کود اور خدمات نوجوان

شعبۂ خدمات نوجوان سنہ ۱۹۷۲ء میں قائم کیا گیا تھا۔ مغربی بنگال میں بائیں محاذ حکومت کے برسرِ اقتدار آنے سے قبل اس شعبہ کے زیر غور صرف چند اسکیمیں معہ فاضل روزگار پیدا کرنے کی اسکیمیں تھیں لیکن بائیں محاذ نے اس شعبہ کو چلانے کے بنیادی نظریہ کو مکمل طور پر بدل دیا۔ اب اس شعبہ کے پروگرام شہروں اور دیہاتوں کے زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ جبکہ اس کے عمل کے میدان کو وسیع بنایا گیا ہے اس کے محدود وسائل کے اندر اس شعبہ کے بجٹ کے تحت مختص رقوم میں بھی کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ سنہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں بجٹ میں اس شعبہ کے لئے ۹۹ر۴۱ لاکھ روپے کی گنجائش رکھی گئی تھی اور اب موجودہ مالی سال میں بجٹ میں ۹۵ر۱۰۷ لاکھ روپے (جن میں ۴۲ر۳۶ لاکھ روپے این سی سی کے لئے مختص ہیں) مختص کئے گئے ہیں۔

یکم مئی سنہ ۱۹۸۵ء کو شعبۂ کھیل کود اور شعبۂ خدمات نوجوان کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا گیا ہے اور ایک شعبہ بنام شعبۂ کھیل کود اور خدماتِ نوجوان قائم کیا گیا ہے۔ اب یہ شعبہ آزادانہ طور پر اپنے فرائض کو انجام دے رہا ہے۔ اس سے قبل اس شعبہ کی دونوں شاخیں شعبۂ تعلیم کے تحت تھیں۔

تنظیم: سنہ ۷۷-۱۹۷۶ء تک شعبۂ خدمات نوجوان کے صرف ۴ بلاک سطح کے دفاتر تھے لیکن بائیں محاذ حکومت نے اس ریاست کے ہر بلاک میں ایسے دفاتر قائم کئے۔ ہر ضلع میں ضلع سطح دفتر جو اس سے قبل عالم وجود میں نہ تھے قائم کئے گئے۔ مغربی بنگال تنظیمی طاقت کا اس طرح وسیع پیمانہ پر پھیل جانا بہت ہی انوکھی بات ہے۔ بین الاقوامی نوجوان سال میں ۴۰ میونسپل علاقوں میں ایسے ۴۰ دفاتر قائم کئے گئے۔

پیشہ ورانہ تربیت: گزشتہ آٹھ برسوں میں نوجوانوں کے روزگار کے لئے خدمات نوجوان شاخ کے زیر اہتمام تقریباً ۵ کروڑ روپے معاشی قرض فراہم کئے گئے۔ اس کے نتیجہ میں تقریباً ۶۰۰۰ نوجوان ۱۵۰۰ سے زائد پروجیکٹوں کی تکمیل کے ذریعہ خود کفیل بن گئے۔ نیز اب ۵۰۰۰ سے زیادہ نوجوان زیر تربیت ہیں۔ خصوصی معاون منصوبوں کے تحت شیڈولڈ کاسٹ نوجوانوں کے لئے پیشہ ورانہ تربیت کی زیادہ تر اسکیموں کو شعبہ خدمات نوجوان نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس اسکیم کے تحت تقریباً ۵۰۰۰ نوجوانوں کو تربیت دی گئی اور اس کام پر ۹۰ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

ریاستی مرکزِ نوجوان: یوتھ سنٹر (مرکز نوجوان) سنہ ۱۹۸۱ء میں مولالی کلکتہ میں ۱۰ کٹھا زمین پر ۵۵ لاکھ روپے خرچ کر کے تعمیر کیا گیا۔ یہ سنٹر سارے ملک کے نوجوانوں کے لئے اتحاد کا مرکز بن گیا۔ ہر ضلع میں چھوٹے پیمانے میں ایسے یونٹیں تعمیر کرنے کی اسکیموں کو روبہ عمل لانے کا کام شروع کر دیا گیا۔ اضلاع مالدہ، پرولیا، مرشدآباد، ہوڑہ، ۲۴ پرگنہ (جنوب) اور ہگلی میں ایسے یوتھ سنٹر کی تعمیر کے لئے فنڈ کی فراہمی کی منظوری دے دی گئی۔

نوجوانوں کا تہوار: شعبۂ خدمات نوجوان سنہ ۱۹۷۷ء سے نوجوانوں کے تہواروں کا انتظام کر رہا ہے۔ ایسے تہوار عام طور پر ہر بلاک، ضلع اور ریاستی سطحوں پر منعقد کئے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی نوجوان سال میں میونسپل علاقوں میں بھی نوجوانوں کے تہوار منائے گئے۔ اب تک ریاستی سطح پر نوجوانوں کے چار تہوار، کلکتہ (سنہ ۱۹۷۸ء)، سلی گوڑی (سنہ ۱۹۸۰ء)، کلیانی (سنہ ۱۹۸۲ء) اور برہمپور (سنہ ۱۹۸۶ء) میں منائے گئے۔ اس سال کے ایسے تہوار میں ۲۵۷۹۱۲ نوجوانوں نے اور بلاک، ضلع اور ریاستی سطح پر اس سال کے کھیل کود کے تہوار میں تقریباً دس لاکھ نوجوانوں نے شرکت کی۔

سائنسی بیداری: شعبۂ خدمات نوجوان باضابطہ ہر ضلع میں اور ریاست میں سائنسی سیمینار کا انتظام کرتا ہے اور اب یہ سائنسی نمائشوں کا بھی انتظام کرتا ہے۔

دسمبر سنہ ۱۹۸۵ء میں اس شعبے نے یوبا بھارتی کریڑانگن، سالٹ

ایک گنگٹوک میں ریاستی سطح پر سائنس نمائش کا انتظام کیا تھا۔ بائیں محاذ حکومت نے یہاں برسر اقتدار آنے کے بعد سے اب تک برلا صنعتی اور تکنیکی عجائب خانہ کی سفارش پر ۸۲ عام سائنس کلبوں کو مالی امداد فراہم کی ہے۔ مرکزی امداد سے ۳۰ لاکھ روپئے خرچ کرکے پرولیا میں ایک مستقل سائنس مرکز بھی قائم کیا گیا ہے۔

یوتھ ہاسٹل: اب تک اس ریاست میں ۲۶ نئے یوتھ ہاسٹل اور بہار کے ضلع نالندہ میں راجگیر کے مقام پر ایک یوتھ ہاسٹل قائم کیا گیا۔ یووا بھارتی کیرنگن، سالٹ لیک میں نوجوانوں کے لئے ۴۷۹ بستروں پر مشتمل ایک یوتھ ہاسٹل تعمیر کیا گیا ہے۔ سارے ملک میں شاید یہ سب سے بڑا یوتھ ہاسٹل ہے۔

کھلی جگہ میں تھیٹر اور اجتماعی ہال:

شعبۂ خدمات نوجوان نے اس ریاست کے مضافاتی علاقوں میں کھلی جگہوں میں تھیٹر اور اجتماعی ہال تعمیر کرنے کے لئے ایک اسکیم کو اپنایا ہے۔ بلاک سطحوں پر اب تک ۱۷۰ کھلی جگہوں میں تھیٹر اور ۱۷۰ اجتماعی مراکز تعمیر کئے گئے ہیں۔

تعلیمی سیر: شعبۂ خدمات نوجوان ثانوی سطح یا اس سے اوپر کی سطحوں میں زیر تعلیم طلباء کی تعلیمی سیر کے لئے مالی امداد فراہم کرتا ہے۔ گزشتہ سال ۱۸۱۰ تعلیمی اداروں کے ۶۰۰۰۰ طلباء ایسی سہولتوں سے مستفید ہوئے۔ اس مقصد کے لئے ۳۶،۲۲ لاکھ روپئے خرچ کئے گئے۔ ایسے نوجوانوں کو بھی، جو طلباء نہیں ہیں، اس شعبہ سے ایسی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں اور اس مقصد کے لئے گزشتہ سال ۱۱ لاکھ روپئے صرف کئے گئے۔

اسکول کو آپریٹیو: اسکولوں کے طلباء میں امداد باہمی تحریک کو فروغ دینے کے لئے بائیں محاذ حکومت کے دور میں ۱۱۹ اسکول کو آپریٹیو سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔ گزشتہ آٹھ برسوں میں اس ریاست کے مختلف علاقوں میں اسکولوں میں زیر تعلیم طلباء کے لئے نصاب کی کتابوں کی لائبریریاں قائم کی گئیں۔ اس مقصد کے لئے ۶،۳ لاکھ روپئے صرف کئے گئے۔

جہالت کے خلاف جدوجہد: ضلع دارجلنگ میں ایک سو چائے باغات میں بالغوں کی تعلیم کے ۱۰۰ مراکز قائم کئے گئے۔ نیز اساتذہ کی تربیت کے لئے بھی انتظامات کئے گئے ہیں۔ ضلع ہگلی کے صنعتی علاقوں میں اور آرام باغ میں بالغوں کی تعلیم کے ۱۵۰ مراکز اس شعبہ کے براہ راست زیر انتظام ہیں۔

نوجوانوں کے بین الاقوامی سال میں سماجی پروگرام:

اقوام متحدہ نے سنہ ۱۹۸۵ء کو "بین الاقوامی نوجوان سال" اعلان کرتے ہوئے تین نعرے مرتب کئے: (۱) شرکت، (۲) ترقی اور (۳) امن۔ ان نعروں کو اور بھی پُرمعنی بنانے کے لئے ریاستی حکومت نے اور تین نعروں کا اضافہ کیا: (۱) سبھوں کے لئے کام، (۲) سبھوں کے لئے تعلیم اور (۳) سبھوں کے لئے صحت۔ بین الاقوامی نوجوان سال کے دوران شعبۂ خدمات نوجوان نے بہت سارے پروگراموں کو اپنایا جن میں سے چند یہ ہیں: (۱) جائزہ پر مبنی پروگرام "اپنے علاقہ کو جانو" (۲) سالٹ لیک اسٹیڈیم کے لئے پدیاترا، (۳) سالٹ لیک سے ہلدیہ تک پدیاترا اور (۴) بین الاقوامی نوجوان سال کے دوران گیتوں کا ایک کیسٹ تیار کرنا۔

بلاک اور میونسپلٹی سطحوں سے لیکر ریاستی سطح تک ثقافتی مسابقوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مرکزی اور دیگر ریاستی حکومتوں کے مدعو کرنے پر ریاستی سطح کے مقابلہ میں کامیاب ہونے والوں میں سے چند افراد کو مختلف موقعوں پر بھیجا جاتا ہے۔ بین الاقوامی نوجوان سال کے عرصہ میں ثقافتی مسابقتی مقابلوں میں تقریباً ۲۵۸۰۰۰ لڑکے اور لڑکیوں نے شرکت کی۔

بین الاقوامی نوجوان سال منانے کے لئے ریاستی حکومت کا پروگرام شری ترتھا کار بھومی کے سوپر میراتھن ریس سے شروع ہوا۔ اس سال نو تعمیر کردہ سالٹ لیک اسٹیڈیم کو نوجوانوں کے نام منسوب کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے اس اسٹیڈیم کا نام 'یووا بھارتی کیرنگن' رکھا۔ اس اسٹیڈیم کی طرف عام لوگوں کی توجہ مرکوز کرنے اور عام لوگوں کی تائید، جس کی اس اہم پروجیکٹ کی تکمیل میں اہم ضرورت ہے، حاصل کرنے کے لئے ۱۲ اپریل ۱۹۸۵ء کو اسٹیڈیم کے لئے پدیاترا کا انتظام کیا گیا۔ اس پدیاترا میں زندگی کے تمام طبقوں کے لوگوں نے شرکت کی۔ بین الاقوامی نوجوان سال کا ایک اہم پروگرام سالٹ لیک سے ہلدیہ تک پدیاترا تھا۔ سلی گوڑی میں ایک اسٹیڈیم جس کے ساتھ ایک یوتھ ہاسٹل منسلک ہے، گزشتہ سال چالو کر دیا گیا۔ نیز وزیر اعلیٰ نے گزشتہ سال کے

اپریل مہینہ میں برکشور میں تعمیر کردہ ایک یوتھ ہاسٹل کا افتتاح کیا۔

سیمینار: گزشتہ سال کے جون کے مہینہ میں یووا بھارتی کیر نگن میں اس شعبہ نے "اسپورٹس میں عوام کی شرکت اور اس کی آبادکاری" پر ایک سیمینار کا انتظام کیا۔ اس سیمینار کا اس وقت کے مرکزی وزیر کھیل کود اور خدمات نوجوان 'شری پی کے' جتنے چند سنگھ نے افتتاح کیا اور اس میں مختلف ریاستوں کے وزراء 'اسپورٹس تنظیموں کے نمائندے اور سرکاری افسران نے شرکت کی۔ ۲۳ر فروری ۱۹۹۱ء کو بحث و مباحثہ کے دوسرے دور کے بعد یہ سیمینار پایۂ اختتام کو پہونچا۔ اس سال ۲۲ر فروری کو ریاستی حکومت نے "یوم کھیل کود" منایا۔ اس دن بہت ہی رنگین، شاندار اور عظیم جلوس نکالا گیا۔ اس میں زندگی کے مختلف لوگوں نے شرکت کی۔ اس دن یووا بھارتی کیر نگن، سالٹ لیک میں منعقدہ ایک تقریب میں مشہور اولمپئن مسٹر ایمل زاٹوپک اور ان کی بیوی رانا زاٹوپک نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقع پر ریاستی حکومت نے چند پرانے کھلاڑیوں کا بھی استقبال کیا۔

"بین الاقوامی نوجوان سال" منانے کے لئے ریاستی سطح پر قائم کردہ کمیٹی نے یووا بھارتی کیر نگن میں گزشتہ ۴ ۲ر فروری کو دو دنوں کا سیمینار منعقد کیا۔ اس سیمینار میں شرکت کرنے کے لئے ہندستان کی ۲۲ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے، تمام قومی سیاسی پارٹیوں اور بہت ساری ممتاز ہستیوں کو مدعو کیا گیا۔

ریاستی اسپورٹس تہوار: اس سال کے فروری مہینہ میں ریاستی سطح پر شعبہ کھیل کود اور خدمات نوجوان کی ایما پر سالٹ لیک میں واقع اسپورٹس کے نیتاجی سبھاش قومی انسٹی ٹیوٹ کے احاطہ میں پہلی بار اسپورٹس مقابلہ کا انتظام کیا گیا۔

کوہ پیمائی: شعبہ کھیل کود اور خدمات نوجوان نے کلکتہ میں ۳ لاکھ روپئے خرچ کر کے کوہ پیمائی کے ساز و سامان کا ایک اسٹور قائم کیا ہے۔ ساتویں منصوبہ میں اس شعبہ کی یہ تجویز ہے کہ مغربی بنگال کوہ پیمائی بنیاد قائم کی جائے۔ یہ بنیادی ادارہ کوہ پیمائی اور دیگر مہموں کا انتظام کرے گا۔ سنہ ۸۶-۱۹۸۷ء میں اس پروجیکٹ کے لئے ۸ لاکھ روپئے منظور کئے گئے۔

قومی یکجہتی کے لئے اسکیم: اس شعبہ نے قومی یکجہتی کو مستحکم بنانے کے لئے کئی ایک اسکیموں کو روبہ عمل لایا ہے۔ سنہ ۸۶-۱۹۸۷ء کے مالیاتی سال میں اس مقصد کے لئے ۲ لاکھ روپئے مختص کئے گئے ہیں۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے ریاستوں کے مابین تبادلۂ خیال کیا جائے اور سیمینار منعقد کئے جائیں۔ ٭٭٭

بقیہ: ابتدائی تعلیم

مختلف اداروں میں جسمانی ورزش کی تعلیم کو اور بھی فروغ حاصل ہوگا۔

چونکہ تعلیم مشترکہ فہرست میں ہے اس لئے اس سے رونما ہونے والی انتظامی دشواریوں کی وجہ سے اس ریاست میں تعلیم کی توسیع اور اس میں مزید بہتری لانے کے لئے بائیں محاذ حکومت کو اپنی کوششوں میں بار بار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مالیاتی بندشوں سے ریاستی حکومت محدود حد تک کوشش کر سکتی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود بائیں محاذ حکومت اپنے اس عزم مصمم پر قائم ہے کہ وہ تمام ناخواندگی اور گندگی سے تعلیم کی دنیا کو آزاد رکھے گی اور اس ریاست میں تعلیم کی بہتری اور توسیع کے لئے اپنے طور پر تمام ممکنہ اقدامات کرے گی۔ ٭٭٭

بقیہ: ماحولیاتی آلودگی

کانوں اور اسے استعمال میں لانے والی صنعتوں میں کام کرنے والوں کے لئے اس کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ایس بیس ٹاس کو صرف ساؤنڈ پروفنگ یا فائر پروفنگ، انسولیشن یا اندرونی سجاوٹ کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اسے ہیئر اور سادہ پیپرز کو فلٹر کرنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایس بیس ٹوس کے سفوف کو پانی میں ملا کر اسکولوں میں سادہ ماڈلنگ کے کام میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

بقیہ: حالی کی سوانح نگاری

ادب میں ابھی تک نہیں گزرا۔ میری نظر میں "حیات جاوید" نہ "مدلل مداحی" ہے اور نہ "کتاب المناقب" بلکہ ایک کامیاب سوانح حیات ہے۔ ٭٭

بشکریہ "پاسبان" چنڈی گڑھ

حالی کی سوانح نگاری

"حیات جاوید" کی روشنی میں

فیروز احمد کیفی

سوانح نگاری کا فن انگریزی ادب کے توسط سے ہم
دیکھا گیا۔ پرانے زمانے میں عربی اور فارسی زبانوں میں سوانح لکھی جاتی تھیں
اردو ادب میں پہلی مرتبہ حالی نے سوانح حیات لکھی۔ سوانح نگاری کا فن
آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔

ایڈمنڈ گوسے کی رائے ہے کہ:

"Biography is a faithful portrait of a soul in its adventures through life"

سوانح نگاری کے لئے چار باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ سوانح حیات میں سچے واقعات کا ذکر ہونا چاہئے، دوسرے یہ کہ "ہیرو" کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز ہونا چاہئے، تیسرے یہ کہ سوانح حیات کے ہیرو کو سنجیدہ، مکمل اور کسی حد تک عظمت کا حامل ہونا چاہئے۔

سیبلی کا قول ہے کہ:

"The hero must be one who may be called serious, complete and of a certain magnitude"

چوتھی بات یہ ہے کہ سوانح حیات کو ادبی کسوٹی پر بھی پورا اترنا چاہئے اور سوانح نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے "ہیرو" کے متعلق پوری واقفیت رکھتا ہو تاکہ وہ اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈال سکے۔ سوانح نگار اور "ہیرو" کے درمیان ذاتی تعلقات ہوں۔ سوانح نگار کو اپنے ہیرو کے ساتھ ہمدردی ہونا لازمی ہے ورنہ سوانح حیات میں خامیاں رہ جائیں گی۔

حالی نے پانچ سوانح حیات لکھی ہیں:

1. سوانح عمری حکیم ناصر خسرو
2. حیات سعدی
3. یادگار غالب
4. حیات جاوید
5. سوانح عمری مولانا عبدالرحمن

یہاں پر میرا موضوع "حیات جاوید" ہے۔ اس لئے میں اس کی روشنی میں حالی کی سوانح نگاری کا جائزہ پیش کر رہا ہوں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ اپنے مشن میں کس حد تک کامیاب ہیں یا ناکامیاب۔

"حیات جاوید" میں حالی نے سرسید کے حالات زندگی اور کارناموں کو پیش کیا ہے۔ چونکہ حالی سرسید کے رفقاء میں تھے اس لئے انہوں نے سرسید کو قریب سے خود دیکھا تھا۔ سرسید اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اس لئے وہ سیبلی کے قول پر پورا اترتے تھے۔ حالی کی نظر میں سرسید ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ حالی اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"سرسید احمد خاں مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسان ہیں وہاں انہیں میں سے ایک بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔ اگرچہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے مشہور

وزیر اور بڑے بڑے سپہ سالار گزرے ہیں مگر
ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری
نسلوں کو درپیش ہے براہ راست کچھ رہبری نہیں
کر سکتے۔ ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے علاوہ
اس کے تو وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے
متعلق ہیں، ہمارے لئے بے سود ہوں گی۔ البتہ
سرسید کی لائف ہمارے لئے ایک ایسی مثال ہے
جس کی پیروی سے ممکن ہے کہ ہماری قوم کی یہ کٹھن
منزل جو شاید دنیا میں ظاہرا اس کی سب سے
آخری منزل ہے آسانی کے ساتھ طے ہو جائے!"

حالی نے "حیات جاوید" کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔
پہلے حصے میں انہوں نے سرسید کے خاندان اور ان کے بچپن کے حالات
لکھے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے سرسید کے عہد جوانی کا نقشہ بھی پیش کیا ہے لیکن
اس سلسلے میں کچھ حقائق سے چشم پوشی کی ہے۔ شاید وہ یہ سوچتے ہوں کہ
ان باتوں سے سرسید کی عظمت پر حرف آئے گا۔ اگر وہ ان تمام باتوں کو
لکھتے تو سوانح حیات زیادہ دلچسپ ہو جاتی جبکہ سرسید نے خود اعتراف
کیا ہے کہ انہوں نے لڑکپن میں کبڈیاں کھیلیں اور کبوتر اڑائے بلکہ ناچ
اور مجرے بھی دیکھے۔ "حیات جاوید" کے پہلے حصے میں حالی نے سرسید
کی ملازمت اور انگریزوں کی رفاقت کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور تقریباً
تین سو صفحات میں لکھا ہے۔ "حیات جاوید" کے دوسرے حصے میں حالی
نے سرسید کے کارناموں کو بیان کیا ہے۔ سرسید کی ایمانداری، دیانت
داری، بے غرضی اور آزاد خیالی پر بھی روشنی ڈالی ہے ساتھ ہی سرسید
کی مذہبی خدمات کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے "حیات جاوید"
کو ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر کا حامل بھی بنا دیا ہے۔ اس لئے "حیات جاوید"
تکنیک کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں اردو میں
Critical Biography کا رواج نہیں تھا۔ "حیات
جاوید" لکھتے وقت حالی نے ترتیب کا خیال نہیں رکھا ہے۔ پہلے حصے
میں انہوں نے سرسید کی ملکی اور قومی خدمات کو تفصیل سے بیان کیا ہے
دوسرے حصے میں اختصار سے کام لینا چاہتے تھا لیکن انہوں نے
ایسا نہیں کیا اور کتاب کی ضخامت بڑھ گئی جس کی وجہ سے قاری کو
کو اکتاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ "حیات جاوید" کی طوالت کا سبب حالی
نے یہ بتایا ہے کہ سرسید اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اس لئے ان کی تمام
خوبیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا لازمی تھا حالانکہ اس کی کوئی ضرورت
نہیں تھی۔ اگر اس کی ضرورت تھی بھی تو اس کا ذکر بار بار کرنا مناسب نہیں
تھا دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے سرسید کے عیوب کو بیان کرنے سے
گریز کیا ہے۔ مولانا شبلی نے "حیات جاوید" پر سخت نکتہ چینی کی ہے
انہوں نے حیات جاوید کو "مدلل مداحی" اور "کتاب المناقب" کہا ہے۔
اگر "مدلل مداحی" سے اتفاق بھی کیا جائے تو "حیات جاوید" کو "کتاب
المناقب" کہنا قطعی درست نہیں ہے۔ میرے خیال میں مولانا کا یہ قول
انتہا پسندانہ ہے۔ حالی نے سرسید کے صرف اخلاقی پہلو پر ہی روشنی
نہیں ڈالی ہے بلکہ ان کے عیوب بھی بیان کئے ہیں۔ مثلاً انہوں نے سرسید
کے آخری عمر میں ضدی ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ خواہ وہ دبے لہجے میں ہی
کیوں نہ بیان کیا گیا ہو۔ مگر سوانح نگاری کا یہ اصول ہے کہ سوانح نگار کو
اپنے "ہیرو" سے عقیدت رکھنا لازمی ہے۔ شبلی نے "حیات جاوید"
کو "کتاب المناقب" تو کہہ دیا ہے لیکن اس کے لئے انہوں نے کوئی
دلیل پیش نہیں کی۔ میرے خیال میں شبلی کا یہ قول نظریاتی اختلاف پر مبنی
ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں:

"اردو میں سوانح نگاری بہت سے اہل قلم نے کی
ہے مگر ان میں شاید کوئی بھی ایسا نہیں نہ تھا
جس کے پاس سوانح نگار کا دل ہو۔ سوانح نگاری
کا دل صرف حالی کے حصے میں آیا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حالی کی سوانح نگاری
میں کچھ خامیاں بھی ہیں مگر ان خامیوں کے باوجود بہت سی خوبیاں بھی
ہیں مثلاً انہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے مواد جمع کیا ہے
وہ واقعات کا خیال اور اپنے "ہیرو" سے عقیدت رکھتے ہیں۔
انہوں نے واقعات کو بیان کرتے وقت اپنی ذات کو بالکل الگ رکھا
ہے۔ ان کے انداز بیان میں تکلف اور تصنع نہیں ہے۔ تمام
واقعات بڑے ہی سادہ اور سلیس زبان میں پیش کئے گئے
ہیں۔

میری ذاتی رائے ہے کہ حالی سے اچھا سوانح نگار اردو

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ماحولیاتی آلودگی

ایس۔ سری کمار

انسان بزمِ فطرت میں کبھی اکیلا نہیں رہا اور یہ بھی اس کے بس کی بات نہیں کہ آئندہ بھی کبھی وہ فطرت سے جدا رہ سکے۔ ایک طرف تو انسانوں، حیوانات اور نباتات کے درمیان وجود کا پیچیدہ توازن درپیش ہے اور دوسری طرف غیر ذی جان اور فطرت کے لازمی عناصر بھی جن پر انسان اپنے وجود کے لئے انحصار کرتا ہے، اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کا مناسب مقام تسلیم کیا جائے اور ان کی قدر و قیمت کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔

کئی طرح سے انسان اپنے گرد و نواح کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ ٹکنالوجی میں تیزی سے در آنے والی ترقی انسانی زندگی کے معیار میں تبدیلیاں لے آئی لیکن ساتھ ہی اس نے فطرت کی نعمتوں کو بے تناسب صرف بھی کیا اور اس کے عوض فطرت کو صنعت کاری کی تمام بے مزہ مصنوعات پیش کیں۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مصنوعات اور آلات کام حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کے لئے سہولت کا باعث ہوں اور وہ پہلے کی اشیاء کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر شیشے کے مرتبان اور دوسرے برتنوں کی جگہ بڑی تیزی کے ساتھ پلاسٹک اور دوسری مصنوعی اشیاء آ رہی ہیں جو کہ سستی ہونے کی وجہ سے زیادہ سہولت بخش ہیں۔ ایسی اشیاء تیار کرنے سے ہی ماحول کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ ان کا کوڑا کباڑ جو بن کر گرد و نواح میں بکھرتا حالات کو اور بھی خراب کر دیتا ہے۔

ان تمام ان گنت طریقوں کو جن سے انسان ماحول اور گرد و نواح کو نقصان پہنچاتا ہے، مجموعی طور سے آلودگی کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم اپنی ہوا کو گیسوں اور دھوئیں سے اپنے پانی کے وسیلوں اور ذخیروں کو کیمیات اور نالیوں کی غلاظت سے اپنی مٹی کو کیمیاوی کھادوں اور جراثیم کش ادویات کی ہمیشہ سے بڑھتی مقدار سے آلودہ کرتے ہیں۔ صنعت کاری سے پیدا ہونے والی گرمی، سب طرح کے فضلہ جات اور گھروں نیز عوامی مقامات پر بکھری غلاظت سب آلودگی کی اقسام ہیں۔

آلودگی میں اضافے کی ایک اہم وجہ یہ رہی ہے کہ اس کی روک تھام بڑی مہنگی پڑتی ہے۔

ہوائی آلودگی۔

گیسوں نیز معائیات یا ٹھوس اشیاء کے لاکھوں ٹن ذرات ہماری فیکٹریاں، گھر اور موٹر گاڑیاں ہر سال ہوا میں پھینکتے رہتے ہیں۔ ہوا کی زیادہ تر آلودگی چیزوں کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب کوئی چیز جلائی جاتی ہے تو اس سے حرارت، دھواں، گیس اور بدمزہ فضولیات پیدا ہوتی ہیں جو کہ ہوا کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ چلتی ہوا آلودگی کی موجب اشیاء کو بکھیر سکتی ہیں۔ بارش اور برف باری کسی حد تک ان کو زمین تک بہا کر لے آتی ہیں اور اس طرح آلودگی میں کمی لاتی ہیں۔

ہوائی آلودگی محض انسانوں کو ہی نقصان نہیں پہنچاتی جو کہ اس کے زہر میں دن رات سانس لیتے ہیں اور کئی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حیوانات اور نباتات بھی آلودہ ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ قدیم عمارتیں اور سنگتراشی کے مجسمے آلودہ ماحول کی وجہ سے دھیرے دھیرے گھس کر بوسیدہ ہو جاتے ہیں۔ صنعت کاری سے علاوہ مغربی ممالک میں تیزابی بارش کا تجربہ آلودگی کی ایک اور مثال ہے۔

مسٹر ایس۔ سری کمار ایک سائنسداں ہیں جو ماحولیاتی آلودگی کی تحقیق میں مصروف ہیں۔

جن علاقوں میں دھند چھائی رہتی ہے وہاں صنعتی کارخانوں، اور گھریلو چمنیوں کے دھوئیں اور موٹر گاڑیوں سے خارج ہونے والی آلودگی سب دھند سے مل کر "اسماگ" پیدا کرتے ہیں جو صحت کے لئے خطرناک ہونے کے علاوہ مسلسل دھند کی زد میں رہنے والے علاقوں میں معروف شاہراہوں پر آمدورفت کے بڑے بڑے حادثوں اور گاڑیوں کی بھیڑ کے موجب بنتے ہیں۔

گرمی کی بدولت آلودگی:

ہم جب بھی کوئی ایندھن جلاتے ہیں تو اس سے ماحول میں گرمی کا اضافہ کرتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی صنعت کاری اور نیوکلیائی طاقت کے فروغ کی وجہ سے گرمی کے اخراج میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ گرمی پیدا کرنے والی سرگرمیاں براہ راست اسی نسبت سے بڑھتی ہیں جس سے کہ آبادی بڑھتی ہے۔ انسانی فروغ کی بہت سی سرگرمیوں کی وجہ سے البیڈو میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جسے منعکس ہونے والی توانائی کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں ہیں: پختہ اشیاء اور اسفالٹ سے سڑکوں کی سطح تیار کرنا اور درختوں کو اندھادھند گرانا۔ موجودہ رفتار برقرار رہی تو اگلے پچاس سال تک یہ زمین صحت یا کسی طرح کی زندگی کے قابل نہیں رہے گی۔

سورج اور بیرونی خلا سے حرارت کا انتشار جو کہ سطح زمین تک آتا ہے ایک دیگر نادیدہ سے آلودہ عنصر کی صورت ہی ہے۔ گیسیں اور ذرات چھوڑنے والی اشیاء کسی علاقے کے اوسط درجہ حرارت میں تبدیلیوں کا باعث بن سکتی ہیں۔ ذرات بکھیرنے والی اشیاء سورج کی روشنی کو بکھیر کر درجہ حرارت کو کم کرتی ہیں۔ کچھ گیسیں سورج کی روشنی کو زمین تک آنے تو دیتی ہیں لیکن دھوپ کی گرمی کو سطح زمین سے اٹھ کر واپس خلا میں جانے سے روکتی ہیں۔ اس سے علاقے کے اوسط درجہ حرارت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا نام ہے "سبز مکان کا اثر"۔ مٹی سے فضلے کی تہیں لگتی ہیں جن میں مردہ پودے اور جانوروں کا فضلہ شامل ہوتا ہے ان سے "ہیومس" پیدا ہوتا ہے۔ مٹی میں موجود جراثیم اسے نائٹریٹ فاسفیٹ اور دیگر غذائی مرکبات میں تقسیم کردیتے ہیں۔ ان سے اگتے ہوئے پودوں کو خوراک ملتی ہے۔

کیمیائی کھادوں کی بھاری مقداران جراثیم کے ان عوامل میں کمی لاتی ہے جن سے جراثیم ہیومس کی توڑپھوڑ کرتے ہیں۔ بیماریوں کے جراثیم مارنے والی ادویہ کی زیادہ مقدار جراثیم کو تباہ کردیتی ہے۔ مٹی کا کٹاؤ ایک اور گھٹیا طرح کی مٹی کو آلودہ کرنے کی صورت ہے۔ درختوں کا اندھادھند کاٹنا اور سطح زمین کے توازن میں غیرمتوقع تبدیلیاں، جیسے ڈیموں کی تعمیر، پانی کے ذخیروں کی تیاری یا مناسب پختہ پشتوں کے بغیر نئی نہریں تیار کرنا، مٹی کے کٹاؤ کا باعث بنتے ہیں۔ مٹی پر ڈالے گئے فضلے میں خالی ٹینوں، ڈبوں کھوکھوں وغیرہ جیسی کباڑ کی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ان کو ٹھکانے لگانا بھی آلودگی کے ایک دوسرے مسئلہ کو جنم دیتا ہے کیونکہ اس میں جلانا، گرم کرنا شامل ہے۔

پانی کی آلودگی:

انسانی ترقی اور تہذیب کو دریاؤں نے ہمیشہ زندگی بخشی ہے لیکن انسان انہی دریاؤں کو غلیظ کردیتا ہے جو اسکی زندگی کا سہارا ہیں۔ دریاؤں کی آلودگی کا بہت سا حصہ شہری فضلوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جنہیں اکثر کیمیائی طور سے ٹھکانے نہیں لگایا جاتا۔ پچاس ہزار سے زیادہ آبادی والے ۵۲ شہر دریا کے کنارے واقع ہیں۔

جانوروں کو نہلانا، کوڑے کرکٹ اور صنعتی اخراج کو ان میں ڈالنا اور مردہ جانوروں اور انسانی لاشوں کا دریا میں ٹھکانے لگانا دریاؤں کی آلودگی میں اضافہ کرتے ہیں۔

کیمیائی کھادیں اور جراثیم کش ادویات جو کہ کھیتی میں استعمال کی جاتی ہیں آب پاشی کے پانی کے ذریعہ دریاؤں میں چلی جاتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں ان سب کی صحت کو نقصان پہونچاتی ہیں جو دریا کے پانی کو پینے اور نہانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ۸۰ فیصد بیماریاں پانی کے ذریعہ پھیلتی ہیں۔

سمندر کی آلودگی

ہم اپنے دریاؤں اور سمندروں میں تیل، کیمیائی اخراجات، بھاری دھاتوں کے ریڈیو ایکٹو فضولیات، صنعتی ادویات، جراثیم کش ادویات اور بہت سی دیگر اشیاء ڈالتے رہتے ہیں۔ اب سمندر میں سیسے اور پارے کی بڑی مقدار ہے۔ مچھلیاں جو کہ سمندر کے گہرے

مدن میں رہتی ہے جمع شدہ پارہ پی جاتی ہیں اور بیماری کا باعث بن جاتی ہیں۔ دنیا کے آدھے حصے سے زیادہ آبادی مچھلی پروٹین کے لئے مچھلیوں پر انحصار کرتی ہے۔

ایٹمی توانائی کی تنصیبوں سے نکلے ہوئے ریڈیو ایکٹو فضولیات کو گہرے سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ سمندر کے اندر آتش فشاں پہاڑ، پھوٹنے والے عناصر، تیل کے لئے کھوج کے کام اور گہرے سمندروں کی معدنیات جیسے متعدد عناصر ایسی حرکات پیدا کر سکتے ہیں جن سے گہرے پایاب اور سطحی پانی آپس میں مل جاتے ہیں۔ ایک ایٹمی آزمائش کے دوران، ریڈیو ایکٹو فضلے کے محض آدھے ٹن سے بحر الکاہل کے دس لاکھ مربع میل سے زیادہ رقبے میں تشویشناک مسائل پیدا ہو گئے جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ء تک ریڈیو ایکٹو فضلوں کی مقدار ۱۰۰۰ ٹن سے زیادہ ہو جائے گی تو ہم سوچ سکتے ہیں کہ کتنے خطرات ہمارے حصے میں آئیں گے۔

دھاتیں :

پارے کو ایک معاون کیمیا کی طرح پانی و نل۔ کلورآئیڈ تیار کرنے میں نیز کاغذ بنانے اور دھلائی کے کام میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دھات جسم کے خلیوں کو فرداً فرداً تباہ کر دیتی ہے اور خلیوں کے تمام ذخیرے کو ختم کر دیتی ہے۔ اس سے بڑھاپا جلد آتا ہے، اس وجہ سے عمر گھٹ جاتی ہے اور موت جلد ہو جاتی ہے۔

اکثر پارہ دودھ دینے والے جانوروں میں آنول نالی کی رکاوٹ سے ہو کر گزرتی ہے جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اشیاء میں پیدائشی طور سے پارے کا زہر ہوتا ہے۔

سیسے کا معاملہ یہ ہے کہ موٹر گاڑیاں جو پیٹرول، ایندھن سیسے کرائیڈ جن میں ملا کر استعمال کرتی ہیں ان سے صنعتوں اور تعمیر مکانات کے کاروبار کی نسبت زیادہ خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ روایتی طور سے صنعت میں استعمال ہونے والے سیسے کے زہر اور اس طرح کے زہر میں فرق یہ ہے کہ اس میں ظاہری علامتیں پیدا نہیں ہوتیں چاہے بیماری اندر آ چکی ہو۔ زہر کے اثرات کی سطح گاؤں اور ساحل سمندر کے علاقے میں رہنے والے لوگوں کی نسبت ان لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے جو شہروں میں بود و باش اختیار

کے قریب رہتے ہیں۔

موٹر شہروں میں ہر سال ہوا میں ٹنوں سیسہ منتشر رہتی ہیں۔

ہندوستان میں مشرقی اور شمالی مشرقی علاقوں کی ریفائنریوں میں پیدا ہونے والے پیٹرول میں سیسے کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ پٹنہ اور گوہاٹی میں چوراہوں پر گندی ہوا میں سیسے کی مقدار دلی کی نسبت آٹھ سے دس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ جس موٹر اسپرٹ میں سیسہ ہوتا ہے اس کی کھپت ۱۹۸۳ء کے بعد ۵ فیصد کے متوقع اضافے کی وجہ سے تقریباً دگنی ہو گئی ہے۔ سیسہ خوراک میں وارد ہو جاتا ہے۔ لیڈ آرسینٹ کے اس اسپرے سے جو کھیتی میں استعمال کیا جاتا ہے سیسے کو ان ڈبوں کو بند کرنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جن میں خوراک کی اشیاء بند کی جاتی ہے۔ اس سے زہر پیدا ہوتا ہے۔ سیسے سے متاثر ہونے کی صورت حال صدی کے اختتام تک آج کی سطح کی نسبت تین یا چار گنا ہو جائے گی کیوں کہ موٹر گاڑیوں کی تعداد تیزی سے بڑھے گی۔

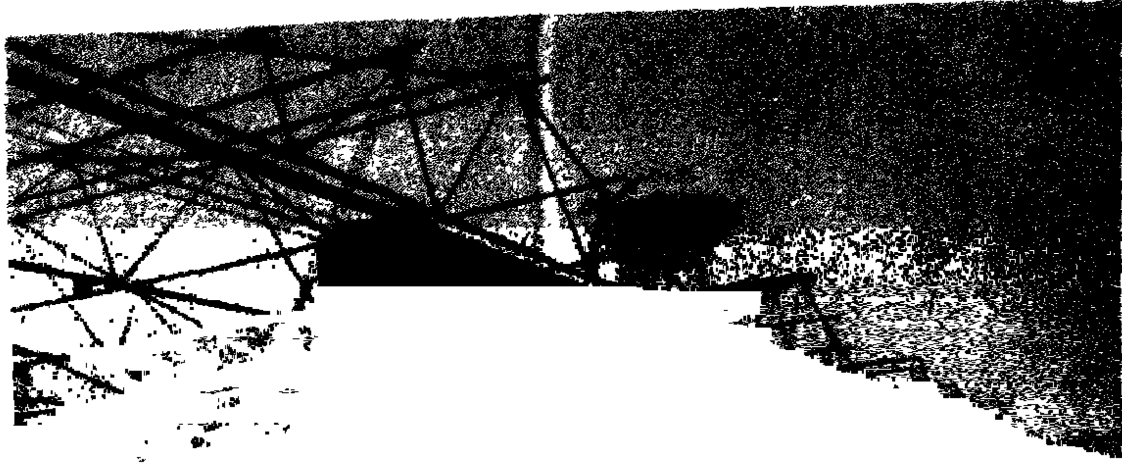
محض شمالی نصف کرۂ ارض میں سمندر کی تہہ میں بیٹھنے والا سیسہ پانچ لاکھ ٹن فی سال کے حساب سے اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ برتنوں کے اندر سے صیقل کرنے کے لئے جو کیڈیم استعمال کیا جاتا ہے اس سے گردے کو نقصان پہنچتا ہے اور یہ اعصابی نظام نیز قوت مردانگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ دھات جسمانی نظام پر اثر انداز ہونے سے پہلے کافی دیر تک جسم میں موجود رہتی ہے۔ کیڈیم کی زیادہ تر مقدار ان پودوں کی چھوڑی ہوئی دھول سے آتی ہے جو جستہ سیسے اور تانبے کی کچی دھات رکھتے ہیں۔

بہت سی دیگر زہریلی دھاتیں بھی ہیں جو ماحول اور زندہ چیزوں میں آلودگی پیدا کرتی رہتی ہیں۔ ان دھاتوں میں بیریم، ٹنگسٹن، سیلینیم اور تھیلیم شامل ہیں۔

ایس بیس ٹاس

دیکھنے میں بالکل بے مزہ اور بہت استعمال میں آنے والی لیکن خطرناک اور نقصان پہنچانے والی شئے کا نام ہے۔ ایس بیس ٹاس کے ذرات جو جسم کے اندر جاتے ہیں ان سے وہ خطرناک سرطان ہوتا ہے جو پھیپھڑوں کو ڈھانپنے والی جھلی میں پیدا ہوتا ہے۔ ایس بیس ٹاس کی

(باقی صفحہ ۹ پر)



نیو مارکیٹ، کلکتہ کے دکانداروں، جن کی دکانیں نذرِ آتش ہو گئی تھیں، کے لئے چورنگی میدان کے علاقہ میں نئے شیڈ کی تعمیر

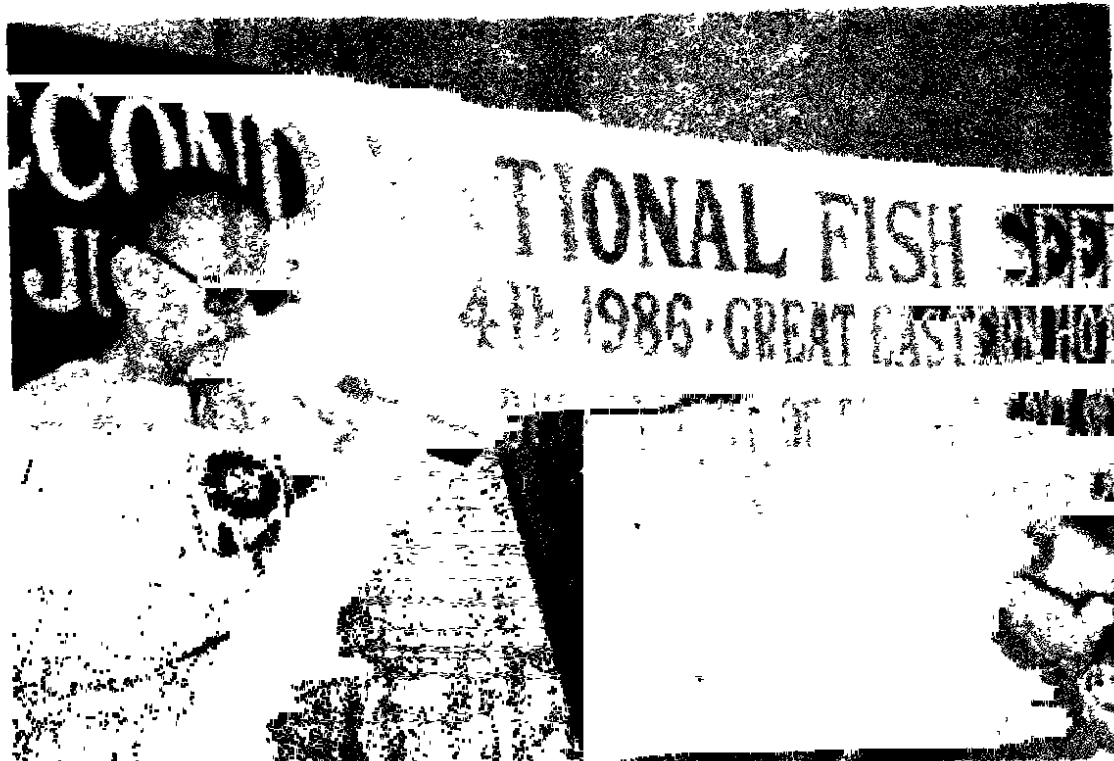
Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta. Associate Md. Azam
Published by the Information & Cultural Affairs Dept. of Govt. of West Bengal and Printed by G. R. T. Printers. 54/1C, Shyampukur. Street, Calcutta-700 004.

MAGHREBI BANGAL
1st August 1986

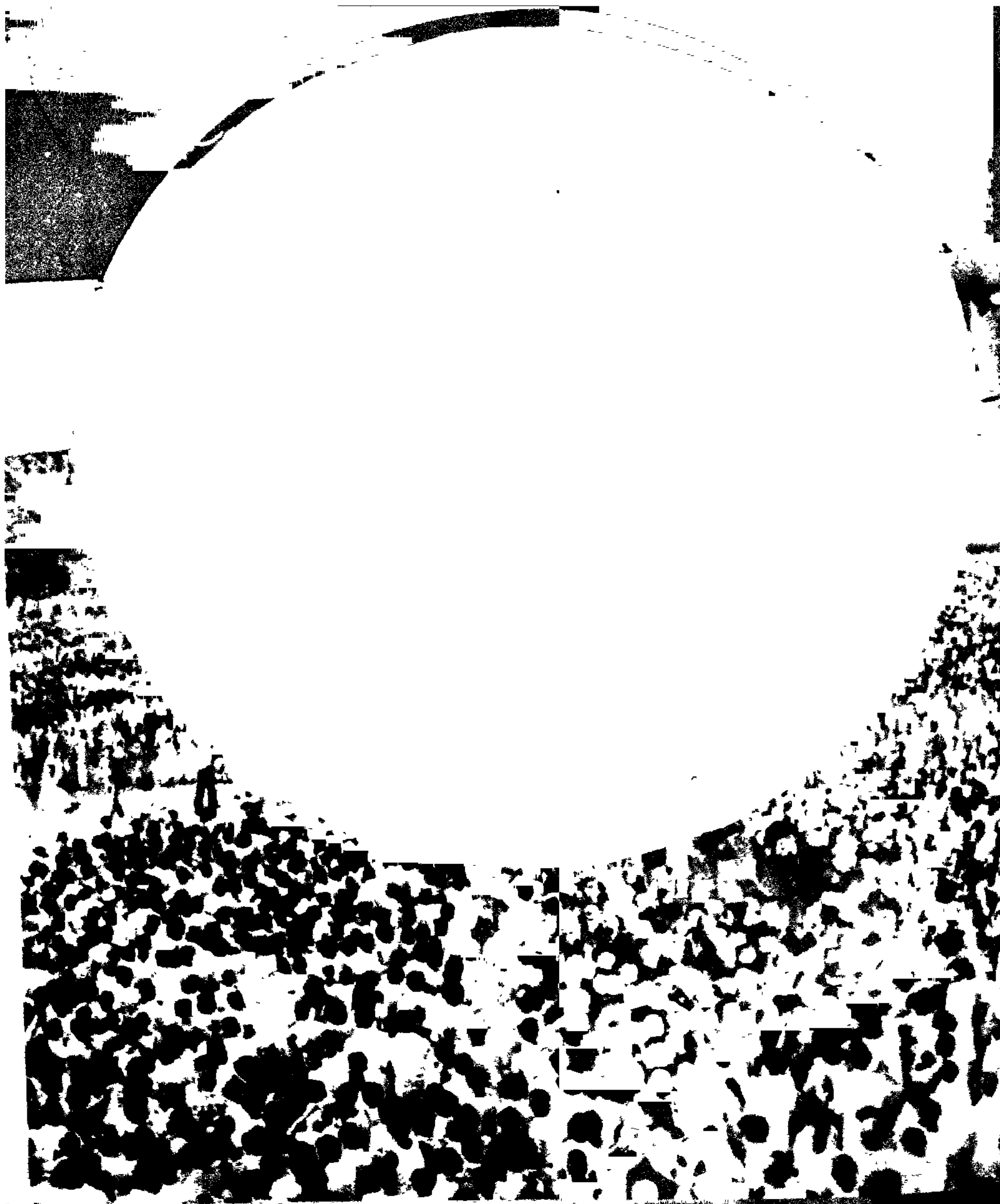
Postal Regd. No. WB/C C-52
Vol—31 No —15
PRICE 12 Paise



شجرکاری اور اس کے تحفظ کے دو ہفتے کے موقع پر منعقدہ ایک تقریب میں مغربی بنگال کے وزیر آراضی و اصلاحات آراضی شری بینوئے چودھری اور وزیر جنگلات شری اچنترائے ۔



گریٹ ایسٹرن ہوٹل کلکتہ میں ۴ر جولائی سنہ ۸۶ کو ریاستی حکومت کے شعبہ ماہی گیری و ماہی پروری کے زیر اہتمام منعقدہ دوسری قومی ماہی تخم کانگریس میں ریاستی حکومت کے وزیر آراضی اور اصلاحات آراضی شری بینوئے چودھری مہمان خصوصی کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے



پندرہ روزہ **مغربی بنگال** کلکتہ

یوم آزادی نمبر

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ

مدیر : دھریندرا ناتھ دت

مدیر معاون : محمد اعظم

شرح خریداری

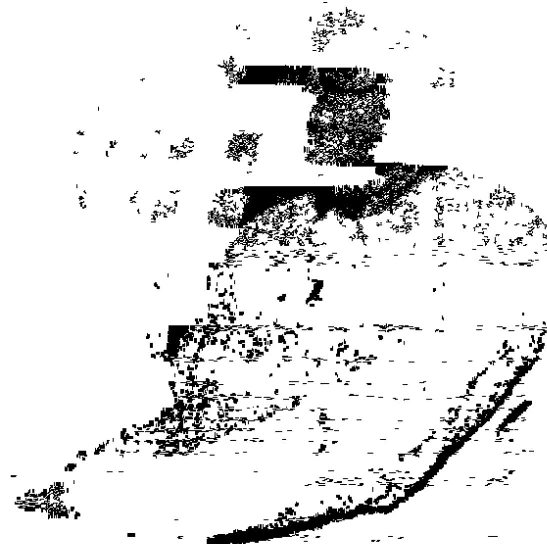
سالانہ : تین روپئے ★ اس خصوصی شمارے کی قیمت : ۲۵ پیسے

ترسیل زر کا پتہ !

بزنس منیجر
شعبۂ اطلاعات وثقافتی امور
حکومت مغربی بنگال
۲۳- آر، این، مکھرجی روڈ
کلکتہ - ۷۰۰۰۰۱

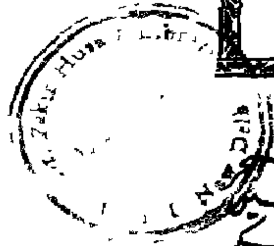
جلد نمبر ۳۳ ★ ۱۵ر اگست اور یکم ستمبر ★ شمارہ نمبر ۱۲ اور ۱۷





وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو، ۹ر اگست ۱۹۸۶ء کو گریٹ ایسٹرن ہوٹل کلکتہ میں مغربی بنگال کے سابق گورنر اوما شنکر ڈکشت کے ساتھ ۔ ایک دعوت الوداع میں

صبحِ آزادی



یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر بھی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض احمد فیض

قوم پرستی کی تحریک ــ ۱۸۵۷ء

بعض مورخین نے ۱۸۵۷ء کی شورش کو مسلح افواج میں بغاوت قرار دیا ہے جبکہ یہ تحریک اس سے کہیں زیادہ تھی جس میں دور افتادہ خطوں غرض یہ کہ تمام گوشۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے حصہ لیا۔

برطانوی کمپنی کی طرف سے جس نے کہ بعد میں عنانِ حکومت سنبھالی، کئے جانیوالے جبر و استبداد پر عوام کے مختلف طبقوں کی جانب سے یہ پہلا بڑا ردِعمل تھا۔ اس سے قومی بیداری کی تحریک کا آغاز ہوا۔ مختلف ریاستوں اور صوبوں میں متحدہ کار روائی کا پیغام پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ غیر ملکیوں کو ایسا فوری خطرہ قرار دیا گیا جس سے چھوٹے موٹے اختلافات کو فراموش کر کے نپٹا جاتا تھا ــــــــ

بہت سے برطانوی مورخین نے اس وقت کے سکریٹری آف اسٹیٹ کی طرف سے دئے گئے سرکاری بیان کی نا دانستہ طور پر تقلید کی اور ۱۸۵۷ء کی شورش کو بغاوت قرار دیا۔ لیکن یہ محض افواج تک محدود نہیں تھی۔ فوج کے عہدہ داروں میں نفرت اور بے چینی پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا کیوں کہ انگریزوں نے ہندستانی سپاہیوں کی مدد سے بھارت پر فتح حاصل کی تھی۔ لیکن کچھ دوسرے عوامل ہیں جیسے والیانِ ریاست کا ردِعمل غریب کسانوں اور قبائلی افراد کا غم و غصہ اور ہندوؤں نیز مسلمانوں کے مذہبی جذبے کی توہین۔ باغیوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمران، زمین دار، اسکالر، کسان اور قبائلی بھی شامل تھے۔

۱۸۵۷ء کی جد و جہد کو بغاوت قرار دینے والے مبصرین اکثر اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ یہ انگریزوں کو اس بات کا پہلا اشارہ تھا کہ پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی اتنی ٹھوس اور پائیدار ثابت نہیں ہو سکتی جیسی کہ وہ چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہادر شاہ ظفر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اسے دلّی کے ہندو اور مسلمان عوام برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر اور زینت محل کی قیادت میں مشترکہ فوجوں نے جو کردار ادا کیا وہ بھارت کی تاریخ میں بقائے باہم اور اتحاد کی ایک ٹھوس مثال ہے۔ بلاشبہ مسلح افواج میں بے چینی پائی جاتی تھی جو چربی لگے کارتوس کے تنازعے پر بھڑک کر سامنے آگئی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شورش کی ایک وجہ یہ تھی لیکن بعض دیگر پہلو بھی تھے جنہیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

استحصال

بہادر شاہ ظفر کے ۲۵ اگست ۱۸۵۷ء کے اشتہار میں سول اور ملٹری سروس میں ہندستانیوں کو دی جانے والی معمولی تنخواہ اور توہین آمیز سلوک کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔ اشتہار میں ایک اور الزام یہ بھی تھا کہ انگریز انگلستان میں تیار کردہ مال بھارت لا کر مقامی کاریگروں کو بے روزگار کر رہے ہیں۔

برطانوی حکومت نے بہت سے تعلقہ داروں اور زمین
داروں کو ان کے علاقوں سے ہٹا کر دیہی علاقوں میں بھی کافی برہمی
پیدا کر دی تھی۔ سرکار کے اصلی منتظمین دیہی علاقوں میں پہنچ کر
ہندستانی زرعی پیداوار کا استعمال کر کے اسے برطانیہ برآمد کر رہے
تھے جہاں اس کے ذریعہ صنعتوں کو فروغ دیا جا رہا تھا۔

کارنوالس کے نئے نظام کے تحت دیہی علاقوں میں
پرانے زمین داروں کی جگہ نئے زمین دار کو دے دی گئی۔ انھیں دیہات
کی کوئی واقفیت نہیں تھی۔ ان زمین داروں کو اپنی سرمایہ کاری سے
زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے میں دلچسپی تھی۔
بقایا جات کی وصولی کے لئے اذیت دینے کے طریقے بھی اپنائے گئے۔
تمام اہم اشیاء کی تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور چھوٹے ہوئے
کاروبار پر بھی حکومت نے بھاری محصولات عائد کر کے اندرونی ملک
تجارت کے لئے مالی دشواریاں پیدا کر دیں۔ ۱۷۵۷ اور ۱۷۶۵ کے
درمیان تاجروں کی یہ کمپنی حکمرانوں کی کمپنی بن چکی تھی۔

انگریز افسروں کے سخت مالی ضابطوں اور جابرانہ
انتظامی تعلقات کے سامنے عوام کے جذبات اور قدرتی انصاف کے
تقاضوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ انھوں نے اپنے مفاد اور انگلستان
کو فائدہ پہنچانے کے لئے الحاق کے لئے دلائل دینا شروع کئے اور
بے شرمی کے ساتھ پنجاب، ناگپور، سندھ کے علاوہ بہت سے
دوسرے راجاؤں اور نوابوں کی مملکتوں کا الحاق کر لیا گیا۔

اپنی حکومت کو توسیع دیتے وقت انگریز نوابوں،
راجاؤں اور حتی کہ دلی کے مغل شہنشاہ کے نظم و نسق میں بھی مسلسل
مداخلت کر رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۴۴ میں ایک حکم جاری کیا
جس میں کہا گیا تھا کہ بادشاہ کی وفات پر جانشین کا انتخاب کرنے کے
لئے ہر مرحلہ پر گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے۔ انگریزوں نے
جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو ایک لڑکا گود لینے نہیں دیا اور ریاست
کے الحاق پر زور دیا۔

والیانِ ریاست چاہتے تو وہ اپنے علاقوں کو انگریزوں کی
مداخلت سے مبرا رکھ سکتے تھے لیکن اس وقت پورے بھارت
میں غیر ملکی راج کے جبر و ستم کے خلاف آواز بلند ہو رہی تھی۔ اس جذبے
کی وجہ سے ہی جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور اودھ کی حضرت محل میدانِ
جنگ میں کود پڑیں۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنے ایک فرمان میں کہا تھا کہ
ان کی یہ دلی خواہش ہے کہ یورپی لوگوں کو بھارت سے نکال باہر کیا
جائے خواہ اس کے لئے کتنی ہی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے اور کیسے ہی
ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔ میری زبردست خواہش ہے کہ بھارت کو
ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دیکھوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انگریزوں
کے نکالے جانے کے بعد اپنے ذاتی مفاد کے لئے بھارت پر حکمرانی کرنے کی
کوئی خواہش نہیں ہے بلکہ خدائے برتر نے انسان کو جتنے قیمتی
تحائف سے نوازا ہے ان میں آزادی سب سے زیادہ اہمیت کی
حامل ہے۔

والیانِ ریاست نے تبدیلیٔ مذہب پر بھی اعتراض کیا
جس کی انگریز حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ اس تبدیلیٔ مذہب سے
ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو رہے تھے۔ اس طرح
لوگوں کو غیر ملکی راج کے خلاف لڑنے کے لئے ایک اور معاملہ مل گیا۔
۱۸۴۵ میں ایک محضر نامہ مرتب کیا گیا جس پر پٹنہ کے عوام نے کثیر
تعداد میں دستخط کئے تھے اور انہوں نے حلف لیا تھا کہ ان کے
سامنے مذہب اور ذات کے تحفظ کے لئے جس اقدام کی ضرورت ہوگی
وہ اسے کریں گے

پیغام کو پھیلایا گیا

"کنول اور چپاتی" کو انقلاب کی علامت کے طور پر
چنا گیا اور تحریک کے پیغام کی شورش کو دیگر مراکز تک پھیلایا گیا۔
شمالی بھارت میں بنگال سے پنجاب تک کھلی بغاوت ہوئی تھی۔ اگرچہ
اس کی شدت کم تھی لیکن یہ دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی۔ بارک
پور میں منگل پانڈے کی بغاوت کے بعد میرٹھ، دہلی، الٰہ آباد، بریلی،
کانپور، جھانسی، لکھنؤ اور آرہ جیسے تمام شہر بغاوت کا مرکز بن
گئے۔ مہاراشٹر اور حیدرآباد میں بھی یہ لہر پھیل گئی۔
مدراس میں فوج نے شہنشاہ دلی کے ساتھ وفاداری
کا اعلان کر دیا۔ اڑیسہ میں گوم سور، بانڈا اور انگول قبیلوں کے
سرداروں نے کئی سال تک انگریزوں کے کنٹرول کی خلاف ورزی

باقی صفحہ ۶ پر

جنھوں نے جانیں نثار کردیں ـــ!

ایک طویل نظم "خوابِ آزادی" کا ایک ٹکڑا

جنھوں نے جانیں نثار کر دیں وقارِ قوم و وطن کی خاطر
فرشتے جنکی کچلتی لاشوں پہ اشکِ یزداں کے ہار لائیں

وہ آج یوں اپنی بند آنکھوں سے دیکھتے ہیں وطن کی حالت
قدم قدم پہ سسکتی بہنیں، تڑپتے بچے، بلکتی مائیں!

وہ بند آنکھوں سے دیکھتے ہیں، خموش ہونٹوں سے کہہ رہے ہیں
وطن کے مقتل کو دیکھتے ہیں اور اپنی روحوں پہ سہہ رہے ہیں

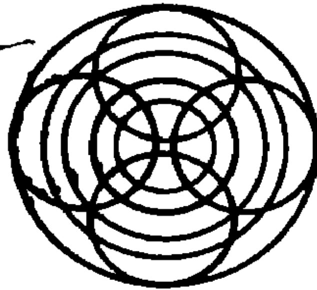
کہ کیا اسی ایک شکلِ مبہم کے واسطے کُل تھی یہ مشقت ــــ؟
یہی شہیدوں کی ہے وراثت، یہی شہیدوں کی ٹھہری قسمت؟

یہی وہ منزل تھی جس کی خاطر حیات کے کارواں ــــ لُٹے تھے؟
ہزاروں ہی بستیاں پھنکی تھیں، ہزاروں بے خانماں ہوئے تھے؟

ہزاروں غنچے مسل چکے ہیں، ہزاروں کلیوں نے خون تھوکا
چمن ہمارا چمن نہیں ہے، یہ ایک مقتل ہے رنگ و بو کا

نہیں! یہ منزل نہیں ہے اپنی، اٹھو کہ منزل ہے ایک دھوکا
ابھی توانا قدم ہیں اپنے، جواں ہے احساس جستجو کا

سالک لکھنؤ
۱۱ اگست ۸۶ء



سالک لکھنوی

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں خواتین کا حصہ

سلیمان خورشید
لکچرار، شعبۂ تاریخ، سیٹی کالج، کلکتہ

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ کی ابتدا کو لے کر مورخین کے درمیان کافی اختلاف رائے ہے مگر اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کو ہم ہندوستان کی جنگ آزادی کی پہلی جنگ کہہ سکتے ہیں۔ لہذا اس مختصر سے مضمون میں خواتین کے رول کا جائزہ اس پس منظر میں لیا گیا ہے۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے حصہ لیا۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہر فرقہ سے تعلق رکھنے والے افراد نے اس جدوجہد آزادی میں شرکت کی اور اپنا خون بہا کر وطن کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔ اس جنگِ آزادی میں صرف مردوں نے ہی بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیا بلکہ اس میں ہماری خواتین نے بھی نمایاں رول ادا کیا اور تحریک آزادی کو تقویت بخشی۔ ہماری خواتین نے بھی اپنے آنچل کو آزادی کا پرچم بنایا اور مردوں کے شانہ بشانہ انگریزوں کے خلاف نکل آئیں اور اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں، جیلوں کی کال کوٹھریوں میں نہ جانے کتنے ظلم وستم کے پہاڑ ان پر توڑے گئے۔ سینکڑوں ان ظالموں کے ہوس کا شکار ہوئیں اس کے باوجود جب ان کی ثابت قدمی میں فرق نہیں آیا تو انہیں دار پر چڑھا دیا گیا۔ اس مختصر سے مضمون میں تفصیل سے تمام خواتین کا ذکر کا احاطہ کرنا ناممکن ہے پھر بھی چند ایسے نام بار بار ذہنوں میں بجلی بن کر چمکتے رہتے ہیں جنہوں نے اس جنگِ آزادی میں اپنے خون سے تحریک کی آبیاری کی ہے۔

ان خواتین میں سب سے روشن نام بیگم حضرت محل کا ہے جو اودھ کے نواب واجد علی شاہ کی بیگم تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی چنگاری جب اٹھی تو اس نے محل کے آرام وآسائش کو تیاگ دیا۔ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنے لڑکے برجیس قدر کو اودھ کا بادشاہ بنایا۔ لکھنؤ سے انگریزوں کو نکال باہر کیا اور باغیوں کی لیڈرشپ سنبھالی۔ نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے جواب میں اپنا اعلانیہ جاری کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان کی انتظامیہ کو چھین لینے کا اعلان کیا۔ غدر کے دوسرے اہم لیڈروں سے رابطہ قائم کیا خاص کر نانا صاحب کے ساتھ مل کر خود جنگ میں کود پڑی۔ انگریزوں نے جب لکھنؤ پر حملہ کیا تو وہ فاطمی جنگ میں خود شریک رہی۔ لکھنؤ پر انگریزوں کے قبضہ ہونے پر وہ فرار ہو کر فیض آباد کے باغی مولوی کے اشتراک و تعاون سے شاہجہان پور پر حملہ کیا۔ ناکام ہو کر نان پارہ کی طرف لوٹی اور نیپال میں پناہ لی۔ نیپال کی ترائی میں پھر اس نے اپنے فوجوں کو منظم کیا۔ نانا صاحب بھی اس وقت نیپال میں فرار ہو کر پہونچے تھے۔ ان کے ساتھ مل کر پھر ایک بار انگریزوں سے بھڑ گئی اور لڑتی رہی۔ انگریزوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے اس نے ہمیشہ انکار کیا۔ نیپال ہی کے کسی گوشے میں اس کی زندگی کا چراغ گل ہوا مگر وہ ہندوستانی خواتین کا نام روشن کر گئی۔

دوسرا اہم نام جھانسی کی رانی لکشمی بائی کا ہے اترپردیش کے وارانسی کے علاقے میں پیدا ہوئی۔ اصل نام منی کرنیکا تھا۔ جھانسی کے راجہ گنگا دھر راؤ سے شادی ہوئی۔ ۱۸۳۵ء میں شوہر کے مرنے کے بعد جھانسی ریاست کی ناظم مقرر ہوئی۔ انگریزوں نے اس کے لے پالک لڑکے دامودر راؤ کو ماننے سے انکار کر دیا اور

ریاست سے اسے بے دخل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اپنے
ت میں جب ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کی آواز بلند ہوئی
ی بائی نے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور انہیں
سی سے نکال باہر کیا۔ پھر اس نے انگریزوں کو آگے بڑھ کر
پور اور بیرواساگر کے مقام پر شکست دی اور اس طرح وہ
۱۸۵۷ء کی سب سے طاقت ور لیڈر بن کر ابھریں۔ اس کی فوجی
میں اور بھی اضافہ ہوا جب بانپور اور شاہ گڑھ کے حاکم اس
کر مل گئے۔ سر ہیو روز کی قیادت میں انگریزوں نے زبردست
یا۔ دو ہفتہ تک لکشمی بائی بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتی رہی
پ کالپی میں پناہ لی۔ وہاں راؤ صاحب اور تانتیا ٹوپے اپنی فوجوں
ساتھ آ ملے۔ کونچ اور کالپی کے مقام پر پھر جنگ ہوئی۔ مخالف
ن نے اسے گوالیار میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ پیشوا کی حکومت
قائم کی اور انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ لڑنے پر آمادہ ہوئی۔
ں کا لباس اتار کر مردوں کا لباس پہنا، فوجیوں کی کمان اپنے
یں میں لی۔ بڑی بے جگری سے لڑی مگر کوٹا کے سرائے کی
میں بری طرح زخمی ہو کر ۱۸ جون ۱۸۵۸ء میں اس دار فانی
ہیشہ کے لئے کوچ کر گئی لیکن انگریزوں کے سامنے گھٹنے
ٹیکے۔

اس جنگِ آزادی میں صرف نواب زادیاں یا
رانیوں نے ہی حصہ نہیں لیا بلکہ اس تحریک میں وہ عام شہریوں
بیویاں، بہنیں اور مائیں بھی شامل رہیں جنہوں نے کبھی گھر
چہار دیواری کے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ
دی کے شعلے بلند ہوئے تو ہر طرف انگریزوں کے خلاف
ں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ انگریزوں نے بندوق کی نال پر اس
ت کو دبانے کی کوشش کی۔ دہلی کے قریب مظفر نگر میں بھی
ں نے بغاوت کی۔ انگریزوں نے اس شہر پر حملہ کر دیا۔ یہاں
ورتیں اپنے گھروں سے باہر نکل آئیں اور جنگ میں حصہ لیا۔
ساری عورتیں گرفتار ہو گئیں۔ ۱۱ عورتوں کو پھانسی پر چڑھا
لیا۔ ان میں آشا دیوی، بھگوانی شوبھا دیوی، حبیبہ اور جمیلہ
سی جوان عورتیں شامل تھیں۔ سرکاری ذرائع کے مطابق

تقریباً ۲۵۵ عورتوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔

جنگِ آزادی کی تحریک چلتی رہی اور ہر دور میں ہماری
خواتین مردوں کے دوش بدوش رہیں۔ گاندھی جی کی قیادت میں
تحریکِ آزادی نے عوامی شکل اختیار کر لی۔ انہیں یہ احساس
ہوا کہ جب تک ہماری عورتیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں تحریکِ
آزادی میں شریک نہیں ہوتیں اس وقت تک ہماری تحریک کمزور
رہے گی۔ ۱۰ اپریل ۱۹۳۰ء کو انہوں نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا"
میں ہندوستان کی عورتوں سے مخاطب ہو کر لکھا کہ انہیں بھی ستیہ
گرہ میں حصہ لینا چاہیئے اور چرخے کاتنا چاہیئے۔ اس اپیل کا
اتنا زبردست اثر ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں دقیانوسی اور اعلیٰ
خاندان کی خواتین اپنے گھروں کی چہار دیواری اور پردے سے باہر
نکل آئیں اور ان لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔
انگریز حکومت ہندوستانی خواتین کی اس بے باکی اور ہمت پر حیران
و ششدر رہ گئی۔ مس میری کیمپبل نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ
کس طرح صرف دہلی میں گاندھی جی کی آواز پر ۱۶۰۰ عورتوں نے
ستیہ گرہ کر کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔

امن پسند تحریک کے ساتھ ساتھ تشدد پسند تحریک
میں بھی ہماری خواتین پیچھے نہیں رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں بنگال
کی کماری پرتی لتا واڈیدار جس نے تیسرے دہائی میں سر جین
کی سربراہی میں چاٹگام کے مقام پر انگریزوں کے خلاف جنگ
کی اور آخر میں گرفتاری کے بجائے خودکشی کو ترجیح دی۔ اسی
طرح ماتنگنی ہاجرا کا نام بھی ہم فراموش نہیں کر سکتے جس نے
"عدم تعاون" کی تحریک سے لیکر "بھارت چھوڑو تحریک" تک
مسلسل انگریزوں کے خلاف احتجاج کرتی رہی۔ جس نے تاملوک
میں گورنر کے ایک دربار میں "واپس جاؤ" کا نعرہ لگانے کی ہمت کی۔
۱۹۴۲ء کے "بھارت چھوڑو" تحریک میں بے شمار
خواتین نے حصہ لیا۔ ان میں چند نام یہ ہیں:
شریمتی ولی امّاں بائی، شریمتی لکشمی تھیرے، شریمتی
سندو بائی تیکھے، سدھا کماری شرما، سمیتیا دیوی، پیاری
دیوی، پربھا دیوی، کھوئی کماری دیوی، بھوکیشوری بھوکانانی، منجولا

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

جدوجہدِ آزادی میں ہندوستانی جمہوری فوج کا کردار

از: سروج چکرورتی

آج بھی ہمارے دلوں میں ان مجاہدینِ آزادی کی یادیں تازہ ہیں جنہوں نے مادرِ وطن کی آزادی کے لئے اپنی اپنی جانِ عزیز کی قربانیاں دیں۔ چندر ناتھ داس ان شہدا میں سے ایک تھے جو ملک کی آزادی کے لئے انگریز حکمراں سے نبرد آزما ہوئے اور آج سے ۵۰ سال قبل، لاہور جیل میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ مادرِ وطن کی آزادی کی حصولیابی کے لئے ان کے مقاصد اور تصورات موجودہ دور کے نسل کے لئے مشعلِ راہ ہیں اور یہاں ان کا ذکر کرنا لازمی ہے۔

اس بات سے تو ہم سب واقف ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگِ آزادی، جسے انگریز سپاہیوں کی بغاوت کہتے ہیں، کے بعد سے آزادی کے لئے سارے ہندوستان میں جدوجہد شروع ہو گئی اور آخر کار غیر ملکی حکمراں کو ۱۹۴۷ء میں ہندستانیوں کے ہاتھوں اقتدار کو منتقل کرنا پڑا اور ہمارا ملک مکمل طور پر آزاد ہو گیا۔ تحریکِ آزادی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ہمیں یہ بات معلوم ہو گی کہ گاندھی جی کے تحت عدم تشدد، شہری مزاحمت اور روسی اور آئرش انقلابیوں کے طرز پر تشددی تحریک نے مجاہدینِ آزادی کے ایک طبقہ کو کافی متاثر کیا اور انہوں نے اپنے مقصد کی حصولیابی کے لئے اپنی جانِ عزیز کی قربانیاں دیں۔

جلیان والا باغ کے قتلِ عام کے سانحہ کے بعد ایک سابق فوجی سکھ نے ۱۹۲۳ء میں انڈین ری پبلیکن آرمی یعنی ہندستانی جمہوری فوج کی تشکیل کی۔ اس جمہوری فوج کا مقصد یہ تھا کہ پہلے قدم کے طور پر بدنام زمانہ برٹش حاکموں اور ان کی کٹھ پتلیوں کو ایک ایک کر کے مار ڈالا جائے اور اس طرح برٹش حکمراں کے دل میں خوف پیدا کیا جائے اور آخر میں انہیں ہندستان سے ہمیشہ کے لئے نکال باہر کیا جائے۔ اسی دوران یعنی ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء میں ایک خفیہ پارٹی بنام ہندستانی قومی فوج، قائم کی گئی۔ اس پارٹی کے کمانڈر ایک ۲۳ سالہ نوجوان بھگت سنگھ تھے۔ اس پارٹی کے ممبروں کو ملک کے ہر صوبہ میں ہندوستانی قومی فوج قائم کرنے کی ہدایت دی گئی۔ خود بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں، سکھ دیو، راج گرو اور لاہور میں رہنے والے ایک بنگالی بابو کشوری رت نے پنجاب میں پارٹی کی تنظیم کا کام شروع کر دیا۔ اتر پردیش میں اس طرح کی فوج تیار کرنے کی ذمہ داریاں چندر شیکھر آزاد کو اور بنگال میں چندر ناتھ داس کو سونپی گئیں۔ صرف چند لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ چندر ناتھ داس کانگریس تحریک میں شامل تھے اور انہوں نے سبھاش بوس کی، ۲۵۰۰ ملٹری رضا کاروں کا ایک دستہ تیار کرنے میں مدد دی۔ ان رضاکاروں نے کلکتہ میں ۱۹۲۹ء میں منعقدہ کانگریس کانفرنس میں گرانقدر خدمات انجام دیں، لیکن باطن میں وہ اسی قومی فوج کے لئے نوجوانوں کی نئی بھرتی کرنے اور انہیں بندوق چلانے اور انہیں بم تیار کرنے کی تربیت دیا کرتے۔ اس سلسلہ میں لاہور سازش کیس اور اس کے فوراً بعد چاٹگام اسلحہ خانہ پر حملہ کیس کو جدوجہد

آزادی کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔

جتندرا داس جنوبی کلکتہ کے علاقے میں رہتے تھے۔
انہیں بنگال میں اپنی پارٹی یونٹ کے لئے بم تیار کرنے کے الزام میں ۱۴ جون ۱۹۲۹ء کو گرفتار کر لیا گیا اور زبردست پولس دستہ کی نگرانی میں لاہور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ لاہور سازش کیس کے چند اہم ملزمین بھگت سنگھ، سکھ دیو، راج گرو اور باٹوکشور دت تھے۔ مقدمہ ۱۰ جولائی ۱۹۲۹ء کو شروع ہوا۔ ان میں سے چند ملزمین نے ۶۴ دنوں کی بھوک ہڑتال کر رکھی تھی اور انکی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ عدالتی کارروائی کے آخر میں بھگت سنگھ اور باٹوکشور دت پر دو الزامات عائد کئے گئے۔ الزامات یہ تھے کہ ۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو جب صدر پارلیامنٹ ویتھل بھائی پٹیل قومی تحریک کی روک تھام کرنے کے لئے ایک سرکاری عوامی تحفظ بل ایوان میں غور و خوض کرنے کے لئے پیش کر رہے تھے تو اس وقت مذکورہ بالا دونوں افراد نے ہندوستانی جمہوری فوج کے نام پر سنٹرل اسمبلی میں بم پھینکا اور دستی رسالہ تقسیم کیا۔

ان لوگوں کے خلاف مقدمہ یہ تھا کہ ان لوگوں نے بھگت سنگھ اور ان کے تقریباً ۵۰ کامریڈوں کے ساتھ ایک پارٹی بنام "ہندوستانی جمہوری ایسوسی ایشن" قائم کی تھی۔ بعد میں یہ پارٹی ہندستانی جمہوری پارٹی میں ضم ہوگئی۔ اگست ۱۹۲۸ء کو اس پارٹی کی ایک نشست ہوئی جس میں ایک مرکزی کمیٹی قائم کی گئی اور اس کے ذمہ یہ کام دیا گیا کہ یہ مختلف صوبوں کی سرگرمیوں میں تال میل کو قائم رکھے۔

لاہور میں سائمن کمشن کے دورہ کے موقع پر پنجاب کیساری لالہ لجپت رائے نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو ایک پرامن جلوس اس کمیشن کی آمد کے خلاف بطور احتجاج نکالا۔ لیکن لاہور اسٹیشن کے نزدیک اس جلوس پر لاٹھی چارج کیا گیا اور لالہ لجپت رائے، جو اس جلوس کی سربراہی کر رہے تھے بری طرح زخمی ہوئے۔ انہیں فوراً ہسپتال لے جایا گیا لیکن چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور ہسپتال ہی میں ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جاں بحق تسلیم ہوئے۔ ان کی موت سے پنجاب میں اور سارے ملک میں ایک بے چینی پھیل گئی۔ ہندوستانی جمہوری پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مجرم پولس افسر کو، جو اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا اور جس نے پولس فورس کی رہنمائی میں تھی لاٹھی چارج اس جلوس کے سربراہ پر حملہ کرنے کے لئے براہ راست ذمہ دار تھا، موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ لیکن شناخت کی غلطی کی وجہ سے ایک اور پولس افسر سونڈرس کو، جو اس واقعہ سے براہ راست ملوث نہ تھا ۱۷ دسمبر ۱۹۲۸ء کو لاہور تھانہ کے پاس گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور مارنے والے بھگت سنگھ، آزاد اور گرو راج تھے، جو وہاں سے فرار ہو گئے۔ فرار ہوتے ہوئے انہوں نے اپنا پیچھا کرنے والے پولس سرجنٹ اور ایک حوالدار کو بھی مار ڈالا۔ بعد میں بھگت سنگھ اور دت کو ۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو سنٹرل اسمبلی کی عمارت میں گرفتار کیا گیا۔ سونڈرس کے قتل کے کیس میں انکی شمولیت ثابت ہو چکی تھی، اس لئے انہیں لاہور سازش کیس میں ملوث کر لیا گیا۔

ان لوگوں کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا کہ ملزمین بادشاہ کے خلاف، اسے برٹش ہندستان میں اپنی حکومت سے محروم رکھنے کے سلسلے میں، جنگ کرنے کے لئے ایک سازش میں مصروفِ عمل تھے اور انہوں نے مجرمانہ طاقت کے ذریعہ ہندستان میں قانون کے ذریعہ قائم شدہ حکومت کو مرعوب کرنے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے ہتھیار، اوزار اور لوگوں کو اکٹھا کیا۔ انہوں نے طاقت کے ذریعہ یا بنکوں اور خزانہ گھروں پر حملہ کر کے اسی مقصد کے لئے فنڈ اکٹھا کئے۔ انہوں نے بم تیار کئے۔ انہوں نے لوگوں کو جان سے مار ڈالا جنہوں نے سازش کے مقاصد کو رو بہ عمل لانے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ ان لوگوں نے ریل گاڑیوں کو بموں سے اڑا دیا۔ اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لئے ان لوگوں نے ان تمام ذرائع کو اپنایا تھا۔

بھگت سنگھ اور باٹوکشور دت کے خلاف ۱۰ جولائی ۱۹۲۹ء سے مقدمہ شروع کیا گیا۔ اس دوران ان لوگوں کو قید خانہ میں شدید جسمانی اذیت پہنچائی گئی۔ بھگت سنگھ اور باٹوکشور دت نے مقدمہ شروع ہونے کے ساتھ ساتھ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ زیر سماعت عرصہ میں انہیں کٹھن اور جاں فشانی کا کام نہ دیا جائے، انہیں بدترین قسم کے مجرموں کے ساتھ نہ رکھا

جائے اور پڑھنے کے لئے کتابیں اور رسالے فراہم کئے جائیں۔ اس طرح کی سہولتیں دیگر یورپی قیدیوں کے لئے فراہم تھیں۔ یہیں سے ابتدا ہوتا ہے عام جرائم کے مجرموں اور سیاسی قیدیوں کے درمیان فرق کی۔ زیر سماعت عرصہ میں یا قید کے عرصہ میں عام مجرموں اور سیاسی قیدیوں کے الگ الگ رکھا جانے لگا۔ اس طرح سنگھ اور دت کو قید خانہ میں اپنے ایک مقصد میں کامیابی ہوئی۔

۱۶ر جون ۱۹۲۹ء کو جتندرا ناتھ داس کو لاہور جیل میں رکھا گیا۔ انہوں نے بھگت سنگھ اور باٹو کشور دت کے ساتھ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ انہیں جیل حکام نے موٹے تازے مجرم قیدیوں کی مدد سے جبراً کھانا کھلانے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ کیوں کہ قیدی نے شدید مزاحمت کی۔ ۲۴ر جولائی کو جتندرا ناتھ داس کو جیل اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ قیدیوں کی بھوک ہڑتال کی وجہ سے چند قیدیوں کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ یہ خبر جب باہر کے لوگوں کو پہونچی تو وہ سب بے چین ہو اٹھے۔ ۲۶ر جولائی کو لاہور میں منعقدہ کل ہند کانفرنس کمیٹی نے اپنی نشست میں یہ قرارداد منظور کی کہ حکومت نے جن طریقہ کار کو اپنایا ہے وہ ایک ظالم ملک کے لوگوں کو بھی چونکا دے گا۔"

جتن کی مزاحمت کی وجہ سے جیل کے ڈاکٹروں نے اس بات کو اچھا نہیں سمجھا کہ انہیں مصنوعی طریقہ سے کھانا کھلایا جائے۔ مریض کی حالت ۱۲ر جولائی کو اور بھی ابتر ہوگئی اور وہ رہ رہ کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ چونکہ دوا کو پانی میں گھول دیا جاتا تھا، اس لئے انہوں نے پانی پینا بھی چھوڑ دیا۔ بھگت سنگھ، باٹو کشور دت اور دیگر قیدیوں نے لاہور کانگریس کی منظور کردہ ایک قرارداد کی دفاع میں ۴ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اپنی بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ اسی دوران حکومت نے ایک جیل انکوائری کمیٹی قائم کی اور اس کے ذمہ یہ کام دیا گیا کہ وہ ان تمام سیاسی قیدیوں سے، جن کے مقدمے زیر سماعت ہیں یا جنہیں سزا دی گئی ہے، وابستہ قوانین کی جانچ کرے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔

جتن داس کی حالت تو بہت بگڑ چکی تھی، اور وہ شفایاب نہ ہو سکے۔ ان کے جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔

۱۰ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو انہوں نے اپنی بھوک ہڑتال کا ۶۰واں دن مکمل کیا۔ ان کے ہاتھ بھی بے حس و بے حرکت ہو گئے اور ۱۳ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو دن کے سوا ایک بجے انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

یہاں کلکتہ میں ان کا اپنا مکان تھا۔ میں نے سڑکوں میں دیکھا کہ جگہ جگہ دیواروں پر پوسٹر چسپاں ہیں اور جن میں جتن داس کی صحت کی رپورٹ روز از درج کی جاتی۔ یہ خبر تو پولس اسپتال سے کسی نہ کسی صورت سے باہر آ جاتی اور یہ خبر قومی اخباروں میں بھی شائع ہوتی۔ دیوار کے پوسٹروں میں لال روشنائی سے انگریزی میں بڑے بڑے حروف میں لکھے جاتے سارے ہندستان کے لوگ یہی دعا کریں کہ وہ بہت جلد رو بہ صحت ہو جائیں اور حکومت سیاسی لیڈروں کے لئے خصوصی سہولتیں فراہم کرنے کے مطالبے کو تسلیم کرے۔ لیکن حکومت نے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا۔ حکام نے جتن داس کے والد کی اس درخواست کو منظور کر لی کہ کیورا تلہ شمشان گھاٹ میں جسد خاکی کو نذر آتش کرنے کے لئے جتن داس کی نعش کو کلکتہ لے آیا جائے۔ جتن داس کی بھی یہی خواہش تھی کہ ان کی نعش کو جنوبی کلکتہ میں نذر آتش کر دیا نہ صرف اس لئے کہ وہ بنگالی ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ایک ہندستانی ہیں۔

ہوڑہ اسٹیشن میں لاکھوں لاکھ سوگوار جتن داس کی نعش کا انتظار کرنے لگے۔ آخر میں جب پنجاب سے انکی نعش کو لانے والی ریل گاڑی ہوڑہ اسٹیشن پہونچی، تو لوگ ان کی نعش کو گاڑی میں رکھ کر وہاں سے کلائیو اسٹریٹ، ڈلہوزی اسکوائر اور چورنگی سے ہوتے ہوئے کالی گھاٹ کے کیرا تلہ لے گئے۔ جنازہ کے جلوس میں میں بھی شریک تھا۔ جب یہ جلوس کلائیو اسٹریٹ، ڈلہوزی اسکوائر اور چورنگی سے گزر رہا تھا، تو اس وقت میں نے یہ دیکھا بڑے صاحبوں کی بیگمات اور رشتہ دار سب کوٹھیوں اور ہوٹلوں کے برآمدوں سے اس جلوس کو سہمے سہمے دیکھ رہے تھے۔ جلوس نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ "ہتھیار سنبھالو اور قاتلوں کو ختم کرو"۔ کیورا تلہ گھاٹ میں جتن داس کے جسد خاکی کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اس وقت اس نوجوان انقلابی کے گزر جانے پر پورے ماحول پر خاموشی چھا گئی تھی۔

تعزیتی پیغامات ہندستان کے تمام قومی اخباروں میں شائع ہوئے۔ آئرلینڈ کے انقلابی رہنما مسٹر ٹیک سوئی نائی، جن کی موت بھی ایسے حالات میں ہوئی، کی بیوہ مسز میکسنے آنجہانی جتن داس کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے بھیجے ٹیلیگرام میں کہا "جتندرا ناتھ داس کی موت سے ٹیرنسی مک سوئی نائی خاندان کو دلی صدمہ پہونچا۔ متحدہ ہندستانی محبانِ وطن کے لئے یہ ایک المیہ ہے اور باعثِ فخر واقعہ بھی ہے۔ ہندستان آزاد ہوکر رہے گا۔"

۲۴ستمبر ۱۹۲۹ء کو جب لاہور سازش کیس کے لئے عدالت کی نشست ہوئی تو اس وقت سرکاری کاؤنسل کی طرف جتن داس کی موت پر ان خیالات کا اظہار کیا گیا۔ "میں سبھوں کی طرف سے جتندرا ناتھ داس کی موت پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہوں۔ آنجہانی میں ایسی خوبیاں تھیں۔ خاص طور پر ایک مطمع نظر کو روبہ عمل لانے میں ان کی ہمت اور استقلال کی، جنہوں نے سبھوں سے خراجِ تحسین حاصل کیں۔ اگرچہ ان کے مطمع نظر سے ہمیں اختلاف ہے تاہم مقصد کی حصولیابی کے لئے ان کے غیر متزلزل اعتماد اور یقین کی، جس کی انہوں نے نمائش کی، تعریف کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔"

بعد میں بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو لاہور جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ مہاتما گاندھی نے بڑی کوشش کی کہ ان کی پھانسی کی سزا کو عمر قید کی سزا میں تبدیل کردی جائے، لیکن وہ ناکام ہوئے، کیوں کہ حکام کو یہ خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ ہندستان ایک ابھرتی ہوئی ایشیائی قوم کی طرح تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

بقیہ: جد وجہد آزادی اور......

ملادیا تو آؤ تم بھی آجاؤ تمہیں بھی بہا کر سمندر سے ملادوں۔ ہاں! کسانوں اور مزدوروں کی تحریک سمندر کی طرح اتھاہ بن گئی۔ یہ تحریک نہ صرف سارے ہندستان بلکہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔

اس واقعہ کے بعد محنت کش طبقہ منظم طور پر سیاسی میدان میں کود گیا اور اس کی اور عوام کی مشترکہ اور مسلسل جدوجہد نے ملک کو غلامی سے نجات دلائی اور ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوگیا ٭٭٭

پروفیسر نور الحسن مغربی بنگال کے نئے گورنر

گذشتہ ۱۲راگست کو پروفیسر نور الحسن نے مغربی بنگال کے نئے گورنر کی حیثیت سے اپنے عہدہ کا حلف اٹھایا۔ راج بھون میں کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شری ستیش چندرا نے انہیں حلف دلایا۔ حلف برداری کی تقریب میں وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو، ان کی کابینہ کے بیشتر وزراء، کلکتہ کارپوریشن کے میئر شری کمل باسو، ڈپٹی میئر شری کمانی سانیل، اسمبلی کے اسپیکر جناب ہاشم عبد الحلیم، ڈپٹی اسپیکر جناب کلیم الدین شمس، محکمۂ دفاع کے اعلیٰ افسران، کلکتہ ہائی کورٹ کے کئی جج شریک تھے۔ حلف برداری کے بعد گورنر پروفیسر نور الحسن نے ایک پریس کانفرنس میں نامہ نگاروں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس جذبے کے ساتھ مغربی بنگال آئے ہیں کہ ریاست کے عوام کے منتخب نمائندوں کے ساتھ مل جل کر کام کرسکیں۔

مغربی بنگال کے سابق گورنر شری اوما شنکر ڈکشت گذشتہ ۱۰راگست کو کلکتہ سے روانہ ہوگئے ٭٭٭

بقیہ: قوم پرستی کی تحریک.....

کی۔ کھونڈ اور سراوس قبیلوں نے بھی غیر ملکی راج کے خلاف علم بغاوت بلند کئے۔

چھوٹا ناگپور علاقے میں سنگھ بھوم کے کولس اور پالامو کے چیرو نیز کھرواڑ قبیلوں نے بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی اور چھاپہ مار جنگ کا طریقہ اختیار کیا۔

۱۸۵۵ء میں بہار کے سنتھال علاقے میں برطانیہ کی بالادستی اور حکمرانی کے خلاف بغاوت بھڑک اٹھی۔

درحقیقت ۱۸۵۷ء کا انقلاب آزادی کی پہلی جنگ اور قوم پرستی کی تحریکوں کی شروعات تھی جس نے غیر ملکی راج کے خلاف متحدہ کارروائی کی ضرورت کا احساس پیدا کیا ٭٭٭

عرضِ معذور

محمد شفیق عزمی
چاپدانوی

انگریز کی، زمانے میں مشہور، شاطری
پہونچی دیارِ ہند میں باشکل تاجری
آئی تھی وہ ذرائعِ دولت خرید نے
قیمت ریا ہیں دے کے اطاعت خرید نے
یاں حکمراں سروں میں موادِ غرور تھا
مدہوش کوئی تھا تو کسی کو سرور تھا
تھے سورما مگر نہ سیاست شناس تھے
مینار تھے ضرور مگر بے اساس تھے
ادراک ہو سکا نہ انہیں نبضِ وقت کا
ہر حکمراں سیاستِ ذیلی سے پٹ گیا
تھا چند کو شعور وطن کے وقار کا
لے کر سپاہ قصد کیا کارزار کا
ریشہ دوانیوں سے مکرمات کھا گئے
انکو انہی کے نائب بدذات کھا گئے
دیو سفید غالبِ میدان ہو گیا
تذلیل اہلِ ہند کا سامان ہو گیا
تقسیم کار آئے فرنگی دولت سے
بانٹے قلوبِ ہند بہت احتیاط سے
نستارہ خزانۂ ہندی بہ سلسلہ
لندن کے سنگریزوں پہ بھی آگئی جلا

جاگے عوامِ ہند تو تھی دیر ہو چکی
حائل تھی ان کے بیچ میں دیوارِ مذہبی
سادہ عوام گرچہ تعصب میں آ گئے
اعصابِ فتنہ گر پہ بہر حال چھا گئے
دو ہاتھ دو طرف سے بڑھے ناپنے گلا
بھاگا سفید دیو کہ ٹکنا محال تھا
دو ہاتھ جو بڑھے تھے وہ دو سمت رہ گئے
رنجِ بریدگی بھی بہر کیف سہہ گئے

آزادیٔ وطن کا ستارہ چمک گیا
حبِّ وطن کے جوش سے ہر دل دھڑک گیا
آئیں بنا کہ جبرِ سیاست حرام ہے
فیضِ عوام اب سے ریاست کا کام ہے
سو طرح کے حقوق عطا کر دئے گئے
یعنی طلب سے پہلے ہی منہ بھر دئے گئے
افلاس کے خلاف ہوا عزمِ جنگ کا
محنت سے روزگار کا رشتہ ملا دیا
دیوارِ امتیاز و تعصب کو ڈھا دیا
کمزور کو قوی کے برابر بنا دیا

اے روزِ عید آ، تری آمد سعید ہو
خاطر شکن نہ ہو تو گذارش شنید ہو
باشندگانِ ہند جلاتے رہے دئے
لرزاں ہیں جن کی جوت میں سائے امید کے
سایہ امید کا کوئی ہیئت نہ پا سکا
آسودگی کا چاند زمیں پر نہ آ سکا
نو اور تیس سال کی مدت گزر گئی
محنت کی سطح اور بھی قدرے اتر گئی
سرمایہ باوقار ہے، محنت ذلیل ہے
تخفیف کردہ سکے ہیں اُجرت قلیل ہے
منبع پہ زر و جنس کے اونچی فصیل ہے
محفوظ جس میں لوٹنے والا قبیل ہے
تاریخ کا مذاق یہ کتنا عجیب ہے
ہندوستاں سونے کا اب بھی غریب ہے
قانون ان گنت ہیں یہ انصاف ہیچ ہے
ہر شق شرحِ طلب ہے تو ہر مد میں پیچ ہے
ہو منصبِ تفضات کا بھی اب سے احتساب
کرنے لگا ہے عدلِ اصولی سے اجتناب
فتنہ طرازیاں ہوں نہ مذہب کے نام پر
مامون ہر بشر ہو کسی بھی مقام پر
دستِ دگر دباؤ نہ ڈالے زمام پر
ہر قافلہ رواں ہو پسندیدہ گام پر
اب سے جوابدہ ہوں معیشت کے دیوتا
در سب کے واسطے ہو کھلا روزگار کا
تو اب کے سال آئے تو انداز ہو جدا
پرچم ہر تیرے ہاتھ ہیں جذباتِ خلق کا
اونچی فصیل والوں کی نبضیں ٹٹولنا
میزانِ عدل میں زر و افلاس تولنا

تحریکِ آزادی اور اردو شعراء

از: ــــــــــــــــــ رام پرکاش راہی

شاید اس حقیقت سے کم لوگ آگاہ ہیں کہ تحریکِ آزادی کو "انقلاب زندہ باد" کا پرکشش نعرہ اردو زبان نے دیا یہ وہ نعرہ ہے جس کا فوری اثر ہوا اور انقلابیوں کے لئے یہ ایک مستقل، مؤثر اور زبان زد جملے کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ نعرہ برطانوی آقاؤں کی مسلسل ستم رانیوں کے باوجود زندہ رہا شمالی ہند کی میٹھی میٹھی بولیوں سے جنم لے کر اور عربی، فارسی الفاظ سے استفادہ کر کے اردو نے ملک کے گوشے گوشے میں امتیازی ہر دل عزیزی حاصل کر لی۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی بنیادی طور پر پرسکون مزاحمت اور منظم طرز کے احتجاج اور تحریکوں کا ایک سلسلہ تھا۔ بڑی حد تک یہ ایک ایسی جدوجہد تھی جو احتجاج کی اونچی سے اونچی آوازوں پر مبنی تھی۔ اس صورتِ حال میں ہندوستان کی زبانوں نے کافی پیش قدمی کی اور اردو نے شاید ایسے حالات میں ایک امتیازی کردار ادا کیا۔ کئی شعراء اور ادباء نے عوام کو تحریک دی اور ان کی سربراہی کی۔ جب اردو کے شعراء جذبات کی رو میں آگے بڑھے تو "انقلاب زندہ باد" کی توانائی کی اہمیت اختیار کر گیا۔ گویا ان کی انگلیاں قوم کی نبض شناس تھیں اور ان کے بول عوام کی نوک زبان پر تھا

شاہی شعراء:

انیسویں صدی کا چھٹی دہائی میں واجد علی شاہ اختر نے جو اودھ کے حکمران اور ایک باوقار شاعر تھے، برطانوی حکمرانوں کے ہاتھوں ملک بدر ہونے سے پہلے یہ اشعار کہے تھے:

ساری اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت
آگے بس اب نہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد مرے ملک کی یا رب خلقت
در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

٭٭

مغل شہنشاہ ابو ظفر بہادر شاہ بھی ایک معروف شاعر تھے اور غالب نیز ذوق جیسے اساتذہ کے ہم عصر تھے۔ جب انہیں جلاوطن کر کے رنگون بھیجا گیا تو انہوں نے اپنی اذیتوں کی زد میں قید خانہ میں یہ اشعار کہے تھے:

سبھی جادۂ ماتم سخت ہے، کہو کیسی یہ گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے، نہ وہ تخت ہے، نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
نہ وہ بال و تن پہ ہے سر مرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا، مجھے اپنی زندگی بار ہے

٭٭

ہماری تحریکِ آزادی ایک عوامی تحریک کے نقطۂ نظر سے گاندھی جی، بال، پال لال اور بہت سے دیگر رہنماؤں کے حسنِ تنظیم کے تحت صحیح معنوں میں بیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہوئی ہے۔ پنڈت برج نرائن چکبست جو ایک محب وطن شاعر تھے اس جدوجہد میں پوری طرح شامل تھے۔ کیٹس کی طرح وہ ایک ذہین شخصیت تھے اور چھوٹی عمر ہی میں انتقال کر گئے۔ حُبِّ وطن کا جذبہ ان کی جوشیلی شاعری میں رونما ہوا۔ ان کے اندر چھپی ہوئی ذہانت للکار اٹھی کہ ہندوستان کو بطور ایک آزاد ملک کے کم از کم ہوم رول

حاصل کرنے کا حق پہونچتا ہے ۔ اسی موضوع پر ان کے یادگار اشعار
اس ملک کے نوجوانوں اور بزرگوں کی نوکِ زبان پر تھے ۔ ان میں سے
ایک بند ملاحظہ ہو

زباں کو بند کیا ہے، یہ غافلوں کو ہے ناز
ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز
چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

* *

اسی اثناء میں مولانا ظفر علی خاں بھی میدانِ جنگِ کشمکش
میں کود پڑے ۔ انہوں نے بڑے ہی طنزیہ اور برجستہ انداز میں
بہت کچھ لکھا ۔ ان کی مشہور نظم "شعلۂ فانوسِ ہند" ان اشعار
سے آغاز کرتی ہے ؛

زندہ باد اے انقلاب اے شعلۂ فانوسِ ہند
گرمیاں جس کی فروغِ مشعلِ جاں ہو گئیں
بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی تاریکیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشرستاں ہو گئیں

شاعر جو شہید ہو گئے :

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۵ء تک کا عرصہ ہندوستان کی سیاسی
تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے جس میں بھرپور سرگرمیاں ہوئیں
تشدد آمیز انقلابی واقعات رونما ہوئے ۔ سرکاری خزانے کو
لے جاتی ہوئی گاڑی کاکوری میل کو لوٹنے کے سلسلے میں کئی نوجوانوں
کو پھانسی دے دی گئی ۔ ان کے ایک سربراہ انقلابی شاعر رام پرشاد
بسمل کو ان کے رفیق کار اشفاق اللہ خاں کے ساتھ پھانسی پر لٹکا
دیا گیا ۔ پھانسی پر لٹکتے وقت بھی ان کی زبان پر غزل کا یہ مطلع تھا

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں جو کچھ ہوا اس سے
ہندوستانیوں کے دلوں میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی ۔ علامہ اقبال اس
جانکاہ حادثے سے بڑے متاثر ہوئے ۔ بڑے اختصار لیکن بھرپور
جذبے کے ساتھ انہوں نے کہا

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

* *

اس سانحے سے متاثر ہو کر علامہ اقبال کے نوجوان ہم عصر
منشی تلوک چند محروم نے احساسِ ہمدردی کے مارے یہ کہا تھا

حکم تیرا ہے کہ فریاد نہ ہونے پائے
کوئی بلبل کہیں آزاد نہ ہونے پائے
دہر میں شہرتِ بیداد نہ ہونے پائے
نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

* *

تحریکِ آزادی نے اس کے بعد تحریکِ خلافت اور ترکِ
موالات کی وجہ سے ایک نیا موڑ لیا ۔ وہ رویے جو قطعی طور پر سیکولر
نوعیت کے تھے ایک نئی تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوئے ۔ مولانا
ظفر علی خاں نے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بلند کیا اور ہندوستان میں
غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی پیش گوئی کی :

پسینہ گرے ہندوؤں کا جہاں
وہاں تم مسلمانوں کا خوں بہاؤ
زمیں جب ہوا اس خون سے لالہ زار
تو اس پر بساطِ اخوت بچھاؤ
گرانا ہوا دفترِ اقتدار
سمجھ لو اب اس کا بھی ہے چل چلاؤ
کسی روز خود غرق ہو جائے گی
بہت بہہ چکی ہے یہ کاغذ کی ناؤ

* *

مولانا حسرت موہانی جو انڈین نیشنل کانگریس کے آتش
[بیان] کارکن تھے، جیل کی کوٹھری میں چکی پیستے ہوئے گنگنایا کرتے
تھے:

دولتِ ہندوستاں، قبضۂ اغیار میں
بے حد و بے حساب، دیکھئے کب تک رہے
ہے تو کچھ اکھڑا ہوا، بزمِ حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب و کباب، دیکھئے کب تک رہے
حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
از رہِ بغض و عتاب، دیکھئے کب تک رہے

++

مولانا محمد علی جوہر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک دانشور تھے
[ملک] کی تحریکِ آزادی میں انہوں نے بڑی خدمات سرانجام دی تھیں۔
وہ ایک ایسے شاعر تھے جو طنزیہ شعر بے تکلفی سے کہتے تھے۔ اس
کی ایک مثال یہ ہے۔

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی
ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست
قلبِ مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی
نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہرؔ
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

++

گاندھی جی کی سودیشی تحریک اور رائے عامہ کو ہر طرح کی
بدیشی اشیاء کے خلاف ابھارنے میں اس کی نفسیاتی دسترس سے
بہت ہی متاثر ہو کر لالہ لال چند فلک آگے بڑھے اور بڑی بڑی امیدوں
اور توقعات کو لوگوں کے دلوں میں اجاگر کیا۔ ان کی ایک یادگار نظم
میں جذبۂ عمل کو کچھ اس طرح بیدار کیا گیا ہے،

سمجھ لو مشکلیں سب دور اپنی ہونے والی ہیں
کہ مائل قوم پر اپنی طبیعت ہوتی جاتی ہے
اٹھا غفلت کا پردہ اپنے دل سے بعد مدت کے
نمایاں ملک کی اب ہم میں الفت ہوتی جاتی ہے
ترقی پر ہے ان روزوں فلک پر پیار دیسی کا
پرائے دیس کی چیزوں سے نفرت ہوتی جاتی ہے

شاعرِ انقلاب :

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی بھی تحریکِ آزادی میں
سرگرمِ عمل تھے۔ انہوں نے بڑے جذبے کے ساتھ کہا تھا ؎

سنو اے ساکنانِ بزمِ ہستی
صدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

++

ساحر لدھیانوی جیسے بے باک شاعر کے لئے شاعری عمر بھر
کا ایک جذبہ تھا۔ ان کے لئے حبِ وطن بہت بڑی چیز تھی جس کے
لئے انہوں نے لکھا اور بہت خوب لکھا:

جب مجھے پیروں سے عریاں کر کے باندھا جائے گا
گرم آہن سے مرے ہونٹوں کو داغا جائے گا
جب دہکتی آگ پر مجھ کو لٹایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر سو جاؤں گا
حکمِ آخر قتل گہ میں جب سنایا جائے گا
جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے گا
جب یکایک تختۂ خونیں ہٹایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا

پھر ساحر صاحب نے قوم کو سرگرمِ عمل ہو جانے کیلئے للکارا:

تری قربانیاں زنہار ضائع جا نہیں سکتیں
مگر پیدا دلِ بے کیف میں کیفِ شہادت کر
جو مستقبل میں فکرِ اہتمامِ سرخروئی ہے
تو اپنے خون سے رنگیں بیاضِ ملک و ملت کر

قدم ابھی چند باقی ہیں منزل تک پہنچنے میں
ابھی کچھ اور کوشش کر، ابھی کچھ اور ہمت کر
قریب ایوانِ آزادی ہے کیوں مایوس ہوتا ہے
تبسم کامیابی کا مجھے محسوس ہوتا ہے

سید علی جواد زیدی نے ایک نئی زندگی اور نئے دور کو لبیک کہا جسے انہوں نے اپنی مشہور نظم 'حیات' میں پیرایہ اظہار دیا۔ نظم کا کچھ حصہ یوں ہے:

نقاب رخ سے الٹ دے، دکھا دے حسن کمال
ترا غرور ہے جو سطحی رقابتوں کا زوال
ترے نظام میں دیر و حرم کی قید کہاں؟
یہ ساری جنگ حرام، اور ایک جنگ حلال
یہ جنگ وہ ہے کہ انسان سر اٹھائے گا
حیات دعوت کی دو طاقتوں میں ہوگی جدال
عروسِ زیست کے ہجراں نصیب عاشق کو
زمانہ دے گا نوید خوشی، پیام وصال
بہت ہی جلد وہ ساعت بھی آنے والی ہے
کہ تیرے رخ پہ لٹوں کی حسین لالی ہے

'ہندوستان چھوڑدو'

گاندھی جی کی تاریخ ساز تحریک 'ہندوستان چھوڑدو' نے اسے بیداری پیدا کی کہ شاید ہی کوئی جیالا اس تحریک میں کود جانے سے باز رہ سکا۔ فراق گورکھپوری اپنے منفرد انداز میں پیکار عمل کے لئے للکار اٹھے۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کچھ ارادے بھی تو چمکیں، کیا قضا اور کیا قدر
بطن مستقبل سے اپنی قسمتوں کو چھین لو
راہ گم کردہ ہی ہے منزل دیرین کی یاد
زندگی سے زندگی کی رحمتوں کو چھین لو
زندگی اور موت سے اے اہل دل کچھ نہ مرو
زندگی اور موت کی سب برکتوں کو چھین لو
کردو اک بزم چراغاں شام ہجراں کو فراق
کارواں در کارواں ان ظلمتوں کو چھین لو

٭٭

جیسے گاندھی جی اپنی تحریکوں میں سرگرم عمل تھے اسی طرح شعرا حضرات ان کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ وہ ایک امید افزا اور روشن مستقبل کی آمد کے گن گا رہے تھے تو مسعود اختر جمال بھی اپنی مشہور نظم 'کسانوں کا گیت' میں پکار اٹھے۔

سپنوں کے سندر آنچل سے آشا روپ دکھاتی ہے
اپنی ہی آواز کی لے پر ساری دنیا گاتی ہے
آج ترنگے کی لہروں میں بجلی سی لہراتی ہے
ایک ہی وار میں اب لے ساتھی دشمن سے چھٹکارا ہے
یہ دھرتی اپنا جیون سا گر یہ سنسار ہمارا ہے

٭٭

فراق گورکھپوری نے بھی اپنی نظم 'آزادی' میں اسی احساس کو جذباتی رنگ و آہنگ دیا۔ یہ اشعار قابل ذکر ہیں:

ہمارے زور سے زنجیر تیرگی ٹوٹی
ہمارا سوز ہے ماہ تمام آزادی
ترنم سحری دے رہا ہے جو چھپ کر
حریف صبح وطن ہے یہ شام آزادی
ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراق
ہماری سانس سے روشن ہے نام آزادی

٭٭

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندوستان آزاد ہوگیا۔ آزادی کا موضوع بعد میں بھی شعرا کو تخلیقی تحریک دیتا رہا۔ منشی تلوک چند محروم اپنی نظم 'آزادی' میں یوں نغمہ سرا ہوئے:

چھٹے دامن سے اپنے داغ ہائے ننگ محکومی
وطن اپنا ہے اپنی سلطنت ہے اقتدار اپنا
نگہبیں غیر ہے کوئی نہ ہے صیاد کا کھٹکا
چمن اپنا ہے اپنے باغباں سلطنت بہار اپنا

اب اے اہلِ وطن! اس کو بنائیں یا بگاڑیں ہم
مقدر پر ہے اپنے ہم کو حاصل اختیار اپنا

وطن آزاد ہوا:

جاں نثار اختر نے اپنی نظم "جشنِ آزادی" میں بڑی بے ساختگی کے ساتھ آزادی کا گیت گایا جس کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

اے زود رنگ گنگا گیت گا اٹھلا کے چل موجِ جمن
ہاں اے ہمالہ جھوم جا رقصاں ہو اے دشت و دمن
ہاں اے ایلورا کے صنم نغمہ سرا ہو نغمہ زن
آزاد ہے، آزاد ہے آزاد ہے اپنا وطن
آزاد ہے اپنا وطن

٭٭

مشہور شاعر سراج لکھنوی اپنی نظم "یوم آزادی" میں اپنے بے لوث جذبات کا اظہار کرا ٹھے۔ نظم کا ایک بند حاضر ہے ؎

زمیں اپنی فضا اپنی آسماں اپنا
حکومت اپنی علَم اپنا اور نشاں اپنا
ہیں پھول اپنے چمن اپنے باغباں اپنا
اطاعت اپنی ہے سر اپنا آستاں اپنا
جہاں کعبہ نہیں یاں جمال دیر نہیں
سب اپنے ہی نظر آتے ہیں کوئی غیر نہیں

٭٭

ساغر نظامی صاحب جذبات قومی میں آ کر اپنی نظم "اے صبحِ وطن" میں [illegible] ہوئے جس [illegible] ہے ؎

پربت پربت ساگر ساگر پرچم اپنا لہراتا ہے
محلوں پہ ملولوں قلعوں پر عظمت کے ترانے گاتا ہے
گلبار ردائے آزادی، سرشار جوانی کا پرچم
یا امن کے نغموں کا مطرب انصاف صداقت کا پرچم
تہذیب کا پیندار آنچل، تعمیر کا یہ رنگیں دامن
اے صبحِ وطن! اے صبحِ وطن

جناب کمال احمد صدیقی اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان "ہماری کہانی" ہے اپنے وطن کی جمہوری آرزوؤں کے اظہار میں بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

آج آزادی جمہور کوئی خواب نہیں
آج آئین ہمارا ہے، ہمارا ہے نظام
معتبر آج ہے دنیا میں ہماری آواز
آج چڑھتا ہوا سورج ہمیں کرتا ہے سلام

٭٭

اردو کی فضاؤں میں تحریک آزادی سے وابستہ بہت سے شاعر تھے جو اس جذبہ کے پرستار تھے۔ ایسے میں ایک انتخاب [illegible] بڑی بات نہیں ٭٭٭

بقیہ: ہندوستان کی جنگِ آزادی میں.....

بائی پٹیل، شریمتی پری، کمالا ناتھ، موہا رانی، بیراجی مردھائن، سکھارام ماتوار، منتورا بائی ماتے، سندوبالا ماتیتی، کماری جانکی، جمنا مالی، کماری انکری، شریمتی کستور باگاندھی، شریمتی گنگو بائی، کماری جیتور موئی گنگولی، دھتوری دیوی، سسی بالا داسی، سرسی بالا داسن، کنک لتا بروا، شریمتی سوشیلا بائی پال، شریمتی اکلی دیوی وغیرہ وغیرہ نے انگریزوں کے خلاف احتجاجی جلوس میں حصہ لیا۔ انہیں یا تو گرفتار کرکے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا یا تو پھر گولیوں کا شکار بنا یا گیا۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ ہندوستان کو آزادی نہیں ملی۔ آخرکار ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا اور آج ۳۹ برس گزرنے کے بعد ان جانبازوں کو جنگِ آزادی کے شہدا کو جن پر ہندوستانی خواتین بھی شامل رہیں خراجِ عقیدت پیش نہ کریں تو یہ ہماری کم ظرفی ہوگی ٭٭٭

ایک شعر

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے

یہ چارہ گری کیسی ہے

مصطفٰی اکبر

ایسے موسم میں یہ شوریدہ سری کیسی ہے
بند ہے بابِ جنوں جامہ دری کیسی ہے

آنکھیں روتی ہی رہیں، زخم دروں ہنستے رہے
وقت کے ہاتھوں میں یہ چارہ گری کیسی ہے

نہ تبسم، نہ تکلم، نہ کوئی لطفِ نظر
خشک ہے راہ روی، ہمسفری کیسی ہے

آستینوں کی خبر گیری بھی کرتے رہیے
دوستی میں یہ بھلا بے خبری کیسی ہے

ہم تو سمجھے تھے پگھل جائیگا نفرت کا وجود
اے محبت! یہ تری بے اثری کیسی ہے

جدوجہد آزادی اور اس کا تاریخی پس منظر

از: ایم۔ اے۔ نسیم

روم کا جولیس سیزر جب ۵۵ ق م میں انگلینڈ پہنچا تو اس نے وہاں پہونچتے ہی یہ کہا تھا "میں یہاں آیا، میں نے دیکھا اور میں نے فتح کی"۔ یہی بات انگریزوں پر صادق آتی ہے جو آج سے تقریباً تین سو سال پہلے تجارت کی غرض سے ہندستان آئے تھے۔ یہاں ان لوگوں نے سونا اگلنے والی زمین کو دیکھا اور اس پر قبضہ کرلیا۔

یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد انگریزوں نے ہندستان میں اپنی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو روبہ عمل لاکر ان لوگوں نے سارے ہندستان پر قبضہ کرلیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تاجروں کی یہ قوم یعنی انگریزوں نے معاشی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھا۔ یہاں سے وہ خام اشیاء اور دیگر ضروری اشیاء وہ اپنے ملک کو بھیجتے اور وہاں سے تیار کردہ مصنوعات کو اس ملک میں فروخت کرتے کیوں کہ یہاں انہیں ایک اچھا بازار بھی ملا۔ اس کے نتیجے میں یہاں کی دیسی صنعتیں تباہ ہوگئیں اور دستکار بیکار اور بے روزگار ہوگئے۔ بے روزگار دستکار کو مجبوراً کاشتکاری کا سہارا لینا پڑا لیکن یہاں بھی انگریز حاکموں میں مالگذاری کی شرح میں اتنی اونچی مقرر کی کہ اس کی ادائیگی غریب کسانوں کے لئے ممکن نہ ہوسکی۔ اس کے نتیجے میں غریب کسانوں کو اپنی زمینوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اب انہیں یومیہ اجرت پر مزدوری کرنی پڑی۔ انگریز تاجر تو یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے ان ضرورت مند مزدوروں کو بہت ہی کم اجرت پر اپنے اپنے کارخانے میں مامور کیا۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندستان کی معیشت کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں کرلیا۔

اس زمانہ میں ہندستان میں بہت ساری چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں اور ہر ریاست "مگر بھلا تو ہم بھلے" کے اصول پر کاربند تھی۔ ریاستوں کے مابین دوستی اور دشمنی عام تھی۔ انگریزوں نے اس نفاق کا فائدہ اٹھایا۔ انگریز ان ریاستوں کو ایک دوسرے سے برسرپیکار کرکے آہستہ آہستہ تمام ریاستوں کے مالک بن بیٹھے اور اس طرح آزاد ہندوستان محکوم بن گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نسلی غرور اور تکبر سے سرشار انگریزوں نے یہاں بھی کالے گورے کا پرچار کرنا شروع کردیا۔ ہندوستان کے وائسرائے مسٹر منٹو نے پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کو یہ خط لکھا "اس بات کو اپنے ماتحتوں کے ذہن نشین کرادیجئے کہ ہم سب انگریز شرفاء ہیں جو ایک کم حیثیت کی نسل کے لوگوں پر حکومت کرنے کے شاندار کام میں مصروف ہیں۔"

انگریزوں کے ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ اور نسلی غرور نے ہندستان میں انگریزی راج کی بنیادی نوعیت سبھوں پر عیاں کردی اور اس طرح آہستہ آہستہ سارے ہندوستان میں سامراج دشمنی تحریک شروع ہوگئی۔ ان تحریکوں اور جدوجہد میں سماج کے تقریباً تمام طبقوں کے لوگوں نے شرکت کی اور یہ جدوجہد قومی جدوجہد میں تبدیل ہوگئی۔ انگریزوں نے ہندوستان کی متحدہ اور مرکوز جدوجہد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس طرح انہیں ملک کو چھوڑنا پڑا اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوگیا۔

لیکن کیا انگریزوں نے آزادی کو سونے کی طشتری میں رکھ کر ہم لوگوں کو پیش کیا تھا؟ جی نہیں۔ ہندوستانیوں نے تن من

دھن کی قربانیاں دے کر آزادی حاصل کی۔ ہماری پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو ہوئی تھی لیکن اس سے سو سال قبل ہی انگریزوں کے خلاف سیکڑوں مزاحمتیں اور بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ ان مزاحمتوں اور بغاوتوں میں معزول راجا اور نواب، جاگیردار اور زمیندار، سابق فوجی، کسان اور دستکار اور عام لوگوں نے شرکت کی۔
بنگال اور بہار میں تو انگریزوں کی عملداری کے قیام کے بعد سے ہی بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۷۵۹ء میں یہاں کے زمینداروں اور سنیاسیوں نے بغاوت کی۔ پھر ۱۷۶۰ء کو مدنا پور کے راجہ دلبسم (۱۷۶۹-۷۲ء) نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو خراج دینے سے انکار کر دیا اور بغاوت کر دی لیکن انگریزوں نے اس بغاوت کو کچل ڈالا اور اس راجہ کی ریاست کو اپنے قلمرو میں شامل کر لیا۔
بنارس کے راجہ چیت سنگھ نے انگریزوں کو ۱۷۸۱ء میں بنارس سے مار کر نکال باہر کر دیا۔ انگریزوں کے لارڈ ہیسٹنگس تو وقت پر بھاگ نکلے ورنہ وہ بھی مارے جاتے۔ یہ بغاوت دیگر علاقوں میں پھوٹ پڑی۔ چیت سنگھ نے یہ بغاوت اس لئے کی تھی کہ انگریزوں نے اس پر خراج کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے ۵۰ لاکھ روپے کا جرمانہ عائد کر دیا تھا۔ ۱۷۹۲ء میں جب مالابار پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تو وہاں کے راجاؤں نے چھ برسوں تک انگریزوں سے جنگ کی۔ کوٹایام خاندان کے کیرل ورما راجا نے، جنہیں عام طور پر "سائیکے راجہ" کہا جاتا تھا، انگریزوں کو جنگ میں شکست دی۔ بعد میں انگریزوں نے ان سے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ اسی طرح ۱۷۹۰ء میں 'نال ناڈو' کے جاگیرداروں نے اور ۱۷۹۴ء میں وزیانگرام کے راجہ نے بغاوت کی۔ انگریزوں نے ان دونوں بغاوتوں کو دبا دیا۔ ۱۷۹۹ء میں اودھ کے معزول نواب وزیر علی نے اودھ میں انگریزوں کے افسر کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے بغاوت کر دی۔ انگریز فوجیوں سے انہوں نے مقابلہ کیا لیکن انہیں شکست ہوئی اور وہ وہاں سے فرار ہو گئے۔ پہلے نیپال پہنچے۔ پھر گورکھپور آئے۔ اس کے بعد راجپوتانہ گئے۔ لیکن وہاں جے پور کے راجہ نے انہیں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ ضلع گنجام کے زمینداروں نے ۱۷۹۸ء میں انگریزوں کے خلاف شورش شروع کی جو بعد میں بغاوت میں تبدیل ہو گئی اور یہ بغاوت ۱۸۳۲ء تک جاری رہی۔ مرہٹہ کے دھوندیا واگھ نے ۱۸۰۰ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور جنگ کی لیکن جنگ میں انہیں شکست ہوئی اور انگریز فوجیوں نے انہیں جان سے مار ڈالا۔ ۱۸۰۱ء میں ضلع گنجام کے گمسر کے زمیندار نے بغاوت کی جو ناکام ہوئی۔ ۱۸۰۱ء میں مالابار اور ڈنڈی گل کے جاگیرداروں نے ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۵ء تک آندھرا کے ساحلی علاقوں کے جاگیرداروں نے اور ۱۸۱۳ء سے ۱۸۳۴ء تک پارلاکی مڈی کے جاگیرداروں نے بغاوتیں کیں۔ ۱۸۰۵ء ٹراونکور کے دیوان تمپی نے علم بغاوت بلند کیا۔ مغربی ہندوستان کے سوراشٹر کے راجاؤں نے ۱۸۱۶ء سے ۱۸۳۲ء تک بار بار بغاوتیں کیں۔ اسی عرصہ میں جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ ٹین ویلی، سیڈیڈ اضلاع اور بیلاری، آننت پور، کڑاپا اور کرنول ضلع اور شمالی ارکوٹ نے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کے لئے بغاوتیں کیں۔ بیجاپور ضلع میں دسمبر ۱۸۲۴ء میں بغاوت پھیل گئی۔ وہاں ایک برہمن دیواکر ڈکشت نے اپنی حکومت قائم کر لی اور انگریزوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔
اسی طرح ۱۸۲۰ء میں نرسمہ دتّا نے بغاوت کی اور بلدا کا قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح ۱۸۱۷ء میں اڑیسہ کی پائیک بغاوت اور ہاتھرس کی دیا رام بغاوت، ۱۸۱۶ء کی بریلی کی شورش، ۱۸۳۱ء کی کول بغاوت اور ۱۸۴۴ء کی گڈکاری شورش میں جاگیردار انگریزی حکومت سے برسرپیکار ہو گئے۔
یہ کہا جا سکتا ہے کہ مہاراشٹر میں تو بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کتور کی بغاوت (۱۸۲۴ء سے ۱۸۲۹ء تک)، کولہاپور کی بغاوت (۱۸۲۴ء)، ستارا کی بغاوت (۱۸۴۱ء) اور گڈکریوں کی بغاوت (۱۸۴۴ء) کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے۔
شمالی ہندوستان میں بغاوتوں اور شورشوں کی کمی نہیں ہوئی۔ ۱۸۲۴ء مغربی اتر پردیش اور ہریانہ کے جاٹوں اور بلاس پور کے راجپوتوں کی بغاوت، ۱۸۱۴ء سے ۱۸۱۷ء تک علی گڑھ کے تعلقہ داروں کی بغاوت اور ۱۸۴۲ء میں جبل پور کے بندھیلوں کی بغاوت کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بنگال میں مان بھوم میں باغی سربراہ گنگا نارائن نے ۱۸۳۲ء میں انگریزوں کے

خلاف میدانِ عمل میں کود پڑے۔ اسی طرح ۱۸۴۲ء میں بندیلا
شورشوں میں جاگیردار انگریزوں کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔
اب آئیے سپاہیوں کی بغاوت کا بھی کچھ ذکر کریں۔
ہندوستانی سپاہیوں نے سب سے پہلے ۱۸۰۵ء یا ۱۸۰۶ء میں
ویلور میں بغاوت کر دی۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ مدراس
پریسیڈنسی کے فوجی افسر نے ہندوستانی سپاہیوں کے نام یہ حکم
صادر کر دیا کہ وہ داڑھی نہ رکھیں، تلک نہ لگائیں اور اپنی روایتی
پگڑی نہ پہنیں۔ ہندوستانی سپاہیوں نے مذہب میں انگریز حکام
کی دست درازی کو پسند نہ کیا۔ پہلے تو انہوں نے احتجاج کیا پھر
بغاوت کر بیٹھے۔ ان کی اس بغاوت کو انگریز فوجیوں نے دبا دیا لیکن
اس کے ساتھ ہی انہیں اپنے اس حکم کو واپس لے لینا پڑا۔ اسی طرح
۱۸۲۴ء میں برما میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں
سے ہندوستانی سپاہیوں کو بارکپور لایا گیا۔ یہاں سے انہیں رنگون
جانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن سپاہیوں نے احتجاج کیا کہ وہ اپنے مذہبی
رسومات کے پیش نظر وہ سمندر پار نہیں کر سکتے۔ نیز یہاں سے
سپاہیوں کو لے جانے کے لئے کرایہ کے سلسلے میں بھی تنازعہ رونما
ہوا۔ انگریزی حاکم انہیں پیدل چلنے کو کہتے تھے۔ بیل گاڑی یا دیگر
گاڑیاں فراہم کرنے یا خریدنے سے انگریز حکام نے انکار کر دیا۔ ان
باتوں کی وجہ سے ہندوستانی فوجیوں نے بارک پور سے جانے سے
انکار کر دیا۔ بھلا انگریز کب ہندوستانی سپاہیوں کی باتیں سنتے
انگریز کمانڈر۔ اِن۔ چیف سر ایڈورڈ پیج انگریز فوجیوں کیساتھ
بارک پور میں آموجود ہوئے۔ انہوں نے ہندوستانی سپاہیوں کو
مارچ پاسٹ کے لئے کھلے میدان میں کھڑا کر دیا۔ پہلے تو انہوں نے
سپاہیوں سے کہا کہ وہ برما کے لئے روانہ ہو جائیں، لیکن جب
سپاہیوں نے انکار کیا تو انہوں نے انگریز فوجیوں کو حکم دیا کہ ان پر
فائرنگ شروع کر دیں۔ انگریزوں نے نہتے ہندوستانی سپاہیوں
کو اپنی بندوقوں کا نشانہ بنایا' اور وہیں ۱۰۰م سپاہیوں کو گولی
مار کر ہلاک کر دیا اور فوج کی اس ڈویژن کو توڑ دیا۔
اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی راج
کی تاریخ کے پہلے سو سال میں کسانوں نے، زمین داروں نے اور چھوٹے
چھوٹے راجاؤں نے انگریزوں کے خلاف بغاوتیں کیں، لیکن وہ سب
ناکام ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بغاوتیں مقامی تھیں اور ان کا
ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نیز باغیوں میں نہ تو نیا قومی جذبہ
تھا اور نہ سامراجی نظام کو سمجھنے اور نئے سماجی رشتوں کی بنا پر
ایک نیا سماج بنانے کی صلاحیت تھی۔ نیز ان کی قیادت روایت
پرستوں کے ہاتھوں میں تھی جو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے بالکل
بے خبر تھے۔ اس لئے ان بغاوتوں اور شورشوں کو رفع کرنے میں انگریز
حکومت کو زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ لیکن غیر ملکی حکمراں کے خلاف
اس جدوجہد نے عام لوگوں کے دلوں میں بیداری پیدا کر دی۔
انگریزوں کی حکومت کے خلاف مخالفت ۱۸۵۷ء
میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی جب لاکھوں لاکھ بے دار کسانوں،
دستکاروں، سپاہیوں اور عام لوگوں نے انگریزوں کے خلاف
پہلی جنگِ آزادی میں شرکت کی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی
(جسے انگریز آج بھی عوامی بغاوت کہتے ہیں) کے بہت سارے اسباب
ذاتی، سیاسی، معاشی، مذہبی تھے۔ نیز انگریزوں کے ظلم و ستم اور
لوٹ کھسوٹ نے ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی تھی۔ یہ جنگ
بدیسی حکومت کے خلاف عوام کی مجموعی شکایتوں کا نتیجہ تھی۔ کسان
شاکی تھے کہ انکی زمینیں حکومت نے چھین لی تھیں کیونکہ وہ
سرکاری مالگذاری ادا نہیں کر سکے۔ مذہبی اور تہذیبی کام کرنے
والوں مثلاً پروہت، عالم، پنڈت اور مولوی کو شکایت تھی کہ ان
کے سرپرستوں یعنی دیسی حکمرانوں اور زمین داروں کا اقتدار ختم
ہو جانے کی وجہ سے ان کی آمدنی کے ذرائع ختم ہو گئے، زمین داروں
تعلقداروں اور جاگیرداروں کی اکثریت ایسی تھی جنکی زمینداریاں
اور جاگیریں حکومت نے ضبط کر لی تھیں۔ لارڈ ڈلہوزی کی ایسی
ریاستوں کو انگریزی قلمرو میں شامل کرنے کی پالیسی نے راجے،
نوابوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی فوج
سپاہی کم تنخواہ، محنت اور انگریز افسروں کے حقارت آمیز رویہ
کے شاکی تھے۔ انگریز ہندوستانی سپاہیوں کو گھٹیا مخلوق
تھے۔
۱۸۵۷ء تک آتے آتے ایک عوامی انقلاب اور

کے لئے حالات سازگار ہوگئے۔ بارود کے لئے چربی لگے ہوئے کارتوسوں کا واقعہ چنگاری بن گیا۔ انگریزوں نے ہندوستانی سپاہیوں کو نئی رائفلیں سپلائی کی تھیں۔ ان رائفلوں کے کارتوسوں پر چربی لگا کاغذ منڈھا ہوا ہوتا جسے استعمال کرنے سے پہلے دانت سے کاٹنا پڑتا۔ یہ چربی سور اور گائے کی تھی۔ اسی لئے مذہبی جذبات کی توہین نے ہندوستانی سپاہیوں کو ناراض کر دیا۔ وہ بغاوت کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے یہ واقعہ کلکتہ کے نزدیک بارک پور میں رونما ہوا۔ یہاں کے ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی لیکن یہاں انگریزی سپاہیوں نے انہیں دبا دیا، بہت سے ہندوستانی سپاہیوں کو مار ڈالا، بہت سے کو پھانسی کے پھندے سے لٹکا دیا۔ لیکن وہ بغاوت کے شعلے کو بھڑکنے سے نہ دبا سکے۔ ۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں سپاہیوں نے بغاوت کی۔ اس کے بعد یہ بغاوت پھیلتی گئی۔ میرٹھ کے سپاہیوں نے اپنے افسروں کو قتل کر دیا اور دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ دوسرے دن صبح کو دہلی پہونچ گئے۔ دہلی کے سپاہیوں نے بھی بغاوت کر دی۔ اور شہر پر قبضہ کر کے معمر بہادر شاہ کی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔ اب یہ بغاوت جنگ آزادی میں تبدیل ہو گئی اور شمال میں پنجاب، جنوب میں نربدا، مشرق میں بنگال، بہار اور مغرب میں راجپوتانہ کے وسیع علاقوں میں پھیل گئی۔ اس جنگ میں ہندوستان کے تمام سپاہیوں نے، جاگیرداروں اور زمینداروں نے، کسانوں، دستکاروں، مزدوروں اور عام لوگوں نے شرکت کی۔ عوام بھالے، کلہاڑی، کمان اور تیر، لاٹھی اور درانتی اور پرانی قسم کی بندوق کے ساتھ میدانِ عمل میں کود پڑے۔ عام لوگوں نے بڑی تعداد میں اس جنگ میں شرکت کی۔ ایک تخمینہ کے مطابق صرف اودھ میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں کام آنے والے ڈیڑھ لاکھ لوگوں میں سے ایک لاکھ عام شہری تھے۔ انگریزی سامراجیوں کو ہندوستان میں چند راجاؤں اور نوابوں کی حمایت حاصل تھی۔ محبانِ وطن انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے کیوں کہ ان کے پاس نہ اسلحہ تھے، نہ تنظیم تھی اور نہ متحدہ قیادت تھی۔ ان خامیوں کی وجہ سے انگریزوں نے اپنے وسائل اور جدید ترین اسلحہ جات کو کام میں لا کر انہیں بیدردی سے کچل ڈالا۔ ۲۰ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور شہنشاہ بہادر شاہ کو گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا۔ دوسرے رہنما بہادری سے مقابلہ کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ ان سبھوں کو شکست ہوئی۔ کانپور میں نانا صاحب نے شکست کھائی۔ جھانسی کی رانی ۱۷ر جون ۱۸۵۸ء کو میدانِ جنگ میں کام آئیں۔ ۱۸۵۹ء تک بہار کے کنور سنگھ، بخت خاں، جو دہلی میں ہندوستانی فوج کے سپہ سالار تھے، بریلی کے خان بہادر خاں اور فیض آباد کے مولوی امان اللہ خاں سب ختم ہو چکے تھے۔ اودھ کی بیگم کو ہندوستان چھوڑ کر نیپال جانا پڑا۔ ۱۸۵۹ء کے آخر تک ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں گرچہ ہندوستان کو شکست ہوئی تاہم اس جنگ نے دو تین باتوں کو بالکل عیاں کر دیا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہندو مسلم اتحاد قائم ہو گیا۔ اس جنگ کے دوران سپاہیوں، عام لوگوں اور ان کے رہنماؤں، ہندو اور مسلمان، دونوں میں مکمل اتحاد و اشتراک تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس جنگ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ۱۸۵۷ء سے قبل کے زمانہ میں جسے عہدِ وسطیٰ کہتے ہیں، ہندوستان کے لوگ اور یہاں کی سیاست فرقہ پرستی سے پاک تھی۔ تیسری بات یہ کہ شکست کے بعد ہندوستانیوں نے تنظیموں کی تشکیل کا کام شروع کر دیا اور ہندوستان کے لوگ ان کے جھنڈے تلے ایک ہو کر جدوجہد کو جاری رکھا۔ اس کے ساتھ قومی یکجہتی کو فروغ دینا شروع کر دیا۔

اب آئیے قبائلیوں اور کسانوں کی تحریکوں اور جدوجہدِ آزادی کا ذکر کریں۔ قبائلی ملک کے ایک بڑے حصے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے سینکڑوں بغاوتوں میں حصہ لیا۔ قبائلی اپنی سیدھی سادی زندگی اپنے طور پر گزارنا چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے انہیں بھی اپنے معاشی نظام کے تحت لانا شروع کر دیا تاکہ ان کی بھی لوٹ کھسوٹ کی جا سکے۔ قبائلیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوتیں کیں اور قربانیاں دیں۔ وہ صرف کلہاڑی اور تیر و کمان لیکر میدان میں اتر پڑے، لیکن وہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے کیوں کہ انگریزی فوج جنگ کے جدید سازوسامان سے لیس تھی۔ قبائلیوں کی

[illegible] چند اہم بغاوتیں درج ذیل ہیں: کولوں کی بغاوت (سنہ [illegible] تا سنہ ۱۸۳۷ء)، سنتھالیوں کی بغاوت (سنہ ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۸۵۶ء)، رمپا کی بغاوت (سنہ ۱۸۷۹ء) اور منڈوؤں کی بغاوت (سنہ ۱۸۹۵ء تا سنہ ۱۹۰۱ء)

کسانوں نے، جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے، انگریز حکومت کے خلاف شورشوں، بغاوتوں اور پہلی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سنہ ۱۸۵۷ء سے زمینداروں یا چھوٹے موٹے راجہ یا نوابوں کی رہنمائی میں جتنی بھی شورشیں اور بغاوتیں ہوئیں کسان انکی روح رواں ہوتے۔

نوآبادیاتی نظام اور اس کے استحصال کے سب سے بڑے شکار تو کسان ہی تھے، اس لئے انہیں ہر قدم پر مزاحمت کرنی پڑی، لڑنا پڑا۔ انگریز حکومت کے ساتھ ساتھ زمیندار، مالکان آراضی اور مہاجنوں نے بھی کسانوں کا استحصال کرنا شروع کر دیا۔ کسان دن رات محنت کرتے، لیکن انہیں دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ ان باتوں کی وجہ سے سارے ہندوستان میں کسانوں نے چھوٹی جماعتیں بنا لیں اور اس طرح متحدہ طور پر ان لوگوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے براہ راست حکومت، چائے اور کافی کے باغات کے انگریز مالکوں اور مقامی زمینداروں اور مہاجنوں سے ٹکر لینی شروع کر دی۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد سے کسانوں کی اس جدوجہد نے شدت اختیار کر لی۔

گزشتہ صدی کی سب سے بڑی کسان تحریک سنہ ۱۸۵۹-۶۰ء کی نیل کی تحریک تھی۔ اس کی زد میں پورا بنگال آ گیا۔ نیل کی کاشت پر یورپین لوگوں کو اجارہ داری حاصل تھی۔ یہ بدیسی مالک کسانوں سے نیل کی کاشت کرنے پر مجبور کرتے اور ان پر طرح طرح کے مظالم کیا کرتے تھے۔ نیز کسانوں کو نیل غیر نفع بخش شرح پر فروخت کرنے پر مجبور کرتے۔ کسانوں کو انکار کرنے پر غیر قانونی طور پر انہیں جسمانی سزائیں دیتے۔ کسانوں نے سنہ ۱۸۵۹ء میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے نیل کی کاشت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور نیل کی کوٹھیوں کے مالکوں اور ان کے مسلح ملازموں کے ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بنگال کے دانشوروں نے بھی کاشتکاروں کا ساتھ دیا۔ آخر میں کاشتکاروں کو فتح حاصل ہوئی اور حکومت کو ایک کمیشن مقرر کرنا پڑا، تاکہ نیل کے کاشتکاروں کی دشواریوں کو دور کیا جا سکے۔

نیز دربھنگہ اور چمپارن میں نیل کے کسانوں نے سنہ ۱۸۶۶ء اور سنہ ۱۸۶۸ء میں وسیع پیمانہ پر بغاوتیں کیں۔ اسی طرح بنگال میں جیسور کے کسانوں نے سنہ ۱۸۸۳ء اور سنہ ۱۸۸۹-۹۰ء میں بغاوتیں کیں۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں مشرقی بنگال کے کسانوں نے زمینداروں کے خلاف بغاوت کی۔ وہاں زمیندار غریب کسانوں پر طرح طرح کے ظلم کیا کرتے۔ بے دخلی، دھاندلی، قطعات آراضی پر بے جا قبضہ، لگان میں اضافہ عام بات بن چکا تھا۔ یہاں کے کسانوں نے سنہ ۱۸۷۲ء سے سنہ ۱۸۷۶ء تک زمینداروں اور حکومت سے منظم ہو کر مقابلہ کیا اور آخرکار حکومت کو مجبور کیا کہ وہ کسانوں کو زمینداروں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھنے کیلئے قانون بنائے۔ سارے ہندوستان میں کسان حکومت، زمینداروں اور مہاجنوں سے بیزار تھے۔ حکومت کی مالگذاری کی شرح بہت اونچی تھی، جسے ادا کرنا غریب کسانوں کے لئے ناممکن تھا، نیز غریب کسانوں کو مہاجنوں سے اعلیٰ شرح سود پر قرض لیکر کھیتی باڑی کرنی پڑتی۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ غریب کسان سال بھر محنت کر کے جو فصل اگاتے وہ سب کے سب حکومت، زمینداروں اور مہاجنوں کے گوداموں میں چلے جاتے۔ ان تمام باتوں سے برافروختہ ہو کر مہاراشٹر کے پونا اور احمد نگر ضلعوں کے کسانوں نے سنہ ۱۸۷۵ء میں بڑے پیمانے پر بغاوت کی۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں احمد نگر کے کسانوں نے مہاجنوں کا بائیکاٹ کیا اور قطعات آراضی کے تمسک قرض کی دستاویزیں مہاجنوں سے چھین کر عام مجمع میں جلا دیں۔ اس شورش کو روکنے کے لئے حکومت کی پوری مسلح فوج میدان میں اتر آئی۔ اسی طرح سنہ ۱۸۳۸ء سے سنہ ۱۸۵۴ء تک مالابار کے موپلا کسانوں نے مالکان آراضی کے ظلم کے خلاف بغاوتیں کیں۔ پھر سنہ ۱۸۷۳ء سے سنہ ۱۸۸۰ء میں موپلا کسانوں کی ان بغاوتوں نے جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ سنہ ۱۸۹۱-۹۲ء میں مالگذاری کے خلاف آسام کے کسانوں نے مالکوں اور حکومت کے خلاف جم کر مقابلہ کیا۔ اس تحریک کو دبانے کے لئے حکومت نے فوج اور مسلح پولس کو استعمال کیا۔ بہت سارے کسان گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بنے۔ اسی

زمانہ میں پولس اور فوج نے جن وحشیانہ طریقوں سے کسانوں کو دبایا اسے آسام کے لوگ آج تک فراموش نہ کر سکے۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۹ ویں صدی میں کسانوں نے جتنی بھی تحریکیں اور بغاوتیں کیں وہ کبھی بھی انگریز سامراجیوں کے لئے باعث خطرہ نہ بن سکیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں اور بغاوتیں علاقائی تھیں۔ اس لئے انھیں نوآبادیاتی معاشی نظام کے ظلم و ستم کے خلاف کسانوں کا فوری ردِ عمل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جہاں کسانوں نے زمینداروں اور مہاجنوں کے خلاف جدوجہد کی وہاں وہ حکومت کے ساتھ نبرد آزما ہو گئے، کیوں کہ جب تک بدیسی حکومت یہاں رہے گی انہیں ظلم و ستم اور استحصال سے دوچار رہنا پڑے گا۔ ان سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ عملی طور پر ہندستان کے ان پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ کسانوں اور لوگوں نے ہندستان کے جدید تعلیم یافتہ اور امراء کے مقابلہ میں نوآبادیاتی خطرے کو محسوس کرنے کی زیادہ صلاحیت کا ثبوت دیا۔ کسانوں نے جدوجہد کی، قربانیاں دیں، بے مثال بہادری کا ثبوت پیش کیا لیکن جدید ہتھیاروں سے لیس سامراجی حکومت کا وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ کسانوں کے پاس کوئی نیا نظریہ نہ تھا اور نہ سامراج کے پیدا کردہ سماجی حالات کو سمجھنے اور ان کی بنیاد پر سماجی، معاشی اور سیاسی منصوبے بنانے کی صلاحیت۔ ان کے پاس سماجی تقاضوں کا ایسا کوئی تصور نہ تھا جو لوگوں کو بڑے پیمانہ پر متحد کر سکے اور جدید سامراج کو شکست دے سکے۔ اس کے لئے تو ایسی جنگ کی ضرورت تھی جس کی پشت پر جدید خیالات اور سمجھ بوجھ، سماج کی ایک نئی بصیرت اور ایسے نظریات اور جماعتیں ہوں جو لوگوں کو قومی سطح پر سیاسی تحریکات کے لئے آمادہ کر سکیں۔

اسی طرح قومی سیاسی بیداری نشوونما پانے لگی اور انیسویں صدی کے آخری دو دہائیوں میں ہندستان میں بہت ساری سیاسی تنظیمیں عالم وجود میں آگئیں۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ بہت ساری مقامی اور علاقائی انجمنیں بھی قائم ہوئیں، جو سیاسی سرگرمیوں میں مصروف عمل تھیں۔ ۲۰ ویں صدی کی دوسری دہائی میں روس میں اشتراکیت کی فتح کے دیگر ملکوں کے ساتھ ساتھ ہندستان پر بھی اچھا خاصا اثر پڑا اور کمیونسٹ اور اشتراکی پارٹیاں، مزدوروں اور کسانوں کی سبھائیں قائم ہوئیں۔ اب یہاں کے مزدوروں اور کسانوں نے کل ہند پیمانہ پر جدوجہد آزادی شروع کر دی۔ اس دوران سامراجی حکومت بھی خاموش بیٹھی نہیں رہی۔ اس نے ہر موقع پر مزدوروں اور کسانوں کے احتجاج کو طاقت کے ذریعہ دبانے کی کوشش کی۔ لیکن کسان اور محنت کش لوگ طاقت کے آگے سر نہ جھکائیں اور قومی جدوجہد میں دیگر سیاسی پارٹیوں کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے۔

میں یہاں منشی گنج کے ایک حادثے بابت لکھئے کہ ایک ایسے کا ذکر کروں گا، جہاں ظالم انگریز حکومت کی مسلح فوجیوں اور پولس نے نہتے کسانوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا اور سیکڑوں کسانوں کو مار ڈالا۔ اس کی وجوہ تو بہت ہیں لیکن ایک اہم وجہ یہ تھی کہ کسانوں نے اپنی تنظیم قائم کر لی تھی اور حکومت اس تنظیم کو توڑنا چاہتی تھی۔ واقعہ کی تفصیل یوں ہے:

منشی گنج ایک گاؤں ہے اور رائے بریلی کے پاس سئی ندی کے کنارے واقع ہے۔ اس گاؤں سے شہر جانے کیلئے اس ندی پر مغلوں کے زمانے کا تعمیر کردہ ایک پُل تھا، لیکن آج سے ۴۰ سال پہلے یہ پُل ٹوٹ گیا۔

آج سے ۶۵ سال پہلے اس گاؤں میں تقریباً ۱۰۰۰۰ کسانوں کا ایک احتجاجی اجتماع ہوا تھا۔ کسان اس ندی کے کنارے تقریباً ڈیڑھ سو کیلو میٹر تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس ندی کے دائیں ایک اونچی اور لمبا پشتہ تھا، جہاں ریلوں کی آمد و رفت کے لئے لائن بچھی ہوئی تھی۔ کسان یہاں احتجاج کرنے کے لئے یکجا ہوئے تھے کیونکہ ان کے سربراہوں کو حکومت نے گرفتار کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے وہاں سے ہٹ جانے سے انکار کیا کہ جب تک کہ ضلع مجسٹریٹ ان کے رہنا شری امل شرما اور بابا جانکی داس، جو مشہور کسان رہبر بابا رام چندر کے ساتھی تھے، کو رہا نہ کر دے۔ شری شرما اور بابا جانکی داس کو ۵ ر جنوری ۱۹۲۱ء کو رائے بریلی سے تقریباً ۴۵ کیلو میٹر کی دوری پر واقع چندنیا گاؤں سے گرفتار

[illegible] اور اسی گاؤں میں ہزاروں کسانوں نے تعلقداروں کے ظلم کے خلاف ایک احتجاجی جلسے کا انتظام کیا تھا۔ جب کسانوں [illegible] سربراہوں کی گرفتاری کی خبر سنی تو انہوں نے رائے بریلی جیل تک جانے اور اپنے رہبروں کو وہاں سے آزاد کرانے کا فیصلہ کیا۔ تعلقداروں کے ظلم اور انگریز حکومت کی بے رُخی اور بے دلی کے خلاف پرزور احتجاج کرتے ہوئے تمام مذاہب و ملتوں کے ہزاروں ہزار کسانوں نے "جئے جئے سیارام" کا نعرہ لگاتے ہوئے رائے بریلی کو روانہ ہوئے۔ اس سے صرف چار مہینہ قبل پاس کے ضلع پرتاپ گڑھ کے کسانوں نے اپنی اجتماعی طاقت کا اظہار کرکے اپنے گرفتار رہبروں کو قید سے رہا کرایا تھا۔ اس بار بھی کسانوں نے ویسی ہی کرنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف حکام نے پرتاپ گڑھ کے واقعہ سے ایک سبق حاصل کرلیا تھا۔ اس لئے انہوں نے گرفتار سربراہوں کو عدالت میں پیش کردیا۔ عدالت نے ان کے سلسلے میں اپنا فیصلہ صادر کردیا اور پھر انہیں لکھنؤ جیل میں منتقل کردیا گیا۔ یہ تمام کام چند گھنٹوں میں مکمل کرلئے گئے۔

۶ جنوری ۱۹۲۱ء کو رائے بریلی شہر میں حکم امتناعی نافذ کردیا گیا، اور منشی گنج پل پر بیل گاڑیوں سے ناکہ بندی کردی گئی تاکہ مزدور سب یہاں سے شہر کو جانہ سکیں۔ اس دن شام ہوتے ہوتے وہاں ۱۰۰۰۰ مزدور جمع ہوگئے۔ انہیں منشی گنج پل پر مسلح پولس نے روک دیا۔ لیکن کسان اپنے مطالبات پر اڑے رہے کہ جب تک ان کے رہنماؤں کو رہا نہیں کیا جائے گا وہ سب وہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ اس طرح پولس نے اس پل پر اپنی چوکسی کو جاری رکھا۔ اتنے میں ایک افواہ پھیلی کہ امل شرما اور جانکی داس کو پولس نے مار ڈالا۔ مزدوروں کے اجتماع میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی حکام نے یہ افواہ پھیلادی کہ بازار لوٹ لیا گیا ہے، ان باتوں سے صورت حال اور بھی سنگین ہوگئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر مزدوروں کے چند مقامی رہنماؤں نے پنڈت موتی لال نہرو کے، جو الٰہ آباد میں رہتے تھے، نام ٹیلی گرام بھیج دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ یہاں آئیں اور صورت حال کو سنبھالیں۔ اسی دوران اسی رات کو انتظامیہ نے لکھنؤ سے مزید فوج اور گھوڑ سوار پولس کو بلا لیا اور انہیں پل پر متعین کردیا۔

۷ جنوری ۱۹۲۱ء کی صبح کو پل ایک محاذ جنگ بن چکا تھا۔ اس کے ایک طرف ہزاروں نہتے کسان اور مزدور تھے، جو پل پر، ندی کے ساحل پر اور پاس کے کھیتوں میں پھیلے ہوئے تھے، اور دوسری طرف مسلح افواج اور گھوڑسوار پولس تھی۔ کسان رہ رہ کر پولس کے اس دائرہ کو توڑ کر پل پار کرنے کی کوشش کرتے تو پولس انہیں پیچھے دھکیل دیتی۔ اسی اثنا میں وہاں یہ خبر پہنچی کہ اسی دن سہ پہر کو الٰہ آباد سے وہاں جواہر لال نہرو آرہے ہیں۔ مقامی رہنماؤں نے ضلع مجسٹریٹ سے درخواست کی کہ وہ مجمع کو منتشر کرنے کے لئے جور و جبر کا استعمال نہ کرے اور نہرو کا انتظار کرے، لیکن ان لوگوں کو یہ یقین تھا کہ نہرو کسانوں کو پرامن طور سے واپس جانے کے لئے راغب کرسکیں گے۔ لیکن اس کی جگہ ضلع مجسٹریٹ نے ایک کانسٹبل کو ریلوے اسٹیشن بھیج دیا اور اس کے ہاتھ میں نہرو کے نام ایک خط بھی دیا۔ اس خط میں نہرو سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ منشی گنج نہ آئیں۔

نہرو اسٹیشن پر پہونچے۔ پہلے تو گاڑی کے لئے انتظار کیا۔ جب گاڑی نہ ملی تو انہوں نے منشی گنج پیدل جانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ منشی گنج کتنی دوری پر واقع ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہاں سے تین میل کی دوری پر۔ تب انہوں نے پیدل چلنا شروع کیا۔ راستہ میں تقریباً ۱۵۰۰ لوگ ان کے ساتھ ہوگئے۔ لیکن ان کے منشی گنج پہونچنے میں صرف چند منٹوں کی دیر ہوگئی۔ جیسے ہی جواہر لال نہرو دریا کے کنارہ پل کے پاس پہونچے تو پل کے اس پار سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں اور انہیں وہیں پر فوج نے روک دیا۔ اور پل پر جانے نہیں دیا۔

پل کی دوسری طرف کسانوں کا مجمع نہرو کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں کے ضلع مجسٹریٹ کے دوست تعلقدار سردار بربل سنگھ نے، جو اس وقت یہاں موجود تھے، جب انہیں نہرو کے آنے کی خبر ملی، فوراً وہاں سے کسانوں کی بھیڑ بھاڑ کو جبراً ہٹانے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام ہوئے۔ سردار بربل سنگھ تھے ایک تعلقدار، علاوہ یہ کیسے برداشت کرتے کہ ان کی پرجا ان کی بات نہ مانیں،

کا حکم عدولی کریں۔ غصہ سے وہ بھپر اٹھے۔ اتنے میں انہوں نے اپنی
ایک رعیت شیو بالک کو دیکھا جو کسانوں کے ایک طبقہ کی سربراہی
کر رہا تھا۔ انہوں نے شیو بالک کو حکم دیا کہ وہ وہاں سے چلا جائے،
لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر تعلقدار نے فوراً
اپنے ریوالور سے شیو بالک اور اس کے تین ساتھیوں پر فائر
کر دیا۔ شیو بالک اور اس کے تین ساتھی وہیں ہلاک ہو گئے۔
بس پھر کیا تھا۔ انگریز فوجیوں اور گھڑ سواروں نے ریوالور کی آواز
سنتے ہی نہتے کسانوں پر گولیوں کی بوچھار کر دی۔ بہت سارے
کسان وہیں جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ جو کسان کھیت کی طرف کھڑے
تھے وہ تو بھاگ سکے لیکن جو کسان ندی کے ساحل پر کھڑے تھے وہ
بھاگ نہ سکے، ان کے دائیں طرف پل تھا اور پل پر وہ جا نہیں سکتے
تھے کیوں کہ وہیں سے فوجی گولی چلا رہے تھے، ان کے لئے بچاؤ کا
واحد راستہ یہ تھا کہ وہ وہیں سے ندی میں کود جائیں۔ اس طرح
بہت سے کسانوں نے ندی میں کود کر خود کو گولیوں کے نشانہ سے
بچایا۔ کئی ایک کسان تو کنویں میں کود پڑے۔ چند ہی منٹوں میں
وہ میدان ایک قبرستان میں بدل گیا۔

اس پل کی دوسری طرف ملٹری نے جواہر لال نہرو کو
پل پار کرنے سے روک دیا تھا۔ اس بات کا نہرو نے اپنی سوانح
حیات میں یوں ذکر کیا ہے " میں وہاں انتظار کر رہا تھا، اتنے میں
بہت سارے کسانوں نے مجھے گھیر لیا، وہ سب سہمے ہوئے تھے اور
فوج اور پولس کے ڈر سے کھیتوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ میں نے ان
سے بات چیت کی۔ انہیں دلاسہ دیا۔ یہ بہت ہی غیر معمولی
صورت حال تھی۔ صرف چند گزوں کے فاصلے پر ہمارے بھائیوں کو
گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور ہم سب بے بس کھڑے تکتے رہے
کیوں کہ چاروں طرف فوج کھڑی تھی۔"

فوراً ضلع مجسٹریٹ فائرنگ لائن سے وہاں واپس
آئے اور وہاں سے وہ نہرو کو اپنے ساتھ لیکر کلکٹر کے دفتر میں
آئے اور یہیں نہرو کو ایک نہ ایک بہانہ سے دو تین گھنٹوں تک
بٹھائے رکھا گیا تاکہ نہرو جائے وقوع پر نہ جا سکیں۔ نہرو
کو وہیں سے واپس جانا پڑا۔

رات ہو گئی، منشی گنج سنسان ہو گیا۔ کھیتوں میں ادھر
ادھر سینکڑوں نعشیں بکھری پڑی ہوئی تھیں۔ حکومت نے ان نعشوں
کو چوری چھپے وہاں سے ہٹانے کا بہت جلد انتظام کیا۔ بہت سی
نعشوں کو اسی کھیت میں دفنا دیا گیا اور بہت سی نعشوں کو کشتیوں
کے ذریعہ دیگر علاقوں میں لے جایا گیا، نیز ندی میں ڈبو بھی دیا گیا۔
وہاں بہت سے مزدور، جو گولیوں سے زخمی ہو گئے تھے وہیں پڑے
تھے۔ ان میں سے چند کو ہسپتال لے جایا گیا۔ نیز پانچ چھ سو
مزدوروں کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔

ضلع مجسٹریٹ کے بیان کے مطابق یہاں صرف پانچ
منٹ تک فائرنگ ہوئی تھی اور صرف دس افراد مارے گئے تھے۔
ریاست ہائے متحدہ آگرہ و اودھ (موجودہ اتر پردیش) کے گورنر
نے بذریعہ تار ضلع مجسٹریٹ اور تعلقدار کو مبارکباد دی اور کہا
کہ انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

جہاں تک سارے ہندستان کا تعلق ہے منشی گنج کو
ایک مقامی معاملہ کہہ کے فراموش کر دیا گیا، دو چار اخبارات کے سوائے
کسی نے بھی اس واقعہ کا تفصیل سے ذکر نہیں کیا، اور وہ کرتے
بھی کیوں، شہید ہونے والے تو غریب کسان تھے اور ایک سرمایہ
دارانہ نظام میں غریب کو کوئی جگہ حاصل نہیں۔ منشی گنج کے واقعہ
کو لوگوں نے تو فراموش کر دیا لیکن آج بھی منشی گنج میں چند ایسے
بزرگ باحیات ہیں، جو سانحہ کے دوران موجود تھے۔ ۸۰ سالہ
شری مدن موہن آج بھی منشی گنج میں موجود ہیں جو رائے بریلی مجاہدین
آزادی کی ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں
سے وہاں کے کنویں سے ۵۰ نعشیں نکالی تھیں۔ انہیں یہ واقعہ اب
بھی یاد ہے کہ یہاں فائرنگ میں کم و بیش ۷۵۰ کسان مارے گئے
تھے اور ہزاروں زخمی ہوئے تھے۔

آزادی کے ۱۲ سال بعد ۱۹۵۸ء میں یہ فیصلہ کیا گیا
کہ یہاں ان شہید کسانوں کی یاد میں ایک مینار تعمیر کیا جائے۔ مینار
تعمیر ہو گیا۔ لیکن اس کا افتتاح کسی نے نہیں کیا۔ نتیجہ میں اس
مینار کو سئی ندی میں پھینک دیا گیا۔ سئی ندی نے شاید یہ سمجھتے
ہوئے اسے قبول کر لیا کہ جب سینکڑوں شہید کسانوں کو سمندر میں

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

مغربی بنگال میں چھوٹی آبپاشی

از ——— کنائی بھومک

مغربی بنگال میں بہت ساری ندیاں ایسی ہیں جنہیں پانی کے لئے بارش پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایسی ندیوں سے سال بھر مسلسل پانی سپلائی نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی بنگال جیسی ایک ریاست جسے اکثر خشک سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے میں چھوٹی آبپاشی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان علاقوں میں جن کا مجموعی رقبہ ۲۰۰۰ ہیکٹر سے کم ہے، چھوٹی آبپاشی کے تحت آبپاشی کے لئے پانی سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس ریاست میں [illegible] ہیکٹر قابل کاشت اراضی کے لئے آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہیں، جن میں سے ۲۸ لاکھ ہیکٹر قابل کاشت اراضی کے لئے چھوٹی آبپاشی کے تحت پانی سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس لئے چھوٹی آبپاشی کو کافی اہمیت دی جاتی ہے۔ ۱۹۷۶-۷۷ء تک صرف ۱۳ء۵ لاکھ ہیکٹر کے لئے آبپاشی کی سہولتیں فراہم تھیں، جبکہ گزشتہ ۹ سال کے عرصہ میں مزید ۱۲ء۵ لاکھ ہیکٹر کے لئے چھوٹی آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ اس وجہ سے بوروردھان کی پیداوار ۱۹۷۶-۷۷ء، ۱۹۸۱-۸۲ء اور ۱۹۸۴-۸۵ء میں علی الترتیب ۴۰۰ء۳ ہیکٹر میں ۵۷۸ء۰۰ ٹن، ۰۰۷ء۲۲ ہیکٹر میں ۳۸۹ء۰۰ ٹن اور ۷۳ء۲۲۰ ہیکٹر میں ۳۸۹ء۱۷ ٹن ہوگئی تھی جبکہ ۱۹۸۵-۸۶ء اور ۱۹۸۹-۹۰ء میں علی الترتیب ۳ء۵ لاکھ ہیکٹر میں ۳ء۳ لاکھ ٹن اور ۴ء۱۷ لاکھ ہیکٹر میں ۳ء۲۷ لاکھ ٹن پیداوار ہوگی۔ اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۸۵-۸۶ء میں بوروردھان کی پیداوار ۴ لاکھ ٹن سے زیادہ ہوگی۔

چھوٹی آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ کرنے کے لئے جگہ جگہ کم گہرے، گہرے ٹیوب ویل بٹھائے اور کنویں کھودے جاتے ہیں۔ اس کام کے لئے حکومت امداد بھی فراہم کرتی ہے۔ اسی طرح چھوٹی آبپاشی کے لئے ۱۹۷۶-۷۷ء میں کم گہرے ٹیوب ویلوں کی تعداد ۴۸۰۹۳ تھی جو بڑھ کر اب ۲۲۴۸۷ ہوگئی۔ ان میں سے سرکاری ٹیوب ویلوں کی تعداد ۳۲۰۹ ہے۔ اسی طرح کھودے گئے کنوؤں کی تعداد ۱۹۷۹-۸۰ء میں ۲۷۲۰۹ تھی جو بڑھ کر اب تقریباً ۷۵۳۰۹ ہوگئی۔ ۱۹۷۶-۷۷ء میں ایسے کنوؤں کی تعداد اور بھی کم تھی۔ نیز بہت سارے تالاب بھی کھودے گئے۔ چھوٹی آبپاشی کے بہت سارے پروجیکٹوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا۔ ۲۹۸۴ گہرے ٹیوب ویل حکومت کے زیر ملکیت ہیں۔ ان میں سے چند ٹیوب ویل مغربی بنگال چھوٹی آبپاشی کارپوریشن کے اور چند جامع علاقائی ترقیات کارپوریشن کے ہیں۔ گہرے ٹیوب ویلوں اور دریا سے پانی اٹھا کر آبپاشی کرنے کے پروجیکٹوں پر کافی رقوم خرچ کی جاتی ہیں۔ اور یہاں اس بات کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کی طرف سے اس بات کی کوششیں کی گئیں کہ ان کی تعداد میں مزید اضافہ کیا جائے اور انہیں مستحکم بنیاد پر قائم کرکے چھوٹی آبپاشی کے لئے انہیں انتہائی حد تک بروئے کار لایا جائے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اقدامات کا ذکر کیا جا سکتا ہے:

(۱) گہرے ٹیوب ویلوں اور دریا سے پانی اٹھا کر آبپاشی کرنے کے پروجیکٹوں سے متعلق چھوٹی آبپاشی کی تنصیبات کو مرکزی طور پر بروئے کار لایا جا رہا ہے تاکہ خاطر خواہ اور بہتر نتائج حاصل ہوں۔ (۲) آبپاشی آبی تفتیش تنظیم نے اپنے تحقیقی پروگرام کے تحت گروچ کے سلسلے میں جو گہرے ٹیوب ویل نصب کئے تھے اب انہیں پیداواری ٹیوب ویلوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔
(۳) پرانے اور ناکارہ گہرے ٹیوب ویلوں کی مرمت کرکے پھر دوبارہ انہیں بٹھایا جا رہا ہے (۴) کم گہرے ٹیوب ویلوں کو پھر سے بٹھایا جا رہا ہے۔ اب ایسے ٹیوب ویلوں کے ساتھ زمین

دوز پانی کی سطح تک پمپ بھی نصب کیا جارہا ہے۔ نیز تیل سے چلنے والی ٹیوب ویل مشینوں کو بھی بجلی سے چلنے والی مشینوں میں تبدیل کر دیا جا رہا ہے۔ سات برسوں کے عرصہ کے بعد حکومت کی براہ راست نگرانی میں ۲۰۰ گہرے ٹیوب ویلوں کو بٹھانے کا کام جاری ہے۔ خشک سالی کے عرصہ میں عارضی طور پر ندیوں سے پانی اٹھا کر آبپاشی کرنے کے ۳۰۰ تنصیبات نصب کئے گئے تھے۔ اب انہیں مستقل بنا دیا جا رہا ہے۔ زمین دوز پمپ کے ساتھ ۳۰۰ کم گہرے ٹیوب ویلوں کو بٹھانے کے لئے جگہوں کی تلاش جاری ہے۔

چھوٹی آبپاشی پروجیکٹوں کے لئے لوگوں کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کرنے کے پیش نظر عالمی بنک کی مدد سے ایک ماسٹر پلان کو بروئے کار لایا جارہا ہے۔ پانچ سال کے عرصہ میں ان اسکیموں پر ۹۶۷ر۱۵۵ کروڑ روپئے خرچ کئے جائیں گے، اور اس کے نتیجہ میں ۳۸ر۱ لاکھ ہیکٹائرس قطعات اراضی کو چھوٹی آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہوں گی۔ اس اسکیم میں چھوٹی آبپاشی کے لئے مندرجہ ذیل تعمیرات کی گنجائش رکھی گئی ہے:

(۱) ۱۲۰۰ بڑے ٹیوب ویل (ہر ٹیوب ویل سے ۱۰۰ ایکڑ قطعات آراضی کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہوں گی یعنی کمانڈ علاقہ ۱۰۰ ایکڑ ہے)

(۲) ۴۰۰ متوسط درجہ کے ٹیوب ویل (کمانڈ علاقہ ۵۰ ایکڑ)

(۳) ۱۸۰۰ چھوٹے چھوٹے ٹیوب ویل، ہر ٹیوب ویل سے زمین دوز پمپ بھی وابستہ ہوگا (کمانڈ علاقہ ۱۵ ایکڑ)

(۴) ۵۰۰۰ کم گہرے ٹیوب ویل مع پمپ (کمانڈ علاقہ ۱۵ ایکڑ)

(۵) ۱۰۰۰۰ کھلے کنویں

(۶) پانی کی ترسیل کے انتظامات کو مکمل کرنا اور ندی سے پانی کرنے کے ۲۰۰ پلانٹس کو جدید طرز پر ڈھالنا۔

عالمی بنک کی آخری منظوری ملنے کے بعد دسمبر ۱۹۸۵ء سے اس وسیع پروگرام پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ شمالی بنگال میں پہاڑ کی ترائی کے علاقوں کی ترقی کے لئے نیدرلینڈ حکومت کی مدد سے شعبۂ زراعت ایک پروگرام کو روبہ عمل لا رہا ہے، اور اس پروجیکٹ میں دیگر باتوں کے علاوہ چھوٹی آبپاشی کے بہت سارے پروجیکٹس شامل ہیں۔

ان تمام اور دیگر پروجیکٹوں کی تکمیل کے بعد ہم لوگ ساتویں منصوبہ کے عرصے میں مزید ۲۵ر۴ لاکھ ہیکٹائرس قطعات آراضی کے لئے آبپاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کے منصوبہ کو پورا کر لیں گے۔

شعبۂ زراعت (چھوٹی آبپاشی شاخ) کے تحت مغربی بنگال ریاستی چھوٹی آبپاشی کارپوریشن لمیٹڈ نے مارچ تک ۴۷۱ گہرے ٹیوب ویل بٹھائے جن میں ۱۴۵ جامع علاقائی ترقی اور ۲ کسانوں کی کوآپریٹو کے لئے تھے۔ یکم اپریل ۱۹۷۷ء سے ۲۰ر مارچ ۸۴ تک اس کارپوریشن نے ۴۵۲ گہرے ٹیوب ویل نصب کئے، ان میں سے ریاستی آبی تفتیشی تنظیمات کے کھوج لگانے کے ۷۶ ٹیوب ویلس ہیں جنہیں پیداواری ٹیوب ویلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۴۵۲ گہرے ٹیوب ویلوں میں سے ۴۴۹ کو بجلی فراہم کی گئی۔ نیز ندیوں سے پانی اٹھا کر آبپاشی کرنے کے ۵۰ پروجیکٹوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا اور اس کی وجہ سے اب تک ۳۰۹۴ قطعات اراضی کیلئے آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔

آبپاشی کے بڑے پروجیکٹوں یعنی دامودر، سورا کشی اور کنگسا بتی کا کمانڈ علاقہ ترقیاتی پروگرام جاری ہے۔ اس پروگرام کا اہم کام کھیتوں سے گزرنے والی نہروں کی کھدائی ہے۔ لیکن ان علاقوں میں جہاں آبپاشی کے ان بڑے پروجیکٹوں کے تحت نہریں تعمیر نہیں کی گئیں وہاں گہرے ٹیوب ویل، کم گہرے ٹیوب ویل ندیوں سے پانی اٹھا کر آبپاشی اور کم گہرے ٹیوب ویل مع پمپ نصب کئے جا رہے ہیں۔ ان کی تنصیب کے لئے حکومت کی طرف سے امداد دی جاتی ہے۔ ایسی امداد چھوٹے اور حاشیائی کسانوں کو اور مغربی بنگال ریاستی چھوٹی آبپاشی کارپوریشن لمیٹڈ کو دی جارہی ہے۔ کھیتوں میں نہروں اور نالیوں کی تعمیر کے کام میں پنچایتیں سرگرم تعاون کر رہی ہیں۔

❖❖ ❖❖❖❖

تبصرہ

کتاب : میر باقر مخلص مرشد آبادی
مؤلف : ڈاکٹر عبدالرؤف
ضخامت : ۳۱۸ صفحات
قیمت : ۱۸ روپئے
ناشر : مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ ۱۷

اردو ادب میں ڈاکٹر عبدالرؤف کا نام محتاج تعارف نہیں۔ الٹ وعمٹ مین کی نظموں کا ترجمہ انکی قابلیت وعظمت کے ثبوت کیلئے کافی ہے۔

میر باقر مخلص مرشد آبادی مؤلف کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۹۷۵ء میں انہیں ڈی۔لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ کتاب کئی اہم ابواب پر مشتمل ہے جنہیں مجموعی طور پر سوانح حیات، اس عہد کی تاریخی ولسانی خصوصیات کلام اور کلام کا جائزہ کا نام دئے جا سکتے ہیں۔

مرشد آباد ادبی وتاریخی اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ دہلی سلطنت کے زوال کے ساتھ فیض آباد، لکھنؤ اور عظیم آباد کی طرح مرشد آباد بھی روزی روٹی کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ اہل کمال کی اکثریت شہر چھوڑ کر مختلف مراکز کی طرف روانہ ہوئی۔ کچھ مرشد آباد آئے، سکونت اختیار کی اور پھر یہیں کی خاک زمین میں پیوست ہو گئے۔ شجاع الدولہ، علاء الدولہ، علی وردی خاں، سراج الدولہ اور میر قاسم کی سرپرستی میں بنگال کی سرزمین میں اردو ادب نے کافی وسعت وترقی پائی۔ اس عہد میں مرشد آباد شعر وادب کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا اور شعر وادب کے ضمن میں نسبتاً اس کی برتری مسلم تھی۔ میر باقر مخلص مرشد آبادی بنگال کے اس عہد زریں کے عظیم المرتبت شاعر تھے جن کی ذات سے بنگال کی ایک پوری صدی کی تاریخ وابستہ وپیوستہ ہے۔ مخلص مرشد آباد کے پہلے صاحب دیوان شاعر تھے جو مرشد آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

مختلف تذکروں میں مخلص کا تعارف تو مختصراً مل جاتا ہے مگر کہیں بھی ان کے فضل وکمال اور زندگی کی تفصیلات سے متعلق اطلاع فراہم نہیں ہوتی۔ تاسف کہ اردو شعر وادب کی تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ ڈاکٹر عبدالرؤف کا یہ اہم کارنامہ ہے کہ انہوں نے میر باقر مخلص مرشد آبادی جیسے باکمال شاعر کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکالا۔ مؤلف نے شاعر سے متعلق تاریخی وسوانحی تفصیلات، ان کے عہد اور ان کے کلام پر بڑی کاوشوں سے خاطر خواہ مواد یکجا کیا۔ زیر نظر کتاب میں جہاں مخلص کی شخصی زندگی کی واضح تصویر ابھرتی ہے وہیں ان کے عہد کا تاریخی پس منظر اور لسانی خصوصیات کے دھندلکے بھی روشن ہوتے ہیں۔

میر باقر مخلص کا دور اردو زبان وادب کا وہ دور ہے جس میں ایہام وابہام اور تکلفات کے ملبوں پر زبان وبیان کی فصاحت سادگی اور فطریت کی عمارت کھڑی کی جا رہی تھی اور مظہر جان جاناں، میر، سودا اور درد کی امامت وقیادت میں قدر اوّل کی شاعری کے نمونے پیش کئے جا رہے تھے۔ چنانچہ تغزل کا وہ مخصوص رنگ وروغن جو اس عہد کی دین ہے، مخلص کے یہاں پوری آب وتاب کیساتھ جلوہ ریز نظر آتا ہے۔ درد، عشق، سادگی وشگفتگی ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ نمونے کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مر گیا میں پر نہیں صبر تہِ خاک ہنوز
یعنی کرتا ہوں گریبانِ کفن چاک ہنوز

جاری ہے سیلِ خون آنکھوں سے
بخیہ کیا دل کے زخم کا ٹوٹا

ناقص ہے وہ دل، عشق کے گلزار میں جب تک
لالہ کی طرح داغ نمودار نہ ہووے

آتا ہے کون سا یہ گل اندام باغ میں
جھک جھک سلام کرتی ہیں پھولوں کی ڈالیاں

دیوانِ مخلص کے مطالعہ کے بعد بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنگال میں میر مخلص کو وہی مقام ہے جو دکن میں ولی اور شمالی ہند میں میر کو حاصل ہے ——— زیر نظر کتاب مرشد آباد کے ادب وتہذیب سے متعلق مدفون خزانہ کی کھوج اور بازیافت کے سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں یقیناً مبارکباد کی مستحق ہے ——— **مصطفیٰ اکبر**

ہمارے یومِ آزادی

کا

عہد

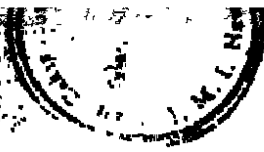
مغربی بنگال کی بائیں محاذ حکومت قومی یک جہتی کو بلند کرنے اور تقویت بخشنے کا عہد کرتی ہے۔

یومِ آزادی کے موقع پر آئیے ہم سب مِل جل کر سماجی اور جذباتی یکجہتی کو فروغ دیں اور اپنے عہد کی تکمیل کریں۔

حکومت مغربی بنگال

1st September-1986

Vol—33 No—17
PRICE [illegible] Paise











پروفیسر نورالحسن، ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء کو راج بھون، کلکتہ میں مغربی بنگال کے گورنر کی حیثیت سے اپنے عہدہ کا حلف اٹھاتے ہوئے۔

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta. Associate Md. Azam Published by the Information & Cultural Affairs Dept. of Govt. of West Bengal and Printed by G. R. T. Printers. 54/1C, Shyampukur. Street, Calcutta-700 004.

مغربی بنگال

۱۵ستمبر ۸۶



مغربی بنگال

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

شرحِ خریداری

سالانہ: تین روپئے ★ اس شمارے کی قیمت: ۱۲ پیسے

ترسیل زر کا پتہ

بزنس منیجر!
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۲۳- آر، این، مکھرجی روڈ- کلکتہ ۷۰۰۰۰۱

جلد نمبر ۳۳ ★ ۱۵ر ستمبر سنہ ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۱۸



مغربی بنگال کے گورنر اور کلکتہ یونیورسٹی کے چانسلر، پروفیسر سید نور الحسن ۲ر ستمبر سنہ ۸۶ء کو کلکتہ یونیورسٹی کے سینیٹ ہال میں منعقدہ خصوصی جلسۂ تقسیمِ اسناد میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے۔ (تصویر از: مدھوسدن گھوش)



مغربی بنگال مزدوروں کی رفاہ بورڈ کی سرگرمیاں

مزدوروں کی رفاہ کی بہت ساری اسکیموں کو جلداز
ںد اپنانے اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے پیش نظر ریاستی
کومت نے آجروں اور مزدوروں اور عوامی اداروں کے نمائندوں پر
شتمل قانون کے مطابق مزدوروں کی رفاہ کے بورڈ کی تشکیل کی ہے۔
بورڈ شعبۂ محنت کے وزیر یا وزیر ریاست کے چیئرمین شپ
ے تحت اپنے فرائض کو انجام دے گا۔ مزدوروں کی رفاہ کی اسکیمول
ی تکمیل کے لئے ریاستی حکومت نے ایک قانونی مزدوروں کی
اہ فنڈ کی تشکیل کی ہے۔ ایک آجر کو اس فنڈ میں، ان کے یہاں
نے در کر کام کرتے ہیں، ہر چھ مہینہ میں فی مزدور ایک روپیہ کے حساب
ے اور ہر مزدور کو ۵۰ پیسے فی کس ششماہی چندہ دینا پڑتا ہے۔
روں پر قانون کے تحت یہ ذمہ داری عائد کردی گئی ہے کہ وہ ان
م کو ہر سال ۱۵ر جنوری اور ۱۵ر جولائی سے قبل جمع کرادیں۔ اس
علاوہ ریاستی حکومت بھی اس فنڈ کے لئے اتنی ہی رقم دے گی
ن کہ آجر دیتے ہیں۔ اس رفاہی فنڈ میں جمع کردہ رقوم سے
دوروں کی رفاہ کی اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا جاتا ہے۔

اس بورڈ کے دائرۂ عمل میں تمام صنعتی یونٹیں، تمام
جارتی ادارے، جہاں کم از کم دس افراد برسر روزگار ہیں، موٹر
ٹرانسپورٹ تنظیمیں، چائے اور دیگر باغات آتے ہیں۔

زدوروں کی رفاہ کے لئے بورڈ کی اسکیمیں:

۱ فی الحال اس بورڈ کے زیر انتظام مزدوروں کی رفاہ کے
مراکز ہیں۔ ان مراکز میں مزدوروں کے لئے بہت ساری رفاہی
ہولتیں فراہم کی گئی ہیں، یہاں کھیل کود، جسمانی ورزش اور
تفریحی پروگرام کی سہولتیں فراہم ہیں۔ نیز یہاں مزدوروں اور ان کے
اہل و عیال کو پیشہ ورانہ تربیت دینے کا بھی انتظام ہے۔ ان میں ۲۲
مرکزوں میں آڈیٹوریم بھی ہیں، جہاں ثقافتی اور دیگر پروگرام پیش
کئے جاتے ہیں۔

۲۔ تعطیل گھر:

(الف) دارجلنگ۔ یہاں ۳۵ خصوصی کمرے اور ۲۱
عام کمرے ہیں، اور کرایہ فی کمرہ ۵ روپئے، کمروں میں فی نشست ۲ روپئے
اور عام کمروں میں فی نشست ۱٫۵۰ روپئے ہے۔

(ب) دیگھا۔ یہاں ۴۸ خصوصی کمرے اور ۴۲ عام
کمرے ہیں اور کرایہ فی کمرہ ۵ روپئے، کمروں میں فی نشست ۲ روپئے
اور عام کمروں میں فی نشست ۱٫۵۰ روپئے ہے۔

ان دونوں تعطیل گھروں میں بستر، مسہری، ہانڈی
برتن، اسٹورس وغیرہ مفت فراہم کئے جاتے ہیں۔
یہاں بکنگ کے لئے بورڈ سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ وظیفے: اس فنڈ میں چندہ دینے والے، جس
کی سالانہ آمدنی ۱۲۰۰۰ روپئے سے زیادہ نہیں ہے، کے بیٹے یا بیٹی کو،
جس نے ثانوی امتحان میں ۶۰ فیصد نمبر حاصل کئے ہیں، ثانوی درجہ کے
بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل شرطوں کے مطابق
وظیفے دئے جائیں گے۔

اگر موصول ہونے والی درخواستوں کی تعداد، دئے
جانے والے وظیفے کی تعداد سے کم ہوئی تو ایسی حالت میں
۵۵ فیصد نمبر حاصل کرنے والے طلبار کے معاملہ پر
غور کیا جائے گا:

کلاس	فی طالب علم ماہانہ وظیفہ کی رقم
الف: کلاس XI اور XII	۱۲۵- روپئے
بی اے، بی کام، بی ایس سی	۱۷۵- روپئے رہائشی طلبا کیلئے
ب: انجینئرنگ، میڈیکل تعمیراتی اور دیگر تکنیکی کورس	۲۵۰- روپئے
ج: پوسٹ گریجویٹ کورس	۳۰۰- روپئے

متعلقہ کورس کے عرصہ کے لئے وظیفہ دیا جاتا ہے۔

پیشہ ورانہ تربیت کے لئے وظیفے:

ایک مزدور جس کی سالانہ آمدنی ۱۲۰۰۰ روپئے سے کم ہے اسکے دست نگر شوہر یا بیوی اور بیٹے یا بیٹی کو حکومت یا یونیورسٹی کے تسلیم شدہ کسی بھی ادارے میں پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرنے کے لئے ماہانہ وظیفہ دیا جا سکتا ہے۔ ماہانہ وظیفہ کی رقم اس ادارہ کے مقررہ فیس (۲۰۰ روپئے سے زیادہ نہیں) کی رقم کے برابر ہوگی۔ بلاشبہ اس وظیفہ کے مستحق ہونے کے لئے مزدور کو باضابطہ رفاہی فنڈ میں چندہ دینا ہوگا۔

کتابیں خریدنے اور تعلیمی سیر کے لئے عطیہ:

اسکالرشپ یا وظیفہ پانے والے طلبا کو، اگر وہ درخواست داخل کریں تو یہ بورڈ کتابیں خریدنے اور تعلیمی سیر کے لئے عطیات دے سکتا ہے۔

گشتی فلم یونٹ:

جنوبی بنگال کے علاقوں میں اور شمالی بنگال کے چائے باغات میں مزدوروں کے درمیان فلموں کی نمائش کے لئے اس بورڈ کے پاس دو گشتی فلم یونٹس ہیں۔ یہ یونٹیں مزدوروں کی تفریح کیلئے مزدوروں کی رفاہ کے مختلف مرکزوں اور صنعتی کیمپس میں فلم شو کا انتظام کرتی ہے۔

مزدوروں کے خاندان کے معذور لوگوں کیلئے پیشہ ورانہ تربیت:

اس سلسلے میں انتظامات کئے گئے ہیں کہ مرکزی حکومت کے تحت معذور لوگوں کے لئے تربیتی مرکزوں کے ذریعہ مزدوروں کے خاندان کے معذور لوگوں کو مندرجہ ذیل کام میں پیشہ ورانہ تربیت دی جائے۔ ٹرنر، ویلڈر، فٹر، ٹائپ رائٹنگ، شارٹ ہینڈ، ریڈیو اور ٹی۔ وی، مرمت کا کام، بڑھئی گیری، خطاطی، بید کی کرسی، جلد سازی وغیرہ۔

اس کے علاوہ ریاستی حکومت کے تحت آئی ٹی آئی (انجینئرنگ کالج میں) ایسے معذور لوگوں کے لئے نشستیں مختص کرنے کے سلسلے میں انتظامات کئے گئے ہیں۔ ایسے معذور افراد کو تربیت کے عرصہ میں فی ماہ ۱۲۰ روپئے بطور وظیفہ دئے جاتے ہیں۔

بورڈ کی زیر تکمیل اسکیمیں:

(۱) بوکھالی میں تعطیل گھر، (۲) ہلدیہ میں رفاہی مرکز مع تعطیل گھر کی تعمیر اور (۳) پوکھریا بونگ، دارجلنگ میں ایک رفاہی مرکز کی تعمیر۔

بورڈ کی مزید اسکیمیں:

(الف): بالغوں کی تعلیم کے مراکز (ب) ماں کے لئے طبی دیکھ بھال اسکیم (ج) بلوادی (بچوں کا مرکز) (د) بچوں کے لئے طبی دیکھ بھال اسکیم (ہ) بچوں کے لئے پرورش گاہ (و) اور بھی زیادہ گشتی فلمی یونٹیں چالو کرنا (ز) طلبا کے لئے ہاسٹل (مزدوروں کے خاندان کے طلبا کے لئے) (ح) میریک اور دیگر جگہوں میں تعطیلی گھروں کی تعمیر۔

سندربن علاقہ میں کھال کی از سر نو کھدائی

حکومت مغربی بنگال کے شعبہ ترقیات و منصوبہ بندی نے سندربن کے پسماندہ علاقہ کی ترقی کے لئے متھورا پور تھانہ کے علاقہ میں موضع رادھا کانتا پور میں کالی تلہ لول بیر یا کھال کی از سر نو کھدائی کے لئے چھ لاکھ روپئے دینے کی منظوری دی۔ ایک تخمینہ کے مطابق اس کام پر کل ۹۸۲۹۵۰ روپئے خرچ ہوں گے۔

فیض ــــ ایک عہد آفریں شاعر

شام داس کھنہ

اُردو کے نامور نقاد اظہر قادری لکھتے ہیں ــــ "کسی بڑے شاعر کی تخلیق کی کاوشوں کو نظریاتی اعتبار سے مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ بڑے شاعر کے فکری ڈھانچے اور اس کے فنی اظہار میں کبھی تصادم نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مختلف ادوار میں زندگی کے گوناگوں اور نت نئے حقائق سے اپنے تخلیقی عمل کے تانے بانے تیار کرتا ہے لیکن اس کی نظریاتی سالمیت اس کی فکر میں ناہمواری پیدا نہیں ہونے دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ خیال کی رنگارنگی اور بوقلمونی کے باوصف اس کے اندازِ نظر کی زیریں لہر ہمیشہ یکساں رہتی ہے جو اس کی تخلیقات کو تضاد کی بھول بھلیوں میں گم ہونے نہیں دیتی اور تیرگی میں چراغ بن کر منزلِ مقصود کی نشاندہی کرتی ہے۔ فیض احمد فیض کا شمار ایسے ہی شاعروں میں ہوتا ہے۔"

جس وقت ہمارا ایوانِ شاعری فیض کی مدھر اور رسیلی تانوں سے گونجنا شروع ہوا اس وقت ترقی پسند ادبی تحریک کی صبحِ صادق نمودار ہو رہی تھی اور اس کی پہلی کرنیں اندھیروں سے الجھنے کی کوشش کر رہی تھیں، ایسے کڑے وقت میں بعض دانشوروں نے اس تحریک کو صرف سہارا ہی نہیں دیا بلکہ اسے نوک پلک سے درست کرنے میں اپنا خونِ جگر صاف کیا۔ ابتدا میں تحریک کے تحت تخلیق ہونے والے ادب کا لہجہ رومان کی راہ سے انقلاب تک پہنچنے کا ملتا ہے۔

ابتدا میں فیض کے یہاں بھی رومانیت اور انقلاب کا ملا جلا تصور ملتا ہے اور ان کے پہلے مجموعۂ کلام "نقشِ فریادی" میں کچھ نظمیں اس رجحان کا واضح پتہ دیتی ہیں۔ مثلاً ــــ

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم سے نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

⁂

فیض نے اردو کو کلاسیکی شاعری کا بڑا گہرا اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور میرؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، غالبؔ اور مومنؔ جیسے اساتذہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے جہاں روایت کی فنی ہنرمندی سے شعری لہجے کو شائستگی عطا کی ہے وہاں بدلتی ہوئی زندگی کی جدید اقدار نے اسلوب کی مانگ میں تازہ کاری کی افشاں بھی چنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اگر ایک طرف قدیم کی تہذیبی لطافت اپنے جلوے دکھاتی ہے تو دوسری طرف جدید کا بانکپن ذہن کے دریچے پر دستک دیتا ہے۔

فیض نے غزل اور نظم دونوں کو اظہارِ خیال کا وسیلہ بنایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظم کے مقابلے میں ان کی غزل گوئی زیادہ

طرحدار، لطیف اور شائستہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ غزل میں اپنے
تصورات اور نظریۂ حیات کو روایت سے مربوط رکھ کر اظہار کی
دشوار گزار [illegible] سے جس آن بان اور سبک روی سے گزرے ہیں
وہ ان کی جمالیاتی ہنرمندی اور سماجی شعور کی دلیل ہے۔ اور جہاں
غمِ جاناں کی کجلائی شام اور شبِ فراق کی تہہ بہ تہہ تیرگی ہے وہاں
غمِ دوراں کی صبحِ نشاط بھی ہے۔ اس میں داستانِ جلوۂ جاناں
کی دودھیا چاندنی کے پہلو بہ پہلو حدیثِ گیراں کے تڑکے کی
سپیدی بھی ہے۔ اس میں محبوب کے خرامِ ناز کی سحر انگیز
چاپ بھی ہے اور رفتارِ وقت کی تیز رو آہٹ بھی۔ اس میں کہیں
زلفِ جاناں کا نرم و نازک سایہ ہے، کہیں غمِ دوراں کی جھلسا
دینے والی کڑی دھوپ۔ فیض کی فنی چابکدستی نے غمِ دوراں
میں غمِ جاناں کی رنگ آمیزی اس بانکپن سے کی ہے کہ دونوں آپس
میں شیر و شکر ہو گئے ہیں۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

٭٭

دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

٭٭

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

٭٭

ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

٭٭

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

٭٭

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

وہ ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

فیض کے یہاں تمام کلیدی علائم غزل کی روایت سے
آئے ہیں البتہ ان کی معنیاتی تقلیب ہوئی ہے۔ اردو شاعری میں سیاسی
سماجی جہت کا اضافہ تحریکِ آزادی کا تقاضہ بھی تھا اور اس میں
فیض سے پہلے دیگر شعرا بھی شریک رہے تھے لیکن فیض نے
سیاسی سماجی شعور کو غنائی عناصر کے ساتھ ملا کر ایک نئی
جمالیاتی شان پیدا کی۔ فیض کی پیکر تراشی پر جہاں انگریزی شاعری
کا اثر ہے وہاں ان کے رچے ہوئے احساسِ جمال کی تشکیل میں
علاوہ فارسی اردو کلاسیکی اثرات کے پنجابی جزدوں کا بھی کچھ نہ کچھ
عمل دخل ہے۔ انہوں نے اپنے انقلابی فکر کے اظہار کے لئے
غنائیت کو اور غنائیت کے اظہار کے لئے انقلابیت کو قربان
نہیں کیا ہے۔

بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ —— "انقلابی فکر اور
تغزل کی آمیزش سے اردو شاعری میں ایک نئی جمالیاتی جہت پیدا
ہوئی ہے جس میں فیض کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ فیض نے اقبال کے
بعد کلاسیکی روایات کو لیکر اپنی شاعری کی بنیاد استوار کی اور
اپنے تجربات، مشاہدات اور سماجی حالات کے درد کو اس میں سمو
دیا۔"

پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں :— "اردو شاعری کی
اتھاہ گہرائیاں فیض کی شاعری میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ انہوں نے
روایت کی بنیاد سے اٹھنے والی شاعری کو انقلابی راہوں سے
استوار کیا۔ فیض کی شاعری کا درد دل و دماغ کو متاثر کرنے کے علا
اپنے مقدر کے بدلنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔"

احمد ندیم قاسمی کی رائے میں —— "فیض انسانی
معاشرے میں مثبت انقلاب کا حامی تھا تاکہ ایک ایسا معاشرہ
تشکیل پذیر ہو سکے جس کی بنیاد عدل و انصاف، مساوات او
انسان کے وقار پر ہو۔ اس انقلابی امنگ کے باوجود اس کے ہا
انقلابیوں کی سی گھن گرج کے بجائے ایک مترنم سرگوشی کا سا اندا
ہے۔ انقلاب کے حوالے سے جو شور بلند ہوتا ہے وہ فیض کی

شاعری میں نہیں بلکہ اس کے اثرات میں پوشیدہ ہے ۔ چنانچہ فیض کی لفظی سرگوشی کو اپنے اندر اتار لے جانے والے کے باطن میں جو قیامت برپا ہوتی ہے اسی کو فیض کے مثبت انقلاب کی شروعات سمجھنا چاہیئے ؛

فیض نے جہاں روایتی تشبیہات، استعارات اور فنی محاسن سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور انہیں نہایت سلیقے سے اپنی تخلیقی کاوشوں کا حصہ بنایا ہے وہاں خود بھی نئے استعارے، نئی تشبیہیں اور نئی ترکیبیں دی ہیں ایک اچھے شاعر کی طرح انہوں نے روایت کے حسین سرمائے سے فائدہ تو ضرور اٹھایا ہے لیکن اس پر قناعت کرکے بیٹھ نہیں گئے ہیں بلکہ اردو کو بڑی حسین، نئی تشبیہوں، استعاروں اور ترکیبوں سے مالامال کیا ہے ۔ انہوں نے شعروادب کے گلستاں میں فن کے نئے نئے پھول کھلائے ہیں جن کی خوشبو سے اظہار کی روشیں دور دور تک مہک اٹھی ہیں ۔

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

⁂

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

⁂

جب تجھے یاد کرلیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگالیا رات مچل مچل گئی

⁂

ہم اہلِ قفس تنہا ہی نہیں ہر روز نسیم صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

کیٹس کا قول ہے ــــ " محبت انسان کی فطرت بھی ہے اور اس کی کمزوری بھی۔ شاعر بھی انسان ہونے کے ناطے روایت سے قطعِ نظر ذاتی طور پر بھی محبت کے جذبوں سے سرشار رہتا ہے اور اس کے دل میں بھی اور چاہے جانے کی تمنا انگڑائیاں لیتی ہے اور یہی تمنا اس کے ذوقِ جمال کو تہذیب اور شائستگی سے سنوارتی ہے اور اس کی تخلیقی فکر کو وارفتگی اور جلا بخشتی ہے ۔ اگر شاعر باشعور ہوتا ہے تو اس کے یہاں یہ انفرادی تمنا حرفِ آخر نہیں ہوتی بلکہ اجتماعی شکل اختیار کرلیتی ہے ۔ اس کے ذوقِ جمال میں پاکیزگی اور طہارت پیدا کرتی ہے اور اس کی نظر کو وسعت عطا کرتی ہے ۔

فیض کے رچے ہوئے بالیدہ شعور کو جذب و شوق کی انفرادی منزل کی سرعت سے طے کرکے اجتماعی مرحلے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی ۔ ذاتی تمنا نے ان کے یہاں خانۂ دل سے نکل کر پوری انسانیت کا احاطہ کرلیا ۔ اس میں شک نہیں کہ عام خوشحالی کی آرزو بھی بڑی چیز ہے لیکن فیض کی نظر میں صرف آرزو سے کام نہیں بنتا ۔ تکمیلِ آرزو اصل مقصدِ حیات ہے ؎

یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

عالمی سطح پر سوچنے کے انداز نے فیض کے تصورات اور نظریۂ حیات کو انسانی بنیادیں عطا کیں اور انہیں اپنی تخلیقی کاوشوں کو محدود قومیت، فرقہ پرستی اور تنگ نظری سے بالاتر رہنا سکھایا ۔ ان کی نظمیں "آجاؤ افریقہ" اور " ایرانی طلبا کے نام"، اور " رقیب سے " اور جنگِ آزادی سے متعلق ان کی تخلیقی کاوشیں ان کے فن کا رشتہ حیاتِ انسانی کو عالمی جدوجہد سے جوڑ دیتی ہے اور فیض کو کسی ایک قوم، کسی ایک زبان اور کسی ایک طبقے کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا شاعر بنادیتی ہے ۔ یہی ان کی وہ انسان دوستی ہے جو انہیں انسانیت، مسرت و محبت اور زندگی کا پیغام دینا، استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھانا اور جنگ سے گریز کرنا سکھاتی ہے اور انہیں اس کا شاعر بناتی ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض کی نظمیں بھی روایت کے حسن سے مالامال ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان کی غزلوں میں روایت کی تہذیب وشائستگی جس طرح ان کے انقلابی آہنگ کو نکھارتی سنوارتی ہے اس سے انکی تخلیقی کاوشوں کو رعنائی، دلکشی اور توانائی قائم ہے ۔ آج جبکہ حالات کی انتشاری کیفیات کے پیشِ نظر نئی نسل کے علاوہ پرانے شاعروں کا ایک طبقہ بھی ذات کے تنگ حصار میں اسیر ہوگیا ہے ۔ فیض کی شاعری کی صاف وشفاف اور کھلی فضا دل و دماغ کے لئے تازگی و طراوت کا اہتمام ہے ⁂

مزدوروں کی رفاہ اور تحفظ کیلئے چند قانونی دفعات

۱۔ مزدوروں کا معاوضہ ایکٹ سنہ ۱۹۲۳ء :

اگر کسی مزدور کو ڈیوٹی میں کام کرتے ہوئے چوٹ لگ جائے یا وہ زخمی ہو جائے تو اس ایکٹ کی دفعات کے تحت وہ اپنی چوٹ کی شدت کی بنیاد پر اور اپنی تنخواہ کے متناسب، معاوضہ کا دعویٰ کر سکتا ہے، اور اگر ڈیوٹی میں اس کی موت واقع ہو جائے تو اس ایکٹ میں رکھی گنجائش کے تحت آجر کو معاوضہ کی پوری رقم اس کے قانونی وارثوں کو دینا پڑے گی۔

۲۔ ٹریڈ یونین ایکٹ سنہ ۱۹۲۶ء :

ایک ٹریڈ یونین کے رجسٹریشن کے لئے، کوئی بھی ۷ ورکر ممبر، جو یونین کو چندہ دیتے ہیں اور اس ایکٹ کی دفعات کی شرائط پر پورا اترتے ہیں، رجسٹریشن کے لئے مقررہ فارم میں ٹریڈ یونین رجسٹرار کے پاس درخواست داخل کر سکتے ہیں۔ اس درخواست کے ساتھ اس ٹریڈ یونین کے قوانین اور ضابطے کی ایک کاپی، درخواست کنندگان کے نام، پتے اور پیشے، ٹریڈ یونین کا نام اور اس کے صدر دفتر کا پتہ بھی داخل کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ٹریڈ یونین کے تمام عہدہ داروں کے نام، عمر، پیشے اور پتہ بھی داخل کرنے ہوں گے۔ مزید برآں اگر ایک ٹریڈ یونین رجسٹریشن کے لئے درخواست داخل کرنے کی تاریخ سے کم از کم ایک سال قبل قائم کیا گیا ہے تو اسے اپنے قرض اور اثاثے کی تفصیل بھی درخواست کے ساتھ منسلک کرنی ہوگی۔ رجسٹرار قانون کے مطابق تفتیش کرنے کے بعد رجسٹریشن کا سرٹیفکیٹ جاری کر دے گا۔

ٹریڈ یونین کے فنڈ کو عہدہ داروں کی تنخواہ یا بھتوں کی ادائیگی، انتظامی اخراجات، مزدوروں کے مفاد میں خرچ، مزدوروں کے حقوق کے دفاع کے لئے قانونی خرچ، صنعتی تنازعات کے سبب مالی مشکلات سے دوچار مزدوروں کی مالی امداد یا ایک مزدور کی موت پر دی جانے والی امداد، ایک مزدور کے کام کے دوران مجروح ہو جانے یا چھنٹائی پر بیکار ہو جانے پر دی جانے والی امداد، مزدوروں کی تعلیمی اور سماجی ترقی کے لئے اخراجات پر صرف کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یونین کے فنڈ کو صرف مزدوروں کی سماجی، معاشی اور ذہنی ترقی کے لئے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے اس فنڈ کو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ٹریڈ یونین کو اپنے ممبروں کے شہری اور سیاسی حقوق کے تحفظ اور انہیں برقرار رکھنے کے لئے ایک الگ فنڈ قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس کے لئے چندہ اکٹھا سکتا ہے۔ کسی بھی رجسٹرڈ ٹریڈ یونین یا اس کے عہدہ دار یا ممبر کے خلاف، متوقع صنعتی تنازعات یا ایسے تنازعات کی اعانت کے سلسلہ میں کئے گئے کسی بھی اقدام کے لئے کسی بھی عدالتِ دیوانی میں نہ کسی مقدمہ کو اور نہ دیگر قانونی کارروائی کو قابلِ تائید سمجھا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹریڈ یونین کے قانونی طور پر تسلیم شدہ کسی بھی مقصد کی اعانت کے سلسلے میں مجرمانہ سازش کے الزام پر کسی بھی رجسٹرڈ ٹریڈ یونین کے عہدہ دار یا ممبر کے خلاف تادیبی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔

۳۔ اجرت کی ادائیگی ایکٹ سنہ ۱۹۳۶ء :

اس ایکٹ میں ان مزدوروں کیلئے، جن کی اجرتیں ۱۰۰۰ روپئے سے کم ہیں، اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر انہیں ان کی قانوناً جائز اجرتوں سے محروم رکھا جائے تو وہ سب اجرتوں کی ادائیگی کے لئے عدالت سے اپیل کر سکتے ہیں۔ اس ایکٹ کے تحت اجرت سے مراد تمام مشاہرے (تنخواہ، بھتہ، وغیرہ) ہیں اور اس میں وہ رقم بھی شامل ہے جو کسی بھی قانون کے تحت روزگار کے ختم ہو جانے کی وجہ سے یا اوور ٹائم کام، تعطیلات یا کسی قسم کی چھٹی کے سلسلے میں کسی بھی ایوارڈ یا سمجھوتہ یا عدالت کے حکم کے واجب الادا رقم شامل ہے۔ لیکن گھر کا کرایہ، پنشن یا پروویڈنٹ فنڈ میں آجروں کا چندہ اور بونس اس عدالت کے دائرہ عمل سے باہر ہے۔ اس ایکٹ کے تحت اجرتیں دو طرح کی ہوتی ہیں — تاخیر کردہ اجرت اور منہا کردہ اجرت۔ اگر کوئی مالک اجرت کی ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے یا اجرت میں غیر قانونی طور پر کاٹ چھانٹ کرتا ہے تو ایسے معاملہ کو انصاف کے لئے اس عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس ایکٹ کی ہدایتوں کے خلاف ورزی کرنے پر ۲۰۰ سے ۵۰۰ روپئے کا جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔

ملازمین ریاستی بیمہ ایکٹ سنہ ۱۹۴۸ :

اس ایکٹ کے تحت کارخانوں یا اداروں کو، جو اس ایکٹ کے دائرہ عمل میں آتے ہیں، ملازمین ریاستی بیمہ فنڈ میں اپنے حصہ کا چندہ اور اپنے ملازمین کے چندے باضابطہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس ایکٹ میں ان شرائط کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جن کے تحت مالک ای۔ ایس۔ آئی فنڈ میں پہلی قسط کی رقم جمع دینے کے بعد مزدوروں / ملازمین کی اجرتوں سے اتنی رقوم منہا کر سکتے ہیں۔ اس ایکٹ کے تحت اس فنڈ میں چندہ دینے والے مرد اور عورت دونوں ملازمین کو بہت ساری مراعات فراہم کی جاتی ہیں۔ جیسے بیماری مراعات، عورت ملازمین کے لئے زچگی مراعات، کام کے دوران زخمی ہو جانے پر معذوری مراعات، بعض حالات میں کام کی وجہ سے پیشہ ورانہ مرض کے لئے مراعات، اس ایکٹ کے مطابق کسی بھی آجر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ایک ملازم کو، اس کی بیماری، معذوری وغیرہ کی مدت میں نوکری سے برطرف کر دے۔ اس ایکٹ میں مالک کے لئے سزا کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے اگر مالک ای۔ ایس۔ آئی فنڈ میں چندہ نہ دے۔ مغربی بنگال میں ای۔ ایس۔ آئی (ایم بی) اسکیم کے تحت فی الحال ۱۲ ہسپتال، ۲۱ سروس شفاخانے اور ۵۰ آر۔ بی۔ او ہیں۔

گراچیوئٹی کی ادائیگی ایکٹ :

یہ ایکٹ ہر کارخانہ، کان، تیل کے میدان، باغات، بندرگاہ اور ریلوے کمپنی پر اور ان تمام دکانوں اور اداروں پر جہاں دس سے زیادہ افراد گزشتہ بارہ مہینوں سے برسر روزگار ہیں یا تھے، لاگو ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص نے دفتر یا کارخانہ میں مسلسل کم از کم پانچ سال تک ملازمت کی ہے تو اس کے پیرانہ سالی ہونے پر، یا اس کے ریٹائر ہونے یا استعفیٰ دینے پر یا کسی حادثہ یا بیماری کی وجہ سے معذور ہو جانے پر یا اس کی موت پر، اس کے مالک کی طرف سے اسے گراچیوئٹی دی جائے گی۔ اگر ملازمت کے ختم ہونے کی وجہ موت یا جسمانی معذوری ہو تو پانچ سال کی مسلسل ملازمت کی شرط ضروری نہیں ہوگی۔ گراچیوئٹی کی شرح یہ ہے کہ ہر مکمل سال کی یا چھ مہینے سے زیادہ مدت کے عرصہ کی ملازمت کے لئے ۱۵ دنوں کی اجرت دی جائے۔ ملازم کی آخری بار جتنی اجرت تھی اسی کے حساب سے گراچیوئٹی کی رقم مختص کی جائے گی۔ گراچیوئٹی کی جو رقم ملازم کو دی جائے گی وہ اس کے بیس مہینوں کی اجرتوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ایک ملازم کو، اس بات کے لئے کہ گراچیوئٹی کی رقم اسے دی جائے، اپنے آجر کے پاس درخواست داخل کرنی ہوگی۔ اگر گراچیوئٹی کی ادائیگی میں تاخیر ہو تو ادائیگی کیلئے کنٹرولنگ اتھورٹی کے پاس اپیل کی جا سکتی ہے۔ گراچیوئٹی کے طور پر کتنی رقم دی جائے، اگر اس سلسلہ میں تنازعہ پیدا ہو

توتصفیہ معاملہ کو آخری فیصلہ کے لئے متعلقہ کنٹرولنگ اتھورٹی کے پاس بھیجنا چاہئے۔ ہر اسسٹنٹ لیبر کمشنر کو اپنے اپنے حلقہ اختیارات میں کنٹرولنگ اتھورٹی مقرر کیا گیا ہے۔

مساوی تنخواہ ایکٹ سنہ ۱۹۷۶ء :

دستور کی دفعہ ۳۹ میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے مساوی کام کے لئے مساوی تنخواہ کے سلسلے میں ریاست اپنی پالیسی کو مرکوز کرے۔ قانون دفعہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس ایکٹ کو نافذ کیا گیا۔

مساوی کام یا ایک جیسے کام کے لئے مرد اور عورت ورکروں کو مساوی اجرت کی ادائیگی اور جنس کی بنیاد پر تفریق کی روک تھام کے لئے اس ایکٹ میں گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس ایکٹ میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ عورتوں کی نئی بھرتی کے سلسلے میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ اس سلسلے میں عورتوں کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لئے مشاورتی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔

کم سے کم اجرت ایکٹ سنہ ۱۹۴۸ء :

اس ایکٹ میں مندرجہ فہرست روزگار میں برسر روزگار ملازمین کو کم سے کم اجرتوں کی ادائیگی کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس ایکٹ میں کام کرنے کے اوقات اور اوور ٹائم اجرتوں کی ادائیگی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس ایکٹ کی پہلی فہرست میں بارہ اقسام کے روزگار کے نام درج تھے اور اس ایکٹ کے تحت ریاستی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ روزگار کی تعداد میں اضافہ کرے۔ ابتک مغربی بنگال میں پہلی فہرست میں ۳۲ اقسام کے روزگار کے نام درج کئے گئے ہیں۔ اس ایکٹ کے تحت ریاستی حکومت کو فہرست میں درج روزگار میں برسر روزگار ملازمین کے لئے کم سے کم اجرت مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اب تک حکومت مغربی بنگال کے درج فہرست ۳۵ روزگاروں کے لئے کم سے کم اجرتیں مقرر کی ہیں اور ۲۵ اور روزگاروں میں کم سے کم اجرتوں کی نظر ثانی کی ہے۔ متعلقہ قیمت اشاریہ کی بنیاد پر کم سے کم اجرتوں کی شرحیں مقرر کی جاتی ہیں اور ان پر نظر ثانی کی جاتی ہے۔ حالیہ برسوں میں اس ریاست میں کم سے کم اجرت مقرر کرنے یا اجرتوں پر نظر ثانی کرتے ہوئے مہنگائی بھتہ کو صارفین قیمت اشاریہ سے منسلک کر دیا گیا ہے تاکہ ملازمین بڑھتی ہوئی قیمتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ درج فہرست مساوی روزگار میں کم سے کم اجرتوں کی جدید ترین شرح نظامت محنت سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ مقرر کردہ کم سے کم اجرتوں میں سے چند کی بابت عدالتی حکم امتناعی جاری کر دیا گیا ہے۔ فہرست میں درج روزگاروں میں سے جہاں کم سے کم اجرتیں مقرر کر دی گئی ہیں، چند درج ذیل ہیں۔ تیل مل، دال مل، چاول مل، چکی مل، پبلک موٹر ٹرانسپورٹ، چمڑہ سازی، چھاپہ خانہ، سنگ تراشی، ریشمی چھاپہ، خیاطی صنعت، موزہ و بنیان صنعت، لوہاری، شیشہ صنعت، چائے باغات، کوزہ گری صنعت، نرسنگ ہوم، میونسپلٹیاں، سنیما، نانبائی صنعت، زراعت وغیرہ۔

بیڑی اور سگار مزدور (روزگار کی شرائط) ایکٹ سنہ ۱۹۶۶ :

اس ایکٹ میں خدمات کی چند شرائط کا اور چند مراعات کا، جن سے بیڑی مزدور مستفید ہوں گے، ذکر کیا گیا ہے۔ اس ایکٹ میں کام کرنے کے اوقات، اوور ٹائم کام کے لئے اجرت، آرام کے لئے وقفہ، ہفتہ واری چھٹی، اجرت کے ساتھ سالانہ چھٹی، چھٹی کے عرصہ میں اجرتوں کی شرحوں وغیرہ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس ایکٹ میں صفائی، صاف ہوا کی آمدورفت، پختہ پائخانے، ہاتھ منھ دھونے کی سہولتیں، فرسٹ ایڈ، بچوں کے لئے دایہ خانہ، کینٹین وغیرہ جیسے چند رفاہی اقدامات کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس ایکٹ میں

اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ گھر میں بیڑی کے کام کرنے والوں کو اجرت کے ساتھ سالانہ چھٹی دی جائے، نیز اجرت کا حساب لگاتے وقت تیار کردہ بیڑی کی ۵ فیصد بیڑی کو رد کیا جا سکتا ہے۔

کارخانہ ایکٹ سنہ ۱۹۴۸ء :

اس ایکٹ میں کارخانوں کے مزدوروں کی صحت، تحفظ اور رفاہ سے وابستہ بہت ساری باتوں کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے ہر کارخانہ کے مالک کو صفائی، گندگی کے اخراج، ہوا کی آمد و رفت، حرارت، پینے کے پانی کی سپلائی، بیت الخلاء، تھوکنے کی جگہ، بتی اور روشنی کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے۔ نیز مصنوعات کی تیاری کے دوران ایک چھوٹی سی جگہ میں بہت سارے مزدوروں کے کام کرنے کی وجہ سے ضرر رساں اور بدبو دار دھواں، ہوا یا غلاظت کے اخراج سے مزدوروں کی صحت کے تحفظ کیلئے نیز کام کرنے کے کمروں میں، جہاں مصنوعی رطوبت کا استعمال ہے، ہوا میں باضابطہ نمی پیدا کر کے، کام کرنے کے اچھے حالات پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے سلسلے میں بھی اس ایکٹ میں گنجائش رکھی گئی ہے۔ ان دفعات کی تکمیل کے لئے اس ایکٹ کے تحت تصدیق کرنے والے سرجن اور کارخانوں کے میڈیکل انسپکٹر کی تقرری کی ضرورت ہے۔

ورکروں کے تحفظ کے لئے اس ایکٹ میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ مخصوص مشینوں کو، یا ان کے چند حصوں کو تار سے گھیر دیا جائے، چند حالت میں چلتی مشینوں کے نزدیک یا مشینوں پر کام کرنے پر پابندی عائد کر دی جائے۔ خطرناک مشینوں میں نوجوان لوگوں کو کام سے وابستہ نہ کیا جائے۔ بجلی کی سپلائی کو کاٹنے کے لئے بہت ہی نزدیک کمرہ تعمیر کیا جائے، یا دیگر طریقہ کار کو اپنایا جائے۔ روئی کھولنے والی مشینوں کے نزدیک عورت اور بچہ مزدور کو نہ رکھا جائے، حد سے زیادہ وزنی چیزوں کو اٹھانے یا ادھر ادھر لے جانے کے لئے مزدوروں سے کام نہ لیا جائے، بینائی کے تحفظ کے لئے اقدامات کئے جائیں، خطرناک دھواں سے دھماکہ خیز یا آتش گیر دھواں، گیس وغیرہ سے، آگ سے تحفظ کے اقدامات کا نیز عمارت اور مشینوں کی حفاظت کے سلسلے میں متعدد خصوصی گنجائشیں رکھی گئی ہیں۔ اس ایکٹ کے تحت ان کارخانوں میں جہاں ۱۰۰۰ سے زیادہ مزدور برسر روزگار ہیں یا جہاں مال تیار کرنے کا کام اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس سے مزدور جسمانی طور پر مجروح ہو سکتے ہیں یا وہ زہریلی گیس کا شکار ہو سکتے ہیں، یا وہ بیمار پڑ سکتے ہیں یا ان کی صحت کو دیگر خدشات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ایک سیکیورٹی افسر کے تعین کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

ملازمین پراویڈنٹ فنڈس (اور متفرق گنجائشیں) ایکٹ سنہ ۱۹۵۲ء :

اس ایکٹ کا مقصد یہ ہے کہ کارخانوں اور دیگر اداروں میں کام کرنے والے ملازمین اور مزدوروں کے لئے بھی پراویڈنٹ فنڈ اسکیم کی سہولتیں فراہم ہوں۔ ہر ادارہ جو اس ایکٹ میں درج مخصوص صنعت کا ایک کارخانہ ہے اور جس میں بیس اور اس سے زیادہ افراد برسر روزگار ہیں پراویڈنٹ فنڈ کا ممبر بن سکتا ہے۔ یہ ایکٹ ان اداروں پر بھی لاگو ہوتا ہے جن میں بیس یا اس سے زیادہ افراد برسر روزگار ہیں اور جنہیں مرکزی حکومت اپنے اعلانیہ کے ذریعہ ادارہ تسلیم کر لیتی ہے۔ ہر آجر اپنے ہر ملازم کے پراویڈنٹ فنڈ اکاؤنٹس میں اس ملازم یا مزدور کی بنیادی اجرتوں، مہنگائی بھتہ اور ملازمت برقرار رکھنے کا بھتہ اگر کچھ ہو تو، کی ساڑھے چھ فیصد رقم جمع کرے گا۔ مزدور اور ملازم بھی اپنے پراویڈنٹ فنڈ میں اتنا ہی روپیہ جمع کرے گا، جتنا کہ اس کے مالک ادا کرتا ہے۔ یہ آجر کی ذمہ داری ہے کہ پہلی بار وہ ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ میں اپنے حصہ کی رقوم اور اپنے ملازمین، خواہ ان شعبوں کو اس آجر نے براہ راست یا کسی ٹھیکہ دار کے ذریعہ اپنے یہاں

ملازمت پر مامور کیا ہے کے حصہ کی رقوم جمع کرے گا۔ ملازمین اس فنڈ میں جتنی رقوم جمع کریں گے وہ سب ان کی صرف اجرتوں سے منہا کی جائیں گی۔ پروویڈنٹ فنڈ کے حکام ہر ممبر کے نام پر ایک اکاؤنٹ کھولتی ہے اور اسے جاری رکھتا ہے۔ اس اکاؤنٹ میں ملازم ممبر کے حصہ کی رقم اور مالک کے حصہ کی رقم دونوں جمع کر دی جاتی ہیں، نیز ان رقوم پر جو سود حاصل ہوتا ہے اسے بھی اسی اکاؤنٹ میں درج کر دیا جاتا ہے۔ ایک ممبر کو رہائشی گھر کی خریداری کے لئے، رہائشی مکان تعمیر کرنے کے سلسلے میں قطعات آراضی خریدنے کے لئے، نیز صنعتی مزدوروں کیلئے امدادی مکانات اسکیموں کے تحت تعمیر کردہ مکانات خریدنے یا مکانات تعمیر کرنے کیلئے اور ایل۔ آئی۔ جی مکانات اسکیم کے تحت مکانات کی تعمیر کیلئے اس فنڈ سے ایڈوانس دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تالہ بندی، بندی وغیرہ سے رونما ہونے والے چند خصوصی حالات میں، بعض کیسوں میں بیماری کے لئے بیٹے بیٹیوں کی شادی یا درجہ دہم کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے، شدید آفات ناگہانی سے رونما ہونے والے ناموافق حالات میں اس فنڈ سے ایڈوانس فراہم کئے جا سکتے ہیں۔

بچہ مزدور کے سلسلے میں چند قانونی گنجائشیں

بچوں کا روزگار ایکٹ سنہ ۱۹۳۸ء میں چند ملازمتوں میں بچوں کو برسر روزگار کرنے کی ممانعت ہے۔ اس ایکٹ کے تحت مسافروں کو لے کر آمد و رفت کرنے والی گاڑیوں، ریلوں کے ذریعہ اسباب یا ڈاک کے ترسیل، خاکستری یا راکھ دان سے راکھ نکالنے، ریلوے دفتروں کی عمارتوں میں تعمیراتی کام، یا ریلوے اسٹیشن میں، چائے خانہ میں کام یا پھیری کے کام یا بندرگاہ سے وابستہ کام پر پندرہ سال سے کم عمر کے بچوں کو کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پندرہ تا سترہ سال کی عمر کے بچہ مزدوروں کے لئے، اس ایکٹ میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ کسی بھی بچہ مزدور کے لئے کسی بھی دن کام کرنے کے اوقات اس طرح مقرر کئے جائیں کہ اسے کم از کم بارہ گھنٹے آرام کرنے کو ملیں، اس عرصہ میں رات دس بجے سے صبح سات بجے تک یعنی سات گھنٹے مسلسل آرام کا وقت شامل ہے۔ اسی ایکٹ میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ ان بچوں کو، جن کی عمر چودہ سال کی نہیں ہے، کسی بھی کارخانہ میں مندرجہ ذیل کام کرنے کی اجازت نہیں ہے: (۱) بیڑی سازی (۲) قالین بنائی (۳) سمنٹ سازی اور سمنٹ کو بستہ میں بھرنا (۴) ماچس، بم اور پٹاخوں کی تیاری، (۵) کپڑا بننا، رنگنا اور چھاپہ دینا (۶) ابرق کو کاٹنا اور اسے الگ الگ کرنا (۷) لاکھ یا چپڑا سازی (۸) صابن بنانا (۹) چمڑہ کمانا اور (۱۰) اون صاف کرنا۔ نیز بیڑی اور سگار ورکرس (روزگار کی شرائط) ایکٹ سنہ ۱۹۶۶ء، کارخانہ ایکٹ سنہ ۱۹۴۸ء وغیرہ جیسے ایکٹس میں بھی ایسی پابندیوں کا ذکر ہے۔ کارخانہ ایکٹ سنہ ۱۹۴۸ء میں مزید اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ چودہ سال سے زیادہ عمر کے بچہ یا بالغ نوجوان کو کسی بھی کارخانہ میں کام کرنے کی اس وقت تک اجازت نہیں دی جائے گی جب تک کہ وہ ایک اہل ڈاکٹر سرجن سے یہ سرٹیفکیٹ پیش نہ کرے کہ وہ کام کرنے کے قابل ہے یا جب تک کہ وہ ایسا ٹوکن حاصل نہ کرے جس میں ایسے سرٹیفکیٹ کا ذکر ہو۔ اس ایکٹ کے تحت کسی بھی بچہ کو ایک کارخانہ میں روزانہ ساڑھے چار گھنٹے سے زیادہ یا رات کو کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مغربی بنگال دکان و ادارہ ایکٹ سنہ ۱۹۶۳ء:

اس ایکٹ کے تحت مزدوروں اور ملازمین کے کام کرنے کے حالات اور ان کے لئے فراہم کردہ مراعات کا اختصار کے ساتھ ذکر درج ذیل ہے:

کام کرنے کے اوقات: کسی بھی شخص کو ایک دکان میں یا ایک ادارہ میں ایک دن میں ساڑھے آٹھ گھنٹے سے زیادہ یا کسی بھی ہفتہ میں ۴۸ گھنٹے سے زیادہ عرصہ تک کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہر ملازم کو یومیہ چھ گھنٹے کے کام کے لئے ایک

ہفتہ تک آرام کرنے کا حق حاصل ہے۔

چھٹی: ایک ملازم کو یہ حق حاصل ہے:

(الف) ایک سال تک مسلسل برسرِ روزگار رہنے پر پوری تنخواہ کے ساتھ ۱۲ دنوں کی ترجیحی چھٹی (اس ایک سال کے عرصے میں تعطیلات، قانونی تعطیلات، کسی بھی ہڑتال جو غیر قانونی نہ ہو، یا تالہ بندی کا عرصہ شامل ہے) اس چھٹی کے عرصہ کو ۲۸ دنوں تک جمع رکھا جا سکتا ہے۔

(ب) ایک سال میں چودہ دنوں کے لئے نصف تنخواہ پر طبی چھٹی۔ اس چھٹی کے لئے ایک رجسٹرڈ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ طبی چھٹی کو ۵۶ دنوں تک جمع رکھا جا سکتا ہے۔

(ج) ہر سال پوری تنخواہ پر دس دنوں کی اتفاقی چھٹی۔ یہ چھٹی جمع نہیں ہوتی۔

(د) عورت ملازمین کو مذکورہ بالا چھٹیوں کے علاوہ ۱۲ ہفتے کی زچگی چھٹی، بچہ کے جننے سے قبل چھ ہفتے اور بعد چھ ہفتے، دی جاتی ہے۔ اس ایکٹ میں اس چھٹی کے سلسلہ میں چند شرائط کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور جنہیں پورا کرنا لازمی ہے

دکانوں / اداروں کا رجسٹریشن:

ہر دکان دار یا آجر کو، خواہ اس کے یہاں کوئی ملازم ہو یا نہ ہو، اس ایکٹ کے تحت اپنے کاروبار کے چالو کرنے کے بعد ۳۰ دنوں کے اندر مقررہ فارم میں رجسٹریشن کے لئے درخواست داخل کر کے اپنے کاروبار کو رجسٹرڈ کر لینا چاہئے۔

جرمانے: اس ایکٹ کی دفعات کی خلاف ورزی کرنے والوں پر پہلے قصور کیلئے ۵۰۰ روپیہ تک پھر بعد کے قصور کے لئے ایک ہزار روپیہ تک جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔

اس ایکٹ کا مقصد: اس ایکٹ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کے نفاذ سے قبل جو مراعات ملازمین کو حاصل تھیں انہیں کم کر دیا جائے، اس ایکٹ کے کلاز کے تحت مزدوروں اور ملازمین کے ان حقوق اور مراعات کی، جو ان کیلئے بہت ہی سود مند ہیں، حفاظت کی جاتی ہے ***

غزل

ہم بیچیں خودی، ایسے سوالی تو نہیں ہیں
حق مانگنے نکلے ہیں، بھکاری تو نہیں ہیں

آتا ہے ہمیں پیاس بجھانے کا سلیقہ
بدنام ہوں، ہم ایسے شرابی تو نہیں ہیں

دنیا کبھی دیکھے گی مری سوچ کے جلوے
یہ خواب حقیقت ہیں، خیالی تو نہیں ہیں

مانا کہ بہت خوب ہے غزلوں کی جوانی
چہروں کے مگر رنگ شہابی تو نہیں ہیں

مقصود ہمیشہ رہی اصلاحِ زمانہ
شاعر ہیں کوئی جذبؔ فسادی تو نہیں ہیں

جذبؔ الولوی

سرکاری خبریں

چائے صنعت کی ترقی کیلئے مثبتی اقدامات

پروفیسر نرمل بوس، وزیر صنعت و حرفت و اعلیٰ تعلیم، حکومت مغربی بنگال نے، حال ہی میں ماٹی گارا، سلی گوڑی میں منعقدہ ترائی انڈین پلانٹرس ایسوسی ایشن کی ۵۹ ویں سالانہ عام نشست کی صدارت کی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے وزیر موصوف نے چائے کی کوالیٹی میں بہتری لانے اور اس کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا کیونکہ عمدہ چائے کو ہندستان کے باہر کے ملکوں میں فروخت کرنے کیلئے بازار کے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ انہوں نے مزید کہا کہ چائے صنعت کی ترقی کے لئے چند مثبتی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے اور حکومت اس سلسلے میں تمام مثبت طریقوں سے چائے صنعت کی مدد کرے گی۔ شری بوس نے مزید کہا کہ ضلع جلپائی گوڑی کے دوارس کے علاقہ میں چائے باغات کی توسیع کے لئے تقریباً ۷۰۰ ہیکٹارس قطعات آراضی حاصل کرائے گئے ہیں۔ لیکن دارجلنگ اور ترائی میں اس صنعت کی توسیع کے لئے قطعاتِ آراضی نہیں لئے جا سکے کیوں کہ ان میں سے زیادہ تر علاقوں میں فوجیوں کا قبضہ ہے اور جنگلات ہیں۔ وزیر موصوف نے اس بات پر بھی زور دیا کہ چائے تیار کرنے کی صنعت میں الکٹرنکس استعمال کیا جائے۔ انہوں نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ حکومت نے شمالی بنگال میں بہت سارے صنعتی یونٹیں چالو کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کیلئے روزگار فراہم ہو۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ضلع دارجلنگ میں چند افتراق پسند طاقتوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے چائے صنعت بہت متاثر ہوئی ہے اور پیداوار بھی کافی کم ہو گئی ہے۔ انہوں نے لوگوں سے پرزور اپیل کی کہ وہ سب چائے صنعت میں شامل اور برسرروزگار لوگوں کی رفاہ کے لئے اس تحریک کو روکیں ÷÷÷

مضافاتی طالبات کیلئے اسکول پوشاک

ریاستی حکومت نے سنہ ۸۷-۱۹۸۶ء کے تعلیمی سال کیلئے مضافاتی علاقوں میں اول تا پانچویں کلاسوں کے پرائمری اور جونیئر بیسک اسکولوں کی طالبات کو فی طالبہ ۱۴ روپئے کے حساب سے اسکول پوشاک سپلائی کرنے کی اسکیم کی تکمیل کے لئے ۱۴۴۵۸۹۹.۰ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔ مختلف ضلعوں میں سے مدناپور ضلع کو اس مد کے تحت سب سے زیادہ رقم یعنی ۲۷۷۴۳۲۴ روپئے فراہم کئے جائیں گے ÷÷

مضافاتی علاقوں میں پانی کی سپلائی کی اسکیم

ریاستی حکومت نے موجودہ مالی سال میں اس ریاست کے گیارہ اضلاع میں ۶۲۸ پانی کے ذرائع (ٹیوب ویل/کنویں) کو از سرِ نو بٹھانے/تبدیل کرنے/بٹھانے/تعمیر کرنے کے لئے ۵۰۰۴۵۶.۰ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔ ان اضلاع میں ان علاقوں میں جہاں ٹیوب ویل بٹھائے نہیں جاسکتے وہاں پختہ کنویں تعمیر کئے جائیں گے۔ پنچایت سمیتیوں کے ذریعہ ان اقدامات کو روبہ عمل لایا جائے گا ÷÷÷

شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے طلباء کیلئے وظیفے

حکومتِ مغربی بنگال کے شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کی رفاہ کے شعبے نے سنہ ۸۷-۱۹۸۶ء میں ثانوی درجہ کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے شیڈولڈ کاسٹ کے طلباء کو ۳۳۹۶۳۷۵ روپئے اور شیڈولڈ ٹرائب کے طلباء کو مزید ۸۵۴۷۵۰ روپئے بطور وظیفہ دینے کیلئے منظوری دی ہے ÷÷÷



حکومتِ مغربی بنگال کے وزیر ریاست برائے نقل و حمل شری ایس، این، چودھری ۱۵؍ اگست ۱۹۸۶ء
کو سلی گوڑی میں این۔ بی۔ ایس۔ ٹی۔ سی کے ایک ورکشاپ کا افتتاح کرتے ہوئے۔

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta. Associate Md. Azam
Published by the Information & Cultural Affairs Dept. of Govt. of West Bengal and Printed by G. R. T. Printers. 54/1C, Shyampukur. Street, Calcutta-700 004.

کلکتہ میں
اسمبلی ہاؤس کے
جنوب میں چوراہے
پر نصب کردہ مجاہدِ
آزادی آنجہانی
سرت چندر
کا مجسمہ۔

وزیر اعلیٰ
شری جیوتی باسو،
۶؍ستمبر ۱۹۸۶ء کو مجاہدِ
آزادی آنجہانی سرت
چندر بوس کو خراجِ
عقیدت پیش کرتے
ہوئے۔

تصویریں از:
(اجیت داس)






پندرہ روزہ مغربی بنگال کلکتہ

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

شرح خریداری

قیمت : بارہ پیسے فی پرچہ ★ سالانہ : تین روپئے

ترسیل زر کا پتہ :

بزنس منیجر!
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۲۳- آر این مکھرجی روڈ - کلکتہ ۷۰۰۰۰۱

جلد نمبر ۳۳ ★ یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۱۹



وزیراعلیٰ شری جیوتی باسو کی، ۲۴ ستمبر ۱۹۸۶ء کو رائٹرس بلڈنگس، کلکتہ میں جاپان کے وفد کے ممبروں سے ملاقات —— (تصویر از : اراجیت بھٹاچاریہ)

اچاریہ پرفلا چندر رائے



از: ڈاکٹر این۔ آر۔ دھر

کچھ یادیں کچھ باتیں

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے ۱۹۰۷ء میں پہلی بار ہمارے گرو اچاریہ پرفلا چندر رائے سے رپن کالج جسے اب سریندرا ناتھ کالج کہتے ہیں، میں ملنے کا موقع ملا۔ اسی کالج میں اسی سال آئی ایس سی کورس شروع کیا گیا تھا۔ میں نے اس میں داخلہ لے لیا تھا اور اس کورس کے لئے کالج کو حسب ضرورت آلات و ساز و سامان فراہم کرنے کے سلسلے میں اچاریہ رائے اور چندرا بھوشن بہادوری اس کالج میں معائنہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن جب ۱۹۱۹ء میں میں نے کیمسٹری میں بی۔ ایس سی (آنرس) کورس میں پریسیڈنسی کالج میں داخلہ لیا تو اس وقت اس عظیم ہستی، مشہور استاد اور عالم سے روزانہ ملاقات ہوتی۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں انہوں نے ۹۱ اپر سرکلر روڈ میں واقع بنگال کیمیکل اور فارماسیوٹیکل ورکس کی عمارت کی بالائی منزل میں آنے کیلئے مجھے مدعو کیا۔ میں وہاں گیا اور تین سال تک وہاں ان کے ساتھ رہا۔ پھر ۱۹۱۵ء میں یورپ کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس طرح مجھے انہیں بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے خیالات اور تصورات سے آگاہ ہوا اور اس طرح اس عظیم ہستی کی خوبیوں نے میرے دل میں ان کے لئے پیار و احترام کا جذبہ اجاگر کیا۔ ان کی عظیم حب الوطنی، دکھیوں کے دکھوں کو دور کرنے کیلئے ان کی کوششوں، طلباء کے لئے ان کی محبت اور ان کی دانشمندی و دور اندیشی نے میرا دل موہ لیا۔ وہ اکثر یہی کہا کرتے "بجلی کے ایک سیل میں الیکٹرون کو ڈالنے سے کیا فائدہ ہوگا جب کہ سارا ملک غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور لوگ نیم بھکمری کے شکار ہیں"۔

سیدھی سادی زندگی اور اعلیٰ خیالات کی ہندستانی روایات پر ان کا عقیدہ تھا، اور انہوں نے ان باتوں پر عمل بھی کیا۔ پریسیڈنسی کالج میں (۱۸۸۹ء سے ۱۹۱۵ء تک) سرکاری ملازمت کے عرصہ میں پہلے تو وہ کیمسٹری کے جونیئر پروفیسر تھے، پھر بعد میں وہ اس ڈپارٹمنٹ کے سربراہ اور پروفیسر بن گئے۔ اس عرصہ میں ان کی تنخواہ فی ماہ ۲۵۰ روپئے سے ۸۰۰ روپیہ تک تھی۔ لیکن وہ سوتی کپڑے کا سوٹ پہنتے، اور سوٹ کے کپڑے کی قیمت چار آنے فی گز ہوتی۔ صبح اور شام کو سستے دام کی دھوتی پہنتے، کبھی کبھی تو پھٹی دھوتی کو سلائی کرکے پہن لیا کرتے۔ آپ اکثر ریڈ روڈ میدان کلب جایا کرتے۔ آپ اس کلب کے ممبر بھی تھے۔ کبھی کبھی آپ اس کلب میں سر کے بال کے شیو کیشر نامی تیل کمپنی کے مالک کویراج چندرا ناتھ سین، بنگا باشی کالج کے پرنسپل شری جی۔ سی۔ بوس، سریندرا ناتھ بنرجی کے مشہور شاگرد اور اچاریہ رائے کے عزیز دوست ستیہ نند ابوس اور ان کے شاگردوں کے ساتھ جایا کرتے اور وہاں اپنی پھٹی دھوتی اور قمیض کو دکھاتے اور خوشی

محسوس کرتے۔ جب وہ پریسیڈنسی کالج میں معلم تھے تو اس
وقت وہ کالج میں گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر آتے اور ہر ٹرپ
کے لئے چار آنے بطور کرایہ دیتے۔ انہوں نے بہت سے مواقع
میں مجھ سے کہا کہ جب وہ نیل رتن سرکار، ڈاکٹر ستاکار مترا،
ڈاکٹر پی کے اٹلی کے ساتھ شمالی ہندستان کے دورے پر
جاتے تو ہمیشہ ریل کے سکنڈ کلاس ڈبے میں سفر کرتے کیونکہ
وہ معمولی لباس میں ملبوس ہوتے۔ شام کے وقت عشائیہ
سے قبل ہم لوگ مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے۔ آپ
اکثر مغربی تہذیب کی شان و شوکت اور عظمت کا حقارت سے
ذکر کرتے گو کہ آپ یورپ کے باشندوں کی روزمرہ کی
زندگی میں ایمانداری، غریب اور امیر دونوں کے لئے مواقع کی
مساوات، شہری صفائی کی بابت خیالات، قانون کی پابندی،
دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ، وقت کی پابندی، سائنس
سے محبت وغیرہ کی بڑی تعریف کیا کرتے۔ آپ نے ایڈنبرا
یونیورسٹی میں چار سال تک (سنہ ۱۸۸۲ - ۱۸۸۶ء) تعلیم
حاصل کی۔ پھر بعد میں آپ نے چار بار یعنی سنہ ۱۹۰۱ء،
سنہ ۱۹۱۲ء، سنہ ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۲۶ء میں یورپ کا دورہ کیا اور
وہاں امپائر یونیورسٹی کانگریس میں شرکت کی اور کیمیاوی
سائنس کی دنیا کی نئی دریافتوں اور متعلقہ باتوں میں دیگر
شرکاء سے تبادلۂ خیال کیا۔ لیکن اس محفل میں بھی انہوں
نے کبھی یورپی لباس نہیں پہنا۔ لیکن برخلاف اس کے اس
وقت کے دیگر عظیم افراد جیسے سر جے۔ سی۔ بوس اور
گوپال کرشنا گوکھلے، جو اچاریہ کے دوست تھے اس اصول
پر کاربند تھے کہ جب روم میں رہو تو رومی بن جاؤ، اس لئے
وہ سب جب یورپ میں رہتے تو یورپی لباس پہنتے۔ سنہ ۱۹۱۲ء
میں جب گوکھلے ہندستانی اصلاحات کے لئے اسلنگٹن
کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے کلکتہ آئے، تو اس وقت وہ یہاں
پریسیڈنسی کالج کے کیمسٹری لیبوریٹری (تجربہ گاہ) میں آئے
یہاں انہوں نے اچاریہ کے شاگردوں کو جانچ کے لئے اپنا
پیشاب دیا کیوں کہ انہیں شک تھا کہ ان کے پیشاب میں شکر
تھا۔ یوں تو گوکھلے شکر کے مریض تھے۔ اچاریہ یہ کہا کرتے
تھے کہ گوکھلے نے بنگال کے لئے "سرونٹس آف انڈیا
سوسائٹی" کی خدمات کو سونپ دیا! اور گوکھلے یہ کہا کرتے
تھے کہ "بنگال جو آج سوچتا ہے، ہندستان اسے آئندہ کل
سوچتا ہے"۔

بہت عرصہ تک اچاریہ رائے نے کلکتہ کے کالجوں
کے ضرورت مند طلبہ کی مدد کے لئے ہر ماہ ۴۰۰ روپئے دیا
کرتے۔ انہوں نے سادھارن برہمو سماج اور برہمو گرلس
اسکول، جس کی نگرانی ان کی دوست لیڈی ابالا بوس تھی، کو
بھی دل کھول کر مالی امداد دی۔ جب کبھی کسی اچھے کام کیلئے
لوگوں کو پیسے کی کمی محسوس ہوتی تو وہ سب لیڈی بوس کے پاس
جاتے اور لیڈی بوس ان کے لئے اچاریہ رائے سے کافی رقم
بطور امداد حاصل کر لیتیں۔ مزید برآں ان کی اپنی بنگال
کیمیکل اینڈ فارماسیوٹیکل ورکس، اپنے خرچ پر سائنس کی تعلیم
دینے والے کالجوں کو حسب ضرورت آلات اور ساز و سامان
سپلائی کرتا۔ میں آج بھی ان کا ممنون ہوں کہ جب میں سنہ ۱۹۱۵ء
میں ریاستی اسکالر کی حیثیت سے تحقیقی کام کرنے کے لئے
یورپ کے لئے روانہ ہوا تو انہوں نے مجھے ۴۰ پونڈ (۵۰۰
روپئے) دئے۔ ایچ۔ کے سین کو، جو بعد میں کلکتہ یونیورسٹی
کی اپلائیڈ کیمسٹری کے پروفیسر بنے، جب وہ طالب علم تھے
شری اچاریہ رائے انہیں ۴۰ روپئے فی ماہ دیا کرتے تھے۔ بعد میں
شری اچاریہ رائے جب تک یونیورسٹی میں کیمسٹری کے پالت
پروفیسر رہے، کوئی تنخواہ نہ لی۔ انہیں ۴۰۰ روپیہ فی ماہ
پنشن ملا کرتا اور اسی پر وہ گذارہ کیا کرتے۔ وہ اپنی تنخواہ کی
زیادہ رقم، انڈین کیمیکل سوسائٹی کو، کیمیاوی تحقیق کے لئے
"ناگرجونا پرائز" عطا کرنے کے لئے کلکتہ یونیورسٹی کو اور
سائنس میں ریسرچ فیلوشپ قائم کرنے کے لئے اور انعامات
دینے کے لئے خرچ کرتے۔ گرچہ وہ بڑے فیاض اور انسان
دوست تھے ساتھ ہی ساتھ وہ بہت سرگرم اور عملی
انسان بھی تھے۔ انہوں نے کیمیاوی اشیاء تیار کرنے کے لئے

بنگال کیمیکل اور فارماسیوٹیکل ورکس قائم کیا۔ آج اس صنعت کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں جب اچاریہ رائے درہم یونیورسٹی سے اعزازی ڈی۔ ایس سی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یورپ کے دورہ سے ہندوستان واپس آئے تو انہیں پریسیڈنسی کالج کے طلباء نے ایک استقبالیہ دیا جس کی صدارت اسی کالج کے اس وقت کے پرنسپل ایچ۔ آر۔ جیمس نے کی۔ مسٹر جیمس نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اچاریہ رائے کی خوبیوں اور سائنس کی دنیا میں گراں قدر خدمات کا اعتراف کیا۔ انہوں نے کہا کہ جس منزل پر بڑے بڑے کاروباری ناکام ہو چکے تھے، وہاں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ مسٹر جیمس اچاریہ کا بہت احترام کیا کرتے اور انہیں پریسیڈنسی کالج کے گورننگ باڈی کا واحد پروفیسر ممبر بنا دیا۔

اچاریہ اپنے شاگردوں کو بہت چاہتے تھے۔ ان کے بہت سارے شاگردوں، جیسے پروفیسر پی۔ رائے، ڈاکٹر ایچ۔ کے سین، ڈاکٹر بی۔ بی۔ دے، آر سی۔ رائے، ایم۔ این۔ ساہا، جے سی۔ گھوش، جے۔ این۔ مکھرجی، پی۔ بی۔ سرکار، ایس۔ ایس۔ بھٹناگر، پی سی۔ گوہا، بی سی۔ گوہا، جے۔ این۔ رائے، پی۔ کے بوس اور دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ میں نے بھی ان سے استفادہ حاصل کیا۔

اچاریہ رائے کا کیمسٹری سے دلی لگاؤ تھا۔ انہوں نے بہت سارے تجربات سے نئی نئی دریافتیں کیں۔ انہوں نے جگہ جگہ تقریریں کیں اور اپنے تجربات کا مظاہرہ پیش کیا۔ ان سے ان کے سائنسی تصورات کے اصول بالکل عیاں ہو جاتے تھے۔ وہ اکثر اپنے طلباء کے لیکچر۔ نوٹ کی تصحیح کر دیا کرتے۔ ایک بار میں ایک تجربہ کر رہا تھا۔ پانی میں ترسیل برق کی طاقت ہے۔ اس طاقت کو رد عمل لا کر نائٹرائٹ محلول کی ترسیل برق کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے تجربہ کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت اچاریہ رائے تجربہ گاہ میں گھنٹوں میرے ساتھ بیٹھے رہتے اور تجربہ کے نتائج پر بحث و مباحثہ کیا کرتے۔ جب وہ تیسری بار سنہ ۱۹۱۲ء میں یورپ گئے تو اس وقت انہوں نے ہوپ مین طریقہ کار سے جو تجربہ کیا تھا اسے بھی وہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ انہوں نے ایک غیر مستحکم مرکب امونیم نائٹریٹ کا، خلا میں بھاپ ثقل نوی معلوم کرنے کے لئے ہوپ مین کے طریقہ کار کو اپنایا تھا۔ عام درجہ حرارت میں امونیم نائٹریٹ نائٹروجن اور پانی میں منتشر ہو جاتا ہے۔ اس رد عمل میں ۷۱۸ کیلوریز گرمی پیدا ہوتی ہے۔

$$(NH_4NO_2 = N_2 + 2H_2O + 718\ K\ Cal)$$

اچاریہ رائے نے کیمیکل سوسائٹی، لندن کی ایک نشست میں، اپنے ان تجربات کو تفصیل کے ساتھ دہرایا۔ انہیں سر ولیم رامسے سر ہنری۔ ای، ارمسکو اور برطانیہ کے دیگر مشہور کیمسٹوں نے دلی مبارکباد دی۔ ڈاکٹر ویلے نے کہا کہ ڈاکٹر رائے ایک ایسی قوم کے نمائندہ ہیں جو سائنس اور تہذیب کی دنیا میں بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ جبکہ ان کا ملک (انگلینڈ) ایک مایوس کن دلدل میں ہے۔

کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیوں نے سنہ ۱۹۵۷ء میں اپنی اپنی صد سالہ سالگرہ منائی، لیکن ان یونیورسٹیوں میں شروع شروع میں تحقیقات کے کام نہیں ہوئے اور اس صدی کے شروع میں ہندوستانی تاریخ، فلسفہ، سنسکرت وغیرہ پر تحقیقی کام منظم طریقے سے شروع کیا گیا۔ اچاریہ رائے اور اچاریہ جے سی۔ بوس نے سنہ ۱۸۸۸ء سے ہی پریسیڈنسی کالج میں تجرباتی تفتیش کا کام شروع کر دیا اور انہوں نے تجربہ گاہ میں کسی کی مدد کے بغیر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے چند ہونہار نوجوانوں اچاریہ رائے کی خدمات سے متاثر ہوئے اور انہوں نے ان کے تحت ریسرچ کا کام کرنا شروع کر دیا۔ سارے ہندوستان میں یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی بار کلکتہ میں کیمیاوی تحقیق کرنے والوں کی ایک جماعت نے تحقیق کا کام شروع کر دیا۔ سر سی۔ وی۔ رمن ایک اکاؤنٹس افسر نے سنہ ۱۹۰۷ء میں ۲۱۰۔ بہو بازار اسٹریٹ، کلکتہ میں واقع سائنس کے فروغ کے لئے انڈین ایسوسی ایشن

کی تجربہ گاہوں میں فزکس میں تحقیق کا کام شروع کر دیا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بہت سارے افراد، ان تجربہ گاہوں میں ان کے ساتھ اور انکی رہنمائی میں فزکس میں ریسرچ کرنے لگے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اچاریہ رائے کے شاگردوں نے ملک کی بہت ساری یونیورسیٹوں میں تحقیق اور مطالعہ کے مراکز کھولے۔ سر ٹی۔ این۔ پالت، سر راش بہاری گھوش، کھیرا کے راجہ کی فراخدلی اور تعاون کے ذریعہ ۱۹۱۵ء میں یونیورسٹی کالج آف سائنس قائم کیا گیا، اور اچاریہ رائے کو اس کالج کا پالت پروفیسر آف کیمسٹری اور سی۔ وی۔ رمن کو پالت پروفیسر آف فزکس مقرر کیا گیا۔ یہ واقعہ ہماری قومی ترقی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اچاریہ رائے کو وہ موقع فراہم ہوا جس کی انہیں توقع تھی، اور ان کے الفاظ میں "میری زندگی کے خواب کی تعبیر ہوئی"۔

اچاریہ رائے نہ صرف ایک اچھے اور عظیم معلم تھے بلکہ وہ تو اپنے شاگردوں اور نوجوانوں کے لئے تخلیق و تعلیم کا منبع تھے، اور یورپی شہرت کے سائنس دانوں، گے لیوسک، ریلے، لاوائزر، وہلر، اوسٹوالڈ، برزیلیس، اربین اور سلویں کی صفوں میں ان کا شمار کرنا چاہئے۔

اچاریہ رائے کو تواریخ اور انگریزی ادب میں بھی کافی عبور حاصل تھا۔ وہ فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں لکھی کتابوں اور رسالوں کا بھی مطالعہ کیا کرتے۔ ان کی لکھی مشہور "ہسٹری آف ہندو کیمسٹری" (ہندو کیمیاوی سائنس کی تواریخ) کیمیاوی سائنس اور قدرتی اور طبعی سائنسوں کی تاریخ کی بابت ان کے علم کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کے عزیز شاگرد پروفیسر پی۔ رائے نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کر کے اور توسیع کر کے اسے پھر شائع کیا۔

گرچہ انہوں نے اپنی کتاب کا نام 'ہندو کیمسٹری' رکھا لیکن وہ ایک برہمو تھے اور شیوناتھ شاستری، نیل رتن سرکار، پی۔ کے۔ اچاریہ، ستیہ ناتھ تتوا بھوسن جیسے عظیم برہمو سماجی سربراہوں کا انہیں اعتماد حاصل تھا۔ میں ان کا مشکور ہوں کہ وہ مجھے بہت چاہتے تھے اور مجھے ان کا اعتماد حاصل تھا۔ انہوں نے جبلپور یا الہ آباد میں میرے غریب خانہ میں کئی بار تشریف فرما ہوئے۔ میں نے ۱۹۳۸ء میں شیلا دیوی سے شادی کی۔ میرے گرو بہت خوش ہوئے کیوں کہ میری بیوی ایک برہمو لڑکی تھی اور اچھی کیمسٹ تھی۔

ان کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوا۔ اس سے تقریباً دس سال قبل میں راربی۔ کاٹی پاڑہ، کھلنا میں ان کے گھر گیا۔ یہاں وہ گرما کی چھٹیاں گزار رہے تھے۔ یہاں بھی وہ نوجوانوں کی ایک مثال پیش کر کے ایک سیدھی سادی دیہی زندگی گزارنے کے لئے ہمت افزائی کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ چند خوشگوار دن گزارنے کے بعد جب میں الہ آباد کے لئے واپس آنے لگا تو انہوں نے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے الوداع کہا۔ میں اس واقعہ کو آج تک فراموش نہ کر سکا اور نہ اس محبت کو فراموش کر سکوں گا۔ ایسے گرو، محب وطن، انسان دوست، عظیم سائنس داں، مورخ اور ایک انسان، جنہوں نے اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کر دی، نوجوانوں کے لئے ایک مشعلِ راہ ہیں، اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر ہم قوم کی بحسن و خوبی خدمت کر سکتے ہیں۔

ان کی محبت اور ان کی یاد کے احترام میں کلکتہ کارپوریشن نے اپر سرکلر روڈ کے ایک حصہ کا نام اچاریہ پرفلا چندر روڈ رکھا۔ ہم ان کے ہم وطن، ان کے ممنون ہیں، ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی کیوں کہ ان کی زندگی، بنی نوع انسان کی خدمت کی ایک شاندار مثال ہے۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے سارا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا
—— اقبال

طبی سہولتیں

بائیں محاذ حکومت نے طبی دیکھ بھال کی جس پالیسی کو اپنایا ہے اس میں تدارکی اقدامات اور اجتماعی طبی دیکھ بھال خدمات پر خصوصی طور پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ان اقدامات اور خدمات سے اس ریاست کے عوام کی اکثریت مستفید ہو۔ صحت معیشت کے نقطۂ نظر سے "کم خرچ اور اچھے نتائج" کے اصول کو اپنایا گیا ہے اور اس طرح تدارکی اور طبی دیکھ بھال خدمات میں اضافہ کیا گیا ہے اور انہیں جدید طرز پر ڈھالا جا رہا ہے۔ آج تدارکی طبی دیکھ بھال کا نظام جدید ترین تفتیش اور تکنیکی اقدامات پر مبنی ہے۔ مضافات سے وابستہ چند میڈیکل کالجوں کے شعبہ جات تشخیص امراض، مطالعۂ جراثیم کو مستحکم بنایا جا رہا ہے تاکہ یہ امراض کے علاج اور روک تھام کے اور طبی دیکھ بھال کی ضرورتوں کو، امراض کی نوعیت، وجوہ اور ادویہ کی بابت مشورہ دے کر پورا کریں۔ نیز طبی دیکھ بھال کے تنظیمی ڈھانچہ کو انتہائی حد تک بروئے کار لانے کے پیشِ نظر طبی خدمات کی خاص طور پر مضافاتی علاقوں میں توسیع کے لئے ایک ماہرین کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ یہ کمیٹی طبی خدمات کی توسیع کے لئے اقدامات کے سلسلے میں سفارشات پیش کرے گی۔ نیز مضافاتی علاقوں میں طبی خدمات کی فراہمی کے لئے تحتی مرکز، ذیلی مرکز، ابتدائی مرکز صحت اور مضافاتی اسپتال قائم کئے گئے ہیں۔

طبی تعلیم

صحت عامہ خدمات میں وسعت اور مزید بہتری کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ نیز طبی اور معاون طبی معہ دانتوں کے مطب اور نرسنگ افراد کے لئے یہ بات صادق آتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ طبی تعلیم پروگرام کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ اس پروگرام کو مضافات سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مضافاتی ماحول میں کام کرنے کے لئے ڈاکٹر تیار کئے جائیں۔ تین شاخوں میں ایم - ڈی - ایس کے مختصر کورس اور بی - ایس سی نرسنگ کورس رائج کیا گیا۔ ڈاکٹروں کو جدید ترین سائنسی معلومات فراہم کرنے کے مقصد کے لئے مسلسل طبی تعلیم لازمی ہے۔ اور ان باتوں کی وجہ سے مرض پر کنٹرول کرنے اور اس کے علاج میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر مشہور طبی سائنسدانوں پر مبنی ایک ٹاسک فورس اس کام میں مصروف ہے۔

قومی ادویہ پالیسی

صحت عامہ دیکھ بھال خدمات کو بہتر طریقہ سے روبہ عمل لانے کے لئے ایک قومی ادویہ پالیسی کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس سلسلے میں بائیں محاذ حکومت نے ایک ادویہ پالیسی مرتب کی ہے اور اس نے حکومتِ ہند سے درخواست کی ہے کہ وہ ایک قومی ادویہ پالیسی مرتب کرے۔ اس دوران او - پی - ڈی، آئی - پی - ڈی معہ امراضِ قلب کے لئے لازمی اور جان بچانے والی ادویہ کی ایک فہرست تیار کی گئی ہے۔ ادویہ اور غذائی اجناس میں آمیزش کی روک تھام کے لئے خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس وبا کو دور کرنے کے لئے شعبۂ شہری ترقیات، شعبۂ خوراک و رسد اور شعبۂ پولس کے ایک مشترکہ منصوبہ کو روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔

خون بینک

خون بینک کی اہمیت اور خدمات سے لوگوں کو

روشناس کرایا [illegible] ہے اور اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ [illegible] سے زیادہ تعداد میں لوگ رضاکارانہ طور پر خون کا عطیہ [illegible] دیں۔ خون کا عطیہ قبول کرنے کے لئے بہت سارے مستقیم خون بینک ہیں، نیز گشتی خون بینک بھی خون کا عطیہ حاصل کرنے کے کام میں سرگرم عمل ہیں۔

اس مقصد کی حصولیابی کے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ صحت عامہ خدمات میں شامل ہوجائیں، لوگوں کو صحت کی تعلیم دینی ضروری ہے۔ طبی علم کے فروغ کے لئے اور ایسے علم کو عمل میں لانے کے لئے تمام دستیاب ذرائع کو روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ ریاستی طبی تحقیق کاؤنسل کا مرکز بہت ہی جلد چالو ہوجائے گا۔ یہ مرکز نوجوان کارکنوں کی، ساتھ ہی نوجوان محققوں کی ہمت افزائی کرے گا۔ نیز آئی۔سی۔ایم۔آر کے ساتھ قریبی تعلقات کو قائم رکھے گا۔ شروع شروع میں یہ کاؤنسل مندرجہ ذیل پانچوں باتوں کی طرف مرکوز طور پر دھیان دے گا۔

(۱) امراض متعدی کا جانچ پروگرام (۲) بستیوں میں تغذیہ کی اقسام کا مطالعہ اور اس سلسلے میں اصلاحی اقدامات، (۳) پیچش جیسے امراض کا جانچ پروگرام (۴) کالا آزار کی روک تھام اور علاج اور (۵) آنتوں میں کرم کے امراض کا مطالعہ۔

امراض متعدی کی روک تھام

امراض متعدی جیسے ملیریا، جذام، فائیلیریا اور تپ دق پر کنٹرول کرنے پر کافی زور دیا گیا ہے۔ نیز آنتوں کے امراض کالا آزار، جاپانی امراض دماغ اور متعدی امراض جگر کا مقابلہ کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً خصوصی مہم چلائی جاتی ہے۔ نابینائی کی روک تھام کرنے اور امراض چشم کے علاج کے لئے اس ریاست میں ایک وفاقی اسکیم کو مرکوز طور پر روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ موتیابند کے آپریشن کی تعداد میں حالیہ برسوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

زچہ وبچہ دیکھ بھال پروگرام

زچہ وبچہ صحت خدمات کے فروغ کے لئے مرکوز طور پر کوششیں کی جارہی ہیں، نیز ان خدمات کے تحت خاندانی رفاہ پروگرام کو بھی روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ ان پروگراموں کو عوام کی تائید حاصل ہوئی ہے اور اس کے نتیجہ میں زچہ وبچہ کی اموات کی شرح میں کافی کم ہوگئی ہیں اور لوگوں نے عام طور پر "چھوٹے خاندان" کے اصول کو اپنالیا ہے۔

مضافات میں ذیلی مراکز صحت، معاون مراکز صحت، ابتدائی مراکز صحت اور مضافاتی ہسپتالوں میں اس پروگرام کو روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ نیز ان مراکز اور ہسپتالوں میں علاج کی فراہم سہولتوں میں مزید اضافہ کیا جارہا ہے۔ بستروں اور اسٹاف کی تعداد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ادویہ اور دیگر ضروری چیزوں کی گنجائش میں اضافہ کیا گیا۔ کلکتہ میں چند بنیادی ہسپتالوں میں دن رات ایکسرے، تشخیص امراض، حیاتیاتی۔کیمیاوی اور ای۔سی۔جی خدمات فراہم ہیں۔

اس ریاست میں ہندوستانی طریقہ علاج اور ہومیوپیتھی تو طبی دیکھ بھال کے اہم جزو ہیں۔ ہندوستانی طریقہ علاج میں یونانی اور آیورویدک شامل ہیں۔ ریاستی حکومت کی قائم کردہ یونانی ادویہ مغربی بنگال کی ریاستی کاؤنسل نے یونانی حکیموں کے ناموں کے رجسٹریشن کا کام مکمل کرلیا ہے۔ چند ریاستی یونانی شفاخانے کا قیام زیر عمل ہے۔ آیورویدک نظام کے تحت تعلیمی اداروں، طبی دیکھ بھال یونٹوں اور ادویہ تیار کرنے کے مراکز میں نمایاں تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔ تعلیم اور علاج کے میدان میں ہومیوپیتھی میں کافی بہتری لائی گئی ہے۔

اس ریاست میں ابھی بہت ساری امدادی اسکیمیں جاری ہیں۔ ان اسکیموں میں عالمی بینک، مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت سرگرم عمل ہیں۔ کلکتہ شہری ترقیاتی پروجیکٹس ۱ اور ۲ کو سی۔ایم۔ڈی۔اے کی چند بستیوں میں

پایۂ تکمیل تک پہونچ گیا۔ ان پروجیکٹوں کے تحت بستیوں میں بار بار گھر جا کر لوگوں کو ابتدائی صحت عامہ خدمات فراہم کی گئیں۔ ان خدمات کے اچھے نتائج کے پیش نظر اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ گلگزشتہ ترقیات۔ پروجیکٹ ۳ کے تحت ایسی ہی سہولتیں سی۔ ایم۔ ڈی۔ اے کے مختلف علاقوں میں اقدامات کئے جائیں گے اور لوگوں کو بھی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ہندوستانی آبادی پروجیکٹ ۲ کو جس کے لئے تقریباً ۱۰۷ کروڑ روپئے خرچ ہوں گے اب اسی ریاست کے چار اضلاع بردوان، بانکوڑا، بیر بھوم اور پرولیا میں روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت جو اقدامات کئے جا رہے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی جائے، اموات (خاص طور پر بچہ و زچہ کی) میں کمی کی جائے اور خاندانی رفاہ کے پروگرام کو وسیع پیمانہ پر فروغ دیا جائے۔

سارے ہندوستان میں دو اضلاع ہیں سے ایک ضلع پرولیا میں کشٹ اور یہ پروجیکٹ کی شاندار کامیابی کے پیش نظر مرکزی حکومت نے یہ جرأت مند فیصلہ کیا کہ ۲۰۰۰ء تک سارے ملک سے جذام کو مکمل طور پر نیست و نابود کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہماری ریاستی حکومت نے بہت سارے اقدامات کئے ہیں۔ ہم لوگ رضاکار تنظیموں، پنچایتی اداروں اور جمہوری تنظیموں کے سرگرم تعاون کے ذریعہ اس اسکیم کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

صحت عامہ خدمات کی رفتار ترقی

	۱۹۷۶ء		۱۹۸۵ء
۱۔ صحت عامہ پر فی کس اخراجات	۱۵٫۹۰ روپیہ		۳۷٫۰۷ روپیہ
۲۔ ہسپتالوں کی تعداد	۳۴۲		۴۰۹
۳۔ امدادی مراکز صحت	۷۱۸	-	۸۲۰
۴۔ ہسپتالوں میں بستروں کی تعداد	۵۲۶۲۴	-	۶۴۳۳۱
۵۔ گشتی شفاخانے	—	-	۷۸
۶۔ تربیت یافتہ نرسوں کی تعداد	۶۹۸۵	-	۱۸۷۱۶
۷۔ تربیت یافتہ صحت رہنما کی تعداد	—	-	۲۱۲۳۴
۸۔ خاندانی رفاہ پروگرام: (الف) بچوں کی پیدائش کی روک تھام	۳۵۸۴۷	-	۱۷۴۸۱۱
(ب) آئی۔ یو۔ ڈی	۷۱۲۴	-	۲۱۹۴۸۰

بقیہ: اکبر الہ آبادی کی شاعری

نہیں تھے۔ یہ درست تھا کہ اچھی چیزوں کو حاصل کیا جائے مگر خاص کر اس کے نظریہ فکر و عمل میں ان باتوں پر رد عمل ہو جاتا جو ہمارے معاشرے اور ہماری تہذیب کے لئے مضر تھے۔ اسی غرض کے تحت اکبر نے فرنگی تمدن کو سماج کی جڑ سے ہٹانے کے لئے اپنا طنز و ظرافت سے کام لیا۔
بلاشبہ اکبر ایک حقیقت پسند شاعر تھے۔ وہ زندگی کو اجتماعی حیثیت سے دیکھتے تھے اس لئے عام شعراء سے ان کا نظریہ فکر مختلف ہے۔ وہ طنز و ظرافت کے تیر انسانوں پر پھینکتے ہیں لیکن اس میں انسانی دوستی کا جذبہ ہوتا ہے — اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ طنز و ظرافت کے تیروں سے نشتر لگا دیتے ہیں۔ مگر وہ نشتر دل میں گدگدی لگا دیتا ہے اور اس طرح وہ ہنستے ہنساتے بڑے حسن ادائیگی سے مطلب کی بات کہہ جاتے ہیں ٭٭٭

بشکریہ "پاسبان" چنڈی گڑھ

اکبر الہ آبادی کی شاعری

اے۔ کے راہومورتی سہرساوی

اردو ادب کی دنیا میں اکبر آج بھی ایک چمکدار ستارے کی طرح درخشاں ہیں۔ وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جس وقت کہ مغل حکمراں کا اقبال رو بہ زوال تھا۔ ہر طرف مایوسی اور افراتفری تھی۔ جاگیرداری نئے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ ہر گوشے میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ہندوستانیوں کے مال و جائیداد، عزت و حرمت اور ان کی مذہبی، روحانی حیثیت سب پامال ہو رہی تھی ۔ اکبر نے ان سب حیرت ناک اور زہرہ گداز واقعات اور انقلابات کا مشاہدہ کیا اور اس کے دھکے بھی کھائے۔ اس لئے ان کے کلام میں سب سے زیادہ مذہبی زوال کا سبق ملتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار میں رجعت پسند عناصر ہیں اور مادیت کے خلاف ان کی صدائیں بازگشت ہیں۔

اکبر کی پیدائش ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو قصبہ بارہ میں ہوئی جو الہ آباد سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ علوم متداولہ گھر پر ہی ہوئی۔ وہ انتہائی خوش مزاج اور نفاست پسند واقع ہوئے تھے۔ جیسے جیسے ان کے علم میں وسعت ہوتی گئی ان کے حسیات بھی لطیف تر ہوتے گئے۔ انہیں قدرت کی جانب سے عالمانہ دماغ اور شاعرانہ جذبات عطا ہوتے تھے۔ اس وقت کی سیاست پر ہنگامہ آرائی کی دھول ماحول کو تاریک کرتی جا رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے موجودہ مسلم تہذیب، اخلاق و معاشرت، رسم و رواج، میلانات و رجحانات، تعلیم و تربیت غرض یہ کہ سارے معاشرتی اور ذہنی تصورات و توہمات پر ظریفانہ تنقید و تبصرہ کو نہایت خوش اسلوبی سے نظم کیا جس سے اس زمانے کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے ؎

ہم نشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا

❖❖

بہت رہئے وہ اسپیچوں میں حکمت اسکو کہتے ہیں
میں سمجھا خیر خواہ ان کو حماقت اسکو کہتے ہیں

❖❖

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

❖❖❖

اکبر کے کلیات میں غزلیں، مثنویاں، رباعیات، قطعات اور متفرق اشعار ملتے ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ غزلوں کا ہے۔ ان کی غزل کی خوبی طنز و ظرافت اور تصوف و معرفت ہے جو اس زمانے کے تغیرات اور انقلابات کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے چند کلام ایسے بھی ملتے ہیں جن سے اکبر کے عاشقانہ مزاج اور حسن پرست طبیعت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ ان کے ابتدائی دور کا انداز ہے۔ جیسا کہ ان کے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں ؎

دشمن راحت جوانی میں طبیعت ہو گئی
جس حسیں سے مل گئیں آنکھیں محبت ہو گئی

❖❖

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

٭٭٭

حیا سے سر جھکا لینا، ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

٭٭٭

حسن و عشق کا رشتہ دست و گریباں جیسا ہے۔ عشق، حسن کے فراق میں بے قرار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عقل لاکھ رہبری کرے لیکن عشق اس کی ایک نہیں سنتا ہے۔ عقل ہر چند صبر، ضبط، توبہ اور درگزر کی تلقین کرے اسے گوارا نہیں کرتا۔ اس کے تمام لوازمات ناز، ادا، دلربائی، خوشنمائی قامت اور لطافت کو دیکھتا اپنی دھن میں ہو وارفتہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف حسن بھی اپنے گوہر مقصود کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باوجود تمام رکاوٹوں اور پابندیوں کے یا تو دونوں کامیاب ہوتے ہیں یا دونوں فنا فی المقصد ہو جاتے ہیں۔ لیکن اکبر کا دامنِ عشق ایسا نہیں، ان کی جذبات پسند طبیعت نے ان پر منفرد رنگ چڑھا دیا اور پھر یہ عشق مجازی رفتہ رفتہ عشقِ حقیقی کی بلند منزل تک پہنچ گیا ہے جیسا کہ حقیقی کیفیت کا اظہار انہوں نے خود کیا ہے ؎

جنونِ عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے
یہی مستی ہے وہ جو عقل کو ہشیار کرتی ہے

٭٭٭

تصوف ایک عجیب طرزِ فکر ہے۔ ایک طرف اس سے تخیل اور ادراک سے دل و دماغ سب کو تسکین ملتی ہے ہر طرف حسن ہی حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ تو دوسری طرف فنی جمالیات، مذاق اور معیار کی تربیت ہوتی ہے۔ بصارت اور بصیرت کو تقویت ملتی ہے۔ مضامین میں دلگدازی اور سخن میں آب و رنگ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن اکبر کے مذہب کا تصوف اس درجہ [illegible] وہ اتنے جذباتی تھے کہ زندگی کے قریب

ہو کر سوچا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ مذہب کی روح کو نہیں سمجھ سکے۔ ان کا نظریۂ تصوف اپنے منبع اص[ل] تک پہونچنے میں کامیاب بنا رہے ہے۔ وہ فلسفیانہ تصوف کے مخالف ہیں جس کی بنیاد صرف عقل پہ ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں ؎

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

٭٭

صدیوں فلاسفی کی چنا اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

٭٭

اکبر کے کلام میں تصوف و معرفت، حکمت و توحید، عشق و محبت وغیرہ کی دل گیر چاشنی ملتی ہے جو اس نے اردو شاعری کو ایک جدید اسلوب سے آشنا کیا ہے۔ لیکن ان کی شاعری کی ایک خوبی جو سب سے بڑھ کر بتائی جاتی ہے وہ ظرافت اور شوخ طبعی ہے۔ اردو ادب میں اکبر سے پہلے بھی ظرافت اور طنز موجود تھا۔ میر، انشاء اور مصحفی اپنے اپنے خاص انداز کے ساتھ اس محفل میں نظر آتے ہیں۔ میر کے یہاں ظرافت کی اچھی مثالیں ہیں۔ لیکن انشاء کی ظرافت میں مردانہ وقار نظر نہیں آتا ہے۔ اس کے بعد غالب کا زمانہ آتا ہے۔ غالب نے اپنے نثر میں طنز و ظرافت کے بڑے ہی دلنواز نمونے پیش کئے ہیں جو اردو ادب کا مستقل سرمایہ ہیں۔ مگر اکبر کی ظرافت نے زندگی میں ایک نئی راہ کو ہموار کر دیا۔ گرچہ وہ پرخلوص راہ تھی مگر ان کے پرخلوص عزم نے کلیہ طور پر تعمیر کر دیا۔ اس طرح غالب نے اپنی ظرافت سے زندگی کو پیار کرنا سکھایا اور اکبر نے زندگی میں برکت دینے کی کوشش کی۔

اکبر مشرقیت کے دلدادہ اور مغربیت سے بیزار تھے۔ اس وقت ماحول میں جو رسم و رواج، نئی تہذیب اور نئے نظام جڑ پکڑتے جا رہے تھے وہ سب مذہبی عقائد کے خلاف تھا اس لئے انہوں نے مغربی تعلیم اور تہذیب و تمدن کو حتی الامکان روکنے کی کوشش کیں۔ وہ مغربی تعلیم کے خلاف

(باقی ص ۹ پر)

دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعت

دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعت مغربی بنگال کی معیشت کو مستحکم بنانے میں بہت ہی اہم کردار ادا کرتی ہے اور روزگار کے امکانات کے نقطۂ نظر سے یہ صنعت صرف زراعت کے بعد دوسرے نمبر پر آتی ہے۔ اس ریاست میں دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی بہتری اور ترقی کے لئے ریاستی حکومت کے دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعت کے شعبہ کی سرگرمیوں کو تین اہم سیکٹروں کی طرف مرکوز کیا جاسکتا ہے (۱) دیہی اور چھوٹی صنعتیں (۲) ہتھ کرگھا اور (۳) ریشم سازی۔

دیہی اور چھوٹی صنعتیں:

دیہی اور چھوٹی صنعتوں کی افزائش اور فروغ کے لئے یہ شعبہ ضلع سطح ایجنسیوں یعنی ضلع صنعت مراکز کے ذریعہ فراخ دلی سے امداد فراہم کرتا ہے۔ سنہ ۱۹۷۷ء سے اضلاع میں اس شعبہ کے پروگراموں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے پنچایتی ادارے زیادہ سے زیادہ تعاون کر رہے ہیں۔ یہ شعبہ چھوٹے پیمانے کی صنعتی یونٹوں کے فروغ کے لئے بہت ساری معاون اسکیموں کو روبہ عمل لا رہا ہے۔ معاون اسکیمیں یہ ہیں: مشاورتی خدمات کے لئے امداد، کارخانہ کے حصص کے لئے کرایہ کے سلسلے میں امداد، قطعاتِ آراضی کے کرایہ کے لئے امداد، خام اشیاء کے لئے بطور چھوٹ امداد، خصوصی روزگار امداد (دی گئی سالانہ اجرت کا ۱۵ فیصد رقم، زیادہ سے زیادہ ۵۰۰۰ روپئے فی سال،

اس اجرت میں بونس، اوور ٹائم الاؤنس گریجویٹی کی اعزازی رقم شامل نہیں ہے)، فاضل امداد خصوصی طبقوں یعنی شیڈولڈ کاسٹ و شیڈولڈ ٹرائب وغیرہ کے لئے (اس اسکیم کے تحت حسب معمول امداد فراہم کی جاتی ہے، لیکن یہ فاضل امداد حسب معمول شرحوں پر مذکورہ امداد کے سوا ہوگی)۔ فاضل روزگار پروگرام کے تحت کاروباریوں کو پروجیکٹ کے کل اخراجات کی دس فیصد رقم بطور حاشیائی قرض فراہم کی جاتی ہے۔ شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے سلسلے میں یہ رقم پروجیکٹ کے کل اخراجات کی ۲۰ فیصد کردی گئی ہے۔ سنہ ۷۷-۷۶ء میں حاشیائی امداد کے طور پر ۱۸ر۵۵ لاکھ روپئے اور سنہ ۸۶-۸۵ء میں ۱۹۹٫۷۱ لاکھ روپئے دئے گئے۔ اس امداد سے مستفید ہونے والی یونٹوں کی تعداد سنہ ۷۷-۷۶ء میں ۵۵۴ تھی جو بڑھ کر سنہ ۸۶-۸۵ء میں ۵۰۷۰ ہوگئی۔ موجودہ حکومت نے چھوٹی یونٹوں کو عارضی رجسٹریشن دینے کے نظام کو رائج کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ چھوٹی یونٹیں مالیاتی اداروں اور دیگر ایجنسیوں سے خام اشیاء حاصل کرنے کے لئے بات چیت کرسکے۔

چھوٹی صنعت ترقیاتی ایجنسی:

سنہ ۱۹۸۳-۸۲ء میں چھوٹی بچت ترقیاتی ایجنسی قائم کی گئی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس ایجنسی کے ذریعہ نئے نئے کاروباریوں کو حسب ضروری خدمات اور سہولتیں فراہم کی جاتی۔ یہ ایجنسی مالیاتی اداروں، بجلی سپلائی حکام، دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعت کی نظامت اور دیگر اداروں کے نمائندوں کے تعاون کے ساتھ چھوٹی یونٹوں کے قیام اور انہیں چالو کرنے کی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ اس ایجنسی نے اپنے کاروباری ترقیاتی پروگرام کے تحت ۴۷۵۶ افراد کو کاروبار کرنے کیلئے، چمڑہ کی مصنوعات، اسٹیل کی مصنوعات، گھریلو بجلی کی مصنوعات، ادویہ سازی وغیرہ میں تربیت دی ہے۔ فروری سنہ ۱۹۸۶ء تک چھوٹے کاروبار شروع کرنے کی ۱۵۰ تجویزوں کو، جن میں سرمایہ کاری کے لئے کل ۲ر۳۵ کروڑ روپئے کی ضرورت ہوگی، مالیاتی

اس نے اپنی منظوری دے دی۔

الیکٹرونکس یونٹیں:

اس شعبہ کا الیکٹرونکس سیل نئے کاروباریوں کو تربیت اور خدمات کی سہولتیں فراہم کر رہا ہے۔ ان یونٹوں کو نئی الیکٹرونک یونٹیں قائم کرنے کے لئے تکنیکی منظوری دی جا رہی ہے۔ رجسٹرڈ الیکٹرونک یونٹوں کی تعداد ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۲۰۰ تھی جو بڑھکر ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۱۶۳۱ ہو گئی۔

جدت کاری کی اسکیم:

چھوٹے پیمانہ کی صنعتی یونٹوں کو جدید طرز پر ڈھالنے کی اسکیم کے تحت ریاستی حکومت منتخب یونٹوں کو، اپنی ٹکنالوجی میں بہتری لانے اور اسے جدید بنانے کے لئے مالیاتی اداروں سے مختلف عرصوں کیلئے لئے گئے قرض کے سود کی ادائیگی کے سلسلہ میں مالی امداد فراہم کرتی ہے، نیز حکومت مشین، مکان، کارخانہ وغیرہ کے لئے حاشیائی رقم بطور امداد فراہم کرتی ہے۔ اس پروگرام کو مقبول عام بنانے کے لئے تین چھوٹی یونٹوں، پاؤروٹی تیار کرنے والی، مٹھائیاں تیار کرنے والی اور لاکھ تیار کرنے والی یونٹوں کے سلسلے میں لوک سمینار معہ ورک شاپ کا انتظام کیا گیا۔

نو کاروباریوں کیلئے ریاستی انسٹی ٹیوٹ:

ریاستی حکومت انتظامیہ اور مناسب ٹکنالوجی کے میدانوں میں موجودہ اور نئے کاروباریوں کی تربیت کیلئے ۸۷-۱۹۸۶ء میں کاروباریوں کے سلسلہ میں تربیت کے لئے ایک ریاستی ادارہ قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔

کلکتہ ضلع صنعت مرکز:

کلکتہ ضلع کی گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے اور انہیں مالی امداد فراہم کرنے کے پیش نظر کلکتہ کے لئے ایک نیا ضلع صنعت مرکز حال ہی میں قائم کیا گیا ہے۔

مضافاتی بازار:

مضافاتی بازار کے فروغ کے لئے ۸۶-۱۹۸۵ء میں راجہ گرام (جلپائی گوڑی)، نیا گرام (مدنا پور)، علم بازار (بیربھوم) اور چوک اسلام پور میں مضافاتی دیہی اور چھوٹی صنعتوں کی مصنوعات کی فروخت کے لئے، فروخت گھر یعنی شید تعمیر کرنے کی منظوری دی گئی ہے۔

دستکاری کی مصنوعات کی فروخت:

دیہی صنعت اور دستکاری کی مصنوعات کی فروخت کیلئے ضلع صنعت کوآپریٹیو، پرائمری یونٹوں اور ضلع خدمات معہ بازار صنعتی کوآپریٹیو یونٹوں کو موثر طور پر منظم کریگا اور انہیں چھوٹی صنعت، چرمہ سازی اور دستکاری کے سیکٹروں میں ریاستی اداروں سے منسلک کر دیگا۔ مغربی بنگال دستکاری ترقیاتی کارپوریشن کے ریاست کے باہر کے علاقوں میں قائم کردہ ایمپوریا اس ریاست کی دستکاری کی مختلف مصنوعات کی فروخت میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

مغربی بنگال کی چھوٹی صنعت کارپوریشن:

اس مقصد کے پیش نظر کہ چھوٹی صنعتی یونٹوں کو لوہا اور اسپات، پرافین موم وغیرہ جیسی ضروری خام اشیاء کی سپلائی کی جائے اور ان کے لئے بڑی بڑی سہولتیں جیسی پختہ سڑک، پانی، بجلی وغیرہ فراہم کی جائے، ۱۹۶۱ء میں مغربی بنگال چھوٹی صنعت کارپوریشن قائم کیا گیا۔ اس کارپوریشن نے ابتک ۱۳۳ صنعتی شیڈ اور ۷۹۷ کاروباری اسٹالس تعمیر کئے اور چھوٹی یونٹوں کے قیام کے ۲۱۳ قطعات آراضی کو بہتر بنایا۔ دو چینی مٹی واشریز بیربھوم میں قائم کئے گئے اور ایک واشری بہت ہی جلد بانکوڑا میں قائم کیا جائے گا۔ یہ کارپوریشن لیبو سمنٹ اور ملاقی ایش اینٹ تیار کرنے کے لئے مشترکہ

سیکٹر کے یونٹوں کو [illegible] معروف عمل ہے۔

مغربی بنگال ریاستی چرم سازی صنعت ترقیاتی کارپوریشن:

اس کارپوریشن نے چرڑہ اور مدیہ میں شوروم قائم کئے ہیں۔ [illegible] میں کھیل کود کے سامان تیار کرنے کیلئے یہ کارپوریشن جوتے تیار کرنے کیلئے دو مضافاتی کارخانے قائم کرنے کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں باراسات کے علاقے میں خام اشیاء کا ایک بینک قائم کیا گیا ہے۔

مغربی بنگال دستکاری ترقیاتی کارپوریشن:

دسمبر ۱۹۸۵ء تک اس کارپوریشن نے ۱۷ دکانیں دا امپوریہ کھولیں۔ یہ کارپوریشن اس ریاست کے ۳۰۰۰ دستکار بنکروں کو [illegible] فراہم کر رہا ہے اور ان کی مصنوعات کو بلنار میں فروخت کرنے کا انتظام کر دیا ہے۔ نیز یہ کارپوریشن قالین بنکروں کی ۱۱ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی تیار کردہ مصنوعات کو بازار میں فروخت کرنے کا بھی انتظام کر رہا ہے۔ یہ کارپوریشن نوادیپ علاقہ میں پیتل اور ملوان دھات کی مصنوعات تیار کرنے والی چھوٹی یونٹوں کے لئے حسب ضروری سہولتیں فراہم کر رہا ہے۔

کھادی اور دیہی صنعت بورڈ:

یہ بورڈ پنچایتوں کے تعاون سے اضلاع میں پختہ سڑکوں کی تعمیر، بجلی اور پانی کی سپلائی کے لئے دیگر اقدامات کر رہا ہے، نیز دیہی فنکاروں کو مالیاتی اور دیگر امداد فراہم کر رہا ہے۔

ہینڈ کرگھا:

ریاستی حکومت ۷۷-۱۹۷۶ء سے ہینڈ کرگھا بنکروں کی معاشی حالت میں بہتری لانے کے لئے بہت ساری پروگراموں کو روبہ عمل لا رہی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۵ر۴۴ فیصد ہینڈ کرگھا بنکروں کو کوآپریٹیو سیکٹر میں لایا گیا جبکہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ایسے بنکروں کی تعداد صرف ۱۵ فیصد تھی۔ [illegible] سیکٹر میں کرگھوں کی تعداد ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۱۲۰۰۰ تھی جو بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۸۸۵۰۳ ہو گئی۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۲۵ لاکھ مربع میٹر کپڑے تیار کئے گئے تھے، جبکہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۲۶۰ لاکھ مربع میٹر جنتا کپڑے تیار کئے گئے۔ تانتوجا اور تانتوشری دکانوں کی تعداد ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۴۱ تھی لیکن ۸۵-۱۹۸۴ء میں ایسی دکانوں کی تعداد ۱۸۴ ہو گئی۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے آخر تک تانتوجا اور تانتوشری کو کپڑے، [illegible] اور دیگر اشیاء کی فروخت سے علی الترتیب ۲۸ کروڑ اور ۵۳ر۷ کروڑ روپئے حاصل ہوئے جبکہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ان کی کل بکری علی الترتیب ۲ر۴۱ کروڑ روپئے اور ۳۲ر۶۶ لاکھ روپئے کی تھی۔

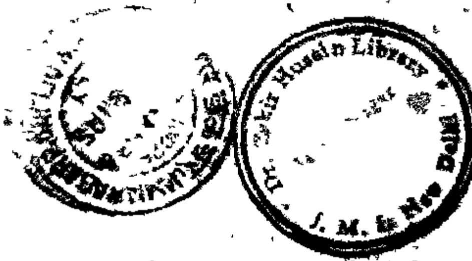
بنکروں کی فلاح و بہبود کے لئے چند اسکیموں کو، جیسے مضافات میں مکانوں کی تعمیر، کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے ممبر بنکروں کے لئے پروویڈنٹ فنڈ، کفایت شعاری فنڈ کی سہولتیں اور مستحق بنکروں کو چشمے کی سپلائی وغیرہ کو روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔

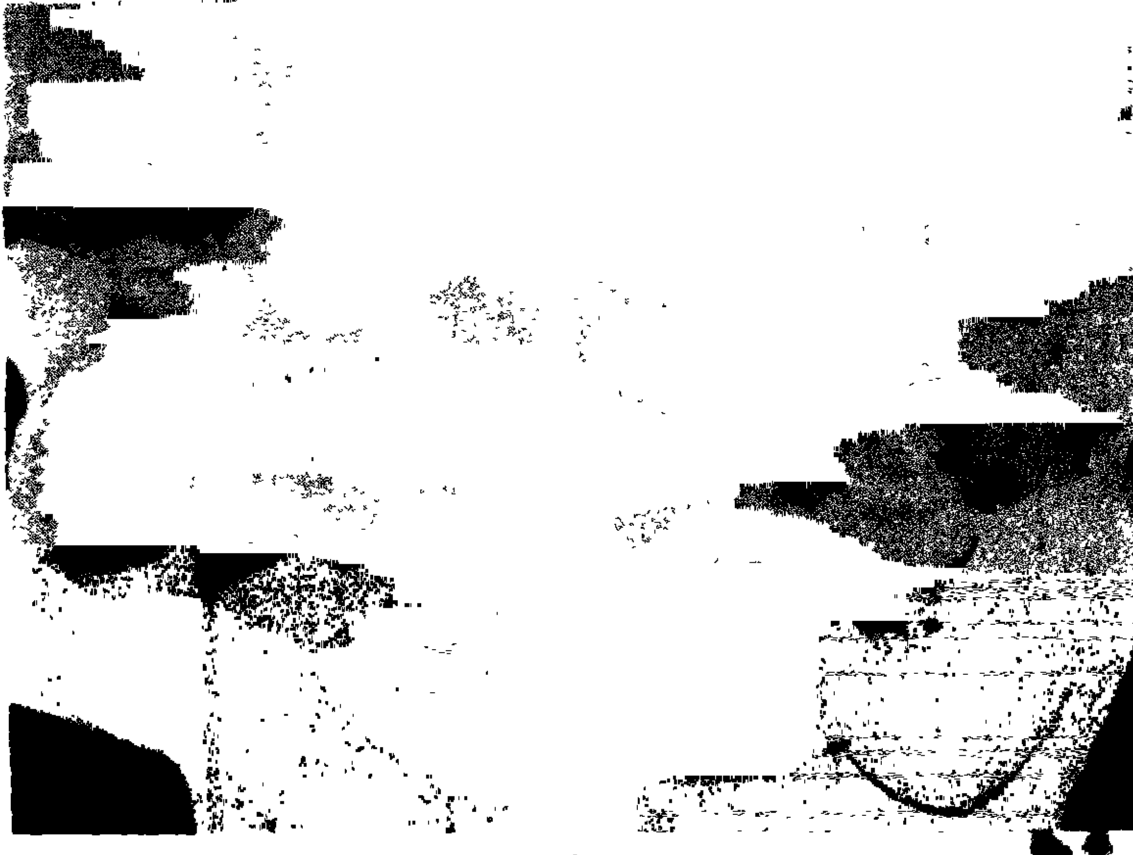
اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ سیرامپور میں مغربی بنگال کوآپریٹیو اسپننگ مل کی توسیع کے پروگراموں کو جون ۱۹۸۶ء تک پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ مدناپور میں تامرلپتا کوآپریٹیو اسپننگ مل کے لئے تعمیراتی کام اس مالی سال کے عرصے میں مکمل کر لیا جائے گا۔ بور جور، بانکورا میں کنگسابتی اسپننگ مل قائم کرنے کے کام کو جلد از جلد مکمل کرنے کے سلسلہ میں وہاں پانی کی پائپ لائن بچھانے کے لئے اس شعبہ نے ۲۷ لاکھ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ ہینڈ کرگھا سیکٹر میں ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۲۰ر۷ کروڑ میٹر کپڑے تیار کئے گئے تھے جبکہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳ر۷ کروڑ میٹر کپڑے تیار کئے گئے تھے۔ کوآپریٹیو سیکٹر میں کپڑے کی تیاری ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۶۶۲ لاکھ میٹر سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۵۲۶ لاکھ میٹر ہو گئی۔

باقی آئندہ



چارلس کوریا، چیئرمین، ٹاؤن ڈیولپمنٹ کمیشن حال ہی میں گریٹ ایسٹرن ہوٹل، کلکتہ میں صحافیوں کے ساتھ محوِ گفتگو۔
(تصویر از : اجیت داس)





وزیر اعظم شری راجیو گاندھی ۱۸ ستمبر ۱۹۸۶ء کو راج بھون کلکتہ میں مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو
اور دیگر وزراء اور حکام سے گفت و شنید کرتے ہوئے۔ (تصویر از: مدھوسدن گھوش)

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta. Associate Md. Azam
Published by the Information & Cultural Affairs Dept. of Govt. of West Bengal and Printed by G. R. T. Printers, 54/1C, Shyampukur Street, Calcutta-700 004.

مغربی بنگال

نومبر ۱۹۸۶ء



پندرہ روزہ
مغربی بنگال کلکتہ

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

شرحِ خریداری

قیمت : بارہ پیسے فی پرچہ ★ سالانہ : تین روپیے

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر،
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور، حکومت مغربی بنگال
۲۳- ار، این، مکھرجی روڈ — کلکتہ ۷۰۰۰۰۱

جلد نمبر ۳۳ ★ یکم نومبر ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۲۰



راج بھون، کلکتہ کے شمال میں مجاہدِ آزادی آنجہانی سرت بوس کے نصب کردہ مجسمہ کی نقاب کشائی کرنے کے بعد وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو تقریر کرتے ہوئے۔

منصوبہ مرتب کرنے کے سرمایہ دارانہ طریقہ کار عوام کے مسائل کو حل نہ کرسکیں گے

وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو

وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے حال ہی میں یوبا بھارتی کرانگن سالٹ لیک، کلکتہ میں منعقدہ مغربی بنگال ماتحت انجینئرنگ خدمات ایسوسی ایشن کے ساٹھ سالہ جشن کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ منصوبہ مرتب کرنے کے سرمایہ دارانہ طریقہ کار عوام کے مسائل کو حل نہ کر سکیں گے۔ وزیر اعلیٰ کی افتتاحی تقریر کا متن اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے۔

چھٹے پنج سالہ منصوبے کا عرصہ گزر چکا، لیکن وہ مقاصد جن کے لئے یہ تمام منصوبے مرتب کئے گئے تھے، اب بھی تشنۂ تکمیل رہ گئے۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ صورتحال میں بہتری ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ چیزوں کی قیمتیں مسلسل بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ لوگوں کی قوتِ خرید گرتی جا رہی ہے۔ کیا ہم اسے منصوبہ بندی کہہ سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک سرمایہ دارانہ نظام میں منصوبہ بندی کا اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ صحیح معنوں میں ہمارے جو سماجی اور اشتراکیتی تصورات ہیں، ہمارے ملک میں پنج سالہ منصوبے اس کے عین مطابق نہیں ہیں۔

ایک سرمایہ دارانہ نظام میں حکمران طبقہ "معاشی منصوبہ بندی" کا محاورہ استعمال کرتا ہے تاکہ اس محاورہ سے وابستہ تصور کا استحصال کیا جائے اور اس طرح لوگوں کو خوش فہمی میں مبتلا رکھا جائے۔ لیکن درحقیقت حکمران طبقہ اشتراکیتی طرز کی منصوبہ بندی کو پسند نہیں کرتا، اس لئے ایسے منصوبوں میں ایک بڑا خلا رہ جاتا ہے اور اس خلا کو جوں کا توں رہنے دیا جاتا ہے۔ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لائی جاتی۔ امیروں اور غریبوں کے درمیان فرق وسیع ہوتا جاتا ہے مثلاً ناخواندگی میں کسی قسم کی کمی دکھائی نہیں دیتی۔ ان تمام باتوں کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے منصوبہ بندی میں سرمایہ دارانہ طرزِ عمل کو اپنایا ہے۔ لوگوں کو اس کے خلاف اور سماج میں بنیادی تبدیلی لانے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے اور اس جدوجہد کے لئے لوگوں کا سب سے بڑا ہتھیار "تنظیم" ہے۔ تنظیم جتنی مستحکم، وسیع اور موثر ہوگی زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے دائرۂ عمل میں آتے رہیں گے۔ ان لوگوں کو، جو ابھی تک منظم نہیں ہوئے ہیں، جلد از جلد تنظیم قائم کر لینی چاہئے۔

ہمارے ملک میں منصوبہ بندی کمیشن ہے، لیکن یہ حکومت کے ایک شعبہ کی طرح کام کرتا ہے۔ نہ اس کے پاس کوئی خصوصی دستوری اختیارات ہیں اور نہ اسے منصوبہ مرتب کرنے کے لئے کوئی قابلِ ذکر آزادی حاصل ہے۔ اگر صحیح معنوں میں ایک اشتراکیتی منصوبہ مرتب کرنا ممکن ہوتا تو اس سے ہمارے ملک میں بہت سارے امکانات عیاں ہو جاتے۔ لیکن ایسا [illegible] نہیں کیا گیا۔ درحقیقت طبقہ میں بڑے سرمایہ دارانہ سماج میں ایسا ہونا ممکن بھی نہیں۔ اسی لئے اس کے خلاف تحریک کی ضرورت ہے۔ اس طرح یہاں طبقاتی جدوجہد کا جاری ہونا بھی لازمی ہے۔

چند حلقوں کی طرف سے سستے نعرے بھی لگائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند برسوں قبل "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ لگایا گیا تھا لیکن غریبی دور کرنے کے لئے حسبِ ضرورت اقدامات نہیں کئے گئے۔ اس کے نتیجہ میں غربت دور نہیں ہوئی اور ابھی تک جوں کی توں موجود ہے۔ اب ایک اور نعرہ "ہم لوگ ۲۱ ویں صدی میں داخل ہونے کو ہیں" لگایا جا رہا ہے۔ دن تو گزرتے جائیں گے، جو لوگ اس وقت زندہ رہیں گے تو وہ خود بخود ۲۱ ویں صدی میں داخل ہو جائیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس حالت میں ۲۱ ویں صدی میں قدم رکھیں گے۔ کیا اس وقت بے روزگاری کم ہو جائے گی یا بڑھ جائے گی؟ کیا چیزوں کی قیمتیں ساکت ہو جائیں گی یا مزید

[illegible] کی تعلیم میں توسیع ہوگی یا ناخواندگی کا مسئلہ [illegible]
[illegible] ان تمام باتوں کا انحصار ان پالیسیوں پر ہے، جنہیں
اب ہم روبہ عمل لا رہے ہیں۔ یہ پالیسیاں اس بات کا تعین کریں گی کہ ہم
ایک بہتر معاشی حالت میں ۲۱ ویں صدی میں داخل ہو سکتے ہیں یا نہیں
لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں اس سمت میں مرکزی حکومت کی طرف سے
سنجیدگی کے ساتھ کی گئی کوششیں نظر نہیں آتیں۔ اس سال کا غریب
دشمن مرکزی بجٹ درحقیقت مرکزی حکومت کی لاتعلقی کی نشاندہی
کرتا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ اس سال کے مرکزی
بجٹ کے خلاف سارے ہندوستان میں احتجاج ہوا ہے۔ دہلی میں بھی ہندو
ہونے، احتجاجی مارچ ہوا۔ یہ کافی اہم بات ہے۔

یہ بات تو اب بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ سستے نعروں کے
ذریعہ لوگوں کو بے وقوف بنایا نہیں جا سکتا۔ اب عوام بیدار ہو چکے
ہیں۔

ہندوستان سے ملحق ریاستوں کے اختیارات بہت ہی محدود
ہیں۔ اس لئے مغربی بنگال جیسی ایک ملحق ریاست کے لئے یہ بات ممکن نہیں
ہے کہ وہ اپنے محدود اختیارات کے ساتھ سماج میں بنیادی تبدیلی لائے۔
ایک ریاست کے ہاتھوں میں اس مقصد کے لئے اختیارات نہیں ہیں۔ اس
بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے ملازمین کے
مہنگائی بھتے میں اضافہ کر دیا گیا اور ایسا کرنا حق بجانب ہے۔ لیکن سارے
ملک میں اس [illegible] میں کافی فرق ہے۔ مرکزی حکومت کی پالیسیوں کی
وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن ریاستی حکومتوں کو ان دشواریوں
سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مرکزی حکومت کو زیادہ سے زیادہ نوٹ چھاپنے
کا اختیار حاصل ہے اور اس طرح وہ اپنے وسائل میں اضافہ کر لیتی ہے
اور ریاستوں کو نہ تو نوٹ چھاپنے کا نہ اختیار رہنے [illegible] ایسا کرنے
کا حق حاصل ہے اور نہ وہ اس سلسلہ میں [illegible] بات کر سکتی ہیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
ریاستی حکومت اپنے ملازمین کی دشواریوں اور مشکلات سے
واقف ہے۔ اس بات کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ [illegible] کے بعد [illegible] ہے

کمیٹی کی تشکیل کی جائے گی۔ ریاستی حکومت کے ملازمین کی خدمات اور
خلوص قابل ستائش ہے۔ ان لوگوں نے ۱۹۷۸ء کے سیلاب کے عرصہ
میں بہت ہی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہڑتال کرنے والے انجینیئر
بڑی بے حسی سے برتاؤ کر رہے ہیں۔ ان کی بہتری کے لئے ہم سے جو کچھ کرنا
ممکن ہو سکا ہم نے کیا۔ ہمیں اس بات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے کہ ہم
حکومت کے صرف دو یا تین شعبوں سے یا سینیئر انجینیئروں سے وابستہ
نہیں ہیں۔ ہم جب بھی کوئی فیصلہ کرتے ہیں یا ایک خاص پالیسی کو روبہ عمل
لاتے ہیں تو اس وقت ہمیں اس کی پیچیدگیوں اور دیگر شعبوں پر اس کے
اثرات کو بھی زیر غور رکھنا پڑتا ہے۔ بہرحال جہاں تک ممکن ہو سکا ہم لوگوں
نے انجینیئروں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ سب
اس نقطہ کو پیش نظر رکھیں گے اور تعاون کرنے کے لئے آگے بڑھیں گے۔

بقیہ : سیلاب ....

فنائیل — ۳۸۰ ڈرم
او۔ آر۔ ایس پیکٹ — ۹۰۰۰
آنتوں کی بیماری کی ادویہ — ۳۱ لاکھ ٹکیہ

---

۵۴ میڈیکل ٹیمیں اور بہت ساری پیرا میڈیکل ٹیمیں
سیلاب زدہ علاقوں میں کام کر رہی ہیں۔

اس نشست میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سیلاب سے متاثر علاقوں
میں کل آبادی کے زیادہ سے زیادہ ۱۰ فیصد لوگوں کے درمیان خصوصی
بے استحقاقی امداد تقسیم کی جائے۔ بے استحقاقی کی امداد کی شرح کو
فی ماہ فی کس ۸ کیلو گرام سے بڑھا کر فی ماہ فی کس ۱۲ کیلو گرام کر دیا گیا
ہے۔

اس بات کا بھی فیصلہ کیا گیا کہ متاثرہ علاقوں میں ٹیوب
ویلوں کی فوری مرمت کر کے انہیں پھر سے چلانے کے لئے عارضی عطیہ کے
طور پر [illegible] فراہم کئے جائیں۔
[illegible] سیلاب سے متاثر غریب لوگوں کو
[illegible] سیلاب
[illegible]

مغربی بنگال میں سیلاب

وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو نے حال ہی میں کلکتہ میں دیگر وزراء کے ساتھ مغربی بنگال میں سیلاب کی صورتحال کا جائزہ لیا۔

حالیہ سیلاب سے مغربی بنگال کے بہت سارے علاقے بری طرح متاثر ہوئے، جنکی تفاصیل درج ذیل ہیں:

مدناپور ضلع میں ۳۳ بلاکوں کے علاقے، ضلع ۲۴ پرگنہ جنوب میں ۲۶ بلاک، ضلع ۲۴ پرگنہ شمال میں ۲۲ بلاک، ضلع ہوڑہ میں ۱۴ بلاک، ضلع ہگلی میں ۱۸ بلاک، اور ان اضلاع کے میونسپل علاقے اور کلکتہ کارپوریشن کا پورا علاقہ۔ نیز اضلاع مرشدآباد، بیربھوم، ندیا اور مالدہ کے بھی کئی ایک علاقے سیلاب کی زد میں آگئے۔

ایک ابتدائی جائزہ کے مطابق ندیوں پر تعمیر کردہ مجموعی طور پر ۱۵۰۰ کلومیٹر لمبے بندھ میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے ہیں۔ خاص طور پر کیلی گھائی، نرساپور، پہاڑپور، بہرا، ربہاتی، رام جوک، کھیریکا، کالدل کوری، گوگلپور، سبھانگ اور کیلشوری کے علاقوں میں تعمیر بندوں کو کافی نقصان پہنچا۔ اسی طرح ضلع مدناپور میں بالی گھائی کھال اور ضلع ہگلی میں اردگل کھال کو بھی نقصان پہنچا۔ سندربن بند تو کئی ایک جگہوں میں ٹوٹ پھوٹ گئے۔

تقریباً ۲۶ر۵ لاکھ ہیکٹرس زرعی قطعات آراضی زیر آب ہوگئے۔ کھڑی فصلوں کا کتنا نقصان ہوا اس کا تخمینہ کیا جا رہا ہے۔



سیلاب زدگان

سن رسیدہ افراد کا نظامِ ہاضمہ

از: ڈاکٹر وی بالا کرشنن

شکمی آنت کے دائرہ یعنی نظامِ ہاضمہ کا ضروری فعل غذا کو منہ سے جاکر معدے میں ڈالنا، اس کا ذخیرہ کرنا، اسے ہضم کرنا، جذب کرنا اور جزوِ بدن بنانا ہے۔ جسم کے جو اعضاء یہ کام انجام دیتے ہیں۔ ان کے نام ہیں منہ، گلے کی نالی، معدہ، چھوٹی بڑی آنتیں، جگر، پتہ اور لبلبہ۔ ان میں سے ہر ایک عضو ایک مخصوص کام کرتا ہے۔

منہ خوراک کو چباتا اور نگلتا ہے۔ گلے کی نالی اسے معدے میں لے جاتی ہے جہاں اسے بلویا اور پیسا جاتا ہے۔ وہاں اس معدے میں ترشہ اور خمیری اجزاء شامل ہوتے ہیں اور وہاں سے غذا چھوٹے چھوٹے برابر حصوں میں تقسیم ہو کر ہضم ہونے اور جسم میں جذب ہونے کے لئے چھوٹی آنت میں جاتی ہے۔ تخمیر کرنے والے مادے ہاضمے کے لئے ضروری ہیں جو لبلبہ میں چھپے رہتے ہیں۔ یہ عضو انسولین اور گلوکاگون ہارمون بھی پیدا کرتا ہے جو خون میں شکر کی مقدار کی سطح کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہاضمے اور جذب ہونے کے اعمال کو ایک تیزی کی اصل رفتار سے بھی مدد ملتی ہے جسے صفرا کہتے ہیں اور جگر ہوتی صفرا کے ذریعے زہریلے اور استعمال شدہ مادے اور ادویہ کو الگ کرتا ہے۔ جذب ہو چکنے کے بعد خوراک یا غذا جگر میں جاتی ہے جسے حیاتیاتی کیمیاوی تجربہ گاہ کہا جاسکتا ہے۔ یہاں مقوی غذا کا ذخیرہ ہوتا ہے، اس کی شکل تبدیل ہوتی ہے [illegible] آمیزش ہوتی ہے اور اسے بدن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ جگر کے کئی کام ہیں جیسے کہ زہریلے مادوں کی علیحدگی، جراثیم کا خاتمہ اور ادویہ کی تحلیل وغیرہ۔ جگر جسم کے صحت مند افعال کے لئے اتنا ضروری ہے کہ قدیم زمانے کے طبیب اسے "روح کا مقام" سمجھتے تھے۔ پتہ صفرا کو جمع [illegible] سب سے چھوٹی آنت میں داخل ہوتی [illegible] غذا کے تمام ضروری [illegible] اجزاء جذب

[illegible] آنت میں داخل [illegible] کا فعل [illegible] کو الگ کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی پیچیدہ عمل کا بہت ہی سادہ الفاظ میں بیان ہے جس میں غذا کے [illegible] کو الگ الگ کرنے، [illegible] کی شکل میں آگے پیچھے کرنے، پٹھوں کی حرکت کی ہم آہنگی، حیاتیاتی کیمیاوی عمل شامل ہیں جن کو اعصابی اور افرازی اثرات سے بڑی نزاکت سے قابو میں رکھا جاتا ہے۔

عمر میں اضافہ ہاضمہ کے نظام کی یک جہتی اور کارکردگی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟ لعاب دار غدود، آنت کے لعاب، لبلبے اور جگر میں انحطاطی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ آنتوں کی تیزابیت کم ہو جاتی ہے، پٹھوں کا معیار، ان کی عضلی حرکت سست پڑ سکتی ہے اور خون کی نالیاں موٹی اور تنگ ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان تبدیلیوں سے خوراک کو ہضم کرنے اور جذب کرنے کے اعمال میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی کیوں کہ ہضم کرنے والے خمیری مادوں کی مقدار کافی ہوتی ہے اور جگر کے فعل پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا۔ مختصر یہ کہ سن رسیدہ افراد میں نظامِ ہاضمہ کی شکایات کو شاذ و نادر ہی ان اعضا کی عمر بڑھ جانے سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ موت شاید ہی کبھی ہاضمے کے اعضا کی ناکامی کے سبب ہوتی ہو جو بڑھاپے کے سبب کمزور یا بے کار ہو گئے ہوں۔

اگرچہ انفرادی امراض کی امتیازی یا الگ الگ علامتیں ہوتی ہیں لیکن ہاضمہ کے نظام کے خلل کی عام اور بکثرت پائی جانے والی علامتیں بھوک کی کمی، غذا کی لذت کا محسوس نہ کرنا، نگلنے میں تکلیف، پیٹ میں درد، پیٹ پھولنا، ڈکاریں آنا، جی متلانا، متلی ہونا، ضرورت سے زیادہ [illegible] اور آنتوں کے فعل میں تبدیلی یعنی قبض ہونا یا پیچش، ہاضمے کے نظام میں خلل کے ساتھ وزن کی کمی اور تھکاوٹ بھی ہو سکتی ہے۔ الگ الگ علامتوں کے جو اسباب ہیں ان کا اس مضمون میں ذکر نہیں کیا جا رہا ہے اگرچہ کم و بیش ہر مرض جو ایک نوجوان پر اثر کرتا ہے سن رسیدہ افراد کو بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض ایسی بیماریاں ہیں جو زیادہ تر بڑھے لوگوں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ [illegible] کے اثر کے سبب اکثر بزرگ لوگ غذا کو نگلنے میں تکلیف محسوس کرتے ہیں یا سینے میں جلن ہوتی ہے۔ عمر بڑھ جانے [illegible] کھسک جاتا ہے [illegible]

مکانات کے منہدم ہوجانے سے ۱۷ اموات ہوئیں۔ کئی ایک مکانات تو سیلاب میں بہہ گئے۔ تقریباً ۱۷ لاکھ افراد سیلاب میں گھر گئے۔ ان میں سے ۱۷۵۰۰۰ افراد کو متاثر علاقوں سے محفوظ مقامات پر لے جایا گیا اور انہیں کلکتہ اور اضلاع میں ۲۰۰۰ سے زیادہ کیمپوں میں رہائش کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔

ابتدائی رپورٹ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ۱۴۵۰۰۰ مکانات منہدم ہوچکے ہیں اور ۵۰۰۰۰ مکانات کو جزوی طور پر نقصان پہونچا ہے۔ اس بات کا خدشہ ہے کہ بارش کے ختم ہوجانے کے بعد اور بھی بہت سارے مکانات منہدم ہوجائیں گے۔

کلکتہ اور اضلاع میں سڑکوں، اسکولوں، عمارتوں اور پانی سپلائی کے نظام کو اور دیگر ڈھانچوں کو کافی نقصان پہنچا۔ نقصان کا تخمینہ لگایا جارہا ہے اور بہت ہی جلد یہ کام مکمل کرلیا جائے گا۔

اکتوبر ۸۶ء کے پہلے ہفتہ تک ریاستی حکومت نے سیلاب زدگان کی امداد کے اقدامات کے تحت تقریباً ۸ کروڑ روپئے خرچ کئے۔ امدادی اقدامات کی تفاصیل درج ذیل ہیں:

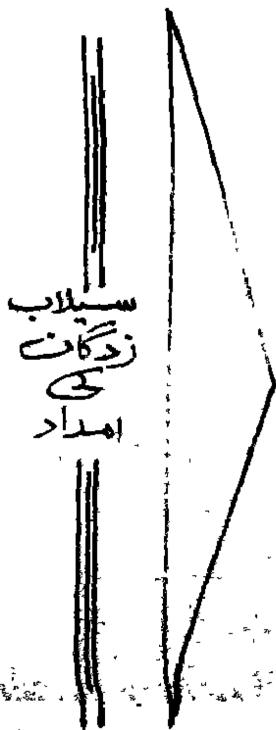
اشیاء	مقدار	قیمت (کروڑ روپے میں)
چاول	۱۹۰۰ میٹرک ٹن	۴۹٫۵۰
گیہوں	۳۷۹۰ میٹرک ٹن	۸۱٫۱۱
دودھ پاؤڈر	۴۹۹۹۵ میٹرک ٹن	۱۷٫۱۰
ترپال	۳۱۳۰۰ عدد	۳۱٫۹۵
اتفاقی مصارف	—	۷۹٫۶۰
بے استحقاقی امداد (زرِ نقد میں)		۲٫۶۰

لباس ۔ دھوتی، ساڑھی، بچوں کا لباس، لنگی۔ ۸۷۷۵۰ عدد

ادویہ

ہلازون ٹیکہ ۔ ۳۳ لاکھ

بلیچنگ پاؤڈر ۔ ۵۰۲ ڈرم، ہر ڈرم کا وزن ۵۰ کیلوگرام (باقی ص۴ پر)



معدے کا نظام ناکارہ ہوجاتا ہے یشکم کے تیزابی اجزا کا کچھ حصہ نکل کر گلے کی نالی کے نچلے حصے میں چلا جاتا ہے جس سے وہاں سوزش ہوجاتی ہے لیکن اسں مرض کو بڑھانے کے لئے پیدا ہونے والی حالت گلے کی نالی کی ایک اور خباثت سے الگ کرکے دیکھنا چاہئے ۔ اگر ہرنیہ کے سبب چھاتی کے درمیانی عقبی حصے میں درد ہوتا ہے تو اسے غلطی سے دل کا درد خیال کیا جاسکتا ہے لیکن ایک ڈاکٹر ان دونوں حالتوں میں امتیاز کرتا جاتا ہے۔ سینے کی جلن کو کھانے کی مقدار میں کمی کرکے ، چکنائی سے بھری غذاؤں سے پرہیز کرکے یا اٹھنے بیٹھنے کے ایسے طریقوں سے گریز کرکے دور کیا جا سکتا ہے جن سے پیٹ کے اندر دباؤ بڑھتا ہو ۔ اگر چارپائی کے سرہانے کی طرف کی جگہ چھ انچ اونچی کردی جائے تو اس سے آنتوں کے اترنے میں کمی کرنے میں مدد ملے گی اور لعاب کا جزر رک جائے گا ۔

پیٹ کے نچلے حصے کی آنت میں ناسور اکثر نوجوان بالغ افراد میں پائے جاتے ہیں لیکن معدے کا ناسور زیادہ تر سن رسیدہ لوگوں میں ہوتا ہے ۔ اسں ناسور کی بڑی علامت کھانا کھانے کے بعد پیٹ میں درد ہونا ہے اور کبھی کبھی قے بھی ہوجاتی ہے ۔ لیکن یہ حالت اکثر نہیں ہوتی ۔ ایسا معدے اور پیٹ کے نچلے حصے کی چھوٹی آنت کے ناسور کا علاج کرنے کیلئے موثر ادویہ مل گئی ہیں ۔ کبھی کبھی جراحی بھی کرنی پڑتی ہے ۔ اگر درد کے ساتھ ساتھ بھوک بھی تیزی سے کم ہوجائے تو ناسور کو شدید صورت اختیار کرنے سے روکنے کے لئے ڈاکٹر کی صلاح لینا بہتر ہوگا ۔ اگر ناسور کی ابتدائی مرحلے پر ہی پتہ لگ جائے تو اسے عام طور پر جراحی سے ٹھیک کیا جاسکتا ہے ۔ ناسور یا پھوڑے کے ریشوں کو دیکھنے اسں کی نوعیت معلوم کرنے اسں کے اجزا کا تجزیہ کرنے بلکہ اس کی تصویریں اتارنے کے جو جدید طریقے ایجاد ہوئے ہیں وہ بیریم ایکس رے سے پتہ لگانے کے روایتی طریقوں سے بہتر ہیں ۔ یہ سہولت بہت سے بڑے نزدیکی اسپتالوں میں موجود ہے ۔

یرقان کسی بھی عمر میں ہوسکتا ہے اور یہ عموماً جگر یا پتے کے فعل میں نقص کی علامت ہے ۔ بہتر یہی ہوگا کہ یرقان کی ہر حالت میں ڈاکٹر سے مشورہ کیا جائے اور ضروری جانچ پڑتال کرائی جائے ۔ سن رسیدہ افراد کا یرقان اگر شدید ہو تو صفراکی نالیوں میں رکاوٹ کے سبب ہوسکتا ہے جس کا علاج جراحی سے ہوسکتا ہے ۔ یرقان کی مناسب تشخیص اور علاج کے لئے ایک سائنسی نظریہ کی ضرورت ہے ۔ دراصل یرقان بجائے خود کوئی بیماری نہیں بلکہ بہت سی بیماریوں کی علامت ہے ۔

جگر کی خرابی اور بہت زیادہ سگرٹ نوشی ہمارے ملک میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اس لئے بڑھاپے میں اس مرض کا ہونا کوئی خاص بات نہیں ۔ یہ عام طور پر شراب نوشی اور متعدی امراض کے زہر سے جگر کی سوزش کے سبب ہوتا ہے ۔ دیرینہ شراب نوشی کی عادت جگر اور پتے کو نقصان پہنچاتی ہے ۔ اگرچہ صرف ۲۰ فیصد پرانے شرابیوں کو جگر کی سوزش ہوتی ہے اور جگر کا کام بند کردیتا ہے لیکن قبل از وقت یہ بتانا مشکل ہے کہ کس شخص کو یہ بیماری ہوجائے گی ۔

سن رسیدہ افراد میں خرابیوں کی آماجگاہ بڑی آنت ہو سکتی ہے ۔ بوڑھوں کو پیچش لگنے یا پیٹ میں کیڑے پیدا ہونے کے امکانات نوجوانوں سے قدرے کم ہوتے ہیں ۔ پاخانے میں تازہ خون کی موجودگی بھی بڑی آنت میں زخم کی علامت ہے جبکہ سیاہی مائل پاخانے سے ظاہر ہے کہ خون اسں سے بالائی حصوں سے آرہا ہے ۔ بڑی آنت کے آخری حصے سے خون آنے کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں جو بواسیر یا دراڑوں سے لیکر جو عام ہوتی ہیں کم عام اسباب مثلاً پیچش اور اسں سے بھی کم یعنی اندر سے کسی پھوڑے کے پھٹنے تک ہوسکتے ہیں ۔ پاخانہ کے اخراج کے بعد بڑی مقدار میں خون آنا بواسیر کی علامت ہوسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ سخت درد ہو تو ہمیں آنت کے اندر دراڑوں یا زخم کے بارے میں سوچنا ہوگا ۔ یہ دونوں امراض جراحی کے اقدامات سے درست ہوسکتے ہیں ۔ بڑی آنت کے اندر کسی پھوڑے کا بننا زیادہ تر مخرج کے خطے میں ہوتا ہے اور یہ اودے یا بڑی آنت کے فعل میں تبدیلی کے سبب ہوسکتا ہے یا مخرج سے خون بہنے کے سبب ہوسکتا ہے ۔ ان دونوں شکایتوں کے لئے فوری طبی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مخرج کی ان بیماریوں کا علاج جراحی اور انہیں وہاں سے ہٹا کر کیا جاسکتا ہے ۔ مہذب مغربی ممالک میں عمر رسیدہ لوگوں میں عام پائی جانے والی ایک بیماری ڈائیورٹیکولوسز خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں نہیں ہے کیوں کہ خیال کیا جاتا ہے کہ بڑی مقدار میں ریشے دار خوراک اس بیماری کو نہیں ہونے دیتی ۔

عمر رسیدہ لوگوں کو عام طور پر قبض کی شکایت رہتی ہے قبض کے کئی سبب ہوسکتے ہیں جیسے کہ خوراک میں ریشے دار اجزا کی کمی خوراک کی کم مقدار ، پٹھوں کی حرکت میں کمی ، بواسیر یا نالی میں مقامی خراشیں یا محض

عضلاتی وجوہات۔ اس شکایت کو دور کرنے کا مناسب طریقہ بڑی مقدار میں ریشے دار یا مرغن خوراک، مائع اشیاء کا بکثرت استعمال، ورزش، عادات میں باقاعدگی اور اعضاء کے عمل کو درست کرنا ہے۔ جلاب آور اشیاء کا بے دریغ استعمال جو کبھی کبھار ناگزیر بھی ہو سکتا ہے کم کیا جانا چاہئے۔ قبض اور اسہال کی باری باری ہونا عضوی بیماری کی علامت ہو سکتا ہے اور اس کی جانچ کرانی چاہئے۔

اسہال اگر شدید صورت میں ہو تو یہ عام طور پر خوراک میں احتیاط نہ رکھنے کے سبب ہو سکتا ہے اور اسے بجائے خود محدود کیا جا سکتا ہے۔ دیرینہ پیچش عمر رسیدہ افراد کو زیادہ نہیں ہوتی اور اگر ہو تو اس کی بالتفصیل جانچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑی آنتوں کا عام فعل الگ الگ لوگوں میں اتنا مختلف ہوتا ہے کہ ایک بار پاخانہ جانے کا نظریہ عمل میں نہیں بلکہ صرف کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

پیٹ میں زیادہ مقدار میں ہوا بننے کی شکایت عمر رسیدہ لوگوں کو عام ہوتی ہے۔ چونکہ اس کے کئی اسباب ہیں اس لئے ٹھیک ٹھیک کہنا مشکل ہے کہ گیس کیوں بنتی ہے۔ مٹھائیوں، تلی ہوئی خوراک، دالوں کی ضرورت سے زیادہ استعمال، بدہضمی، انتڑیوں کے فعل کی سستی جو بڑھاپے میں ہو جاتی ہے، ذیابیطیس، بیٹھے رہنے کی عادت یا محض ہوا خوری کا اس کے کچھ اسباب ہو سکتے ہیں۔ گیس کو روکنے کا کوئی تیر بہدف علاج نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایک مربوط نظریہ اپنانے کی ضرورت ہے جس میں عادات کی باقاعدگی، خوراک میں امتیاز اور اعتدال اور ورزش شامل ہیں۔ گیس کی گڑبڑ سے نجات پانے کے طلسماتی علاج کی اشتہار بازی سے گمراہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

بازار میں گیس کے علاج کے لئے بے شمار ادویہ ملتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی بے ضرر نہیں ہے۔ اس لئے ان ادویہ کے بلا امتیاز استعمال کی بلا لحاظ عمر حوصلہ شکنی کی جانی چاہئے۔ عمر رسیدہ لوگوں کے لئے تو ایسا کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ ان کے جگر اور گردوں میں ادویہ کو استعمال کرنے کی صلاحیت کمزور ہو جاتی ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں کے جلاب آور، سکون بخش، اعصابی کشیدگی اور ذیابیطیس کو روکنے والی اور درد ختم کرنے والی ادویہ استعمال کرنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے لیکن اس قسم کی ادویہ کا استعمال اعتدال اور احتیاط سے کیا جانا چاہئے۔ ان میں سے بہت سی ادویہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور بعض تو ایک دوسرے کے مخالف ہوتی ہیں۔ اگر یہ دیکھنا کہ بنیادی طور پر ڈاکٹر کا فرض ہے لیکن مریضوں کو بھی ادویہ کے غلط استعمال سے محتاط رہنا چاہئے۔

بھوک میں کمی، وزن میں کمی، قے کرنا، پیٹ میں بار بار درد ہونا، پاخانے کی طرح سے خون آنا اور آنتوں کے فعل میں تبدیلیوں پر خاص طور پر عمر رسیدہ لوگوں کی حالت میں مناسب توجہ دی جانی چاہئے۔ اگر مناسب طور پر علاج کیا جائے تو ان علامتوں کا سبب اکثر بیماریوں کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ بڑھاپا کوئی قنوطی نظریہ اپنانے کا جواز نہیں بن سکتا۔

اب کچھ خوراک کے بارے میں۔ عمر رسیدہ لوگوں کی خوراک صحت بخش اور متوازن ہونی چاہئے۔ اس میں اتنے حرارے ہونے چاہئیں جو ان توانائی کی ضرورت پوری کر سکیں۔ لیکن ضرورت سے زیادہ حراروں کے استعمال سے موٹاپا آ سکتا ہے۔ خوراک میں کافی مقدار میں ریشے ہونے چاہئیں جن میں حیاتین کے اضافے کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے۔ ایک ایسے شخص کی جسے بواسیر ہو معدنیات جیسے کہ لوہے کی اضافی ضرورت پوری کی جانی چاہئے۔ اس کی خوراک میں کافی مقدار میں دودھ، تازہ سبز پتوں والی سبزیاں اور پھل شامل ہونے چاہئیں۔ ذیابیطیس، اعصابی کشیدگی اور گردوں کی بیماری والے افراد کی الگ الگ ضروریات کے مطابق ان کی خوراک بھی طے کی جانی چاہئے۔

اور آخر میں یہ کہ عمر رسیدہ افراد کی نفسیاتی ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بڑھاپے کے سبب کسی شخص کی عزت نفس کیوں نہ ہو اور اسے جذباتی محرومی کا احساس کیوں ہو؟ ایک بھرپور اور شاندار دن بسر کرنے کے بعد ان کی زندگی میں سہ شام کی پرتپاک چمک نکلنی چاہئے۔ ہم ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں بزرگوں کو سماج کا بے کار دُم چھلّا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ دانشمندی کا خزانہ ہیں، ماضی اور مستقبل میں رابطہ ہیں اور ہم انہیں صرف اپنا نقصان کرنے کے اندیشے کے ساتھ نظر انداز کر سکتے ہیں۔

شیڈولڈ کاسٹ طلباء کے لئے ہاسٹل

حکومت مغربی بنگال نے جلپائی گوڑی میں پانچ کول گوڑی پرومید بنی ہائی اسکول سے ملحق ہاسٹل کی عمارت کی تعمیر کے لئے ۵۰۰۰۰ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔ شیڈولڈ کاسٹ طلباء اس ہاسٹل سے مستفید ہوں گے۔

بائیں محاذ حکومت کے نو سال

دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعت

(دوسری اور آخری قسط)

کام کرنے کے سرمایہ کے مسائل

کرگھے بنکروں کو کام کرنے کے سرمایہ بطور قرض دینے کی منظوری دی جا رہی ہے۔ نیز زراعت اور مضافاتی ترقی کے لئے قومی بنک کی اسکیم کی تحت ابتدائی بنکر امداد باہمی سوسائیٹوں اور مرکزی امداد باہمی سوسائٹیوں کو ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۲۵ کروڑ روپئے بطور زرنقد قرض فراہم کئے گئے۔ جبکہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں انہیں ۱۰ر۲۹ لاکھ روپئے بطور زرنقد قرض فراہم کئے گئے تھے۔

گزشتہ پانچ برسوں میں ۱۲۲۳۸ کرگھوں کو جدید طرز پر ڈھالا گیا۔ اب اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ طرح طرح کی مصنوعات تیار کی جائیں، جیسی اونی کمبل، ترکی تولیہ، پولسٹر قمیض وغیرہ، پہاڑی لوگوں کی فلاح کیلئے کلمپونگ میں اونی کمبل تیار کئے جا رہے ہیں۔

ریشم سازی:

۷۷-۱۹۷۶ء سے قبل اس ریاست میں ریشم سازی صنعت کم و بیش مرشدآباد، مالدہ اور بیربھوم تک محدود تھی۔ غیر روایتی اضلاع جیسے کوچ بہار، ندیا اور ۲۴ پرگنہ، میں ریشم سازی کی توسیع کر دی گئی ہے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء کے بعد سے اس ریاست میں ریشم سازی کی صنعت نے کافی تیزی سے ترقی کی ہے۔

۷۷-۱۹۷۶ء کے بعد سے اس پالیسی اور پروگرام کی چند خصوصیات یہ ہیں: غیر روایتی اضلاع میں اس صنعت کی توسیع، اس صنعت کی مرکوز ترقی، ٹسر اور ایری صنعت کی ترقی اور سماج کے کمزور طبقوں جیسے شیڈولڈ کاسٹ و ٹرائب کے لوگوں کے لئے خصوصی پروگرام۔

اس عرصہ میں شہتوت کے زیر کاشت علاقہ میں کافی اضافہ کیا گیا ہے اور اب ۱۸۱۵۷ ایکڑ کی جگہ ۵ر۳۱۸ ایکڑ علاقے شہتوت کے زیر کاشت ہیں۔ اس طرح اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ خام ریشم کی تیاری میں تقریباً ۱۵ر۳ لاکھ کیلوگرام کا اضافہ ہوگا۔

صنعت کی مرکوز ترقی کے کام میں بہتر کوالیٹی کے بیج، بتے اور خام ریشم کی تیاری کا کام شامل ہے۔ گزشتہ ۹ برسوں میں اضلاع بانکوڑا، پرولیا، مدناپور اور بیربھوم میں ٹسر صنعت کی ترقی کے لئے چند ٹھوس اقدامات کئے گئے۔ چونکہ خاص طور پر قبائلی اس صنعت سے وابستہ ہیں اس لئے کری تشور، مرشدآباد میں شیڈولڈ کاسٹ لوگوں کے مفاد کے لئے ایک مظاہرتی فارم اور گزول، مالدہ میں شیڈولڈ ٹرائب لوگوں کے مفاد کے لئے ایک اور مظاہرتی فارم چالو کر دیا گیا ہے اور مرشدآباد میں آخری گھاٹا شہتوت اضعاف فارم نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ درمیانی کاروباریوں کو ہٹانے کے لئے اور ریشم کے کیڑے کویا اور ریشمی دھاگے کی فروخت کیلئے مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ خام ریشم کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے پرانے چرخوں کی جگہ نئے اور بہتر چرخے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ خام ریشم کی پیداوار ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۰۵ر۴ لاکھ کیلوگرام سے بڑھکر ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۴۸ر۷ لاکھ کیلوگرام ہوگئی ٭٭٭

پوجا کی تعطیلات کی وجہ سے "مغربی بنگال" کا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کا شمارہ شائع نہیں کیا گیا۔

— مدیر

اودے گری اور کھنڈ گری کی گپھائیں

از : رام پرکاش راہی

اُڑیسہ میں اودے گری اور کھنڈ گری کی پہاڑیوں میں واقع جڑواں گپھائیں ہندوستان کے فن اور گپھاؤں کے فن تعمیر میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ چونکہ ان میں سنگتراشی کا کام بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے لہٰذا ان کی ماہیت سے ان مذہبی اور سماجی رجحانات کا پتہ چلتا ہے جن سے ان کی تشکیل ہوتی نیز ان کے معماروں کی اس دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کی بدولت اس زمانے کے سماجی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ گپھائیں اڑیسہ میں بھوبنیشور ریلوے اسٹیشن کے مغرب میں تقریباً پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہ ایک ایسی سڑک کے ذریعہ منسلک ہیں جن پر موٹریں چل سکتی ہیں اور مقامی بس نیز کسی بھی ذریعہ آمدورفت سے وہاں پہنچا جا سکتا ہے۔

یہ دو پہاڑیاں ایک وسیع بے برگ و گیاہ میدان میں اچانک ابھرتی ہیں اور ایک تنگ درّے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جُدا ہیں جس میں سے بھوبنیشور سے چنڈاکا جانے والی نئی سڑک گزرتی ہے۔

کھنڈ گری کی پہاڑیاں

سرکاری ریکارڈ میں پہاڑیوں کے اس تمام سلسلے کو کھنڈ گری کا نام دیا گیا ہے لیکن داستانی روایت کے تحت آس پاس کے رہنے والے لوگ اس سلسلے کے چار حصوں کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ شمال مشرقی ٹیلے کو اودے گری یعنی طلوع آفتاب کی پہاڑی کہا جاتا ہے۔ دوسرے کو کھنڈ گری یعنی شکستہ پہاڑی پکارتے ہیں تیسرے ٹیلے کا نام ہے "نیل گری" یعنی نیلی پہاڑی اور چوتھے ٹیلے کو دھول گری یعنی سفید پہاڑی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اودے گری اور کھنڈ گری الگ الگ پہاڑیوں کے اعتبار سے تقریباً ایک سو گز چوڑی اور تنگ سی وادی کے ذریعہ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ان چٹانوں کا مواد گوناگوں ساخت کے کھردرے ریتیلے پتھر پر مشتمل ہے جو کہ بیشتر نرم، مسام دار اور آسانی سے کھدائی کے قابل ہے لیکن وضع سنگتراشی کے لئے موافق نہیں ہے۔ پتھر چونکہ چٹخنے والا ہے لہٰذا یہ گپھائیں جو کہ پہاڑیوں کے مختلف ابھرے ہوئے مقامات پر تراشی گئی تھیں موسم کی چیرہ دستیوں کا آسانی سے شکار ہو گئیں۔

راجہ کھارویلا

ان گپھاؤں کی تعمیری کوشش کو کالنگا کے حکمراں راجہ کھارویلا سے منسوب کیا گیا ہے۔ اسے چیتیہ (چیتی) خاندان کا ایک عظیم بادشاہ گردانا گیا ہے اور اس خاندان کو شاہی نقرا و کے ایک طویل سلسلے کا فخر حاصل ہے۔ وہ مہامیگھ واہنی خاندان سے وابستہ تھا۔ اس کی مہارانی اور اس کے دو بیٹے کدیپ اور ودوکھومنیا پورکا گپھاؤں کی تکمیل میں معاون رہے جو کہ اودے گری گپھاؤں کے سلسلے میں نزیں درجہ پر ہیں۔ ماہرینِ تحقیق اس بات پر متفق ہیں کہ راجہ کھارویلا پہلی قبل از مسیح صدی میں کالنگا کے حکمراں تھے۔

دونوں پہاڑیوں کی گپھاؤں میں کھدی ہوئی تحریریں کالنگا میں جین مت کی صورت حال پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ہاتھی گپھا کی تحریر ۱۷ اشلوکوں اور شدھوں کے تیکس بندگی سے آغاز کرتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ کھارویلا جینی تھا۔ راج گدی پر بیٹھنے کے بعد اس نے جینی مت کا پیرو بن کر اسے مزید ترویج دی۔ اس کی دگ وجے (علاقائی فتوحات) نے شمال میں متھرا، مغرب میں ستروبجا اور تیرہ پوری اور جنوب میں سراون بیل گولا جیسے مانے ہوئے مقدس مقام کا احاطہ کر لیا تھا۔ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ جینیوں کے عظیم معبود "کالنگا جینا" کو کھارویلا نے مگدھ سے واپس بلا لیا تھا۔ ہاتھی گپھا کی تحریر "نمو ارہنتانم، نمو سدھانم" کے الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور جینیوں کے روایتی پانچ کلمات

کے مطابق ہے جنہیں جینی دستور کے اعزاز میں کھاریویلا نے اپنایا تھا۔

گپھائیں

اودے گری پہاڑی میں اٹھارہ گپھائیں ہیں جن کے نام رانی گپھا، ہاتھی گپھا وغیرہ ہیں۔ اسی طرح کھنڈ گری پہاڑی میں چودہ گپھائیں ہیں جن کے نام تلتوا گپھا، مہاویر گپھا، ایکادسی گپھا وغیرہ ہیں۔

اودے گری پہاڑی میں پہلی گپھا رانی گپھا اپنی بہت ہی خوبی سے تراشی ہوئی محرابوں، بہت سی کوٹھریوں اور سامنے کے کھلے چوکور کے اعتبار سے چٹانوں میں کھدی ہوئی عصری گپھاؤں میں اہم مقام کی حامل ہے۔ اس کی زیریں اور بالائی دو منزلیں ہیں۔ دائیں دروازے کے اوپر کی قوسی محراب یکے بعد دیگرے آم اور بلیننش کے پھلوں کے نقوش سے سجی ہوئی ہے۔ وہ بیل جن کے ساتھ یہ پھل جڑے ہوئے ہیں دو ببر شیروں کے منہ سے نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ نندی پد اس محراب کا سرتاج عنصر ہے محراب کا نچلا حصہ۔ ممتاز جانوروں کے اگلے حصوں کے ساتھ طرفین کے ستونوں میں پیش کیا گیا ہے۔

درمیانی دروازے کی محراب پتھر میں تراشے ہوئے شہد کے چھتوں اور ان کے مرکز میں مکمل طور سے کھلے ہوئے کنول کے پھولوں سے سجی ہوئی ہے۔ کنول کے یہ پھول دو لیٹے ہوئے ہاتھیوں کے منہ سے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

سری وتس کو ایک مقدس شگون کی صورت میں محرابی بندش کے اندر اندر محراب کی نوکیلی چوٹی پر منقش کیا گیا ہے جس کا تاج "نندی پد" ہے۔ ٹہنی دار کنول کی کلیاں ابھرے ہوئے نقوش کی صورت میں دکھائی گئی ہیں۔ دو سنیڈرل وہاں موجود ہیں جن میں سے ایک مکمل اور دوسرا آدھا ہے۔ انسانی شکلوں کا ایک سلسلہ تراشا گیا ہے جو کہ اظہارِ عقیدت کے مختلف عوامل میں مصروف ہیں۔ داہنا پہلو جس کا جنوب مغرب کی طرف رُخ ہے اس میں ایک بڑا اور اکیلا حجرہ ہے جس میں داخل ہونے کا مقام استون دار برآمدہ اور سامنے ایک بینچ بنا ہوا ہے۔ حجرے کی اندرونی دیواریں، آرائش سے بے نیاز ہیں اور اس کی چھت تراش کر چپٹی بنائی گئی ہے۔ داخلے کے تین دروازوں کے دائیں بائیں مربع شکل کے ستون ہیں۔ دروازوں کے راستے اوسط

سائز کے ہیں داخل ہونے کے لئے گھٹنوں کے بل چلنا پڑتا ہے۔ ستونوں کے سر پر سانڈ اور پردار ببر شیر بیٹھے ہوئے ہیں جو کہ سہارے دار پتھر کی چوکی پر ہیں۔ دروازوں کے اوپر کی محرابوں میں آرائشی نقوش کندہ ہیں جن کے نچلے حصوں کو جنگلے سے باہم جوڑا گیا ہے۔

اننت گپھا

کھنڈ گری کی گپھاؤں میں اننت گپھا چھوٹی ہوتے ہوئے بھی بہت اہم ترین گپھاؤں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ گپھا ایک تنگ اور لمبے کمرے پر مشتمل ہے جس کے چار دروازے ہیں اور سامنے کی طرف برآمدہ ہے۔ برآمدے میں تین ستون ہیں جو اپنے سروں پر لگے کھمبوں سے چار راستے بنا دیتے ہیں۔ ستون تین حصوں میں منقسم ہیں جن میں سے مرکزی حصہ آٹھ طرفہ ہے اور دوسرے دو حصے مربع ہیں۔ دروازے بڑے کمرے کی طرف لے جاتے ہیں۔ کمرے کی عقبی دیوار پر سیڑھی دار چبوترے کے اوپر ایک "نندی پد" کندہ ہے جس کے دونوں طرف سیڑھی دار چبوترے پر ایک تکونی سر والی علامت، ایک سری وتس اور ایک سواستیک کا ایک سیٹ بنا ہوا ہے۔ ایک اکیلے تیرتھنکر کی شبیہ چنور دھاریوں اور دو دیا دھاریوں سمیت ان علامتوں کے گروہ کے قریب دیکھی جا سکتی ہیں۔

اس گپھا کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو مذہبی نظریات کو ظاہر کرنے والے سنگ تراشی کے نقوش اور ان آرائشی نمونوں میں موجود ہے جو محرابوں کے اندر کندہ ہے۔

برآمدہ ایک کھلے اور کشادہ صحن سے لگتا ہوا ہے جس کا سامنے کا حصہ شاید راہبوں اور عقیدت مندوں کے آپس میں ملنے کی جگہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ گپھا کے دائیں طرف کا پیدل راستہ پہلے تو "دیو سبھا" کی طرف جاتا ہے اور بعد میں اس نئے جین مندر کی طرف جاتا ہے جسے پہاڑی کی چوٹی پر تعمیر کیا گیا ہے۔

موجودہ گپھائیں، اپنی بوسیدہ حالت میں بھی اپنے مختلف حصوں، ان کی کھدائی کی تکنیک اور ان کی اہتمامی صورت حال کے بارے میں بھی کافی تفصیلات فراہم کرتی ہیں۔ جنگلے، پہرہ داروں کی شبیہیں، محرابوں کے منقش حصے اور دروازوں کے ستون آرائشی ہوئے ہیں لیکن مفید

تعمیراتی اہمیت کے حامل ہیں۔

کھدائی کے طریقے اور ان میں سنگتراشی کے ڈیزائن بنانے کا کام انہیں نمونوں کی تقلید کرتے ہوئے کئے گئے ہیں جنہیں آج کے معمار اور فن کار اپناتے ہیں۔ پتھر اچھی قسم کا نہ ہونے کی وجہ سے کھدائی کرنے والوں کو مناسب مقامات کا پتہ لگانا پڑتا ہے اور اسی لئے بیشتر گپھائیں پہاڑیوں کے کناروں پر مختلف سمتوں اور بلندیوں پر واقع ہیں۔ ماہرین تعمیرات نے لازمی طور سے خصوصی ڈیزائن اور دیگر تفصیلات کا حامل کوئی بنیادی منصوبہ تیار کیا ہوگا۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک گپھا کا ڈیزائن ایسا بنایا گیا تھا کہ وہ ایک کاریگر یا رہائشی مکان جیسے لگے جس کا برآمدہ کھلا ہو یا ستون دار ہو۔

فن تعمیرات

کمرے اور سامنے کے برآمدے کے تمام دروازوں، راستوں، کھمبوں، ستونوں، بنچوں، طاقچوں، آرائشی بیلیوں اور منقش کھدائی کی شبیہوں سے اس شہری تعمیرات کی صورت حال کا علم ہوتا ہے جو اس علاقے میں گپھاؤں کی تشکیل سے پہلے عموماً موجود تھی۔ رہائش گاہوں کو قاعدے کے ساتھ کوٹھریوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے فرش کو مناسب سطح اور ڈھلان دی گئی ہے۔ چھتیں قوس دار یا چپٹی ہیں۔ دروازوں، کھڑکیوں، دیوازوں، برآمدوں، کھمبوں اور ستونوں کی تعداد بالکل مناسب ہے۔ لینٹل، بریکٹس، محرابیں، جنگلے، کھلی جگہیں یا صحن بالعموم جہاں ضروری تھے وہیں تعمیر کئے گئے ہیں۔ سہولیات کے لئے بارش کے پانی کے لئے نالیاں، بیٹھنے کے لئے بنچ، سامان رکھنے کے لئے طاقچے وغیرہ تراشے گئے ہیں۔

کھنڈ گری کی کچھ گپھاؤں میں عہد وسطیٰ سے متعلق جینی تیرتھنکروں اور ساشادیویوں کے بت موجود ہیں۔ مجسمے اور آرائشی فن پارے دو قسم کے موجود ہیں۔ پہلی قسم کے تحت آتے ہیں بڑے پینل جو مقبول عام داستانوں، تاریخی واقعات، مذہبی تقریبات، رقص کے مظاہرے وغیرہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے تحت آتے ہیں افرادی پیکر اور بریکٹوں کی شبیہیں، دیا بھاری ستونوں کے منقش سرے اور آرائشی ڈیزائنوں کا ایک سلسلہ ہے۔

آرائشی مجسموں کے لئے جن نباتات کو استعمال کیا گیا ہے ان میں شامل ہیں وہ درخت جو لینڈ اسکیپ پینلوں میں ہیں اور وہ بیلیں، پھل اور پھول جو دروازوں کے سروں کے اوپر محرابی بندوں کی چپٹی سطحوں پر کندہ ہیں۔

حیوانات

حیوانات کی پیشکش کے بارے میں یہ ظاہر ہے کہ قدیم زمانے کے مجسمہ ساز بہت سے قدیم اقسام کے جانوروں کی جسمانی ساخت کا علم رکھتے تھے۔ ہاتھی، سانڈ، ببر شیر، گھوڑے وغیرہ ابھری ہوئی نقاشی کے پینلوں کی صورت میں بریکٹوں پر کھردری شکل میں دکھائے گئے ہیں۔ ان میں سارس، ہنس، طوطے، فاختائیں بھی ہیں۔

راجہ کھارویلا کا دور حکومت واقعی امن و معاشی خوشحالی کا زمانہ تھا جس نے عوام کی تخلیقی ذہانت کو تحریک و ترغیب دی اور اودے گری اور کھنڈ گری میں واقع تعمیراتی آثار کی تخلیق کو ممکن کر دکھایا۔

پہلی صدی قبل مسیح کے عوام کی زندگی میں ملبوسات اور زیورات بھی اہم کردار ادا کرتے تھے۔ شاہی افراد، امراء اور عوام کے ملبوسات میں کوئی زیادہ فرق نہیں دکھائی دیتا۔ مردوں کا لباس ایک لمبی دھوتی، اوپری پوشاک، بھاری دستار، شانہ پوشی، کانوں میں بھاری کنڈل اور سر پر برج دار تاج پر مشتمل تھا۔ خواتین کا لباس ایک ایسی دھوتی پر مشتمل تھا جو کمر پر بندھی ہوئی تھی اور جسم کے نچلے حصے کو گھٹنوں تک ڈھانپ لیتی تھی۔ اوپری پوشاک دونوں شانوں سے گزر کر پیٹھ کو چلی جاتی تھی۔ عورتیں بھاری بازوبندوں، چوڑیوں، بالیوں اور بالوں کی آرائش سے لدی ہوئی ہوتی تھیں۔

جنگی ہتھیاروں میں کمان، تیر، ترکش، تلواریں، نیزے اور ڈنڈے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تفریحات

مجسمہ سازی کے کئی پینل موسیقی کی سنگت میں رقص کی ترجمانی کرتے ہیں۔ استعمال میں لائے جانے والے سازوں کے نام ہیں وینا، بانسری، ڈھول، مردنگ اور کھڑتالیں۔ رانی گپھا میں ایک

رقص پیش کرتا ہوا نقشین ماہرین کے لئے کشش کا باعث رہا ہے۔ اسے ہندوستان کی سنگتراشی میں ایک مکمل منظر رقص تصور کیا جاتا ہے جس نے کہ اس زمانے میں اسلوبی عظمت حاصل کر لی تھی۔ برآمدے کے دائیں طرف چار موسیقار موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک ساز ہے۔ دائیں طرف کے سرے پر موجود شبیہہ بانسری بجاتی ہے۔ دوسرا تاروں والا ایک رباب بجا رہا ہے اور اگلے دو افراد ڈھولچی ہیں۔ رقاصہ خود زندہ دلانہ حالت میں اپنے اکتساب فن میں پورے اعتماد کا اظہار کر رہی ہے۔ رقص، موسیقی اور جنگل کے پھولوں کی جھیل میں کھیل کود کے علاوہ پینلوں کا ایک سلسلہ کھلے میدانوں کے کھیلوں وغیرہ کی ترجمانی کرتا ہے جن میں انسان اور حیوانات دونوں حصہ لیتے ہیں۔ تیر کمان کے ساتھ ہرن کا ببر شیر کا نیزے اور ڈھال کے ساتھ اور ہاتھی کا ڈنڈوں کے ساتھ شکار کرنا اور اس کے علاوہ آدمی اور ببر شیر و سانڈ کے درمیان لڑائی کے منظر بڑے زوردار انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

روزانہ استعمال میں آنے والے گھریلو ساز و سامان میں سے بستر پوش، اسٹول، لمبے آسن، کٹورے، پلیٹ، گھڑے جیسے برتن، طشتریاں، پیٹیاں، بٹوے، پنکھے، چھاتے، ہار، بتیوں کے اسٹینڈ ان گپھاؤں میں کئی موقعوں پر پیش کئے گئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا رتبہ بلند رہا تھا۔ شاہی خواتین سر عام آتی ہیں تو اپنے خاوندوں کے ساتھ رقص دیکھنے یا مذہبی رسوم میں شامل ہونے کے لئے آتی ہیں۔ ایسے پینل موجود ہیں جو عورتوں کی ترجمانی نہ صرف بطور رقاصہ یا موسیقار کرتے ہیں بلکہ جو ہاتھی ہانک کر ببر شیروں کو مار کر اور پیڑوں پر چڑھ کر بطور افراد اپنی جسمانی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

رانی گپھا میں کھدی ہوئی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمشیر زن آدمیوں، چھاتوں، جھنڈوں اور پہریداروں پر مشتمل جھانکیوں کا اہتمام فتح کا جشن منانے کے لئے کیا جاتا تھا۔ مڈبھیڑیں، مزاحیہ مظاہرے، گانے، ناچ، راگ رنگ کے مظاہرے اور دعوتوں کا اہتمام بھی راجہ کھارویلا عوام کی تفریح کے لئے کیا کرتا تھا۔

گپھاؤں میں کندہ تحریریں بڑے فخر کے ساتھ راجہ کھارویلا کو وہ مہاراجہ یا خوشحالی کے بادشاہ کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ شاہی خزانہ سونا، چاندی، موتیوں اور قیمتی پتھروں سے بھرپور تھا جبکہ ملک خوراک کی اشیاء اور دیگر خوردنی اشیاء سے مالا مال ہو رہا تھا۔ بہت سی نقدی، خوردنی اشیاء کے وسیع ذخیروں سے بیش بہا ہیرے جواہرات، قیمتی ملبوسات، گھوڑے اور ہاتھی اور دیگر حیوانات کی شکل میں بے پناہ دولت کا ہونا اس وقت کی خوش قسمتی اور خوشحالی کی شہادت پیش کرتا ہے۔

ادے گری اور کھنڈ گری دونوں پہاڑیوں کی اہم گپھائیں اس دور میں جینی معبدوں کے طرح طرح کے بتوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ علامتوں، درختوں، تخت، سورج دیوتا اور گجا لکشمی کی پرستش کی بدولت ظاہر ہونے والے جین مت کا کافی ثبوت گپھاؤں کے مختلف پہلوؤں میں دیکھا گیا ہے۔

ادے گری اور کھنڈ گری کی گپھاؤں جیسی عظیم تعمیرات میں حکمران خاندان بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور وہ تعاون، محنت اور عقیدت کی روح جسے تمام پیشوں اور کاروبار کے لوگ بڑی مقدار میں پیش کرتے تھے، ان سب کی عکاسی کی گئی ہے تاکہ اس زمانے کی ثقافتی عمارت آئندہ کیلئے بھی ہمیشہ برقرار رہے ٭٭٭

آفات ناگہانی کے شکار لوگوں کے خاندانوں کو عطیہ

آفات ناگہانی سے مرنے والے لوگوں کے خاندانوں کو دئے جانے والے عطیہ کے سلسلے میں ریاستی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بے استحقاقی عطیہ کے طور پر دی جانے والی رقم کو فی خاندان ۲۰۰۰ روپئے سے بڑھا کر ۵۰۰۰ روپئے کر دیا جائے ٭٭

فقیرِ شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

ساحر



کھریکا اسکول اور بادشاہی گرام ، مدنا پور ، سیلاب کی زد میں

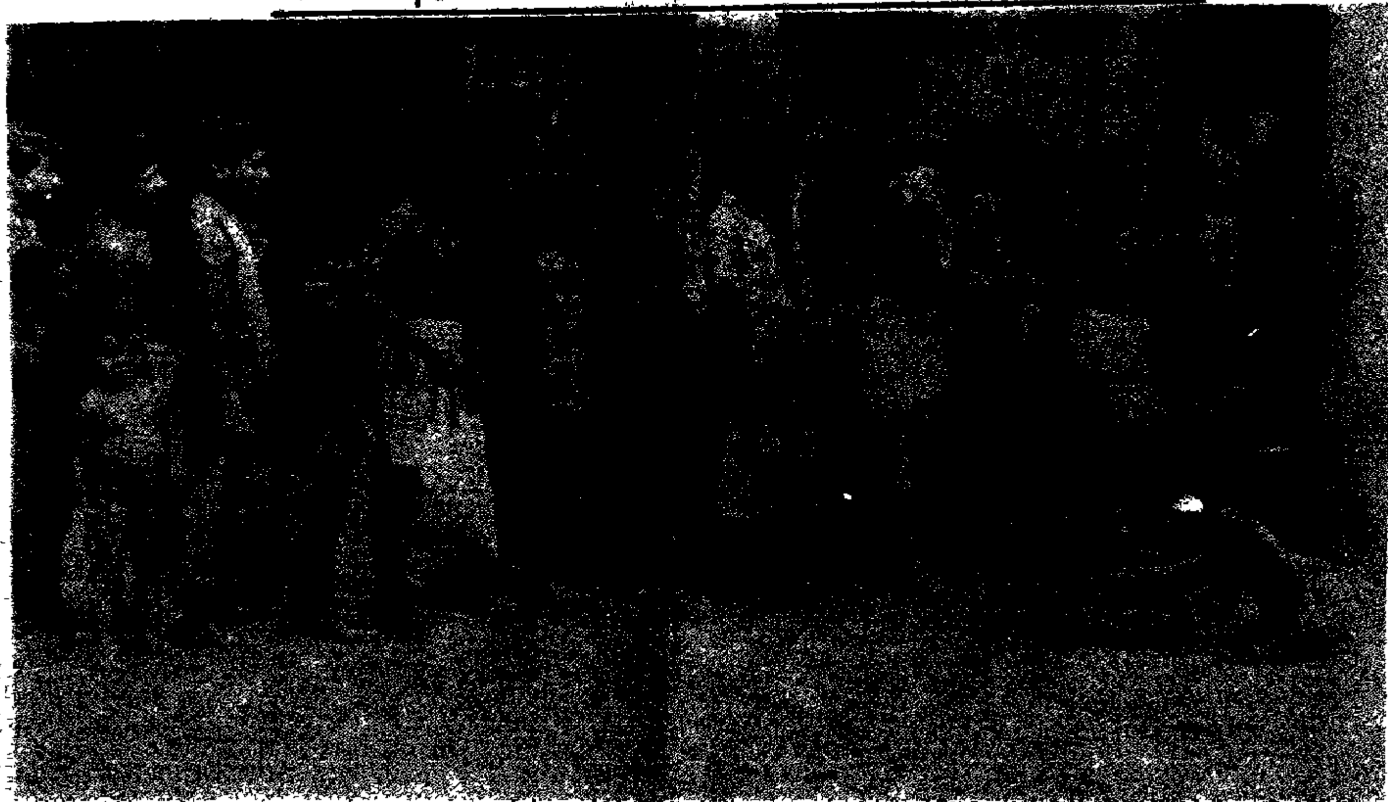


بند ٹوٹ گیا

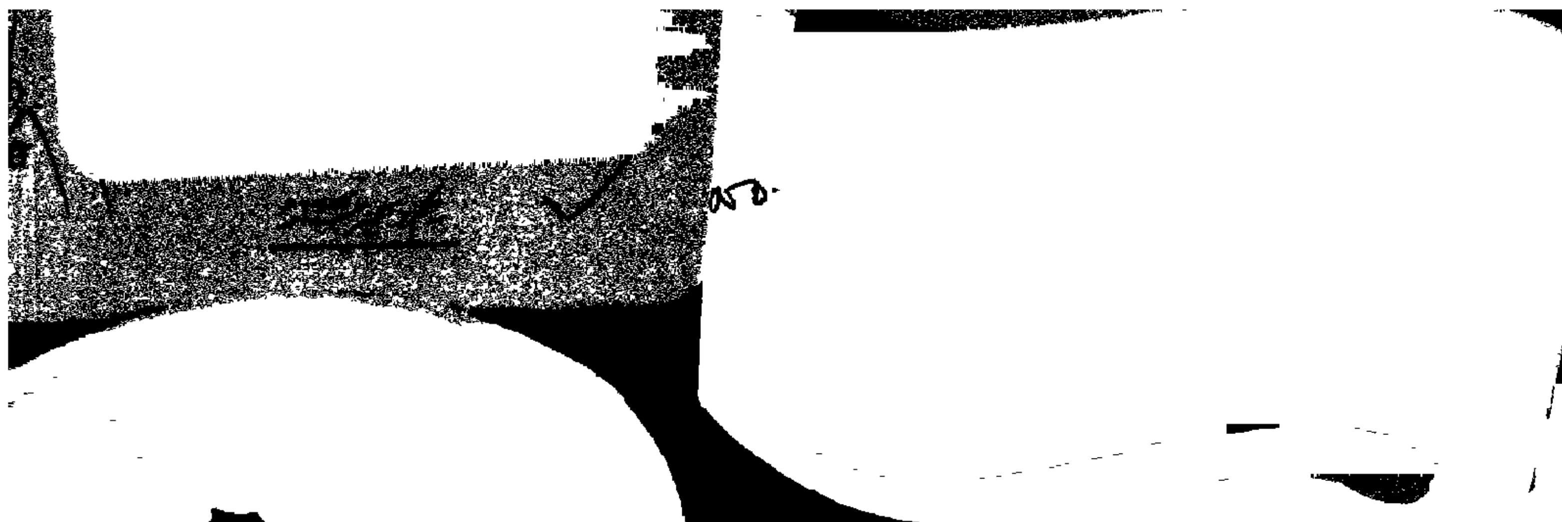
تصویریں : ٹولداس



آمتا بلاک - I ، ضلع ہوڑہ میں سیلاب زدگان کو خوراک و رسد فراہم کیا جا رہا ہے



Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta. Associate Md. Azam
Published by the Information & Cultural Affairs Dept. of Govt. of West Bengal and Printed by G. R. ...
... Shyampukur Street, Calcutta-700 004







پندرہ روزہ

مغربی بنگال کلکتہ

اکتوبر انقلاب نمبر

مدیر اعلیٰ: پرتین بھٹا چاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون: محمد اعظم

شرح خریداری

سالانہ تین روپئے ★ اس خصوصی شمارے کی قیمت ۲۵ پیسے

ترسیل زر کا پتہ:
بزنس منیجر:
شعبۂ اطلاعات و ثقافتی امور
حکومت مغربی بنگال
۲۳- آر- این- مکھرجی- روڈ- کلکتہ- ۷۰۰۰۰۱

جلد نمبر ۳۳ ★ یکم دسمبر ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۲۱ اور ۲۲



پروفیسر سید نور الحسن، گورنر مغربی بنگال، ۳۰؍ نومبر ۱۹۸۶ء کو گریٹ ایسٹرن ہوٹل، کلکتہ میں پیٹرولیم کنزرویشن ریسرچ ایسوسی ایشن کے زیر انتظام "تحفظ توانائی" پر منعقدہ سیمینار میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے۔ تصویر: مدھوسودن گھوش



عظیم اکتوبر اشتراکیتی انقلاب سنہ ۱۹۱۷ء

از: ای۔ کومارو

سنہ ۱۹۱۷ء کے عظیم اکتوبر اشتراکیتی انقلاب کو ہمارے طوفانی دور کے تاریخی واقعات کے درمیان ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ اس نے بنیادی سماجی تبدیلیوں کا، جنہوں نے ہمارے سیارہ کی شکل کو بالکل تباہ کر دیا، سنگِ بنیاد رکھا۔ تمام گزشتہ انقلابات کے برخلاف اس اشتراکیتی انقلاب نے عنانِ حکومت لوگوں۔ محنت کش طبقے اور محنت کش کسانوں کے ہاتھوں میں دے دی، انہیں نئے سیاسی اختیارات دئے اور محنت کشوں کے استحصال اور انہیں قومی اور سماجی نابرابری سے پاک اور آزادی، امن اور سماجی ترقی کے تصور کو فروغ دینے والے سماج کا سرگرم معمار بنا دیا۔

عظیم اکتوبر انقلاب اس وقت رونما ہوا جب عالمی سامراجیت کی ضدیں بام عروج پر تھیں اور جن کی وجہ سے پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں اکتوبر انقلاب کے وقت عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں روس معاشی، سماجی، سیاسی، قومی اور تصوراتی لحاظ سے سب سے زیادہ کمزور تھا۔ روس کے سماجی تضادات بڑھتے گئے۔ کسانوں نے زمین کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ مزدوروں نے اپنے معاشی حالات کو بدلنے، پیداوار کے ذرائع اور اسباب کی سرمایہ دارانہ ملکیت کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کی اور دونوں اس خونی جنگ کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ بورژوائی ۔ جاگیردارانہ حکومت ملک کے کسی بھی مسئلہ کو حل نہ کر سکی۔

ان تمام باتوں نے روس میں ایک انقلابی صورت حال پیدا کر دی جب کہ بقول کارل مارکس، عام لوگ پرانے طرز پر اپنی زندگی گزارنا نہیں چاہتے تھے [illegible] کے لوگ پرانے طرز پر اپنی زندگی گزار نہ سکے۔

اکتوبر انقلاب عام لوگوں کا انقلاب تھا کیوں کہ آبادی کے تمام محنت کش طبقے اس میں شامل تھے۔ محنت کش طبقہ اور اس کے سیاسی ہراول دستہ ۔ کمیونسٹ پارٹی نے اپنے ارد گرد روس کی تمام مظلوم قوموں کے لاکھوں لاکھ کسانوں اور سپاہیوں کو کھڑا کر دیا اور پھر اس پارٹی نے سرمایہ دارانہ نظام پر حملہ کرنے کے لئے ان کی سربراہی کی۔

جس شخص نے اکتوبر اشتراکیتی انقلاب کا منصوبہ تیار کیا اور اس کے لئے لوگوں کو ابھارا وہ تھے وی۔ آئی۔ لینن۔ لینن بہت سرگرم انقلابی، سنجیدہ سیاست داں، بہت ہی اچھے پارٹی ناظم، ایک اچھے اسکالر اور بہت ہی دانش مند مدبر بھی تھے، اور ان کی سربراہی کی وجہ سے انقلاب کامیاب ہوا۔ لینن نے اپنی زندگی انقلابی جدوجہد کے لئے وقف کر دی تھی اور ان کی جتنی بھی تحریریں ہیں وہ سب انقلاب کے موضوع سے وابستہ ہیں۔ ان کی لکھی کتابیں، پمفلٹس، مضامین، تقاریر، خطوط اور پارٹی کی اور سرکاری دستاویزات روس میں اشتراکیتی انقلاب اور نئے سماجی نظام کی تشکیل کی تاریخ سے پُر ہے۔

لینن مارکسسٹ تھے۔ ان کے اور ان کے پیروکاروں کی نظر میں مارکسزم تو ایک عقیدہ تھا اور مارکس ان لوگوں کے لئے انقلابی اقدامات کے رہبر تھے۔ اکتوبر انقلاب نے روس کی خصوصی حالات میں مارکسزم کے تخلیقی اطلاق کی مثال پیش کی۔

اکتوبر اشتراکیتی انقلاب سنہ ۱۹۱۷ء کے ۶۹ سال ہو چکے ہیں اور یہ تاریخی واقعات ماضی میں چلے گئے اور ان کے اثرات آج بھی ہم محسوس کر رہے ہیں۔ اس انقلاب نے عالمی انقلابی طریقہ کار کے لئے عوام کو بیدار کر دیا اور انہیں متحرک بنا دیا۔ اس نے سرمایہ داری سے اشتراکیت

کی طرف منتقلی اور صدیوں پرانے نوآبادیاتی نظام کے زوال کے ذریعہ ایک نئے تاریخی دور کا آغاز کیا ۔ دنیا کی صورت بدل گئی۔ ایک عالمی اشتراکی نظام رونما ہوا اور یہ نظام مستحکم ہوتا جا رہا ہے اور آج سماجی ترقی میں اس نظام کو کافی اہمیت حاصل ہو گئی ہے ۔ اب عوام کی قومی آزادی تحریک بہت ہی وسیع ہو چکی ہے ۔ نوآبادیاتی حکومتیں منہدم کر دی گئیں اور ان کے کھنڈرات پر نئی نئی ریاستیں نمودار ہو رہی ہیں ۔

عظیم اکتوبر انقلاب کے تصورات اور کامرانیوں کو ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک بھی محسوس کرنے لگے، ان ملکوں میں سامراجیت کو دور کرنے کے لئے محنت کش لوگ متحد اور منظم ہو چکے ہیں اور جمہوری اور اشتراکیتی اصلاحات کے لئے محنت کش لوگ برسرِ پیکار ہیں اور جہاں اشتراکیتی اور مزدوروں کی جماعتوں کے اثرات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ آج سامراجیت کے خلاف ساری انقلابی تحریکیں ایک دوسرے میں ضم ہو کر متحدہ محاذ پر نبرد آزما ہیں۔

اکتوبر انقلاب نے بین الاقوامی تعلقات میں بنیادی تبدیلی لائی ۔ آج دنیا کے تمام ملکوں میں لاکھوں لاکھ افراد اکتوبر انقلاب کے تصورات سے واقف ہیں اور بہت سارے ممالک شدید معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل سے دوچار ہیں ۔ ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے اکتوبر انقلاب کو ایک مشعلِ راہ بن چکا ہے ۔

اکتوبر انقلاب کے برسوں میں سرمایہ دارانہ نظام اور عالمی ترقی کی ضدوں کا مطالعہ کرتے ہوئے لینن نے بار بار انقلاب کے مسائل کی طرف توجہ دی ۔ انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ سرمایہ دارانہ ملکوں کی ناہموار معاشی اور سیاسی ترقی اشتراکیت کی ایک یا کئی ایک ملکوں میں تعمیر کی جا سکتی ہے ۔

بقول لینن اکتوبر انقلاب بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کا اثر نہ صرف عالمی انقلابی تحریکوں پر براہِ راست پڑا بلکہ بالشیوزم کے لئے یہ حکمتِ عملی کا ایک نمونہ بھی بن گیا ۔ انہوں نے اکتوبر انقلاب میں دیگر ملکوں میں مستقبل میں رونما ہونے والے انقلابات کا عکس دیکھا ۔۔

کل ملا وقت تو زلفیں تری سلجھاؤں گا
آج الجھا ہوں ذرا وقت کے سلجھانے میں

خواجہ احمد عباس

بقیہ: لینن کی تعلیمات

لینن کا اہم علمی تعلیم کمیونسٹ پارٹی کی بابت تعلیم ہے ۔ ان کی تعلیم کے مطابق یہ ایک نئی قسم کی انقلابی پرولتاری پارٹی ہے ۔ یہ ایک ایسی پارٹی ہے جو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے محنت کش لوگوں کی جدوجہد کی رہبری کر سکتی ہے ۔ تاریخ میں پہلی بار ان کی تشکیل کردہ پارٹی نے مارکسی نظریہ کو عمل سے ہمکنار کیا، روس میں اشتراکیتی انقلاب کی سربراہی کی اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ۔ اس مثال سے بے شمار ممالک میں کمیونسٹ پارٹیاں عالمِ وجود میں آئیں ۔ فی الحال ۱۰۰ ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیاں سرگرمِ عمل ہیں اور ان کے آٹھ کروڑ ممبران ہیں جو محنت کشوں کی فلاح و بہبود کے لئے جدوجہد کئے جا رہے ہیں ۔

بہت سے ملکوں کے انقلابیوں کے لئے جمہوریت اور اشتراکیت کے لئے جنگ میں پرولتاری طبقہ کے معاہدے، سماجی نجات اور قومی آزادی کے طلب، حاصل کردہ انقلابی سہولتوں کے ساتھ پُرامن طریقہ سے رہنے کے اصول کی بابت لینن کے نظریہ بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں ۔

اشتراکیت اور کمیونزم کی تشکیل کے طور و طریقے کے علم نے لینن کی علمی تخلیقی سرگرمیوں کو جلا بخشی ۔ لینن نے چھ سے زائد برسوں تک اشتراکی سماج کی تشکیل کی رہنمائی کی ۔ ان کے تصورات کو حقیقت کا جامہ پہنا کر روسی عوام نے کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں متحدہ اشتراکیتی روسی ری پبلک کی سرزمین پر ایک اعلیٰ ترین ترقی یافتہ سماج کی تشکیل کی ہے ۔ جو معاشی طور پر مستحکم ہے، جو سائنس اور ترقی کے میدان میں بلندیوں کو چھو رہا ہے ۔ جہاں حقیقی جمہوریت رواں دواں ہے اور جہاں ایک انسانی زندگی کارفرما ہے

موجودہ دنیا میں لینن کے نظریہ کا اثر بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے ۔ ایک تہائی انسان جو آج اشتراکیت کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے ۔ یورپ اور ایشیا، امریکہ اور افریقہ کے ملکوں میں اشتراکیت کی تشکیل ہو چکی ہے یا اس کی کامیاب تعمیر کے لئے سنگِ بنیاد رکھی جا رہی ہے اور جسے رفتہ رفتہ تقویت مل رہی ہے ۔ روح اور قوت جو لینن نے اپنے تصورات اور زبردست سرگرمی کے ذریعہ ترقی کے ایندھن میں ڈالا ہے وہ ضرور پھل لائے گا ۔۔۔

عظیم اکتوبر انقلاب اور ہندوستان

از: اے۔ ڈی۔ لٹمین
ڈاکٹر، فلسفہ

روس میں عظیم اکتوبر اشتراکیتی انقلاب کا بنی نوع انسان اور ان کے مستقبل پر کتنا زبردست اثر پڑا ہے، یہ بات آج کے دنوں کی گہری سماجی تبدیلیوں اور تیز تر سیاسی طریقہ کار سے عیاں ہو جاتی ہے۔ ۶۸ سال قبل روس کے کسانوں اور مزدوروں نے جو شمع روشن کی تھی اسکی لو ۱۹۱۷ء کے اہم واقعہ کے بعد سے آج بھی ساری دنیا کو کم و بیش منور کر رہی ہے۔

ایشیائی اور افریقی قوموں کی آزادی کے لئے قومی تحریکیں اور اس کے ساتھ ساتھ سامراجیت کے شرمناک نوآبادیاتی نظام کا انہدام تو عظیم اکتوبر اشتراکیتی انقلاب کے عالمی تاریخی نتائج تھے۔

اکتوبر انقلاب کے عظیم نصب العین اور مطمح نظر کا ہندوستان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ ہندوستان برٹش سامراجیت کا سب سے بڑا کالونی تھا لیکن یہاں قومی آزادی کی تحریک اور جدوجہد کافی مرکوز اور مستحکم ثابت ہوئی۔ ہندوستان کی آزادی کے مجاہدین سوویت حکومت کے فرمانوں —— امن کا فرمان، آراضیات کا فرمان، روس کی قوموں کے حقوق کا اعلانیہ —— سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو ان قانونی ایکٹس میں، جنہوں نے اکتوبر انقلاب کی کٹھالی میں جنم لیا۔ امن، آزادی، مساوات اور ترقی کی بابت لاکھوں لاکھ مظلوم محنت کش لوگوں کے صدیوں پرانے خوابوں کی تکمیل نظر آئی۔ ہندوستان اور دیگر کالونیوں کے لوگ اس واقعہ سے زبردست متاثر ہوئے کہ عالمی تاریخ میں پہلی بار کسی سوویت حکومت نے سرکاری طور پر کالونیائی نظام کی مذمت کی کہ یہ مجرمانہ اور غیر قانونی نظام ہے، قومی آزادی کی تحریکوں کی صحیح نوعیت کی شناخت کی اور روس میں رہنے والی تمام قوموں کی مکمل آزادی اور مساوات کا اعلان کیا۔ اس سے قبل زار شاہی روس کے ٹرانس کوکیشیا، مرکزی ایشیا اور شمال میں رہنے والے روسی باشندوں کو شدید کالونیائی مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔

روس کی قوموں کے حقوق کے اعلانیہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور ہندوستانی مورخ اور سفیر کے۔ ایم۔ پانیکر نے بعد میں یوں لکھا کہ "یہ اعلانیہ تو ایک دھماکہ ہے جس نے آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والی تمام ایشیائی قوموں کے دلوں میں نئی امیدیں اجاگر کر دیں۔"

یہ تو قدرتی بات ہے کہ ترقی پسند ہندوستانی سیاسی رہنماؤں، مفکروں اور ادیبوں نے اکتوبر انقلاب میں اپنی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ مشہور جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "اشتراکیتی تصورات اور روسی انقلاب کے اثرات نے ہمارے سوچ و چار کو زبردست تقویت بخشی۔" کالونیائی اور سامراجی طاقت اس بڑھتی ہوئی طاقت کو نہ روک سکی۔

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد پر اکتوبر انقلاب کا ایک نمایاں اثر یہ ہوا کہ یہاں کی سامراجیت کے خلاف جدوجہد کرنے والی جماعتوں نے اپنی انقلابی ساختوں کو مستحکم بنا لیا۔

ہندوستان کے قومی انقلابیوں نے شروع سے ہی سوویت روس کے ساتھ ہندوستانی سامراج دشمن تحریک کو ملا دینے اور روس کے لوگوں کی باہمی دوستی کے لئے پہل کی۔

اکتوبر انقلاب کے براہ راست شرکت کے تحت ہندوستان کی آبادی کی بڑی اکثریت نے قومی آزادی کی جدوجہد میں شرکت کی۔ بیشتری نافرمانی، عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریکوں نے سارے ملک کو اور برطانوی حکومت

کو ہلاکر رکھ دیا۔ لینن [illegible] عوامی تحریکوں سے اچھی طرح باخبر تھے۔ بہت ساری دستاویزوں [illegible] اس سوال پر ایم۔ این۔ رائے کے ساتھ بات چیت سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ لینن نے سامراجیت کے خلاف ہندوستان کے لوگوں کے سربراہوں کی خدمات کو سراہا۔

ہندوستان کے انقلابی اس کے متمنی تھے کہ وہ ماسکو جائیں اور اپنی آنکھوں سے وہاں اکتوبر انقلاب کی کارروائیوں کو دیکھیں۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں دہلی میں منعقدہ ایک نشست میں ہندوستان کے لوگوں کی طرف سے سوویت روس کو مبارکباد پیش کی گئی۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں چند ہندوستانیوں پر مشتمل ایک وفد ماسکو پہنچا اور اس نے وہاں آل یونین سنٹرل ایگزیکیٹو کمیٹی کے صدر جے۔ ایم۔ سویردلو کو خصوصی میمورنڈم پیش کیا۔ اس میمورنڈم میں یہ کہا گیا کہ برطانیہ کی تمام کوششوں کے باوجود قوموں کی خودمختاری کا نعرہ ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ اس وفد کے ایک ممبر پروفیسر جبار نے کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ روسی انقلاب نے ہندوستانیوں کے دلوں میں نئی امید کا دیا روشن کر دیا ہے اور جدوجہد کے ایک نئے طریقۂ کار سے انہیں روشناس کرایا ہے۔ بعد میں ۶ مئی سنہ ۱۹۱۹ء کو مشہور ہندوستانی انقلابی رہنما برکت اللہ نے ماسکو کے اخبار "ازویستیا" کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستانیوں کے لئے سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سوویت روس نے زار اور سامراجیوں کے عائد کردہ غلام بنانے والے تمام معاہدوں کو منسوخ کر دیا ہے اور قوموں کو اپنی اپنی حکومت منتخب کرنے کی کھلی آزادی دے دی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس ایکٹ نے ایشیا کے استحصال کے شکار تمام قوموں کو سوویت روس کے ارد گرد متحدہ طور پر لا کھڑا کر دیا ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے اوائل میں ہندوستان کے انقلابیوں نے ماسکو کے پاس تہنیت کا ایک پیغام بھیجا جس میں انہوں نے روس کی قوموں کے حقوق کے اعلانیہ کو کافی سراہا۔ ہندوستان کے انقلابیوں نے سوویت حکومت کے سربراہ وی۔ آئی۔ لینن کو یہ بتایا کہ انگریزوں کی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" پالیسی کے برخلاف، قومی آزادی کی جدوجہد کے دوران ملک کے تمام مذہبی و وطنی طاقتوں کو سامراجیت کے خلاف متحد کیا جا رہا ہے۔ اس خبر کے موصول ہوتے ہی لینن نے ۲۰ مئی سنہ ۱۹۲۰ء کو یوں جواب دیا۔

"یہ سن کر بڑی خوشی حاصل ہوئی کہ خود مختاری کے اصولوں اور غیر ملکی اور دیسی سرمایہ داروں کے استحصال سے، جیسا کہ مزدوروں اور کسانوں کی ری پبلک نے دعویٰ کیا ہے، مظلوم قوموں کی نجات اور آزادی پر ترقی یافتہ ہندوستانیوں نے دل و جان سے خوش آمدید کہا۔ ہندوستان کے عوام بھی آزادی کی حصولیابی بہت ہی بہادری کے ساتھ جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم اس بات کی پرخلوص امید کرتے ہیں کہ یہ اتحاد مشرق کے تمام محنت کشوں کے درمیان پھیل جائے اور مستحکم ہو جائے۔

روس میں انقلاب نے ہندوستانی محبانِ وطن پر یہ حقیقت عیاں کر دی کہ محنت کش لوگ خواہ ان کا کتنی بری طرح سے استحصال کیوں نہ کیا جائے، کمزور نہیں یا ان میں طاقت نہیں ہے یا وہ سب بےکس اور بےبس ہیں، متحدہ طور پر یہ سب آزادی لانے والی ایک زبردست فوج بن جاتے ہیں، جنہیں سامراجیت اور کالونیائی طاقتیں روک نہیں سکتیں۔ سوویت روس کے تجربات نے قومی آزادی کی تحریک کے سربراہوں کو اس بات سے مطمئن کر دیا کہ سبھوں کی سیاسی، سماجی مقاصد ایک ہیں اور مستحکم ہیں؛ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ صرف سوراج ہی کافی نہیں، بلکہ معاشی اور ثقافتی پسماندگی کو دور کرنے کے سلسلے میں غربت اور بھوک، جو نوآبادیاتی نظام سے لاکھوں لاکھ ہندوستانی محنت کشوں کو وراثت میں ملی ہیں، کو دور کرنے کے سلسلے میں سماجی۔ معاشی تبدیلی لانے کے لئے یہ پہلا قدم ہے۔

ایک عظیم انقلاب، ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کی انتہا پسندی، اس کی سماجی بنیاد کی لامثالی توسیع اور ایک آزاد سیاسی طاقت کی طرح پرولتاریت کے کئے گئے اقدامات نے مشرق میں، جہاں اکتوبر انقلاب کے اثرات کے تحت سامراج دشمن جدوجہد خاص طور پر کافی تیز ہو گئی تھی کالونیوں اور ماتحت ملکوں کے لئے صفِ اوّل کی رہنمائی کا کردار ادا کیا۔

لینن کی نظر میں ہندوستان ان عظیم ایشیائی ملکوں میں سے ایک ملک تھا جسے سامراجیت کے کالونیائی نظام کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کرنے کے لئے بہت ہی اہم کردار ادا کرنا تھا۔ قومی آزادی کے لئے ہندوستان کے عوام کی جدوجہد کی تاریخی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لینن نے اپنی عمر کے آخری دور کے ایک مضمون میں [illegible] تجزیہ میں [illegible]

لینن اور ہندوستان

از: ڈاکٹر اے۔ لتمن

اس سال سوویت روس کے عوام اور تمام ترقی پسند لوگ عظیم مفکر اور انقلابی، تمام محنت کشوں کے سربراہ اور معلم ولادیمیر لینن کی ۱۱۷ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ روس میں ۱۹۱۷ء کے عظیم اکتوبر اشتراکی انقلاب کی تاریخ ساز فتح میں لینن ازم کے جو تصورات اور مطمح نظر پوشیدہ تھے تاریخی ترقی کے ہر دور نے ان کی افادیت کی تصدیق کر دی ہے۔

لینن کی انقلابی تعلیم تو اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی صدیوں سے علم کے خزانہ سے مالا مال ہو چکے ہیں۔ وہ ہمیشہ سائنسی نقطہ نظر سے عالمی امور کا مطالعہ کیا کرتے۔ ساری دنیا میں محنت کش طبقہ کی عالمی تحریک، قومی آزادی کی جدوجہد اور سماجی، سیاسی اور فلسفیانہ تصورات کی کامرانیوں کا جائزہ لیا کرتے، ان کا تجزیہ کرتے اور اس کے بعد ہی کچھ فیصلہ کرتے۔ ایسا کرتے ہوئے لینن نے ایشیا کی بیداری کی طرف خصوصی توجہ دی۔ یہ بیداری اس وقت رونما ہو رہی تھی جب وہ باحیات تھے اور مشرقی ملکوں کی خصوصی سماجی۔ معاشی حالات، ثقافتی اور تاریخی روایات اور مطمح النظر سے یہ بیداری وابستہ تھی۔

لینن نے ہندوستان میں بہت زیادہ دلچسپی لی، کیوں کہ اس وقت یہ سب سے بڑی کالونی تھا۔ ہندوستان کو برٹش راج میں شدید استحصال اور ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا۔ ان باتوں کی روشنی میں لینن نے اپنی تھیوری مرتب کی جس میں انہوں نے سامراجی نظام کو سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے اعلیٰ دور بتایا۔ انہوں نے قومی اور نوآبادیاتی سوالات پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔

سامراجیت کی کالونیائی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے اور اس کے ظلم و ستم کی مذمت کرتے ہوئے لینن نے ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات اور ہندوستان کی ترقی پر اظہار کیا۔ ہندوستان کی قومی آزادی تحریک کا اور عوام کے خلاف حکمران انگریزوں کے ظلم و ستم کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے مضمون "عالمی سیاست میں آتش گیر مادے" میں یوں لکھا: "کچھ عرصہ میں ہندوستان میں مہذب برٹش سرمایہ داروں کے دیسی غلام اپنے آقاؤں کے لئے دردِ سر بن گئے ہیں۔ ہندوستان میں حکومت کے برٹش نظام کے نام پر کئے جانے والے لوٹ کھسوٹ اور تشدد کی کوئی انتہا نہیں ہے۔"

لینن نے ایشیا کی بیداری میں ایک اہم نوعیت کا ذکر کیا۔ اور وہ یہ کہ قومی اور سماجی آزادی کے لئے عام لوگوں کی جدوجہد میں مسلسل بڑھتی ہوئی تنظیم اور اتحاد ہے۔ پھر انہوں نے ہندوستان کو قومی تحریک آزادی کے تجربہ کے مثال کے طور پر پیش کیا۔ انہوں نے اس بات کا ذکر کیا کہ جب سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف عوام بیدار ہو جاتے ہیں اور سیاسی جدوجہد شروع کر دیتے ہیں تو نوآبادیات کے حکمران ظالم بن جاتے ہیں اور باضابطہ "چنگیز خان" کا کردار ادا کرنے لگتے ہیں۔ بی۔ جی۔ تلک کی دفاع میں کی گئی منظم مہم کی طرف لینن نے خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں تو انہوں نے یوں لکھا "ہندوستانی جمہوریت پسند تلک کو برٹش کے گیدڑوں نے سزا دینے کا اعلان کیا، اس لیے بمبئی کی سڑکوں پر مظاہرے کئے گئے اور ہڑتال بھی ہوئی۔ اس مثال کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "ہندوستان میں سڑکیں اپنے ادیبوں اور سیاسی رہنماؤں کے لئے تیار کھڑی ہیں" انہوں نے مزید لکھا کہ "پرولتاری عوامی سیاسی جدوجہد سے بیدار اور سرشار ہو چکے ہیں۔"

لینن نے ایک دور اندیش عالم نے ہندستان اور دیگر نوآبادیاتی ملکوں میں رونما ہونے والے واقعات میں نوآبادیاتی اور محکوم ملکوں میں سامراجیت کے خلاف بڑھتی ہوئی جدوجہد کے امکانات دیکھے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں اپنے ایک مضمون "کارل مارکس کی تعلیم کی تاریخی منزل" میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ دنیا کی کوئی طاقت عوام کی، جو کالونیائی تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، بہادرانہ جمہوری جدوجہد کو پرے نہیں رکھ سکتی۔

عظیم اکتوبر انقلاب کے اثر کے تحت مشرق کے محکوم ملکوں میں سامراجیوں کے خلاف بہت ہی مرکوز اور مستحکم جدوجہد لینن کی پیشن گوئی کی تصدیق کرتی ہے۔ انہوں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ پہلی سامراجی جنگ اور روس کے انقلاب نے محکوم اور غیر محکوم ملکوں میں لاکھوں لوگوں کو عالمی سیاست کا سرگرم رکن بنا دیا اور اس طرح انہوں نے سامراجیت کے نوآبادیاتی نظام کو انقلاب کے ذریعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

۱۳ر اپریل سنہ ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ، امرتسر میں ہزاروں نہتے لوگوں پر، جو وہاں ایک جلسہ کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے، انگریز کے فوجیوں اور پولس نے گولیاں چلا دیں، جن سے ہزاروں لوگ مارے گئے۔ اس سانحہ کی خبر دستاویزات سے ظاہر ہے، لینن کو "امرت بازار پتریکا" انگریزی اخبار سے ملی۔ انہوں نے فوراً جابر حاکموں کی نہتے مظاہرین پر اس ہولناک ظلم کی پرزور مذمت کی۔ انہوں نے ذاتی طور پر اور سودیت حکومت کی طرف سے ہندستان کے لوگوں کے نام ایک تعزیاتی پیغام بھیجا۔ انہوں نے اس بات کی پیشن گوئی بھی کی کہ امرتسر قتلِ عام کے بعد اب عوام کی جھنجھلاہٹ کھل کر سامنے آئے گی۔

بلاشبہ اس کے فوراً بعد سامراجیت کے خلاف عوام نے جو زبردست اقدامات کئے ان کی وجہ سے کالونیائی اور محکوم قوموں کی قومی آزادی کی تحریکوں کا ہندستان سربراہ بن گیا۔ ۵ر جولائی سنہ ۱۹۲۱ء کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کے تیسرے کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے لینن نے کہا تھا "برٹش ہندستان ان ملکوں کا سربراہ ہے۔ یہاں ایک طرف صنعتی اور ریلوے پرولتاریت کی افزائش سے اور دوسری طرف برٹش کی وحشیانہ ظلم جیسے امرتسر میں قتلِ عام وغیرہ میں اضافہ سے اسی تناسب میں انقلاب کی نشوونما ہو رہی ہے۔

لینن نے ہندستان میں سامراجیت کو نکال باہر کرنے کیلئے ہندستان کے عوام کے کئے گئے اقدامات کو کافی سراہا۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ ان تحریکوں کے پس پردہ ہندستان کی عظیم ہستیاں بھی برسرِ عمل تھیں۔

ہندستان کے لوگوں کی اپنی قومی و سماجی آزادی کے لئے منظم جدوجہد کرنے کے لئے بیداری کو خوش آمدید کہتے ہوئے لینن نے کہا تھا کہ ان کی کامیابی کا انحصار براہِ راست عوام کے اتحاد اور طاپ پر ہے۔ ایک ایسی صورت میں جہاں کالونی کے حکمران تقسیم کرو اور حکومت کرو کے اصول کے تحت خاص طور پر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اور فرقہ وارانہ فسادات کی آگ کو بھڑکا رہے ہیں اور اس طرح ہندستان کی قومی آزادی کی تحریک کو کمزور کرنے اور توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سامراجیت کے خلاف ملک کی طاقتوں کے اتحاد کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

لینن نے قومی آزادی اور سماجی نجات کے کاز میں عوام کے طبقاتی اور انقلابی شعور کو اور بھی اجاگر کرنے پر بہت زیادہ زور دیا۔ ہندستان کے محنت کش لوگوں کو بیدار کرنے میں لینن ازم کے تصورات نے بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا، کیونکہ اس وقت عظیم اکتوبر اشتراکیتی انقلاب کی فتح کے بعد ہندستان میں لینن کے تصورات عام ہو گئے تھے۔ ان تصورات نے ہندستان کے محنت کش عوام پر انقلابی پرچارِ آزادی پر گہرا اثر ڈالا۔ ان تنظیموں کے بہت سارے اہم نمائندوں نے لینن کے تصورات کو تسلیم کیا اور لینن کی بہت تعریف کی۔ ان لوگوں نے سامراجیوں کی لینن کے خلاف افترا پردازی اور جھوٹ کے پروپیگنڈے کا موثر طور پر مقابلہ کیا۔ اکتوبر انقلاب کے تین مہینے بعد یعنی ۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۱۸ء کو بمبئی کرونیکل نے ایک مضمون بعنوان "لینن — ایک انسان اور اس کی منزل" شائع کیا۔ اس مضمون میں لینن کے کاز کی کامیابی پر اعتماد کا اظہار کیا گیا۔ اسی سال کے جنوری کے آخر میں تلک کے کیساری اخبار میں روسی رہنما لینن کی بابت ایک اداریہ شائع کیا، جس میں لینن کی بابت برٹش حکام کے جھوٹے الزامات کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی گئیں۔

لینن کا نام ہندستان اور دیگر ملکوں میں بہت ہی مقبول بن چکا ہے کیونکہ یہ نام ہندستان کے تمام محنت کش لوگوں اور ترقی پذیر لوگوں کیلئے آزادی، انصاف اور ترقی کا علمبردار ہے اور لینن کی تعلیم نے تمام اقسام کی قومی اور سماجی جبر، سماجی ناانصافی اور استحصال کو دور کرنے اور ظلم اور جنگ کے ذریعہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے صحیح راستہ کی نشاندہی کی ہے۔ ٭٭٭

لینن کی تعلیمات

از: ڈائرکٹر دیمتری کا ئے ماکوو

انسان کی زندگی میں تیس سال ایک مختصر مدت نہیں ہے۔ ہمارا نصف عرصہ ہے جسے قسمت نے دی۔ آئی لینن کو ہزاروں کتابوں، مضامین، رپورتاژ اور دافعات کی تصنیف کے لیے عطا کیا تھا۔ ان کی یہ تصانیف جو آج ہم تک پہنچی ہیں ان کی اعلیٰ نظریاتی وراثت ہیں۔ ۴۰۰۰ سے زائد لینن کے مخطوطات و دستاویزات مارکسزم و لینن ازم کے ادارہ ماسکو جو سی۔ پی۔ ایس۔ یو مرکزی کمیٹی کے تحت ہے، میں محفوظ ہیں۔ ان کی چند تصانیف اور تخلیقات ۵۵ جلد پر مشتمل "لینن کی تصانیف کا مجموعہ" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تصانیف علیحدہ کتابوں اور کتابچوں کی شکل میں بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی مضامین کے ۹ مجموعے اور ان کی سوانح حیات کے واقعات کی ۱۲ جلدیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ لینن کی تصانیف لاکھوں کی تعداد میں نہ صرف روس میں بلکہ روس کے باہر بھی درجنوں ممالک سے ۱۳۴ مختلف زبانوں میں پہنچ چکی ہیں۔

لینن کے انتقال کو اکسٹھ برس گزر چکے ہیں لیکن آج بھی عالمی معاملات سے متعلق لینن کے نظریہ کے اثرات زائل نہیں ہوئے ہیں۔ دنیا کے سیاسی نقشے پر جہاں اشتراکیت کی سرحد وسیع ہوتی جا رہی ہے وہاں شہنشاہیت کا میدان تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ آج پہلے سے زیادہ لوگ وی۔ آئی۔ لینن کی ۱۱۵ ویں یوم پیدائش منا رہے ہیں۔ وہ ایک شاندار نظریاتی عالم، حکمتِ عملی کے ایک عالم، پرولتاری دنیا کے ماہر معاشیات اور سی پی ایس یو اور دنیا کے پہلی اشتراکی ریاست کے بانی تھے۔

لینن کی تعلیمات میں مقناطیسی قوت اور پرکشش موضوعات کہاں موجود ہیں؟ ایک مرتبہ ڈنمارک کے ایک مشہور مصنف مارٹن اندرسن نیکسو نے تمثیلی انداز میں اس کی تشریح کی کہ کیوں لینن انسانی دنیا وسعت پر چھا گئے ہیں۔ اس نے مزید کہا کہ "پرولتاری کی جدوجہد آزادی کو ایک نئی وسعت ملی۔ اب مزدور طبقہ کی تحریک کو دبا دینا ممکن نہیں تھا۔ لینن نے انسانی طاقتوں میں روح پھونکی جو [illegible] جدوجہد کرتی ہے۔ لینن نے اپنی ساری زندگی پرولتاریت اور مظلوم لوگوں کی سماجی نجات اور [illegible] کے سلسلے میں جدوجہد کرنے کے لیے [illegible] ہمارے [illegible] انگیز عہد کے پرجوش انقلابی واقعات کو ان کے نام اور ان کے نظریہ سے موسوم کیے جاتے ہیں۔

لینن گزشتہ صدی کے اواخر میں سیاسی سطح پر سائنسی کمیونزم کے بانی کارل مارکس اور فریڈرک اینجلس کے ایک وفادار شاگرد کی حیثیت سے ابھرے۔ انہوں نے ان تمام باتوں کا مطالعہ کیا جو عالمی انقلابی تصور کی تخلیقات تھیں۔ انہوں نے مارکسی تصور کے تمام اجزاء کو — فلسفہ، سیاسی معیشت اور سائنسی کمیونزم کو یکجا کیا، انہیں فروغ دیا اور انہیں اپنے تصورات سے مالامال کیا۔ ان میں سائنسی دور اندیشی کی ایک زبردست قوت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی اصطلاحات، نظریے اور نتائج عالمی قرار کی اہمیت کے حامل ہیں۔

تصوراتی ہتھیار کو لینن نے جلا بخشی تھی اور جسے انقلابیوں کی متعدد نسلوں نے استعمال میں لایا اور جو آج بھی موضوعاتی ہے اور بہت وسیع ہے۔ شہنشاہیت، اشتراکی انقلاب اور پرولتاریوں کی سیاسی اقتدار کی حصولیابی پر لینن کی تعلیمات تمام ملکوں میں سماجی نجات اور قومی آزادی کے لیے مجاہدین کے عظیم تصوراتی اور نظریاتی ہتھیار بن چکی ہیں۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

اکتوبر ۱۹۱۷ء روسی انقلاب

از: ایم۔ اے نسیم

اکتوبر ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے رونما ہونے کے قبل تک بہت ساری سیاسی پارٹیوں کو اس بات کا یقین نہ تھا کہ یہ انقلاب رونما ہوگا۔

اس سلسلہ میں اشتراکیتی انقلابی پارٹی کے سربراہ مسٹر وی۔ زینیر بنو نے ۱۵ مارچ ۱۹۱۷ء کو ایک رسالہ "ڈیلونارودا" (لوگوں کے کاذ) کے پہلے شمارہ میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں یوں لکھا:

"یہ انقلاب بجلی کی طرح یکایک رونما ہوگیا اور اس نے نہ صرف حکومت کو بلکہ "ڈوما" (روسی پارلیمنٹ) اور بہت ساری عوامی تنظیموں کو بھی عالم غنودگی میں آگھیرا۔ ہم لوگوں کو تعجب بھی ہوا اور بڑی خوشی بھی حاصل ہوئی۔ پیٹروگراڈ میں ہڑتال کی تحریک کے دوران بہت سارے جلسے ہوئے جن میں شہر کے انقلابی تنظیموں اور شہر کے انقلاب پسند لوگوں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ یہ تو ایک حسب معمول سی بات تھی، لیکن اس وقت کسی کو یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ یہ تحریک آنے والے انقلاب کی پیش رو ہے۔"

اور واقعی لینن جو اس وقت زیورک میں جلاوطنی میں زندگی بسر کر رہے تھے، کے بہت سارے ساتھیوں کو روس میں انقلاب کے رونما ہونے کی بابت، انقلاب کی کامیابی تو دور کی بات رہی، ابھی یقین نہ تھا۔ فروری ۱۹۱۷ء کے واقعات کے رونما ہونے سے ذرا قبل ایک جرمن سوشیل جمہوریت کے سربراہ مسٹر ویکی منزبرگ نے اس مسئلہ پر لینن سے بحث و مباحثہ بھی کیا، حالانکہ لینن اس وقت بھی اپنے ساتھیوں پر یہ بات عیاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انقلاب بہت ہی نزدیک آچکا ہے۔ یہ بحث و مباحثہ زیورک کے اسٹور یہ کیفے میں ہوا تھا۔ پھر اس کے تین سال کے بعد مسٹر منزبرگ لینن سے، جو اس وقت دنیا کی پہلی کسان۔ مزدور حکومت کے سربراہ بن چکے تھے، ماسکو میں ملاقات کی، تو اس وقت [illegible] پوچھا "اچھا کیفے اسٹوریہ میں، جو بات چیت ہوئی اب بتاؤ کس کی باتیں صحیح ثابت ہوئیں؟" مسٹر منزبرگ نے اس کے جواب میں خاموشی اختیار کرلی۔

جنوری اور فروری ۱۹۱۷ء میں انقلابیوں کے درمیان آنے والے انقلاب کی بابت شک و شبہہ پھیل گیا۔ ان میں سے چند ایسے تھے جنہیں اس بات پر یقین ہی نہیں تھا کہ انقلاب کی گھڑی آپہنچی ہے۔ اس موقع پر اپنے ساتھیوں کے شک و شبہہ کو دور کرنے کے لئے لینن نے یوں لکھا:

"ہمیں یورپ کی خاموشی سے دھوکہ میں نہیں رہنا چاہیئے، یورپ میں تو انقلاب اب پھٹ پڑنے کو ہے۔ سامراجی جنگ کی ہولناک ہیبت اور مہنگی قیمتوں میں اضافہ ہونے والی دشواریوں نے لوگوں میں انقلابی جوش پیدا کر دیا اور دوسری طرف حکمران طبقے، بورژوائی اور اس کے پیروکار حکومتیں، سب کی سب ایک اندھی گلی کی طرف جا رہے ہیں، اور یہاں سے باہر نکلنا ان کے لئے ناممکن بن چکا ہے۔ روس کے لئے لینن نے اس بات پر زور دیا کہ واقعات روسی بورژوائیوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ انقلاب شروع ہو چکا ہے۔ لینن کو اس بات کا یقین کامل تھا کہ انقلاب ضرور رونما ہوگا۔ روس میں صورت حال کے مارکسی تجزیہ پر ان کا یہ اعتقاد مبنی تھا۔"

لینن نے زار شاہی اور سرمایہ داروں کے اختیارات کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے اور ایک پرولتاری حکومت قائم کرنے کے لئے اپنی پارٹی کے مطمع نظر کو علمی اور تنظیمی طور پر روبہ عمل لانا شروع کر دیا۔ سنہ ۱۹۰۵ء کے ناکام روسی انقلاب کے بعد وہ خود روس سے سوئٹزرلینڈ آ گئے تھے۔ ناکام انقلاب تو ان کے لئے آنے والے انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ لینن کو اس بات کا یقین تھا کہ زار شاہی کا زوال ناگزیر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سنہ ۱۹۱۷ء میں زار شاہی کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور اسی سال کے نومبر کے آخر میں وہاں کی بورژوائی حکومت کو وہاں کے عوام نے لینن کی سربراہی میں بالکل ختم کر دیا۔ ذیل میں عوامی انقلاب کے آخری دو دنوں کے واقعات کو اختصار کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے۔

روس میں اقتدار کے لئے مسلح جدوجہد شروع ہو چکی تھی۔ انقلاب کے لئے کارخانوں میں، فوج میں، بالٹک فلیٹ کے جہازوں میں اقدامات کئے گئے۔ پیٹروگراد میں انقلاب کی منظم تین لاکھ فوج کو اقدامات کرنے کے لئے صرف لینن کے حکم کا انتظار تھا۔ دوسری طرف عارضی بولشیوک حکومت نے ۵ نومبر (روسی تاریخ ۲۳ اکتوبر) کی شام کو اس انقلاب کو کچلنے کے لئے متعدد اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے انقلاب کے حامی اخباروں کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی اور انقلاب کے رہنماؤں مع لینن کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ حکومت نے فوجی انقلابی کمیٹی کے بہت سارے سربراہوں کو گرفتار بھی کر لیا۔ لینن روپوش ہو گئے تھے۔ وہ سردوبسکیا اسٹریٹ کے ایک گھر میں تھے۔ وہاں سے وہ اپنے ساتھی راہیا کے ساتھ بھیس بدل کر اسمولنی میں آئے تھے۔ اسمولنی لال فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہاں سے انہوں نے براہ راست فوجوں اور انقلابی اقدامات کی رہنمائی کرنا شروع کر دیا۔ ۲۴ اکتوبر (۶ نومبر) کی شام کو ایم۔ آر۔ سی کی ایک نشست ہوئی۔ نشست کے بعد ایک انقلابی سربراہ این۔ پوڈوسکی نے یوں لکھا:

"ہم لوگوں نے لینن کی ہدایات کے مطابق اپنے عملی منصوبہ کو آخری شکل دی۔ یہ ضروری تھا کہ سب سے پہلے تمام پلوں، ریلوے اسٹیشنوں، ذرائع رسل و رسائل اور بارود خانے پر، جو ابھی تک دشمنوں کے ہاتھوں میں تھا، قبضہ کر لیا جائے۔ اس سے انقلابی فوجیوں کیلئے اسلحہ جات فراہم ہوں گی اور وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو کامیابی کے ساتھ نبھا سکیں گے۔ نیز انقلابی فوج دشمن کی فوج کو الگ تھلگ رکھ سکے گی اور ونٹر پیلیس سے اس کے ناطہ کو کاٹ دیا جائے گا۔ بہتر تربیت یافتہ ریڈ گارڈس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ملٹری کیڈٹ اسکول اور دیگر ملٹری یونٹوں کی مزاحمت کا مقابلہ کرے اور انہیں دبا دے۔ ریڈ گارڈس کو یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی کہ وہ اس بات کی کوشش کرے کہ ونٹر پیلیس میں بورژوائی فوجی یونٹیں نہ جا سکیں۔

ریڈ گارڈس نے دشمنوں کے قلعہ کو مفلوج بنا دیا اور تمام ریلوے اسٹیشنوں، ٹیلی فون اکسچینج، ٹیلی گراف دفاتر، بڑی شاہراہوں اور پلوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے ونٹر پیلیس کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور یہاں رہنے والے حکومت کے بورژوائی ملازمین سے کہا کہ وہ اقتدار سے استعفیٰ دے دیں ورنہ وہ سب اس پیلیس کے اندر داخل ہو کر انہیں گرفتار کر لیں گے۔

دوسری طرف لینن بھی اس عرصہ میں بہت مصروف رہے۔ وہ اپنے کارکنوں کو ادھر ادھر بھیجا کرتے، کسی کو کہتے دیکھو ٹیلی گراف آفس پر یا ریلوے اسٹیشن پر ریڈ گارڈس کا قبضہ ہوا یا نہیں، یا فلاں سڑک پر جو سپاہی موجود ہیں وہ اپنی جگہ قائم ہیں یا نہیں۔ اس فوجی تنظیم کے ایک سرگرم کارکن نے، میکانوسکی، لینن کی بابت یوں کہا۔

کامریڈ لینن اکتوبر انقلاب کی تمام مسلح افواج کے صحیح معنوں میں کمانڈر ان چیف ہیں۔ ان کے تحت ایسے جنرل اسٹاف کام کر رہے ہیں جن کی مثال اس سے قبل کہیں نہیں ملتی۔ لینن کو ہم اپنا پہلا ریڈ مارشل کہہ سکتے ہیں:"

انقلاب کے لئے لینن کے منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا گیا۔ ۲۵ اکتوبر کی رات ناقابل فراموش رات بن گئی۔ پیٹروگراد میں رات کے وقت چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ وہاں ہر جگہ، کارخانوں میں، فوجی بیرکس میں، انقلابی بالٹک فلیٹ کے جہازوں میں سوئیس کی تائید میں نشستیں ہو رہی تھیں، قرار دادیں منظور کی جا رہی تھیں، مسلح گاڑیاں



۲۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء (مطابق ۷ نومبر) لال فوج کا ونٹر پیلیس پر حملہ

سڑکوں پر گشت لگا رہی تھیں۔ شہر کو کئی سیکٹر میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر سیکٹر کو انقلابی یونٹ اور ریڈ گارڈس کی ذمہ داری میں دے دیا گیا تھا۔ اسی روز صبح کے تین بجے تک انقلاب کی کامیابی یقینی ہو گئی۔ فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کیرنسکی کے وزراء اس وقت ونٹر پیلیس میں تھے۔

محنت کش طبقہ کے انقلاب نے بہت سارے پر خلوص اور سرگرم عمل نوجوانوں کو عملی میدان میں لایا نیز اسی انقلاب نے بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

اکتوبر انقلاب کو تاریخ میں ایک اہم مقام بھی حاصل ہے، کیوں کہ جتنے انقلابات بھی رونما ہوئے ان میں یہ واحد انقلاب تھا جس میں خون خرابہ بہت ہی کم ہوا۔ دستاویزات شاہد ہیں کہ پیٹرو گراڈ میں اس انقلاب کے دوران صرف چھ افراد مارے گئے اور طرفین کے کم و بیش ۵۰ افراد زخمی ہوئے۔

۲۵ اکتوبر (۷ نومبر) کی صبح تک یہ بات عیاں ہو گئی کہ ٹیلی فون ایکسچینج، ٹیلی گراف دفاتر، ریڈیو اسٹیشن، ریلوے اسٹیشنوں اور شہر کے اہم اہم مقامات پر انقلابی محنت کشوں اور سپاہیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ عارضی حکومت ونٹر پیلیس تک محدود ہو گئی اور یہیں اس حکومت کے تمام وزراء بھی ہیں۔ اسی دن صبح کو فوجی انقلابی کمیٹی نے روس کے باشندوں کے نام لینن کا یہ پیغام جاری کیا "عارضی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ ریاست کے اقتدار مزدوروں کے اور سپاہیوں کے نائبوں کی پیٹرو گراڈ سوویت نے سنبھال لئے ہیں۔ لوگوں نے جن باتوں کے لئے یعنی جمہوری امن کے قیام، قطعات اراضی کی ذاتی ملکیت کو ختم کرنے، پیداوار پر مزدوروں کے کنٹرول اور جمہوری اقتدار کے قیام کے لئے جدوجہد کی تھی وہ پوری ہو چکی ہیں۔"

"مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کا انقلاب، زندہ باد"

پھر اسی دن نے ونٹر پیلیس پر قبضہ کرنے کے لئے لینن کی ہدایات کے مطابق یہ منصوبہ تیار کیا گیا:

(۱) رات کے ۹ بجے ونٹر پیلیس میں بھیجا جائے اور وہاں مقیم وزراء کو آخری موقع دیا جائے۔

(۲) اگر عارضی حکومت اپنے اقتدار سے دستبردار ہونا منظور نہ کرے تو پیٹر اور پول قلعوں سے اشارہ کے طور پر گولے داغے جائیں۔

(۳) اس کے بعد ارورا جہاز سے تین ہوائی فائر کئے جائیں۔

(۴) پھر پیٹر اور پول قلعوں سے ونٹر پیلیس پر توپ داغے جائیں۔

(۵) اس اشارہ کے بعد ریڈ گارڈس، نیوی اور سپاہی اس پیلیس پر حملہ کر دیں۔

اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ ونٹر پیلیس بلا مزاحمت ہتھیار ڈال دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور عارضی حکومت نے اقتدار سے دستبردار ہونا منظور نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلابی فوجیوں نے مختصر عرصہ تک جنگ و جدال کرنے کے بعد ونٹر پیلیس پر قبضہ کر لیا اور وہاں عارضی حکومت کے ۱۳ وزراء جو موجود تھے انہیں گرفتار کر لیا۔ صرف وزیر اعظم مسٹر کیرنسکی وہاں موجود نہ تھے۔ وہ وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ اس طرح روس میں صحیح معنوں میں عوامی اشتراکی حکومت عالم وجود میں آئی ***

ترقی کیلئے امداد باہمی تحریک لازمی ہے

نرمل بوس

حال ہی میں پٹنہ میں انڈین پبلک ایڈمنسٹریشن ایسوسی ایشن کی گیارہویں کانفرنس میں "امداد باہمی کے ذریعہ ترقی" پر بحث و مباحثہ کی نشست کا افتتاح کرتے ہوئے مغربی بنگال کے شعبہ صنعت و حرفت کے وزیر شری نرمل بوس نے اپنی تقریر میں کہا کہ نہ صرف ترقی پذیر ملکوں میں بہت سارے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی امداد باہمی تحریک کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ وزیر موصوف کی افتتاحی تقریب کا متن اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے:

"میں انڈین پبلک ایڈمنسٹریشن کا مشکور ہوں کہ اس نے اس ایسوسی ایشن کی گیارہویں سالانہ کانفرنس کے موقع پر منعقدہ "امداد باہمی کے ذریعہ ترقی" پر بحث و مباحثہ کا افتتاح کرنے کا مجھے موقع دیا۔ آج اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا کہ نہ صرف ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں بلکہ اشتراکیتی ملکوں میں اور مغرب کے چند ترقی یافتہ ملکوں میں امداد باہمی تحریک ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

برطانیہ میں سنہ ۱۸۴۴ء میں روکڈیل اکیوئیبل پائونیرس کے درمیان پہلی بار امداد باہمی کی دستوری شکل پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا میں مختلف سمتوں میں امداد باہمی تحریک بڑی تیزی سے پھیلتی گئی۔

ایک امداد باہمی سوسائٹی ایک کاروباری ادارہ ہے جس سے لوگ رضاکارانہ طور پر خود کو وابستہ کر لیتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان ہونے کے ناطے مساوات کی بنیاد پر ایماندارانہ ذرائع سے بذات خود اپنے لئے معاشی مفادات کو فروغ دیا جائے۔ جن لوگوں کے پاس اتنے روپئے نہیں ہوتے کہ وہ خود ان سے کاروبار شروع کر سکیں، وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اور اپنے اپنے وسائل کو یکجا کر کے معاشی کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ رابرٹ اوین (سنہ ۱۷۷۱ء تا سنہ ۱۸۵۸ء) شاید پہلے اشتراکیتی مفکر تھے جنہوں نے نہ صرف امداد باہمی کے تصورات کی تائید کی، بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں بھی کیں۔

کارل مارکس اور فریڈرک اینجلس نے امداد باہمی پر کافی زور دیا۔ مزدوروں کی امداد باہمی میں انہیں اشتراکیت کے مستقبل کے نمونے کی جھلکیاں نظر آئیں۔ وی آئی لینن نے زار شاہی کے دور میں بھی امداد باہمی کے فروغ کے لئے کوششیں کی تھیں اور سنہ ۱۹۱۷ء میں عظیم اکتوبر انقلاب کے بعد جب تاریخ میں پہلی بار انہوں نے روس میں اشتراکیت کی بنیاد ڈال دی تو اس وقت انہوں نے زراعت کے لئے اور لوگوں کے درمیان لازمی چیزوں کی تقسیم کے لئے امداد باہمی سوسائٹیوں کا سہارا لیا۔ اجتماعی کاشت کاری اور صارفین سوسائٹیوں کو سوویت روس کی اشتراکی معیشت میں اہم مقام حاصل ہے۔ اس کے بعد سے تمام اشتراکیتی ممالک معرضین میں امداد باہمی سوسائٹی معیشت کی بنیاد بن گئی۔

ہندوستان میں رابندر ناتھ ٹیگور امداد باہمی تحریک کے سربراہوں میں سے ایک تھے۔ مہاتما گاندھی، نیتاجی سبھاش بوس، پنڈت جواہر لال نہرو سبھوں نے اس تحریک کی تائید کی۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ایک سو سے زیادہ ممالک نوآبادیاتی حکومت سے آزاد ہو گئے۔ ان ملکوں میں معاشی ترقی کے طریقہ کار کا تعین کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور اس طریقہ کار میں امداد باہمی کو اہم مقام دیا گیا ہے۔

ہندوستان میں امداد باہمی تحریک کی تاریخ سنہ ۱۹۰۴ء سے شروع ہوتی ہے، جب کو آپریٹیو کریڈٹ سوسائٹیز ایکٹ لاگو کیا گیا۔ اس وقت امداد باہمی سوسائٹیوں کو چالو کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زراعت

کے سلسلے میں کاشتکاروں کے بیچ قرض کی گنجائش رکھی جائے۔ گرچہ آج بھی مضافاتی قرض کو آپریٹیو سوسائٹیاں اہمیت رکھتی ہیں، تاہم گزشتہ ۴۲ برسوں میں امداد باہمی سوسائٹیوں کا مختلف شاخوں میں، جیسے زراعت میں نیز چند دیگر شعبوں میں جال بچھ گیا ہے۔ آج ملک میں معاشی سرگرمیوں کا شاید ہی کوئی علاقہ ہو جہاں امداد باہمی کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ دیہی قرض کے ساتھ ساتھ زراعت میں کوآپریٹیو سوسائٹیاں چھوٹی آبپاشی، آراضیات کی ترقی اور زرعی پیداوار کی بازار میں فروخت کے کام میں مصروف عمل ہیں۔ نہ صرف زراعت بلکہ مضافاتی معیشت کے دیگر شعبوں جیسے ماہی گیری، ڈیری (دودھ، مکھن)، مرغ مرغیوں کی پرورش وغیرہ میں امداد باہمی سوسائٹیاں گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ مضافاتی اور شہری دونوں علاقوں میں عوامی نظام تقسیم میں صارفین کی کوآپریٹیو سوسائٹیاں بہت ہی اہم خدمات انجام دے رہی ہیں۔ نیز مکانات کی تعمیر، صنعتوں خاص طور پر دیہی اور چھوٹی صنعتوں، مزدوروں، نقل و حمل کے لئے کوآپریٹیو سوسائٹیاں بھی اپنے اپنے میدان میں بہت ہی اہم خدمات انجام دے رہی ہیں۔

ہندستانی امداد باہمی تحریک آج ساری دنیا میں سب سے بڑی تحریک ہے۔ اس کی تین لاکھ سے زیادہ سوسائٹیاں ہیں جن کے ۱۲/۵ کروڑ ممبر ہیں۔ کوآپریٹیو کے ذریعہ سنہ ۱۹۷۰ء میں ۷۴۵ کروڑ روپئے اور سنہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۲۵۰ کروڑ روپئے بطور قرض فراہم کئے گئے۔ اسی عرصہ میں بازار کوآپریٹیو سوسائٹیوں نے سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں ۶۵۰ کروڑ روپئے اور سنہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۰۰۰ کروڑ روپئے کی زرعی پیداوار فروخت کیں۔ اسی طرح امداد باہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ فروخت کردہ کھاد ۳۱ لاکھ ٹن این۔ کے۔ پی سے ۳۶ لاکھ ٹن این۔ کے۔ پی ہوگئی۔ جتنی کھاد تقسیم کی گئی ان میں سے امداد باہمی سوسائٹیوں نے ۴۵ فیصد، نائٹروجن کھاد ۴۱ فیصد اور فاسفورک کھاد ۴۲ فیصد تقسیم کی۔ سارے ملک میں ۴۳ فیصد کپاس اور ۴۰ فیصد سے زیادہ چینی کے کاروبار کا انتظام کوآپریٹیو سوسائٹیاں کرتی ہیں۔ ہندستان میں ۷۰ فیصد دیہی اور ۸۸ فیصد شہری آبادی امداد باہمی کی خدمات سے مستفید ہو رہی ہے۔ سنہ ۵۲-۱۹۵۱ء میں پنج سالہ منصوبوں کے شروع ہونے کے بعد ہی قومی معاشی پالیسی میں امداد باہمی کو ایک اہم مقام حاصل ہوگیا۔

منصوبہ میں یہ باتیں درج ہیں کہ امداد باہمی معاشی سرگرمیوں کی خاص طور پر مضافاتی علاقوں کی بہت سی شاخوں میں اہم تنظیم ہے۔ ملک کی منصوبہ بند معاشی ترقی میں امداد باہمی کے کردار کی تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں یوں تشریح کی گئی ہے:

"اشتراکیت اور جمہوریت سے وابستہ منصوبہ بند معیشت میں تعاون اور امداد باہمی معاشی زندگی میں، خاص طور پر زراعت، چھوٹی آبپاشی، چھوٹی صنعت اور پروسیسنگ، مصنوعات کی بازار میں فروخت، تقسیم رسد، دیہی برقیانے کے کام، مکانات، تعمیرات، مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری چیزوں کی سپلائی وغیرہ۔ اہم بنیادی تنظیم ہے۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سماجی استحکام کے لئے، روزگار کے مواقع کی وسعت کے لئے اور تیز تر معاشی ترقی کے لئے، کسانوں، مزدوروں اور صارفین کی ضرورتوں کے پیش نظر امداد باہمی ایک لازمی عنصر بن چکی ہے۔

تمام پنج سالہ منصوبوں، جن میں موجودہ ساتواں پنج سالہ منصوبہ شامل ہے، ملک کی ترقی کے لئے امداد باہمی کو بہت ہی اہم مقام دیا گیا ہے۔

بہرحال یہاں اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ پہلے پنج سالہ منصوبہ کے شروع ہونے کے قبل، یہاں تک کہ ملک کی آزادی کے قبل بھی معاشی منصوبہ بندی میں امداد باہمی کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں حکومت ہندستان نے کوآپریٹیو پلاننگ کمیٹی کی تشکیل کی تھی۔ اس کے چیرمین شری آر۔ جی۔ سرایا تھے۔ کوآپریٹیو کے سلسلہ میں اس کمیٹی نے یوں اظہار خیال کیا تھا:۔ "معاشی منصوبہ بندی کو جمہوری طرز پر بڑھانے کے سلسلے میں ایک مناسب واسطہ کی طرح کوآپریٹیو (امداد باہمی) سوسائٹی کو بہت ہی اہم کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سوسائٹی دوہری ذمہ داری ادا کرتی ہے۔ ایک طرف منصوبہ سے لوگوں کو روشناس کراتی ہے اور دوسری طرف منصوبہ کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لئے ریاستی حکومت تمام طبقوں کے لوگوں کی خیرسگالی کی خواہاں ہوگی کیوں کہ عوام کے لئے اور عوام کے ذریعہ ہی منصوبہ بندی کے کام کو شروع کیا جاسکتا ہے۔"

ہندستان آج بھی ایک زرعی ملک ہے۔ اس لئے یہاں زراعت اور اس سے متعلقہ شعبوں کے لئے قرض کافی اہمیت کے حامل

ہوتے ہیں۔ یہ بات دیکھی گئی ہے کہ کئی ایک ایجنسیوں، مثلاً قومیائے گئے
بینکوں کی موجودگی کے باوجود دیہی قرض کی سپلائی کے لئے کوآپریٹو
سوسائٹیاں ہی اہم تنظیم ہیں۔ اس طرح زراعت کی ترقی کا انحصار بہت
حد تک کوآپریٹو پر ہوتا ہے۔

کوآپریٹو کو ایک ایسی سہولت فراہم ہے جو اور کسی معاشی
ادارہ کو حاصل نہیں ہے اور وہ یہ کہ تمام سطحوں پر فیصلہ سازی سے لیکر
تکمیل تک عوام کو شریک کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر زراعت کے لئے
قرض کو لیجئے۔ دیہاتوں میں سب سے نچلی سطح پر ابتدائی زرعی امداد باہمی
سوسائٹیاں ہیں۔ ایسی سوسائٹیوں کے ممبران اپنے لوگوں میں سے ہی
اپنی انتظامی کمیٹی منتخب کرتے ہیں اور یہ کمیٹیاں اپنے باتنخواہ ملازمین کے ذریعہ
اپنے ممبروں کے درمیان قرض کی رقوم تقسیم کرتی ہیں اور قرض کی واپسی
کے لئے اقدامات بھی کرتی ہیں۔ اس سے اعلیٰ سطح پر سنٹرل کوآپریٹو بنک
ہیں۔ ان کی کمیٹیاں مذکورہ کمیٹیوں کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ریاستی
سطح تنظیم پر ریاستی کوآپریٹو بنک مختصر عرصہ کے زرعی قرض فراہم کرتا
ہے اور سب سے اونچی سطح پر قومی مرکزی ادارہ یعنی ریاستی کوآپریٹو
بنکوں کا کل ہند فیڈریشن ہے۔ امداد باہمی کے دیگر سیکٹروں میں اسی طرح
کے کوآپریٹو بنک ہیں۔ ہمارے ملک میں جہاں ترقی کے لئے جمہوری طریقہ کار
پر نہ کہ مطلق العنانی پر زور دیا جاتا ہے اس لئے کوآپریٹو میں پالیسی مرتب کرنے
اور انکی تکمیل دونوں کے لئے عوام کی شرکت خاص طور پر اہم بن جاتی ہے۔

مرکزی اور ریاستی دونوں سطحوں پر کئی ایک عوامی سیکٹر
اداروں کی موجودگی کے باوجود ہندوستانی معیشت نمایاں طور پر پرائیویٹ سیکٹر
کے زیر اثر ہے اور چند اجارہ دار گھرانے ملک کی پوری معیشت پر حاوی ہیں۔
اسی طرح عوامی سیکٹر کی توسیع بہت محدود ہو گئی ہے۔ اس لئے پرائیویٹ
سیکٹر کے برخلاف عام لوگ اپنے اپنے محدود وسائل کے ساتھ صرف
امداد باہمی سیکٹر میں مختلف معاشی کاروبار کے لئے خود کو منظم کر سکتے ہیں۔
اس بات کی خوش فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ ایک سرمایہ دارانہ ڈھانچہ میں
امداد باہمی یعنی کوآپریٹو پرائیویٹ سیکٹر کا حقیقی بدل بن سکتا ہے کیونکہ
ایسا ہونا ناممکن ہے۔ کوآپریٹو صرف اشتراکی نظام میں ہی پنپ
سکتا ہے لیکن خود کو کوآپریٹو میں منظم کر کے عام لوگ چند فوائد سے مستفید
ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی موجودہ نظام میں پرائیویٹ سیکٹر کے حملوں کا کچھ
حد تک مقابلہ کر سکتے ہیں اور آج ہندوستان میں ایسا کرنا ممکن ہے۔

ساتویں پنج سالہ منصوبہ میں شعبہ امداد باہمی کے لئے اپنائی گئی حکمت عملی میں بہت
ساری اہم باتوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ "امداد باہمی کی پالیسیوں اور طریقہ کار کو اس طرح
از سر نو مرتب کیا جائے کہ ان کے ذریعہ فراہم کردہ قرض، اہم اشیاء اور خدمات سے خاص طور پر
سماج کے کمزور طبقہ کے لوگ مستفید ہوں"۔ حالیہ برسوں میں اس سلسلے میں مرکوز کوششیں کی گئی ہیں کہ
سماج کے غریب لوگوں کے لئے امداد باہمی سہولتیں اور مراعات فراہم کی جائیں اور ساتھ ہی انہیں اس
بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کوآپریٹو سوسائٹیوں، خاص طور پر زرعی کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ممبر
بن جائیں۔ غریب کسانوں کی اس سلسلہ میں مدد کرنے کے مقصد سے ابتدائی زرعی امداد باہمی سوسائٹیوں
(پی۔ اے۔ سی۔ ایس) کے ممبر بن جائیں۔ ایک عام ممبر شپ پروگرام کو روبہ عمل
لایا جا رہا ہے۔ اس پروگرام کے تحت ریاستی حکومتیں غریب کسانوں کے سلسلہ
میں ان سوسائٹیوں کے ممبر شپ کے لئے ان کے حصص کی رقوم ادا کر دیتی ہیں۔

صنعتی امداد باہمی سوسائٹیاں، خاص طور پر دیہی اور چھوٹی
صنعتوں کے شعبہ میں بے روزگار نوجوانوں، لڑکے اور لڑکیوں دونوں کو براہ راست
یا بالواسطہ اپنے روزگار کے مسئلہ کو حل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

کبھی کبھی بند اور بیمار صنعتوں کے ورکرس خود اپنی کوآپریٹو
سوسائٹی قائم کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی صنعتی یونٹوں کا اختیار لیں اور
انہیں موثر طریقہ سے چالو کر دیں۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بہت
سارے کیسوں میں ورکرس ان صنعتی یونٹوں کو پرائیویٹ سیکٹر کا
انتظامیہ سے بہتر اور موثر طریقے سے چلاتے ہیں۔

اگرچہ ہم معاشی ترقی کے لئے پروگراموں میں کوآپریٹو کے اہم
کردار اور اس کی کامیابیوں سے واقف ہیں تاہم ہم اس کے چند
مسائل کو نظر انداز نہیں کر سکتے جن سے ہمارے ملک میں آج امداد باہمی تحریک
دوچار ہے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ تمام متعلقہ افراد اس بات
کی مرکوز کوششیں کریں کہ اس تحریک میں جو خامیاں ہیں انہیں دور کیا جائے۔

غریب کاشتکاروں کو مختصر عرصہ کے لئے قرض فراہم کئے جاتے
ہیں لیکن ایسے قرضوں کی واپسی کی صورت حال کچھ بہتر نہیں ہے۔ سارے
ملک میں اب تک قرض کے تقریباً ۱۲۰۰ کروڑ روپئے واپس نہیں کئے گئے۔
چونکہ جو کسان عموماً قرض ادا نہیں کرتے، تو انہیں دوبارہ قرض نہیں دیا جاتا،
اس لئے بہت سارے کسانوں کو دوبارہ قرض فراہم نہیں کیا جا سکا۔ قرض
کی واپسی کے لئے چند کسانوں کی طرف سے مزاحمت کی گئی۔ اس سلسلہ میں

سیاسی جماعتوں میں رونما ہوتی ہیں۔ تمام سطحوں پر عوام منظم ہونا چاہئیے کہ قرض مناسب طور پر واپس کیا جائے۔ اس سے نہ صرف امداد باہمی تحریک کو تقویت پہنچے گی بلکہ اس کی وجہ سے مضافاتی قرض کا مسلسل بہاؤ قائم رہے گا اور ملک میں زرعی ترقی کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امداد باہمی تحریک عام لوگوں کے لئے ہے اور کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے انتظامیہ کی ذمہ داری بھی ان سوسائٹیوں کے ممبروں کو سونپ دی گئی ہے۔ چند جماعتیں یا جتھے مختلف علاقوں میں اس تحریک کو ایک طریقہ یا دیگر طریقوں سے کنٹرول کر رہے ہیں۔ ایسے بھی چند افراد ہیں جنہیں ان سوسائٹیوں کے انتظامیہ میں خاص طور پر ریاستی اور قومی سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں چند افراد ایسے ہیں جن کے کردار قابل ستائش نہیں ہیں۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ امداد باہمی تحریک سے وابستہ سبھی لوگوں کو مفاد پرستوں کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیئے۔

تیسری بات یہ کہ گرچہ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی ممبرشپ میں سماج کے کمزور طبقہ کے لوگوں کو لانے کے لئے چند اقدامات کئے گئے ہیں تاہم ان میں غریب ترین افراد جیسے حاشیائی کسان، برگدار اور زرعی مزدور، بستی باشی اور مختلف صنعتی یونٹوں میں کام کرنے والے مزدور آج بھی امداد باہمی کے دائرے سے باہر ہیں۔ درحقیقت امداد باہمی تحریک تو انہی لوگوں کے لئے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کو اس سے وابستہ ہونا چاہیئے۔ اس تحریک میں عورتوں اور نوجوانوں کو بھی حصہ لینا چاہیئے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے کام کاج میں حکومت بہت زیادہ مداخلت کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ترقی پذیر ملک میں کوآپریٹیو کی ترقی اور فروغ میں حکومت کو ایک ٹھوس کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ امداد باہمی ایک تحریک ہے۔ یہ ایک شعبہ جاتی معاملہ نہیں ہے۔ ایک کوآپریٹیو سوسائٹی کے مالک اس کے ممبران ہوتے ہیں اس لئے ممبروں کو یہ ذمہ داری سونپی جانی چاہیئے کہ یہ سب اپنے منتخبہ ممبروں کو اس کے نظم و نسق کی ذمہ داری دے دیں۔ کبھی کبھی ایک خاص سوسائٹی کے سلسلے میں بدنظمی اور بدعنوانی کی وجہ سے حکومت کو مداخلت کرنی پڑتی ہے لیکن کوآپریٹیو سوسائٹیوں کو بہت دیر تک معطل رکھنا یا حکومت کے مقرر کردہ منتظمین کے زیر انتظام رکھنا نہیں چاہیئے۔ ایسی سوسائٹیوں کے لئے باضابطہ انتخابات ہونے چاہئیں اور امداد باہمی تحریک میں جمہوریت کو بحال رکھنا چاہیئے۔

پانچویں بات یہ کہ سارے ہندوستان میں رجسٹرڈ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے تقریباً ۱۲.۵ کروڑ افراد ممبر ہیں۔ ان میں سے تو کثیر تعداد لوگ اس لئے ممبر ہیں کہ ان سوسائٹیوں کے فراہم کردہ معاشی سہولتوں سے وہ فیضیاب ہوں۔ لیکن وہ سب امداد باہمی تحریک کے نصب العین اور اصولوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ بلاشبہ ممبروں کی تعلیم کے لئے سوسائٹیوں میں برسرروزگار ملازمین کی اور ضلع، ریاست اور قومی سطحوں پر کوآپریٹیو یونینوں کی تربیت کے لئے اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ عام طور پر لوگوں کو بھی ان باتوں سے واقف ہونا چاہیئے کہ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا کیا کردار ہے، کس طرح یہ سوسائٹیاں کام کرتی ہیں اور ان سے عوام کو خاص طور پر کمزور طبقے کے لوگوں کو کیا کیا سہولتیں فراہم ہوتی ہیں۔

آج ملک میں کوآپریٹیو تحریک کے خلاف شکایتیں ہو سکتی ہیں، نیز چند خامیاں اور ناکامیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس امر کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ ترقی اور عوام کے مفاد کے لئے کوآپریٹیو بہت ہی اہم جمہوری ایجنسی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہاں اس بحث و مباحثہ میں شرکت کرنے والے میرے احباب امداد باہمی تحریک پر نہ صرف تعلیمی نکتہ نظر سے غور و خوض کریں گے بلکہ ہمارے کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے کام کاج میں مزید بہتری لانے کے لئے وہ تجاویز بھی پیش کریں گے۔ ٭٭٭

بقیہ، عظیم اکتوبر انقلاب

اس جدوجہد کے نتیجے کا تعین اس حقیقت سے ہوگا کہ روس، ہندستان اور چین میں دنیا کی آبادی کی اکثریت آباد ہے۔ یہ اکثریت بھی جو بڑی تیزی و تندی سے آزادی اور نجات کے لئے جدوجہد میں شامل ہوگی۔ اس طرح اس سلسلے میں کسی قسم کی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے، عالمی جدوجہد کا آخری نتیجہ کیا ہوگا۔"

"تاریخ نے اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ محنت کش لوگوں کے عظیم رہبر اور معلم بہت ہی دور اندیش تھے۔ ہندستان کے لوگوں کی برسوں کی جرأت مندانہ جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ نو آبادی کے حاکموں کو ہمیشہ کے لئے نکال باہر کیا اور ایک آزاد ہندستان عالم وجود میں آگیا۔ ٭٭

اردو شاعری میں قومی نظمیں

نارائن دت بھاشا وبھاگ۔ پنجاب۔ پٹیالہ

ہر ملک اور ہر قوم کی زبان اپنی تہذیب کے تابع ہوتی ہے۔ زبان کا تہذیب و تمدن سے بڑا گہرا اور نزدیکی تعلق ہوتا ہے۔ ہندوستان پر اسلامی فتوحات کے نتیجے کے طور پر ہماری تہذیب نے اسلامی اثر قبول کیا اور ہماری زبان میں عربی۔ فارسی الفاظ کا استعمال ایک عام سی بات ہو گئی۔ عربی۔ فارسی نے جب ہندی کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑا تو اردو زبان وجود میں آئی۔ اردو زبان نے ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اسے قومی زبان کا درجہ دینے کی باتیں ہونے لگیں۔ کئی صوبوں کی سرکاری اور عدالتی زبان اردو ہو گئی اور اس زبان کو مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے لوگوں کے درمیان باہمی میل جول اور راہ و رسم پیدا کرنے کا ایک ذریعہ مانا جانے لگا۔ جب جنگِ آزادی کا بگل بجا تو اردو زبان خاص طور پر اردو شاعری بھی اسی رنگ میں ڈوب چلی کیونکہ شاعر حساس ہوتا ہے اور حساس دل دردمند ہوتا ہے۔ دردمند انسان کے لئے خاکِ وطن کا ایک ایک ذرّہ دیوتاؤں کی سی عظمت رکھتا ہے۔ وطن کی محبت انسانی زندگی کا اصلی ترین مقصد ہوتا ہے۔ وطن کی محبت ایک نشہ ہوتی ہے ایک پاکیزہ جذبہ ہوتی ہے اور یہ جذبہ خداداد عطیہ ہوتا ہے۔ احساس اس کو ابھارتا ہے اور گرد و پیش کا ماحول اس کی تربیت کرتا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت ہی انسان دنیاوی آسائشوں کو ٹھکرا کر اور مذہب و ملت کے اختلافات کو نظر انداز کرکے قید و بند کی صبر شکن تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔ آزادیٔ وطن کی بے تاب امنگوں اور اٹل ارادوں کے سہارے سرفروشانہ خیالات دل میں چٹکیاں لیتے ہیں مگر ہر انسان کا اس جذبہ کا طریقِ اظہار الگ الگ ہوتا ہے۔ شاعر کو وقت کا نقیب مانا جاتا ہے اور جب وہ جذبہ قومیت سے سرشار ہو کر اپنے خیالات کو کاغذ پر اتارتا ہے تو قومی شاعری جنم لیتی ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے جنگِ آزادی میں برابر کا حصہ ڈالا ہے اور عوام کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں اس نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ کیوں کہ شاعری میں احساسات جذبات اور مشاہدات الفاظ کا جامہ پہن کر ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑنے کی قوت رکھتے ہیں۔ شعر کو حسن، رقص، موسیقی اور مصوری کا مجموعہ مانا جاتا ہے۔ اس میں الفاظ کا ترنم، تخیل کی نفاست اور حقائق کی جیتی جاگتی تصویر نگاری جذبات کو برانگیختہ کرکے تحریک کے لئے ابھارتے ہیں۔ ایک ایک شعر سے وہ وہ کام لئے جاسکتے ہیں جو بڑے بڑے واعظ اور مقرر اپنی لمبی لمبی تقریروں اور لچھے دار دلیل بازی سے نہیں لے سکتے۔ شعر ایک نشتر ہوتا ہے جو قوم کی دکھتی ہوئی رگوں کو خود بخود ڈھونڈ لیتا ہے۔ اردو شاعری نے بھی اسی نشتر سے کام لے کر قوم کو بیدار کیا اور جب ضرورت محسوس ہوئی تو ہر شاعر نے اپنا قومی فرض سمجھ کر اس میں ہاتھ بٹایا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کا "ترانۂ ہندی" سارے
جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اردو شاعری کی قومی
نظموں میں ایک سنگِ میل ہے۔ اس کا یہ شعر سے

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

پیغام ہے اپنی قوم کے نام۔ جنگِ آزادی کے دوران
اس نظم نے ایک تہلکہ سا مچا رکھا تھا اور آج بھی اسی
ترانہ کی آواز ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر گونجتی رہتی ہے کیوں کہ
قومی یکجہتی کی ضرورت آج بھی اسی طرح ہے جس
طرح کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے وقت
تھی۔ چکبست پر بھی حبِ وطن اور تحریکِ آزادی کا
اثر نمایاں تھا۔ وہ اپنی نظم "خاکِ وطن" میں لکھتے ہیں سے

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

سرور جہاں آبادی کی نظم "گلزارِ وطن" میں
حبِ وطن کا جذبہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کا یہ شعر
ان کے دل کی آواز ہے سے

اس کنجِ دل نشیں میں قبضہ نہ ہو خزاں کا
جو ہو گلوں کا تختہ، تختہ ہو اک جناں کا

جوش ملیح آبادی کی مشہور نظم وطن لاکھوں دلوں
کی آواز ہے۔ اس کے علاوہ جوش صاحب کی "وفادارانِ
ہند کا پیغام، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" "خونی جنڈا"
"شکستِ زنداں کا خواب" "لمحہ آزادی" "الله کرے" اور
"آثارِ انقلاب" نظموں کا بھی جواب نہیں جنہیں برٹش
سرکار نے باغیانہ نظمیں قرار دیتے ہوئے ضبط کر لیا تھا۔ برق
دہلوی کی نظمیں "اصلِ ہند" اور "جنت" بھی لذیذ ہے
اپنے ہم وطنوں کو ایک للکار ہے۔ جمیل مظہری کی "اے
مادرِ ہندوستان" اپنی اسی پاک سرزمین کے تئیں ایک سجدہ
ہے۔ آنند نرائن ملا کی نظم "زمینِ وطن" میں ہندوستانی تہذیب
کا بھرپور نقشہ کھینچا گیا ہے۔ سیماب اکبر آبادی کی نظم "ہندوستان"
زمانہ قدیم کی ہندوستانی عظمت کا آئینہ دار ہے۔ ظفر
علی خاں کی نظمیں "ہندوستان" "طاقتِ ایمانی" "فانوسِ ہند
کا شعلہ" "آزادی کا بگل" "شرابِ خانہ ساز" اور "تخت
یا تختہ" اپنے ملک کی آزادی کے لئے ایک تڑپ ہیں۔
ساغر نظامی "ترانۂ وطن" اور "عہد" میں اپنے پیارے وطن
کی آبرو کے لئے مر مٹنے کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
افسر میرٹھی "وطن کا راگ" میں مذہب و ملت کے اختلافات
کو مٹا کر مادرِ وطن سے اس کے رکھوالے ہمالیہ سے گنگا
کی پیاری لہروں سے اور ہندوستان کی سرسبز وادیوں
سے پیار کی پینگیں بڑھانے کے لئے اکساتے نظر
آتے ہیں۔ علی سردار جعفری اپنی نظم "یہ ہندوستان"
میں اپنے ملک کو خلدِ بریں قرار دیتے ہیں اور انکی نظم "آگے
بڑھیں گے" میں ایک اعتماد کی جھلک نظر آتی ہے۔
اعجاز صدیقی "نغمۂ وطن" میں "میرے سینے میں رہے
ہر وقت تیری ہی لگن" کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ نازش
پرتاب گڑھی "نیا ساز نیا انداز" میں اپنے وطن کو مینارۂ
ادب اور ہوارۂ ادب قرار دیتے ہیں۔ قریش صدیقی "جدیدِ
وطن" میں اپنے ملک کو "حیات و کائناتِ من" کا درجہ
دیتے ہیں۔ گوپال متل اپنی نظم "اے وطن" میں خلوص
دل سے یہ دعا کرتے ہیں کہ قیامت تک مسرتوں کے ستارے
سے ہندوستان کی مانگ بھری رہے۔ سکندر علی وجد
"نذرِ وطن" میں ملک کی آزادی پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے
ہوئے فرماتے ہیں سے

سیاہ دورِ غلامی خیال و خواب ہے آج
بلند عظمتِ انساں کا آفتاب ہے آج

محمد حسین آزاد کی "حبِ وطن"، حالی کی "آزادی
کی قدر" اور "انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی"
اسمٰعیل میرٹھی کی نظم "اچھا زمانہ آنے والا ہے" میں حب
وطن کا جذبہ ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ اکبر الہ آبادی
نے اپنی طنزیہ نظموں کے ذریعہ اپنی قوم پرستی کا اظہار جس خوبصورت

انداز میں گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "برٹش راج" اور "دہلی دربار" کو لاثانی قومی نظمیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

قومی نظموں کی طویل فہرست میں ان نظموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن کو برٹش سرکار نے اپنی جابرانہ حکومت کے لئے خطرناک سمجھتے ہوئے باغیانہ نظمیں قرار دے کر ضبط کرنے کے احکام جاری کئے تھے۔ ان میں علی جواد زیدی کی "من کی سیوا"، رام پرشاد بسمل کی "دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو" "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" "زندگی کا راز مضمر فخرِ قاتل میں ہے" اور "ہم جو فریاد کرتے ہیں"، اشفاق کی "شورشِ جنوں" اور "ہم رہے نہ رہے"۔ نوبہار صابر کی "پیامِ بیداری" "جذبۂ ایثار" "سوزِ دل" "بیدار ہونا چاہیئے" "جذبۂ حریت" کنور پرتاپ چند آزاد کی "انقلاب آنے کو ہے" "ترانۂ آزاد" "وطن کے واسطے" اور "ستم کی انتہا کیا ہے" ٹیکا رام سخن کی "عظمتِ دشمن" عثمانی کی "وطن عزیز سے اب چھڑانا پڑے گا" خلیق کی "تب مجھے گولیوں سے اڑا دیا" حسرت موہانی کی "نجاتِ ہند" اختر شیرانی کی "لوری" حفیظ جالندھری کی "آزادی" روشن صدیقی کی "بیداریٔ مشرق" احسان دانش کی "امیدِ آزادی" اور "غلامی کی خصوصیات" شمیم کرہانی کی "جوان جذبے" وقار انبالوی کی "ترانۂ جنگ" اور "میدانِ جنگ میں صبح" سلام مچھلی شہری کی "مجبوریاں" ساحر لدھیانوی کی "شعلہ نوائی" اور جاں نثار اختر کی "میں ان کے گیت گاتا ہوں" قابلِ ذکر قومی نظمیں ہیں۔

اردو شاعری میں قومی نظمیں اتنی بڑی تعداد میں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا ایک مشکل بات ہے۔ اس سلسلے میں صرف اردو کے نامور شعراء کی زبان زدِ عام قومی نظموں کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ [illegible] شاعری کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری میں قومی نظموں نے ہندستان کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے میں جو اہم کردار ادا کیا ہے دوسری زبانوں کے ادب میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ (بشکریہ "پاسبان" چنڈی گڑھ)

بقیہ: راموقبیلے

عام طور سے رائج ہیں۔ طلاق اور میاں بیوی کا جدا ہو جانا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

راموکنبہ عموماً چھوٹا ہوتا ہے۔ مشترکہ کنبے پر کوئی پابندی یا خصوصی ناپسندیدگی نہیں ہوتی لیکن ایسے کنبے کم ہوتے ہیں اگرچہ آدمیوں کا ایک عورت سے شادی کرنا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے تاہم ایک آدمی کا کئی شادیاں کرنا عام ہے۔ متبنٰی بنانا عملی طور سے ناپید ہے لیکن اگر کسی کنبے میں اکلوتی لڑکی ہو تو وہ ایک داماد کو اپنے یہاں امداد کے عوض رکھ سکتے ہیں جس کے لئے رشتہ داروں اور گاؤں کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔

راموگ بڑے شائستہ ہوتے ہیں۔ انہیں جلد غصہ نہیں آتا۔ حیرت کی بات ہے کہ راموگ گانے، موسیقی اور ناچ کے لئے کوئی رغبت پیدا نہ کر سکے۔ گانے کا واحد گیت یا ترانہ جسے رامو لوگ جانتے ہیں وہ جا جینیر ہے جس میں سنسار کی تخلیق کا بیان اور تاریخ ہوتی ہے۔ حال ہی میں کچھ لڑکیوں نے گیلا ٹمک پو نو سیکھا ہے جو ایک اجتماعی ناچ ہے۔

گاؤں کا راج:

راموگوں کے یہاں ایک سادہ سا زراعتی نظام ہے جس میں شکار کرنے، مچھلی پکڑنے، بھیڑ بکری پالنے اور جنگلی پودوں کے اکٹھا کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان کے اہم کاروبار کے اعتبار سے زراعت کا کام انہیں پورا سال مصروف رکھتا ہے۔

راموقبیلہ

از: ——— رام پرکاش راھی

ہندستان ان گنت قبیلوں سے گھرا ہے۔ لہٰذا
یہ علم الانسانیات کے ماہرین کی جنت گردانا جاتا ہے۔ راموقبیلہ
ایک رنگیلا قبیلہ ہے اور ہندوستان کے شمال مشرقی پہاڑوں میں آباد
ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے اب اروناچل پردیش پکارا جاتا ہے جس کے
قدرتی مناظر از حد خوبصورت ہیں۔ رامو لوگوں کو "بید اور بانس" کے
...نی گروپ کے نسلی محافظوں کا مرتبہ بخوبی دیا جا سکتا ہے اور یہ لوگ
...بی بدلتی کاشتکاری کا کام کرتے ہیں۔ اپنے طور و طریق میں پڑوسی
تبت کی طرف سے بار بار دخل اندازی کی وجہ سے ان کی ثقافت میں
مختلف تمدنوں کا امتزاج ہے

رامو لوگ اپنے آغاز کو آسمان اور دھرتی کے میل سے
منسوب کرتے ہیں۔ دونی (سورج) اور پولو (چاند)، میدونگ (آسمان)
...سی چنگ (دھرتی) کی اولاد تھے۔ جب دونی اور پولو میدونگ کے پاس
رہنے کو چلے گئے رامو لوگ سی چنگ ماں کے پاس رہ گئے۔ دونی اور
پولو وقت آنے پر دیوتا بن گئے اور رامو لوگوں کی دنیا کے نگراں بن گئے۔
رامو لوگ دعوے کرتے ہیں کہ ساما (شیر)، کیبو رمبا (شیطان) اور
رامو لوگوں کے آبا و اجداد آپس میں بھائی تھے۔

رامو لوگ پہلے تبت میں رہتے تھے۔ حیات و ممات
کے دباؤ کے تحت جنوب کی طرف منتقل ہو گئے۔ ایک داستان کے مطابق
ان کے منتقل ہونے کی وجہ چودھویں صدی میں تبت والوں کا مذہبی
تعصب تھا۔ چونکہ رامو لوگ فطرت کی عبادت اور قربانی میں اعتقاد
رکھتے تھے لہٰذا وہ تبت کے دیوتائی راج والے اصولوں سے دور چلے گئے۔

وہ سرزمین جہاں رامو لوگ رہتے ہیں وہاں مختلف قبیلوں
کا امتزاج ملتا ہے۔ ایک قبیلے کا مطالعہ دوسرے قبیلے کے بغیر مشکل ہے۔
ان کی تعداد کم ہے اور ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا
علیحدہ پہچان، انفرادیت اور نام برقرار رکھے ہیں اور انہیں دوسروں
سے امتیاز دینے کے لئے "اپنے آبائی نام سے پکارے جانے پر فخر کا
احساس ہوتا ہے۔ رامو لوگوں کے اہم قبیلے "میمبا" رامو لوگ اور پیلیبو
کہلاتے ہیں۔ جن علاقوں میں وہ رہتے ہیں انہیں ان کے نیا کی نام سے
جانا جاتا ہے۔ رامو لوگوں کے کئی خاندان ہیں جن کے نام گوجے، کوتین
وغیرہ ہیں۔

آبادیوں کی نوعیت:

رامو لوگ کسی خاص علاقے تک محدود نہیں رہے۔
تبت سے ترک وطن کر کے وہ بوکاس اور میمبو علاقوں میں آباد ہو گئے۔
پیلیبو قبیلے سے ان کی شادیوں کی وجہ سے وہ پیلیبو علاقے میں آباد
ہو گئے۔ میمبو علاقے میں واقع بارکر گاؤں مکمل طور سے رامو لوگوں کا
گاؤں ہے۔ اسی علاقے کے دور جیلنگ گاؤں میں ۵۰ فیصد آبادی
رامو لوگوں کی ہے۔ جو علاقہ بالکل رامو لوگوں کا ہے وہ
اور نیشونگ کے ٹکڑوں پر مشتمل ہے جو [illegible] دونوں طرف۔ چھوٹی
چھوٹی وادیاں ہیں۔ سیجو کسلو وادی میں آ جانے پر رامو لوگ سیلیم ندی
کے مغربی کنارے پر مختلف مقامات پر آباد ہو گئے۔ کچھ مقامات جن پر
[illegible] قابض ہیں۔ آج بھی اپنے ناموں کے حامل ہیں چاہے وہ
اب اس جگہ رہتے ہیں یا سیوم وادی کی پہاڑی ڈھلانوں کی طرف
چلے گئے ہیں۔ مینچو کا وادی میں واقع رامو گاؤں کے نام ان گاؤں میں
رہنے والے خاندانوں سے منسوب کر دئے گئے ہیں۔

ان کا علاقہ سطح سمندر سے ۵۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ فٹ
تک کی اونچائی پر ہے۔ آب و ہوا عموماً سرد ہے۔ گرمیوں کے مہینوں
کے دوران جب کبھی بہت سی بارش ہوتی ہے موسم سرد ہو جاتا ہے۔
سرما کے دوران ہوائیں چلتی ہیں۔ صبح سویرے کے چند گھنٹوں کو
چھوڑ کر سرما کے دنوں کو کیلی ہوا بہت ہی ٹھنڈا کر دیتی
ہیں۔ دھوپ کے باوجود لوگ اپنے آپ کو اپنے مکانوں تک محدود
رکھتے ہیں۔ سردیوں میں بارش کم ہوتی ہے لیکن آسمان پر بادل
چھائے رہتے ہیں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف پڑی ہوتی ہے۔

رامو لوگ آباد ہونے کی جگہ کا انتخاب کرنے کے لئے کئی پہلوؤں پر غور کرتے ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم ہیں ہموار سطح کی زمین کی دستیابی، سردی کے دوران دھوپ سینکنے کے لئے اچھے پتھر اور پانی کی دستیابی۔ یہی وجہ ہے کہ سبھوم ندی اور اس میں ملنے والی ندیوں کی وادیاں راموں لوگوں سے آباد ہیں۔ تیسرا پہلو ہے سلامتی۔ یہ بہت ضروری ہے کیوں کہ رامو لوگ ایک جنگجو قبیلہ ہیں۔ جنگ کرنا ان کی زندگی کا دستور ہے۔ اس لئے گاؤں اونچائی پر واقع ہوتے ہیں تاکہ حملہ کرنے والوں کو سخت اور کھردری چٹانوں پر چڑھنے میں کافی وقت لگانا پڑے۔ قابل کاشت زمین کی دستیابی اور جنگلوں سے نزدیک ہونا بھی ایک سازگار پہلو ہے۔ رامو لوگوں کے مکان لکڑی کی گیلیوں اور بانس کی چٹائیوں سے بنائے جاتے ہیں۔ ہر مکان دس سے پندرہ سال تک قائم رہتا ہے۔ انہیں اکثر مرمت کی ضرورت رہتی ہے۔ اس کے لئے جلانے کی لکڑی کا جنگل خاص کشش رکھتا ہے۔ جب جگہ کا انتخاب کر لیا جاتا ہے تو مکانوں کی تعمیر شروع ہوتی ہے جس سے پیشتر مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ دولت یا ذات پات کی بنا پر مکان کی جگہ کے لئے کوئی ترجیح نہیں دی جاتی۔ ذات پات کی بنا پر کوئی تفریق بھی نہیں ہوتی۔ رامو لوگ پدرانہ میراث کا قبیلہ ہیں۔ خاندانی بنیاد پر گھر گرہستیوں کی تعداد میں اضافہ مکانوں کی تعداد میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

مکان کی بنیاد اور ڈھانچے کا کام گیلیوں پر مبنی ہوتا ہے۔ دیواریں کچلے ہوئے بانس سے بنائی جاتی ہیں۔ چھت کچھ اور نہیں بلکہ پورے سائز کے بانس سے بنتی ہے جو کچل کر چپٹا کر دیا جاتا ہے اور اس طرح رکھا جاتا ہے کہ اس کے سرے اونچے مرکز سے دونوں طرف کو ترچھے ہو جاتے ہیں جس سے بارش کے پانی کا نکاس ہوتا ہے۔ زیادہ تر مکانوں میں سامنے کے برآمدے ہوتے ہیں جو مکانوں کی چھت اور فرش کی توسیع یافتہ حصے ہوتے ہیں اور طرفین کی دیواروں کے بغیر ہوتے ہیں۔ مکانوں میں ایک دروازے سے داخل ہوتے ہیں جو عام طور سے سامنے کا دروازہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی پہلو میں دروازہ ہوتا ہے لیکن عقبی دروازہ نہیں ہوتا۔ دروازے لکڑی کے تختوں سے بنائے جاتے ہیں جن کو لکڑی کے فریموں کا سہارا دیا جاتا ہے۔ مکانوں میں کھڑکیاں، روشندان یا چمنیاں نہیں ہوتیں۔ ان کے اندر اندھیرا رہتا ہے۔ مکان چھوٹے، درمیانے یا بہت ہی بڑے ہوتے ہیں۔

ایک مکان کئی حصوں میں بنا ہوا ہوتا ہے جس کے لئے فرش پر کوئی نشان نہیں لگایا جاتا۔ مختلف حصے اپنے ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ جوں ہی گھر میں داخل ہوتے ہیں "نائیکو" سب سے پہلے آتا ہے اور زیادہ تر اسے خواتین ہی استعمال کرتی ہیں۔ دوسرے نصف کو "بنگو" کہتے ہیں جسے زیادہ تر مرد استعمال کرتے ہیں اور شادی نیز مذہبی رسوم کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تیسرا حصہ "نیپنگ" کہلاتا ہے اور اسے مقدس تصور کرتے ہیں۔ اس حصے میں مختلف جانوروں کے جتنے سر نمائش کے لئے ہوتے ہیں ان سے ان قربانیوں کا پتہ چلتا ہے جو اس کنبے نے کر رکھی ہیں۔ چوتھا حصہ یعنی "کورنگ" جو پہلو کی دائیں دیوار کے ساتھ ہوتا ہے باہر سے آئے لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو ایک یا دو راتوں کے لئے قیام کرنا چاہتے ہیں۔ پانچواں حصہ "چینگے" عقبی ہوتا ہے اور ایک گلیارے کی طرح دائیں یا بائیں پاخانے کی طرف جاتا ہے۔ آگ جلانے کی جگہ یعنی چولہا سب سے زیادہ اہم جگہ ہوتی ہے۔ یہ مکان کے مرکز میں ہوتا ہے اور کھانا پکانے کا یا حقہ پینے کے لئے ہوتا ہے۔ جانوروں کیلئے کوئی علیحدہ مکان نہیں تعمیر کیا جاتا۔ وہ عام مکان میں کھلے بندوں گھوم سکتے ہیں۔ اناج کا گودام چھوٹا اور زمین سے اوپر بنایا جاتا ہے اور اونچائی میں برابر ہوتا ہے۔

لباس اور زیورات:

مرد رامو سردی میں اونی کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ سلک استعمال نہیں کرتے۔ لباس کے انداز میں ان پر دوسرے قبیلوں کا اثر ہے۔ سر کا لباس "ڈملوب" کہلاتا ہے جو بید یا منفن اریچھ یا بندر کی کھال سے بنایا جاتا ہے۔ اوپری لباس ناموا اور چوبا پر مشتمل ہے۔ دونوں بکری کے بالوں سے بنے کپڑے کے ہوتے ہیں۔ ناموا ۵ فٹ لمبا اور ڈیڑھ فٹ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کے مرکز میں ایک سوراخ رکھا جاتا ہے جس میں سے سر کو نکالا جاتا ہے اور بقیہ

پڑا ہو تو اون پر جا پڑتا ہے۔ یہ سارے جسم کو گردن سے گھٹنے تک
دونوں طرف سے ڈھانپ لیتا ہے۔ کمر پر اسے بید کی ایک پیٹی سے
باندھا جاتا ہے جسے [illegible] چراپ کہتے ہیں۔ چوبا ایک کوٹ ہوتا
ہے جو اندرونی لباس کا کام دیتا ہے۔ اسے اون سے بنایا جاتا ہے
اور مختلف رنگوں میں ملتا ہے۔ ڈیمن لنک کوک ہرن کی کھال ہوتی
ہے جو شولڈر پر چوبا کے اوپر اور نامو کے نیچے پہنی جاتی ہے۔ ایک حفاظتی
لباس جنگجو آدمی تیروں، تلوار کی چوٹوں اور اچانک کے حملوں سے بچنے
کے لئے اوڑھتے ہیں۔ مرگم (واسکٹ)، لیبانگ (دستانہ) اور راتم
(ستمان کی کھال سے بنی ڈھال) روزانہ پہننے کی قابل ذکر چیزیں ہیں۔

عورتوں کا لباس اومیکیڈنگ اور جیبانگ پر مشتمل
ہوتا ہے۔ اومیکیڈنگ کوٹ جیسا اونی ملبوس ہوتا ہے۔ سرخ اور
نیلی پٹیاں یکے بعد دیگرے آپس میں جوڑی جاتی ہیں تاکہ رنگینی
اور زیبائش پیدا ہو جائے۔ یہ کوٹ جسم کو گردن سے کمر تک ڈھانپ لیتے
ہیں، آدھی بانہوں کے ہوتے ہیں اور آگے سے کھلے ہوتے ہیں۔ جیبانگ
جو سوتی کپڑے کا ہوتا ہے جسم کے نچلے حصے کو کمر سے گھٹنوں تک یا
ذرا نیچے تک ڈھانپ لیتا ہے۔ دھیرے دھیرے اب اس کی جگہ
لہنگا لے رہا ہے جو کہ مقابلتاً سستا اور عمدہ ہوتا ہے۔

رامو عورتیں سر پر کچھ نہیں اوڑھتیں۔ ان کے بال کٹے
ہوئے ہوتے ہیں۔ دلہنیں تالوڈ ملوپ پہنتی ہیں جو کہ دھات کی بنی
ہوئی ہوتی ہے۔ لڑکیاں اور عورتیں سونے اور قیمتی پتھروں سے بنی
انگوٹھیاں پہنتی ہیں۔ انی، تیلو، اوک، بالو وغیرہ عورتوں کے دیگر
زیورات ہیں۔

رامو لوگ دھنش، تیر، چھوٹی تلواریں، بھالے جیسے
ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ "یوکسی" ایک چھوٹی تلوار ہوتی ہے۔
"اوریک" ایک چھرا ہوتا ہے۔ "یورگیک" ایک چھوٹا چاقو ہوتا ہے۔
"[illegible]" ایک بھالا ہوتا ہے۔ تیروں کی نوک [illegible] زہریلی کر
دی جاتی ہے۔

خوراک

رامو لوگوں کی عام غذا مکئی ہے جسے وہ کچا بھی کھا سکتے
ہیں اور سکھا کر اور روٹی بنا کر بھی کھاتے ہیں۔ چاول بڑا پسند کیا جاتا
ہے۔ چونکہ یہ کمیاب ہے لہذا اسے خاص مواقع کے لئے محفوظ کر لیا
جاتا ہے۔ جب اناج دستیاب نہیں ہوتا تو چند جڑیں کھائی جاتی ہیں۔
انہیں سفوف میں بدل کر ان کی روٹیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ سبزیوں میں
بین، سیتا پھل، کھیرا اور کریلے وغیرہ عام ہوتے ہیں۔ دالیں زیادہ
مرغوب نہیں ہوتیں۔

مصالحوں میں نمک اور لال مرچ بڑے احترام سے پسند
کئے جاتے ہیں۔ لال مرچ کافی مقدار میں لگائی جاتی ہے۔ نمک ایک نعمت
ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے رامو لوگ اپنے کنبے کے افراد کو نمک کے ڈھیر
کے لئے بیچ دیتے تھے لیکن اب حالات بدل چکے ہیں اور نمک دستیاب
رہتا ہے۔ مچھلی بہت پسند کی جاتی ہے۔ گوشت پسند کیا جاتا ہے۔
اناج اور سبزیاں دعوتوں میں قربانی کے موقعوں اور تقریبات میں بانٹی
جاتی ہیں۔ اگرچہ دودھ دینے والے جانور کم ہوتے ہیں۔

حقہ پینا رامو لوگوں کی زندگی کا اہم جز ہے۔ کھانا چوک
سکتا ہے لیکن تمباکو کبھی نہیں چوکتا۔ رامو لوگوں کا اہم نوشیدنہ "او"
مقامی نوعیت کا ایک بیئر ہے جو مکئی اور رائی سے تیار کی جاتی ہے
اور رامو لوگوں کی بچپن سے قبر تک کی ساتھی ہے۔ جنم سے جنازے
تک، فصل کاٹنے اور دھاوا بولنے۔ دوائی کے طور پر بحث و مباحثے
اور تصفیے، اغوا سے قتل تک کوئی بھی ایسا موقع نہیں جس کی تکمیل
"او" کے بغیر کی جا سکے۔

شادی اور کنبہ

شادی کے بارے میں بات چیت کے دوران جس چیز کا
زیادہ خیال رکھا جاتا ہے وہ ہے خاندانی طبقہ اور اقتصادی پہلو۔
امیر لوگ دو یا تین بار شادی کر سکتے ہیں اور غریب چاہے ساری
زندگی گزارا رہ جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رومانی اغوا اور افراد
کے معاملے پیدا ہو جاتے ہیں۔ دلہن کی قیمت کے علاوہ رشتہ داروں
کے لئے تحفے اور شادی کی دعوت پر [illegible] گوشت اور
بیئر کی مقدار [illegible]
[illegible]

عوامی تعطیلات ۱۹۸۷ء

حکومت مغربی بنگال نے سال ۱۹۸۷ء کے مندرجہ ذیل دنوں کو عوامی تعطیلات کا دن قرار دیا ہے۔

نیتاجی کا جنم دن ۔ ۲۳ر جنوری، یوم جمہوریہ ۔ ۲۶ر جنوری، شری پنچمی ۔ ۳ر فروری، بنگلہ نئے سال کا پہلا دن ۔ ۱۵ر اپریل، گڈ فرائڈے ۱۷ر اپریل، یوم مئی ۔ یکم مئی، عید الفطر ۔ ۲۹ر مئی، ★ بنک اکاؤنٹس کی نصف سالہ بندی ۔ ۳۰ر جون، عید الضحیٰ ۔ ۶ر اگست، یوم آزادی ۔ ۱۵ر اگست، محرم ۔ ۵ر ستمبر، مہالایا ۔ ۲۲ر ستمبر، درگا پوجا ۔ ۲۹ر ستمبر تا یکم اکتوبر، درگا پوجا ۔ دسمی اور گاندھی جی کا جنم دن ۔ ۲ر اکتوبر، لکشمی پوجا ۔ ۶ر اکتوبر، کالی پوجا ۔ ۲۱ر اکتوبر، گرو نانک کا جنم دن اور میلاد النبیؐ (فاتحہ دوازدہم) ۔ ۵ر نومبر، کرسمس ڈے ۔ ۲۵ر دسمبر، ★★ بنک اکاؤنٹس کی سالانہ بندی ۳۱ر دسمبر۔

نوٹ : (الف) این ۔ آئی ۔ ایکٹ کے تحت اتوار تعطیل کے دن ہوتے ہیں۔

(ب) : اگر مسلمانوں کا تہوار اس دن نہ ہو جس دن کا ذکر مذکورہ بالا فہرست میں کیا گیا ہے تو مسلمان سرکاری ملازمین کو اعلان کردہ دن کے ساتھ اس دن بھی شعبہ جاتی چھٹی دی جائے گی جس دن وہ تہوار منائیں گے۔

(ج)۔ چونکہ سال ۱۹۸۷ء میں دول جاترا (۱۵ر مارچ) اور جنم اشٹمی (۱۶ر اگست) اتوار کے دن ہیں اور جو این ۔ آئی ۔ ایکٹ کے تحت عوامی تعطیلات کے دن ہیں۔ اس لئے انہیں عوامی تعطیلات کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

باقی عوامی تعطیلات :

★ [illegible] ٹریژری کے علاوہ دیگر سرکاری دفاتر ۳۰ر جون اور ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو جنہیں عوامی تعطیلات کے دن قرار دئے گئے ہیں، کھلے رہیں گے۔

سال ۱۹۸۷ء کے مندرجہ ذیل دنوں میں جنہیں عوامی تعطیلات کا دن قرار نہیں دیا گیا ہے، کلکتہ کے رجسٹرار آف انشورنس اور اسٹامپ ریوینو کے کلکٹر کے دفاتر کے علاوہ حکومت مغربی بنگال کے دیگر دفاتر بند رہیں گے :

★★ ربندرا ناتھ کا جنم دن ۔ ۹ر مئی

درگا پوجا ۔ ۳ر اور ۵ر اکتوبر

نوٹ : ★★ اس کا اطلاق ان سرکاری دفتروں میں ہوگا جہاں مہینہ کے دوسرے اور چوتھے سنیچر پوری تعطیل کے دن نہیں ہوتے۔

ریاستی حکومت نے مزید اعلان کیا ہے کہ مندرجہ ذیل دنوں میں مختلف فرقوں کے ملازمین کے لئے شعبہ جاتی تعطیلات ہوں گی۔

شب برات : (صرف مسلمانوں کے لئے) ۱۳ر اپریل

بیساکھی : (صرف سکھوں کے لئے) ۱۴ر اپریل

ایسٹر سنڈے : (صرف عیسائیوں کیلئے) ۱۸ر اپریل

بودھ پورنیما : (صرف بدھ مت والوں کیلئے) ۱۳ر مئی

نوٹ : چونکہ مہابیر جینتی (۱۲ر اپریل) اتوار کا دن ہے اور جو این ۔ آئی ۔ ایکٹ کے تحت عوامی تعطیل کا دن ہے۔ اس لئے اسے عوامی تعطیل کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔

۱۹۸۷ء کے دوران درج ذیل مخصوص تعطیلات میں سے کسی دو دن کی تعطیلات میں سے سرکاری ملازمین حسب خواہ مستفیض ہو سکتے ہیں :

نیا سال ۔ یکم جنوری جمعرات، پوس سنکرتی ۔ ۱۴ر جنوری بدھ، سکرات ۔ ۱۵ر جنوری جمعرات، گرو ربی داس کا جنم دن ۱۳ر فروری جمعہ، شیوراتری ۔ ۲۶ر فروری جمعرات، ہولی / دول جاترا / باھا ۔ ۱۶ر مارچ سوموار، رام نومی ۔ ۷ر اپریل منگل، دیوالی ۲۲ر اکتوبر جمعرات، بیدھ تیہ ۔ ۲۴ر اکتوبر سنیچر، رتھ جاترا ۔ ۴ر نومبر بدھ، [illegible] پنچمی (صرف پرولیا ضلع کے لئے) ۔ ۴ر نومبر بدھ، بجر [illegible] ۲۷ر فروری جمعہ، [illegible] تہوار (صرف مرشدآباد ضلع کے لئے) ۔ ۱۶ر [illegible] سوموار،

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

سوویت مطبوعات کا جائزہ

جدلیاتی اور تاریخی مادیت کا ابجد

حبیب الحق انصاری

یہ کتاب ایک ضخیم موضوع کا جامع اور خلاصہ اور اردو داں عوام کے لئے ایک دل خوش کن تحفہ ہے جس کے لئے دارالاشاعت ترقی، ماسکو شکریے کا مستحق ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں ایک کائنات بجز کر رکھ دی گئی ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جدلیاتی مادیت دس ابواب پر اور دوسرا حصہ تاریخی مادیت آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مترجم مرزا اشفاق بیگ ہیں۔

جدلیاتی مادیت:

اس حصے کے پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ مادہ مقدم اور شعور ثانوی ہوتا ہے اور مادی مظاہر ہی روحانی مظاہر کو پیدا کرتے ہیں۔ داخلی عینیت اور معروضی عینیت کے فلسفے غلط اور مضرت رساں ہیں جبکہ جدلیاتی مادیت کا فلسفہ درست اور مفید ہوتا ہے

دوسرے باب میں علی الترتیب قدیم جدلیات، سولہویں اور سترہویں صدی کے میکانیات پسندوں، اٹھارہویں صدی کے مابعد الطبیعاتی مادیت فلسفے اور ہیگل کی جدلیاتی عینیت کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ مارکس نے جدلیاتی مادیت کی بنیاد ڈالی اور سائنسی علم کا خلاصہ پیش کیا جو حقائق پر مبنی تھا۔

تیسرے باب میں بتایا گیا ہے کہ مادہ وہ مواد ہے جس سے عام اشیاء تشکیل پاتی ہیں اور جو ہمارے شعور سے باہر معروضی وجود رکھتا ہے۔ مادہ ناقابلِ تخلیق اور لازوال ہے۔

چوتھے باب میں بتایا گیا ہے کہ حرکت سے مراد مادے میں ہر قسم کی تبدیلی ہے مثلاً زندگی مادے کی حرکت کی ایک شکل ہے سکون حرکت کی ایک مخصوص حالت ہے۔ حرکت ابدی، مطلق، ناقابلِ تخلیق، لازوال ہے۔ یہ مختلف شکلوں میں ارتقا پاتی ہے۔ شعور سے باہر یا شعور کے اندر مادے کے بغیر حرکت ناممکن ہے۔

پانچویں باب میں بیان کیا گیا ہے کہ زمان اور مکان، مادے کے وجود کی عمومی شکلیں ہیں۔ نہ تو مادہ مکان و زمان سے باہر وجود رکھتا ہے نہ ہی زمان و مکان مادے سے باہر وجود رکھتے ہیں۔

چھٹے باب میں اس بات کی وضاحت ہے کہ شعور مادی دنیا کے انعکاس کی بلند ترین معلوم شکل ہے۔ انسان محنت کے ذریعہ حیوانی دنیا سے بلند ہوا۔ معاشرتی باہمی عمل سے شعور میں ذہنی سرگرمی فروغ پائی اور زبان ظہور میں آئی۔ غور و فکر جو انسان کو دیگر حیوانوں سے ممتاز کرتے ہیں، محنت اور زبان کی پیداوار ہیں۔

ساتویں باب میں مادی جدلیات کے قوانین بیان کئے گئے ہیں۔ کمیت کی کیفیت میں عبور کے قانون میں بتایا گیا ہے کہ مثلاً پیدائش اور موت کیفیتی تبدیلیاں ہیں جس کے برعکس خود زندگی کے دوران ہونے والی تبدیلیاں کمیتی تبدیلیاں کہی جا سکتی ہیں۔ نفی کی نفی کے قانون کو سمجھانے میں واضح کیا گیا ہے کہ جدلیاتی نفی معینہ شئے میں جبلی قوانین کے تحت ہی ہوتی ہے۔ ضدین کی وحدت اور تصادم کے قانون کو سارے ارتقا کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔ حرکت کیسے خود حرکتی اور شئے میں جبلی ہوتی ہے۔ موخر الذکر قانون پہلے دو قانونوں کو اپنے میں سموئے ہوئے ہے۔

آٹھویں باب میں مقولات کا ذکر ہے کہ وہ انتہائی وسیع نوعیت کے تصورات کُلی ہوتے ہیں جن کا جدلیاتی مادیت میں کافی استعمال ہوتا ہے۔ علت اور معلول کے مقولے ایسے ہوتے ہیں کہ معلول اپنی ہی علت کی علت ہوتا ہے۔ لزوم اور اتفاق کے مقولے ایسے ہوتے ہیں کہ ہر واقعہ ان ضدین کی ہوتا ہے اور ہر قانون صرف ایک رجحان، ایک اوسط کی

طرح یوں درست ہوتا ہے کہ وہ دیگر ادراکات کی بہر حال مدبعی معزز کردیتا ہے۔

نویں باب میں ادراک کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ خارجی دنیا کے ادراک کی بنیاد اشیاء پر اوزاروں اور آلات کے ذریعے کی گئی انسانی سرگرمی ہے۔ عمل تغیر پذیر ہوتا ہے اور چونکہ عمل ادراک کی معروضی بنیاد ہے تو اس لئے علم کبھی جامد نہیں رہتا ہے۔ ساتھ ہی عمل ادراک کی کسوٹی بھی ہوتا ہے۔

دسویں باب میں بتایا گیا ہے کہ تجریدی خیالات ناقابل احساس ہوتے ہیں لیکن وہ معروضی حقیقت کی نقلیں اور شبیہیں ہوتے ہیں۔ تجرباتی سائنس کی ابتداء فطرت کی جانب مجہول استغراقی رسائی چھوڑ کر اس کے رازہائے سربستہ میں سرگرم مداخلت کی طرف ایک بڑا موڑ تھی۔ سائنسی تجربہ کاری اور پیداواری سرگرمی کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ لینن کا یہ فارمولا کہ "سرگرم مشاہدے سے تجریدی فکر تک اور پیار سے عمل تک" ادراک کے عمل کے جدلیاتی کردار کا بہترین اظہار ہے۔

تاریخی مادیت:

کتاب کے دوسرے حصے کے پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ معاشرے کی مارکسی لینی سائنس کو تاریخی مادیت کہتے ہیں۔ تاریخی مادیت کے قوانین کل فطرت میں نہیں بلکہ صرف معاشرے میں عمل کرتے ہیں۔ تاریخی مادیت جانبدار ہوتی ہے۔ اس کے مطابق بورژوائی کے مفادات کے برعکس مزدور طبقے کے مفادات تاریخی رجحان کی عکاسی کرتے ہیں۔

دوسرے باب میں ہے کہ مادی اشیاء کی پیداوار تاریخ کی بنیاد ہے۔ تاریخ ایک معروضی عمل ہے۔ معاشرتی قوانین کا ارتقاء ہمیشہ انسانوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ معروضی ضرورت کا ادراک حقیقی آزادی کی پہلی لازمی شرط ہے۔ دوسری شرط علم کو عمل میں بدلنا ہوتا ہے۔ مادی پیداوار کے طریقے ہی معاشرے کے کردار کو متعین کرتے ہیں۔

تیسرے باب میں مادی پیداوار کے طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ لوگ محنت کی اشیاء اور محنت کے آلات پیداواری قوتیں کہلاتے ہیں۔ ذرائع پیداوار کی ملکیت سے لوگوں کا تعلق پیداواری رشتوں کی بنیاد ہے۔ پیداواری قوتیں اور پیداواری رشتے مل کر طرز پیداوار بناتے ہیں۔ سماجی معاشی تشکیلوں کی خاص مثالیں ابتدائی برادری کا نظام، غلامی کا نظام، جاگیرداری کا نظام، سرمایہ داری کا نظام، اشتراکی نظام اور کمیونسٹ نظام ہیں جو عالمی تاریخ کی ارتقائی منزلیں ہیں۔

چوتھے باب میں طبقات اور طبقاتی رشتے زیر بحث لائے گئے ہیں۔ غلام اور آقا، نیم غلام کسان اور جاگیردار، مزدور اور سرمایہ دار علی الترتیب غلامی اور آقا، جاگیرداری اور سرمایہ داری نظاموں کے بنیادی نزاعی طبقات ہیں۔ طبقاتی جدوجہد سماجی ترقی کی محرک قوت ہوتی ہے۔ طبقات کا خاتمہ ایک طویل عمل ہے۔ اس میں بڑی زبردست کوشش صرف کرنا ہوتی ہے۔

پانچویں باب کا موضوع ریاست ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ابتدائی برادری کی منزل میں ریاست کا وجود نہیں تھا۔ ریاست جب سے وجود میں آئی ہر دور میں استحصال کرنے والے طبقے کے مفادات کی حفاظت کرتی آئی ہے۔ سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیانی عبوری دور میں معاشرے کی سیاسی تنظیم اور لازمی طور پر پرولتاریہ کی آمریت ہونی چاہیئے جس کی مختلف شکلوں میں پیرس کمیون، سوویتوں اور عوامی جمہوریت کو شمار ہوتا ہے۔

چھٹے باب میں بتایا گیا ہے کہ انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف مزدوروں کی اکثریت انقلاب کے لئے مرنے مارنے پر تیار ہو تو دوسری طرف حکومت اس قدر کمزور بنا دی جائے کہ اس کا تختہ الٹنے کا موقع مل سکے۔ اشتراکی انقلاب مسلح ہوگا یا پرامن یہ کسی ملک کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔

ساتویں باب میں ہے کہ عوام اپنی محنت سے معاشرے کی ساری دولت پیدا کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کے معروض اور عامل ہوتے ہیں اور تخلیقی صلاحیت کا مستقل سرچشمہ بھی۔ سوشلزم کے برعکس دوسری طبقاتی تشکیلوں میں عوام میں کچھ استحصال کرنے والے طبقے بھی شامل ہوتے ہیں۔ تاریخی مادیت عظیم انسانوں کے نمایاں رول سے انکار نہیں کرتی لیکن یہ بھی ہے کہ خود نمایاں افراد تاریخ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ رابطے جتنے گوناگوں اور گہرے ہوتے ہیں افراد انہیں جتنی زیادہ سرگرمی سے قائم

رکھتا ہے اتنی ہی زیادہ ترقی یافتہ اس کی شخصیت ہوتی ہے۔ سرمایہ داری فرد کی شخصیت کو پارہ پارہ بنا رہی ہے جبکہ کمیونزم اسی شخصیت کو مکمل اور ہم آہنگ سانچے میں ڈھالتا ہے۔ فرد کی سالمیت کا مطلب یہ ہے کہ کام کو تخلیقی بنایا جائے۔

آٹھویں اور آخری باب میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح مادہ مقدم اور شعور ثانوی ہوتا ہے اسی طرح معاشرتی ہستی مقدم اور شعور ثانوی ہوتا ہے۔ اخلاقیات معاشرتی شعور کی قدیم ترین شکل ہے جب پیداوار رشتے بدلتے ہیں تو اخلاق بھی بدلتا ہے۔ مذہب ایک انتہائی پیچیدہ معاشرتی مظہر ہے اور اس کی کئی سطحیں ہیں جن میں بعض کا تعلق شعور سے ہے تو بعض کا عمل سے ہے۔ فنون کا ارتقا ہمیشہ معاشرے کی مادی بنیاد کے ارتقا کے مطابق نہیں ہوتا۔ موسیقی میں تال کی اہمیت ابتدائی دور کے پیداواری عمل کے طریقے کے سبب سے ہے۔ ڈرامے کا فن بھی سماجی ساختوں اور معاشرے میں تبدیلی سے متاثر ہوتا ہے۔ اگرچہ مارکسی لیننی نظریہ یہ کہتا ہے کہ معاشرتی شعور کا دارومدار ہستی پر ہے لیکن وہ معاشرتی شعور کی اہمیت کو کم نہیں کرتا۔ مارکس کا قول ہے کہ "...نظریہ جب عوام الناس کے ذہن کو گرفت میں لے لیتا ہے تو مادی قوت بن جاتا ہے۔

مجموعی طور سے یہ کتاب عصر حاضر کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس طرح کی کتابیں اسکولوں اور کالجوں کے نصابوں کا حصہ بنادی جائیں تاکہ ہم سب کو اپنی راہیں متعین کرنے میں آسانی ہو سکے۔

کتاب کا سائز ایسا ہے کہ آسانی سے ہر جگہ ساتھ جا سکتی ہے۔ کاغذ، جلد، پرنٹ، ٹائپ وغیرہ نہایت اعلیٰ درجے کا ہے۔ البتہ املے اور ترجمے سے متعلق کچھ غلطیاں حسب ذیل ہیں:

میعن (معین)۔ ریزر فورڈ (ریدر فورڈ)۔ اطلاع کو صیغہ بندی (اطلاع کی صیغہ بندی)۔ مبالغہ آموز (مبالغہ آمیز)۔ دکھایا ہے (دکھاتا ہے)۔ کو اظہار کرنے (کا اظہار کرنے) اور تعلیلات (تعلیقات) صفحات ۵۰، ۱۲۸، ۲۴۴، ۲۸۴، ۳۰۳، ۴۷۹ اور ۵۲۹ پر ملتی ہے۔ جیومیٹری کو علم اقلیدس کہنا کہاں تک موزوں ہے جبکہ غیر اقلیدسی جیومیٹری کا رواج نظریہ اضافت میں مثلاً عام ہے۔ لیکن

کے لئے لفظ عدسہ مروج ہے لیکن زجاجیہ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح کیا حرارتی حرکیات کے بجائے حر قوتیات زیادہ موزوں نہ ہوتا؟ حلقۂ عمل کے بجائے میدان کہہ دینے میں کیا قباحت تھی۔ فیبرک لازم پر لکھ دیا گیا ہے جو غلط ہے۔ صفحہ ۱۱۷ پر حیوانات سے مختلف کی بجائے حیوانات کے برخلاف 'ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح صفحہ ۹۷ پر "مادے کی حرکت محض ایک شکل" ہونا چاہئے تھا۔ علم المناظر اقلیدس 'درست نہیں، اجیومیٹری یا علم النور مطلب بخوبی ادا کر سکتا تھا۔

مصنف کا نام نہ ہونے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تصنیف کئی انسانوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس لئے امید کی جا سکتی ہے کہ جامع اور نپی تلی عبارات پر مشتمل ہوگا اور واقعتاً ایسا ہے بھی۔ اور محض چند نکات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے ورنہ تو ۵۳۶ صفحات کی اس کتاب میں تفصیلی وضاحتیں موجود ہیں۔

فطرت اور سماج کے ہر طالب علم کو بلکہ ہر ترقی پسند انسان کے لئے جو اردو داں ہے اس کتاب کو بلا استثنا کم از کم ایک بار اور ہو سکے تو بار بار ضرور پڑھنے کی کوشش کرنا چاہئے اور اپنے فکر و عمل میں اس کا خاطر خواہ استعمال بھی کرنا چاہئے ٭٭٭

بقیہ: عوامی تعطیلات

رام کیلی میلہ (صرف مالدہ ضلع کے لئے) - ۱۵ رجون سوموار، پرنا جاترا (صرف ہوگلی ضلع کے لئے) ۶ رجولائی سوموار، پنڈوا میلہ (صرف مالدہ ضلع کے لئے) - تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا، مکیتر کی کالی پوجا (صرف بیر بھوم ضلع کے لئے) - تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا، بارو دول (صرف ندیا ضلع کے لئے) - تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا، مناسا پوجا (صرف جلپائی گوڑی ضلع کے لئے) - تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

نوٹ: چونکہ امسال رتھ جاترا (۲۸ رجون) اور رکشا بندھن (۹ راگست) اتوار کے دن ہیں اور جو این۔ آئی۔ ایکٹ کے تحت عوامی تعطیلات کے دن ہیں اس لئے انہیں مخصوص تعطیلات کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

سال ۱۹۸۷ء کی کسی مقامی چھٹی یا تعطیل کا اعلان اگر متعلقہ مجاز حکام نے کیا ہے تو وہ مندرجہ بالا فہرست کی روشنی میں منسوخ سمجھا جائے گا ٭٭٭



حال ہی میں کلکتہ میں وزیر اعلیٰ شری جیوتی باسو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، کلکتہ کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے۔



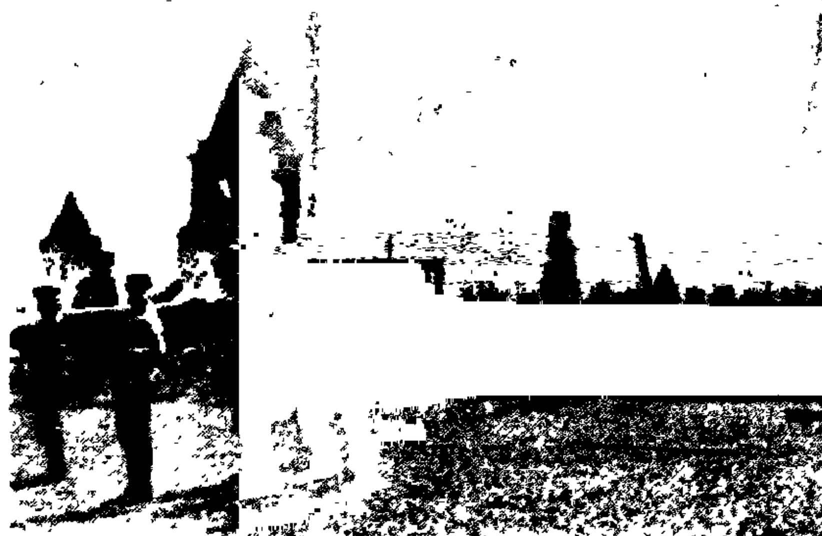
سید منصور حبیب اللہ وزیر عدلیہ حکومت مغربی بنگال ۹ / دسمبر [illegible] کو "یوم یاد" کے موقع پر [illegible] کلکتہ میں تعمیر کردہ شہدائے [illegible] کے مینار میں شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرتے [illegible]

MAGHREBI BANGAL
1st December 1986

Postal Regd. No. WB/CC-52
Vol-33 No—22
PRICE 25 Paise



وی۔ آئی۔ لینن



انقلاب روس ۱۹۱۷ء ۔ ریڈ گارڈس (لال فوج)

Chief Editor : Pritindra Krishna Bhattacharya, Editor : Dhirendra Dutta, Asst. Editor Md. Azam

مغربی بنگال

۱۵/دسمبر ۱۹۸۶ء

پندرہ روزہ
مغربی بنگال کلکتہ

مدیر اعلیٰ : پرتین بھٹاچاریہ
مدیر : دھریندرا ناتھ دت
مدیر معاون : محمد اعظم

جلد نمبر ۳۳ ★ ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۶ء ★ شمارہ نمبر ۲۳

شرحِ خریداری

سالانہ : تین روپئے ★ اس شمارے کی قیمت : بارہ ۱۲ پیسے

ترسیلِ زر کا پتہ :

بزنس منیجر!
شعبۂ اطلاعات وثقافتی امور
حکومت مغربی بنگال
۲۳۔آر، این، مکھرجی روڈ۔ کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۰۱



۱۲ر نومبر ۱۹۸۶ء کو رائٹرس بلڈنگس کلکتہ میں وزیر اعلیٰ جیوتی باسو، جارجیا، سوویت روس، کے نائب وزیر اعظم کے ساتھ محوِ گفتگو

مسلمان نوجوانوں کو تبادلۂ روزگار کے دفاتر سے روزگار فراہم کیا جا رہا ہے

وزیر قانون و اقلیتی امور، ایس۔ اے۔ ایم۔ حبیب اللہ

گزشتہ کل یعنی ۹ر دسمبر ۱۹۸۶ء کو بنگلہ اخبار جوگانتر' میں ایک خبر شائع ہوئی جس کی طرف میری توجہ مبذول کرائی گئی۔ اس خبر میں یہ باتیں درج ہیں کہ مرکزی وزیر شری پریہ رنجن داس منشی اور حزبِ اختلاف کے سربراہ مولوی عبدالستار کو، آئندہ انتخاب کی آمد آمد کے وقت یہ بات معلوم ہوئی کہ بائیں محاذ حکومت کے تحت مسلمانوں کے ساتھ سب سے زیادہ غفلت برتی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ گزشتہ ۸ ر دسمبر کو مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں کانگریس والوں کا ایک جلسہ ہوا تھا اور اس جلسہ میں اس رائے کا اظہار کیا گیا۔ کانگریسی رہنما یا وزراء اپنے پیروکار اور حامیوں سے کیا کہتے، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، لیکن وہ موقعہ کو دیکھتے ہوئے ہماری بائیں محاذ حکومت پر حملہ کر دیتے ہیں اور عوام کے لئے اس کی اشاعت بھی کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر ہمیں ان کے جھوٹے اور مکمل طور پر بے بنیاد الزامات کا جواب دینا پڑتا ہے۔ یہ بڑی تعجب کی بات ہے کہ جہاں کانگریس کے زیر حکومت تمام ریاستوں اور علاقوں میں مسلمانوں کو روزانہ فرقہ وارانہ فسادات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ایسے فسادات تو ان کے لئے وبا بن چکے ہیں وہاں کانگریس کے سربراہ مغربی بنگال میں ایسے الزامات عائد کرتے ہیں جہاں فرقہ پرست عناصر کی شدید کوششوں کے باوجود، فرقہ وارانہ فسادات رونما نہ ہوئے، سوائے اس کے کہ چند علاقوں میں فسادات کی صورت حال پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں، لیکن ایسی صورت حال کو عوام اور انتظامیہ نے غیر مؤثر بنا دیا۔ بہرحال اس خبر کی سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان دونوں سربراہوں نے یہ بتایا کہ مغربی بنگال میں جہاں ہزاروں نوجوانوں کو روزگار فراہم کیا جاتا ہے، وہاں ایک بھی مسلمان کو نہیں لیا جاتا۔ مجھے یہ بات معلوم نہیں کہ ان اصحاب کو یہ اعداد و شمار کہاں سے ملے۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت ایسے اعداد و شمار نہیں رکھتی، کیوں کہ دستور کے لحاظ سے مسلمانوں کو شیڈیولڈ کاسٹ و ٹرائب کی طرح سرکاری ملازمت کے لئے کوئی الگ خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ ہم چند اعداد و شمار پیش کرتے ہیں، جن سے یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ ان لوگوں کے بیانات بالکل بے بنیاد ہیں۔ مثال کے طور پر مغربی بنگال میں مدرسہ تعلیم کو لیجئے۔ اس بات سے سبھی واقف ہیں کہ ایسے اداروں کے زیادہ اساتذہ، طلباء اور غیر معلم اسٹاف مسلمان ہیں۔ یہاں اس بات کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۷ء سے قبل مغربی بنگال میں ۹۷ ہائی مدرسے، ۱۴۰ جونیئر مدرسے اور ۷۴ سینیئر مدرسے تھے، لیکن ان میں سے ایک بھی مدرسہ حکومت کا تسلیم کردہ نہ تھا۔ ان مدرسوں کے اساتذہ اور اسٹاف کی تنخواہیں بھی بہت کم تھیں اور یہ سب دیگر مراعات سے بھی محروم تھے۔ ان کی تنخواہوں کی کوئی شرحیں نہیں تھیں۔ گزشتہ دس برسوں میں نہ صرف ان مدرسوں کو حکومت نے تسلیم کر لیا بلکہ ان کے اساتذہ اور اسٹاف کو دیگر ثانوی اسکول کے اساتذہ اور اسٹاف کو دی جانے والی تنخواہوں کے برابر تنخواہیں دینی شروع کر دیں۔ نیز مزید ۶۲ ہائی مدرسے، ۴۶ جونیئر مدرسے اور ۱۹ سینیئر مدرسے کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور انہیں ثانوی اسکول کی شرح کے مطابق باضابطہ تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ ۱۹۷۶-۷۷ء میں حکومتِ مغربی بنگال نے ۲ر۵ لاکھ روپئے مدرسہ تعلیم پر خرچ کئے جبکہ موجودہ ریاستی بجٹ میں اس مد کے تحت ۵ر۷ کروڑ روپئے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ ثانوی اسکول کے اساتذہ اور اسٹاف کی تنخواہوں کی جو شرحیں ہیں، ان ہی کے مطابق مدرسے کے اساتذہ اور اسٹاف کو تنخواہیں دی

دی جاتی ہیں۔ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی مدرسہ تعلیم کے لئے سالانہ کروڑ روپئے فراہم کئے جاتے ہیں۔
مدرسوں کے علاوہ بائیں محاذ حکومت کے دور میں پرائمری اور ثانوی اسکولوں کے لئے سینکڑوں اساتذہ کی نئی بھرتی کی گئی اور انہیں نئی شرحوں کے مطابق تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ اردو اسکولوں کو تسلیم کر لیا گیا، اردو اکیڈمی قائم کی گئی۔ یہ اقدامات مسلمان نوجوانوں کو روزگار کی فراہمی میں معاون ثابت ہوئے۔ نیز لسانی اقلیت، جو زیادہ تر مسلمان ہیں، کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ان کے حقوق برقرار رہیں گے۔ جہاں تک سرکاری روزگار کا سوال ہے، یہاں اس بات کو یاد رکھنا ہوگا کہ بنگال کے علاوہ، جہاں آزادی کے قبل کے دنوں سے مختلف طبقوں کے لوگوں کے لئے روزگار میں نشستیں مخصوص ہیں، کہیں بھی مسلمانوں کے لئے روزگار میں نشستیں مخصوص نہیں ہیں۔ لیکن ہماری حکومت نے روزگار کی تمام ایجنسیوں کو گشتی خطوط لکھے کہ مسلمانوں کو مناسب طور پر روزگار فراہم ہو۔

میں یہ بات حزب اختلاف کے سربراہ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ مغربی بنگال وقف بورڈ کے اسٹاف کی تنخواہوں کی مناسب شرحیں نہیں تھیں اور انہیں چندے سے حاصل کردہ رقوم پر مکمل طور پر تنخواہوں کے لئے انحصار کرنا پڑتا تھا۔ کانگریسی حکومت نے اس صورت حال کو بدلنے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی۔ یہ بائیں محاذ حکومت ہی ہے جس نے وقف بورڈ کے ادارہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ریاستی حکومت اسے مساوی عطیہ فراہم کرتی ہے۔ ۱۹۷۷ء سے قبل وقف عطیہ نہ تھا۔ موجودہ بجٹ میں اخراجات ۹ لاکھ روپئے تک بڑھ گئے۔ ان تمام مراعات سے مسلمان ہی مستفید ہوتے ہیں لیکن مشری برہ ریڈی واس منشی کے کہنے کے مطابق مغربی بنگال میں مسلمانوں سے غفلت برتی جاتی ہے۔ جو کچھ کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے اس کے ساتھ ساتھ میں یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے "کام کے لئے خوراک" پروگرام اور موجودہ مرکز کا اور ریاستی منصوبہ کا روزگار پروگرام در حقیقت ہزاروں مسلمانوں کی مدد کر رہے ہیں جن کی سینکڑوں دیہاتوں میں دیہی مزدوروں میں اکثریت ہے۔
تباد لئے روزگار کے دفتر کے ذریعہ نئی بھرتی کے اصولوں کو رو بہ عمل لاکر موجودہ حکومت نے تمام فرقوں کے لئے روزگار کے مناسب مواقع فراہم کئے اور اس طرح مسلمان نوجوانوں کو تبادلئہ روزگار کے دفتروں کے ذریعہ روزگار فراہم کیا جا رہا ہے۔ وزیروں اور ممبران اسمبلی کی سفارشات کے ذریعہ روزگار کی فراہمی سے کہیں زیادہ تبادلئہ روزگار قوانین اور پبلک سروس قوانین کے نفاذ سے روزگار کے زیادہ مواقع فراہم ہو سکتے ہیں۔ ماضی میں بھی ان باتوں کو رو بہ عمل لایا جاتا تھا لیکن ایسے طریقہ کار صحت مند نہیں ہیں اور یہ صرف کنبہ پروری کی ہمت افزائی کرتے ہیں ٭٭٭٭

بقیہ: اقبالؔ اور فلسفۂ عقل وعشق

لیکن عشق اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ آرزو کا وجود نہ ہو۔ آرزو نہ ہو تو عشق ایک بے کار جذبہ ہے جس کی کچھ قدر نہیں۔ عشق آرزو ہی سے استوار اور دیرپا بنتا ہے۔ آرزو جتنی بلند اور روشن ہوگی اسی قدر عشق ہوا و ہوس سے بیگانہ ہوگا۔ عشق آرزو سے زندہ ہوتا ہے۔ اگر دل میں آرزو نہ ہو تو عشق کا روشن چراغ بھی بجھ جاتا ہے۔ عشق کی بقا آرزو کی بقا ہے اور عشق کا سوز آرزو کے قیام سے وابستہ ہے۔ اس لئے اقبالؔ نے آرزو کو زندہ رکھنے کی کثرت سے تعلیم دی ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ زندگی یاس و قنوط سے عبارت نہیں ہے بلکہ آرزو حیاتِ انسانی کا وہ چراغ ہے جس سے زندگی کا ہر پہلو تابناک ہے۔ اسلام آرزو و تمنا کی تعلیم سے پُر ہے — رضائے الٰہی کی آرزو، خوشنودیٔ رسولؐ کی آرزو، جنت کی آرزو، زندگی کی آرزو، آسمانی عطیات کی آرزو، زندگی کو با مقصد اور با معنی بنانے کی آرزو۔ غرض اقبالؔ کے فلسفۂ عقل و عشق کا ماحصل یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے بلکہ صرف مدارجِ ارتقا کا فرق ہے۔ ان میں مابہ الامتیاز آرزو کے معرفت کی وہ خاص کیفیت ہے جسے شاعر نے سوز کہا ہے۔ اگر عقل میں یہ سوز پیدا ہو جائے تو وہ عشق بن جاتی ہے ؎

چہ می پرسی میانِ سینہ دل چیست
خرد چوں سوز پیدا کرد، دل شد

٭٭٭٭ (بشکریہ "پاسباں" چنڈی گڑھ)

اقبال اور فلسفۂ عقل و عشق

نسرین سلطانہ جبیں

عقل اور عشق کی کشمکش اردو اور فارسی شاعری کا قدیم موضوع رہا ہے۔ اقبال کے فلسفہ میں بھی عقل اور عشق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے عقل اور عشق کے تصورات صوفی شاعروں سے لے کر ان پر جدید فلسفۂ وجدانیت کا رنگ چڑھا کر اپنی جدید فکر سے عشق و عقل کی ماہیت اور اس کی حقیقت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اقبال نے عقل و عشق کا موازنہ کثرت سے کیا ہے۔ وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ ذیل میں ہم اقبال کے فلسفۂ عقل و عشق کے ان دونوں پہلوؤں یعنی ان کے اختلافات اور اتحاد کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

(الف) "عقل رازِ ہستی کو سمجھتی ہے" یعنی مظاہرہ کی صورت میں اس کا بلاواسطہ ادراک کرتی ہے اور عشق اسے آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ یعنی حقیقتِ ہستی کا بلاواسطہ مشاہدہ کرتا ہے۔

(ب) عقل زمان و مکان کی پابند ہے اور یہ صرف مظاہر کے ادراک کی صورتیں ہیں اس لئے عقل کے ذریعہ سے ہمیں صرف "علم" حاصل ہوتا ہے۔ عشق زمان و مکان کی حدود سے نکل کر اس عالمِ لامحدود میں پہنچ جاتا ہے جہاں حقیقتِ مطلق بے حجاب نظر آتی ہے اور یہی معرفت کا مقام ہے۔

(ج) عقل کی منزلِ مقصود بھی ہستی مطلق کی معرفت ہے۔ وہ "خدا جو" ہے لیکن اس کی جستجو بجائے خود ناتمام ہے۔ عشق "خدا نما" ہے یعنی راہِ طلب میں عقل کی راہبری کرتا ہے اور اسے منزل تک پہنچا دیتا ہے اور عقل و عشق ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ دراصل عشق عقل کا مرشد ہے۔

(د) عقل مشکوک اور شبہات کا نام ہے۔ اس میں والہانہ جذبہ نہیں ہوتا اور یہ دور بینی اور عاقبت اندیشی کے مرض میں گرفتار ہوتی ہے۔ عقل نے دنیا میں جرأت کے حیرت انگیز کرشمے نہیں دکھائے ہیں لیکن عشق کی بدولت انسانوں کی تاریخ درخشاں اور منور کارناموں سے پُر ہے

عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است

واقعی عقل کا علم جو مشاہدہ حقیقت سے محروم ہے ظن گمان سے زیادہ نہیں، انسانی دل محض گمان سے مطمئن نہیں ہو سکتا بلکہ یقین حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتا ہے۔ کائنات کا سطحی علم بیکار ہے جب تک انسان کی نظر اس کی تہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس لئے عقل کی بصارت کے ساتھ عشق کی بصیرت بھی شامل ہو تو کائنات جو خود محرمِ راز کی تلاش ہے اپنے اسرارِ پنہاں آشکار کر دیتی ہے۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرے ذرے میں ہے ذوقِ آشکارائی

کائنات کی حقیقت معلوم کرنے کی جو لگن انسان کے دل میں ہے وہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی روح ہے محض نظری اہمیت نہیں، اخلاقی اور عملی اہمیت رکھتی ہے۔ انسان کی حیات یہ ہے کہ اپنی شخصیت کی توسیع اور تکمیل کر کے اسے پائیدار اور لازوال بنائے۔ عقل کو اس مقصد کا احساس تک نہیں یہ وہ کشمکشِ حیات کا دور سے تماشا دیکھتی ہے۔ مگر عشق جو پیغامِ خودی کا مخاطب اور محرم ہے بلا تامل کارزارِ عمل کود پڑتا ہے

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یعنی امروز و فردا سے بے خبر، نتائج سے بے خوف، طعن
و تشنیع سے بے پروا ہو کر وہ کر گزرتا ہے جو اسے کرنا چاہیئے۔
لیکن اقبالؔ عقل سے بالکل متنفر نہیں ہیں۔ عقل کو وہ
اپنے [illegible] عقل میں اتنا پختہ نہیں پاتے جتنا کہ عشق کو۔ عقل ہر شے
کو اپنی کسوٹی پر پرکھتی ہے اور صرف اسی کو خوش آمدید کہتی ہے جو اسکے
معیار پر پورا اترتا ہے۔ عشق صرف سچائی اور صداقت کا طلبگار ہوتا
ہے، جہاں اسے یہ صفات مل جاتی ہیں وہ اپنی جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ عشق
کے معاملہ شناسی اور معاملہ فہمی کے فرق کو اس شعر میں دیکھیئے ؎

بختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اقبالؔ عشق کو انسانی کمال کے لئے لازم اور ضروری ہی نہیں
سمجھتے بلکہ یہ ان کا ایمان ہے کہ عشق کے بغیر کوئی قوم ترقی کی منزلیں طے
نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے ؎

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق سے انسان اور جماعتوں کو حیاتِ جاوید نصیب
ہوتی ہے۔ عشق دنیا میں دائم و قائم ہے۔ اس کے کارنامے دلوں میں محو
نہیں ہو سکتے ؎

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

عشق ہی سے خودی کی تخلیق ہے اور خودی میں اسوقت
تک زندگی نہیں پیدا ہو سکتی جب تک کہ اس میں عشق اپنی پوری شان
کے ساتھ جلوہ گر نہ ہو۔ اس لئے عشق اور خودی لازم و ملزوم ہیں۔
حق تو یہ ہے کہ دنیا کی تخلیق سراسر عشق ہی سے ہے۔
اگر عشق نہ ہوتا تو [illegible] پیدا اس عالم کون و مکاں کا وجود نہ ہوتا۔ یہ عشق ہی
[illegible] محبت [illegible] ہے۔ ہر شخص
[illegible] حرارتِ زندگی
[illegible] عالم [illegible] محبت کی [illegible] یہ عالم
ہے کہ [illegible] حقیقت ایک ہے ہر شے کی [illegible] ہو کہ [illegible] ہو
[illegible] اگر ذرہ کا دل چیریں

علامہ اقبالؔ نے عقل کو کبھی اپنا پیشوا تسلیم نہیں کیا کیونکہ
عقل دل میں یقین و ایمان پیدا کرنے کے بجائے شک و شبہ پیدا کرتی ہے
لیکن عشق وہ جذبۂ اندرون اور بے باکی پیدا کرتا ہے، اس لائق ہے
کہ انسان اسے اپنا رہنما قرار دے ؎

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من

عشق ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کو ایسا جذبہ عطا
کرتی ہے کہ انسان کائنات کی قوتوں کو تسخیر کر کے اور زمانہ کی قیود کو توڑ
کر اپنی زندگی کو لازوال بنا لیتا ہے ؎

عشق کی اک جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

ارتقاء کی تمام منازل پر عقل رہنمائی نہیں کر سکتی کیونکہ
عقل محدود چیز ہے، زندگی کی راہ نمائی عشق کرتا ہے۔ عشق کے ذریعہ مکمل
زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ عقلی، جمالی اور مذہبی عناصر سے مرکب اور ان
پر حاوی عمل ہے لیکن عشق کو صادق اور باصفا ہونا چاہیئے اگر کوئی طلب
صادق کی روشن آگ میں مر جائے تو اس کی موت شہید کی موت سے کم
قابلِ رشک نہیں ہے اس لئے کہ ؎

عشق ہے مرگِ باشرف، مرگِ حیات بے شرف

جس قوم میں عشق رچ نہ گیا ہو اور جو جماعت عشق کی کیفیات
سے وارفتہ نہ ہو وہ اقبالؔ کے نزدیک دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ
عشق ہی سے قوم میں آثارِ حیات اور زندگی نو پیدا ہوتی ہے۔
غرض اقبالؔ نے عشق کو زندگی کی متاعِ بے بہا قرار دیا ہے۔
وہ اس کو ایسا آبِ رحمت سمجھتا ہے جس کے بغیر زندگی کی کھیتیاں سر سبز
شاداب نہیں ہوتیں۔ سچے عشق کی تڑپ اور خلش اگر دل میں نہ ہو تو
دل عشق کی آگ سے شعلہ نواز ہو۔ زندگی میں کیف و رنگ نہیں پیدا
ہوتا۔ عقل کا درس یا ہی زندگی کے مسائل حل کرنے میں مدد دیتی ہے
لیکن اس کو آپ حق و باطل کے پرکھنے کا کسوٹی نہیں بنا سکتے۔ کسوٹی تو
حق پسند دل کی [illegible] جو [illegible] سکتا ہے۔ اگر
انسان دل کی اس آواز کو سننے [illegible]
ادا شناس بن جائے گا۔

([illegible])

راموقبیلہ

(دوسری اور آخری قسط)

رام پرکاش راہی

راموِلوگ تعداد میں بہت کم ہیں۔ ان کے گاؤں چھوٹے ہوتے ہیں۔ کسی گاؤں میں بھی ایک ہزار سے زیادہ آبادی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے گاؤں کو خوراک کی کمی یا ناسازگار زمین کے لئے ترک نہیں کرتے۔

راموِلوگ کسی کام میں خصوصی رغبت نہیں رکھتے۔ نوجوان لڑکوں کو زراعت، شکار کھیلنے، مچھلی پکڑنے کی تربیت دی جاتی ہے جس میں خوردنی جڑی بوٹیوں کا اکٹھا کرنا بھی شامل ہے۔

ابھی تک راموِلوگ صرف "جھوم" قسم کی کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اس کے لئے جنگل کا کچھ حصہ صاف کر دیا جاتا ہے۔ اس پر کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔ بعد میں اسے ترک کر دیا جاتا ہے اور چند برس گزرنے پر اسے پھر استعمال کیا جاتا ہے۔ کاشت کا کام عورتوں کے ہاتھوں سے بیج بکھیرنے سے کیا جاتا ہے۔ کھیتی کا کوئی آلہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اپریل اور مئی کے مہینے کے بعد مکئی بوئی جاتی ہے جس کی فصل نومبر میں اٹھائی جاتی ہے۔

ابتدائی دنوں میں تمام معاملات گاؤں کے سربراہوں کے باہمی بات چیت کے ذریعہ منیصل کئے جاتے ہیں۔ یہ کونسل اب بیرونی خطرات سے لے کر رسم و رواج کے خلاف ورزی اور جرائم تک تمام مسائل کو حل کرتی ہے۔ بعد میں خاندان کے بارسوخ سربراہوں نے اسی گاؤں میں رہنے والے دوسرے خاندان کے سربراہ کو مات کر لیا اور گاؤں کا سربراہ بن گیا یعنی گیمبو بن گیا۔ پہلے پہل گیمبو کو ہر ایک گاؤں منتخب کرتا تھا۔ بعد میں یہ عہدہ وراثت یا قابلیت پر مبنی ہو گیا۔ گیمبو شادی بیاہ اور قتل، چوری اور شادی شدہ عورتوں کے فرار سے متعلق [illegible] تھا۔ اسے مروجہ قانون اور دوسرے گاؤں [illegible] حاصل ہوتا ہے۔ گیمبو منتخب

ختم ہونے کے بعد گرام پنچایتیں اور گرام سمیتیاں وجود میں آگئیں۔ راموِ لوگ چونکہ سرحدی علاقے کا قبیلہ تھے لہٰذا ان کے رہن سہن کے طریقوں میں کم سے کم دخل دیا جاتا تھا اور انصاف کی کارروائی مروجہ قانون کے تحت ہوتی تھی۔ رواج اور روایتیں، قسمیں اور منتقیں، دیوانی اور فوجداری معاملات نیز سزاؤں کے طریقے کا فیصلہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

مذہبی زندگی:

راموِلوگوں کے اعتقادات، دھرم، رواج اور ان سے وابستہ رسوم ان کی دیومالا سے ہی نکلتے ہیں۔ انہوں نے قسموں، وعدوں، دوستانہ روابط، بدلہ اور جوابی کارروائیوں جیسے مختلف موقعوں پر اپنے آپ کو پتھروں سے وابستہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وقت گزرنے پر پتھر مقدس بن گئے۔ قسموں کا پتھر گیبی لنڈنگ ایک ممتاز مقام کا حامل ہے۔ مجرم لوگ پتھر کے سامنے قسم کھا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ دھاوا بولنے سے پہلے وہ اس پتھر کا طواف کرتے ہیں جو کہ حوصلہ افزائی تحریک اور شکریے کے لئے ہوتا ہے۔ بدلے کا پتھر بھی اس کام آتا ہے لیکن طریقہ عمل مختلف ہے۔ اس صورت میں ایک متھن یا دوسرے جانور اس پتھر پر قربان کئے جاتے ہیں۔ راموِلوگوں کا اعتقاد ہے کہ آسمان اور زمین کا میل چند چیزوں کی تخلیق کا ذمہ دار تھا۔ ان چیزوں نے دیوتاؤں اور اچھی بری آتماؤں کا روپ دھار لیا۔

دونی پولو (سورج اور چاند) راموِلوگوں کی دیومالا کے سب سے اونچے دیوتا ہیں۔ وہ ہر ایک چیز کے لئے دونی۔ پولو کی عبادت کرتے ہیں اور ان کی پرستش کی کئی رسومات اور قربانیاں دیتے ہیں ان کی نعمت بخش آتمائیں ہیں۔ یاسو دیوتا (آگ کا دیوتا)، یا بودیو (پانی کا دیوتا)، دومینگ (دانش مندی کا دیوتا)، دونی ونگ (کستوری والے ہرن اور جنگلی جانوروں کا دیوتا) وغیرہ ان کی بدی کی آتمائیں عام طور سے اویوسس کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ آفات، وبائیں وغیرہ کو دور رکھنے کی غرض سے اہم اویوسس جیسے [illegible] کو مبا سارے، ارفی، اسد کا وغیرہ کی عبادت کی جاتی ہے۔

بڑا پروہت [illegible]

جو منتر اور پہاڑ نیتر بولتے ہیں وہ تحریری نہیں ہوتے اور منہ زبانی ہی ایک آدمی سے دوسرے تک پہنچائے جاتے ہیں۔

شمال مشرق میں رامو قبیلے کا علاقہ اب ارونا چل پردیش کا حصہ ہے۔ آزادی کے بعد ہی اس علاقے کی طرف توجہ دی گئی تھی۔ آٹھویں دہائی کے وسط میں رامو لوگوں کی سماجی نیز ثقافتی اور سیاسی نیز اقتصادی بحالی سے پتہ چلا ہے کہ قانون و امن کی حالت بالکل حسب معمول تھی۔

زراعت میں ان لوگوں کو دھان بونے اور دیگر فصلیں کاشت کرنے کے نئے طریقوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ مکئی، جوار، باجرہ، گیہوں، جو، دالیں، سرسوں، آلو، گنا اور انناس، سنترہ، پپیتا، جیری، اخروٹ اور بادام جیسے پھل کاشت کئے جاتے ہیں۔ جھوم طریقے کی کھیتی باڑی مفقود ہو رہی ہے۔

گرام سیوکوں کی تربیت کا ایک مرکز اور کسانوں کی تربیت کا ایک مرکز قائم کئے جا چکے ہیں۔ گھریلو صنعتوں کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ پن بجلی کے کئی وسائل بڑی سود مندی کے ساتھ بروئے کار لائے گئے ہیں۔ گھریلو اور صنعتی استعمال کے لئے بجلی ۵۰ فیصد سے زیادہ آبادی کو مہیا کی جا چکی ہے۔

بقیہ: جی۔ این۔ ایل۔ ایف۔ ......

چائے باغات میں مستحکم ٹریڈ یونین بنیاد کو کمزور بنانے اور اسے منتشر کرنے، مغربی بنگال کی بائیں محاذ حکومت کو غیر مستحکم بنانے اور کم از کم فرقہ وارانہ خیر سگالی کے نقطۂ نظر سے اس کے ریکارڈ پر داغ لگانے اور دیگر علاقوں میں بھی اسی طرح کی علیحدگی پسندی کو ترغیب دینے کا مقصد ہے۔ اس لئے قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے اور مستحکم بنانے والوں کا اور ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے میں تقسیم کرنے والی تمام سازشوں کی مخالفت کرنے والوں کا یہ مقدس فرض ہے کہ وہ اس قوم دشمن تفریقی تحریک کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور متحد ہو کر مقابلہ کریں۔



مضافاتی پانی سپلائی اسکیم کیلئے عطیہ

ریاستی حکومت نے اس ریاست کے سولہ اضلاع میں پانی کے وسائل ٹیوب ویل، تالاب وغیرہ کو سنبھالنے، کھودنے یا ان کی تعمیر کے لئے موجودہ مالی سال میں ۷۵ لاکھ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔

سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء کی مضافاتی پانی سپلائی اسکیم کے تحت ندیا ضلع کے چکدا میونسپلٹی کو ۱۰۷۶۱۳ روپئے بطور قرض دینے کی ریاستی حکومت نے منظوری دی۔ اس طرح اس اسکیم کے تحت اب تک کل ۱۱۰۰۲۸۰ روپئے قرض دئے گئے۔

سیلاب زدگان کی امداد

پروفیسر ایس۔ نورالحسن، گورنر، مغربی بنگال نے اضلاع مدنا پور، جنوبی ۲۴ پرگنہ اور شمالی ۲۴ پرگنہ میں ہر ضلع کے ضلع مجسٹریٹ کو ان ضلعوں میں سیلاب زدگان کی فوری امداد کے لئے "کل مقصد فیض رساں فنڈ" سے ۵۰۰۰ روپئے دینے کی منظوری دی ہے۔

وزیر اعلیٰ کے امدادی فنڈ میں عطیہ

پانا گڑھ، ضلع بردوان کے مترا سنگھ کے ممبروں نے ریاست کے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے وزیر اعلیٰ کے امدادی فنڈ میں ۱۰۲۲۷ روپئے دئے۔ ان لوگوں نے اس سال درگا پوجا کے تہوار کے اخراجات میں کمی کر کے یہ رقم اکٹھا کی۔

بردوان ضلع پریشد کے سبھا پتی نے وزیر اعلیٰ کی طرف سے اس عطیہ کو قبول کیا۔

جی۔این۔ایل۔ایف

کے سلسلے میں حکومت مغربی بنگال کا نکتۂ نظر

دارجلنگ کے پہاڑی علاقوں کو مغربی بنگال سے الگ کر لینے، یا اس علاقہ کو ریاست بنانے یا مرکزی حکومت کے زیر اقتدار علاقہ کی حیثیت دینے کی مخالفت کرتے ہوئے مغربی بنگال کی حکومت نے پہاڑی علاقوں کی نیپالی آبادی کی ثقافتی امتیازی خصوصیات کو تسلیم کر لیا ہے اور اس سلسلے میں اقدامات کئے ہیں گرچہ اس ریاست میں نیپالی بولنے والے اقلیت میں ہیں تاہم ان کی الگ ثقافتی اور سماجی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

اٹھائے گئے مسائل میں سے ایک مسئلہ نیپالی بولنے والے لوگوں کی زبان کا ہے۔ بہت قبل یعنی ۱۹۶۱ء میں مغربی بنگال کی ریاستی اسمبلی نے دارجلنگ کے پہاڑی علاقے کے لئے نیپالی کو دوسری زبان تسلیم کر لیا تھا اور اس وقت سے کوششیں کی جا رہی ہیں کہ انتظامیہ کے خط و کتابت میں جہاں تک ممکن ہو سکے نیپالی زبان کو رائج کیا جائے اور اہم اہم سرکاری دستاویزات اور گشتی خطوط کا نیپالی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ آنے والے برسوں میں اس سمت میں مزید مرکوز طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اس زبان سے وابستہ ایک اور مسئلہ دستور ہند کے آٹھویں جدول میں نیپالی زبان کو درج کرنے اور اسے تسلیم کرنے کا سوال ہے۔ مغربی بنگال کی ریاستی حکومت اس مطالبہ کی پوری طرح تائید کرتی ہے اور اسے اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں مرکزی حکومت اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کرتی۔ درحقیقت ۱۹۷۸ء میں جب وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی نے دارجلنگ کے پہاڑی علاقوں کا دورہ کیا تھا تو اس وقت انہوں نے یہ بیان دیا تھا کہ نیپالی ایک غیر ملکی زبان ہے اس لئے اسے آٹھویں جدول میں درج کرنے کی بات سوچی نہیں جا سکتی۔ حکومت مغربی بنگال نے اس کے خلاف احتجاج کیا، اور اس بات کا ذکر کیا کہ سندھی زبان بھی جدول میں درج ہے، کیونکہ ہندوستان کے ایک طبقہ کے لوگوں کی زبان سندھی ہے۔ بہت سارے مواقع پر مغربی بنگال میں ریاستی اسمبلی نے قراردادیں منظور کیں جن میں مرکزی حکومت سے پُرزور درخواست کی گئی کہ وہ نیپالی زبان کو تسلیم کرلے اور اسے آٹھویں جدول میں درج کر دے۔ ۱۹۷۷ء میں سلی گوڑی سے ایم۔ایل۔اے شری بیرن بوس نے مندرجہ ذیل تجویز پیش کی، جسے اتفاق رائے سے ریاستی اسمبلی نے منظور کر لیا۔ عرصہ دراز سے ہندوستان کی نیپالی بولنے والی آبادی اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ ان کی زبان کو دستوری طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ ۱۹۶۹ء میں مغربی بنگال کی متحدہ محاذ حکومت نے مغربی بنگال میں دارجلنگ کے تین پہاڑی سب ڈویژنوں ــ دارجلنگ، کرسیونگ اور کلمپونگ میں بنگلہ کے ساتھ ساتھ نیپالی کو سرکاری زبان تسلیم کر لیا تھا۔ مزید برآں کلکتہ، شمالی بنگال اور پٹنہ کی یونیورسیٹیوں میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورسوں میں تعلیم دینے کے لئے نیپالی زبان کو ایک موضوع کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ایسے حالات میں یہ اسمبلی مرکزی حکومت سے پُرزور درخواست کرتی ہے کہ نیپالی زبان کو آٹھویں جدول میں درج کر کے دستوری طور پر تسلیم کر لیا جائے تاکہ نیپالی بولنے والے لوگ ملک کی قومی زندگی میں مکمل طور پر شرکت کر سکیں۔"

ایک اور قرارداد میں، جسے اشوک بوس نے [illegible] میں پیش کیا تھا، اسی نظریہ کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس قرارداد کو ریاستی اسمبلی نے اتفاق رائے سے [illegible]

ان مطالبہ ہے جس کی مغربی بنگال میں سرکاری پارٹیوں کے تمام
شعبوں [illegible] کی تھی۔ یہاں تک کہ تری پورہ کی ریاستی اسمبلی نے،
جہاں [illegible] اکثریت ہے، ایک قرارداد منظور کی جس میں نیپالی
زبان کو [illegible] طور پر تسلیم کرنے کا ذکر کیا گیا۔ لیکن ان تمام باتوں
کے باوجود [illegible] حکومت نے نفی میں جواب دیا۔

ایک دوسرا سوال علاقائی خود اختیاری کے سوال سے
وابستہ ہے۔ ایک گمراہ کن نظریہ کو پریس کا ایک حلقہ اور چند
سیاسی پارٹیاں پھیلا رہی ہیں کہ بائیں محاذ اور اس کی حکومت
نے حال میں اپنے ارادہ کو بدل دیا ہے اور وہ دارجلنگ کے پہاڑی
علاقوں میں علاقائی جذبات کو ابھارنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ
حقیقت ہے کہ ریاست مغربی بنگال کے اندر علاقائی خود اختیاری
کے مسئلے پر برسوں سے گفت و شنید ہو رہی ہے اور بائیں محاذ کی
پارٹیاں کئی دہائیوں سے مسلسل اس بات کی تائید کرتی آ رہی ہیں
نیز ماضی میں اس مطالبہ کی مغربی بنگال کی بہت ساری سیاسی پارٹیوں
معہ کانگریس نے تائید کی۔ اس لئے باخبر لوگوں کے لئے تو یہ
ایک خبر نہیں ہے کہ ریاستی حکومت دارجلنگ کے پہاڑی علاقوں میں
علاقائی خود اختیاری کے ذکر کو بڑھاوا دے رہی ہے۔

۱۹۵۷ء میں جب وزیراعظم جواہر لال نہرو نے دارجلنگ
کا دورہ کیا تھا تو انہیں ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں دارجلنگ کے
پہاڑی علاقوں کے لئے علاقائی خود اختیاری کا مطالبہ کیا گیا اور اس
میں اس علاقہ کی تین اہم سیاسی پارٹیوں یعنی کانگریس، کمیونسٹ
پارٹی اور اکھل ہند گورکھا لیگ کے، ساتھ ہی بنگالی، لیپچا، بھوٹیا اور
دیگر فرقوں کے ۵۰ نمائندوں، پہاڑی علاقوں کے بلا لحاظ پارٹی تمام
ممبران اسمبلی اور ممبران پارلیامنٹ کی اور میدانی علاقوں کے ۵۰ سے
زیادہ ممبران اسمبلی کے دستخط تھے۔ اس سے قبل ۱۹۵۵ء میں ریاستی
تنظیم نو کمیشن نے جب اس نے دارجلنگ کا دورہ کیا تھا کے سامنے
بھی اسی قسم کی نمائندگی کی تھی۔ ۱۵ر مئی ۱۹۵۵ء کو انڈین نیشنل
کانگریس کی دارجلنگ ضلع کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی تھی جس
میں اس بات کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ انتظامیہ کے امور کی بابت حکومت
کی مدد کرنے اور حکومت کو مشورہ دینے کے لئے ایک قانونی ضلع کاؤنسل
قائم کیا جائے۔ نیز وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے پاس بھی جب انہوں
نے ۱۹۶۶ء میں اور ۱۹۷۲ء میں دارجلنگ کا دورہ کیا تھا، ایسے
میمورنڈم پیش کئے گئے۔ چنانچہ ریاست مغربی بنگال کے اندر علاقائی
خود اختیاری کا تصور بعد کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ یہ تو آزادی کے
بعد سے ہی تمام سیاسی پارٹیوں معہ پہاڑی علاقوں میں کانگریس
اور کمیونسٹ پارٹی اور اکھل ہند گورکھا لیگ کا مطالبہ تھا۔

۱۹۶۷ء میں متحدہ محاذ کی تشکیل کے بعد ریاستی اسمبلی
نے ایک تجویز منظور کی جس میں مذکورہ مطالبہ کیا گیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ قبل
یعنی ۲۳ر ستمبر ۱۹۸۱ء کو اسی طرح کی ایک اور قرارداد منظور کی گئی۔
اس قرارداد میں یہ کہا گیا کہ مرکزی حکومت دستور میں ترمیم لائے تاکہ مغربی
بنگال کے دائرہ عمل میں اور ریاستی حکومت اور مجلس قانون ساز
کے زیر اختیار ایک قانونی خود اختیار آٹونومی قائم کی جائے۔
ریاستی اسمبلی میں تمام پارٹیوں کے نمائندوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ
ایسی ایک باڈی اس علاقہ کی ضرورتوں کا متوازی اور صحیح اندازہ لگائے
گی، اس علاقہ کے لوگوں کی جمہوری تمناؤں کو مناسب نمائندگی دے
گی، ترقیاتی پروجیکٹوں کے تال میل کے ذریعہ جلد از جلد تکمیل کے لئے
انسانی اور قدرتی ذرائع کو یکجا کرے گی اور اس طرح نیپالی، بنگلہ اور
دیگر زبان بولنے والے لوگوں کے درمیان اتحاد کے بندھن کو مضبوط
بنائے گی۔

اتفاق رائے سے پاس کردہ اس تجویز کے مطابق تین
ممبران پارلیامنٹ، آنندا پاٹھک، انسم مکھرجی اور سومناتھ چیٹرجی نے
۹ر جولائی ۱۹۸۳ء کو پرائیویٹ ممبروں کے بل کی حیثیت سے دستور
(ترمیمی) بل پیش کیا تھا۔ اس بل کے اغراض و مقاصد میں نیپالی بولنے
والے لوگوں کی اہم خدمات کا، انتظامی اور ترقیاتی سرگرمیوں میں
شرکت کرنے کے لئے انہیں قومی دھارے کے قریب لانے کے لئے مواقع
فراہم کرنے کا تفرقہ پھیلانے والی تمام قوتوں کا، جو گورکھا لینڈ کا مطالبہ
کر رہی ہیں، ذکر کیا گیا تھا۔ بہرحال پارلیمنٹ نے اس بل کو منظور نہیں کیا۔
پھر ۹ر اگست ۱۹۸۵ء کو آنندا پاٹھک کے نام سے اسی طرح کا بل
پیش کیا گیا۔ اس بل کو بھی نامنظور کر دیا گیا۔ یہ تمام باتیں اس امر کو
عیاں کر دیتی ہیں کہ دارجلنگ کے پہاڑی علاقوں میں علاقائی خود اختیاری

کے لئے ریاستی حکومت نے کتنی کوششیں کیں اور اس تجویز کی کتنی پرزور تائید کی۔ لیکن یہ کوئی اچانک فیصلہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے اور اس ریاستی حکومت میں تمام سیاسی پارٹیوں کی یہی ایک رائے تھی کیوں کہ ریاستی سطح پر اس تجویز کو تمام سیاسی پارٹیوں مع کانگریس یا کانگریس (آئی) کی تائید حاصل تھی۔

اس تجویز کے خلاف ایک تنقید یہ ہے کہ دارجلنگ کے پہاڑی علاقوں کے لئے علاقائی خود اختیاری عملی طور پر باقی مغربی بنگال سے الگ ہو جانا ہے اور جو یہ مطالبہ کر رہے ہیں، ان میں اس علاقہ کو ریاست بنانے یا مرکزی حکومت کے زیر انتظام علاقہ کی حیثیت دینے کی مخالفت کرنے کی اخلاقی طاقت نہیں ہے۔ یہ تنقید صحیح نہیں ہے، کیونکہ ضلع خود اختیار کاؤنسل کو، جس کا اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے۔ ریاستی مجلس قانون ساز، ہائی کورٹ اور ریاستی حکومت کے دائرۂ عمل کے تحت کام کرنا پڑے گا۔ تری پورہ میں ضلع خود اختیار کاؤنسل کی (جیسے ریاست کے بڑے حصہ پر اختیار حاصل ہے، دارجلنگ کے پہاڑی علاقہ اس کے مقابلہ مغربی بنگال کا بہت ہی چھوٹا سا علاقہ ہے) تشکیل کی گئی۔ یہ کاؤنسل گزشتہ تین برسوں سے اس ریاست کے قبائلی علاقوں میں کام کر رہا ہے، لیکن یہ کاؤنسل ریاستی حکومت کے زیر اختیار ہے۔ یہ کوئی فرضی واقعہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کو جو اب بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خود اختیار کاؤنسل کے زیر اختیار ایسے علاقے ریاستی حکومت کے زیر انتظام نہیں رہیں گے اور بعد میں ایسی کاؤنسل کو الگ ریاست میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، تری پورہ جانا چاہئے۔ وہ سب وہاں جائیں اور اپنی آنکھوں سے یہ دیکھیں کہ ایسے خود اختیار ضلع کونسل ریاستی حکومت کے تحت آزادی کے ساتھ کام کرتی ہے یا نہیں۔

ایسے بھی لوگ ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ اس تجویز کا مقصد یہ ہے کہ علاقائی جذبات سے اپیل کی جائے اور اس طرح درحقیقت افتراق پسندوں کی اخلاقی طاقت کو مستحکم بنایا جائے۔ ایک بڑے اخبار کے صحافی نے اس بات کا بھی دعویٰ کر دیا کہ گورکھا لینڈ ماضی میں کی گئی اپنی تجاویز کی، جو علاقائی جذبات کو اجاگر کرتی ہیں، "سوتیلا بچہ" ہے۔ اس بات پر منطقی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو ہم یہ دیکھیں گے کہ ایسی بحث اس بنیاد پر وفاقیت کے مطالبات کی مخالفت کرے گی کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قومی تفریق کا پرچار کیا جائے۔ جبکہ بہت سارے افراد کا یہ خیال ہے کہ وفاقیت قومی اتحاد کو مستحکم بناتی ہے۔ اگر علاقائی خود اختیاری کے لئے مطالبہ علیحدگی اور تفریق کو فروغ دیتا ہے تو پھر دستور ہند میں دفعہ ۲۴۴ اور شیڈول VI میں ایسے دستوری اقدامات کی کیوں گنجائش رکھی گئی؟ کیا ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ دستور سازوں نے مخصوص معاشرے میں قومی اتحاد کو مستحکم بنانے کیلئے ایسا کیا جبکہ یہ سچ ہے کہ دستور میں جو گنجائش رکھی گئی ہے اس کا اطلاق صرف قبائلی علاقوں پر ہوتا ہے اور چند مخصوص صورتحال میں اسی نقطۂ نظر سے دفعہ ۲۴۴ میں ترمیم لانے کی درخواست کی گئی تاکہ اسے غیر قبائلی علاقوں میں نافذ کیا جا سکے، جہاں چھوٹے چھوٹے علاقوں میں اقلیتیں اپنی مخصوص ثقافت کے ساتھ رہتی ہیں۔ (علاقائی خود اختیاری کے لئے مطالبہ کے پیچھے جو منطق ہے اسے ایک الگ ریاست کیلئے مطالبہ کے ساتھ گڈمڈ کر دینا نہیں چاہئے جبکہ اول الذکر کا مقصد یہ ہے کہ ثقافتی اور نسلی تنوع کو تسلیم کر کے قومی اتحاد کو مستحکم بنایا جائے اور بعد الذکر تو اس خاص معاملہ میں قومی نااتفاقی کی طاقتوں کو مستحکم کرنے کی بابت ہے) پھر تری پورہ کی خود اختیار ضلع کاؤنسل واضح طور پر اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس طرح کی خود اختیار ضلع کاؤنسل قائم کر کے کس طرح تفریق پسند طاقتوں کو سیاسی طور پر شکست دی جا سکتی ہے۔ اس بات کی خود اختیار ضلع کاؤنسل، ریاستی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے لئے انتخابات کے نتائج سے تصدیق ہو جاتی ہے ــــ اور کس طرح ٹی۔ این۔ وی اور اس کے سرپرست تری پورہ اوپاجاتی جوبو سمیتی کو قبائلی عوام سے الگ تھلگ رکھنے میں معاون ثابت ہوئی۔ (چند سال قبل فرقہ وارانہ اور سامراجی طاقتوں کے بھڑکائے فسادات کے رونما ہونے کے باوجود تری پورہ میں ریاستی انتظامیہ کے ساتھ قبائلیوں کے قریبی تعلقات اور ملاپ اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں کہ مقامی زمین، جنگل اور دیگر مسائل کی دیکھ بھال کرنے کے لئے قائم کردہ علاقائی خود اختیار کاؤنسل تفریق پسندوں کے پروپیگنڈے کی تردید کرتی ہے)۔ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اگر نیپالی بولنے والے لوگوں کے عرصہ دراز کے مطالبہ کو مرکزی حکومت تسلیم کر لیتی ہے،

اس کے ساتھ ساتھ ان کی زبان کو دستوری طور پر تسلیم کر لیا جاتا کہ تفریق پسندوں کے پروپیگنڈے کا موثر طور پر مقابلہ کیا جا سکتا۔

یہ بات بھی پوچھی جا رہی ہے کہ جب پانچویں دہائی کے نصف عرصہ میں بائیں محاذ کے پارٹیوں نے ہندوستانی ریاستوں کی لسانی از سر نو تنظیم کی تائید کی تھی تو پھر اب کیوں مغربی بنگال کی بائیں محاذ حکومت نیپالیوں کے لئے ایک الگ ریاست کے مطالبے کی مزاحمت کر رہی ہے؟ ہماری مخالفت اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہندوستان کے علاقوں سے کتنی ریاستیں تشکیل کی جا سکتی ہیں، ان کی ایک حد معین ہے۔ پانچویں دہائی کے وسطی عرصے میں بڑی بڑی زبانوں سے وابستہ ملک کی لسانی نو تنظیم ہوئی۔ اگر اس اصول کو تمام لسانی جماعتوں کے لئے اپنایا جائے تو ہندوستان میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ریاستیں قائم ہو جائیں گی، ہر ایک میں چند لاکھ کی آبادی ہوگی اور اس میں اقلیتی فرقے کے لوگ ہوں گے۔ تو پھر ان ریاستوں کی ایک بار اور تقسیم ہوگی۔ اس بحث میں ایک خاص نقطہ یہ ہے کہ اگر سکم، جہاں تین لاکھ کی آبادی ہے، ایک ریاست بن سکتی ہے، تو پھر تین لاکھ سے زیادہ آبادی کے علاقے کیوں نہیں ریاست میں تبدیل ہو سکتے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ آبادی ۷۵ کروڑ سے زیادہ ہے، اس بات کے پیش نظر یہاں اس قسم کی ۲۵۰۰ ریاستوں کی مانگ ہوگی۔ میزورام کو ریاست کی حیثیت دے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ گورکھا لینڈ کی مہم کے ساتھ ساتھ مزید مطالبات جیسے شمالی بنگال میں کامتاپوری ریاست، مغربی بنگال، بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش کے مابین سرحدی علاقوں میں جھارکھنڈ، اتر پردیش کے آٹھ پہاڑی ضلعوں پر مشتمل اترکھنڈ وغیرہ کئے جا رہے ہیں۔ اگر انتشار کے اس طریقہ کار کو ایک بار شروع کر دیا جائے تو پھر ہندوستان کے کتنے ٹکڑے ہو جائیں گے اس کی کوئی حد نہیں ہوگی — ہر علاقہ، محلہ اور گاؤں کی جماعت اپنے لئے ایک الگ قومی شناخت کا دعویٰ کرے گی (آخر میں ہندوستان نہیں رہے گا اور یہ ملک سامراجیوں کے رحم و کرم پر رہے گا اور سامراجی تو اس ملک کو ختم کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ اس طرح ہمارا یہ عظیم ملک کمزور بن جائے گا)۔ اگر گورکھا لینڈ کے مطالبہ کو پورا کر دیا جائے تو کیا کوئی اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ اس کے بعد کے عرصہ میں پہاڑی علاقوں میں رہنے والی اقلیتیں جیسے لیپچا اور بھوٹیا اپنے لئے اپنے وطن کا مطالبہ نہیں کریں گی۔

اس لئے اقلیتوں کے مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ ان کے لئے ایک اور ریاست قائم کی جائے بلکہ اس کا حل تو یہ ہے کہ ریاستوں کے ڈھانچہ میں ان اقلیتوں کی زبانوں اور ثقافتی کے تحفظ کی یقین دہانی کرائی جائے اور ان مسائل پر، اس ریاست میں جن کا تعلق صرف ان لوگوں سے ہی ہے، دوسروں سے نہیں، انتظامیہ میں ان کی شرکت کے لئے انتظامات کئے جائیں۔ خود اختیار ضلع کاؤنسل کا تصور ہی یہی ہے کہ ایک مخصوص صورت حال میں اس مقصد کو پورا کیا جائے

حکومت مغربی بنگال نے اب تک نیپالیوں کی زبان اور ثقافت کو محفوظ رکھنے اور فروغ دینے میں مرکوز دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اس سلسلہ میں اقدامات بھی کئے ہیں۔ ۱۹۶۱ء کے ایکٹ کی سرگرم تعمیل، جس کے تحت تین پہاڑی سب ڈویژنوں کے لئے بنگلہ کے ساتھ ساتھ نیپالی کو بھی دوسری زبان قرار دیا گیا ہے، مزید اس کے "بائیں محاذ حکومت نے ایک نیپالی ترجمہ سیل اور ایک نیپالی پریس دارجلنگ میں قائم کیا۔ نیز دارجلنگ میں نیپالی لوگوں کی زبان اور ثقافت کو فروغ دینے کے لئے ایک نیپالی اکیڈمی بھی قائم کی۔ عظیم نیپالی شاعر بھانو بھگت اچاریہ کے نام پر ایک جلسہ گھر کی تعمیر اور ان ہی کے نام ادبی انعام دینا، اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ حکومت مغربی بنگال اس سلسلے میں کتنی تائید اور مدد کرتی ہے

ممتاز نیپالی ادیبوں اور فنکاروں کو انعامات دینے کے لئے ۱۳ جولائی کی تقریب کا بائیکاٹ کرنے کی جی۔ این۔ ایل۔ ایف نے پکار دی تھی۔ یہ پکار اس کی فرقہ وارانہ نوعیت کی عکاسی کرتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تقریب منعقد ہوئی اور جس ہال میں یہ تقریب منعقد ہوئی وہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور دھمکی کے باوجود یہاں ایک بے سوا سو ادیب اور فنکار آئے اور انعامات حاصل کئے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نیپالی ثقافت سے وابستگی کے لئے لوگ اس میدان میں ریاست حکومت کے ادا کردہ کردار کو سراہتے ہیں۔ جی۔ این۔ ایل۔ ایف کا یہ کہنا کہ ریاستی حکومت کو بھانو بھگتی کے نام میں کوئی ایوارڈ

دینا نہیں چاہئے، کیوں کہ وہ ایک نیپالی ہے، اور یہ کہ یہ ایوارڈ حکومت مغربی بنگال کی طرف سے دیا جاتا ہے اس لئے یہ بہتر ہوگا، یہ ایوارڈ ربندرا ناتھ کے نام پر دیا جائے — جی۔این۔ایل۔ایف کی یہ باتیں نسلی عصبیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ جہاں جی۔این۔ایل۔ایف کی پالیسی یہ ہے کہ نیپالی بولنے والے لوگوں کو ہندوستانی شہریوں سے الگ رکھا جائے، وہاں حکومت مغربی بنگال کا مقصد یہ ہے کہ نیپالیوں کو قومی دھارے کا جزو لاینفک بنا دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی مدد کی جائے کہ وہ سب اپنی ثقافتی انفرادیت کو برقرار رکھیں۔

ریاستی حکومت کا یہ نظریہ ہے کہ مغربی بنگال میں دیگر طبقوں اور فرقوں کے لوگ آباد ہیں اور یہ ان کا وطن ہے۔ اسی طرح یہاں آباد نیپالی بولنے والی آبادی کا بھی مغربی بنگال وطن ہے۔ ہماری ریاست مختلف طرز ہائے زندگی اور ثقافتوں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں ہر طبقہ اور فرقہ کے لوگوں کو، اس ریاست کی مجموعی ثقافت میں تنوع پیدا کرکے اور اسے مالا مال کرنے اور سماجی زندگی کو پُرلطف بناتے ہیں، بہت ہی اہم کردار ادا کرنا ہے۔ نیپالی اُنکی نمایاں زبان، رسم و رواج اور عادات کے ہماری اس ریاست کی سرزمین اور ثقافتی ورثہ کے جزو لاینفک ہیں۔

چائے باغات، جو پہاڑی علاقوں میں پہاڑی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے، ایک پلیٹ فارم بھی جہاں ملک کے مختلف علاقوں کے لوگ یکجا ہو جاتے ہیں۔ سرسبز چائے کے باغات قومی یکجہتی کی آماجگاہ ہیں جہاں نیپالی، بہار کے قبائلی، بنگالی، لیپا، بھوٹیا، ایک اور دیگر پہاڑی اور غیر پہاڑی قبیلے کے لوگ ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں، ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں، اس طرح بلا لحاظ زبان، نسل، مذہب محنت کش ہونے کے ناطے ان کی باہمی رشتے مستحکم ہو جاتے ہیں۔ برسوں سے چائے باغات میں ٹریڈ یونینوں کی جدوجہد نے محنت کش طبقہ میں بیداری پیدا کروی اور ان میں اتحاد کو فروغ دیا۔ اب جی۔این۔ایل۔ایف جو کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ چائے باغات میں رواں دواں محنت کشوں کے اتحاد اور قومی یکجہتی کے اس جذبہ کو کھوکھلا بنا دیا جائے۔ جیسا کہ ہم لوگوں نے بار بار ذکر کیا ہے کہ ریاستی حکومت اسے

امن و امان کا مسئلہ نہیں سمجھتی۔ جو مسائل اٹھائے گئے ہیں وہ سیاسی نوعیت کے ہیں۔ دارجلنگ کے پہاڑی علاقوں میں جو کچھ رونما ہو رہا ہے اس کی وجہ سے عام لوگوں میں ذہنی ہیجان پیدا ہوگیا ہے۔ ایک طرف تو تفرقہ پسند عناصر اقلیتوں کے خوف اور پریشانیوں سے جھوٹ اور نصف سچائی کے ذریعہ کھیل رہے ہیں اور لوگوں کے درمیان فرقہ وارانہ جذبہ کو اجاگر کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں تو دوسری طرف ان پہاڑی علاقوں کے لوگ، جو گورکھالینڈ کے حامیوں میں سے کچھ کم نیپالی نہیں ہیں، اور جن کے پاس اس علاقہ کے کسانوں، مزدوروں اور ملازمین کے جائز کاز کے لئے جدوجہد کرنے، مصائب جھیلنے اور قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونے کا شاندار ریکارڈ ہے، وہ سب فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لئے بہادری سے جدوجہد کر رہے ہیں اور قومی یکجہتی کے کاز کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اس بات کا اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ نیپالی بولنے والی آبادی کا ایک طبقہ علیحدگی پسندوں کے توڑے موڑے پروپیگنڈے سے متاثر ہوا ہے۔ اور جی۔این۔ایل۔ایف کے اجاگر کئے جذبات کا شکار بن چکا ہے۔ لیکن ریاستی حکومت کو اس بات کا پورا اعتماد ہے کہ ایک بار جب وہ فریب اور جھوٹ کی جال سے باہر دیکھنے لگیں گے تو وہ سب ان علیحدگی پسندوں کے دائرہ سے باہر نکل آئیں گے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ عوام کے سامنے حقائق کو پیش کئے جائیں تاکہ انہیں کوئی گمراہ نہ کر سکے۔ سارے ملک میں اور عرصہ دراز سے دیگر طبقوں کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ سے رہنے کے بعد یہ تو صرف اب وقت کی بات ہے کہ جب نیپالیوں میں قومی اتحاد کی طاقتیں اپنے مخالفین کو شکست فاش دیں گی۔ نیپالی بولنے والے عام کسانوں، مزدوروں یا متوسط درجہ کے ملازمین کو بنگالیوں، بہار کے قبائلیوں اور ہندوستان کے دیگر فرقوں، ساتھ ہی حکومت مغربی بنگال کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ سارے ملک میں دیگر عام شہریوں کی طرح وہ سب بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے اور امن سے رہنے کے خواہاں ہیں۔ اس لئے ریاستی حکومت کا یہ مقصد ہے کہ نیپالی بولنے والے عام محبان وطن سے ان علیحدگی پسندوں کو علیحدہ کیا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ ریاستی حکومت کے اس رویے کے

باوجود گزشتہ تین مہینوں میں تین موقعوں پر پولس فائرنگ کرنی پڑی اور جن سے ۱۹ افراد جاں بحق تسلیم ہوئے۔ موصول ہونے والی رپورٹوں کے مطابق ہر معاملہ میں پولس پارٹی پر پہلے مسلح افراد نے لکڑیوں اور دیگر اسلحہ جات سے ساتھ حملے کئے جن کی وجہ سے پولس کے افراد کی جان کو خطرہ لاحق ہوگیا اور ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ اپنے دفاع کے لئے فائرنگ کریں۔
کرسیونگ میں پولس فائرنگ پر ایک اکزی کیوٹیو انکوائری ہوئی ہے۔ اس انکوائری کی رپورٹ میں پولس فائرنگ کو بجا بتایا گیا ہے۔ کلمپونگ میں پولس فائرنگ کی انکوائری کی رپورٹ تیار کی جارہی ہے۔ بلاشبہ جو کچھ بھی ہوا اسے ہم اچھا نہیں کہہ سکتے۔ حکومت مغربی بنگال ہلاک ہونے والوں کے اہل و عیال سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور اس بات کی امید کرتی ہے کہ اس طرح کی فائرنگ کا اور کوئی واقعہ رونما نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی جی۔ این۔ ایل۔ ایف کی سربراہی میں ایسی پُرتشدد تحریکوں اور پولس والوں پر حملوں کا موثر طور پر مقابلہ کرنا بھی ضروری ہے۔ تشدد اس تحریک کی بنیاد بن چکا ہے اور اب تک اس تحریک کے متعدد مخالفین پر حملے کئے گئے انہیں چھری مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ خون سے لبریز کنگری کے ظلم کے ساتھ پُرتشدد تحریک اس علاقہ میں کافی خون ریزی اور جانی نقصان کی ذمہ دار ہے۔

بہرحال مغربی بنگال میں برسرِ عمل سیاسی پارٹیوں کا یہ اقدام قابلِ تحسین ہے کہ جب ۱۸ راگست ۱۹۸۶ء کو وزیر اعلیٰ نے تمام پارٹیوں کا ایک جلسہ منعقد کیا تو وہ سب اس میں شریک ہوئیں اور اتفاق رائے سے ایک قرارداد کو منظور کیا جس میں گورکھا لینڈ کی تحریک کی "قوم دشمن" اور "علیحدگی پسند" تحریک کی حیثیت سے مذمت کی گئی۔ اس قرارداد میں دستخط کرنے والوں میں سی پی آئی (ایم)، کانگریس (آئی)، فارورڈ بلاک، آر ایس پی، سی پی آئی، جنتا پارٹی، بی جے پی، لوک دل، مغربی بنگال سوشلسٹ پارٹی، ایس یو سی، ڈی ایس پی، بیپلوبی بنگلہ کانگریس، کانگریس (ایس)، آر ایس پی کے سربراہوں نے دستخط کئے۔ یہ تجویز ان لوگوں کے

حوصلہ کو تقویت پہنچائے گی جو پہاڑی علاقوں میں تفرقہ پسندوں اور علیحدگی پسندوں سے نبرد آزما ہیں اور جو اپنی جان کی بازی لگا کر قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے جھنڈے کو لہرا رہے ہیں۔

آخر میں گورکھا لینڈ کی پُرتشدد تحریک کی بابت ہر متعلقہ شخص کو غور کرنے کا سوال ہے کہ کس طرح صرف چند مہینوں کی ایک مختصر سی مدت میں جی۔ این۔ ایل۔ ایف کی تنظیم اتنی تیزی سے ترقی کر سکی؟ وہ لوگ کون ہیں جو پولس پر اور اپنے مخالفین پر حملہ کرنے کے لئے مسلح دستوں کی رہنمائی کر رہے ہیں؟ اس سے قبل وہ سب کہاں تھے؟ ایک بات تو یہ دیکھنے میں آئی کہ بہت زیادہ روپئے ڈھالے جارہے ہیں ——— لیکن کہاں سے یہ کسی کو نہیں معلوم۔ یومیہ اجرت پر رضاکاروں کی ایک بڑی فوج رکھی گئی ہے۔ کون ان اخراجات کو برداشت کر رہا ہے؟ یہ سوالات اٹھائے جارہے ہیں، کیوں کہ صرف چند مہینوں قبل یا یوں کہئے کہ اپریل ۱۹۸۶ء تک پہاڑی علاقہ کے صرف چند لوگ سبھاش گھیسنگ یا اس کی تنظیم سے واقف تھے۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ گورکھا لینڈ کی تحریک برف کا بہتا ہوا وہ تودا ہے جو پانی کی سطح سے اوپر رہتا ہے؟ کیا یہ علیحدگی پسند تحریک اس بڑے منصوبے کا ایک حصہ ہے جو ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے اور کمزور کرنا چاہتی ہے اور یہاں غیر ملکی مفادات کے ذریعہ بلا روک ٹوک معاشی استحصال کا بازار گرم کرنا چاہتی ہے؟ کیوں ہند۔ نیپال معاہدہ میں درج سیدھی سادی باتوں کی تشریح کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس معاملہ کے پسِ پردہ بھی کچھ اور ہی باتیں ہیں۔ گزشتہ چند مہینوں میں دارجلنگ میں رونما ہونے والے واقعات کا سلسلہ وار جائزہ لیا جائے تو کیا ایک شخص اسے خالصتان، آزاد آسام، قبائلی تری پورہ اور میزورام، جھارکھنڈ، کامتاپوری، اتر کھنڈ اور اسی طرح کی دیگر تحریکوں سے وابستہ نہیں کر سکتا؟ کیا ہم اس غیبی ہاتھ کو نہیں دیکھ سکتے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان فوج کو کمزور بنایا جائے اور برصغیر ہندوستان میں غیر مستحکم صورتِ حال پیدا کر دی جائے۔

ریاستی سطح پر اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی تحریک

(باقی صفحہ ۸ پر)

وزیر اعلیٰ کی اپیل

مغربی بنگال ایک ایسا علاقہ ہے جہاں مختلف فرقوں اور مختلف نسلی، لسانی اور مذہبی جماعتوں کے لوگ مکمل ہم آہنگی کے ساتھ رہتے ہیں اور باہمی اعتماد اور پیار و محبت سے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ بدنصیبی کی بات ہے کہ فی الحال چند قوم دشمن اور علیحدگی پسند عناصر دارجلنگ کے پہاڑی علاقوں میں عوامی امن و امان اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔

یہ تحریک، جس کا مطالبہ یہ ہے کہ ضلع دارجلنگ کے تین پہاڑی سب ڈویژنوں میں ایک الگ گورکھا لینڈ قائم کیا جائے۔ ایک جماعت؛ جو خود کو جی۔ این۔ ایل۔ ایف (گورکھا لینڈ قومی آزادی محاذ) کہتی ہے، کی سربراہی کے تحت گزشتہ چند مہینوں سے جاری ہے۔ یہ جماعت قوم دشمن اور قوم کو تقسیم کرنے والی ہے۔ یہ حقیقت کہ اس جماعت نے غیر ملکوں اور تنظیم اقوام متحدہ (یو۔ این۔ او) سے اپیل کی اور ان سے امداد کی درخواست کی ہے، اس تحریک کو نوعیت میں قوم دشمن اور نظریہ میں تفریق پسند بنا دیتی ہے۔ شورش کرنیوالوں کی دلیل کی کوئی معاشی بنیاد نہیں ہے اور وہ ہند۔ نیپال معاہدہ میں درج باتوں کی غلط تشریح کرتے ہیں اور تاریخ کو قصداً توڑنے مروڑنے کے کام میں مصروف ہیں۔ اس پوری تحریک کا مقصد یہ ہے کہ مغربی بنگال کو تقسیم کر دیا جائے اور نیپالی اور غیر نیپالی لوگوں کے درمیان ایک شگاف پیدا کر دیا جائے۔ بہر حال یہ بات باعث مسرت ہے کہ پہاڑی علاقوں، اس کے ساتھ ساتھ میدانی علاقے میں رہنے والے لوگوں کی اکثریت اس تحریک کی مخالفت کرتی ہے۔

علیحدگی پسندوں کی اس مضرت رساں تحریک کا مقابلہ کرنے اور ان کی شر انگیز سازش کو ناکام بنانے کے لئے ہم لوگ تمام ممکنہ انتظامی اور سیاسی اقدامات کر رہے ہیں۔ میں صحیح سوجھ بوجھ کے لوگوں سے پُر زور اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس تقسیم کرنے والی اور تخریب پسندوں طاقتوں کا، جو دارجلنگ میں سرگرم عمل ہیں، متحدہ طور پر مقابلہ کریں اور مغربی بنگال کے پہاڑی اور میدانی دونوں علاقوں میں نیپالی اور غیر نیپالی لوگوں کے درمیان اور اتحاد اور خیر سگالی کے پرچم کو بلند رکھتے ہوئے ان لوگوں کا منہ توڑ دیں۔

دستخط

جیوتی باسو

Chief Editor : Prinandra Krishna Bhattacharya, Editor : **Dhurendra Dutta**, Asst. Editor **Md. Azam**
Published by the **Information & Cultural Affairs Dept. of Govt. of West Bengal** and **Printed by G. R. T.** Printers, 25 Panchanantala Road, Calcutta-700 048.

PRICE 12 Paise

وزیر اعلیٰ کی اپیل

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے ماہ ستمبر میں مغربی بنگال کے ستر[illegible]
[illegible] ضلع غیر معمولی سیلاب سے دوچار ہوئے تھے اور جن کے
[illegible] کو ۲۵ فیصد آبادی بری طرح متاثر ہوئی۔ ہماری حکومت
[illegible] کی تعداد لاکھوں سے تجاوز اور امدادی کام کے لئے فوری
[illegible] سیلاب کے پانی کے گھٹنے کے بعد تمام متاثرہ اضلاع میں بحالی
[illegible] شروع کیا گیا ہے۔ موجودہ بحران کا مقابلہ کرنے کیلئے
[illegible] ضروری ہے کیونکہ [illegible]
[illegible] حکومت [illegible] محدود ہیں اور مرکزی
[illegible] منظور [illegible] تکمیل [illegible]
[illegible] کہ وزیر اعلیٰ ریلیف فنڈ کے لئے عطیہ دینے کے سلسلے
[illegible] پیش رفت کی ہے
[illegible] سے اپیل کرتا ہوں کہ وزیر اعلیٰ کے ریلیف فنڈ میں
[illegible] سے امداد فرمائیں۔

(جیوتی باسو)